معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران
حاجی محمد اسمعیل خان
مولوی وحید الدین سلیم

جلد ۲ — یکم جولائی سنہ ۱۸۹۹ عیسوی — نمبر ۱

قیمت سالانہ مع محصولڈاک .... للعہ | قیمت فی پرچہ نمونہ ۵/

مقام اشاعت علیگڈھ

مطبع مفید عام آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخان صوفی چھپا

سنہ ۱۸۹۹ع

[illegible] قواعد

۱- یہ [illegible] علمی رسالہ [illegible] ہر مہینے کی [illegible] تاریخ کو علیگڈھ سے شائع ہوا کریگا

۲- اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اس [illegible] اردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور [illegible] علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی [illegible] مضامین [illegible] انگریزی۔ عربی اور [illegible] زبانوں [illegible] اور اخباروں اور رسالوں سے [illegible] مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ [illegible] علم تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳- [illegible] ہر قسم کے مضامین [illegible] اقسام کے مضامین [illegible] شائع کیے جائینگے۔

۴- بالفعل اس رسالہ کے [illegible] مقرر کیے گئے ہیں۔

ا- حاجی محمد اسمٰعیل خان۔

ب- مولوی وحید الدین سلیم۔

۵- ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجہ کے انشاپردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں [illegible] وہ اپنے [illegible] مضامین سے ہماری مدد کریں [illegible] جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں [illegible] ان کے احباب ان کے ناموں سے ہمکو مطلع کریں [illegible] گذارش ہے کہ وہ بھی اس رسالہ کو اپنی قیمتی [illegible] امداد پہنچائیں جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا [illegible] گے [illegible]

۶- [illegible] مولوی وحید الدین سلیم [illegible]

۷- چونکہ اس رسالہ [illegible]

۸- [illegible]

۹- اگر کوئی پرچہ [illegible] اشاعت [illegible] اطلاع [illegible] طلب [illegible]

۱۰- جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہ جاوے۔

۱۱- پتہ مولوی وحید الدین سلیم کا علیگڈھ دفتر رسالہ معارف

معارف

ایک ماہواری رسالہ

جلد ۲ | یکم جولائی ۱۸۹۹ء | نمبر ۱

حالات سسلی

(۲)

[illegible] سسلی کی ابتدا

[illegible] جیسا کہ قدرت کا قاعدہ ہے کہ [illegible]
مختلف سلطنتوں میں [illegible] اجزاے پریشان کو [illegible]
وقت [illegible] کے شیرازہ [illegible]
[illegible] ابتدا [illegible] فرمان روا ہوا [illegible] کے
[illegible] جب وہ [illegible]
[illegible] علاوہ [illegible] و عمل کی قدر [illegible] سے
[illegible] کی بھی یہی حالت [illegible]
[illegible] سے [illegible] رہے تھے - اور یورپ
[illegible] اور [illegible] سے [illegible] زیادہ [illegible]
تھے - اس بات کی قابلیت [illegible] باقی رکھ سکیں

[illegible] خصوصاً [illegible] رومیون کی
[illegible] تمام مختلف
[illegible] حالت میں [illegible] تھے
الگ الگ [illegible] ہو گئی ہیں - اور اس طرح ہمیشہ کے
لیے [illegible] - انگلینڈ کی [illegible] قوم کے
ہاتھ میں [illegible] - [illegible] قوم نے اپنی [illegible]
[illegible] نے زیادہ [illegible] یورپ میں [illegible] کے بعد بھی
شاہنشاہی قائم کی اور دین عیسوی کی حمایت کا بیڑا اٹھایا -
[illegible] نامی فرقہ [illegible] پر فرمان روا تھا - اسپین پر [illegible]
قبضہ [illegible] ہوئے تھے - باقی رہا اٹلی کا ملک جس میں [illegible]
[illegible] ہوئی تھی اور جس میں اب [illegible] اقوام نے
دخل پا لیا تھا وہ بھی [illegible] عالم حالت میں یورپ کی [illegible]
تھی بہت جلد شریک ہو گیا - پہلے [illegible] قوم کا [illegible]

(نوٹ) [illegible] حالات [illegible] کتابوں سے مدد لی گئی ہے - [illegible] تاریخ [illegible]
[illegible] صفحہ ۱۳۵ و ۲۱۵ و ۲۱۶ و ۲۳۰ - [illegible] تاریخ [illegible] عام تاریخ [illegible]
صفحہ ۳۰ - دائرۃ المعارف جلد چہارم صفحہ ۷۰ - [illegible] پاشا کی ترکی تاریخ کا عربی ترجمہ [illegible]
صفحہ ۱۹۶ و ۲۰۰ - [illegible] (مشہور انگریزی مورخ) کی کتاب کا عربی ترجمہ [illegible] الاول [illegible]
مترجمہ خلیفہ بن محمود افندی جو مصر کے مشہور عالم [illegible] کے [illegible] صفحہ ۲۲۰ -

مقاصد اور قواعد

۱- یہ دو جزو کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علیگڈہ سے شایع ہوا کریگا

۲- اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے اردو زبان کے علم ادب کا دایرہ وسیع ہو اور اس میں ہر قسم کے علمی فلسفی - اخلاقی - مذہبی - تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں انگریزی - عربی - اور ترکی زبانون کی نایاب کتابون اور اخبارون اور رسالون سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائین تاکہ مسلمانون مین روشن ضمیری عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو -

۳- یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچہ مین ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شایع کیے جائین گے -

۴- بالفعل اس رسالہ کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہین -

ا - حاجی محمد اسمعیل خان -

ب - مولوی وحیدالدین سلیم -

۵- ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجہ کے انشاپردازون اور مضمون نگارونکی خدمت مین درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کرین - جن بزرگون کے نام ہمکو معلوم نہیں ہین - اگر مہربانی سے وہ خود یا اُن کے احباب اُن کے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُن کی خدمت مین بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالہ کو اپنی قیمتی تحریرون سے امداد پہنچائین جو حضرات کسی مضمون مین اپنا نام ظاہر کرنا نہین چاہین گے اونکا نام ظاہر نہین کیا جائیگا

۶- اس رسالہ کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک (للعہ) ہے جو نقد قیمت بھیجنے یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرنے سے خریدارون کی خدمت مین بھیجا جائیگا ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہوگی نمونے کے پرچہ کیلیے پانچ آنہ کے ٹکٹ آنے ضرور ہین قیمت ہمیشہ پیشگی نقد یا بذریعہ ویلیو کے وصول کیجائیگی اور قیمت رسالہ کسی حال مین کم نہین ہوسکتی - رسالہ کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحیدالدین سلیم کے نام ہونی چاہیے اور انہی کے نام قیمت آنی چاہیے - جواب طلب امور کے لیے آدہ آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے -

۷- جو بزرگ اس رسالہ کی خریداری منظور فرمائین اون سے امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائیٹل اور پتہ صاف لفظون مین تحریر فرمائین گے -

۸- حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہین گے -

۹- اگر کوئی پرچہ ڈاک مین گم ہوجاے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دیجیے ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائین -

۱۰- جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائین وہ خوشخط و صاف لکھا بھیجین تاکہ طبع مین آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجاے -

۱۱- پتہ مولوی وحیدالدین سلیم کا علیگڈہ دفتر رسالہ معارف

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

نمبر ۱	یکم جولائی سنہ ۱۸۹۹ء	جلد ۲

حالات تسلی

(۴)

زمنۂ مظلمہ کی ابتدا

رومن امپائر کا انقسام مختلف حکومتون مین

جیسا کہ قدرت کا قاعدہ ہے کہ مختلف اقوام و ملل کے اجزاے پریشان کو اسی وقت تک ایک شہنشاہی کے شیرازہ مین مجتمع رکھا جا سکتا ہے جب تک کہ کوئی زبردست ہاتھ ان پر فرمان روا ہو جو ان کے شیرازے کو ٹوٹ جانے نہ دے۔ لیکن جب وہ ہاتھ اٹھ جاتا ہے تو بہت جلد ان اقوام و ملل کی قدیم ملکی صورت عود کر آتی ہے، رومن امپائر کی بھی یہی حالت ہوئی۔ وہ وحشی اقوام جنہون نے رومن شہنشاہی کے ٹکڑے اڑا دیے تھے۔ وہ جو یورپ کے شمال اور مشرقی جانب سے آئی تہین جنمین زیادہ تر جرمنی جرگے تھے، اس بات کی قابلیت نرکھتی تہین کہ اس شیرازہ کو باقی رکھ سکیں اور ان مین وہ خصائص موجود نتہین جو رومیون کی کامیابی کا باعث ہوئی تہین جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام مختلف صوبجات مین جو مجبوراً ایک مجتمع حالت مین نظر آتے تھے الگ الگ حکومتین قایم ہو گئین۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لیے وہ جدا ہو گئے۔ انگلینڈ کی جنوبی سرزمین سکسن قوم کے ہاتھ مین چلی گئی۔ گال (فرانس) پر فرانک قوم نے اپنی حکومت جمائی جس نے آیندہ چلکر یورپ مین رومن قوم کے بعد پہلی شاہنشاہی قایم کی اور دین عیسوی کی حمایت کا بیڑا اوٹھایا۔ ہونس نامی فرقہ منگری پر فرمان روا تھا۔ اسپین پر گاتھ قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ باقی رہا اٹلی کا ملک جس مین رومن قوم کی نشو و نما و ترقی ہوئی تھی اور جس مین اب وحشی اقوام نے دخل پا لیا تھا وہ بھی اسی عام حالت مین جو یورپ کی اس وقت تھی بہت جلد شریک ہو گیا۔ پہلے تو ہرول قوم کا ایک سردار اوداوکر

(نوٹ) اس زمانہ کے حالات لکھنے مین ان کتابون سے مدد لی گئی ہے۔ زبدۃ الصحائف کا دوسرا حصہ موسوم بہ سیاحۃ المعارف (اقوام متمدن کی تاریخ) مولفہ نوفل آفندی طرابلسی صفحہ ۱۳۵ و ۲۱۵ و ۲۱۶ و ۲۲۰۔ تحفۃ الدہور فی تاریخ الدہور (کل دنیا کی عام تاریخ) مولفہ یوحنا آفندی ابکاریوس صفحہ ۳۸۔ دائرۃ المعارف جلد چہارم صفحہ ۷۷۔ جودت پاشا کی ترکی تاریخ کا عربی ترجمہ مترجمہ عبدالقادر آفندی رئیس محکمۂ تجارت بیروت جلد اول صفحہ ۱۹۰ و ۱۹۹ و ۲۰۰۔ ہارٹسن (مشہور انگریزی مورخ) کی کتاب کا عربی ترجمہ موسوم بہ اتحاف الملوک الالباء بتقدم الجمعیات فی بلاد اوربا مترجمہ خلیفہ بن محمود آفندی جو مصر کے مشہور عالم رفاعہ بیک (رئیس المترجمین مصر) کی نظر ثانی کے بعد شایع ہوا تھا۔ صفحہ ۲۳ و ۱۳ منہ

ی جس نے روملس (آخری رومن شہنشاہ) کو تخت سے
رمیا تہا فرمان روا ہوا جس نے اس ملک کا اٹلی کے نام
سوم کیا۔ جو آج تک مشہور ہے مگر بہت ہی تھوڑے دنون
کے بعد ایک اور جرمنی جرگے گاتہہ نامی نے ۴۹۳ء مین حملہ
ا اور اب اٹلی کی حکومت گاتہہ قوم کے ایک سردار کے ہاتھ مین
س کا نام تھیوڈورک تہا چلی گئی اور ۵۵۲ء تک اسی کے
نشینون کے ہاتھ مین رہی۔ گاتہہ قوم نے اپنا مستقر ریونا
رار دیا تہا۔

بنہ مظلمہ کی افسوسناک حالت وہ خراب اور سخت افسوسناک
لت جو اس یورپ کی ہوگئی تہی سارے مورخین یک زبان
راسکی شہادت دے رہے ہین اور اس ذلت انگیز و ادبار آمیز
ت کی یادگار مین اس زمانہ کو ازمنہ مظلمہ کا لقب
یا گیا ہے۔ مشہور رابرٹسن انگریزی مورخ لکھتا ہے "اس
لا سے یورپ ایک سخت تعب مین مبتلا ہوا۔ اور سارے
شندگان یورپ پر اسکی بدولت مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
م اس زمانہ کو دریافت کرنا چاہین جس مین جنس انسانی پر سخت
ے سخت مصیبت پڑی تو ہمین اس زمانہ کو یاد کرلینا چاہیئے جو
یوڈوسیس کے مرنے کے بعد اٹلی مین لومبارڈیون کی سلطنت
ہونے تک رہا۔ ان مصنفون نے جو اس زمانے مین گذرے
ہین ان واقعات کے بارہ مین جو تباہ کن بربادی اور انسانی جانون
افسوسناک خون ریزی کے نوشتون سے پُر ہین اگرچہ بہت
لکھا ہے لیکن ان وقایع کی حد سے زیادہ ہولناک ہونے
بدولت ان مصنفین کو اپنی اظہار مافی الضمیر کے لیے مناسب
ارتین نہ مل سکین اور کماحقہ تفصیل و توضیح اُن سے نہ ہوسکی
مصنفون نے ان کرخت وحشی اقوام کے دساکو (خدا کی جانب
سے نازل ہونے والی بلا) اور (اقوام دنیا کی تباہی اور بربادی)
جیسے معیب القاب سے یاد کیا ہے۔ گویا ان کے افعال کو
زلزلون۔ آتش زدگیون۔ طوفانون۔ اور دیگر خوفناک مصائب
جنکو عقل تصور کرسکتی اور وہم فرض کرسکتا ہے تشبیہ دی گئی ہے
یہ ہین ایک مشہور مورخ کے الفاظ جس سے زیادہ مختصر اور پُر حقائق
عبارت اسبارے مین لکھی نہین جاسکتی۔

رومن مشرقی سلطنت کی ترقی اور اٹلی کے ایک حصہ پر اس کا متصرف ہوجانا ایسی حالت مین جبکہ ہر ایک سلطنت کا اعلیٰ اور بزرگ ترمقصد یہی ہوا کرتا تہا کہ اپنی مقبوضات کو ترقی دے اور بسیں پر کوئی تعجب کی بات نہین ہے کہ جوستیانوس مشہور قیصر قسطنطنیہ (جس نے سینٹ صوفیہ کی عمارت بنائی اور بہت سے قوانین و انتظامات مرتب کیے اور جس کا زمانہ مشرقی سلطنت روما کے لیے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے) اپنی سلطنت کو ترقی دینے پر توجہ کی چنانچہ ۵۵۵ء مین اس نے دو مشہور جنرلون بلیساریوس اور نارسیس کے ذریعے سے جو اس کے دربار کے سب سے چمکتے ہوئے جوہر تہے ملک اٹلی کو جس مین ہمیشہ خانہ جنگی برپا رہتی تہی، فتح کرلیا۔ اور اس طرح پھر ایک دفعہ جیسے کہ شمع کے گل ہونے کے وقت اسکی روشنی مین دفعتہً تیزی آجاتی ہے) رومن سلطنت کا علم اٹلی کے خوشنما شہرون مین لہرانے لگا۔ مگر اب نہ وہ جوش تہا۔ نہ وہ اسباب تہے جن کی بدولت ان کے اسلاف کو ترقی نصیب ہوئی تہی۔ لہذا بہت جلد اِن کو تنزل شروع ہوگیا۔

لومبارڈیون کی سلطنت ایک اور جرمنی جرگے نے جو لومبارڈ کہا جاتا ہے۔ ۵۶۸ء مین اٹلی مین داخل ہوکر اسکے جنوبی حصے پر اپنا تصرف کرلیا۔ اب گویا اٹلی دو حکومتون مین منقسم تہی اور انہین آپس مین کوئی تعلق نہ تہا ایک حصہ ایطالیہ لومبارڈیہ جس پر لومبارڈی قوم قابض تہی اور جس نے اپنا مستقر حکومت

پاو یا مین قرار دیا۔اس حصہ مین اٹلی کے جنوبی صوبے شامل تھے دوسرا حصہ ایطالیۃ الرومیہ مشرقی رومن سلطنت کے زیر حکومت جس مین صوبجات وینس۔ روسیہ۔ ناپول۔ اور جزیرہ سسلی شامل تھا۔ قیاصرۂ روم کی جانب سے اس حصہ ملک پر ایک والی جو اکزرخوس کے نام سے موسوم ہوتا تھا مقرر ہوا کرتا تھا اور اس کا مستقر ریونا تھا۔ اب اٹلی کی پوری تباہی آگئی اور مؤلف دائرۃ المعارف کے قول کے مطابق اٹلی بھی اب اُس عام حالت مین شریک ہو گیا جو اسوقت سارے یورپ کے ممالک پر طاری تھی۔

بائی زنیٹن سلطنت کا اقوام مفتوحہ سے سلوک اور اُسکی عام حالت۔

اب سسلی بائی زنیٹن سلطنت (سلطنت مشرقی روم) کے زیر حکم تھا اور ہم کو اسکے حالات سے صرف اسی حد تک جسقدر کہ انتظام ملکی اقوام مفتوحہ سے تعلق ہے بحث ہے اور اس لحاظ سے ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بائی زنیٹن سلطنت کسی مدح کی مستحق نہین ہوسکتی اقوام مفتوحہ سے بالکل ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ملک کا اعلیٰ طبقہ عیش پرستی اور بدکاری مین مبتلا تھا۔ اور اسی عیش پرستی کی بدولت عورتون کی سفارش ملکی انتظام کے متعلق بہت بڑا اثر رکھتی تھی اور اسی کی بدولت ان مین نوع انسانی کا ذلیل ترین اور ظالمانہ دستور خوجہ بنانے کا جاری تھا جسکے لیے یورپ نے آنکھ بند کر کے مسلمانون کو سخت الزام دیے ہین۔ چنانچہ خود بادشاہ کی حفاظت انہین سے متعلق رہا کرتی تھی۔ مذہبی فرقہ نہایت اوج موج پر تھا یہان تک کہ بائی زنیٹن سلطنت اور مذہبی جنون کو جو اسوقت رومیون کی طبیعتون پر غالب تھا لازم وملزوم خیال کرنا چاہیے۔

اگر بائی زنیٹن سلطنت کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو کوئی ورق ایسا نظر نہ آئیگا جس مین مذہبی فرقے کی احمقانہ خیالات اور قیاصرۂ روم کی ظلم وزبردستی کی بدولت خون ریزی اور افسوسناک تباہی کے کھلے ہوے واقعات پیش نظر نہ ہوتے ہون۔ اوسط درجے کے لوگ محصولون کے بارے دبے ہوئے تھے جسکی نسبت پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہین کہ ”محصولی انتظام کی سختیون کا حال پڑھنا ہو جو بائی زنیٹن سلطنت مین تھا تو بیری لشی گشتغن مصنفہ فردر کو دیکھو“ جب بائی زنیٹن سلطنت کا اس طرح سے برتاؤ اور انتظام تھا تو کوئی تعجب کی بات نہین ہے ”اگر رعایا کو اپنی اس سلطنت سے محبت نہ تھی اور وہ اپنے اس ظالم گورنمنٹ کے پنجہ سے نجات دہندہ کی تلاش کر رہی تھی۔“

یہ حالت تھی بائی زنیٹن سلطنت اور اسکے رعایا کی جبکہ وہ مبارک ومقدس زمانہ اسلام شروع ہوا جسکی بدولت دنیا نے ایک اور نئی حالت مین قدم رکھا اور جس زمانہ کے سسلی کی حالات لکھنا ہم کو مدنظر ہے۔

(۵)

”فتوحات اسلامیہ پر ایک اجمالی نظر“

مسلمانون کی ملک گیری اور فتوحات کے بیان کرنے سے پیشتر ہم کو اس خطرناک غلط فہمی پر غور کرنا ضروری ہے جس کی بدولت یورپ نے مسلمان فاتحین کی تاریخ پر بڑے بڑے اعتراضات کی چاشنی چڑھا رکھی ہے۔ اور اُسکا ایسی ظالمانہ صورت مین دکھلایا ہے گویا اُن کا اصلی مقصد ملک گیری کے ساتھ ہی ساتھ بزور شمشیر اشاعت مذہب رہا کرتا تھا۔

ہوشیار گر متعصب عیسائی فاضل سر ولیم میور کی یہ عبارت سب سے مختصر عبارت ہوسکتی ہے جہان تمام اعتراضات کا (جو اس بارہ

[illegible]

ہو سکتے ہیں) خلاصہ یہ ہے "اسلام کا وجود دیتا اس پر موقوف تھا کہ اور ملکوں پر ہمیشہ تعدی اور دست درازی کی جائے اور اس دین کا تمام عالم میں شایع ہونا اور اس سلطنت کا ساری دنیا میں قایم ہونا اس پر منحصر تھا کہ یہ دین بزور شمشیر قبول کروایا جائے"۔

گو دراصل اس مسئلہ پر کامل طور سے غور کرنی اور اسکے تمام مباحث پر محققانہ نظر ڈالنی اُسی مصنف کے لئے موزون ہے جو اسلام اور مسلمانون کی مکمل تاریخ لکھی مگر اس خیال سے کہ ہمارا آیندہ بیان بھی ان ہی عظیم الشان فتوحات کے سیلاب کی ایک لہر ہوگا محض تسلسل بیان کے لیے اجمالی طور پر اسکے متعلق کسی قدر بحث کر دینی غالباً ہماری حد سے خارج نہو گی۔

وہ تاریک غبار جو اس مسئلہ پر چھایا ہوا ہے اور وہ دُھندلا پن جو جو اس بارے مین دکھلائی دیتا ہے۔ یہ ساری خرابیان دو مختلف حیثیتون (یعنی مذہبی اور تمدنی) کے گڈمڈ کر دینے سے پیدا ہوئی ہین اور جہان ان دونو حیثیتون کے فرق پر ذرا سا بھی غور کر لیا تو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ یہ دُھندلا پن جو بظاہر دکھلائی دیتا ہے صرف عیسائی متعصبون کی رنگ آمیز اور بے بنیاد باتون سے پیدا ہوا ہے اور بہت جلد اصلی حقیقت کھل جاتی ہے۔ مذہبی اور تمدنی دو جدا جدا اعتبار ہین۔ اور ان دونو کو ملا دینا جیسا کہ یورپ نے اس مسئلہ مین کیا ہے ایک بہت بڑا مغالطہ اور ایک بہت ہی بُرا تدلیس ہے۔ اور کبھی انصاف پسند نظر اس کو جائز نہین قرار دے سکتی۔ یہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ مسلمان فاتحون کی تمدنی اور سیاسی اعمال کے جانچنے مین بجائے تمدنی و سیاسی قواعد کو ملحوظ رکھنے کے مذہبی نظر سے کام لیں اور تمام اقوام عالم کے گذشتہ اور ان کے بعد آنے والے فاتحین سے مقابلہ کرنے کے عوض ان کے حالات پر ایسی نظر کیجائے جو (معاذ اللہ) ایک پیغمبر کے حالات کے لیے موزون و شایان ہو سکتی ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کے بعد ہم کو تاریخ اسلام پر ایک اجمالی نظر ڈالنی چاہیے جس سے ہمارا بیان کیا ہوا فرق آسانی سے خیال مین آسکتا ہے۔

سب سے پہلے جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی پر ایک نظر ڈالیئے۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات والاشان مین دونون صفتین جمع تھین۔ جسطرح آپ وحی ربانی اور تبلیغ عامہ رسالت کی بدولت نوع انسانی کے سب سے کامل اور سب سے برتر و اعلیٰ فرد ہین، اسی طرح آپ اپنی ملک عرب اور اقوام مسلمانان کے حاکم دنیاوی بھی تھے اور اسلیے ہم یورپ کو اجازت دیتے ہین کہ وہ ہر حیثیت سے آپ کی والاشان زندگی پر نظر ڈالے۔

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والاشان زندگی کے متعلق اگر اس درست و صحیح مواد پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے جو عربی مستند سیر کی کتابون مین (جن کے بارے مین بے تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اس سے بڑھکر آجتک دنیا مین کسی کے حالات زندگی کے متعلق توجہ نہین کی گئی اور نہ کسی کے حالات ایسے کاوش و کوشش کے ساتھ فراہم کیے گئے ہین) مہیا ہے، تو صاف صاف نظر آجائیگا۔ کہ جیسا اعلیٰ نمونہ انسانی کمال کا حضرت کی والاشان زندگی مین موجود تھا اس کے برابر کوئی اور نمونہ انسان نے نہین دیکھا اور اس سے اعلیٰ اور بے داغ زندگی کا اس دنیا مین ہونا پورے پورے طور پر محال و ممتنع ہے۔ اس تمام زندگی بھر مین کوئی واقعہ ایسا نہین ہے جس پر کسی اعتراض کا موقع مل سکے اسکی تصدیق خود وہ علماے یورپ جنہون نے حضرت کی سیر کا کامل طرح سے مطالعہ کیا ہے کرنے لگے ہین۔ صرف ایک غزوات و فتوحات ہی کا مسئلہ ہے جس پر مخالفین اسلام نے بہت کچھ زور دیا ہے۔ ان کے اعتراضات کی مدلل اور مفصل تردید جناب سید مرحوم نے اپنی تفسیر اور خطبات مین کر دی ہے

جس مین چند جزوی فروگذاشتون کے سوا کوئی ایسی بات نہین ہے جس کا انکار کیا جاسکے اور اسکا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے - کہ یہ غزوات اخلاقی لحاظ سے کسی ناجائز غرض پر مبنی نہ تھے بلکہ ان کا مقصد صرف اسلام و مسلمانون کی حفاظت تھی -

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلفاء راشدین کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیئے جن مین بھی یہ دونو صفتین (ایک صفت تمدنی تو پوری پوری طور سے اور دوسری صفت بلحاظ خلیفہ رسول اللہ ہونے کے) موجود تھین - انکی زندگی مین بھی کوئی ایسا واقعہ نہین ملیگا جس پر نکتہ چینی کی جاسکے -

اب اسکے بعد وہ زمانہ آیا جبکہ یہ دونون صفتین جدا ہوگئین - مذہبی حیثیت خلافت سے بالکل علیحدہ ہوگئی اور پھر کوئی ایسا موقع نہین آیا کہ یہ دونو صفتین جمع ہوئی ہون بیشک یہ خلفا سچے دل سے اسلام کے پابند اور اسکے حامی تھے مگر وہ کوئی خاص مذہبی حیثیت نرکھتے تھے جسکی وجہ سے ہم انکے افعال کی مذہبی طور سے جانچ کرین -

مذہبی کام ان علماء کے ہاتھ مین چلا گیا تھا جو ان سے الگ تھلگ اپنی خدمت انجام دے رہے تھے اور سلطنت سے براہ راست ان کو کوئی تعلق نہ تھا - اسبات کے علم حاصل کرنے کے لیے کہ اگر خلفاء کی ظلم و ستم سے مذہب اسلام نہ پھیلا تو پھر وہ کون سے وجوہ تھے جن سے اسلام نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی ناظرین کو دعوت اسلام مصنفہ آرنلڈ دیکھنی چاہیئے - باقی رہی تمدنی و سیاسی حیثیت جو خلفاء مین تھی - اسی لحاظ سے ہم کو انکی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے اور انکو دیگر اقوام کے فاتحین و فرمان رواؤن سے انکا مقابلہ کرنا چاہیئے - جو ان سے پہلے یا انکے بعد گذرے - انہی فاتحین کی نسبت موسیو لی بان نے یہ بیش بہا

رائے دی ہے -

"جب ہم عربون کی تاریخ کو بغور پڑھتے ہین تو ہمین معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ملک گیری دو قسم کی ہوا کرتی تھی - یا تو وہ کسی ملک کو قیام کرنے کے ارادے سے فتح کیا کرتے تھے یا محض فوج کے ساتھ ملک سے گذر جاتے تھے - پہلی صورت مین وہ ہمیشہ ماتحت قوم کی دلجوئی کرتے اور کل ملک گیران سابق کے طریقے کے برخلاف مفتوحہ اقوام کو پوری آزادی مذہب و رسوم و رواج و قوانین کے دیتے تھے اور اسکے عوض ان سے ایک خفیف ساجزیہ لیتے فتوحات عرب کی یہ صورت شام - مصر - اندلس مین پیش آئی - لیکن دوسری صورت مین جبکہ وہ ملک مین قیام کرنا نہ چاہتے ان کا طرز بالکل ہی علیحدہ ہوا کرتی تھی - یعنی مثل اور ملک گیرون کے یہ بھی مفتوحہ ممالک کو محض ایک مال غنیمت سمجھتے اور جس قدر مال و متاع انکے ہاتھ لگتا لے لیتے اور جو نہ لے جاسکتے اس کو غارت کر دیتے تھے یہ اخیر طریقہ انہون نے اطالیہ اور فرانس مین اختیار کیا "

موسیو لی بان کی اس بیش قیمت رائے پر کسی قدر حاشیہ لکھنے کی ضرورت ہے - قسم اول کے مسلمان فاتحین کی نظیر خود بے تعصب اور نہایت گہری نظر رکھنے والے موسیو لی بان نے اعتراف کر لیا ہے دنیا مین کسی قوم کے فاتحین میں [illegible] ل نہین سکتی - باقی رہے قسم ثانی کے فاتحین - گو یہ فاتحین اور فاتحین کیطرح انہین کے رسوم و قواعد کے پابند ہوا کرتے تھے مگر تب بھی ہم یہ ضرور کہین گے کہ گو مسلمان فاتحین کی ظلم و ستم کی داستانین کیسے ہی ایشیائی مبالغہ اور مبالغہ انگیز الفاظ میں کیون نہ بیان کی جائین پھر بھی ان سے پہلے گذرے ہوئے اور ان کے بعد آنے والے فاتحین غیر اقوام کی نسبت ان کے مظالم گھٹے ہوئے ہی ہونگے اور اگر ہم ان معصوم

خوفناک فاتحین کا مقابلہ جو مسلمانون مین ہوگذرے ہین اُن
بے شمار فاتحین غیر اقوام سے کرین جن کے مظالم کی داستانین
ہمیشہ کے لیے صفحۂ تاریخ پر ثبت رہین گی تو صاف نظر آسکتا ہے
اول الذکر بمقابلۂ ثانی الذکر فاتحین کی رحمت کے فرشتے تھے ۔
اس لحاظ سے جو الزام فاتحین موخر الذکر پر عاید ہوسکتا ہے اُس
سے کسی قدر کم ہے جو اول الذکر پر عائد ہونا چاہیئے ۔ اس قدر
تفصیل کے بعد ہم اب سسلی کی حالت کیطرف متوجہ ہوتے ہین۔

…سسلی پر / …الی رائے

خلافت راشدہ کے پاک زمانہ مین جن کے فتوحات کی نسبت کوئی نکتہ چینی نہین کیجا سکتی
فتوحات اسلامیہ کی وسعت سسلی تک نہ پہونچی تھی بلکہ سسلی
فتح اُس زمانہ مین ہوئی جبکہ صرف تمدنی حیثیت خلفاء اسلام مین
…لہذا ہم کو فتوحات سسلی کو مذہبی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے
…صرف تمدنی حیثیت سے جیساکہ ہمنے بیان کردیا ہے۔
…ان فاتحین سسلی کی نسبت اس امر کا تصفیہ ہوتا ہے کہ
…موسیو لی بان کے بیان کردہ تقسیم کے مطابق کس قسم کے
…تھین تھے چنانچہ موسیو لیبان لکھتے ہین*۔
…صقلیہ (سسلی) مین اُنہون نے اِن دونون طریقون کو یکے
…بعد دیگرے برتا ۔ اوائل مین جبکہ اِن کی تعداد بہت کم تھی اور
…صقلیہ او ایک حصہ ایطالیہ کا شہنشاہان قسطنطنیہ کے تحت مین
…انہون نے محض فوجی حملون پر اکتفا کی اور ملک کو لوٹا ۔ وہ
…کسی صوبے مین داخل ہوے جو کچھ پایا لے لیا۔ جن باشندون
…نے مقابلہ کیا انہین قتل کیا اور پھر جلدی سے اپنی سرحدمین واپس
…کے چند ایسی کامیابیون کے بعد جب انہین ملک کا لے لینا
…معلوم ہوا تو انہون نے باشندون کے ساتھ مدارات شروع
…اور جس دن سے ان کا تسلط ہوگیا۔ تو پھر لوٹ مار کو بالکل

* دیکھو تمدن عرب صفحہ ۲۰۵ ۔

ترک کردیا اور مفتوحہ ملک کو ہر قسم کی آسائش دی اور وہان اپنا
تمدن پھیلایا اور مثل اندلس کے اسے بھی سرسبز کردیا"۔
مگر جیساکہ ہمنے اپنے اس حاشیہ مین جو موسیو لیبان کے مقولہ
پر لکھ چکے ہین بیان کردیا ہے ہم پھر بھی کہینگے کہ اوائل مین گو
مسلمانون نے بہت کچھ ظلم کیا مگر ان کے ظلم بہ نسبت اُن فاتحین
کے جنہون نے سسلی کو اُن سے پہلے فتح کیا تھا بہت ہی
کم تھے۔

یہ ایک اجمال خاکہ ہے جسکی تفصیل ہم آیندہ نمبر مین
کرینگے۔

(محمد مرتضی)

الفاروق

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدت سے ملک مین بلند تھا۔ پبلک کا شوق وقف انتظار تھا خلیفۂ ثانی کی لائف کی عظمت و اہمیت علامۂ مصنف کے پیش نظر تھی۔ اور اونکی دقیقہ سنج نظر سواد تحریر کی تلاش مین سرگرم۔ جن باتون کو آج کل نگاہین ڈھونڈتی ہین وہ گذشتہ تاریخون مین ڈھونڈنے سے بھی نہین ملتین۔ ہندوستان مین جو تاریخی مصالح ہے وہ اسی عظیم الشان کام کے لیے کافی نہین۔ مصنف کی تشنگی طلب سمندر طے کرکے اونکو ٹرکی دارالخلافہ مین لے پہنچی جہان انہون نے نایاب کتابخانے چھان ڈالے۔ وہان سے اونکا شوق اپنے عزیز کی تلاش مین مصر لایا۔ غرض یہان انتظار تھا وہان مصروفیت ادھر تعجیل تھی اور ادھر تاخیر۔ مگر کہ طلب نگاہون نے جب پبلک کی اس بےچینی کو محسوس کیا تو اونکو موقع ہاتھ آیا۔ دیکھتے دیکھتے

سیرت الفاروق - الفاروق داخل ہ تالیف ہوئیں چھپیں بازار میں آئیں اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق فروخت بھی ہوئیں - جب یہ سیمیائی جلوے محو ہوے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی کافور ہو گئی تو صبح صادق نور افشان ہوئی جس نے نگاہون کو پرنور اور دماغون کو روشن کردیا - ہم بعض مذکورہ بالا کتابین پڑھ چکے تھے - لہذا الفاروق کو دیکھکر ہمنے بے تامل کہا "دیر آید درست آید" اور جب ہم نے اُس مین اون کتابون کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ مین مصنف کی نظر سے گذری تہین تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ع

دیر آمدہ ز راہ دور آمدہ

الفاروق کو غور و تامل سے پڑہنے کے بعد ہمارے تمہیدی الفاظ شاعرانہ مدح سرائی نہین معلوم ہونگے بلکہ یہ کہا جائیگا کہ جسقدر کہنا چاہیے تہا اوس سے کم کہا گیا - حضرت فاروق اعظم کی لائف جنکا درہ جنرلون کی شمشیر سے زیادہ پُر اثر اور جنکی سادہ عظمت قیصر و کسریٰ کے جاہ و جلال سے بڑہکر تہی شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کی قلم سے نکلے تو کیا اوس کا غلغلہ اور انتظار اوس سے کم ہو سکتا ہے جو ہمنے اوپر بیان کیا -

الفاروق جس قسم کے مادہ سے صورت پذیر ہوئی ہے وہ اعلیٰ درجہ اور اول قسم کا ہے - تاریخ طبری کتاب الخراج - عقد الفرید - مقریزی - بلاذری - فتوح البلدان وغیرہ - وہ کتابین ہین کہ جو مسلمانون کیلیے فن تاریخ و جغرافیہ کی جان ہین اور ان سے زیادہ معتمد کتابین جہانتک علم ہے اس وقت عالم مین موجود نہین - یہ کتابین مصنف کے قابو مین ہین - اور جہان جس پہلو سے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ علامۂ روزگار ان سے کام لیتا ہے - قدیم معتبر تاریخین - جدید تحقیق واقعات کے اصول - ان دونو عنصرون کو ملا کر مؤلف الفاروق نے ایک تازہ و دلفریب شکل پیدا کی ہے جو ایشیا اور یورپ دونون کے قابو سے فرداً فرداً خارج تہی - اور جسکی نسبت خود مولانا نے فخریہ لہجے مین فرمایا ہے - ؎

پیکرے تازہ کہ خواہم بہ عزیزان بنمود

لختے از ذوق خودش نیز تماشا کردم

ہمارے مخدوم نے الفاروق لکھکر نہ صرف تاریخ اسلام پر ایک احسان کیا ہے بلکہ خود مذہب اسلام کی حقانیت کی ایک صاف و روشن برہان عالم کے سامنے پیش کی ہے - انصاف اور غور کی نظر اگر الفاروق پر ڈالی جائے تو بدیہی طور پر سمجھ مین آتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم ایک اعلیٰ نمونہ کمال و صفات انسانی کے تھے - اس خیال کے بعد دل مین یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قوی کو کسنے کامل کرکے شگفتہ کیا اور کسطرح اونکی بو فضائے عالم مین پہیلی - نہ وہ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے - نہ عرب کے ایام جاہلیت کی سوسیٹی ایسی تہی جسکی سانچے مین ایسے باکمال انسان ڈہلتے - واقعات صاف شہادت دے رہے ہین کہ یہ اوس ذات قدسی کی تعلیم و تربیت کا اثر تہا جو انسانون کو کامل بناتے اور خداوند حقیقی کے مظاہر قدرت کو ظاہر کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے - اور خالق عالم نے بواسطہ نبوت خود اونکو کامل بنایا تہا - ایسے انسان گذرے ہین جو خود اپنی طبیعت کے زور سے بادشاہ بن گئے ہین اپنے قوت کے بل پر سپہ سالار بنکر فاتح عالم ہوگئے ہین - لیکن تیمور و نپولین کے حالات پڑہکر صاف عیان ہوتا ہے کہ وہ طبیعت کی ایک لہر تہی جو ایک جانب کو بہا لیگئی -

وہ بہت سی خوبیون اور بہت نقائص کے مجموعہ تھے فاروق اعظم پر جس پہلو سے نظر ڈالو - امامت کے اعتبار سے بادشاہی کے لحاظ سے سپہ سالاری کی حیثیت سے مقنن و مدبر کی نظر سے - اخلاق انسانی کی بنا پر - غرض ہر شکل مین اور ہر طرح دیکھو خوب دیکھو - موافق نگاہ سے دیکھو مخالف بنکر جانچو غرض مختصر جہانتک دیکھا جائے دیکھو - سوا ے خوبی کمال کے اور کچھ نظر نہین آئیگا -

حق یہ ہے کہ صحابہ کرام حضرت سرور عالم کی ہدایت کے ایک اعلیٰ اور زبردست شہادت تھی - اور آپ کی قوت تربیت کی ایک سچی تصویر - آپکے فیضان صحبت سے حضرات ابوبکر - عمر - عثمان - علی - ابوعبیدہ ابن جراح - سعد ابن ابی وقاص - عبدالرحمن ابن عوف - خالد ابن ولید - معاذ ابن جبل - زید ابن ثابت وغیرہ لوگ جیسے انسانی کمالات کے مختلف نمونون کا پیدا ہونا ایک بڑی اور مستحکم ثبوت آپکے منجانب اللہ مبعوث ہونے کا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے -

الفاروق دو حصون پر منقسم ہے جنکی مجموعی تعداد تقریباً آٹھ سو صفحے سے زاید ہے - حصہ اول کے شروع ہونے سے پیشتر ایک تمہید ہے جس مین اسلامی تاریخ اور اوسکے مختلف زمانون کی حالت سے بحث کی ہے - معتبر تاریخون کے نام - متقدمین و متاخرین کی طرز تحریر و تحقیق کا تفاوت بیان کیا ہے - فن تاریخ پر ایک عام نظر ڈالی ہے اوسکے اصول و فروع بتائے ہین اور یہ ظاہر کیا ہے کہ مورخ کے کیا فرائض ہین اور یورپ کے مورخ کس قسم کی بے اعتدالی برتتے ہین -

تمہید کے بعد حصہ اول شروع ہوتا ہے - اور اس مین حضرت عمرؓ کے نسب - ولادت - سن رشد - قبول اسلام ہجرت - سن یکم ہجری سے وفات حضرت سرور عالم تک کے حالات سقیفہ بنی ساعدہ - خلافت حضرت ابوبکر - ولیعہدی اور خلافت و فتوحات کا ذکر ہے -

اس ضمن مین مصنف کو دو معرکۃ الآرا اختلافی مسئلے طے کرنے پڑے ہین - ایک حدیث قرطاس - دوسرا سقیفہ بنی ساعدہ -

حدیث قرطاس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سرور عالم نے وفات سے چار روز پیشتر قلم اور دوات طلب کی اور فرمایا کہ مین تمہارے لیے ایسی چیز لکھون گا کہ تم آیندہ گمراہ نہو - اسپر حضرت عمر نے لوگون سے مخاطب ہوکر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے - حاضرین مین سے بعض نے کہا کہ (معاذاللہ) رسول اللہ بہکی باتین کرتے ہین - کسی نے کہا دوات قلم لے آو کسیکی رائے ہوئی کہ نہ لانا چاہیئے - غرض قیل و قال بڑہی اور آپنے پریشان ہوکر سب کو اوٹھا دیا - یہ حدیث اسلام کے دو زبردست گروہون کے مباحثے کا صدہا برس سے منشا ہورہی ہے ایک گروہ اسکو خلیفہ ثانی کے خلاف کام مین لانا چاہتا ہے - دوسرا فریق ثابت کرتا ہے کہ اس مین کوئی امر خلاف شرع یا ادب نہ تھا - شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم نے تحفہ مین اسکی نسبت بارہ صفحے لکھے ہین جو لوگ شاہ صاحب مرحوم کی روانی عبارت اور شگفتگی مضامین سے واقف ہین وہ خیال کرسکتے ہین کہ کیا موتی برسائے ہونگے اور کیسی گلکاری کی ہوگی اور کن پیارے علامہ نے نئے پیرایہ مین استدلال کیا ہے اور روایت کے سادہ اصول سے دفعتہ کھو جا نچا ہے - لوگون کو اونکا بیان روکھا اور پھیکا معلوم ہوگا مگر "انصاف بالاے طاعت ست" کا وصول نے دو ٹوک زبردست

پہلو اختیار کئے ہین - اور پوری صفائی سے اس گتھی کو سلجھایا ہے اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر فن کے مولف کا ایک فرض منصبی ہوتا ہے - متکلم کا فرض منصبی اور ہے - فقیہ کا اور اور مورخ کا اور - جب ایک ہی واقعہ ان سب کے سامنے پیش ہو گا تو ہر ایک کی نظر اوس پر مختلف پہلوون سے پڑیگی - ایک مورخ سی واقعہ کو صرف اوسکی واقفیت کے اعتبار سے جانچیگا - یا یون مو کہ جانچنا چاہئیے - جو مورخ آج تاریخ لکھے وہ اون سادہ اور زبردست اصول سے قطع نظر نہین کرسکتا جنھون نے فن تاریخ کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے - اور جو تاریخ نگاری کی جان ہین - پس الفاروق و تاریخ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئیے نہ فقہ یا کلام کی کتاب کی حیثیت سے اور اوسکے مولف کو تحسین یا نفرین کے واسطے مورخین کی بزم مین لانا چاہئیے نہ مفتیون کے دار الافتا مین -

سقیفہ بنی ساعدہ (جہان حضرت ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ ہوا)

حدیث قرطاس سے بہی زیادہ معرکہ خیز ہے - مولف الفاروق نے اس موقع پر بہی پوری آزادی رائے سے کام لیا ہے اور سی طرح اپنے اوس فرض کو ترک نہین کیا - جو مورخ ہونے کی حیثیت سے تہا - اس بحث کے ہر ایک پہلو کو پولیٹکل سائنس کے اصول سے جانچکر واقعہ کے اصلی پہلو دکہا دیے ہین -

معمولاً کسی کتاب کی جلد اول و ثانی کے مابین کوئی فصل نہین ہوتا مین الفاروق کی دونون جلدون کے بیچ مین اتنا فاصلہ ہے ک عالم نظر آتا ہے - اور کہہ سکتے ہین - کہ دونون مین مشرقین ہے - ہماری مراد اوس نقشہ سے ہے جو دنیای سلام کے نام سے دونو جلدون کے بیچ مین چہپا ہے - جب ہم اوسکو کہولتے ہین تو اوسکا مشرقی حصہ جلد اول مغربی حصہ جلد ثانی پر آجاتا ہے اسی لیے ہمنے اسکو مشرقین سے تعبیر کیا ہے - یہ نقشہ فی نفسہ ایک عجیب چیز ہے - اور جرمن کے جن پروفیسرون نے مرتب کیا ہے اونکی جان فشانی اور دقیقہ سنجی لایق ہزار آفرین ہے کسی بڑے مضمون کی عبارت کی اختصار کی تعریف بیان کرین تو معمولاً کہتے ہین کہ دریا کو کوزہ مین بند کردیا ہے - لیکن یہ مثل نقشہ کے بارے مین عموماً اور اس نقشہ کی مقابلہ مین خصوصاً ناچیز ہے - نقشہ مین دریا کیا چیز ہے - فقط ہر کلفظ مین بلکہ اس سے کم مین سمندر بند ہوتے ہین - بلکہ بر و بحر - اس نقشہ مین کہاری پانی کے سمندرون سے گذر کر فتوحات اسلامیہ کے جا نفزا سمندر موج زن ہین جسطرح دنیا کے سمندرون مین رنگ کا امتیاز ہے - کوئی اسود ہے کوئی احمر - اسی طرح اس نقشہ مین مختلف عہد کے فتوحات کے سیلاب اپنے اپنے رنگ سے ممتاز نظر آتے ہین - اور ایک نگاہ مین حضرت سرور عالم خلیفہ اول سے ثالث تک اور بنی امیہ کے عہد اور اوسکے مابعد کے فتوحات کی حد معلوم ہوجاتی ہے - اس نقشہ کی مدد سے عرب کی گزشتہ تاریخ عمدہ طور پر سمجھ مین آسکتی ہے - شمس العلما سید علی بلگرامی نے بہی ایک نقشہ تمدن عرب مین شامل اسکے دیا ہے - لیکن الفاروق کا نقشہ اوس سے زاید مفید اور زیادہ معلومات کا مخرج ہے - کاش یہ نقشہ بڑا چہاپا کر دیوار کے آویزان کرنے کے لایق بنایا جائے - جلد ثانی جیسا کہ خود مصنف نے دعوی کیا ہے - مصنف کی سعی و محنت کی تماشاگاہ ہے - بلکہ یون کہنا چاہیے کہ حضرت فاروق اعظم کی عظمت کی پوری تصویر ہے - جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ یہ کتاب حضرت عمر کے حالات مین ہے - وہ حصہ ثانی کی فہرست مطالب دیکہیگے تو سمجہیگا کہ کسی انیسوین صدی کے مہذب و منتظم سلطنت کے حکمران کی فہرست ہے

 الفاروق

کیا یہ کم تعجب خیز امر ہے کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہے اور اوسی وسعت کی بنا پر جو جو محکمے جزو سلطنت قرار پائے ہین - وہ سب نہین تو اونمین سے اکثر ایک منتظم شکل مین حضرت عمر نے اپنی دہ سالہ حکومت مین قایم فرما دی تہی - اور نہ صرف قایم فرمائی بلکہ اونکے فیض بخش نتایج عالم کو دکہلا دی -

علامہ مصنف کو سب سے اول اونکی قوت دماغی اور جامعیت خیال پر آفرین کہنی چاہیئے کہ اونہون نے فاروق اعظم کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن مین قایم کیا یا بالفاظ دیگر اونکی عظمت کو اصلی ہیئت مین دیکہا - اوسکے بعد مصنف کی بندش و تحسین کی داد دینی چاہیئے - کہ جسقدر عنوان قایم کیے اونکو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتہہ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کر دیا -

اس جلد کے آغاز مین مصنف نے فتوحات فاروقی پر ایک نظر ڈالی ہے اور جن واقعات کو ختم کر آئے ہین اونکو ایک نگاہ سے دیکہا ہے - اول اسباب فتوحات سے بحث کی ہے - اس بحث مین مصنف نے اپنے آپ کو زور طبع کی مدد سے اوس طوفان کے مقابلہ مین قایم رکہا ہے جس مین اکثر ابنائے زمانہ کی رائین بہتی پہرتی ہین - یعنی جو کچہہ یورپ کہے اور سب آمنّا وصدّقنا - اور دعوی یہ کہ ہمنے یورپ سے آزادی خیال و تحقیقات کا سبق حاصل کیا ہے - محقق مصنف نے فتوحات فاروقی کے اون اسباب کی نسبت جو یورپ مین مورخ لکہتے ہین یہ بتایا ہے کہ اونمین طباعی کی ملمع سازی واقعات کے عنصر پر غالب ہے - پہر اپنی رائے کے مطابق اسباب قایم کیے ہین - جو شخص ان دونون بیان اسباب کا موازنہ کریگا وہ مصنف الفاروق کی دقت نظر کا ضرور قائل ہوگا

اس بحث سے فارغ ہوکر حضرت عمر کا اون فاتحین سے مقابلہ کیا ہے جو عالم مین (مثل اسکندر اعظم) مشہور ہین - اور ثابت کر دکہایا ہے کہ ان مین ایک ہی فاتح حضرت فاروق سے برتر اور بہتر فاتح نہ تہا - بحث فتوحات کے بعد سلسلہ انتظام سلطنت کو شروع کرتے ہین - اول نوعیت حکومت سے بحث ہے - کہ خلیفہ ثانی کی حکومت کا انداز شخصی سلطنت کے اصول پر تہا یا جمہوری سلطنت کے - اس بیان مین یہ امر حیرت خیز ہے کہ حضرت عمر کی سی زبردست طبیعت اور نفوذ رائے کا فرمان روا کیسا عام رائے کا قدرشناس اور جمہوری حکومت کے اصول کا پابند تہا اور نہ صرف پابند بلکہ شخصیت اور غلامی رائے کو مٹانے والا اور طبایع کو آزادی رائے کا سبق سکہانے والا تہا -

اسی سلسلہ مین حضرت عمر کی مختلف حیثیتون کی مجالس شوری کے حالات اہم پڑہتے ہین - یہ مجالس اپنے اپنے ارکان اور اپنے اپنے مسائل بحث کے لحاظ سے باہم ممتاز تہین - ان مین بعض ایسی ہی تہین - جن مین رعایا کے قایم مقام طلب کیے جاتے تہے - اور اون سے مشورہ لیا جاتا تہا - اس بیان کی جان یہ ہے کہ خلیفہ کے حقوق کسیطرح عامہ رعایا سے ممتاز نہ تہے - اور اونکی ذات کسی قانونی اثر سے مستثنی نہ تہی - نوعیت حکومت کے بعد انداز حکومت کا بیان ہے - اور اس مین تقسیم ملک - عہدہ داران ملکی - اونکے فرائض کا امتیاز - اونکی تنخواہین - رشوت کے انسداد کے طریقے - اونکے جرایم کی تحقیقات کے لیے کمیشن کا تقرر - ان تمام امور سے مفصل بحث کی ہے -

نظام حکومت کے بعد صیغہ محاصل ہے - اس مین یہ دلچسپ ذکر ہے کہ اس طریقہ خراج کے موجد عرب مین حضرت عمر ہین

اسی ضمن مین عراق۔ شام و مصر کے صوبون کی بندوبست کا ذکر ہے۔ بندوبست کے ذکر مین ہر صوبہ کے جداگانہ اصول بندوبست اقسام اراضی پیداوار کو ملحوظ رکھنے۔ لگان کی شرح مالگذاری کی ترقی۔ اور پیمایش اراضی (۱) اور اوسکی صحت مین امام ابو یوسف کی یہ شہادت کہ اراضی کی پیمایش اس احتیاط سے کی گئی جسطرح ریشمی کپڑا ناپا جاتا ہے) کا مفصل بیان ہے۔ خوبی بندوبست اس سے ثابت کی ہے کہ حضرت عمر کے بندوبست کے بعد افتادہ زمینین آباد ہو گئین۔ اور پیداوار زراعت مین محسوس ترقی ہو گئی۔ اس دیدہ ریزی اور جانکاہی کے بعد بھی فرمان رو کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال صوبہ صوبہ سے دس دس معتمد آدمی دار الخلافہ مین طلب ہوتے اور اوسے چار مرتبہ حلفًا پوچھا جاتا کہ وصول مالگذاری مین رعایا پر سختی تو نہین ہوئی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ بلکہ خوبی انتظام کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ کہ جسقدر خراج عراق وغیرہ صوبون سے حضرت عمر کے بابرکت عہد مین وصول ہوا اوسقدر حجاج کی سختی وصول کرنیکی ناموں کے زمانے کی امن۔ خلیفہ ثانی کے عہد مین محاصل عراق دس کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم تھے۔ حجاج نے ایک کروڑ اٹھ لاکھ وصول کیے۔ اور خلیفہ مامون کے عاملون نے پانچ کروڑ اڑتالیس لاکھ۔ مصر کا خراج آجکل کے حساب سے پانچ کروڑ چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ صیغہ محاصل مین خلیفہ ثانی نے جو اصلاحین فرمائین اور کاشتکارون کے حقوق جسطرح مضبوط کیے اور تعلقہ داری و زمینداری کے قدیم ایرانی طریقہ کو قایم رکھا اوسکا بیان بھی مفصل طور پر ہے۔ صیغہ محاصل کے بیان کا تتمہ یہ ہے کہ ترقی و استحکام زراعت کے واسطے ذرائع آبپاشی مہیا کیے گئے۔ نہرین کھدوائین۔ تالاب کھدوائے۔ بند بنوائے۔ اور اس تمام سلسلہ کو محکمہ کی شکل مین منتظم فرمایا۔ یہانتک کہ پانی کی تقسیم کے رجسٹر تک بنی ہی

سنطوری سے بنوائے۔ علامہ مقریزی کا بیان ہے کہ صرف ملک مصر مین ایک لاکھ بیس ہزار مزدور برابر اس محکمہ مین کام کرتے تھے اور انکے مصارف خزانہ خلافت سے ادا ہوتے تھے صیغہ محاصل کے بعد صیغہ عدالت ہے۔ رومن ایمپائر کے بارہ اصول کارروائی اور حضرت عمر کے قواعد کا موازنہ کیا ہے بسیط طور پر محکمہ عدالت کے جزئیات کی تفصیل لکھی ہے اور جتایا ہے کہ کسطرح انصاف مین مثلًا اصول مساوات مرعی رکھا جاتا تھا حضرت عمر کا جو فرمان اصول عدالت کی نسبت نقل کیا ہے اوس کی عبارت سے ایک موقع پر جو مطلب مصنف نے اخذ کیا ہے وہ ہماری سمجھ مین نہین آتا۔ اصل فرمان کی عبارت یہ ہے۔ واجعل لمن ادعى بينة امدًا ينتهي اليه فان احضر بينة اخذت له بحقه والا وجهت القضاء عليه اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اوسکے لیے ایک میعاد مقرر کرو اگر وہ ثبوت دے تو اوسکا حق دلاؤ ورنہ مقدمہ خارج آگے چلکر اس عبارت سے حسب ذیل دو اصول مستنبط کیے ہین (۶) مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیے (۷) تاریخ معینہ پر اگر مدعی علیہ حاضر نہو تو مقدمہ یکطرفہ فیصل کیا جائیگا۔ معلوم نہین اصول نمبر (۷) کہان سے ماخوذ ہے۔ اس امر کا لحاظ رہے کہ فرمان مذکور کی ماقبل یا مابعد عبارت کو اس اصول سے کوئی تعلق نہین۔

عدالت کے بعد افتا اور افتا کے بعد پولیس فوجداری کا ذکر ہے۔ اس صیغہ مین حضرت عمر کے عرب مین جیلخانہ ایجاد کرنے کا ذکر ہے اون کی خلافت سے پیشتر عرب مین کہین جیلخانہ نہ تھا۔ یہ بھی مذکور ہے کہ عادی مجرمون کو جلاوطنی کی سزا بھی ملتی تھی جو کسی جزیرے کو بھیجدیے جاتے تھے پولیس و فوجداری سے فارغ ہو کر ایک اور اہم صیغہ کا حال مصنف نے بیان

ہے۔یعنی خزانہ اور اوسکے انتظامات ۔ اوسکے افسر مفصلات
خزانون اور خزانون کے مکانون کا مفصل حال تحریر کیا ہے
محکمہ کا ایجاد بھی عرب مین حضرت عمر نے فرمایا۔خزانہ کے بعد پبلک
ڈیپارٹمنٹ ہے ۔ اس مین اون نہرون کے حالات ہین
وہ آبپاشی کے اور اغراض کے لیے تیار ہوئین ۔مثلاً ایک
موسی تھی ، جو دجلہ سے نو میل مسافت طے کرکے بصرے
تی تھی - اور اوس سے وہان کا گلی کوچہ سیراب ہوتا تھا ۔ایک
امیر المومنین کے نام سے مشہور تھی ۔ سنہ ۱۸ھ کے قحط عرب مین
بلا بوجہ بُعد مسافت دیر مین آیا ۔اس لیے رفع قحط کے بعد
ثانی نے وسائل آمدورفت کو زیادہ آسان کرنے کی تدبیر
- دریائے نیل سے ۶۹ میل طویل ایک نہر نکالکر بحر قلزم سے
ح اسطرح جہاز نیل سے سیدھے بحر قلزم مین آجاتے تھے
ت کیسی تعجب کی ہے کہ اسی عہد مبارک مین گورنر مصر نے
عظیم الشان کام کا ارادہ کیا تھا جو انیسوین صدی مین ایک
ں کے ناموَر کے ہاتھ سے پورا ہوا ۔یعنی حضرت عمرو
اص نے نہر کے ذریعے سے بحر روم بحر قلزم کو ملا دینے کا ارادہ
ا ۔نہر کا موقع تجویز کیا گیا پیمایش کی گئی مگر بعض پولٹیکل مصلحتون
، اوسکی تیاری ملتوی رکھی ۔نہرون کے بعد مفید عام عمارتون کا
ہے ۔جنمین دار الامارہ - دفتر - وغیرہ شامل ہین ۔عمارتون
کے بعد سڑکون مین اور سڑکون سے ہم اون شہرون پہنچتے ہین جو
حضرت عمر نے آباد کیے - ان بابون کے ختم ہونے کے بعد فوجی
کا حال ہے ۔ حضرت عمر کے عہد مین اس محکمہ کا وجود ہونا
ولی بات تھی کیونکہ وہ فتوحات کا زمانہ تھا ۔لیکن حیرت خیز وہ
ظام تھا جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر اس محکمہ کا کیا گیا - الفاروق
ن اس صیغہ کے مختلف شعبون اور انتظامون کا بیان پورے
صفحون پر پھیلا ہوا ہے - ملک کو جسطرح فوجی حیثیت سے

حضرت عمر نے تقسیم فرمایا ۔اور مختلف مواقع پر فوج کے صدر
مقامات مقرر فرمائے ۔اونکی تشریح اور اوسکے وجوہ اسباب سے
بسیط و دقیق بحث کی ہے ۔فوجی بارکون ۔فوج کے دفتر ۔
کمسریٹ ۔فوجی چھاونیون ۔بحری قلعون ۔ اسٹاف ہونٹر ۔فوجی
حفظان صحت ۔محکمہ خبر رسانی وغیرہ سبھی باتین تو لکھ ڈالی ہین ۔
یہ امر کیسا دلچسپ ہے ۔کہ حضرت عمر کے جرار لشکر مین برادران زٹ جٹ
بھی شامل تھے ۔سندہ کے جاٹ شہنشاہ فارس کی فوج مین ملازم
تھے جب ایران عرب کے قبضے مین آیا تو یہ فوج بھی حلقہ بگوش ہوئی
اور بصرہ مین آباد کی گئی ۔

اسی موقع پر اصطبل کا بھی بیان ہے ۔ ہر فوجی صدر مقام
کے متعلق بڑے بڑے اصطبل ہوتے تھے جنمین چار چار
ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے ۔اونکے واسطے وسیع و
شاداب چراگاہین ہوتی تھین ۔ داغ کا طریقہ بھی رائج تھا ۔ اس
محکمہ مین یہ ایجاد ہوئی کہ اس سے قبل قبائل عرب نسل کے بارے
مین گھوڑیون کی خوبی اور اصالت کی پروا نہین کرتے تھے حضرت
عمر نے اس پر لحاظ فرمایا اور خالص عربی گھوڑون کے مہیا کرنے
کی ترغیب دی ۔ آج جو لوگ عربی گھوڑون پر سوار ہوتے ہین
اونکو خلیفہ ثانی کے اہتمام کا ممنون ہونا چاہیے ۔ الفاروق کا یہ
حصہ کسی پٹھان مورخ کی قلم کا جولان گاہ بننا چاہیئے تھا ۔ مگر حق
یہ ہے کہ علامہ مصنف نے اس بحث کا بھی پورا حق ادا کیا ہے
ہم کہہ سکتے ہین ۔کہ چونکہ اونکا دماغ برسون حضرت فاروق کے
حالات کی تفتیش مین مصروف رہا ہے ۔ اس لیے اونکے
ہر دم کے صفات کا پرتو اونکے دماغ پر پڑا اور وہ جنگی مطالب اس
خوبی اور صفائی سے لکھ سکے ورنہ ایک مدرسہ کے مولوی کو اس
مضمون کا لکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا ۔

جنگی مُہیب صیغہ کے حالات پڑھکر ہم مذہبی حالات پر پہنچتے

ہین - اوران حالات کی ترقی اور شگفتگی، اُس آشفتگی کو - نع
کرنے والی ہے - جو جنگی حالات سے اعتدال پسند خیالات
مین پیدا ہوتی ہے - اسی سلسلہ مین اشاعت اسلام اوسکے
طریقے اور اوسکے اسباب مسطور ہین جو بیانک شکل قرون
اولی کی اشاعت اسلام کی نسبت غیر مذہب والون کے دماغون
مین غلط فہمی سے جمی ہوئی تھی - اوس کو بہت کچھ بلکہ بالکل پروفیسر
آرنلڈ نے اپنی بیش بہا تصنیف کے ذریعے سے محو کر دیا ہے
تاہم الفاروق سے بھی بہت سی مثالین اسکی تردید کے لیے
ملتی ہین حضرت عمر کا ایک غلام مسلمان نہ تھا - اونہون نے
ہر چند اوسکو اسلام لانے کی ترغیب دی مگر وہ ایمان نہ لایا آخر
خلیفہ ثانی نے مایوس ہوکر فرمایا لا اکراہ فی الدین یعنی دین
کے معاملہ مین کسی پر جبر نہین کر سکتے -

متفرق انتظامات کے سلسلہ مین سب سے مشہور سن ہجری
کا تقرر ہے جو آجتک موافق و مخالف مین رائج ہے - اس ضمن
مین یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ اوس وقت تک عرب مین
دستاویزون پر صرف مہینہ لکھا جاتا تھا - سنہ لکھنے کا رواج
نہ تھا - جس سے حساب کے وقت عجب دقت پیش آتی تھی -
اسی ضرورت نے حضرت عمر کی توجہ تقرر سنہ کیجانب مائل کی -
اسی باب مین یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ محکمہ مردم شماری اور
اوسکا دفتر بھی ایک نئے دو شکل مین قایم تھا -

انتظامات متفرق کے ختم ہونے پر ایک نہایت اہم بحث
شروع ہوتا ہے - یعنی ذمیون کے حقوق جو انصاف پسند
اس مضمون کو پڑھینگے - وہ بے ساختہ بول اٹھین گے کہ اسلام
سے پیشتر اور اسلام کے بعد کبھی کسی قوم نے غیر قومون کو وہ حقوق
نہین دیے جو اسلامیہ قرون اولی مین بخشے گئے - انتہا یہ ہے
ذمی بغاوت کرتے اور برخلاف خلافت سازشین - اسپر بھی

اسلام کا رحم قہر سے مبدل نہوتا - اور سزا دینے مین رعایت کا پہلو
اور رحم کا خیال پیش نظر رہتا شام کے ایک شہر عربسوس کے
باشندے، رومیون سے ساز رکھتے تھے اور ممالک اسلامیہ
کی خبرین اونکو پہنچاتے - خلیفہ ثانی کو اسکے اطلاع ہونے پر
دار الخلافہ سے یہ سزا تجویز ہوئی کہ اونکی جائداد - زمین - اور مویشی
اور جو اسباب ہے سب کی فہرست مرتب کرکے ہر ایک کی دونی
قیمت دیجائے اور ادائے قیمت کے بعد اونسے کہدیا جائے
کہ ہمارے ملک سے باہر چلے جائین - اگر اسپر وہ عذر کرین تو چال چلن
کی درستی کے لیے اونکو ایک سال کی مہلت ملے - مہلت پر معاملہ
شیر اگر خوئے بد کب اور کمان جاتی ہے اونہون نے پھر وہی
حرکت کی اور سال کے ختم ہونے پر جلاوطن کر دیے گئے -
حضرت عمر کے ایک جلیل القدر حاکم نے حمص کے ایک ذمی
سے غصہ مین صرف یہ لفظ کہدیے تھے اخزاک اللہ -
خدا تجھکو رسوا کرے - جب غصہ فرو ہوا تو اس قدر ندامت اونکو
ہوئی کہ دربار خلافت مین اپنا استعفا بھیجا اور وجہ استعفا یہ لکھی
کہ مین ملازم ہوتا نہ یہ حرکت مجھسے سرزد ہوتی - اسی باب مین جزیہ کی
بحث ہے مگر اوسکا حق رسالہ جزیہ مین ادا ہو چکا ہے اس لیے
یہان ہمکو اوسکی نسبت کچھ کہنا نہین ہے -

غلامی کا رواج جن تدابیر سے حضرت عمر نے کم کیا اور غلامو نکو
احرار کے رتبے بخشے اونکو جدا بیان کیا ہے - اور اس بیان مین
ایک وسیع اور عام غلط خیال کی تردید کی ہے - جو حضرت شہر نو
کی نسبت پھیلا ہوا ہے -

حضرت عمر کی اوس صفت کے لیے جو عام طور پر مشہور ہے
(یعنی انصاف و سیاست) علامہ مصنف نے جداگانہ باب باندھا
ہے - اس مین حسرت خیز بیان ہے کہ کسطرح بدون جبر و قہر کے
حضرت فاروق کی وہ ہیبت اعلی سے ادنی تک چھائی ہوئی

تہی۔جس سے تمام سلاطین عالم کے جلال لپیٹ کر دیئے تہے حضرت عمر کے رعب اور انکی دوستان اس راز کی حل کرنے والی ہے کہ اصلی ہیبت اور عظمت اصول انصاف کی پابندی مین ہے۔حضرت عمر نے جو اصول یا قانون جاری فرمایا اول اوسپر اپنے نفس اور اپنے اعزا اور اقربا کو پابند کیا۔کسی قانون کے توڑنے کی سزا اغیار کے لیے ایک حصہ تہی تو اپنی اولاد کے لیے دو حصے۔ اونکی ایسی تعلیم کا اثر تہا۔کہ (جہانتک ہمکو علم ہے) حضرت عمر کی اولاد کے دلمین کبہی خلافت یا حکومت کا خیال نہین سمایا۔حالانکہ اور خلفا کی اولاد اس سے مستثنی نہین رہی۔

ان تمام حالات کے پڑہنے کے بعد خواہ مخواہ دل مین یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔کہ آخر ایک شخص واحد یہ سارے کام کیونکر انجام دیتا تہا۔جب کہ آجکل کی سی آسانی وسائل آمدورفت مین تہی۔ نہ اونکو شائستہ اور آسودہ ملک حکومت کے لیے ملا تہا۔اسیطرح یہ کہ علامہ شبلی بیان کرتے ہین کہ ہر کام وقت پر انجام پاتا تہا۔بڑی مشاغل چہوٹے چہوٹے مشاغل کے اوقات پر دعوی نہین کرسکتے تہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظم کام کرنے کی قوت تعداد رکہتے تہے۔اور اونکا ایک گہنٹہ دوسرے کام کرنے والون کے ہفتون یا مہینون کی برابر تہا۔

امامت واجتہاد کا باب ایسا دقیق وبسیط ہے کہ اوسکو بہی تین اولالی آمزہ پڑہنے سے اوسکا نقشہ ذہن مین آسکتا ہے۔لہذا ہم اوسکے لطف کو بالکلیہ ناظرین الفاروق کے لیے محفوظ رکہتے ہین۔

امامت واجتہاد سے فارغ ہوکر حضرت عمر کے ذاتی حالات لکہے ہین۔اس باب مین اونکے مذہبی زندگی اور عبادات کا حال ہم پڑہتے ہین۔اور دیکہتے ہین کہ خدا تعالے کا ایک بندہ اور فرمان بردار بندہ اپنے فرائض کو اوسی سرگرمی سے ادا کر رہا ہے جو اوسکے واسطے زیبا ہے۔یا بالفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ اوس پاک بندے سے اوسکی قوت ایمانی کا تقاضا وہ عہد سچائی کے ساتھ پورا کرا رہی ہے جو اوسنے اسلام لاکر اپنے مالک حقیقی سے کیا تہا۔جو لوگ اس زمانہ مین مذہب اور اوسکی پابندی سے بہاگتے ہین وہ حضرت عمر کی مذہبی لائف سے یہ سبق حاصل کرسکتے ہین کہ "جسقدر مذہب اسلام کی پابندی کیجائیگی اوسیقدر انسان پاک باطن فیاض اور ہمدرد خلایق بنیگا اور اپنے فرائض کے ادا کرنے کی کوشش کریگا"۔جو لوگ پابندی مذہب کو تنگ خیالی اور درشتی طبیعت کا سرچشمہ مان رہے ہین۔وہ حضرت عمر کے اوس برتاؤ کو دیکہین جو وہ غیر مذہب رعایا سے برتتے تہے۔اور اوس شفقت کے حالات پڑہین جو اونکو غلامون کے حال پر تہی۔اور یہ بہی سن لین کہ حضرت عمر وہ شخص ہین جنکی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اشدہم فی امر اللہ عمر یعنی تمام میری امت مین خدا کے احکام مین سخت تر عمر ہے۔اونکی شدت فرمان برداری یہ تہی کہ اونہون نے اپنی آہنین طبیعت کو خدا تعالے کے احکام کی بجا آوری مین موم سے زیادہ ملایم کرلیا تہا۔جو لوگ ہم مین آجکل اپنے اوہام کے بموجب کارباری بن رہے ہین۔وہ احکام مذہبی کے نہ بجالانے کے لیے کثرت کار کو ایک فاصلہ اور معقول عذر تصور کر رہے ہین۔اور اس غلطی مین پڑے ہین۔کہ نماز وروزہ کی پابندی اون لوگون کا کام ہے یا اونہین سے ہوسکتی ہے جو مذہبی آدمی بنجاہین۔اور دنیا سے کچہہ کام نرکہین۔این لوگون کو حضرت عمر کے مشاغل خلافت اور کثرت عبادت کے حالات ملاکر خود

پڑھنا اور اپنی راے سے پرغور کرنا بیجا نہو گا۔

حضرت عمر کے گونا گون قابلیتون کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ باوجود ایک مدبر مذہبی پیشوا ہونے کے اونکو اشعار کا خاص ذوق تھا۔ ہزارون شعر اونکو یاد تھے۔ شعراے جاہلیت مین سے۔ زہیر وغیرہ کے کلام کی نسبت جو رائین اونہون نے ظاہر فرمائی ہین۔ بڑے بڑے ادیب اونکو آنکھون سے لگاے ہوئے ہین۔ یہ کیسے لطف کی بات ہے کہ شاعری اونکی حق پسند نظر کے سامنے آکر فیض سے محروم نہین رہی۔ جو مخرب اخلاق طریقہ شعراے عرب مین جاری تھا کہ شریف عورتون کا نام لیکر تشبیب قائم کرتے تھے۔ اوسکو حضرت عمر نے ترک کرادیا اسی طرح ہجوگوئی کو جرم قرار دیا۔

سب سے آخر مین اولاد وازواج کا ذکر ہے اور اسپر الفاروق ختم ہوتا ہے۔ صفاتھ مین اون واقعات کی بنا پر جو مذکور ہو چکے۔ اپنے ہیرو کی نسبت مصنف نے راے لکھی ہے اور اوسکا عنوان یہ بلیغ و بے نظیر شعر قرار دیا ہے ؎

لیس من اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

یعنی خدا کی قدرت سے یہ کیا بعید ہے کہ تمام عالم ایک فرد مین سما جائے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمر کی اصلی تصویر دکھانے کی علامہ مصنف نے کوشش کی ہے۔ اور اس مین کچھ شبہ نہین کہ وہ اپنی کوشش مین بہت کچھ کامیاب ہوئے ہین۔ جو لوگ اہل اسلام کا سچا نمونہ اور صفات انسانی کا ایک زبردست مجموعہ دیکھنا چاہتے ہین وہ الفاروق پڑھین۔

اس کتاب کو تمام و کمال پڑھکر مختلف وجوہ سے ہمکو یہ تمنا رہی کہ مسودہ پر مصنف کی ایک نظر اور پڑجاتی تو خوب ہوتا۔

اس موقع پر اگر ہم چند الفاظ الفاروق کی طرز ادا کی نسبت کہین تو شاید بیجا نہو گا۔ الفاروق جس زمانہ کی تصویر ہے وہ اسلام کا مذہبی زمانہ تھا۔ اور اول سے آخر تک جن مسلمانون کا ذکر آیا ہے۔ وہ مقتداے مذہب اور آسمان عظمت کے ستارے تھے۔ متاخرین کی طرز یہ ہے کہ جب ایسے بزرگون کا نام لکھتے ہین تو کچھ مدحیہ کلمات اور دعائیہ فقرے ضرور اوسکے ساتھ ہوتے ہین۔ مذہبی مسائل پر بحث کا ایک خاص اسلوب مقرر ہو چکا ہے جس مین متکلم اپنے خیال کو ایسی پرت آواز مین ظاہر کرتا ہے۔ گویا قعر چاہ مین سے آواز آرہی ہے۔ متقدمین کی روش اس سے جدا تھی۔ صحابہ کرام اور تابعین کے مختصر نام اونکی تحریرون مین آتے ہین بہت ہوا تو سارے بیان مین ایک دو جگہہ رضی اللہ عنہ اونکے نام کے آخر مین لکھدیا۔ لیکن ہر جگہہ نہین۔ جو بات اونکو حق معلوم ہوتی ہے صاف بے لوث کہہ جاتے ہین۔ جو شخص متقدمین کی کتابون کو پیش نظر رکھے اور اونکی طرز تحریر سے آشنا ہو جائے ناممکن ہے کہ اوسکی قلم سے اوسی قسم کی عبارت نہ نکلے۔ الفاروق کی تحریر مین جو آزادی ہے وہ بالکل نہین تو اکثر طرز متقدمین کا پرتو ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ متقدمین متاخرین کے مقابلہ مین کم ادب شناس یا کم تہذیب تھے کم از کم طرز مین عرب اور اسلام کی سادگی تھی۔ یہ سادگی خراسان و ہندوستان کی آب وہوا مین بہت کچھ بدل گئی۔ مخاطب جب واحد ہو خواہ کسی مرتبہ کا ہو تو عرب کے قاعدے کی موجب ضمیر و صیغہ اوسکے واسطے واحد ہو گا۔ ہندوستان کے اہل ادب نے مفرد کی جگہہ عربی مین اس موقع پر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہان یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ عرب اور عربی کا قاعدہ تھا۔ ہماری زبان اُردو کا طریقہ وہ نہین ہے۔ ہم اگر کسی مخاطب کے مقابلہ مین (با استغنا) اپنے چھوٹون کے)

واحد کی ضمیر یا صیغہ استعمال کرین تو یا تذلیل و تحقیر معلوم ہوگی یا
بھاڑیوں کی بولی - اگرچہ کہین کہ تو نے یہ کام نہین کیا - یا مولوی رحیم بخش
آیا تھا - تو اول سے مخاطب کی ذلت اور دوسری سے بدھی
پہاڑیون کی بولی معلوم ہوتی ہے - شرفائے دہلی اپنے سائیس
و نفر کو بھی اس طرح مخاطب نہین کرتے - حیف ہے کہ اہل مطبع
نے اس کتاب پر کچھ رحم نہین کیا - اس کثرت سے غلطیان
ہین کہ طبیعت الجھتی ہے - غلط نامہ ہرگز ان غلطیون کی تلافی
نہین کرسکا - بلکہ باقی ماندہ غلطیون کو گویا غلط نامے نے مضبوط
کردیا -

عربی عبارتین جا بجا غلط ہین - زیادہ افسوسناک نامون کا غلط
چھپنا ہے - الفاروق کی مقبولیت یہی غلط نام زبانون سے
اور قلمون سے نکلوائیگی - اور اسطرح گویا ہمارا لٹریچر غلط ہوتا رہیگا - نقشہ ایسی
بری طرح لگایا ہے کہ جلد بندی پر اوسکا محفوظ رہنا مشکل ہے -
کاش انگریزی کتابون کی طرز پر لگایا جاتا -

الفاروق کی نسبت ہم بہت کچھ لکھ چکے لیکن انصاف یہ
ہے کہ اوسکی عظمت کے مقابلہ مین بہت کم کہا گیا - تاہم ہم نے اپنے
معزز ناظرین کا بہت وقت صرف کیا - ہرج اوقات کی معافی چاہکر
ہم رخصت کے طلبگار ہین - فقط -

(محمد حبیب الرحمن خان شروانی)

شکر

چونکہ آجکل شکر سازی پر بحث ہو رہی ہے اسواسطے شکر کے
متعلق بعض علمی تحقیقاتون کا لکھنا غالباً خالی از نفع اور دلچسپی
نہ ہوگا -

از روئے علم کیمیا کے شکر نام ایک کیموی ترکیب کا ہے

آکسیجن - - - - - - - - - ۴۴ حصہ
ہیڈروجن - - - - - - - - ۴۲ "
کاربن - - - - - - - - - ۴۴ "

یعنی مذکورہ بالا تینون عنصر مذکورہ بالا مقدار سے ملجائینگے تو اوس کا
نتیجہ یا نام شکر ہوجائے گا - گنا، چقندر، انگور، سیب وغیرہ تمام
شیرین نباتی مخلوق کی بابت یہ تحقیق ہوا ہے کہ انکا عمل شکر
کے بنانے مین یہ ہے کہ مذکورہ بالا عناصر مقدار معینہ کے
موافق انکے ذریعے سے ملجاتے ہین - اگرچہ از روئے فن کیمیا کی
کسی شے کے عناصر کا معلوم کرلینا سہل ہے - لیکن اونکا امتزاج
امتزاج دینا قریب بہ محال کے ہے کہ جس سے وہ شے
یا جسم حاصل ہوجائے - ان اجزا معلوم کی ترکیب سے شکر
کا بنالینا بھی سہل نہین ہے لیکن تاہم کیمیاگرون نے اسپر بار بار
کوشش کی ہے اور آخرکار کچھ نہ کچھ کامیابی ہوچکی ہے ۱۸۹۵ع
مین اٹلی کے ایک ماہر کیمیاگر نے جسکا نام ڈیلی گرین ہے
اسمین بہت کچھ کامیابی حاصل کی -

اوس نے اول چند ڈاکٹرون سے ایک مسامدار پتھر مین
(جسکا اب مصنوعی چقندر نام ہوگیا ہے) نالیون کی مانند ادہر
اودہر سے یعنی مختلف سمتون سے سوراخ کرکے اوس پتھر کو
لوہے کے مضبوط خول مین بند کیا اور پھر ان نالیون مین (۸ حصہ
کاربونک ایسڈ گیس - اور (۴ حصہ) پانی کا ہائیڈریٹ آف ہیڈروجن
گیس داخل کرکے پانی کی بھاپ کو داخل کیا - ان اجزا کے اندر
داخل ہونے سے کیموی امتزاج حاصل ہوا اور پانی میٹھا ہوکر
(شربت بنکر) نکلنے لگا -

ڈیلی گرین نے اس مین یون تبدیلی کی ہے - کہ مسامدار پتھر
کو اول ڈرائیوٹ سلفیورک ایسڈ (سرکہ) ہوتا ہے او سکے بعد
(پانی کلوریٹ آف پلاٹینم) کے اندر جوش دیکر ایک گھنٹہ

اوسمین پڑا رہنے دیتا ہے جب اسطرح بلاٹینم کا اثر پتھر کے مسامات میں ہوجاتا ہے تو اوسکے بعد مذکورۃ الاول طریقہ سے کاربانک ایسڈ گیس وغیرہ کو داخل کرتا ہے اور نتیجہ میں کامیابی حاصل کرتا ہے مذکورہ بالا عناصر کا شکری امتزاج کی میزان اسطرح حاصل ہوجاتی ہے۔

۸ حصہ (کاربونک ایسڈ گیس) =	ک ۸		آ ۱۶	※
۴ حصہ (پانی کا بینٹ آف ہیڈروجن) =	ک ۱۶	ھ ۱۶		
۶ حصہ (پانی کے بخارات)		ھ ۶	آ ۶	
میزان	ک ۲۴	ھ ۲۲	آ ۲۲	

جو کیمیاگر اس طرف متوجہ ہین اونکا بیان ہے کہ کامیاب ہوجانے کے بعد صرف ہوا سے شکر تیار ہو سکے گی یعنی مذکورہ بالا تمام اجزا ہوا سے حاصل کیے جائینگے اور اونسے شکر ترکیب دیجائے گی ایک طرف تو کیمیاگر لوگ شکر سازی کی طرف اسطرح یورپ مین متوجہ ہین۔ اور دوسری طرف دوسرا گروہ یہ تجویز کررہا ہے کہ جب تک ہوا سے شکر بنے اوسوقت تک دوسری نباتی مخلوق سے شکر بنانی چاہئے۔ چنانچہ یہ قرار دیکر کہ تمام درختون، پھلون کے چھلکون مین شکر، بہ صورت نشاستہ موجود ہے بُھس (گیہون جو کا بھس) مین سے شکر نکالنے کی کوشش کررہے ہین اور اوسمین کامیابی ہورہی ہے۔

(محمد اسمعیل)

طبیب حافظہ

مولوی سید عبدالعلیٰ خان رضوی اتالیق صاحبزادگان آنریبل راجہ امیر حسن خان بہادر والی ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور نے اس نام کی ایک کتاب (۳۴۸) صفحہ کی حال مین تصنیف کی ہے یہ کتاب ایسی ضروری اور مہتم بالشان مضمون پر لکھی گئی ہے جس پر توجہ کرنا حامیانِ تعلیم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ روشن ضمیر مصنف نے ایک بالکل جدید موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر اُردو زبان مین کوئی کتاب آج تک نہین لکھی گئی اور وہ موضوع یہ ہے کہ عُجُب ویگر دماغی قوتون کیطرح حافظہ کی قوت عمدہ تربیت سے ترقی پاسکتی ہے تو وہ کونسی تدبیرین ہین۔ جن سے اس قوت کا نشو و نما ہو۔" چونکہ اس کتاب کا مضمون ہر شخص کے لیے نہایت کارآمد اور مفید ہے اس لیے ہم اس کے اہم اور ضروری مضامین کا خلاصہ ذیل مین درج کرتے ہین۔

مصنف نے سب سے اول حافظہ کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کیون اور کن اسباب سے کوئی واقعہ ہمین یاد رہتا ہے اور اس قوت مین کسقدر ترقی کی قابلیت ہے۔ پھر اصل مضمون کو شروع کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حافظہ خیالات کا خزانہ ہے۔ خیالات دو قسم کے ہین۔ (۱) مانوس (۲) غیر مانوس پہلی قسم مین وہ تمام خیالات داخل ہین جنکو ذہن کے ایسے خیالات سے تعلق ہو کہ اگر اُنمین سے ایک یاد آجائے تو ابتدائی اور اصلی خیال ذہن مین فوراً تازہ ہوجائے۔ مثلاً کسی کا نام سنتے ہی اسکی شکل وشباہت۔ عادات و خصائل اور اُسکی تمام باتین یاد آجاتی ہین دوسری قسم سے وہ خیالات مراد ہین جو پہلے ذہن مین نہ گذرے ہون اور نہ کسی ایسی چیز سے مشابہ یا متعلق ہون جنکو ہم نے پہلے دیکھا یا سنا ہے۔ مانوس خیالات جلد یاد ہوجاتے ہین۔ چونکہ ہندستانیون کو انگریزی نام اور انگریزون کو ہندوستانی نام غیر مانوس معلوم ہوتے ہین اس لیے انکو انگریزی تاریخ کا یاد کرنا اور اونکو ہماری تاریخ کا یاد کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جن خیالات کو یاد رکھنا منظور ہے اُن کا ابتدائی

※ک علامت ہے کاربن کی۔ آ علامت ہے آکسیجن کی۔
ھ علامت ہے ہیڈروجن کی۔

نقش گہرا اور قوی ہوتا چاہیئے تاکہ پھر فراموش نہ ہو سکے - دو خیال جن پر ایک ساتھ غور کی جائے ایسے مل جاتے ہین کہ اُن مین سے ایک خیال دوسرے کو فوراً یاد دلاتا ہے - ایک جلسہ مین چند اشخاص غدر سنہ ستاون کا ذکر کر رہے تھے - حاضرین مین سے ایک شخص نے پوچھا کہ تخت طاؤس کے بنانے مین کسقدر روپیہ صرف ہوا ہوگا - اگرچہ یہ سوال بظاہر بے محل تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ غدر سنہ ستاون کے ذکر سے اُس کا خیال نادر شاہ کے زمانہ کے واقعات قتل و غارت کیطرف منتقل ہوا - اور چونکہ مشہور ہے کہ نادر شاہ تخت طاؤس کو اپنے ساتھ ایران لیگیا تھا اسلیے یہ سوال اِس سلسلہ سے پیدا ہو گیا اور بے موقع نہین تھا - کوئی خیال تنہا یاد نہین آتا جب تک کہ اسکے ساتھ کا دوسرا خیال یاد نہ آجائے یہی سبب ہے کہ بعض باتون کو یاد کرتے مین دقت پیش آتی ہے اور جب تک کوئی ایسی بات یاد نہین آتی جسکو دوسری بات سے تعلق ہے اُس وقت تک دوسری بات ذہن مین نہین آتی -

اسکے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ خیالات گذشتہ کو با آسانی یاد کرنا دو باتون پر منحصر ہے (۱) غور کرنا (۲) خیالات کا باہمی تعلق غور کی نسبت جو بحث کی ہے اوسمین بیان کیا ہے کہ کسی بات کی یاد کرنے مین جسقدر توجہ اور غور سے کام لیا جائے گا اسیقدر گہرا نقش ذہن مین پیدا ہوگا اور اُس کا خیال اسی قدر ذہن مین دیرپا ہوگا - بعض دفعہ بلا ارادہ خود بخود توجہ پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن مین گہرا نقش بن جاتا ہے مثلاً کوئی حادثہ دیکھکر خود بخود ذہن اسکی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اوسکا خیال ہمیشہ ذہن مین موجود رہتا ہے - اسکے بعد غور کرنے کی تدبیر بتائی ہے اور لکھا ہے جو چیز آنکھون سے دیکھ لی جائے وہ دیر تک یاد رہتی ہے اسی بنیاد پر ابتدائی تعلیم کی کتابون مین جانورون اور درختون کی تصویرین بنا دیجاتی ہین - اگر مجسم صورتین آنکھون کے سامنے لائی جائین تو اُن کا خیال اور بھی دیرپا ہوتا ہے - چنانچہ اسی بنا پر جرمن مین وہ طریقہ تعلیم جاری ہوا ہے - جسکو کنڈر گارٹن کہا جاتا ہے اور جس مین مجسم مورتون کی ذریعہ سے بچون کو تعلیم دی جاتی ہے - بجائے تصویرون اور مجسم مورتون کی اگر اصلی چیزین ایک دو مرتبہ نظر سے گذر جائین تو پھر اُن کا خیال ذہن سے کبھی محو نہین ہوتا آنکھون سے دیکھنے کے بعد کانون سے سننے کا درجہ ہے اور اِس ذریعہ سے بھی خیالات کا ذہن مین محفوظ رہنا ممکن ہے اگر دیکھنا اور سننا دونون کے ذریعہ سے کسی خیال کو ذہن مین جگہ دیجائے تو وہ بہت زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے - یہی سبب ہے کہ کسی کتاب کو دیکھکر بلند آواز سے پڑھنا حافظہ کے لیے بہت بڑی مدد ہے اور الفاظ کو دیکھنے اور اُنکی آواز کانون سے سننے کے بعد کتاب کی عبارت کا یاد کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے اسی طرح اگر دو کی جگہ کئی حواس سے کام لیا جائے تو وہ خیال جسکو ہم یاد کرنا چاہین ذہن مین نہایت دیرپا ہو جاتا ہے -

غور کرنے کے لیے دماغ کا صحیح ہونا ضروری ہے - بیمار - تھکا ہوا اور پژمردہ طبیعت کا آدمی کچھ بھی یاد نہین کر سکتا بلکہ وہ جتنی کوشش یاد کرنے کی کرتا ہے اُسیقدر اُس کا دماغ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے - یاد کرنے کے وقت اور طرف توجہ نہ کرنی چاہیئے - بلکہ جس بات کو یاد کرنا منظور ہے - ہمہ تن اسکی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے - پھر خیالات کے باہمی تعلق پر بحث کرکے بتایا ہے کہ وہ خیالات اچھی طرح ذہن نشین ہوتے ہین جن مین کسی طرح کا باہمی تعلق ہو - اس تعلق پر غور کرنے سے وہ خیالات فوراً یاد ہو جاتے ہین - مثلاً دو خیالون پر غور کرو کہ اُن مین کن باتون مین اختلاف ہے اور کن باتون مین مشابہت ہے - اگر کوئی ظاہری تعلق نہ معلوم ہو تو غور کرنے سے ایک نہ ایک اتفاقی تعلق نکل آئے گا چنانچہ جن خیالات مین مشترک صفات ہو نگے

جن میں ذرا سا بھی لفظی یا معنوی تعلق ہوگا۔ اُسپر غور کرنے سے وہ خیالات یاد رہ جائیں گے۔ مثلاً برف اور اولا۔ پھل۔ پھول۔

چار اصول ہیں جنکے ذریعہ سے خیالات میں باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے (۱) قربت زمانی و مکانی (۲) تشابہ (۳) تقابل (۴) علت و معلول۔ پہلے اصول سے یہ مراد ہے کہ دو واقعات ایک وقت میں یا ایک مقام میں واقع ہوں۔ تشابہ اور تقابل سے مراد یہ ہے کہ دو چیزوں میں باہم مشابہت ہو یا وہ ایک دوسرے کی ضد ہوں علت و معلول سے یہ مراد ہے کہ اُن میں سے ایک واقعہ دوسرے واقعہ کو پیدا کرتا ہو — ان چار قسم کے قدرتی تعلقات پر اگر وہ خیالات کے درمیان موجود ہوں غور کرنے سے وہ خیالات جلد تر یاد ہو جائیں گے۔

اسکے بعد مصنف نے حفظ کرنے کے چار عام قاعدے بیان کیے ہیں۔

(اول) جس مضمون کو یاد کرنا چاہو اُسکا ذہن پر بہت گہرا نقش بنانے کی کوشش کرو۔

(دوم) خیالات میں تعلق پیدا کرنے کے وقت اُن کا باہم مقابلہ کرو۔

(سوم) دو چیزوں سے زیادہ کا کبھی ایک وقت میں مقابلہ نہ کرو۔

(چہارم) جن دو خیالوں میں کسی طرح کا تعلق نہ ہو اُن میں ایک ایسے خیال سے تعلق پیدا کرو جسکو دونوں سے لگاؤ ہو۔ مثلاً بادبان اور آسمان میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر سمندر کا لفظ ایسا ہے کہ ان دونوں میں تعلق پیدا کر سکتا ہے کیونکہ بادبان کو سمندر سے علاقہ ہے۔ اور سمندر کو آسمان سے۔

اس سے آگے چلکر مصنف نے مانوس اور مربوط الفاظ کے یاد کرنے کے قاعدے بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مثلاً ان الفاظ کا یاد کرنا منظور ہے۔ گھاس۔ باغ۔ دیوار۔ دروازہ۔ مکان۔ رستہ۔ شہر۔ آگرہ۔ تاج گنج۔ شاہ جہان۔ قیدخانہ۔ اورنگ زیب۔ تعصب۔ نفاق۔ کمزوری۔ زوال۔ اگر یہ الفاظ رٹ کر یاد کیے جائیں تو بہت سا وقت بھی صرف ہوگا اور کسی نہ کسی لفظ کے بھول جانے کا احتمال بھی باقی رہیگا۔ پس ہمکو بموجب قواعد بالا کے ان الفاظ کے باہمی تعلق پر غور کرنا چاہیے مثلاً جب خیال کروگے کہ گھاس باغ میں ہوتی ہے۔ باغ کے گرد دیوار ہے۔ دیوار میں دروازہ ہے۔ دروازہ۔ مکان کا ضروری جز ہے۔ مکان میں دروازہ کے رستہ سے جاتے ہیں۔ شہر میں بھی رستے ہوتے ہیں۔ ایک شہر آگرہ بھی ہے۔ آگرہ میں تاج گنج ہے۔ تاج گنج کو شاہ جہان نے بنوایا۔ شاہ جہان کا قیدخانہ میں انتقال ہوا۔ شاہجہان کو اورنگ زیب نے قید کیا تھا۔ اورنگ زیب متعصب تھا۔ تعصب باعث نفاق ہوتا ہے۔ نفاق باعث کمزوری۔ کمزوری باعث زوال۔ اسطرح ان سب الفاظ میں تعلق پیدا ہو گیا۔ اور اس تعلق پر غور کرنے سے یہ تمام الفاظ بآسانی یاد رہ سکتے ہیں۔

اس قسم کی متعدد مثالیں درج کرنے کے بعد غیر مربوط الفاظ کو یاد کرنے کے قاعدے بیان کیے ہیں اور وہ حسب ذیل تین قاعدے ہیں۔

(اول) غیر مربوط الفاظ میں فرضی تعلق پیدا کرو اور اسکی ذہنی تصویر فرض کرو مثلاً گھوڑا۔ آسمان ان دو الفاظ کو یاد کرنے کے وقت خیال کرو کہ ایک گھوڑا آسمان تک اُڑ گیا۔ یا مثلاً گھوڑا۔ کاٹھ پل۔ کرتا۔ کانٹا۔ کتاب۔ ان الفاظ کی نسبت ذہنی تصویر اسطرح بناؤ کہ ایک گھوڑا۔ کاٹھ کے پل پر جاتا ہے۔ دوسری طرف سے ایک آدمی آرہا ہے۔ اُسکے بدن میں کرتا۔ ایک ہاتھ میں کانٹا دوسرے ہاتھ میں کتاب ہے۔

(دوم) اگر تمہین کچھ اشعار یاد ہون تو اُن کو غور سے دیکھو کہ اُنمین
ایسے الفاظ موجود ہین یا نہین جنکو اُن الفاظ سے کسی طرح کا تعلق
ہے جنکو تم یاد کرنا چاہتے ہو۔ اس صورت مین اُن اشعار کے
پڑھتے ہی وہ الفاظ فوراً یاد آجائینگے مثلاً ضعیف ۔ دوا۔ موت
شہر سودا یہ الفاظ ہین جو تمہین یاد کرتے ہین ۔ اب مسدس
حالی کے اس بند پر جو تمہین یاد ہے ۔ یا یاد کرسکتے ہو غور کرو ؎

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہین کیا کیا
کہا دکھ جہان مین نہین کوئی ایسا دوا جسکی خالق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھین
کہے جو طبیب اسکو ہذیان سمجھین

یہ تصور کرو کہ بقراط ایک ضعیف آدمی تھا مرض کے لیئے
دوا کی ضرورت ہوتی ہے مہلک وہ مرض ہے جو باعث موت ہو
جاتے ہین ہزارہا شہر ہین ۔ ہذیان وہ لوگ بکتے ہین جنکو سودا ہوجاتا
ہے ۔

(سوم) دو غیر مربوط الفاظ کے درمیان ایک یا زیادہ الفاظ سے
کوئی تعلق پیدا کرو ۔ مثلاً کباب اور توشک خانہ ۔ اب ایسا لفظ تجویز
کرو جو دونون الفاظ سے لگاؤ ہو جیسے باورچی خانہ ۔ باورچی خانہ کو کباب سے
تعلق ہے اور باورچی خانہ اور توشک خانہ ایک مکان کے حصّون
کے نام ہین ۔

اسکے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ جب ایسے لفظ
یاد کرنے ہون جو محض نامانوس ہون مثلاً غیر زبان کے الفاظ ۔
شہرون اور ملکونکے نام ۔ تو اس صورت مین چاہیئے کہ نامانوس
الفاظ مانوس بنائے جائین ۔ مثلاً اپنی زبان مین ایسے الفاظ
تلاش کرو جو نامانوس الفاظ سے ہم آواز یا قریب التلفظ ہون
اور اس تعلق پر غور کرو ۔ مثلاً پرسٹن کو پرستان کے ساتھ
اٹلس کو اطلس اور پیریس کو پارس کے ساتھ یاد کرو ۔

یہ ترکیب جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کے یاد کرنے مین بہت کارآمد ہے
تاریخ مین اکثر سنون کے یاد کرنے مین سخت دقت ہوتی ہے
اسکی ترکیب یہ ہے کہ اگر بعض مشہور واقعات کے سنہ یاد ہون
تو اُن مین اور غیر مشہور واقعات کے سنون مین تعلق پیدا کرو ۔ مثلاً
ایک شخص سنہ ۱۸۵۷ء مین پیدا ہوا ۔ تو غدر کا واقعہ سنہ ولادت
کے یاد رہنے سے یا سنہ ولادت غدر کا مشہور سنہ یاد رہنے
سے یاد آسکتا ہے یا سنون مین سو سو برس کا فرق کرکے ایک
خفیف مشابہت پیدا کرو ۔ مثلاً سنہ ۱۸۵۷ء مین غدر ہوا ۔
سنہ ۱۷۵۷ء مین جنگ پلاسی ہوئی سنہ ۱۶۵۷ء مین عالمگیر نے شاہ
جہان کو قید کیا ۔ یا اسطرح کی مشابہت پیدا کرو ۔ مثلاً سنہ ۱۵۵۵ء
سنہ ۱۶۶۶ء ۔ سنہ ۱۸۸۸ء ۔ سنہ ۱۷۷۷ء ۔ ان سنون مین تین تین
ہندسے یکسان ہین ۔ یا دو دو ہندسون کی مشابہت پیدا کرو
مثلاً سنہ ۱۲۸۸ء ۔ سنہ ۱۳۸۸ء ۔ سنہ ۱۴۸۸ء وغیرہ ۔ ان سنون کی
مدد سے بہت سے سنہ جو ان سے ایک سال قبل یا بعد
کے ہون بآسانی یاد رہ سکتے ہین ۔ دو ملکون کی تاریخ ایک
ساتھ پڑھتے ہو تو ایسے واقعات بالمقابل جمع کرلو جو ایک سنہ
مین دونون ملکون مین واقع ہوئے ہون ۔

چونکہ اعداد کی مقابلہ مین الفاظ آسانی سے یاد ہوجاتے ہین
اس لیے ابجد کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری تھا ۔ یہ تو معلوم ہے کہ
اسی بنا پر تاریخی نام رکھے جاتے ہین ۔ ولادت ۔ موت ۔ شادی
اور دیگر تاریخی واقعات کے سنہ بتلانے کے لیے ایسے
مصرع بنائے جاتے ہین جنکی حروف بحساب ابجد ہم عدد اُن
واقعات کے سنون کے ہوتے ہین مگر ہر شخص کے لئے با معنی الفاظ
یا جملون یا مصرعون کا بنانا جو واقعات سے مشابہت رکھتے
ہون مشکل ہے اسلیے مصنف نے اس موقع پر ایک
نئی ابجد کا ذکر کیا ہے ۔ اور وہ یہ ہے ۔

زذظض - - - - - - - - - - صفر

ت ٹ دڈط - - - - - - - - - ۱

خ ن - - - - - - - - - - ۲

م - - - - - - - - - - - ۳

رڑژ - - - - - - - - - - ۴

ل ح ہ - - - - - - - - - ۵

ج چ ش - - - - - - - - - ۶

ق ک گ - - - - - - - - - ۷

ث س ص غ ف - - - - - - - ۸

ب پ - - - - - - - - - - ۹

حروف علت ا - و - ی کی کوئی قیمت نہین ہے - محض الفاظ کے بنانے مین کام آتے ہین - ع اور ہ اردو مین الف کی ہم آواز ہین اسلیے اُن کی بھی کوئی قیمت نہین ہے - مشدد حروف مفرد حروف کیطرح خیال کئے جاینگے یعنی بجاے دو حرفون کے ایک حرف کے عدد لیے جائینگے چونکہ مشہور تاریخی واقعات اکثر سنہ ا کے بعد واقع ہوئے ہین اسلیے اگر (۱۰۰۰) کو حذف کردیا جائے تو الفاظ کے بنانے مین آسانی ہوگی - جن الفاظ سے تاریخ نکلتی ہو اونکے اول کے تین حروف صحیح کی قیمت لی جائیگی - مثلاً (مضامین) مین م - ض م کی قیمت لی جائیگی - حروف علت ا - و - ی اور خفیف (ق) بیکار سمجھے جائینگے - ذراسی مشق کرنے کے بعد اس ابجد کی مدد سے اعداد سے الفاظ اور الفاظ سے اعداد بآسانی بن سکتے ہین - الفاظ سے اعداد اسطرح بن سکتے ہین مثلاً

(جلال) ج - ۶ ل - ۵ ل - ۵ ∴ جلال - ۶۵۵

(گرگ) گ - ۷ ر - ۴ گ - ۷ ∴ گرگ - ۷۴۷

(فلک) ف - ۸ ل - ۵ ک - ۷ ∴ فلک - ۸۵۷

(مرکز) م - ۳ ر - ۴ گ - ۷ ∴ مرکز - ۳۴۷

اسی طرح اعداد سے الفاظ تیار ہوسکتے ہین مثلاً

۶۱۵ = ج - چ - ش - ۶	ان ہندسون کے مقابل
د - ت - ط - ٹ - ڈ - ۱	کے حروف لیکر حروف علت
ا - ل - ح - ۵	بڑھاؤ گے تو ذیل کے مختلف

الفاظ پیدا ہونگے -

جدہ - جدول - جادہ - جداول وغیرہ ان مین سے جس لفظ کو ہم مناسب موقع خیال کرین لے سکتے ہین -

اسیطرح ۵۷۳ سے نقل - نقال - نقلی - نکیل وغیرہ الفاظ بن سکتے ہین - چونکہ ایک سنہ کے اعداد سے کئی الفاظ بن سکتے ہین - اسیلئے واقعہ کی مناسب لفظ منتخب کرنے مین کوئی وقت نہ ہوگی اور جب واقعہ کے مناسب الفاظ بن گیے تو وہ واقعات جلد یاد ہو سکتے ہین - مناسب واقعہ لفظ کا ایک مختصر سا جملہ بناکر دو تین مرتبہ اوس جملہ کو پڑھو گے تو وہ ازبر ہوجاے گا - مثلاً امریکہ سنہ ۱۴۹۲ء مین دریافت ہوا تھا - اس سنہ کے لیے مطابق ابجد بالا کے الفاظ خبر - ضبیر - اخبار - انبار وغیرہ بن سکتے ہین - ان مین سے لفظ خبر کو اختیار کرکے یہ فقرہ تیار کرلو "اول کلمبس نے امریکہ کی خبر دی" اس قاعدہ کے عمل مین لانے کے لیے تھوڑی سی مشق درکار ہے - اسکے بعد تاریخ کے ہزارہا سنہ - جغرافیہ کے طول و عرض و آبادیان - علم کیمیا و برق کے فارمولے بآسانی یاد ہو سکتے ہین -

مصنف نے اسکے بعد ایک عجیب نقشہ معین حافظہ کے نام سے درج کیا ہے جس مین (۱۰۰) خانے ہین اور ہر خانہ مین ایک لفظ لکھا ہوا ہے جسکے عدد ہر خانہ کی نمبر شمار کے موافق ہین - اسکی نسبت دعوی کیا گیا ہے کہ اگر اس

نقشہ کی الفاظ ترتیب وار مع انکی اعداد کو ازبر کر لیے جائیں تو لا تعداد الفاظ کی ایک کثیر تعداد ایک مرتبہ سنکر یاد ہو سکتی ہے جن کو کوئی باہمی تعلق نہ ہو اور وہ نقشہ سے

آواز

آم - - - ناؤ - - - آٹا
٣ ٢ ١
چاپے - - آلو - - - آرا
٦ ٥ ٤
آب - - - ادس - - - آگ
٩ ٨ ٧

زید ١٠

مٹی - - - خط - - - ٹاٹ
١٣ ١٢ ١١
شادی - - - لٹھ - - - رات
١٦ ١٥ ١٤
بوٹ - - - سوت - - - گیت
١٩ ١٨ ١٧

زن ٢٠

میخ - - - خوان - - - تن
٢٣ ٢٢ ٢١
جن - - - آہن - - - رن
٢٦ ٢٥ ٢٤
بن - - - سان - - - کان
٢٩ ٢٨ ٢٧

عظیم ٣٠

موم - - - شیام - - - آدم
٣٣ ٣٢ ٣١
جام - - - مسلم - - - روم
٣٦ ٣٥ ٣٤
بام - - - سام - - - قوم
٣٩ ٣٨ ٣٧

زور ٤٠

سور - - - غار - - - تار
٤٣ ٤٢ ٤١
چور - - - حور - - - روڑا
٤٦ ٤٥ ٤٤
بیر - - - غار - - - گور
٤٩ ٤٨ ٤٧

زال ٥٠

مولی - - - نیل - - - ڈول
٥٣ ٥٢ ٥١
جال - - - لعل - - - ریل
٥٦ ٥٥ ٥٤
پل - - - سولی - - - گال
٥٩ ٥٨ ٥٧

روح ٦٠

موشس - - - اناج - - - تاج
٦٣ ٦٢ ٦١
چچا - - - لاش - - - رشی
٦٦ ٦٥ ٦٤
باجا - - - غل - - - کلج
٦٩ ٦٨ ٦٧

زکی ٧٠

سکا - - - ناک - - - طاق
٧٣ ٧٢ ٧١
چاک - - - حق - - - رگ
٧٦ ٧٥ ٧٤
باگ - - - ساگ - - - کاگ
٧٩ ٧٨ ٧٧

زاغ ٨٠

موسی - - - ناف - - - داغ
٨٣ ٨٢ ٨١
جالس - - - السی - - - روس
٨٦ ٨٥ ٨٤
بلغ - - - صف - - - قاف
٨٩ ٨٨ ٨٧

عذاب ٩٠

دمابائی - - - خواب - - - توپ
٩٣ ٩٢ ٩١
شیو - - - لب - - - راب
٩٦ ٩٥ ٩٤
پ - - - سیب - - - قاب
٩٩ ٩٨ ٩٧

اب فرض کرو کہ چند الفاظ ہین مثلاً کتاب - دنیا - دروازہ - تماشا - وکیل - وغیرہ جن کے درمیان کوئی تعلق نہین ہے اونکو ترتیب وار یاد کرنا منظور ہے - نقشہ مین پہلا لفظ (آواز) ہے جسکی قیمت صفر ہے اسیلئے ترتیب و شمار مین اس سے کام نہین لیا جا سکتا - وہ لفظ جسپر پہلا نمبر ہے - (آٹا) ہے اور یاد کردنی الفاظ مین پہلا لفظ (کتاب) ہے - اب کتاب اور آٹا ان دونون لفظون کے درمیان کسی قسم کا تعلق پیدا کرو - مثلاً خیال کرو کہ آٹے پر ایک کتاب رکھی ہوئی ہے - ہمارا دوسرا لفظ (دنیا) ہے اور نقشہ کا دوسرا لفظ (ناؤ) ہے انمین بھی کوئی تعلق پیدا کرو مثلاً تصور کرو کہ ایک ناؤ اتنی بڑی ہے کہ اسمین تمام دنیا آگئی ہے - اسی طرح الفاظ دروازہ اور تماشا اور وکیل کو الفاظ آم - آرا - آلو کیساتھ ترتیب وار ملا کر خیال کرو کہ ہمارے دروازہ پر آم کا درخت ہے - ایک گلی مین جہان آرا چل رہا ہے - وہین بندر کا تماشا ہو رہا ہے ایک وکیل بازار مین آلو خرید رہا ہے -

اگر تم نے یہ تصور غور سے کیا ہے اور نقشہ معین حافظہ اچھی طرح ازبر ہے تو نقشہ کا لفظ آٹا تمہین فوراً کتاب کو یاد دلائیگا ناؤ کا لفظ دنیا کو - آم کا لفظ دروازہ کو - آرا - تماشے کو - آلو - وکیل کو - الفاظ کی بڑی سے بڑی تعداد اسطرح یاد ہو سکتی ہے اس نقشہ کے ذریعہ سے اگر وہ اچھی طرح محفوظ ہو - ہم بتا سکتے ہین کہ یاد کردنی الفاظ کی فہرست مین مثلاً پانچوان لفظ کونسا ہے چھبیسوان کونسا ساٹھوان کونسا -

اس نقشہ کی مدد سے پوری کتاب اسطرح ازبر ہو سکتی ہے کہ کتاب کے ہر صفحہ پر ایک لفظ ایسا تجویز کرو جو پورے صفحہ کا مضمون یاد دلا سکے - پھر ہر صفحہ کے نمبر کو نقشہ کے نمبر مین دیکھو اور اُس نمبر کے لفظ اور صفحہ کے لفظ مین ایک ذہنی تعلق قائم کرو - مثلاً ایک کتاب کے صفحہ (۸۰) پر (ترقی) کا لفظ ایسا ہی جو اُس صفحہ کے پورے مضمون کو ضرورت کے وقت یاد دلا سکتا ہے - اب نقشہ مین (۸۰) کا نمبر دیکھو اسمین (زاغ) کا لفظ لکھا ہوا ہے - ان دونون لفظون مین تعلق پیدا کرو - مثلاً اسطرح کہ زاغ یعنی کوّے مطلق ترقی نہین کرتے - کتاب کے صفحہ (۲۶) پر مخلوق کا لفظ ہے - نقشہ کے چھبیسوین خانہ مین (جن) کا لفظ ہے - اب دونون مین تعلق پیدا کرو - مثلاً اسطرح کہ جن بھی ایک مخلوق خدا ہین - اسیطرح ہر صفحہ کے لفظ کو نقشہ کے لفظون سے ملا کر ترتیب وار جملے بناتے جاؤ تو نقشہ کا ہر لفظ کتاب کے خاص صفحہ اور اوسکے خاص لفظ کو یاد دلائے گا - اور وہ خاص لفظ اس صفحہ کے مضمون کی پوری تصویر تمہارے ذہن مین کھینچ سکیگا - اس نقشہ کے ذریعہ سے اعداد کے لمبے سے لمبے سلسلے باآسانی ازبر ہو سکتے ہین - مثلاً یہ سلسلہ تعداد ہمکو یاد کرنا ہے -

(۳۱۴۱۵۹۲۶۵۳۵۸۹۷۹۳۲۳۸۴۶۲۶۴۳۳۸۳۲۷)

اس سلسلہ کے بائین طرف سے دو دو ہندسے لیتے جاؤ - اور نقشہ مین اُن ہندسون کو دیکھکر الفاظ لیتے جاؤ اور اُن الفاظ کو نقشہ پر ترتیب وار مطابق کرتے جاو - اور ان سے جملے بناتے جاؤ - مثلاً پہلے دو ہندسے بائین طرف کے (۳۱) ہین - نقشہ مین (۳۱) کے خانہ مین (آدمی) کا لفظ ہے اب چونکہ (۳۱) ہمارے سلسلہ کا پہلا زوج ہے - اسلیئے نقشہ کے پہلے خانہ کے لفظ (آٹا) سے اسکو ملاؤ اور تصور کرو کہ ایک آدمی آٹے کی گٹھری سر پہ لیے جاتا ہے - دوسرے دو ہندسے بائین طرف کے (۴۱) ہین - نمبر (۴۱) کے خانہ مین (تار) کا لفظ ہے اسکو نقشہ کے دوسرے خانہ کے لفظ (ناؤ) سے ملاؤ اور خیال کرو کہ ایک ناؤ تارون سے بھری ہوئی دریا مین جا رہی

سے ہے۔ تیسر (ربع (۵۹) سے ہے۔ نقشہ کے اسی بہر کے خانہ مین (بل) کا لفظ ہے۔ اسکو نقشہ کے تیسرے لفظ (آم) سے ملا دو اور یون تعلق قایم کرو کہ پل پر بہت سے آم بکھرے ہوتے ہوں۔ اسی طرح کل سلسلہ کے الفاظ بنا کر باسانی یاد کر سکتے ہین۔

اسکے بعد مصنف نے اس امر پر بحث کی ہے کہ نظم بہ نسبت نثر کے جلد یاد ہو جاتی ہے اور چیاسٹھ اشعار لکھے ہین جن مین تاریخ ہند کے مشہور واقعات کے سنہ جدید ابجد سے نکالکر نظم کر دیے ہین۔ اخیر مین لکھا ہے کہ ان اشعار کے اول الفاظ کو نقشہ معین حافظہ کی مدد سے یاد کر لو۔ اس سے اور بھی اختصار ہو جائے گا۔ اور ہندوستان کی پوری تاریخ آسانی سے یاد ہو جائیگی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی لمبی نظم یاد کرنی ہو تو اشعار کے پہلے لفظ یا ضروری الفاظ جن سے وہ اشعار یاد آسکین نقشہ کی مدد سے ازبر کر لو ان الفاظ کی تصور سے پوری نظم باسانی یاد آجائیگی۔

تاریخ کے بعد جغرافیہ کے اجنبی اور غیر مانوس نامون کے یاد کرنے کی دو ترکیبین مصنف نے بتائی ہین۔

(اول) یہ کہ ایسے مانوس الفاظ تلاش کرو جو اُن غیر مانوس الفاظ کے ہم آواز ہون۔ مثلاً اٹنا (پہاڑ کا نام) اور اٹنا۔ اٹلس (پہاڑ کا نام) اور اطلس۔ بوسٹن (شہر کا نام) اور بستان وغیرہ۔ (دوم) یہ کہ اگر ایسے ہم آواز اور مانوس الفاظ نہ مل سکیں تو ہم قافیہ الفاظ تلاش کرو۔ مثلاً وایانہ (دار السلطنت) اور بیعانہ۔ موزمبیق (افریقہ کے ایک ملک کا نام) اور قرع انبیق۔ گریس (یونان) اور رئیس وغیرہ۔

مشہور پہاڑون کی بلندیان اور دریاؤن کے طول بھی نقشہ معین حافظہ کی مدد سے الفاظ بنا کر لکھدئے ہین تاکہ انکی یاد کرنے مین آسانی ہو۔ پہاڑون کی بلندیون مین تین صفر اور دریاؤن کے طول مین دو صفر مشترک ہین اسیلئے ان کو حساب مین شمار نہین کیا۔ اسکے بعد انگریزی زبان کی تحصیل کے متعلق چند مفید ہدایتین تحریر کی ہین منجملہ انکے چند ہدایتین یہ ہین۔

اردو زبان متعدد زبانون سے مرکب ہے اور اسمین ہزارون انگریزی الفاظ بھی شامل ہو گیے ہین۔ مثلاً اسکول۔ ریل بنک۔ فٹن۔ بکس وغیرہ۔ بہت سے الفاظ انگریزی مین ایسے ہین۔ جو اُردو الفاظ کی ہم آواز اور ہم معنی ہین مثلاً لَب اور لِپ۔ گھاس اور گراس۔ لیموں اور لیمن وغیرہ بیشمار انگریزی الفاظ ایسے بھی ہین جو اُردو الفاظ کے ہم آواز ہین گو کہ ہم معنی نہین ہین مثلاً بحث اور بجٹ۔ حال اور ہال۔ دوا اور ڈو وغیرہ۔ ان اقسام کے الفاظ اگر ایک جگہہ جمع کر لیے جائین اور اُن سے بچون کی ابتدائی تعلیم شروع کیجائے تو انگریزی الفاظ کی کثیر تعداد بلا مشقت اُنکو یاد ہو سکتی ہے۔

انگریزی گرامر سے پہلے اپنی زبان کی گرامر جاننا ضروری ہے اسکے بعد انگریزی گرامر پر توجہ کرنی چاہیئے۔ اُردو اور انگریزی نحو مین جو قاعدے مشترک ہین۔ انکو تو یاد ہی نہ کرنا پڑیگا رہے وہ قاعدے جو دونون زبانون مین مختلف ہین انکو البتہ محنت سے یاد کرنا ہوگا۔ انگریزی صرف کی کار آمد الفاظ کی فہرستین نقشہ معین حافظہ کی مدد سے باسانی یاد ہو سکتی ہین۔

مصنف کے بیان بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک ایسی کتاب تیار کیجائے جسمین وہ انگریزی الفاظ درج ہون جو اُردو زبان مین شامل ہو چکے ہین۔ یا اُردو الفاظ کیساتھ ہم آواز اور ہم معنی ہین یا فقط ہم آواز ہین تو بچون کی ابتدائی تعلیم کے لیے نہایت مفید ہوگی۔ اسیطرح اگر ایک ایسی گرامر تیار کیجائی جسمین انگریزی اور اُردو گرامر کے مشترک قاعدے جدا کر دئے

جائین اور مختلف قاعدے جدا بیان کیے جائین تو بہت جلد انگریزی گرامر ون کو یاد ہو گی۔

اس کتاب کے آخر مین مستند عالمون اور مصنفون کی کتابون سے تحصیل علم اور ترقی حافظہ کے متعلق نہایت مفید باتیں بھی درج کیگئی ہین۔

تاریخ مین قوت حافظہ کی عجیب عجیب مثالین بیان کی گئی ہین کچھ عجب نہین ہے کہ مشہور قوی الحافظہ اشخاص نے ایسے ہی قاعدون پر عمل کر کے حیرت انگیز مشق بہم پہونچائی ہو۔ انگریزی زبان مین اس فن کی کتابین موجود ہونگی مگر مشرقی زبان مین کوئی کتاب ایسی موجود نہین ہے، جس سے حافظہ کی تربیت اور نشو و نما کے قاعدے معلوم ہون۔ روشن ضمیر مصنف نے اس مضمون کی سب سے پہلی کتاب ہماری زبان مین لکھی ہے اور کیا عجب ہے کہ یہی کتاب اس مضمون پر جامع اور مکمل بھی ہو۔ اگرچہ ہم نے چند اہم مضامین کتاب کا خلاصہ اس ریویو مین کر دیا ہے۔ مگر جب تک ہر شخص کے پاس یہ کتاب موجود نہ ہو ان قواعد سے پورے طور پر کام نہین لے سکتا ہمارے نزدیک ہر مدرس کے پاس۔ ہر پروفیسر کے پاس۔ ہر طالبعلم کے پاس۔ ہر وکیل و بیرسٹر کے پاس۔ ہر اسپیکر کے پاس۔ ہر مورخ کے پاس اس کتاب کی ایک ایک جلد کا ہونا ضروریات سے ہے۔ اس کتاب کا مضمون ایسا نادر اور عجیب اور کارآمد اور مفید ہے کہ اگر اسکی قیمت سو روپیہ رکھی جاتی تو بھی اہل بصیرت اور صاحب نظر اشخاص یہی کہتے ہے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ہم جسطرح مصنف کی اس علمی محنت اور قومی اور ملکی خدمت کے شکر گذار ہین اُسی طرح اسبات کے بھی احسانمند ہین کہ انہون نے اسکی قیمت صرف ۱۲ر رکھی ہے اور مصنف ممدوح سے بمقام ...

کرنے پر مل سکتی ہے ہمارے بعض احباب اس امر سے تو آگاہ ہونگے کہ انگلستان مین بعض اس فن کے جاننے والے نہایت خطیر رقم بطور فیس کے لیکر ترقی حافظہ کی ترکیب بتلاتے ہین اور یہ اقرار کرا لیتے ہین کہ وہ کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کرین۔ عالی دماغ مصنف نے محض اپنے ملک کی خیرخواہی کی غرض سے اس راز کو بالکل منکشف کر دیا ہے اور وہ جواہرات کو کوڑیون کے مول فروخت کرتے ہین۔

(وحید الدین سلیم)

محفل میلاد

مظفر الدین حاکم اربل نے جس شان و شوکت سے اپنے زمانہ مین محفل میلاد قایم کی تھی اسکی تعریف جسقدر کی جائے کچھ غیر مناسب نہین ہے۔ ہم اس کا ذکر ابن خلکان سے لیتے ہین جو غالباً ناظرین کو دلچسپ معلوم ہوگا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ہر سال بغداد۔ موصل۔ سنجار۔ جزیرہ۔ نصیبین۔ بلاد عجم اور اُن تمام شہرون سے جو اربل کے مضافات اور اسکی گرد و نواح مین آباد تھے ہزارون فقیہ۔ صوفی۔ واعظ قاری اور شاعر اور ہر قسم کے اہل کمال اربل مین آتے تھے اور محرم سے ربیع الاول کے شروع تاریخون تک اُن کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مظفر الدین کی طرف سے لکڑی کے مکان لوگون کے آرام و آسائش کے لیے پہلے سے تیار کر دئے جاتے تھے ہر مکان چار یا پانچ درجہ کا ہوتا تھا۔ بیس یا اس سے زیادہ چوبی مکان جو خاص طور پر تیار کئے جاتے تھے ان مین سے ایک مکان بادشاہ کے لیے اور باقی مکانات امرا اور اعیان دولت کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ صفر کی پہلی تاریخ سے یہ

تمام مکانات طرح طرح کی آرائشون سے مزین اور آراستہ
کئے جاتے تھے۔ کوئی ایسا مکان نہین تھا جسمین مغنیون کا
یک طائفہ موجود نہ ہو۔ اس محفل کا وہ زور شور ہوتا تھا۔ کہ اس
زمانہ مین تمام لوگون کے کاروبار بند ہوجاتے تھے اور شہر کے
لوگون کو سواے تفریح اور سیر تماشے کے کوئی مشغلہ نہین تھا
لکڑی کے مکانات قلعہ سے لیکر اُس خانقاہ کے دروازہ تک
میدان کے قریب ہی مسلسل بنائے جاتے تھے۔
مظفر الدین ہر روز نماز عصر کے بعد وہان آتا تھا اور ہر مکان مین
تھوڑی دیر تک قیام کرتا۔ گانا سنتا اور حمید اشعار سے لطف
اٹھاتا تھا۔ رات کے وقت خانقاہ مین بسر کرتا تھا اور وہان سماع
کی مجلس قایم ہوتی تھی صبح کی نماز سے فارغ ہوکر وہ خانقاہ سے
سوار ہوکر شکار کو جاتا تھا اور ظہر کے وقت سے پہلے قلعہ مین
واپس آجاتا تھا۔ مظفر الدین میلاد کی شب تک ہر روز اسی طریقہ
پر عمل کرتا تھا محفل میلاد کسی سال آٹھوین ربیع الاول کو اور کسی سال
بارھوین ربیع الاول کو قایم ہوتی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ولادت
سرور کائنات کی تاریخ مین اختلاف ہے۔ محفل میلاد کی تاریخ
سے دو دن پہلے اونٹ۔ گائے۔ بھیڑ۔ بکری وغیرہ جانور
بہت سے میدان کیطرف لیجاتے تھے۔ اُنکے ساتھ بہت
سے گیت گاتے اور باجا بجاتے جاتے تھے۔ میدان مین
ان تمام جانورون کو ذبح کرتے تھے۔ اور رنگ برنگ کے
کھانے تیار کیے جاتے تھے۔ میلاد کی شب کو نماز مغرب کے بعد
قلعہ مین سماع کی محفل قایم کی جاتی تھی۔ پھر وہ قلعہ سے اُترتا تھا
اسکی جلو مین کثرت سے شمعین ہوتی تھین منجملہ اونکے دو یا چار
شمعین اتنی بڑی ہوتی تھین کہ اونکو خچرون پر لاد کر لیجاتے تھے
آدمی ان شمعون کو گرجانے کے خیال سے پکڑے رہتے
تھے حالانکہ وہ خچرون کی پیٹھ پر بندھی ہوتی تھین۔ اس جلوس

اور ازدحام کے ساتھ وہ خانقاہ تک جاتا تھا مولود کے دن
صبح کے وقت بہت سے خلعت بادشاہ کیطرف سے قلعہ سے
چلتے تھے۔ اور خانقاہ مین آتے تھے یہ بیشمار شاہی خلعت
صوفیون اور درویشون کے ہاتھون پر پہونچائے جاتے
تھے جو ایک دوسرے کے پیچھے قطار باندھے ہوئے چلتے
تھے۔ جب بادشاہ خانقاہ مین پہونچتا تھا تو بڑے بڑے
امرا اور ارکان دولت جمع ہوجاتے تھے۔ واعظون کے
لیے کرسیان بچھائی جاتی تھین۔ بادشاہ کے لیے ایک
لکڑی کا برج کھڑا کیا جاتا تھا جسمین ایک طرف کی جالیان اس
غرض سے تھین کہ واعظون اور لوگون پر بادشاہ کی نظر پڑسکے
اور دوسری طرف کے جالیان میدان کے رخ پر تھین۔ یہ
میدان اسقدر وسیع تھا کہ اسمین پوری فوج سماجاتی تھی۔ فوج
کی اُس روز بادشاہ کے سامنے موجودات لی جاتی تھی۔
اور وہ ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی
فوج کی طرف نظر ڈالتا تھا اور کبھی واعظون اور عام لوگون کو دیکھتا
تھا۔ فوج کے قواعد دیکھنے کے بعد محتاجون کے لیے میدان مین
ایک وسیع دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور ہر قسم کے کھانے چنے
جاتے تھے۔ جنکی تعریف نہین ہوسکتی۔ خانقاہ کے لوگون کے
لیے ایک جدا دسترخوان بچھتا تھا۔ علما کے وعظ اور فوج کی
قواعد کے وقت بادشاہ وامرا۔ ارکان دولت۔ فقیہون۔
شاعرون۔ قاریون اور واعظون مین سے ہر ایک کو اپنے
پاس بلاتا تھا۔ اور ہر ایک کو خلعت سے سرفراز کرتا تھا
اس سے فارغ ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا اور خاص
خاص آدمیون کے مکان پر کھانا بھجوایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ
عصر بلکہ بعد عصر تک جاری رہتا تھا۔ بادشاہ اسی مقام پر شب
بسر کرتا تھا۔ صبح تک برابر نغمہ وسرود کی آواز خانقاہ مین گونجتی

ہوتی تھی - بہرحال اس بادشاہ کا یہی دستور تھا میں نے اس محفل کا حال بہت مختصر بیان کیا ہے - اگر پورا پورا حال بیان کیا جائے تو طوالت کا اندیشہ ہے - جب لوگ اس ہنگامہ سے فارغ ہو جاتے تھے تو ایک ایک کر کے سب اپنے وطن کو واپس جاتے تھے - ہر شخص کو بادشاہ کیطرف سے زاد راہ ملتا تھا - مظفر الدین کی اسقدر سرگرمی اور توجہ محفل میلاد کی نسبت دیکھکر ابو الخطاب بن وحیہ نے جو اس زمانہ کا ایک مشہور فاضل تھا ایک کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے حال میں تصنیف کی اور اسکو بادشاہ مذکور کی خدمت میں پیش کیا جسپر اسکو ایک ہزار دینار کا انعام ملا"

مظفر الدین جو اربل کا حاکم تھا اور صلاح الدین فاتح بیت المقدس کیساتھ بہت سے اُن معرکون میں شریک رہ چکا تھا - جو غزوات صلیبی کے نام سے مشہور ہین - اور جن مین اُس نے اپنی جوہر شجاعت کے بہت سے نمونے دکھائے تھے - اُس کا زمانہ سنہ ۵۴۹ھ سے سنہ ۶۳۰ھ تک ہے - وہ مجلس مولود کا موجد نہین ہے - بلکہ اس سے بہت دنون پہلے اس رسم خیر کی بنیاد پڑ چکی تھی - زمانہ حال مین ممالک عثمانیہ مین بھی نہایت دھوم دھام سے جشن میلاد منعقد ہوتا ہے اور ہر قسم کی خوشی کی علامتین ظاہر کی جاتی ہین - یہ سچ ہے کہ سلطنتون کا میلان جب کسی امر کی طرف ہوتا ہے تو اُسکو بہت ترقی ہو سکتی ہے - مگر ہم چاہتے ہین کہ بلا کسی حکم سلطان یا بادشاہ اسلام کے اس مبارک رسم کو قوم من حیث القوم ادا کرے - کوئی شہر اور کوئی گھر مسلمانون کا ایسا نہو جسمین اس یادگار پر خوشی نہ منائی جائے ہر مسلمان کو خواہ وہ امیر ہو یا غریب حسب مقدور کوشش کرنی چاہیے - کہ اس قومی یادگار کے زندہ کرنے مین حصہ لے -

وما علینا الا البلاغ المبین — رشید احمد سالم

عورتین قومی ترقی کا اعلیٰ ذریعہ ہین

اس مین کچھ شک نہین کہ سوسائٹی مین بہت سے امور ایسے ہوتے ہین - جو ترقی اور تنزل پر اثر ڈالتے ہین - اگر کوئی قوم پست ہو جائے - اُسکی حالت خراب ہو جائے - اُسکے تمام کامون مین ابتری پھیل جائے اور تجارت بے رونق ہو جائے تو ہم پہلی نظر مین یہی خیال کرینگے کہ اسکا سبب یا گورنمنٹ کی خرابی ہے یا رعیت کی جہالت - یا زمین کا سرسبز اور شاداب نہ ہوتا - یا اسکے سوا اور اسباب ہونگے - جو ملک کی دولت اور اسکی ترقی کے وسائل پر اپنا اثر ڈالتے ہین - اس حالت کا علاج اگر ہم تلاش کرنا چاہین - تو ہم یہی تجویز کرینگے کہ حکومت کی اصلاح ہو علوم کی اشاعت کیجائے - قوم کی تربیت مین کوشش کی جائے - زراعت اور تجارت مین جو خلل آگیا ہے وہ دور کیا جائے - یا اسی طرح کی اور باتین تجویز کرین گے - جو شائستگی کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہین - اور جنکے مفید ہونے مین کوئی شخص اختلاف نہین کر سکتا -

لیکن تنہا یہی امور ایسے نہین ہین جن پر دنیا کی قومون کی ترقی یا تنزل کا دارمدار ہو - بلکہ ممکن ہے کہ ان اسباب کی تاثیر کمزور ہو - یا وہ دوسرے پوشیدہ اسباب سے پیدا ہوئے ہون جنکی کوئی پروا بھی نہین کرتا یہ سچ ہے کہ حکومت کا خراب ہونا اور حاکمون کا ظلم و ستم یہ دو سبب قوم کی ذلت اور پستی اور اسکی حالت کی تباہی کے لیے کافی ہین اور جہالت بھی بلا شبہ اُن اسباب مین سے ہے کہ جو ملکون اور قومون کو تباہ اور برباد کرتے ہین - اور ہم اس بات کا بھی انکار نہین کرتے کہ الخ

* یہ مضمون مصر کے مشہور عربی رسالہ المسلال سے ترجمہ کیا گیا ہے

وسیع اور عام طور پر اشاعت کرنے سے ہر قوم معراج ترقی پر پہونچ سکتی ہے - اور یہی حال دوسرے اسباب کا بھی ہے مگر ہم ان تمام اسباب پر اسوقت بحث نہین کرینگے -

ہمارے ملک کے انشا پردازون نے ان اسباب کے مطالعہ مین کوشش کی ہے - اور انکو نکتہ چینی کے ساتھہ جانچا اور پرکھا ہے - اور کوئی شخص ایسا نہین ہے، جو شایستگی اور تہذیب پر ان امور کے اثر ڈالنے سے انکار کرتا ہو ہم ان امور کے اصلی اسباب پر بحث کرنی چاہتے ہین - اگر ہم یہ کہین کہ حکومت کی خرابی ملک کو تباہ کرتی ہے - تو یہ صحیح ہوگا - لیکن پوچھنا یہ ہے - کہ وہ خرابی کیونکر پیدا ہوئی ؟ - اگر ہم یہ کہین کہ رعیت خود اپنے جاہل ہونے سے ذلیل اور پست ہو جاتی ہے - تو یہ بھی درست ہے - لیکن دریافت کرنا یہ ہے کہ رعیت کے جاہل ہونے کا سبب کیا ہے - اسیطرح اگر ہم یہ بات کہین کہ زراعت اور تجارت کیطرف سے بے پروائی کرنا ملک کی خوش حالی اور سرسبزی کو ملیا میٹ کر دیتا ہے تو یہ بھی صحیح ہوگا - لیکن ہم سے پوچھا جائے گا کہ اُس بے پروائی کا کیا باعث ہے - و تنزل کے اسباب جو ہمنے بیان کیے اُنکی اصلی علت ضرور کچھہ اور ہے، جسکے معلوم ہونے سے ملک کی تباہی دور ہو سکتی ہے - یہی حال ترقی کے اسباب کا ہے اور انکی بھی اصلی علت کچھہ نہ کچھہ ہے - ہم ان تمام اصلی اسباب پر تفصیل کے ساتھہ نظر ڈالنی چاہتے ہین - اور وہ اصلی اسباب جنکا ہمنے ذکر کیا حسب ذیل ہین -

۱) عورت - عورتین اُن طاقتور اور پوشیدہ اسباب مین سے ہین جنکی تاثیر سوسائٹی پر ہوتی ہے - عورتون کی شرمگینی - پردہ نشینی - نزاکت - اور لطافت کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو تم اپنی نوجوانی اور دوڑ دہوپ اور محنت اور کوشش پر مغرور مت ہو - میدان جنگ مین توپون سے آگ برسانے - ملکون اور براعظمون کی سیر و سیاحت کرنے - سمندرون کی تہ مین غوطہ لگانے - بجلی - بہاپ اور نیچر کی دیگر قوتون سے کام لینے اور انکو مسخر کرنے پر فخر نہ کرو - تم اپنی قوت اور شوکت سطوت اور جبروت سے عورتون پر اپنی تیغین ترجیح ست دو - تم اپنے علم صنعت - ایجاد اور انکشاف سے عورتون کو مت ڈراؤ - تم کیسے ہی معزز اور بلند مرتبہ کے ہو - کیسے ہی عالم اور صنّاع ہو مگر یہ خوب سمجھہ لو کہ تم وہی پودے ہو جنکو عورتون نے اپنے ہاتھہ سے لگایا - تم انہین کے دل اور انہین کی زبان کی مخلوق ہو - اگر اُن کا نازک اور کمزور دل نہ ہوتا تو تمہارا بیخوف اور دلیر اور طاقتور دل کہان سے آتا ؟ - اگر انکی نازک اور نرم انگلیان نہ ہوتین - تو تمہارے فولادی اور مضبوط ہاتھہ کہان سے ہوتے ؟ - پس عورتین جو باورچی خانہ کے کام مین مشغول رہتی ہین - سوسائٹی پر ایسا زبردست اثر ڈالتی ہین جو بڑے بڑے لشکرون اور سپہ سالارون اور عالمون سے ممکن نہین -

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ عورت ہی ماں ہوتی ہے - عورت ہی بیوی ہوتی ہے - عورت ہی بہن ہوتی ہے - اور ماں اور بیوی اور بہن ہی وہ ہین جنکے ہاتھہ مین تمدن اور شایستگی کی باگ ہے - اس تمدن اور شایستگی کو کامیابی اور ترقی کی بلندی پر پہونچانا یا پستی اور تباہی کے گڑہے مین پھینک دینا انہین کے اختیار مین ہے - وہ اپنا اثر اسطرح چپ چاپ ڈالتی ہین کہ معلوم ہی نہین ہوتا - اسمین ذرا بھی تعجب نہین ہے کیونکہ جب کوئی انسان اعلیٰ رتبہ پر پہنچتا ہے یا ترقی کے مدارج طے کر جاتا ہے تو وہ یا تو کسی عورت کا شوہر ہوتا ہے یا کسی ماں کا بیٹا یا کسی بہن کا بھائی یا وہ شوہر بھی ہوتا ہے بیٹا بھی اور بھائی

ہی یعنی وہ عورت ہی کی گود مین پلا ہے۔ عورت ہی کا رفیق
ہے۔ عورت ہی کیساتھ زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ وہ بچپن اور
لڑکپن کے زمانہ مین عورت ہی کا مطیع تھا۔ اور مجبوراً اُسیکے احکام
کو مانتا تھا جوانی کے ایام مین وہ عورت ہی کیساتھ محبت رکھتا تھا۔
اور اُسکی ہر بات مانتا تھا۔ کہولت کی عمر مین وہ عورت ہی کی تعظیم
و تکریم کرتا تھا۔ اور اُسیکی مہربانیون کا احسانمند تھا۔ اُس نے
اپنی زندگی کے دس حصون مین سے نو حصے عورت ہی کے
سامنے بسر کیے اور جو بات اُسکی نازک اور نرم ہونٹون سے
نکلتی تھی اُسکو تسلیم کرتا رہا۔ جسطرح عورت نے چاہا اُسکو پالا اور
جس طریقہ پر اُس نے چاہا اوسی طریقہ پر وہ جوان ہوا۔ وہ
خوشی سے اسکا مطیع اور فرمانبردار رہا۔ اوسیکے اشارون پر
چلتا رہا۔ اور آنکھہ بند کیے اُسکے حکمون کو مانتا رہا۔ جب تم
کسی انسان کو دیکھو کہ وہ اعلیٰ درجہ کی ترقی اور علم و فضل کے
حاصل کرنے مین محنت اور کوشش کرتا ہے۔ تو سمجھہ لو کہ
جو بات عورت نے چپ چاپ اسکے دل مین ڈال دی تھی۔
وہ اوسیکو کھلم کھلا طلب کرتا ہے۔ اور جو چیز عورت نے اُسکی
طبیعت مین مضمر رکھدی تھی وہ اُسیکی تلاش مین بالا رادہ سرگرم
رہتا ہے۔ جج عدالت مین علی الاعلان احکام جاری کرتا ہے
حالانکہ اسکے احکام مین ماں یا بیوی کی خیالات کی جھلک پائی جاتی
ہے۔ سوداگر بازار مین اپنا مال فروخت کرتا ہے۔ حالانکہ
اُسکی باتون مین اُس سختی یا نرمی یا شیرین کلامی یا بدگوئی کا اثر
پایا جاتا ہے جو اُس نے اپنی گھر کے آدمیون سے سیکھی ہے
اسیطرح کوئی مضمون نگار یا صنّاع یا وکیل یا طبیب ہو اسکے
کاروبار مین عورت کے فیضان صحبت کا اثر ہوتا ہے
ہو اسلیے کہ عورت کا اثر انسان پر بہ نسبت تمام امور فطرت کے
زیادہ ہوتا ہے۔ فرانس کے باشندے انسانون کے

ہر ایک بُری یا بھلی حالت کو عورت کیطرف منسوب کرتے ہین
اگر کوئی حادثہ ظہور مین آئے اور اس کا سبب معلوم نہ ہو تو وہ
کہتے ہین کہ عورت کو ٹٹولو۔ غرضکہ وہ اسباب جو سوسائٹی پر اپنا
اثر ڈالتے ہین اُنمین عورت سب سے زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ اگر
عورتین تربیت اور تہذیب سے آراستہ ہون تو اس مین کوئی
شک نہین ہے کہ سوسائٹی کی ترقی کے لیے وہ اعلیٰ
ذریعہ ہو سکتی ہین۔

(۲) عام اخلاق۔ اس سے ہماری مراد نوجوانون
کی بُری یا بھلی عادتون سے ہے۔ اخلاق کی بہت قسمین
ہین جنکی تفصیل سے یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔
ہم اس مقام پر انمین سے چند ضروری اخلاق کا بیان کرتے ہین
اور وہ حسب ذیل ہین۔ اوّل پرہیزگاری جس سے ہماری مراد
عام طور پر بُری باتون سے بچنا اور خاصکر بدکاری سے پرہیز
کرنا ہے۔ یہ ناپاک خصلت تہذیب اور شایستگی کو سب سے
زیادہ برباد کرنے والی ہے۔ کیونکہ اسمین پست ہمتی۔ ذلّت
اور دناءت پائی جاتی ہے۔ پس وہ قوم جس مین بدکاری عام
طور پھیلی ہوئی ہو۔ اُسکے افراد ذلیل۔ پست ہمت۔ کم عقل اور
ناتوان ہونگے۔ خاصکر اُس حالت مین جبکہ نفس کی باگ
ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور سب کے سب بیہودہ باتون مین
محو ہون اگرچہ حرام تک نوبت نہ پہونچی ہو۔ ایسے لوگ جو بیہودہ
چال چلن رکھتے ہون اور بدکاریون مین غرق ہون اُن سے
کسی فایدہ کی توقع نہین ہو سکتی بلکہ وہ تہذیب و شائستگی کے
جسم مین فاسد اعضا ہین۔ اس بیان سے خیال مین آسکتا ہے
کہ کیونکر سلطنتین تباہ ہوتی ہین۔ اور جب یہ مہلک بیماری کسی
قوم کے بڑے آدمیون یا حکومت کے ارکان مین پھیل جاتی
ہے تو وہ قوم بہت جلد برباد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو قوت

انکو انصاف پرستی اور فرائیض حکرانی سے باز رکھتی ہے اور کل
قوم پر عام بلا نازل ہوتی ہے۔

مگر وہ لوگ جو افعال بد سے بچتے رہتے ہین۔ وہی
دنیا مین کچھہ کام کرتے ہین۔ جب وہ کسی بات پر جھک پڑے
تو جھک پڑے۔ انکو ہٹانے والی کوئی چیز نہین۔ اور جب وہ
کسی بڑے کام مین لگا دیے گئے تو اسکے کرنے پر فوراً کمر بستہ
ہو گیے اور اُسیکے ہو رہے۔ ایسے ہی لوگ اپنی ملک کی
خدمت کرتے ہین۔ اور اُسکی عظمت بڑہانے مین مدد دیتے
ہین۔

بداخلاقیون مین سے ایک آفت قمار بازی کی ہے
یہی بدکاری کی برابر تہذیب کو نقصان پہونچاتی ہے۔ بلکہ بعض
اوقات اس سے بھی زیادہ مضرت رسان ہے۔ قمار بازی
اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے جوا کھیلنے والون کی طبیعتون مین
لالچ اور بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے مال کا نقصان۔ اور
وقتی کی ایسے دن کا خون ہو جاتا ہے۔ جوا کھیلنے والے
مین محبت اور ہمدردی نام کو نہین رہتی۔ وہ اسی دُہن مین رہتا
ہے کہ مال کو برباد کرے۔ جب وہ اپنے بھائی کا بھی دوست
نہین ہوتا تو اپنے اہل وطن پر کب مہربان ہو سکتا ہے؟
سوسائٹی کا دشمن ہے۔ کوئی قوم جسمین قمار بازی کی عادت
ہو کامیاب نہین ہو سکتی۔ کیونکہ قوم کا وجود افراد قوم کے
اجتماع پر منحصر ہے۔ اور قمار بازی انکو تتر بتر کرتی ہے۔
(۳) خانگی زندگی۔ خانگی زندگی کو تہذیب سے بہت بڑا تعلق
ہے کیونکہ جب لوگ خانگی زندگی اعتدال سے بسر کرتے
ہین۔ تو انکو دماغ صحیح اور بدن تندرست ہوتے ہین۔ اور جب
خانگی زندگی مین تنزل کرتے ہین تو انکا حال ابتر ہو جاتا ہے
آدمی رات دن کھانے پینے مین مشغول رہتے ہین۔ اور
زندگی کی دیگر ضروری کامون پر توجہ نہین کرتے وہ کبھی کامیاب
نہین ہو سکتے۔ جو شخص دن کا بڑا حصہ عمدہ کھانے کی فکر مین
گنوا دیتا ہے۔ وہ اپنے اور کامون سے غافل رہتا ہے
فرض کرو کہ کھانے پینے کی فکر مین وقت کا زیادہ حصہ صرف
نہین ہوا تاہم محض بسیار خوری کی عادت انسان کو کام سے
روک دیتی ہے۔ اور دل ودماغ مین سستی اور کاہلی پیدا
کر دیتی ہے جیسی کہ ایک عربی مثل ہے "البطنة تذهب الفطنة"
یعنی پرخوری کی عادت عقل ودانش کو کہا جاتی ہے۔ نشہ
کی چیزوں مین منہمک ہو جانا اور رات بھر جاگنا یہ بھی نہایت
بُری خصلتین ہین اور جسمانی اور دماغی تندرستی کے لیے سم
قاتل ہین۔

تہذیب وشایستگی کی ضروری اور کارآمد امور مین سے
ایک امر صفائی ہے ہمارے ناظرین کو پہلی نظر مین یہ خیال پیدا
ہوگا کہ شاید صفائی ایسی اہم اور ضروری بات نہین ہے۔ جسپر زیادہ
توجہ کی جائے۔ مگر حقیقت مین صفائی سوسائٹی کے لیے
ایسی ہی ضروری چیز ہے جیسے کہ لباس اور خوراک ہر آدمی کے
لیے۔ جس مکان مین صفائی اور ترتیب کی حکومت نہین ہے
اسکے رہنے والون پر سستی اور اُداسی چھائی رہتی ہے۔
اور جو شخص اپنے جسم کو پاک صاف رکھتا ہے اُسکا دماغ
بھی صحیح ہوتا ہے۔ اور جو شخص نجس اور گندے بستر پر سوتا ہے
اور اسکی پروا نہین کرتا وہ بے حس ہے۔ اور اس سے
کسی طرح کی نفع کی امید نہین ہے۔

(۴) دینداری۔ یہ بھی اُن اسباب مین سے ہے جو
سوسائٹی پر چپ چاپ اثر کرتی ہین۔ اس سے ہماری مراد
خدا سے ڈرنا ہے۔ جن لوگون کے ایمان کمزور ہو جاتے ہین
اُنکے دل مرجھا جاتے ہین۔ اور وہ بے سرے ہو جاتے ہین

اور اُن کا روک ٹوک کرنے والا کوئی نہین رہتا بعض لوگون کا خیال ہے کہ تعلیم و تربیت مذہب سے بے پروا کر دیتی ہے مگر اُن کا خیال ہی خیال ہے کیونکہ انسان بالطبع خودغرضی اور طمع کی طرف مائل ہے جب اُسکی ذات مین کوئی چیز روک ٹوک کرنے والی نہین رہتی تو وہ بے محابا لوگون کا مال لوٹ لیتا ہے۔ اور اُنکی اذیت کی کچھ پروا نہین کرتا۔ مذہب ہی ایسی چیز ہے جو نفس کی بیجا اُمنگون کو روک سکتا ہے ہم اس بات کا انکار نہین کرتے کہ بعض لامذہب آدمی اورون کے نفع رسانی مین ویسی ہی کوشش کرتے ہین، جیسی کہ وہ اپنی ذات کے لیے کرتے ہین۔ مگر ایسے آدمی بہت تھوڑے ہین۔ اسکے سوا اُنکی یہ عادت اُس مذہبی تعلیم کے باعث سے ہے جو اُنہون نے اس سے پیشتر کہ وہ مذہب کو خیرباد کہین اور خدا سے انکار کرین، ماں کی دودھ کے ساتھ پائی ہے۔ اور شاید جب تم اُن سے مباحثہ کرو تو وہ تمہین گمراہ سمجھین۔ اور مذہب نے جو اثر اُنکی طبیعت پر کیا ہے اُسکا صریح انکار کرین۔ اسمین ذرا بھی شک نہین ہے کہ انسان ہمیشہ محض علم کی مدد سے بداخلاقیون سے نہین بچتا۔ بلکہ اکثر اُسکی بدکاری مین ترقی ہو جاتی ہے۔ دینداری سوسائٹی کی رہنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اور دنیا کی تمام قومون مین وہی قوم زیادہ خوشحال ہوتی ہے، جسکے افراد زیادہ دیندار ہون اور جزا و سزا کو مانتے ہون۔

اس مقام پر یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ بعض کم علم یہ خیال کرتے ہین، کہ لامذہب ہونا علم کا لازمی نتیجہ ہے جب لوگ بارش۔ گرج۔ کسوف کے قوانین سے واقف ہو جاتے ہین۔ اور زلزلون اور آسمانی حادثون کے اسباب سے آگاہ ہو جاتے ہین اور نیچر کے عقدے حل کر لیتے ہین اور کائنات کے اسرار اُن پر منکشف ہو جاتے ہین۔ تو انکو اس بات کی ضرورت نہین رہتی کہ وہ کسی پوشیدہ قوت کے وجود کو تسلیم کرین۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اگر تم اُن سے پوچھو کہ اس کائنات کا بنانے والا اور ان قوانین کا ایجاد کرنے والا کون ہے بلکہ اگر تم اُن سے اسرار فطرت مین سے کسی چھوٹے سے چھوٹے راز کی حقیقت دریافت کرو تو وہ بالکل حیران رہ جائینگے۔ علاوہ اسکے اگر وہ اپنے علم کو وسعت دین اور اُسمین کمال حاصل کرین اور بصیرت کی نگاہ سے نظام کائنات کو دیکھین تو وہ حیران ہو جائینگے۔ اور یقیناً اُن کا دل ایک زبردست خالق کے وجود کا اقرار کریگا جس سے دنیا کے شہنشاہ اپنے تخت پر اور بھیک مانگنے والے فقیر اپنی جھونپڑی مین کانپتے اور لرزتے ہین۔ مذہب کی اتنی ہی فضیلت کافی ہے کہ وہ شریرون کو شرارت سے اور ظالمون کو ظلم و ستم کرنے سے باز رکھتا ہے اور لوگون کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے وہ قوم جسمین مذہب کی حکومت کم ہو گئی ہے اسمین عام خودسری اور ابتری پھیل جاتی ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہین کہ حکومت کے ہوتے مذہب کی کوئی ضرورت نہین ہے کیونکہ وہ ایسے قوانین مرتب کر دیتی ہے جس سے مجرم سزا پاتے ہین اور طاقتورون کے مقابلہ مین کمزورون کی حمایت ہو۔ مگر یہ خیال بھی صحیح نہین ہے۔ کیونکہ جو جرائم حکومت کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہین۔ اُنکے روکنے کا کوئی طریقہ نہین ہے۔ اندرونی اور پوشیدہ جرائم کو روکنے والا صرف کانشنس (ضمیر) ہے جو ایسا منصف ہے کہ نہ رشوت قبول کرتا ہے نہ خوشامد کی پروا کرتا ہے۔ اور اسکے قانون مین تاویل اور تبدیل نہین ہو سکتی۔ وہ مجرم پر اپنا قطعی حکم نہایت تلخی اور تندی کے ساتھ جاری کرتا ہے اور تنہائی مین اسکو سخت ملامت کرتا ہے۔ کانشنس مذہبی تربیت کا ایک

عورتین قومی ترقی کا اعلی ذریعہ ہین

نتیجہ ہے۔ جب اخلاق کی گود مین اوسکی پرورش ہوتی ہے اور وہ نشو و نما پاتا ہے۔ تو اُسکے سامنے بڑے بڑے حکمرانون اور اُنکے لشکرون کی اور بڑے بڑے حاکمون اور انکی قانونون کی کوئی ضرورت نہین رہتی۔ اسکے ہوتے کسی انتقام لینے والے حاکم اور انصاف کرنے والے جج کی حاجت نہین رہتی ہے۔ عدالت اور قانون انسان کو کاشتکی حکم سے بے پروا اور فتی نہین کر سکتے۔ اسکے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ قانون پر عمل کرنے کے وقت لوگون مین ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے اور ایک ہی مقدمہ مین حکام مختلف فیصلے کرتے ہین۔

اوپر کے تمام بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت۔ عام اخلاق۔ خانگی زندگی اور دینداری اُن اسباب مین سے ہین جو چپ چاپ سوسائٹی پر اپنا اثر ڈالتی ہین۔ لیکن اگر تم غور سے اُن پر نظر ڈالو تو معلوم ہوجاے گا کہ ان تمام اسباب کا مدار صرف عورت پر ہے۔ تنہا عورت ہی وہ بڑا سبب ہے جو چپ چاپ سوسائٹی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ عورت ہماری طرز معیشت کا انتظام کرنے والی ہے۔ وہی عام اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ وہی ہمکو دینداری اور خدا پرستی کا دودھ پلاتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو قوم بن جاے اور چاہے تو بگڑ جاے۔ عورت کی تعلیم و تربیت ہی سب سے بڑا وسیلہ قوم کی ترقی کا ہے۔ وہی قوم کو اپنے دامن تربیت مین پالتی ہے اور انکی اصلاح کرتی ہے اور اسکے اخلاق کو تہذیب کے سانچے مین ڈھالتی ہے۔ اگر اسکے اخلاق بگڑے ہون تو کل قوم بگڑ جاتی ہے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ "عورت ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر تم اسمین اپنی صورت کو دیکھو تو یہ معلوم ہوگا کہ اسکو تمہاری ذات سے اور تمکو اُسکی ذات سے تعلق ہے۔ اگر تم عورت مین بُری خصلتین پیدا کرو تو وہ شیطان ہوجاتی ہے اور اگر اُسکو عمدہ اخلاق سے آراستہ کرو تو وہی فرشتہ بنجاتی ہے"

یہ مضمون فی الحقیقت اس قابل ہے کہ ہماری قوم کے وہ بزرگ جو تعلیم و تربیت کے حامی ہین اسکو غور سے پڑھین اور اس بات کو خوب سمجھ لین کہ قومی ترقی جسکی صدا ہر مجلس اور ہر محفل مین بلند کیجاتی ہے۔ اسکی بنیاد عورتون کی تعلیم و تربیت پر ہے۔ کوئی قوم جو عورتون کی تعلیم و تربیت سے غافل ہے کبھی ترقی نہین کر سکتی۔ وہ تمام اسباب ترقی جو اس مضمون مین بیان کیے گیے ہین۔ اس مین کچھ بھی شک نہین ہے۔ کہ اُن سب کا اصل الاصول عورتون کی شایستگی اور تعلیم ہے جیساکہ خود مضمون نگار نے ثابت کیا ہے۔ سید احمد خان مرحوم لڑکون کی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے اور لڑکیون کی تعلیم کی حمایت وبی زبان سے کرتے تھے اور اس مین تو ذرا بھی شبہ نہین ہے کہ وہ لڑکون کی تعلیم کو لڑکیون کی تعلیم سے مقدم سمجھتے تھے مگر غور سے دیکھا جاے تو اس راے مین غلطی ہے۔ لڑکیون کی تعلیم لڑکون کی تعلیم سے مقدم ہے۔ اور لڑکونکی تعلیم کبھی کامل تعلیم نہین کہلا سکتی جب تک کہ لڑکیان تعلیم پا کر اُنکی مائین اور اُنکی بیویان نہ بنجائین۔ ملک کی اصلی روشنی۔ قوم کی اصلی ترقی۔ سوسائٹی کی اصلی عظمت صرف اسی مسئلہ کے حل کرنے پر ہے۔ جسپر ابتک ہماری قوم کے بزرگون نے کامل توجہ نہین کی۔ اور اگر وہ اب بھی کچھ مدت تک اس سے غافل رہینگے تو یہ کہنا پڑیگا کہ وہ اصلی ترقی کے خواہان نہین ہین۔ فقط

(عبد العلی خان)

مقاصد اور قواعد

۱— یہ دو جز کا ماہوار علمی رسالہ جو معارف کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو علیگڑھ سے شائع ہوگا۔

۲— اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اس میں ہر قسم کے علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی۔ عربی۔ اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری علاوہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳— یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کریں گے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جائیں گے۔

۴— بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں

ا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں۔

ب۔ مولوی وحید الدین سلیم۔

۵— ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشا پردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے گرانبہا مضامین سے ہماری مدد کریں۔ جن بزرگوں کے نام ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ اگر مہربانی سے وہ خود یا ان کے احباب ان کے نام و نشان سے ہم کو مطلع کریں گے تو ہم ان کی خدمت میں بھی درخواست کریں گے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہنچائیں۔ جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہیں ان کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶— اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک [illegible] جو نقد قیمت بھیجئے یا ویلیو پے ایبل کی درخواست کرے خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہ ہوگی۔ نمونے کے پرچے کیلیے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد یا بطور ویلیو کے وصول کی جائیگی اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہو سکتی۔ رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیے۔ اور ان ہی کے نام قیمت آنی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لیے آدھ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷— جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائیے۔

۸— حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہیں گے۔

۹— اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر بھیجا جائیگا ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰— جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہ جائے۔

۱۱— پتہ مولوی وحید الدین سلیم علیگڑھ دفتر رسالہ معارف

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۱ | یکم اگست ۱۸۹۹ء | نمبر ۱

لوازم شاعری

بہت ہیں نظم کے بارے میں مختلف آرا ہیں کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا
کوئی تو کہنہ روش کو پسند کرتا ہے کسی کی طبع ہے طرز جدید کی شیدا
ہماری راے ہے اس باب میں غرض جو کچھ خلاصہ اُسکا ہم اس جا پہ کرتے ہیں املا
مقدم اسمیں ہے خود شاعروں کی چھان بین کہ شاعری کے موزوں ہے کسکو تنہا
تو حق یہی ہے کہ شاعر ہو فطرتی شاعر بغیر کسب کے ہو جوش اُسکے دل میں بھرا
طبیعت اُسکی ہو بے اختیار مائل نظم ہو سر میں اُسکے شکین نظم کا سودا
تعلق اُسکو ہو طبعی کلام موزوں سے کہ جو شعر تو سامع کی بھی ہو پیدا
غرض سے پاک ہو یہ عشق فطرتی اُسکو کیے بغیر نہ چین آئے طبع کو اصلا
دروس علم سے بھی باخبر ہو حتی الوسع فنون شعریہ حاوی ہو اُسکی طبع رسا
علاوہ علم کے ادراک میں بھی تیزی ہو رموز بیاں کے نتائج پہ اُسکی [illegible]
ضرور تو ہے کہ بھی آگاہ ہو زمانے کی مذاق ملک سے بھی بیخبر نہ ہو اصلا
میسر آئی ہو سب طرح کی اُسے صحبت ملا ہو سب سے ادانی سے لیکے تا اعلا
طبیعت اُسکی تعصب سے اجتناب کرے گداز ہو دل عاشق مزاج بھی اُسکا
ہو اختلاف پسند اسکی بھی نظر حاوی بخصوص ہو فن تاریخ میں ید طولا
تو ایسے شخص کو لازم ہے شاعری کا رہے وہ شوق جو تکمیل میں تو بے بہا
نتیجے جیسے ہیں ازروے فضل خدا گروہ اسمیں یا ہست کرے تو ہو یکتا
رہیں وہ ملک میں خوش تکلف ہو دیکھ بھال کے ادبی نظم میں پیدا

رہی یہ بات کہ طرز کلام کیسا ہو کہ اہل فہم کہیں جسکو واقعی اچھا
صنعت کلام کی تفصیل و شرح و بسط کے ساتھ فن بیاں کی کتابوں میں ہے رقم ہر جا
ضرورت اُسکے بیان کی نہیں ہے اسجا پر فہم کیلئے کافی ہے بس یہی نکتا
کہ سب سے بڑھ کے سخن میں ہے صنعت تشبیہ کئی اسکی ہیں اقسام منضبط ہر جا
ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے کہ واسطے ہیں کہ ان میں نہیں یا کہ بجا
اگر ہیں لازم و ملزوم میں وسائط کم تو ایسی شکل کی تشبیہ میں ہے لطف بڑا
وسائط اسمیں بڑھیں جسطرح کثیر الرماد تو ابہام ہوگا پراگندہ فہم سامع کا

مثلاً مہمان نواز یا مرد سخی کو کثیر الرماد لکھنا (یعنی بہت سی راکہ والا) کھنڈالا
سلاست کہ جس شخص کے یہاں راکہ کا ڈھیر زیادہ ہوگا تو لازم ہے کہ اُسکے یہاں
لکڑیاں زیادہ جلتی ہوں اور جسکے یہاں لکڑیاں زیادہ جلتی ہوں لازم ہے کہ کھانا
بھی زیادہ پکتا ہو اور جسکے یہاں کھانا زیادہ پکیگا لازم ہے کہ مہمان بھی زیادہ پہنچے
غرض اتنے لوازم اور واسطوں کے بعد اتنی بات نکلی کہ کثیر الرماد مرد سخی کے
بارے میں کہا گیا ہے لامحالہ لازم و ملزوم میں جب اتنا وسائط بیچ میں ہے
سامع کو فہم میں ایک طرح کا اعوجاج پیدا ہوگا حتی الوسع ایسے وسائط جن
لزوم معنی میں ایسی بعدیت ہو ترک کرنا چاہیے عام ازینکہ یہ وسائط
تشبیہ کے اقسام میں ہوں یا غیر تشبیہ میں نافہم و تدبر و لیکن ہیں
المبالغین میں کسی وصف کو حد وجہ تک پہونچا دینے کو مبالغہ کہتے
چاہیے کہ یہ اتفاقاً بسبیل استبعاد و امتناع ہو بیان تک کہ سننے والے
کی نظر میں بھی اس سے زیادہ کوئی وصف نہ آئے۔ اور مبالغے کی

خلاصہ یہ کہ بہت ورکی کوشش کی ہے کہ سُننے والوں کو ایک استعجاب پیدا
نہیں لطیف و تشبیہ غیر حسی بھی ہو مشبہ بہ ہو فقط حسین ہو ہر یہ پیدا
بھی ہے اگر کنایات و استعارے ہیں ہو کہ جسمیں لطف نہو اُس سے اجتناب
مبالغہ میں بھی تبلیغ ہو کہ ہو اغراق البتہ نتیجہ ہو جو موثر تو شعر میں پیدا
غلو کے باب میں ہے رائے برخلاف مری ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں عیب ہوا
اسیطرح جو صنائع خلاف فطرت ہوں کبھی لطیف نہیں نظم و نثر میں حاشا
وہ صنعتیں جو حقیقت کو مشتبہ کر دیں کہ جنکے قطع نظر آنسے بالیقین عقلا
اسی پہ ختم میں کرتا ہوں بحث معنی کہ ہیں بھی ایسے صنائع ہیں جنکا
رہے صنائع لفظی تو وہ بھی ظاہر ہے کہ لفظ پر ہے مقدم لطافت معنی
خلل صنائع لفظی سے جب پڑے معنی میں تو اہلِ ذوق پہ یہ لازم ہے ترک تام کا
نہ یہ کہ لفظ میں ایسے جا پڑیں منہمک ایسے کہ اصل حال مضموں کی بھی نہ ہو پروا
یہ مانتا ہوں کہ وسعت نہیں ہے اُردو میں کچھ اور تنگ کریں اسکو یہ نہیں زیبا
جو مٹے ہوئے ہوں بانو پہ سبکی جو الفاظ لغت کو ڈھونڈھکے صحت اسکی طلب
بھی کہ اصل زباں میں ہے اسطرح لغت محاوروں پہ یہ ایراد بیجا کیسا؟

مختصر تقسیم ہے تبلیغ و اغراق و غلو۔ اگر وہ مبالغہ ازروی عقل و عادت کے ممکن ہو تو اسکو تبلیغ کہتے ہیں جیسے "اس از کے باب میں تا دمِ مرگ میرے لب ہرگز نہ ہلیں گے" ممکن ہے کہ قائل کا ادعا صحیح ہو کیونکہ عقلاً و عادتاً یہ بات محالات میں سے نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ادعا ازروی عقل کے ممکن مگر عادتاً ناممکن ہو تو اسکو اغراق کہیں گے جیسے "میں ہندوستان سے لندن دو دن میں پہونچ گیا" ازروی عقل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسی سواری ایجاد ہو جائے کہ دو دن میں اکیلے سکا ہندوستان سے لندن پہونچ جائے مگر عادتاً جیسا کہ دیکھا جاتا ہے بالکل ناممکن ہے۔

اگر ادعائے مذکور ازروی عقل و عادت ناممکن ہو تو اُس مبالغہ کو غلو کہیں گے مثلاً کسی مردِ شجاع کی تعریف میں کہیں کہ "اگر عکس اُسکی تلوار کا سمندر میں پڑے تو جتنے آبی جانور ہیں مرغِ بسمل ہو جائیں"۔

* کما قال المحققون سالکانِ مسالکِ بلاغت را واجب است کہ مراعاتِ معنی را بر لفظ مقدم دارند و بجہتِ رعایتِ صنائع لفظی معنی را تابع لفظ نسازند ۱۲ منہ

وہ لفظ جسکی ہو شہرت فقط گنوار کو نہ بولتے ہوں جسے بھول کر کبھی شرفا
وہ لفظ جسکی رکاکت ہو برملا ظاہر کہ سنکے جسکو تبسم ہو زیر لب فصحا
وہ لفظ صرف جو ہو اہلِ شوق میں رائج وہ لفظ جس سے نہ مانوس ہوں کبھی شعرا
وہ لفظ صرف جو ظاہر میں خوشنما ہو مگر کہ جسکے ٹکڑے کیا اور پھر جس سے لطافت معنی
وہ لفظ ترک کیا ہو جسے فصیحوں نے جیسے بجائے نشہ بالفتح جیسطرح سے نشا
تو ایسے لفظ کا حکماً بہت ضرور ہے ترک نہ تاکہ فصاحت میں نظم کی ہو خطا
بعینہ یہی حالت ہے ایسے لفظوں کی کہ جنسے کچھ نہیں مطلب عالموں کے سوا
چلے عبارتِ اُردو میں اہلِ فارس کی چال کہ تا نہ صورت ظاہر ہو اُسکی نازیبا
کئی زبانوں سے مل کر بنی تو ہے اُردو وہ زیادہ آمیں فقط فارسی ہے یا بھاشا
زبانِ فارس کی تحصیل سب سے اقدم ہے بغیر اسکے کوئی اُسکو لکھ نہیں سکتا
بہت ضروری ہے اُردو کو فارسی دانی نہ جانتا ہو جو بھاشا تو کچھ نہیں پروا
جدا کرے بھی اگر کوئی فارسی ہی آئے یہ لاعلاج تعلق مٹا نہیں سکتا
اسی لئے ہی تتبع بھی فارسی کا ضرور ورنہ خراب ہوگا بغیر اسکے نظم کا خاکا
مگر تتبع لفظی کی صرف حاجت ہے کچھ اسقدر نہیں لازم تتبع معنے
جہاں تلک ہے مری دسترس میں ہے یقیں مجھے پسند ہے انداز اہلِ یورپ کا
قلم سے لیتے ہیں لوگ وہ قلم کا کام اُتار لیتے ہیں گویا ہو بہو نقشا
مبالغہ ہے نہ اغراق اُنکے مضموں میں وہ صنعتیں نہیں جو واقعی ہیں بے سر و پا
وہ جانتے نہیں ابلی کا آم کر دینا جسے سمجھتے ہیں معراج ادھر سب شعرا
بیان ہیں اُنکے اثر خیز لفظ سب شیریں کہ جسکے سنتے ہی سامع کو جوش ہو پیدا
نمک کلام میں اتنا کہ اہلِ ذوق خوش ہوں بلیغ اصل مضامین سلیس طرزِ ادا
بعینہ مگر اُنکی ضرور کیا تقلید ہے کہ مقتضا بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا
ہر ایک چیز کو اُسکی جگہ پہ غور کرو کہ مقتضائے طبیعی ہے اُسجگہ کا کیا؟
یہاں کا ذوقِ سلیم اسکو جب کرے تسلیم تو ویسی بات کی تقلید ہوسکیگی روا
وہ شے تو خوب ہے لیکن بحالتِ تقلید وہ رنگ و روپ سلاست نہ رہیگا اسکا
مزید یہ کہ نہ ہو مقتضائے طبعی ملک پھر اہلِ ذوق بھی اسکا اٹھا سکیں نہ مزا
اُتارنے کو اُتار لی نقل اصل کی لیکن کہ اصل شے کا بھی بالکل بدل گیا نقشا
تو ایسی نقل کا حاصل نہیں بجز اسکے کہ اصل شے سے بھی ہو اہلِ ذوق کو ابا
رہی یہ بات کہ اُردو کی نظم کیسی ہے کہ خاص و عام کے دل پر اثر کرے پیدا
تو اسمیں راز وہی صاف صاف ظاہر ہے سیاقِ نظم کو دیکھو میں کہہ چکا
مذاقِ ملک کو سمجھے ضرور تم لکھے کہ ہو وہ امر جو ہو مقتضائے زمانے کا

محاورہ نہیں والی آوردی متانت ہے سنجیدہ خلق ہو مضمون حالِ سے
بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا
طریقِ نظمِ سخن کا وہ اختیار کرے کہ ان لبوں سے طرزِ قدیم کے شعرا
غزل میں صرف کریں حسن و عشق کے مضمون نصیحتیں بھی ہیں گو نہ اُسکی ہو بنا
یہ حسن و عشق مجازی نہ ہو حقیقی ہو جسے عبادتِ روحی سمجھتے ہیں عرفا
اگر مجاز کا پہلو بھی ہو تو ایسا ہو کہ اہلِ حال کے دل پر ضرور ہو اثر
جو ہوں وہ سب کے مخالف و لفظ ترک کریں کہ پھر نہ کوچۂ عرفاں میں آئے کوئی رسوا
مجاز کیلئے جو بات ہے فقط شایاں کسی طرح سے حقیقت کو وہ نہیں ہے روا
غزل میں صرف کریں حکمتِ الٰہی کو نہ یہ کہ طائفہ داروں کا نظم ہو نخرا
سلیس لفظوں میں لائے فلسفی مضموں کریں مسائلِ فن محاوروں میں ادا
کہاں مسائلِ حقانیت کہاں وہ روش کہ جسکو پڑھ کے ہو پیدا خواہش بلکہ حیا
یہ مانتا ہوں کہ انگلوں نے یوں کہا ہے مگر تتبع انکا اسمیں کرنے کی ضرورت کیا
بیانِ اصلِ حقیقت کریں مگر کیونکر کہ ہو مجاز کا ہلکا سا پیچ میں پردا
علاوہ اسکے قصیدوں میں کیا ضرور ہے کہ ہر امیر کو کہدیں سکندر و دارا
بخیل اصل میں وہ ہو مگر بحکمِ طمع بنائیں نظم میں ہم اسکو حاتم و کسریٰ
نہ اُسکے دل پہ اثر ہو نہ اپنے دل میں اثر نتیجہ یہ کہ ہنسیں دیکھ دیکھ کر عقلا
از آں قبیل سمجھ لو بہت سی باتیں ہیں کہ جنکو پڑھتے ہی بیزار ہو گا ہر دانا
اثر زیادہ تو ہوتا ہے نثر کی نسبت اسی لیے ہے فقط شعر و شاعری کی بنا
خلافِ فطرتِ انسانیت ہو جو مضموں تو اسمیں قوتِ جذبِ قلوبِ خلق کہاں
کچھ انسے بحث نہیں جو نہیں ہیں اہلِ بحث کلام ہوتے ہیں جنکے ہمیشہ بے سر و پا
غرض مری ہے ان ایسوں سے جو ہیں فہمیدہ سمجھ کے چلتے ہیں ادبی نظم کا رستا
بہت سے انہیں میں ہیں طرزِ قدیم کے عاشق بہت سے انہیں میں ہیں طرزِ جدید کے شیدا
بہت سے وہ ہیں کہ جنکی غرض یہی ہے صرف محاورے ہوں فقط شوخیاں کریں پیدا
وہ بستہ مری غرض ہے یہ تصویر ہے کہ اب زمانے نے بدلا ہے اور پیرایا
برخلاف نہیں شاعری کی بلا ہے کبھی فنوں نے سمجھا ہوں اشرف الا
تتبع ہوں شعر کے مستول نہ یہ کہ سلسلہ اسمیں فقط ہو لفظوں کا
استعاروں کی بے معنی بناوٹوں کی بھرمار ان استعاروں میں یا مسالہ ہے پڑا
سننے سے تعجب ہو اثر ہو غلاف کہے پہ عقل ان وشوں کا حاصل کیا؟
قرار تا گل و بلبل بہار و خزاں جنون و عشق و جفا و وفا و ناز و ادا
حسن و آل و نیزی کرشمۂ حسن و جنونِ عاشق و جوشِ زمانہ سودا
رہا جبر ہو پند و نصائحِ واعظ شراب ساقی و مہرو ساغر و صہبا
قصور و حور و چمن آتش و آسمان و زمیں بہشت و دوزخ و رندی و توبہ و تقوا
یہ سب گرہوں سے تا مگر یہ تمثیل اساتذہ نے کیا ان کو جسطرح املا
اساتذہ بھی وہ عارف جو اپنے وقت کے تھے غرض کہ اور نہ تھی جنکی شعر گوئی کے سوا
تو شاعری نہیں اک قسم کی عبادت ہے اسیکا نام ہے مقاماتِ مصعد اعلا
جو اسطرح کے مضامیں ہیں جا ملتے ہیں ہزار ڈھانکئے انپر مجاز کا پردا
مگر جو اسکی مخالف ہے نیتِ شاعر تو اُسکے شعر سے ہوتا ہے خود بخود پیدا
کہ شعر نیت ہے فقط ہوسناکی کجا مسائلِ حقانیت یہ طرز کجا
وہ شعر کیا ہے کہ بزرگوں کے سنا جو پڑھتا تو اسکی شوخیِ مضموں سے خود ہو جھلمیں حیا
کہیں اُبھار جوانی کا شعر میں ہے نظم کہیں دو پٹے کا آنچل کسی جگہ ڈھلکیا
مری زمانے میں اخلاق سوز کیوں نہ ہے فن نفاق و کبر ہیں بدنام کیوں ہے جھگڑا
ہر ایک نازاں ہے بانگِ انا و لا غیری کسی کا کوئی معترف نہیں ہے اپنے سوا
غضب ہے یہ کہ ریاضت کے بعد بھی اکثر ہے سب میں عیب کم و بیش خود پسندی کا
ہر شاعروں کو گو تو کسطرح طبع کا ہے اگر کسی کے سنا بھی تو اسمیں ہو گی ریا
سبب یہ ہے کہ ہوا جو آجکل کے عالم کی کیا دلوں کو تعصب نے مبتلا
صفائیِ قلب کوسوں لگ گئی فنا ہر ایک ہو گیا کبر و نفاق کا پتلا
بس انتہا ہے یہ اپنی کہ غیر تو ہے غیر جو دیکھئے تو مخالف ہے باپ سے بیٹا
خدا کرے کہ مری قوم ہو نفع یہ بات کسی طرح نہ رہے شاعروں میں کبر و ریا
یہ اپنی رائے ہے ظاہر کیا ہے ورنہ کسی پہ جبر ہے مطلب میں یا ہے بھی
یہی خیال ہے جا لیں ل سے لیں اگرچہ سن بچا و شعر و شعر کجا

(علی محمد شاد)

معجزات ہم کیوں مانیں اور کیوں نہ مانیں؟

یورپ میں آجکل معجزات کے باب میں جو عالی خیال جو بلند خیالات کر رہے ہیں اُن کے موافق یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ اس میں بہت سی اصطلاحات حکمیہ۔ فلسفیہ۔ مذہبیہ آئی ہیں جنکے معانی حتی الامکان ہم نے بیان کر دیے ہیں جبکہ یہ معانی پڑھنے والوں کے ذہن نشین نہیں ہونگے مضمون اچھی طرح اُنکی سمجھ میں آ نہ سکیگا اور نہ لطف

بڑے اور ضروری سوالات یہ ہیں کہ مافوق الفطرت کیا شے ہی؟ اس سے ہمارا مطلب و مقصد کیا ہوتا ہی؟ اسکی تعریف ہم کیا کیا کرتے ہیں؟ اس زمانہ میں کہ علوم و فنون کا دریا جوش و خروش میں آ رہا ہی مافوق الفطرت کا اقرار کرنا نہایت مشکل ہی اور اس اقرار سے زیادہ اسکا انکار کرنا دشوار ہی دونوں طرح مشکلات لاینحل ہیں نہ چھوڑے ہی بنے نہ پکڑے ہی بنے) مافوق الفطرت کا انکار کرنا مذہب پر لعنت بھیجنا ہی اور اسپر حملہ کرکے اسکی اصل کو منہدم کرنا ہے۔ اسکا اقرار کرنا مذہب کا اصل اصول ہی۔ یہ مذہب خواہ کوئی سا ہو اور کیسا ہی ہو۔ فوق العادت کے باب میں سوالات بہت ہی کم صاف صاف پیش ہوتے ہیں اور انکے جواب اور بھی زیادہ کم صاف صاف دیئے جاتے ہیں۔ یہی بڑی فاش غلطی فلسفے کے ہر سوال کے اندر ہی کہ وہ نہ صاف بیان کیا جائے اور نہ اسکا جواب صفائی سے دیا جائے اسی سبب سے انسان کو نصف دشواریاں اور دقتیں پیش آتی ہیں کہ باریک خیالات زبان کے تاریک لفاظ میں مخفی ہوتے ہیں۔ مافوق الفطرت کے اکثر معانی مختلفہ لیئے جاتے ہیں اور معانی متضاد میں وہ مستعمل ہوتا ہی۔ مگر اسکے باب میں جو خیالات ہیں وہ علحدہ علحدہ ہوسکتے ہیں اور اُن میں تمیز ہوسکتی ہی۔ بعض وہ آدمی ہیں کہ فوق الفطرت پر یقین اس سبب سے نہیں کرتے ہیں کہ وہ خدا پر بالکل یقین نہیں رکھتے ہیں وہ ملحد ہوتے ہیں اور خدا کے وجود سے منکر۔ مگر بعض آدمی وہ بھی موجود ہیں کہ ملحد نہیں ہوتے ہیں مگر وہ فوق الفطرت کے یقین کرنے کو سخت دشوار جانتے ہیں۔ انکو خدا تعالیٰ کی ذات واحد پر کوئی شبہ نہیں ہوتا بلکہ یقین کامل ہوتا ہی مگر اُن کو ایسا ہی یہ یقین واثق ہوتا ہی کہ اللہ میاں ہمیشہ قوانین فطرت کے موافق اپنے سارے کام کیا کرتا ہی اُسکی شان سے بعید ہے کہ وہ ان قوانین فطرت کے خلاف کام کرے۔ اسلیئے اُن کے نزدیک فوق الفطرت یعنی خلاف قوانین فطرت معدوم ہے

اسکا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بڑا فرانسیسی محقق عالم کہتا ہی کہ خدا کی خود ذات فوق الفطرت ہی۔ خدا پر یقین کرنا اور فوق الفطرت کو نہ یقین کرنا آپس میں متضاد و متناقض ہیں مگر صرف اسکا حسن بیان ہی کوئی فوق الفطرت کی تعریف نہیں نہ یہ امر نفس الامری ہی کیونکہ دنیا میں ایسے تناقض کے ماننے والے موجود ہیں کہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور فوق الفطرت پر یقین نہیں کرتے ۔ یہ ایسا امر واقعی ہی کہ اسکے ماننے میں کسیکو کلام نہیں (سید کو یاد کرلو) اگر ہم فلسفہ و مذہب دونوں کی تحریروں میں فوق الانسان (قوت انسانی سے باہر) کو فوق الفطرت کا ہم معنی ٹھراکر استعمال کریں تو پھر فوق الفطرت کے تسلیم کرانے میں کچھ دقت باقی نہیں رہتی اسلیئے کہ فطرت نیچر کی ساری قوتیں اور کام فوق الانسان یعنی قدرت بشری سے باہر ہیں۔ پس انسان سے مافوق انکی اصل کی توجیہ انکی توانائی کا مقابلہ کرسکتا ہی اور انکی تاثیرات کو سمجھ سکتا ہی یہ معنی اور وہ معنی جو عقیدہ اور ایمان کی اصل فوق الفطرت کو ٹھراتے ہیں ایسے نہیں ہوسکتے کہ وہ بہت سے دانشوروں کے دلوں کو فوق الفطرت کو تسلیم نہ کرانے دیں۔ اب سوال یہ ہی کہ وہ کونسے اِن کے معنی ہیں جو فوق الفطرت کے تسلیم کرانے میں دشواری ڈالتے ہیں؟ اور وہ کونسا خیال ہی کہ جسنے اُس سے مقابلہ کرکے اپنے مقام سے اسکو نکال دیا ہی؟ یہ فطرتی قوانین ہیں جنہوں نے فوق الفطرت کو نکال دیا ہی۔ قانون فطرت فوق الفطرت کو ماننے نہیں دیتا۔ قانون فطرت موجودات عالم پر ایسا مُسلّط ہو رہا ہی کہ وہ انکی ترتیب و نظم میں کبھی خلل نہیں آنے دیتا اور ذرّہ کی برابر بھی تغیر و تبدل نہیں ہونے دیتا۔ اس زمانے میں اس قانون فطرت کی فرمانروائی کا خیال اس سبب سے زیادہ زبردست ہوگیا ہی کہ علوم طبعیات کی ترقی عظیم ہوئی ہی جو اس زمانہ حال کا بڑا کارِ نمایاں سمجھا جاتا ہی۔ ہر روز سائنٹیفک تحریروں کے طومار کے طومار اور انباروں کے انبار لگتے ہیں جنمیں قانون فطرت

معجزات ہم کیوں مانیں اور کیوں نہ مانیں

کا بیان ہوتا ہی۔ مگر کمتر اور شاذ و نادر ایسا ہوتا ہی کہ اس قانون کے معنی صحیح صحیح اور اسکی تحدید ٹھیک ٹھیک ایسی ہو کہ کُل مظہراتِ عالم پر حاوی ہو اکثر وہ بیہودہ اور پوچ و مہمل زبان میں بیان ہوتے ہیں جس سے وہ خیالات جنمیں تمیز ہو غلط ملط ہوجاتے ہیں اور غلط مفہومات ذہن میں جاگزیں ہوجاتے ہیں۔ توجیہِ قانون کے لیئے فقط ظاہری اور خارجی عالم کے واقعات کی تقسیم و تنویع و توزیع یا ترتیب کو کافی سمجھتے ہیں اور اس سے آگے زیادہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں جانتے۔ گو بنی نوعِ انسان پر یہ خدا تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہوا ہی کہ اسنے اپنے علم کا محیط بڑا فراخ و وسیع کرلیا ہی مگر اسے اپنی عقل و حواس کے دروازے کھول کر نیچر (فطرت) کی روشنی اس افراط سے اپنے ذہن کے اندر کھینچا لی ہی کہ بے اعتقادی کی شب اور عقلی تاریکی اسپر چھا گئی ہی کہ جسنے اسرارِ ربانی پر تحقیقِ انسانی کو ترجیح دی ہی۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ کہاں اور کیونکر مشکل آن کر پڑتی ہی؟ موجوداتِ عالم میں جہانتک ہم دیکھتے ہیں وہاں تک قانونِ فطرت کی فرمانروائی اور عالمگیری نظر آتی ہی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال اب ہوا ہی کہ قانونِ فطرت سے خوق الفطرت مخالفت اور ضد رکھتا ہی یا اُس سے فوقیت رکھتا ہی۔ یا اُسکا ناسخ اور توڑنیوالا ہے۔ خواہ کیسا ہی کوئی عجیب غریب واقعہ قانونِ فطرت کے موافق وقوع میں آئے کوئی اُسکو مافوق الفطرت نہیں خیال کریگا گو یہ اُنکو نہ معلوم ہو کہ وہ کس قانون کے موافق واقع ہوا۔ یہ لاعلمی اُس واقعہ میں مافوق الفطرت کی ذاتی صفت نہیں پیدا کریگی۔ اُسکو حقیقتاً یہی یقین کریگا کہ وہ کسی قانون کے موافق واقع ہوا ہی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قانونِ فطرت کی فرمانروائی اور عالمگیری کا قائل ہوگا اور اُسکو یقین ہوگا کہ کوئی واقعہ بغیر اس قانون کے واقع نہیں ہوسکتا وہ مافوق الفطرت کو ہرگز نہیں مانیگا۔ جب وہ کسی نئے واقعے کو عجیب غریب اور حیرت انگیز دیکھیگا اور اپنے فہم و فراست کی قدرت سے اسکا سمجھنا باہر جائیگا تو اس سے وہ یہ نتیجہ نکالیگا کہ یہ شے کسی قانونِ فطرت کے مطابق واقع ہوئی ہی گو اُس سے میں لاعلم ہوں۔ اس نتیجے کے صحیح ہونے سے کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا اسلئے کہ کثرت سے جدید عجیب غریب مظاہر کا ظہور اسیطرح ہوتا ہی۔ یہ نتیجہ عقلِ انسانی کی نخوت سے نہیں پیدا ہوا بلکہ عجز و انکسار سے۔ مظاہرِ عالم ہمارے گرد ظاہر ہیں اور ہمارے اندر باطن ہیں جن قوانینِ فطرت کے موافق ظہور پاتے ہیں اُن کے حد و گرد ہمارے جہان ہی کا دائرہ بڑا فراخ ہے۔ یعنی ہم بہت سے قوانینِ فطرت سے لاعلم ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی عقل کی بات نہیں ہی کہ جب ہم کوئی عجیب غریب چیز دیکھیں تو جان لیں کہ وہ فطرت کے قانون اور عادت کے موافق واقع ہوئی ہوگی مگر اس نتیجے کے حق جاننے کیلئے یہ ضرور ہے کہ ہم نیچر (فطرت) کے ایسے معنی وسیع لیں کہ اُس میں وہ ساری چیزیں داخل ہوں جو ارض و سما و بحر و ہوا اور نفسِ ناطقہ انسانی میں موجود ہیں اور اسبابِ عالم کے بنانے میں جتنی کام ہوتے ہیں وہ سب اس میں داخل ہوں۔ اِن کاموں میں سب سے زیادہ کارِ عظیم ہمارا نفسِ ناطقہ اور ارادہ کرتا ہے مگر تعجب ہے کہ جب ہم قوانینِ فطرت کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے نفسِ ناطقہ و ارادہ کو فراموشِ خاطر کرتے ہیں اور عالمِ ظاہری میں ایسے محو ہوجاتے ہیں کہ عالمِ باطن کی خبر نہیں رکھتے۔

ایک بڑے عالمِ متبحر اور علومِ طبعیہ کے ماہر کا ذکر ہے کہ وہ مظاہرِ حرارت پر لکچر دینے کھڑا ہوا اور زوروں کے باہمی لازم و ملزوم ہونے کے مظاہر بیان کرنے لگا تو اُسنے کہا کہ ایک قسم کا زور دوسرے قسم کے زور میں یوں تحویل ہوسکتا ہے اور ایک زور سے دوسرا زور پیدا ہوتا ہی اور کوئی زور جبتک نہیں پیدا ہوسکتا کہ پہلے سے کوئی زور موجود نہ ہو۔ یہ بیان کرتے کرتے اُسنے یہ کہدیا کہ نیچر میں از خود کسی چیز کا پیدا ہونا معدوم ہے مگر اس وقت

یہ لکچرار اس بات کو بھول گیا کہ یہ از خود پیدا ہونا اسمیں خود موجود تھا۔ الفاظ کا انتخاب۔ مصالح کا بہم پہنچانا۔ تجربونکا ترتیب دینا جس سے مقصود و مطلوب حاصل ہو۔ غالبًا لکچرار کو ان چیزوں کے از خود پیدا ہونے سے انکار اس سبب سے ہوا ہوگا کہ وہ اُسکی نظرگاہ میں پیش نظر نہ تھے۔ اس کا نفس ناطقہ اور ارادہ قوانین نیچر سے معاملہ کرنے میں مصروف تھے مگر لکچرار کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں خود قوانین فطرت کے اجزا ہیں اور منشا اسکے تابع ہیں۔

انسان نیچر سے تعلق رکھتا ہے وہ اس سے نہ مافوق ہے نہ جدا ہے نہ اسکا توڑنیوالا ہے اگر وہ خود مافوق الفطرت ہوتا تو اُسکو اپنی ذات کے یقین کرنے میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا تھا وہ اپنے نفس ناطقہ کے عرفان کی روشنی پر اور امور حقہ دیکھتا ہے۔ غرض قوانین فطرت میں انسان کی جسمانی اور روحانی ساری قابلتیں اور استعداد یں داخل ہونی چاہئیں۔ ان کے نہ داخل کرنیکا دھوکا اس سبب سے پڑتا ہے کہ اصطلاحات کی تعریف ٹھیک ٹھیک نہیں کی جاتی نیچر کے تعلق کا احاطہ ایسا تنگ کیا جاتا ہے کہ صرف مادے سے نیچر متعلق ہوجاتا ہے اور اسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسمیں خواص مادی کے سوا کسی اور چیز کی گنجایش نہیں۔ اسطرح سے عالم عقلی یا روحانی جس میں ہم رہتے ہیں حرکت کرتے ہیں جیتے ہیں نیچر سے خارج ہوجاتا ہے۔ مگر انسان کی ذات سے جتنی چیزیں تعلق رکھتی ہیں وہ نیچر سے متعلق ہیں جہاں مافوق الفطرت کے سمجھنے میں دقت پیش آئے تو اول یہ سمجھنا چاہیے کہ فطرتی اشیا کیا کیا ہیں

یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیے کہ موجودات کائنات میں انسان کا عمل اور سب عملوں سے زیادہ فطرت کے موافق ہے۔ ہم اپنے ہی عمل سے زیادہ واقف ہیں اور درحقیقت یہی عمل ہے جسکو ہر اندازے کے اندر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی حکمت اور ذہانت جب کسی عجیب غریب کام کی مرجع ہوتی ہے تو وہ کام

مافوق الفطرت کے درجے سے خارج ہوجاتا ہے۔ فطرتی (فطرت کے موافق) کے معنی وسیع سے لینے چاہئیں جسمیں انسان کے عقلی اور روحانی مظہرات داخل ہوں۔ اور آدمی اور اوسکے سارے کام فطرتی سمجھے جائیں اور اسی سے مافوق الفطرت کی تمیز کیجاوے پہلے اس سے کہ مافوق الفطرت کے معنی سے آگاہ ہوں یہ سوال و جواب بھی سُن لو۔

سوال قوانین مادی سے انسان کا تعلق کیا ہے

جواب ان قوانین کی نسبت قوت انسانی اتنی و[...]
رکھتی ہے کہ انسان اول اُن قوانین کا استکشاف کرتا [...]
اُن کی تحقیق کرتا ہے۔ پھر اُن کو اپنے کام میں لاتا ہے [...]
انسان کا یہ مقدور نہیں ہے کہ وہ کسی قانون کو قائم [...]
کرسکے یا کسی قانون کو معطل و معزول کرسکے۔ اسکے [...]
کام کرنے کی فقط اتنی بساط ہے کہ وہ قوانین فطرت [...]
باہمی عمل و رد عمل کی ہدایت ایک حد معین تک [...]
سکے۔ یہ قوانین انسان کے کام کرنے کے ایسے اوزا[ر]
اور آلات ہیں کہ جنکو وہ اپنے ارادے سے استع[مال]
میں لاسکتا ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اور کرسکتا ہے
اونمیں وہ ان قوانین کو کام میں لاتا ہے۔ انسان [...]
تھوڑا ہے۔ اسکی قوت تھوڑی ہے اسلئے اُسکی قابل[یت]
محدود ہے۔ قوانین فطرت کا جتنا علم اُسکا زیادہ ہو[...]
وہ اُسکو اپنے کام میں لاتا جاتا ہے اور اپنے مقا[صد]
منتظم اور سربراہ کار اُن کو بناتا جاتا ہے۔ یہ کچھ ضرو[ر]
کہ فطرت پر انسان کی قدرت علم کی ہمقدم و ہمشار [...]
جائے۔

علم ہیئت میں ہمکو مادی قوانین فطرت بہت [...]
معلوم ہیں جنکو ہم اپنے کسی کام میں نہیں لاسکتے۔ [...]
ایسے قوانین ہیں کہ ہم عملاً اُنکو برتتے ہیں مگر یہ علم [...]
اپنی ذات کے علم پر ہماری قوتوں پر ہمارے [...]
پر جو ہمارے نفس ناطقہ اور عالم کے قوانین اور آئینوں [...]

درمیان ہر اپنا پرتو اور عکس ڈالتا ہے۔ مادی قوانین فطرت کے علم سے ہم کو عالمِ مادی پر زیادہ اختیار اور اقتدار حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اس ذریعے و توسل سے ہزاروں چیزیں ہم ایسی بنانے لگے ہیں کہ جنمیں سے ہر ایک چند صدیوں پہلے مافوق الفطرت (معجزہ) سمجھی جاتی تھی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن چیزوں میں مافوق الفطرت کی صفت کا سمجھنا اونکا غلط تھا۔ اسلئے کہ یہ چیزیں پہلے مافوق الانسان (انسان کی قدرت سے باہر) سمجھی جاتی تہیں مگر اب وہ ایسی نہیں رہیں۔ مثلاً اب قوانینِ نیچر کا ماہر دھکتی ہوئی آگ پر برف جما دیتا ہے جو ظاہرا فطرت کی عادت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس منظر کو پہلے لوگ مافوق الفطرت (معجزہ) جانتے تھے اب اسکو قانونِ فطرت کے موافق جانتے ہیں۔ جیسی اس صدی میں قوانینِ فطرت کے علم کی جلد جلد ترقی ہوئی ہے اگر چار سو برس تک اسکا یہ دور دوران رہے تو بہت سی چیزیں جو مافوق الفطرت (معجزات) معلوم ہوتی ہیں وہ فطرت کے موافق معلوم ہونے لگینگی۔ اور کوئی واقعہ اور کوئی منظر نہیں ہیگا جسکو ہم تعجب کریں۔ یہ مضمون وسیع بہت ہے اور اسکا سمجھنا بھی مشکل ہے۔

(ذکاء اللہ)

مُرغیوں سے نصیحت

۱۔ مرغیوں کا پالنا جسطرح کھانے اور تجارت کیواسطے مفید ہے اوسیطرح اس سے بہت نصیحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ جب کوئی مرغیاں پالتا ہے کچھ کو اونمیں سے کھا لیتا کچھ کے انڈے لیتا ہے۔ انڈوں میں سے بھی کچھ کھانے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ کچھ کے بچے نکلوائے جاتے ہیں جب بچے نکل آتے ہیں تو اونکی حفاظت کیجاتی ہے۔ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر وہی دورِ تسلسل ہوتا ہے یعنی یا وہ اور یا اون کے انڈے کھالئے جاتے ہیں یا پھر بچے نکلوائے جاتے ہیں۔

یہ تو ہوا چلا جاتا ہے مگر ایسا ہونا بعض لوں پر ایک ایسا نصیحت انگیز نقش جما رہتا ہے جسمیں یہ لکھا ہوتا ہے۔

انسان ایک غرض کا پتلا ہے اسکی رعایت۔ اسکی شفقت۔ اسکی مہربانی اور خدمت جو کچھ ہے وہ اپنے ہی نفع کے واسطے ہے۔ جو شخص مجھکو (مرغی کہتی ہے) کھاتا نہیں ہے اوسکو اسکی پروا نہیں ہے کہ میں یا میرے انڈے یا میرے بچے کہاں اور کس حال میں ہیں۔ جب جو کوئی مجھ پر اظہارِ شفقت کرتا ہے تو اوسکے معنی یہ ہوتی ہیں کہ اب ہم اور ہماری نسلیں اُسپر قربان ہونگیں۔

جب میں انڈوں پر بیٹھتی ہوں تو میرے واسطے دانے اور پانی کا اوس سے زائد سامان مہیا کیا جاتا ہے جو جنگلوں میں مجھکو ملتا۔ اپنے ننھے سے بچوں کی حفاظت میں جو کچھ مجھ سے کوتاہی رہتی ہے اوسکو میرا مالک پورا کیا کرتا ہے۔ چیلوں سے کوّوں سے اونکو بچاتا ہے اُن کی عمر و قد کے موافق چگا اور دانہ مہیا کرتا ہے۔ گرمی اور سردی سے اُنکو دور رکھتا ہے۔ غرض کہ پوری ہمدردی اور دلسوزی صرف کرتا ہے لیکن صرف اُس وقت تک جبکہ وہ اوسکی خواہش کے موافق ہو جاتے ہیں۔

اپنے اور اپنے ہمسایوں کے دوزخِ شکم کو بھرنے کیواسطے جب اُسکا دل چاہتا ہے (آؤ۔ آؤ) کرکے غل مچاتا ہے۔ میں اور میرے ناسمجھ بچے دوڑتے ہیں کہ ہمکو کھانا دیا جائیگا مگر نہیں! وہ تو اُن میں سے ایک کو دو کو جتنوں کو چاہتا ہے جھپٹ کر پکڑ لیتا ہے اور اوسوقت اُن دردناک آوازوں اور کراہوں کا اُسپر مطلق اثر نہیں ہوتا جو اگر چیل یا بلّی کے حملے کے وقت ہمارے مُنہ سے نکلتیں تو ہمارے اِن دشمنوں کو مار ڈالنے تک پر آمادہ ہو جاتا۔

ہم میں سے جو کوئی بہت اور بڑے انڈے دیتی ہے

...کی خوب حفاظت کیجاتی ہے مگر یہ رحم دلی دو ڈھائی
...س سے زائد ہمکو نصیب نہیں ہوتی - کیونکہ بڑھاپے
...ے بیکہ انڈے دینے کی قوت کم ہوجاتی ہے تو ہماری
... الی خدمتیں بھول کر بھی یاد نہیں کیجاتیں اور جسقدر
...لد ممکن ہوتا ہے ہمکو جنت کی خاک کردینے کی فکر شروع
...ہوجاتی ہے - حالانکہ زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ وہ اپنی
...نت کی فکر تو کرلے !!

مرغی کی یہ نصیحت اس لائق نہیں ہے کہ اسکو سُنکر بُھلا
...یا جائے - بلکہ اسکا عبرتناک منظر ہر وقت آنکھوں
...کے سامنے رکھنا چاہیئے - کیونکہ انسان کا یہ سلوک
...نکے ساتھ اسواسطے نہیں ہے کہ اُن سے کچھ دشمنی ہے
...انکہ اِن کی اذا و جفا کا اونکی طرف سے خوف ہے
...بلکہ یہ سلوک اُسکا صرف اسواسطے ہے کہ انسانی جبلت
...یں خودغرضی بھری ہوئی ہے اوسکی دوستی دوستوں
...سے اوسکی دشمنی دشمنوں سے صرف اپنی ذات کو فائدہ
...پہنچانے کے واسطے ہے -

مرغی کی یہ نصیحت ہمکو تین سبق سکھاتی ہے - یہ کہ
...جو کوئی تم سے محبت کا اظہار کرتا ہے اُسکی حقیقت کو
...دریافت کرنا اور سمجھ لینا ضرور ہے - کہیں یہ موٹا کرنا
...اسلئے تو نہیں کہ تیار کرکے گلا کاٹا جائیگا ! - یہ کہ - تمھارے
...نقصان سے اگر کسی دوست کا بھی فائدہ ہے تو بھی
...یہ یقین نہیں کرنا چاہیئے کہ تمکو نقصان پہنچانے سے
...درگذر کیجائیگی - یہ کہ - اگر تم چاہو کہ لوگ تمھارے گرویدہ
...ہوں تو کچھ نہ کچھ اُنکو واسطے فائدہ رساں بنو - اگر تم سے
...کسیکو کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا تو کچھ بھی غرض کسیکو نہوگی -

۳ - مرغی تلے جب تم انڈے رکھتے ہو تو وہ اُن کو (بلا
...لحاظ اسکے کہ وہ انڈے خود اوسکے ہیں یا دوسرے کے
...ہیں) پوری جانفشانی سے سیتی ہے - اور اُن میں سے
...نکلے ہوئے بچوں کی حفاظت اُس سے بھی زائد جانثاری
...سے کرتی ہے - مرغی کے اس وصف سے انسانی توجہ

دو طرف مصروف ہوتی ہے - ایک اسطرف کہ
(خون کا جوش، جس عمل کا نام انسان نے رکھ
لیا ہے وہ اصلی اور حقیقی نہیں ہے بلکہ خون کا جوش
جس محبت کا نام ہے وہ صرف ایک فرضی اور
اعتباری ہے - یعنی حیوان (جس میں انسان کو
بھی شامل نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے) جس ہولڑ
کو اپنا بچہ یقین کرلیتا ہے اس کے ساتھ اُسکو ایسی
الفت پیدا ہوجاتی ہے جسکو محبتِ مادری اور
شفقتِ پدری کہتے ہیں - خواہ وہ بچہ حقیقت میں
اُسکا ہو یا نہو -

۴ - مرغیاں جس جانکاہی اور فدائیت سے
انڈوں اور بچوں کی حفاظت و پرورش کرتی ہیں
اُنکی طرف توجہ کرنا اس بنا پر ضرور ہے کہ آخر اس
سے اُنکا فائدہ کیا ہے - انسان اپنی اولاد کی پرورش
میں اِس خیال سے مصیبت اوٹھاتا ہے کہ اِس
سے اوسکا نام چلیگا - بڑھاپے یا اور ایسے وقتوں
میں مدد ملیگی مگر مرغی کو تو یہ بھی توقع نہیں ہے -
حقیقت اسکی یہ ہے کہ انسانی خیال نام چلنے
یا مدد ملنے کا محض ایک ڈھکوسلا ہے - اول تو کسکا
نام باقی رہا ہے جو آپ کوئی توقع رکھے ! بہت سی
بہت ہوا تو دو چار پشت یا شاذونادر دس بیس
پشت - سو وہ بھی محض تاریخی طور پر - رہی مدد ملنا
یہ خود ایک فرضِ غلط ہے - انسان کا بچہ جب اس
لائق ہوجاتا ہے کہ ضرورتوں کا حس اوسے ہونے
لگتا ہے تو وہ طبعًا اپنی حاجتوں کے پورا کرنے
کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور والدین کی مدد کا خیال
درجہ بدرجہ - روز بروز - یعنی اپنی مدد کے بعد اتنا پیچھے
رہتا چلا جاتا ہے کہ بسا اوقات آخرکار بالکل جاتا
رہتا ہے - غرض کہ بچوں کی پرورش کی طرف توجہ
کرنیکی یہ بنا فی نفسہٖ غلط ہے جو انسان نے فرض

کر رکھی ہے۔ اصل یہ ہے۔ کھانوں میں زبان کو لذت یا بچوں کی پرورش میں دل کو خوشی صرف اسواسطے ہر ایک حیوان میں خالق کائنات عزوجل کی طرف سے ودیعت رکھی گئی ہے کہ اُسکی نوع قائم رہے اور بڑھے۔ پس مرغی ہم کو اپنی اس غفلت پر کہ اولاد سے نام چلیگا یا مدد ملیگی متنبہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مجکو تو اسمیں سے کسی خیال کی طرف توجہ بھی نہیں ہے مگر تم سے زیادہ انڈوں کے سینے اور بچوں کی حفاظت میں مجکو لذت آتی ہے !!!

(اسمٰعیل)

دوسرے روز آشنائی بشناختن نیرزد

یہ مصرع جو اس مضمون کا عنوان ہے۔ اُن اقوال کی مثال ہے جن میں شعرا ایک خاص جوش اور وجد کی حالت میں بہت سے جذبات انسانی کو چند لفظوں میں ظاہر کردیتے ہیں۔ یا بہت سے سالوں کے تجربے اور مشاہدے کو ایک مصرعہ یا ایک شعر کے تنگ حدود میں بند کردیتے ہیں۔ شعر میں جو ایک غیر معمولی اثر اور قوت ہوتی ہے۔ جو بعض اوقات آدمی کے دل پر بیطرح قابو پالیتی ہے وہ الفاظ کی ایک مناسب اور موزوں ترتیب کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اُس ترتیب کا مادہ خدا نے ہر شخص کو عطا نہیں کیا۔ اور سوائے اُن لوگوں کے جن کے حصے میں مذاق شاعری قدرت نے رکھا ہو کسیکو یہ طاقت نہیں کہ محض لفظوں کے ہیر پھیر میں دلوں پر حاوی ہوجائے۔ مذاق شاعری سے مراد طبیعت کی وہ موزونیت نہیں جو عروض کے چند ابتدائی قواعد کے مطابق تنگ بندی کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ اور جسکا شمالی ہندوستان میں قریبًا ہر باشندے کو ہر کے ایک نہ ایک حصے میں دعوی ہوتا ہے۔ بلکہ قدرت کا بنایا ہوا شاعر ہم اُسکو مانتے ہیں جس کا دل شاعر ہو۔ دل کا شاعر ہونا اُردو میں ذرا غیر مانوس محاورہ ہے اور اکثر لوگوں کے کان جو انگریزی نہیں پڑھے اس سے غالبًا ناآشنا ہونگے۔ اسلئے اسکی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دل کے شاعر ہونیکے بظاہر تو یہ معنی معلوم ہوتے ہیں۔ کہ دل غزلیں اور مخمس اور مسدس کہتا ہو۔ اور تاریخیں نکالتا ہو۔ اور ایک مثنوی عشقیہ بھی لکھ چکا ہو۔ ایک آدھ مرثیہ یا سلام بھی اُسکی تصنیفات میں ہو۔ شعر کی جو مختلف صنائع ہیں اُن سے بھی واقف ہو۔ ایک سہرا بھی کسی کی مبارکباد کو نہ سہی۔ ذوق و غالب کے جواب میں ہی کہہ رکھے۔ اور کبھی کبھی کسی مشاعرے میں بھی پڑھا ہو۔ لیکن انگریزی میں شاعر دل اور ہی معنی رکھتا ہے

وہ دل جس میں درد ہو۔ رقت ہو۔ سوز ہو۔ گداز ہو۔ وہ دل جو قدرت اور اُسکے گوناگوں تماشوں میں اپنے ساتھ کچھ یگانگت پائے۔ وہ دل جو قدرت کے قادر کا پتا لگالے۔ وہ دل جو خالق کے سبب اُسکی مخلوق کا بھلا چاہے۔ وہ دل جو زندگی کے مقصد کا متلاشی ہو اور وہ دل جو ان تمام مدارج کو طے کرکے خود فراموشی اور محویت کے ایک ایسے درجے پر پہنچے۔ جس میں وہ عام انسانوں کے طبقے سے اوپر نظر آئے۔

یہ کہنے سے کہ انگریزی میں شاعر دل کے یہ معنی ہیں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے شعرا میں ان اوصاف سے متصف شاعر نہیں گذرے۔ ہمارے شعرا میں سے بعض میں صانع قدرت نے یہ صفات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا پرتو اُن کے کسی کسی شعر میں۔ رباعی میں۔ قطعے میں جلوہ افگن ہے بلکہ یہ مدعا ہے کہ ان اوصاف کو لوازم شاعری ٹھہرانا اور اُن اشخاص کو جو ان سے بے بہرہ ہوں۔ غیر شاعر سمجھنا یہ اہل یورپ کی ہی کتابوں میں دیکھا گیا ہے

اور وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں بھی اس اصول کی پابندی شروع ہو۔ اور جو لوگ اس معیار میں پورے نہ اتریں۔ اُن سے شاعری کا خطاب چھین لیا جاوے۔ محض قافیہ اور ردیف کے سمجھنے اور پرانی لکیر پر چلکر دو چار غزلیں کہ دینے کا نام ہی شاعری نہ رکھا جاوے۔ اس سے ہمارے پرانے اعلیٰ درجے کے شعرا کی ناموری میں جیسے کہ میر۔ مصحفی۔ ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر۔ ہیں تو کوئی کمی نہیں آئیگی لیکن بہت کچھ رطب و یابس جو ہمارے لٹریچر میں بھرا ہوا ہے چھنٹ جائیگا۔ اور شاعری کے پہچاننے کا صحیح مذاق ملک میں پیدا ہو جائیگا۔ اور لوگ اس قابل ہو جائینگے کہ ایک ایسے مصرعے کو جو اِن چند سطور کا زیبِ عنوان ہے۔ پڑھ کر محض اسکی لفظی خوبی اور بندش ہی کو نہ دیکھینگے۔ بلکہ اُن خیالات پر بھی غور کرینگے۔ جنکے ہجوم کرنے سے شاعر کی زبان پر یہ مصرعہ بے اختیار آگیا ہوگا۔ اور جسکے بعد ایک مصرعہ اسکے پہلے لگا کر یوں شعر مکمل کر لیا ہوگا:

مکن آشنائی اے دل بہ کسے کہ نزدِ دانا
دوستے روزِ آشنائی بشناختن نیرزد

بادی النظر میں یہ شعر ایسا قابلِ قدر نہیں معلوم ہوتا یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر کوئی اسپر عمل کرے تو اس ڈر کے مارے کہ آشنائی چند روزہ ہے کسی سے آشنائی ہی نہ کرے۔ دنیا کے دن بے یار و مددگار بے دوست و آشنا کاٹ لے اور چل بسے۔ اس صورت میں تمام دنیا کے داناؤں کی کثرتِ رائے اسکے برخلاف ہوگی۔ کیونکہ اُن سبنے باوجود دنیا کی بے ثباتی کے دنیا میں دوستی کو بہت بڑھایا ہے۔ اور ہر شخص کے لیے دلی دوست پیدا کرنے اور اُن کی خدمت کرنے کی تاکید کی ہے اور سچے دوست کو دنیا میں سبسے بڑی نعمت قرار دیا ہے شعرائے دوستوں کی دوستی کی تعریفیں کی ہیں۔ فسانوں میں یاروں کی غمگساری کی حکایتیں ہیں۔ اور تاریخوں میں باوفا اصحاب کی وفاداری کی روایتیں ہیں۔ مسلمانوں کے ہادی برحق نے دوستوں کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور اُن کے بعد کے بزرگانِ دین کا بھی یہی مسلک رہا ہے۔ پس "مکن آشنائی" پر کیونکر عمل ہو سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ شعر نہ تو آشنائی کا مانع اور نہ متقدمین کے عمل کے متضاد ہے۔ بلکہ عین اُس کے موافق ہے۔ اور اطمینانِ قلبِ انسانی جو شعر اور فلسفے کا اعلیٰ مقصد ہے۔ ایسا نسخہ لیئے ہوئے ہے۔ جو دلوں کو پریشانی سے بچانے کے لیئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

اس شعر کی سچائی کی تصدیق کسی ایسے حرماں نصیب سے کیجے۔ جسنے مدت کی تلاش کے بعد اپنے دلکی پسند کے مطابق ایک شخص دیکھا ہو کسی ذریعے سے اُسکے ساتھ ملاقات پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اُس میں ناکامیاب ہوا ہو۔ پھر اور کوئی ذریعہ ڈھونڈھا ہو۔ مگر وہاں بھی ناکامی نے اُسکا پیچھا نہ چھوڑا ہو۔ کوئی اور ترکیب سوچی ہو۔ مگر پھر بھی تیر نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔ آخر ملاقات ہوئی ہو۔ اب ملاقات بڑھانے کی فکر ہو۔ مگر جسکا یہ مشتاق ہو وہ اس سے دور دور کی سلام علیک ہی پسند کرے۔ مشکلوں سے اسنے ربط بڑھایا ہو۔ پھر ربط بڑھنے کی حالت میں چند امتحانات اِسپر آ گئے ہوں اور اُن میں بھی یہ پورا اُترا ہو۔ اور عین اُسوقت جب وہ یہ سمجھے کہ جسے میں چاہتا تھا وہ میرا ہو لیا تو کوئی ایسی غلط فہمی درمیان آجائے کہ شخص موصوف پھر بدگمان ہو جائے اور

سنائے نہ سنے اور بات ایسی بگڑ جائے کہ بنائے نہ بنے - کیا اُس حالت میں اُسکے مُنہ سے بیساختہ یہ نکل جائیگا ؟ کہ -

ع دو دِسہ روزہ آشنائی بشناختن نیرزد -

کیا اُسکو وہ دو چار دن جو باہم ارتباط میں گذرکر اس زمانۂ دراز کے سامنے جو اشتیاق میں گذرا تھا بہت ہی کم نہ نظر آئینگے ؟ اور کیا وہ یہ نہ کہیگا کہ "شناختن" کی تکلیف کی قیمت بھی ادا نہ ہوئی

اس سے بھی زیادہ تصدیق کی ضرورت ہو تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھو جسنے ایسی تلاش سے جیسی اوپر بیان کیگئی ہے بیس پچیس سال میں دو چار دوست پیدا کیئے ہوں - جسنے اس عرصے میں والدین اور اَعِزَّہ اور اقربا کی بے غرض محبت کی قدر کرنی سیکھی ہو - اور جسکے دل میں اُس کے عوض دینے کے نیک ارادے ہوں - جسنے بہت انتظار کے بعد اپنے مطلب کی بیوی پائی ہو - اور نکاح کے بعد یہ محسوس کیا ہو کہ دنیا میں پوری خوشی باعصمت اور تعلیم یافتہ بیوی کے ملجانے سے ہے - اور جس نے مثنا سبب نکاح کا پہلا اور سب سے عمدہ میوہ ایک صحیح اور خوشرو بچہ ابھی دیکھا ہو - اور جو بچپن سے لیکر اس وقت تک کے دراز عرصے میں دنیا کی سب چیزوں سے محض آشنا ہوا ہو اور اس آشنائی کے لُطفوں کے کچھ عرصے تک حاصل کرنے کے خیال میں ہو - کہ اچانک اسے پیامِ اجل آجائے - اور وہ تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کو خیرباد کہتا ہوا اور در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتا ہوا عالمِ بالا کو سدھارنے لگے - اگر اُسوقت کان لگا کر اُسکی کمزور آواز سُنو یا اگر لب بند ہوں تو اُسکی صدائے دل سُنو تو یہ کہہ رہا ہوگا - کہ -

ع دو دِسہ روزہ آشنائی بشناختن نیرزد -

اچھا اِن خیالی مثالوں کو چھوڑکر سید احمد خاں مرحوم کی واقعی مثال کو لیں - اُسکے بچپن کو دیکھیں - اُسکی جوانی پر نظر ڈالیں - اُسکے ادھیڑپن کے زمانے پر غور کریں اور اُسکے بڑھاپے کو خیال میں لائیں - شروع سے یہ دُھن اُسکے سر میں سمائی ہوئی تھی کہ قومِ مسلمانان جو علومِ زمانۂ حال سے نفور ہے - اِن کی طرف راغب ہو - جہالت اور مذہب کی نسبت توہّماتِ بیجا اور خیالاتِ باطل جو اِن کے دلوں میں گھر کیئے ہوئے ہیں اُن سے دُور ہوں - وہ اِسلام کی حقیقت کو پہنچیں - اور اُس کے اصول پر کاربند ہوں - اور اُن بدعات کو جو دوسری اقوام کی رسومات کے اثر سے اُن میں پیدا ہوئی ہیں چھوڑیں - اسلام کی وقعت غیر قوموں کے دلوں میں پیدا ہو - اور اُسکی شان بڑھے - اِس دُھن کے پورا کرنے کے لیئے سید مرحوم مدۃ العمر محنت کرتا رہا - گالیاں کھاتا رہا - بدنامی سر پر لیتا رہا - کفر کے فتوے سُنتا رہا - اور جب وہ زمانہ قریب آیا کہ اپنی محنت کا ثمرہ اُٹھائے - لوگوں میں وہ شوق جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا پیدا ہونے لگا - اُسکی نیکنامی شروع ہوئی - اُسکو تکفیر کے فتوے بند ہوئے - اقوامِ غیر بھی مسلمانوں کو قوموں میں شمار کرنے لگیں تو مشیتِ ایزدی میں یوں آیا - کہ اُسکا وقت ختم کردیا گیا - کیا وہ دو دِسہ روزہ آشنائی جو سید مرحوم کو قومی ترقی کے آثار سے ہوئی - اُس محنت کا جو "شناختن" میں صرف ہوئی تھی معاوضہ ہوسکتی ہے - گو اُسکو اِس ترقی کے کام شروع ہوگیا ہے خواہ تکمیل اُسنے نہ دیکھی - شاید اِس مصرعے کو اُسکا پڑھنے سے روک لیا ہو -

تحصیلِ علوم و فنون میں بھی یہی حال نظر آتا ہے کہ تحصیل کا عرصہ اُس عرصے سے جس میں اُس تحصیل سے فائدہ اُٹھایا جائے عموماً کم ہوتا ہے -

مثلاً کسی علم کی تکمیل کے لیئے تو کم از کم ایک عمر چاہیئے - فرض کیجیئے کہ کوئی شخص عمر بھر صرف کر کے بڑھاپے کے قریب اُس سے کما حقہٗ آشنائی حاصل کرتا ہے پس وہ دن جن میں وہ اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے شناختن کے زمانے کا پورا مقابلہ نہیں کر سکتے - فرض کرو کہ ایک طبیب پچاس سال کے تجربے سے نبض کو پہچاننے میں تھرماسٹر کا رتبہ حاصل کرتا ہے - مگر جلد وہ تجربہ اُس کیساتھ ہی قبر میں جاتا ہے اور اُس سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا - ایک علم کیمیا داں عمر بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک ڈسکوری کرتا ہے یا کوئی ماہر علم طبعیات کوئی نئی اور مفید ایجاد کرتا ہے - یا فلسفی کوئی تھیوری نکالتا ہے - کہ اتنے میں پیمانۂ عمر لبریز ہوجاتا ہے

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے - کہ یہ تو عام دستور ہے جو سب پر کم و بیش اثر کرتا ہے - کہ آشنائی میں محنت کرنی پڑے اور شناختن کے بعد لطف یا فائدہ اٹھانے کے دن کم ہوں - اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ اس خیال سے وہ محنت ہی نہ کریں - وہ تو مایوسی کی حالت میں انسان کے دل سے یہ نکل جاتا ہے - کہ کاش اس مصیبت میں نہ پڑتے تاکہ یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہوتا - اس اظہارِ ناراضگی سے طبیعت ایک گونہ تسلّی پاتی ہے - مگر ایسے بیتابانہ الفاظ یا فقرات کبھی مانعِ سعی نہیں ہوتے - کیونکہ دنیا میں اصلی راحت تو سعی میں ہے - گو انسان ہر وقت اس بات کو نہیں سمجھتا - اور شاعر نے جب ایسے ہی مختلف خیالات کے ہجوم سے جنکے نمونے اوپر لکھے گئے ہیں - یہ بیساختہ مصرعہ کہا تو اُسکا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال کہ حصولِ مدعا کے بعد اُسکا لطف چند روزہ ہوتا ہے - اور دنیاوی چیزیں بہرحال چند روزہ ہیں ہر وقت پیشِ نظر رہے - اور اس خیال سے وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھے اور آشنائی کے حصول میں اتنا وقت ضائع نہ کر دے جتنا بعد کے لاانتہا لطفوں کی امید ہونے کی صورت میں کوئی کر سکتا ہے -

اور نیز یہ کہ جب اسکی کوششوں کا ماحصل اُس سے چھننے لگے تو وہ صبر کو بالکل ہاتھ سے نہ دے بیٹھے بلکہ اس خیال سے تسلّی پائے کہ آشنائی تو اپنے نیچر ہی میں دوسہ روزہ تھی -

(عبدالقادر)

انسان کی زندگی کیونکر دراز ہوسکتی ہے؟

(۱)

٭ اسمیں کچھ شک نہیں کہ انسان کی زندگی کے لیئے ایک زمانہ معیّن ہے اور اوسکے لیئے کچھ قانون اور قاعدے بھی ہیں جسطرح کہ تمام قدرتی اور طبعی واقعات کے لیئے ہیں - جسطرح بعض حالتیں کسی قدرتی اور طبعی واقعے کو جلد یا دیر سے ظہور میں لاتی ہیں اور انکی مدت کو دراز یا کوتاہ کرتی ہیں اسیطرح بعض حالتیں زندگی پر اپنا اثر ڈالتی ہیں اور اُسکی مدت کو بڑھاتی یا گھٹاتی ہیں ان حالات پر بحث کرنے اور غور کرنے سے ایک خاص علم پیدا ہوگیا ہے - جسکو علمِ درازیِ حیات کہتے ہیں اور جسپر ہم اس مضمون میں بحث کرنی چاہتے ہیں - یہ علم طب سے بالکل جدا ہے کیونکہ طب کا مدار حفظانِ صحت اور دفعِ مرض پر ہے - اس کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کیونکر دراز یا کوتاہ ہوسکتی ہے - مگر اس علم میں درازیِ حیات کے مسئلے پر بحث کی جاتی ہے - اُن بیماریوں کے دفع کرنے میں جن سے انسان کی عمر کوتاہ ہوتی ہے - اس علم کو طب سے ضرور مدد پہونچتی ہے مگر طب کے سوا دیگر

٭ یہ مضمون مصر کے نہایت نامور عربی میگزین "المقتطف" سے ماخوذ ہے -

علوم سے بھی اُسکو تعلق ہے اور بہت سے اور علوم ہیں جن سے یہ علم فیضیاب ہوتا ہے۔

اگر ہم زندہ مخلوق کے سلسلے پر غور سے نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا کہ تمام زندہ طبعی قوتیں سوای انسان کے کسی مخلوق میں یکجائی طور پر جمع نہیں ہیں - اور نہ وہ اور جانداروں میں اسقدر بڑی مقدار میں ہیں جسقدر کہ انسان کے وجود میں پائی جاتی ہیں- اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیئے جسقدر تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلتا ہے اور کسی چیز کے لیئے اتنی محنت نہیں اُٹھاتا، تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا-

درازیٔ عمر کا مسئلہ کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے کیونکہ قدیم زمانے میں صدیوں تک انسان اسی دُھن میں مصروف رہ چکا ہے- اور مکاروں اور جادوگروں اور دغابازوں کے لیئے دل بہلانے اور دنیا کمانے کا اس سے بڑھکر کوئی مشغلہ نہیں تھا- ہم اس موقع پر قدیم اور جدید خیالات اس سلسلے پر بیان کرتے ہیں-

مصر کے قدیم باشندے اس بات کے قائل تھے کہ قے اور پسینہ لانیوالی چیزوں کے استعمال سے انسان کی عمر دراز ہوسکتی ہے- چنانچہ بعض مصری ہر مہینے میں دو مرتبہ قے آور دوا پیتے تھے - ملاقات کے وقت ایک مصری دوسرے مصری سے پوچھتا تھا کہ کہیئے حضرت آپکو پسینہ کسقدر آتا ہے؟

یونان کے باشندے کہتے تھے کہ جسمانی ورزش کرنا اور قدرتی چیزوں سے لطف اُٹھانا درازی عمر کی سب سے عمدہ ترکیب ہے- ہیپو قراط اور اُسکے زمانے کے تمام اطبا اور حکما لوگوں کو علی الاعلان ہدایت کرتے تھے کہ اعتدال کا طریقہ اختیار کریں- صاف ہوا میں سانس لیں- حمام میں نہائیں- اور ہر روز جسم کی مالش کریں- جسم کو مختلف طریقے سے آہستگی تیزی کے ساتھ حرکت دینے کے لیئے خاص خاص [illegible] ایجاد ہوگئے تھے- جنکو ہمارے زمانے میں جمناسٹک کہا جاتا ہے- مگر اِسکے ساتھ ہی وہ اس امر کے بھی قائل تھے کہ جسمانی اور نفسانی ریاضت اعتدال سے تجاوز نہ کرجائے - اسمیں شک نہیں ہے کہ ریاضت جسمانی نے اُن کے جسموں کو قوی، اُن کے دماغ کو صحیح، اور اُن کی طبیعتوں کو کامل بنا دیا تھا- مگر [illegible] نے اس مسئلے پر بجید توجہ کی- چنانچہ ایک شخص نے جس کا نام ہیرو دیکی تھا- اِن اصولوں کو ہر شخص کے لیئے لازمی کردیا تھا- وہ اپنے تمام بیماروں کو جنکا وہ [illegible] کرتا تھا یہ ہدایت کرتا تھا کہ وہ ہوا خوری کو جائیں اور بدن کی مالش کریں- جب کوئی بیمار بیماری کے سبب سے نحیف اور لاغر ہوجاتا تو وہ یہی نصیحت کرتا تھا کہ ورزش کرو- ورزش کرو- یہی تمھارا علاج- اُسنے اِن اصولوں کو لازمی کردینے سے بہت سوں کی زندگی بڑھادی مگر افلاطون نے اعتراض کیا ہے کہ ایسی عمر کا بڑھانا جسکے ساتھ رنج و تکلیف بھی [illegible] سراسر ظلم اور ناانصافی ہے، ہیرودیکی کو سخت ملامت کی اور اُسکو اس تعلیم و ہدایت سے منع کیا-

پلوٹارک نے جو یونان کا مشہور مورخ ہے ا[illegible] ایک مضمون کو جو عمر کی درازی پر لکھا ہے اِن جملوں پر تمام کیا ہے کہ "سر کو ٹھنڈا رکھو- پاؤں گرم رکھو- جب بیمار ہوجاؤ تو دوا پینے کی جگہ فاقہ [illegible] ایسا نہ ہو کہ جسم کی ریاضت میں محو ہوجاؤ اور عقل اور روح کی ریاضت کو بھول جاؤ"

سب سے عجیب خیال قدیم لوگوں کا یہ تھا کہ اگر [illegible] آدمی کم عمر اشخاص کے درمیان سوئیں تو اُن کی [illegible] بڑھ جاتی ہے اور اِس خیال کے متعلق بہت سے [illegible] مشہور ہیں جنکا اِس مقام پر ذکر کرنا مناسب نہیں

یمیا کے ذریعے سے عمر کا دراز کرنا بھی ایسا ہی ہے
بانچہ جب (مڈل ایجز) یعنی قرون متوسطہ میں علم کا نام
نشان نہ رہا - اور جہالت کی تاریکی چاروں طرف
پھیل گئی تو جادو - سیمیا - سنگ فلاسفہ - علم حروف
رمل - زایرچہ وغیرہ نے اہل یورپ کی عقلوں اور دماغو
کو مسخر کیا - یہ خرافات اور لغویات ہمارے زمانے
میں بھی پائی جاتی ہیں - اُس زمانے میں بعض مکار لوگ
نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم نے وہ پہلا عنصر دریافت کرلیا ہے
جس سے تمام بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے - اگرچہ اس
دعویٰ کے متعلق بہت سی روایتیں موجود ہیں - مگر
ہم تھیوفراسٹس پارسلس کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں -
اِس احمق نے دعویٰ کیا تھا کہ میں ہر بیماری کو اچھا
کرسکتا ہوں - ہر انسان کی زندگی بڑھا سکتا ہوں
اُس نے ایک دفعہ غرور کے نشے میں دنیا سے خطاب
کیا اور اسطرح بلند آواز سے پکارا کہ " او ابن سینا!
اور رازی! اور جالینوس! او بیرس - کولون - سینا -
دریائی ڈانیوب اور دریائی راین کے ساحلی مقامات
سمندر کے جزیروں اٹلی - ڈلمیشیا اور ایتھنز
کے رہنے والے طبیبو! میری اطاعت کرو - او یونانیو
عربو! - یہودیو! میرے سامنے سر جھکاؤ کیونکہ مجھی
میں قدرت اور عظمت اور جبروت ہے - " عوام نے
اسکے دعووں سے خیال کیا کہ وہ قدرت کے اسرار
سے واقف ہے - بعض کیمیائی تجربوں نے جنکو وہ
اکثر دکھاتا اور اُن کو دھوکے میں ڈالتا تھا، عوام کو اُسکا
اور بھی معتقد کردیا - اسکی شہرت ہر طرف پھیلگئی - جوق
جوق طلبا اسکی شاگردی کو آنے لگے - مگر اسنے ابھی
عمر کی پچاس ہی منزلیں طے کی تھیں کہ موت نے اُسکے
دعووں کا خاتمہ کردیا -

قدیم زمانے کے لوگوں نے درازی عمر کے لیے کیمیا
ہی پر توجہ نہیں کی بلکہ نجوم سے بھی بہت مدد لی -

اُنھوں نے نجوم کا مطالعہ کیا - اور خیال کیا کہ اجرام سماوی انسان کی زندگی اور اسکی قسمت پر حکومت کرتے ہیں - نجومی انسان کی ولادت کا وقت دریافت کرکے اُسکے گذشتہ اور آیندہ حالات بتا دیتے تھے - یہ اعتقاد کچھ نادانوں اور جاہلوں ہی میں نہیں تھا بلکہ اُس زمانے کے بڑے بڑے دانشمند لوگوں میں پھیلا ہوا تھا - حکما اور علما نجوم اور اعداد و حروف کے باطل علوم بڑے شوق سے سیکھتے تھے جب کوئی آدمی نجوم میں شہرت پاتا تھا تو اُسکی بڑی قدر ہوتی تھی - اور اُسکو وقعت اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا - پادشاہ اُن سے خط و کتابت کرتے اور امور سلطنت میں اُن سے مشورہ لیتے تھے - نجومی خیال کرتے تھے کہ ہر انسان کی قسمت پر ایک ستارہ حکمراں ہے - اسیطرح نباتات - حیوانات اور مکانا و مقامات پر بھی خاص خاص ستارے فرمانروا ہیں - جب کسی آدمی کو کوئی تکلیف یا بیماری پیش آتی تو اُس کو اُس ستارے کے دائرۂ حکومت سے نکال لے جاتے تھے جس سے وہ تکلیف یا بیماری پیدا ہوئی اور اُس ستارے کے سایے میں لے جاتے تھے جسکی تاثیر پہلے ستارے کے خلاف ہوتا کہ بیمار اُس ستارے کے ظلِ حمایت میں رہ کر کھائے پیئے - اور دوا نوش کرے اور شفا پائے

اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ ستاروں اور معدنی چیزوں میں خاص تعلق ہے اسلئے نفع حاصل کرنے اور ضرر سے بچنے کے لیئے وہ معدنی چیزوں کا استعمال کرتے تھے خاص خاص ستاروں کے طلوع کیوقت خاص خاص دھاتیں پگھلائی اور ڈھالی جاتی تھیں - اور جسکے پاس اس قسم کی دھات رہتی تھی وہ گویا طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہتا تھا - بعض دھاتیں بیماری کو دور کرنے کے لیے استعمال کیجاتی تھیں - بعض تکلیف

رفع کرنے کے لیئے - بعض بلند مرتبہ اور عزّ و جاہ حاصل کرنے کے لیئے - بعض تجارت میں نفع کمانے کے لیئے اور بعض جنگ میں غالب آنے کے لیئے - جنگ میں فتح پانے کی غرض سے برُج عقرب کے سایے میں دھاتیں پگھلائی جاتی تھیں - اور اُن پر مرّیخ کی شکل اُس حالت میں کھودی جاتی تھی جبکہ وہ برُج عقرب میں طلوع کر رہا ہو - اُن کا خیال یہ تھا کہ ایسی دھات کا ہتیار جس شخص کے پاس ہو وہ خونخوار اور فاتح ہوگا -

درازی عمر کا ایک اور طریقہ مشہور ہے جو غذا سے تعلق رکھتا ہے - اٹلی میں ایک شخص تھا - جو کرنارو کے نام سے مشہور تھا - اُسنے چالیس ۴۰ برس کی عمر تک دولتمندی اور عیش پرستی میں بسر کی تھی - یکایک اُسکو نہایت سخت بخار عارض ہوا اُسکا بدن نہایت کمزور اور دُبلا ہوگیا - حکیموں نے اُسکے علاج میں مایوسی اور نا امیدی ظاہر کی اور اُسکو ڈرایا کہ تم دو مہینے کے بعد مر جاؤگے - پھر کہا کہ اگر تھوڑا سا کھانے پر قناعت کرلو تو بیشک فائدے کی امید ہے - اور صرف یہی تدبیر تندرست ہونے کی ہے - کرنارو نے حکیموں کے کہنے پر عمل کیا - اور ایک مدت کے بعد وہ تندرست ہوگیا - اب اُسنے دل میں ٹھان لی کہ میں اخیر دم تک تھوڑا ہی کھانا کھایا کرونگا - اِس طریقے پر اُسنے ساٹھ ۶۰ برس تک عمل کیا - وہ ہر روز ۱۲ اوقیہ* خوراک اور ۱۳ اوقیہ پانی پیتا تھا - تیز گرمی اور تیز سردی سے اپنے تئیں محفوظ رکھتا تھا - نفسانی جذبات کی پیروی ترک کردی تھی - اسطرح اُسکا جسم اور دماغ دونوں مدت تک سلامت رہے - مصیبت اور تکلیف کا اثر اُسپر بہت ہی کم ہوتا تھا - چنانچہ ایک خانگی مقدمہ میں ہار جانے سے اُسکے دو بھائیوں نے تو غم میں جان دیدی - مگر اُسپر اِس سانحے کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا - ایک دفعہ وہ سواری سے گرا - گھوڑے نے اُسکو کُچل ڈالا - اُسکے دونوں بازو اُتر گئے - اور پاؤں بھی لٹک پڑے - مگر علاج ہوجانے کے بعد اُسکی صحت پھر بدستور ویسی ہی ہوگئی - جب وہ اسّی ۸۰ برس کا ہوا تو اُسکی دوستوں نے اصرار کیا کہ اب غذا کی مقدار بڑھانی چاہیئے کیونکہ ضعف اور کمزوری کا زمانہ ہے - اُسنے دوستوں کے کہنے سے ۲ دو اوقیہ غذا اور تین ۳ اوقیہ پانی اضافہ کردیا - حالانکہ جسم کے کمزور ہونے سے ہاضمے کے اعضا بھی کمزور ہوجاتے ہیں - غذا میں اضافہ کرنا اُسکے لیئے وبالِ جان ہوگیا - اُسنے خود اپنی حالت اسطرح بیان کی ہے کہ "غذا میں اضافہ کیئے ہوئے ابھی دس دن نہیں گذرے کہ مجھپر تکلیف طاری ہوگئی ہے - اور کمزوری ستانے لگی ہے - اور میری حالت دن بدن ابتر ہوتی جاتی ہے - بارہویں دن میری پسلی میں درد ہوا - اور برابر چوبیس ۲۴ گھنٹے تک رہا اسکے بعد بخار آیا جو پینتیس ۳۵ دن تک آتا رہا - خدا خدا کرکے اتنی تکلیف کے بعد اب میں تندرست ہوا ہوں اور غذا کی پہلی مقدار پر آگیا ہوں - اب میں اسّی ۸۰ برس کی عمر کو پہونچ چکا ہوں تاہم گھوڑے کی پیٹھ پر بغیر کسی کی مدد کے سوار ہوجاتا ہوں" - کرنارو اس واقعے کے بعد اخیر وقت تک صحیح و سالم رہا - اور سو برس کا ہوکر فوت ہوا -

ایک طریقہ عمر کی درازی کا یہ ہے کہ جوانوں کا خون بوڑھوں کے جسم میں داخل کیا جائے - اور طاقتور

* نوٹ - اوقیہ ایک قدیم وزن ہے جو تقریباً تین تولہ ۴ ماشہ کی برابر ہوتا ہے -

جسموں کا خون کمزور جسموں میں اُتار اجائے - یہ طریقہ بھی قدیم ہے جو سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جاری تھا - مگر اسکی شہرت بہت کم ہوئی کیوں کہ اسمیں کامیابی کی اُمید بھی کم تھی - آجکل بعض جرّاحی علاجوں میں جو خون کی مقدار ایک بدن سے دوسرے بدن میں داخل کیجاتی ہے وہ اس غرض سے نہیں ہے کہ عمر دراز ہو یا جوانی از سرِ نو حاصل ہو بلکہ اس غرض سے ہے کہ اپریشن کرنے کے وقت اکثر بہت سا خون نکل جاتا ہے -

درازی عمر کے متعلق ایک خیال بیکن کا ہے - جو انگلستان کا مشہور فلسفی تھا - وہ کہتا ہے کہ زندگی ایک شعلہ ہے جسکو باہر کی ہوا بجھا دیتی ہے - اگر وقتاً فوقتاً جسم کا تیل بڑھاتے رہو تو یہ شعلہ بہت دیر میں بُجھیگا - اور زندگی دراز ہوگی" پھر کہتا ہے کہ" اگر ٹھنڈے پانی سے نہاؤ - اور بدن پر تیل کی مالش کرو تو باہر کی آگ نہیں بُجھتی - اور اگر ٹھنڈی غذا کھاؤ اور افیون کا استعمال کرو - اور دل کو تسکین دیتے رہو تو اندر کی آگ بھی نہیں بُجھتی" افسوس ہے کہ بیکن نے افیون کی جو تعریف کی ہے وہ بالکل غلط ہے وہ تو بجائے اسکے کہ عمر کی درازی میں مدد دے زندگی کو تاہ کرتی ہے -

یہ ہیں مختلف خیالات اور مختلف طریقے جو زندگی کی درازی کے لیے جاری رہ چکے ہیں - ہمکو پوری توقع تھی کہ جب علم کی روشنی پھیلیگی تو جہالت - نادانی اور اوہام پرستی کی تاریکی بالکل دُور ہوجائیگی - مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے - بلکہ ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ اکثر مکّار اور دغا باز لوگ درازی عمر کے لیے بہت سی دوائیں استعمال کرتے ہیں - اور اُن کا بڑی دُھوم دھام سے اشتہار دیتے ہیں - مثلاً اخباروں میں کسی اشتہا

کی سُرخی پر آسمانی راز - کہیں ایتھر کی روح کہیں اکسیر حیات - اور کہیں اکسیر اعظم لکھا ہوا پاؤ گے یہ سب جھوٹی دوائیں اور مکر و فریب کے شعبدے ہیں جنکی صحت کو عقل سلیم ذرا بھی تسلیم نہیں کر سکتی زندگی کا مسئلہ نہایت دقیق اور عمیق مسائل میں سے ہے - پس اسپر بحث کرنے میں غور و فکر کرنے اور اُن معلومات سے کام لینے کی ضرورت ہے جو ثابت ہو چکے ہیں - اس بحث میں سب سے پہلا مسئلہ جو پیش آتا ہے - اور جو ظاہر میں بالکل سادہ مگر حقیقت میں ایسا نازک ہے کہ عقلِ انسانی اُسکے حل کرنے سے عاجز ہے وہ یہ مسئلہ ہے کہ زندگی کیا ہے ؟ یا زندہ قوتوں سے کیا مراد ہے ؟ - اسمیں شک نہیں کہ ہم زندگی کی ماہیت نہیں سمجھے بلکہ اُسکے بعض ظاہری صفات و احکام اور خواص ہی کو جانتے ہیں - اُن میں سے وہ باتیں جنکا ذکر اسموقع پر ضروری ہے حسب ذیل ہیں -

(۱) بعض اجسام میں بہ نسبت دوسرے اجسام زندگی زیادہ ہے - گویا کہ وہ انھیں کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے اجسام سے اسکو کچھ تعلق نہیں ہے - جن اجسام میں زندگی پائی جاتی ہے اونکو اجسام آلیہ یا عضویہ کہتے ہیں ، خواہ انمیں زندگی موجود ہو یا اُن سے جدا ہو چکی ہو اور خواہ وہ نباتات سے ہوں یا حیوانات میں سے -

(۲) زندگی بعض زندہ اجسام میں ظاہر ہوتی ہے بعض میں پوشیدہ ہوتی ہے - پھر مناسب حالت میں یکایک اُسکا ظہور ہوجاتا ہے - اس قسم کے اجسام ہزاروں برس کا عرصہ کیوں نہ گذر جائے مگر اُن میں زندگی کا جلوہ اسیوقت نمایاں اور محسوس جبکہ اُس کے لیے مناسب حالات پیش آجائیں مثلاً مصر کے قدیم تہ خانوں میں جو گیہوں کے د

موجود تھے۔ باوجود اسکے کہ اُنپر دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا، جب اُن گوتھانوں سے نکالکر کھلی ہوا میں بویا گیا تو وہ بارآور ہوئے۔

(۳) زندگی بعض زندہ اجسام میں زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں کم۔ اسیطرح بعض زندہ اجسام سے اُسکو گہرا تعلق ہے اور بعض سے بالکل نہیں یا بہت کم ہے۔ چنانچہ ادنیٰ درجے کے حیوانوں میں زندگی کم ہے مگر اُسکو اُن حیوانات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اعلیٰ درجے کے حیوانوں کا حال اسکے برخلاف ہے

(۴) جس جسم میں زندگی داخل ہوتی ہے۔ اُس کے ضروری ارکان میں شمار کیجاتی ہے۔ وہ بعض اعضا سے بعض کو مربوط کرتی ہے۔ اور اُن کو اُن آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے جو اُن پر طاری ہوں۔ وہ اُن طبعی قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو عضوی مادّوں کو فاسد کرتی اور اُن کے فعل کو کمزور کرتی ہیں۔

کوئی زندہ جسم ہوا کے اثر سے خراب نہیں ہوسکتا جبتک کہ اُسکی زندہ قوت ضعیف نہ ہو جائے یا بالکل گم نہ ہو جائے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ جن اجسام میں زندگی کی قوت پوشیدہ ہوتی ہے وہ بھی بگڑنے نہیں پاتے۔ مثلاً انڈے میں جبتک زندگی کی قوت موجود ہے وہ کبھی خراب نہیں ہوسکتا یہی حال گندم اور ریشم کے کیڑے کا ہے۔ زندگی کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ جس جسم میں حلول کرے اُسکو ہوا کے اثر سے بگڑنے نہ دے۔ اسیطرح کوئی زندہ جسم جبتک زندہ ہے سردی سے نہیں بگڑتا۔

پروفیسر ہنٹر نے ایک مچھلی پانی میں ڈالکر پانی کو سردی سے جمایا۔ ہر طرف سے کل پانی جم گیا۔ صرف اُس مقام سے اُسکا جمنا باقی رہگیا، جہاں مچھلی موجود تھی۔ مچھلی کے مرنے کے بعد اُس جگہ کا پانی بھی جم گیا۔

(۵) ایسے اسباب اس دنیا میں موجود ہیں جو زندگی کو کمزور یا فنا کرتے ہیں۔ اور ایسے اسباب بھی ہیں جو اُسکو طاقت پہونچاتے اور بڑھاتے ہیں۔ منجملہ ضعیف کرنے والے اسباب کے ایک سردی ہے۔ لیکن اگر سردی معتدل درجے کی ہو تو کچھ ضرر نہیں کرتی بلکہ جسم کو قوت پہنچاتی ہے لیکن جب شدت کی سردی ہو تو اُسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی زندہ قوت کو فنا کرتی ہے۔ بجلی بھی جب شدت کے ساتھ ہو تو وہ بھی زندگی کی دشمن ہے۔ نیز نفسانی جذبات بھی انسان کی زندگی کے لیے سخت مضر ہیں کیونکہ اونسے اکثر ناگہانی موت وقوع میں آتی ہے۔ وہ اسباب جنسے زندگی کو قوت پہنچتی ہے منجملہ اون کے ایک سبب روشنی ہے۔ نباتات اور حیوانات بغیر اُسکے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ زندگی کے دیگر اسباب کثرت کے ساتھ موجود ہوں۔ نباتات یا حیوانات سے جب روشنی دُور کر لی جاوے تو اول اُنکا رنگ اوڑ جاتا ہے۔ پھر اُنکی طاقت کافور ہوتی ہے۔ انسان بھی اس کلیے سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ تاریک مقامات میں رہتا ہے تو اُسکا رنگ بھی زرد پڑ جاتا ہے۔ بدن کی کھال ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور زندگی کے ساتھ جو چستی اور پھُرتی مخصوص ہے وہ بھی کم ہو جاتی ہے یا گم ہو جاتی ہے۔ جو قیدی تاریک جیلخانوں میں رکھے جاتے ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے یہ بات صاف ثابت ہو جائیگی۔ زندگی کو قوت پہنچانے والے اسباب میں سے ایک حرارت بھی ہے حیوانات اور نباتات کے بڑھنے میں جو اُسکی تاثیر ہوتی ہے وہ نہایت روشن اور واضح ہے مگر بعض علماء افعال الاعضاء حرارت کو زندگی کی قوت کی جگہ لینے والی خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

کہ حرارت اُس قوت کو جگا دیتی ہے جو زندگی کے نہایت سادہ اور ابتدائی مادوں میں پوشیدہ ہوتی ہے - اسبات کا ثبوت کہ زندگی کے لیئے حرارت ضروری چیز ہے - یہ ہی کہ ٹھنڈے ملکوں میں زندہ مخلوقات بہ نسبت گرم ملکوں کے بہت کم پائی جاتی ہے - قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب تو نہ کسی قسم کی نبات اُگتی ہے - نہ کوئی جانور زندہ رہ سکتا ہے - بعض بڑے بڑے جسم والے جانور مثل ریچھ اور خاص قسم کی مچھلیوں کے جو اپنی حرارت کو بمقابلہ برف کے محفوظ رکھ سکتے ہیں - قطبین کے قریب ضرور پائے جاتے ہیں - زندگی کا ایک ضروری سبب ہوا بھی ہے جسکے بغیر کوئی زندہ چیز زندہ نہیں رہ سکتی - ہوا کا جزو آکسیجن جو سانس کے ذریعے سے انسان کے بدن میں داخل ہوتا ہے انسان کی زندگی کے لیئے نہایت ضروری چیز ہے - یہی حال پانی کا ہے جسکے بغیر انسان، یا حیوان، یا نباتات کا زندہ رہنا ناممکن ہے -

اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی روشنی و حرارت اور آکسیجن سے قائم رہتی ہے - رہی غذا جسکو حیوانات کھاتے ہیں - اور اُس سے گرمی پیدا ہوتی ہے، وہ اِس غرض سے ہے کہ بدن کے جو اجزا فنا ہوتے رہتے ہیں - اُن کی جگہ نئے اجزا پیدا ہوں - اور مختلف اعضا کو غذائیت حاصل ہو - یہ بات بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ جاندار کی زندگی کے قیام کا سبب ایک مدت دراز تک بغیر خوراک کے صرف حرارت ہو - مرغی کا بچہ جب انڈے میں ہوتا ہے تو اُسکو باہر سے سوا حرارت کے کسی قسم کی غذا نہیں پہنچتی حالانکہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں کامل جانور بنجاتا ہے -

ڈاکٹر فورڈس نے ایک برتن میں پانی بھر کر تجربے کیلیئے اُسمیں مچھلیاں ڈالدی تھیں اور ہر چوبیس ۲۴ گھنٹے میں ایک مرتبہ پانی بدل دیتا تھا - پھر تین دن کے بعد پانی بدلنے لگا - پندرہ مہینے تک مچھلیاں بغیر کچھ کھائے زندہ رہیں - اور بڑھتی رہیں - چونکہ یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ شاید یہ مچھلیاں اُن چھوٹے چھوٹے جانوروں کے کھانے سے زندہ رہی ہوں جو پانی میں موجود ہوتے ہیں اور خوردبین سے دکھائی دیتے ہیں - اسلیئے اُسنے پانی کو مقطر کرلیا - اور اوپر سے برتن کو ڈھکدیا - اِس خیال سے کہ باہر کی ہوا سے کوئی چیز پانی میں داخل نہو - مچھلیاں اسی حالت میں ایک مدت تک زندہ رہیں - شاید یہی سبب ہوگا کہ بعض لوگ جو مدت دراز تک روزہ رکھتے ہیں اور کچھ کھاتے پیتے نہیں - مرنے نہیں پاتے -

وہ اسباب جنسے زندگی کی قوت کمزور ہوتی ہے اُنمیں سے ایک سبب زندگی کی قوت کو سخت محنت میں ڈالنا ہے جسکے سبب سے بہت قوت ضائع ہوجاتی ہے اور جب محنت شدید کیجائے یا محنت کرتے کرتے مدت دراز گذر جائے تو یہ قوت بالکل فنا ہوجاتی ہے - یہ کیفیت ہر روز کے تجربے سے صاف طور پر معلوم ہوتی ہے - ہمکو دیر تک چلنے یا دیر تک سوچنے یا اسی قسم کی دوسری محنت کرنے کے بعد تھکن اور کمزوری معلوم ہوتی ہے -

پروفیسر گلوسنے مردے کے عضلات اور اعصاب کو دو دھاتوں سے چھوکر اور اُن کو تحریک پہونچا کر تجربہ کیا تو یہ معلوم ہوا کہ جب تحریک کا اثر تیز اور متواتر ہو تو عضلات اور اعصاب سے جلدی اثر قبول کرنے کی قابلیت کم ہوجاتی ہے لیکن جب تحریک ہلکی اور فاصلہ

انسان کی زندگی کیونکر دراز ہو سکتی ہے؟

کے ساتھ ہو تو اثر قبول کرنے کا زمانہ بہت طویل ہوتا ہے۔ اسی سبب سے آرام لینا یا کام سے کچھ دیر کے بعد رک جانا تقویت کا موجب ہے۔ اور یہ ٹھیک قانون قدرت کے موافق ہے

(۶) زندگی کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ غذائیت سے جسم میں جو حصہ بڑھتا ہے زندگی اُسکو عضو بنا دیتی ہے یعنی جو اجزا بدن میں اضافہ ہوتے ہیں اُنکو زندگی اسطرح خلط ملط کرتی ہے کہ وہ جسم کے اعضا میں شامل ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور جس عضو میں وہ داخل ہوتے ہیں اُسی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

(۷) زندگی جسم کے ہر ایک جز میں خواہ وہ سیّال ہو یا جامد داخل ہے۔ لیکن جن اعضا میں زندگی حلول کرتی ہے اُن کے اختلاف کے لحاظ سے جداجدا اور مختلف نتیجے محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ اعصاب میں وہ حِس کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ عضلات میں انقباض کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اسیطرح بدن کے ہر عضو اور ہر مقام پر مختلف شکلوں میں ظہور کرتی ہے۔ ان تمام شکلوں اور صورتوں کا ایک عام نتیجہ یہ ہے۔ کہ جسم کے تمام اجزا نشو و نما پاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ جسم اُس کمال پر پہونچتا ہے جسپر اسکا پہونچنا فطرت الٰہی کو مقصود ہے۔ اسکے بعد وہ تمام قدرتی افعال جو پہلے دورے میں ظاہر ہوتے تھے دوسرے دورے میں بدل جاتے ہیں۔ نموّ اور بالیدگی کی قوت اب ایک اور شکل اختیار کرتی ہے، جسکو تجدید کی قوت کہتے ہیں۔ اور جس سے جسم کے پُرانے اجزا سودہ اور فرسودہ ہوکر فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اُنکی جگہ نئے اجزا طیار ہو جاتے ہیں۔ یہ زندگی کی وہ خاصیت ہے جس سے ہر ایک جاندار کا وجود دنیا میں قائم ہے۔

اِس تمہید کے بعد اب ہم اصلی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی کو حکمانے آگ کے شعلے سے تشبیہ دی ہے۔ اسلیئے کہ پُرانے اجزا کا فنا ہو جانا اور نئے اجزا کا تیار ہو جانا ہمیشہ جسم میں جاری رہتا ہے۔ اِس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے ہر منٹ اور ہر لحظے میں مرنا اور جینا ایک ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی کی قوت یعنی وہ قوت جس کے ہونے سے بدن کے نئے اجزا تیار ہوتے ہیں۔ فنا کی قوت یعنی اُس قوت پر غالب رہتی ہے جسکے سبب سے بدن کے پُرانے اجزا فرسودہ ہوتے ہیں۔ جسم برابر بڑھتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ اپنی تکمیل کے درجے پر پہونچ جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ فنا اور تجدید کی قوتیں برابر ہوتی جاتی ہیں۔ آخرکار فنا کی قوت تجدید کی قوت پر ایسی غالب آجاتی ہے کہ جسم رفتہ رفتہ گھٹنا شروع ہوتا ہے۔ آگے چلکر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جسم بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر مخلوق پر تین دوْر گذرتے ہیں (۱) نموّ اور بالیدگی کا دَوْر (۲) سکون کا دَوْر (۳) انحطاط اور فنا کا دَوْر۔

مگر یہ خیال رہے کہ زندگی کا زمانہ اکثر امور ذیل پر منحصر ہوتا ہے۔

(۱) زندہ جسم میں زندگی کی قوت کی کیا مقدار ہے۔ اگر زندگی کی مقدار زیادہ ہے تو زندگی کا زمانہ بھی طویل ہوگا نہیں تو زندگی کا زمانہ بھی کم ہوگا یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ یہ قوت بعض جسموں سے زیادہ اور بعض جسموں سے کم مانوس ہوتی ہے۔ اسیطرح بعض جسموں میں اسکی مقدار زیادہ اور بعض میں کم ہوا کرتی ہے۔ اور زندگی کے لیئے بہت سے اسباب ایسے پیش آتے ہیں جو اسکی قوت کو

 انسان کی زندگی کیونکر دراز ہوسکتی ہے؟

بڑھاتے یا گھٹاتے ہیں۔ پس یہ کہنا کچھ بعید نہیں ہو کہ یہ تمام چیزیں عمر کی درازی اور کوتاہی پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

(۲) یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے یہ قوت تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اور جو حالت اسکی ہوتی ہو وہی اعضا کی ہوجاتی ہے۔ اگر یہ قوت زوردار ہو تو انسان اُس سے زمانۂ دراز تک کام لے سکتا ہو اور اگر کمزور ہی تو بہت جلد اُسکی عمر ختم ہوجاتی ہے۔ اسی ذیل میں یہ جتانا بھی ضروری ہے کہ بعض اعضا سے زندگی کی قوت مدت تک برابر کام لیتی رہتی ہو اور اونکو اعضای زندگی کہتے ہیں۔ اگر یہ اعضا بیکار ہوگئے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ زندگی دراز ہو۔ پس یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ زندگی کا دراز ہونا ان اعضا کی قوت اور اُن کی صحت پر منحصر ہے۔

(۳) جسم کے اجزا کی فرسودگی جو ہمیشہ جسم میں جاری رہتی ہو کبھی تو اُسکی رفتار تیز ہوتی ہے اور کبھی دھیمی ہوتی ہے۔ پہلی حالت میں زندگی کا زمانہ کم ہوتا ہو اور دوسری حالت میں دراز ہوتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی بتی دونوں طرف سے جلائی جائے تو وہ بہ نسبت اُس بتی کے جو ایکطرف سے روشن کیجائے جلد گھلجاتی ہو۔

(۴) چونکہ فنا اور تجدید کی قوتیں جسم کی فرسودگی کا زور سے مقابلہ کرتی رہتی ہیں، اسلیئے جو جسم اسبات کی قدرت رکھتے ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے اجزا کو بدل دیں۔ اور نئے اجزا اختیار کرلیں وہ بہ نسبت دوسرے اجسام کے زمانۂ دراز تک زندہ رہتے ہیں۔

اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کا زمانہ زندگی کی قوت کی مقدار اور بیرونی اجزا کے جلد جلد گوشت اور پوست میں تبدیل ہوجانے اور فنا اور تجدید کی قوتوں کی تیزی یا سستی پر موقوف ہے۔

ابھی یہ بات بیان کرنی باقی ہو کہ زندگی محدود ہو یا غیر محدود۔ یہ مسئلہ ایسا ہو جسمیں بہت بڑا اختلاف ہو۔ مگر غالب راے یہی ہو کہ جسطرح ہر جاندار کی جسامت۔ قوت۔ اعضا کی جنبش اور پھرتی۔ فنا اور تجدید کی قابلیت پر محدود ہو۔ اسیطرح اُنکی زندگی بھی محدود ہو۔ ممکن نہیں ہے کہ زندگی اس حد سے آگے بڑھ جائے

یہ بات ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ جسم کے اجزا کی فرسودگی۔ اور اُسکی رفتار کی کمی وبیشی اور بعض حالات کے اثر سے تغیر قبول کرنے کو زندگی سے بہت بڑا تعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ زندگی فی الحقیقت محدود ہو مگر اعضا کو تقویت پہونچانے۔ اُنکو فرسودگی سے محفوظ رکھنے۔ اور اُنکے اجزا کو آسانی کے ساتھ تبدیل کرنے سے ایک خاص حد تک انسان کی زندگی بڑھ سکتی ہو۔ خوراک۔ لباس۔ مقام سکونت کے موافق یا ناموافق ہونے کو بھی زندگی کی کوتاہی اور درازی میں بہت بڑا دخل ہو۔

"اجزای جسم کی فرسودگی کو کم کرنا" یہ ایک ایسا امر ہے جسپر خاص طور سے توجہ کرنا ضروری ہے کیونکہ زندگی کی درازی کا دارومدار اسی پر ہو۔ اگر ہم فرض کریں کہ ہر زندہ جسم میں زندگی کی خاص مقدار ہے تو اگر اعضا اپنا کام جلد جلد کرینگے اور اسکی اجزا جلد جلد فرسودہ ہونگے تو زندگی کی مقدار بھی جلد ختم ہوجائیگی۔ اگر دو شخصوں کی زندگی کی مقدار مساوی ہو اور ایک شخص بہ نسبت دوسرے شخص کے اُس مقدار کو دوچند خرچ کرے تو یہ ظاہر ہے کہ پہلے شخص کی زندگی بہ نسبت دوسرے کے آدھی مدت میں تمام ہوجائیگی۔ اور دوسرا پہلے کی نسبت دوچند زمانے تک زندہ رہیگا۔ یہ امر انسان پر منحصر نہیں ہو بلکہ ہر جاندار پر صادق آتا ہو۔ اگر پودوں کو گرمی اور پانی اور کھاد جلد جلد پہونچائی

جانے تو اُن کی زندگی کا ارتقا تیز ہو جائیگی - اور بہت کم عرصے میں وہ کمال کے درجے پر پہونچ جائینگی۔ پھر اُن میں جلد انحطاط شروع ہو جائیگا - وہ مخلوقات جنمیں زندگی کی قوت زیادہ اور اُن کے اعضا میں حرکت اور جنبش بھی زیادہ ہے - اُنکی زندگی بہ نسبت اُن مخلوقات کے کم ہے جنمیں زندگی کی قوت کم اور کام کرنے کی قوت کمتر ہے - اگر تم نباتات پر نظر ڈالو تو صاف طور پر معلوم ہو جائیگا کہ زندگی کی قوت نباتات میں بمقابلہ اعلیٰ درجے کے حیوانات کے زیادہ نہیں ہے - باوجود اس کے یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ درخت بمقابلہ جانوروں کے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں - پس ممکن ہے کہ بعض حالات جو کمزور کرنیوالے ہیں اعضا کی حرکت اور جنبش کے کم کرنے سے وہی حالات زندگی کے لیے معین اور مددگار ہو جائیں - اور جو حالات تقویت پہونچانیوالے ہیں وہ زندگی کی کوتاہی کا باعث ہو جائیں - اس سے یہ امر صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ خوراک وغیرہ وسائل جن سے زندگی کے دراز کرنے میں مدد لیجاتی ہے وہ ہمیشہ ہمارے مقصد کو پورا نہیں کرتے۔

جب ہم نیچر (فطرت) پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُسنے ہر ایک کامل مخلوق کے لیے ایک ایسا طریقہ قائم کردیا ہے جس سے اُس کے جسم میں جو اجزا کی فرسودگی واقع ہوتی ہے - اُسکی مدافعت ہوسکے - دیکھو - نیند سے کیا مراد ہے - اُس سے یہی مطلب ہے کہ زندگی کے سب کام اُس سے کم ہو جائیں اور بعض کام بند ہو جائیں تاکہ وہ زندہ مخلوق جسپر نیند طاری ہوئی ہے اُسکے جسم سے جو اجزا فنا ہوگئے ہیں اُن کی جگہ نئے اجزا پیدا ہو جائیں - جب کوئی انسان متواتر (۱۳) گھنٹے یا (۱۶) گھنٹے تک کام کرتا ہے تو اُس کے جسم میں نقصان عظیم پیدا ہو جاتا ہے اور اُسکو تھکن اور کمزوری معلوم ہوتی ہے - اسی سبب سے وہ اوسطاً چھ گھنٹے لگتا ہے اور سات یا آٹھ گھنٹے تک گہری نیند میں سوتا رہتا ہے تاکہ جو اجزا اُسکے بدن سے کم ہوگئے ہیں وہ پھر پیدا ہو جائیں اسی بنا پر بیداری کی برابر کوئی چیز انسان کو لاغر اور ناتوان نہیں کرتی - یہ نہ سمجھنا کہ نیند جانوروں کے ساتھ خاص ہے بلکہ وہ نباتات میں بھی پائی جاتی ہے - درخت سالہا سال تک زندہ رہتے ہیں لیکن اگر اُنپر جاڑوں کی گہری نیند طاری نہ ہوتی تو وہ اتنے دنوں تک کبھی زندہ نہیں رہ سکتے تھے جتنے دنوں تک کہ وہ اب زندہ رہتے ہیں

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بعض نباتات پر انسان کی طرح ہر روز نیند طاری ہوتی ہے - اُن کے پتے سکڑ جاتے ہیں - اُن کی شاخیں جُھک جاتی ہیں - اُن کے پھول بند ہو جاتے ہیں - اور اُن کی حالت وہی ہو جاتی ہے جو سونے والوں کی ہوتی ہے - بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نیند کا اثر شام کی سردی اور اُس کی رطوبت کے باعث سے ہے - اگر یہ امر صحیح ہو تو جو نباتات شیشے والے کے کمروں میں رکھی جاتی ہیں - جہاں حرارت ہمیشہ ایک ہی درجے پر رہتی ہے - اُن پر غنودگی کی کیفیت کبھی طاری نہ ہوتی - بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ کیفیت اندھیرے کے اثر سے پیدا ہوتی ہے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سے نباتات ایسے ہیں جنپر اُن پرندوں کی طرح جو رات کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں دن ہی کے وقت نیند طاری ہوتی ہے -

دوسرے نمبر میں ہم اس مضمون پر اپنا ریمارک تحریر کرینگے

(رشید احمد سالم)

سوفسطائی حکما اور انکا فلسفہ

سوفسطائی سوفسطائی (سوفسٹ یا دانا) کا نام اہل یونان نے جس فرقے کو دیا تھا وہ درحقیقت فلسفی نہ تھے۔ اور نہ انھوں نے نظریات حکمت میں کوئی ترقی کی تھی۔ مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ یہ گروہ سابقہ فلسفیوں کے اختلافات اور تنازعات سے پیدا ہوا تھا۔ اور علم حسّی کی بے اعتباری جو حکمای سابقہ نے ثابت کی تھی اوسکا بہت بڑا اثر سوفسطائیوں پر ہوا تھا۔ سوفسطائیوں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک ابتدائی سوفسطائی تھے۔ جنکی حیثیت فلسفیوں کی تھی۔ دوسرے ما بعد کے لوگ جنھوں نے اس فرقے کا نام بدنام کیا ہے اور جو علانیہ کہتے تھے کہ نیکی بدی کوئی چیز نہیں ہے۔ سقراط سے قبل شہر آتھینز میں خصوصًا اور یونان میں عمومًا اِس گروہ کا بہت زور رہا۔ اُن کی لیاقت فصاحت و بلاغت چرب زبانی میں ایسی تھی جیسی وکلا۔ بیرسٹروں اور معلموں کی ہوتی ہے۔ ان میں علم اور دنیاداری دونوں باتیں جمع تھیں۔ اور وہ یونانی تہذیب کے اوسی زمانے میں پیدا ہوئے تھے، جبکہ قدیم دیوتاؤں کا اعتقاد ذہین لوگوں کے دل سے درپردہ دُور ہوگیا تھا مگر مذہب الہامی اور توحید کی روشنی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ یہودی اپنے متعصّب خدا کی پرستش اپنے معبدوں میں کرتے تھے مگر وہ خدا صرف آلِ یعقوب کا خدا تھا۔ دوسری قوموں کو اُس سے سروکار نہ تھا۔ غرض یونانی تہذیب پر مذاہب ایشیا نے اپنا اثر اُسوقت تک نہ ڈالا تھا۔ سوفسطائیوں اور دیگر حکما میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ سوفسطائی پیشہ ور معلم تھے اور جگہ جگہ پھرتے اور روپیہ لیکر علم و دانش کا سبق دیتے تھے جو اصلی حکما کو یہ امر ناگوار تھا۔ وہ لوگ فقیر تھے اور یہ امیر۔ وہ امیروں سے متنفر تھے اور یہ اُن کے مصاحب۔ غرض اسوجہ سے سنجیدہ آدمیوں کو سوفسطائیوں سے نفرت ہوگئی۔ اور حکمار قدیم کے شاگرد جو تعلیم کو ایک پاک اور مقدس کام سمجھتے تھے اور اُسکی اُجرت لینا گناہ جانتے تھے اس علم فروشی کو حقارت سے دیکھتے تھے۔

علاوہ ازیں ما بعد کے سوفسطائیوں نے قدیم فلسفے اور اخلاق کی زنجیروں کو بالکل توڑ دیا تھا اور بیباک ہوکر وہ علم حسّی ہی کی نہیں بلکہ علم عقلی کی بھی بے اعتباری دکھاتے تھے اور پرانی نظریات کو لغو بتاتے تھے۔ سچ اُن کے نزدیک ناقابل حصول شے تھی۔ جب سچ معلوم ہونے کے قابل نہ رہا تو اب کیا باقی رہا جسکی تعلیم وہ نوجوانوں اور امیرزادوں کو دیتے تھے۔ وہ فنِ ابلہ فریبی تھا یعنی فصاحت و بلاغت۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں حقیقت اور حق کا پتا نہیں ملتا تاہم زندگی کے دن گذارنا اور لوگوں سے کام نکالنا تو ضروری بات ہے۔ اِس کے لیے وہ آدمیوں کو تیار کرتے تھے اور بحث و کلام میں اُنکو ایسا چست کرتے تھے کہ اپنی چرب زبانی سے ہر جگہ غالب ہوجائیں اور دلیل بدتر کو بہتر ثابت کردیں یہ فن تعلیم کرنا اور اُسمیں مستعد لوگ پیدا کرنا، یہی اُنکا سرمایۂ افتخار تھا۔ قدما کے فلسفی خیالات تو ظاہر ہے کہ نہایت دلیرانہ اور غیر مستقل اور مبالغہ آمیز تھے۔ انھوں نے اُن سبکو ترک کیا اور عملی اور مفید باتوں کی طرف توجہ کی۔ مگر مفید اور عملی باتیں وہ انھیں کو سمجھتے تھے جس سے اُنکا اور اُن کے شاگردوں کا مطلب حاصل ہوجائے۔

سوفسطائیوں کی بدنامی کی اصل وجہ اسمیں بھی شک نہیں کہ سوفسطائیوں کے ساتھ مورخین نے

سوفسطائی حکما اور اُنکا فلسفہ

بے انصافی بھی کی ہے۔ آجکل جبکہ ہر پروفیسر اور لکچرر با اُجرت دوسروں کو تعلیم دیتا ہے۔ سوفسطائیوں کو بُرا سمجھنا صرف پُرانے مصنفین کی تقلید کرنا ہے اس زمانے میں جبکہ اکثر نوآموز آدمیوں کا رجحان اس طرف ہے کہ فلسفہ ناممکن ہے۔ اُن کو بددین اور لغو قرار دینا صریح ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سُقراط سوفسطائیوں کا مخالف تھا۔ اور سوفسطائی اُس کے دشمن۔ اور دونوں نے ایکدوسرے پر سخت سخت حملے کئے تھے۔ سُقراط تو قتل کیا گیا مگر فلسفہ سُقراط اور شاگردانِ سُقراط نے خیالات و فلسفے کے عالم میں مطلق العنان حکومت حاصل کرلی۔ اِس صورت میں سوفسطائیوں کے نام پر جسقدر تاریخی ظلم کیا جائے تھوڑا ہے۔ سوفسطائیوں نے بحث ومباحثے کے رَو میں جو کوئی فقرہ بسبیل تنزل بھی زبان سے نکالا حکمانے اُسکو پکڑ لیا۔ اُن کے اِسی قسم کے اقوال زیادہ تر افلاطون و ارسطو کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں۔ الغرض ہماری رائے میں علم بلاغت کی ترقی دینے اور عام تعلیم کے پھیلانے میں اِس گروہ نے قدیم یونان میں بہت مدد دی ہے۔ تاہم یہ سچ ہے کہ اُن کی عقلی بے اعتقادی اور بے اصول خیالات مضر ہیں مگر جس قلم نے اُن کی تصویر کھینچی ہے وہ اُنکا نہ تھا۔ ورنہ ہم چاروں طرف سے اُنکی بُرائیاں ہی بُرائیاں نہ سُنتے۔ جس تصویر کو دشمن یعنی سقراط کے پیرو افلاطون و ارسطو نے کھینچا ہے وہی تصویر سوفسطائیوں کی ہم تک پہنچی ہے۔ اگر اُن بزرگوں کی تصانیف موجود ہوتیں تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے مخالفوں کو لغوگو اور بیوقوف ثابت کرتے۔ جس شخص کو صرف اہلِ شریعت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے یا صرف رندمشربوں میں، وہ اُنکے کلام و تصانیف سے دوسرے فرقے کو نہایت ہی لغو سمجھے گا اور کہیگا کہ وہ تو بدیہی اور معمولی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کسی نسل کو صرف سُنّیوں کی تصانیف دکھائی جائیں تو وہ روافض سے بدتر دنیا میں کسی کو نہ سمجھیگی۔ برخلاف اسکے جنہوں نے سراسر شیعوں کے دائرے میں تربیت پائی ہے اُنکے نزدیک سُنّیوں کا مذہب مثل پرکاہ کے کمزور اور بودا ہے۔ پس سوفسطائیوں کو بُرا کہنے سے پہلے ہمکو اِستثنا کا بھی لحاظ رکھنا لازم ہے کہ جو کچھ اُنکی نسبت ہماری معلومات ہیں وہ اُنکے مخالفوں سے ہم تک پہونچی ہیں۔ علاوہ اسکے کوئی مذہب اور کوئی جماعت نہیں ہے جو اپنی رای کی تائید سوفسطائی دلائل سے نہ کرتی ہو۔ پس ہمکو کوئی حق نہیں ہے کہ اپنے پیشرووں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

پروٹوگراس

پروٹوگراس جو ۴۸۵ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا ایک نہایت ممتاز قدیم سوفسطائی ہے۔ اُسکا خیال جیساکہ سیکسٹس امپریکس کی کتاب سے پایا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ سب اشیا کی صداقت کا معیار خود انسان ہے۔ مادہ ہروقت تغیّر و تبدل کی حالت میں رہتا ہے۔ ہمارے حواس جو اِس تغیّر کو مشاہدہ کرتے ہیں وہ بھی کبرسنی اور علالت سے متغیّر ہو جاتے ہیں۔ حواس جن چیزوں کو محسوس کرتے ہیں اُنکی بنیاد بھی مادہ پر ہے۔ مگر مختلف اوقات میں آدمی پر اُنھیں خارجی چیزوں کے اثرات مختلف طور پر ہوتے ہیں۔ صحیح الجسم تندرست چیزوں کو عموماً اور طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔ علیل المزاج اور ناقص لوگ اُنکو بیماروں اور ناقص آدمیوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ پس خود انسان صداقت کا معیار ہے۔ جھوٹ اور سچ کے فیصلے کے لئے ہم ہمیشہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔

پروٹوگراس کی رائے کو اپنے ایک مکالمے میں افلاطون نے بھی ایسا ہی ظاہر کیا ہی۔ ان الفاظ میں پروٹوگراس نے درحقیقت ایسی بات کہی ہے جسکو ہر شخص سمجھ سکتا اور قدر کرسکتا تھا۔ وہ مثل سقراط کے خود آدمیوں کے اپنے خیالات اور تجربے کا حوالہ دیتا تھا۔ غرضکہ اُسنے عام فہم اصول کا فلسفہ قائم کیا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ حکمانے اُسکے اصلی رجحان کو توڑا پالیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ حس اور علم کو اس اصول نے ایک کردیا اور عقل کو بالکل بالائے طاق رکھدیا ہے۔ جب انسان کی طبیعت اور مادہ کے باہمی عمل سے احساس یا علم پیدا ہوتا ہے اور وہ دونوں بدلتے رہتے ہیں تو علم ایک غیر مستقل اور بدلنے والی شے ہوگا۔ اور خود انسان جو اُسکا معیار ہے ایک متغیر شے ہے۔ نتیجہ اُسکا یہی ہوا (جیسا ما بعد کے سوفسطائیوں نے نکالا) کہ علم بے اعتبار ہے۔

گورجیاس سوفسطائی سینکڑوں گذرے ہیں اور افلاطون کے مکالموں میں اُنسے اور سقراط سے جو جو مباحث ہوئی سب درج ہیں۔ مگر ہم ایک اور مشہور سوفسطائی کا ذکر کرتے ہیں جو فلسفی حیثیت رکھتا تھا اور دیگر سیکڑوں سوفسطائی معلموں کو اس مختصر بیان میں جگہ نہیں دیسکتے۔ گورجیاس ۴۵۲ قبل مسیح میں پیدا ہوا اُسنے ایک کتاب لکھی ہے جسکا نام علی[۲] مَالَیْسَ بِمَوْجُوْدٍ اَیْ فِطْرَۃُ الْعَالَمِ۔ رکھا۔ اُس میں اُسنے تین اصول متعارفہ قرار دیے ہیں اور اُن سے علم انسانی کے بے اعتبار بلکہ محال ہونے کو ثابت کیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ (ا) کوئی شے موجود نہیں۔ (ب) اگر موجود بھی ہو تو انسان کو معلوم نہیں ہوسکتی (ج) اگر آدمی جان بھی سکے تو اُسمیں یہ طاقت نہیں کہ دوسروں تک اُسی علم کو پہونچا سکے۔

(ا) پہلے اصول کو یعنی کوئی شے موجود نہیں گورجیاس اسطرح ثابت کرتا ہے (۱) شروع شروع میں کوئی شے نہ تھی۔ (۲) اُسوقت حقیقت کا وجود نہ تھا۔ پس ہر شے یا تو قدیم ہے یا مخلوق ہے، یا مخلوق و قدیم دونوں ہے۔[۱] اگر مادہ قدیم ہے تو وہ مخلوق نہیں ہوسکتا۔ اور ضروری ہے کہ غیر محدود لا متناہی بھی ہو۔ مگر لامتناہی کے حصے نہیں ہوتے نیز جس شے میں مادہ ہے، وہ ضرور ہے کہ مادہ سے مختلف ہو یعنی وسعت یا مکان۔ پس لازم ہے کہ مکان مادے سے مختلف اور بڑی شے ہو۔ اور یہ خیال مادہ کے غیر محدود (لا متناہی) ہونے کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک غیر مخلوق اور لا متناہی (یعنی مادے) کے سوا۔ دوسری اُس سے بھی زیادہ وسیع چیز (یعنی مکان یا وسعت) کہاں سے آگئی۔ اگر مادہ خلق کیا گیا ہے تو وہ یا تو اُس شے سے بنایا گیا ہے جو پہلے سے تھی یا اُس شے سے جو پہلے نہ تھی۔ اول صورت میں وہ مخلوق نہیں ہوسکتا۔ اُسکی صورت صرف بدل جاتی ہے۔ دوسری صورت میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ جو چیز کبھی نہ تھی اُس سے کوئی چیز مخلوق کیسے ہوسکتی ہے۔

(ب) دوسرا اصول یعنی اگر کوئی شے ہو بھی تو آدمی اُسکو جان نہیں سکتا۔ اسکی نسبت وہ اسطرح دلیل کرتا ہے۔ ہم اشیا کی حقیقت کو نہیں جان سکتے

[۱] یعنی ایک وقت جو کچھ ہمکو محسوس ہوتا ہے وہ حقیقی اور سچ ہے۔ دوسرے وقت جو کچھ معلوم ہوا اُسوقت وہ سچ ہے۔

[۲] بحث اُسپر جو موجود نہیں ہے یعنی عالم۔

[۱] یہ دلیل ایسے اصول پر مبنی ہے جو غلط ہیں، اسلیئے ہم کو ان کے بطلان کی یا ان پر بحث کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ مکان یا وسعت دراصل کوئی مخلوق جداگانہ نہیں ہے۔

سوفسطائی حکما اور اُنکا فلسفہ

کیونکہ اُسکے لیئے ہمارے مشاہدے اور اشیا میں کامل مناسبت ہونی چاہیئے یعنی جو کچھ مادے میں ہے ہمارے حواس میں آجائے اور یہ لغو ہے پس جو دراصل موجود ہے وہ ہمارے علم میں نہیں آسکتا ہر حواس صرف اُس شے کو محسوس کرتا ہے جو اُسکے دائرے میں ہے۔ پس ممکن ہی کہ شے موجود ہو اور ہمارے خیال میں نہ آئے کیونکہ حواس محدود ہیں۔ سوفسطائیوں کا دوسرا دعویٰ ایسا ہے جس سے کوئی شخص جسنے فلسفی مسائل پر غور کیا ہی انکار نہیں کرسکتا۔ یعنی ماہیت وحقیقت اشیا کا علم محال ہی۔ مگر سوفسطائیوں کا یہ دعویٰ کہ ہر قسم کا علم محال ہے تجربے کے خلاف اور انسانی یقین کے منافی ہے۔ منظاہر کا علم ہمکو ہر ساعت ہوتا رہتا ہے اور وہ علم بہت کچھ آپس میں مطابق اور ہماری ضروریات کے لیئے کافی ہے۔ اور فلسفی اور منطقی استدلال کے مقابل میں اُسکی صحت قائم رہ سکتی ہی۔ البتہ جو کوتاہ نظر شخص علم منظاہر اور علم حقیقت میں فرق نہیں سمجھتے اور انسان کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ وہ ماہیت جان سکتا ہی اون کے لیئے گورجیاس کی دلیل لاجواب ہے اور لاجواب رہیگی۔

(ج) تیسرا اصول یہ ہے کہ اگر ہم جان بھی سکیں تو دوسروں تک اُسی علم کو نہیں پہونچا سکتے۔ اُس کی تشریح گورجیاس نے یوں کی ہے۔ کہ "ہماری پاس دوسروں تک خیالات کھنچانیکا ذریعہ زبان یعنی تقریر ہے۔ مگر زبان اور اشیا خارجی یعنی حقیقی اشیا متحد نہیں ہیں بلکہ جدا جدا چیزیں ہیں۔ ہم دوسروں تک صرف اپنے لفظ منتقل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو نظر میں سما سکتا ہے۔ کان اُس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نہ کان بیرونی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان دونوں کا دائرہ جُدا ہی بیشک ہم کہتے ہیں کہ زبان اُن اثرات سے مرتب کیگئی ہی جو اشیاء خارجیہ ہمارے حواس پر کرتی ہیں لیکن اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ لفظ درحقیقت سچے طور پر اشیاء بیرونی کے خواص ہم تک منتقل کرتے ہیں، بلکہ جو اثر ہمارے اپنے حواس پر ہوتا ہے وہ ہم دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ مان بھی لیا جائے کہ محسوس اشیاء حسّی وجود ہیں تو اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہی اشیاء الفاظ بھی ہیں۔

گورجیاس کی یہ دلیل صرف ایک حد تک صحیح ہے یعنی بذریعہ کلام یا تحریر کے ہم علم حقیقت دوسرے تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ خود ہم تک نہیں پہنچا ہے لیکن منظاہر کا جو علم ہمکو ہے اُسکو بہت کچھ دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں یا کم از کم دوسرے کو ایسے رستے پر ڈال سکتے ہیں جس سے وہ خود بذریعہ تجربہ ذاتی کے علم منظاہر کو حاصل کریگا فی نفسہ دیکھا جاوے تو ایک شخص دوسرے تک علم کبھی نہیں پہونچاتا ہی بلکہ جو اثر اُسکی اپنی طبیعت پر ہوا ہے۔ وہی اثر مختلف ذرائع سے دوسرے کی طبیعت پر ڈالتا ہے اسیکو تعلیم کہتے ہیں۔ پھر بھی دونوں اثروں میں کچھ فرق ضرور رہتا ہے لیکن چونکہ ہماری طبائع وضع میں باہم یکساں ہیں اسلیئے یکساں اسباب عموماً یکساں نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اسوقت ہم نے سوفسطائی دلیل و تعبیر کی ایک اعلیٰ مثال بیان کردی ہی۔ اِن دو حکما کے سوا اور بیشمار سوفسطائی گذرے ہیں جنمیں سے بعض قتل بھی کیئے گئے ہیں۔ اِس الزام پر کہ وہ نوجوانوں کو بگاڑتے تھے۔ پروڈکس۔ ہپیاس۔ یوتھیڈیمس مشہور سوفسطائی ہو گذرے ہیں۔ سب سوفسطائی ظاہر ہی کہ ایک خیال کے نہیں ہوسکتے مگر علم کی بے اعتباری اور خود انسان کے معیار صداقت ہونے میں کم وبیش سب شریک تھے۔ اور موجودہ زمانے میں وہ سب ایک ہی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

آجکل سوفسطائی کے معنی کیا ہیں؟ ہمارے زمانے

میں تمام یورپ اور ایشیا میں سوفسطائی کے معنی اُس شخص کے ہوگئے ہیں جو ظاہر فریب دلائل سے جنکی بنیاد واقعات پر نہیں ہی عوام کو غلط امر باور کرائے ایسے دلائل کو سوفسطا اور ایسے شخص کو سوفسطائی کہتے ہیں - مگر یہ بات بھی قابل بیان ہی کہ سوفسطائی جو معلم اور فصیح لوگ تھے وہ نوجوانوں کو دنیا میں ترقی کرنے اور سوسائٹی میں بڑھنے کا ہنر خاصکر سکھاتے تھے - غالباً سوفسطائی کے موجودہ معنی اسیوجہ سے پیدا ہوگئے ہیں - کیونکہ جب اُن کے نزدیک علم خود ایک ناقابل اعتبار چیز ہے تو سچ اور جھوٹ یا غلط اور صحیح وہی چیز ہے جو اسوقت ہماری اغراض کے لحاظ سے سچ یا جھوٹ معلوم ہوتی ہے - جیسا موقع پڑے وہی بات کرنی چاہیے - اور جسطرح ہو کام نکالنا چاہیئے - مگر یہ حالت اعلیٰ درجے کے سوفسطائیوں کی نہ تھی - کیونکہ اُن کی حیثیت حکما اور فلاسفہ کی ہی

کیا اب بھی سوفسطائی موجود ہیں؟ مسیح علیہ السلام کا ایک قول مشہور ہے کہ "غریب ہمیشہ تمہارے درمیان رہیں گے" - اسیطرح کہہ سکتے ہیں کہ سوفسطائی ہمیشہ ہمارے درمیان رہے ہیں اور ہمیشہ رہینگے -

(۱) سوفسطائی فلسفے کا اصل الاصول یہ ہے - علم و صداقت کا کوئی صحیح معیار نہیں ہوسکتا - جو کچھ کسی کی سمجھ میں آجاوے وہی حق اور وہی باطل ہے - انسان خود علم کا معیار ہے -

(۲) سوفسطائی اصول اخلاق جیسا کہ عام طور پر اُن کی طرف منسوب کیا گیا تھا - یہ ہوسکتا ہے - سچ اور جھوٹ کا حال تو کسکو معلوم ہے - اسوقت جس بات سے کام نکلے وہ کہنی چاہیئے - اور جسطرح اپنی بات غالب رہے وہ تدبیر اختیار کرنی چاہیئے - یہ سچ ہے کہ سواے چند حکما کے اُن کے علمی اصول کو بہت کم لوگ علانیہ قبول کرینگے مگر آخر الذکر یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کا روزانہ عمل ہی اور نہایت ہی مقدس اور نیک آدمی بھی اُسکو جائز بلکہ بعض اوقات مستحسن سمجھتے ہیں -

بیرسٹر اور وکیل سب سے بدیہی طور پر وکیل و بیرسٹر اپنے موکل کی حفاظت کے لیئے قانونی عذر یا لفظی نزاع سے یا اپنی زبان زوری سے گواہان فریق مخالف کے دھمکانے سے - عدالت کو ایسے امور باور کرانے سے جن کو بعض اوقات قائل خود باور نہیں کرتا - اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتے ہیں اور کوئی شخص انکو اسلیئے معیوب نہیں سمجھتا -

خیر اہل قانون تو اپنے ناخواندہ یا جاہل موکل کے لیے ایسا کرتے ہیں - مگر ایک دوسرا فریق ہی جس کے پاس یہ عذر نہیں ہی -

مدبران سلطنت وسفیران حکومت بڑے بڑے مدبران سلطنت اور سفیران حکومت اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیئے ذو معنی جملے بولنے یا لکھنے اور علانیہ دوسرے فریق کو دھوکا دینے کو اعلے درجے کا ہنر سمجھتے ہیں - اور جو اس میں کامیاب سوفسطائی ہو وہی سب سے زیادہ عزت پاتا ہی اور اُسی کو سب سے بہتر معاوضہ ملتا ہے - انکی اصطلاحوں میں مخالف اور کمزور کا نام وحشی - جاہل - اور ظالم ہی - جب وہ غیر کی املاک پر قابض ہوکر اُسکو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں تو وہ انسانیت اور تہذیب کی اشاعت کرنے والے ہیں - جیسا کہ کسی زمانے میں لوگ دین حق کی اشاعت کے لیے لوٹ مار کیا کرتے تھے -

حامیان مذہب و عقائد اِس سے بھی بڑا گروہ اُن لوگوں کا ہی جنھوں نے کسی فریق یا مذہب یا کسی خاص شخص کی حمایت کو اپنا پیشہ قرار دے رکھا ہے - بیشک کوئی مناظر یا متکلم ایسا ملیگا جو ایک حد تک

سوفسطائی حکما اور انکا فلسفہ

سوفسطائی نہ ہو۔ اور جو فسطائی نہیں اور حق گو ہو وہ عموماً مرد و دالفریقین ہوتا ہے۔ بہت سے شایستہ اور لائق آدمی ایسے ہیں کہ اگر اُن کو کوئی مکار یا جھوٹا یا سوفسطائی کہے تو دراصل بے ادبی ہے اور خود اُن لوگوں کو بہت تعجب ہوگا مگر جب وہ کسی خاص مذہب یا عقیدے کی حمایت کرتے ہیں تو مفصلہ ذیل امور سوفسطائیوں کی مانند کرتے ہیں۔

(۱) فریق مخالف کے مطلب کو ناقص طور پر بیان کرنا۔

(۲) فریق مخالف کے الفاظ و خیالات کے غلط معنی بیان کرکے اُسکو بدنما صورت میں دکھانا۔

(۳) تاریخ میں کتر بیونت کرنا۔ جہاں تک ہوسکے اپنے مضر باتیں چھوڑ جانا یا نہایت اوپری طور سے اُنپر اڑا لنا۔ اور اُن کو بے وقعت ظاہر کرنا۔

(۴) تاریخ میں اپنے قیاسات ملا دینا اور اُن کو واقعات کی صورت میں ظاہر کرنا۔

(۵) مخالف فریق کیطرف بد اغراض کا منسوب کرنا (یہ عیب فلسفی سوفسطائیوں اور پولٹیکل سوفسطائیوں میں بھی بہت کثرت سے ہوتا ہے) مثلاً ایک فریق کا آدمی اگر کہے کہ صبح کو ہوا کھانا اچھا ہے تو دوسرے فریق والے اُسکا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ صبح کو ہوا کھانے کے بہانے سے وہ سویرے اُٹھکر چوری یا دیگر افعال شنیعہ کرنا چاہتا ہے۔

(۶) جن باتوں کو عوام بلا دلیل مانتے ہیں اُن کے ثابت کرنے میں صرف عوام کے اعتقاد کو دلیل قرار دینا اور مخالف کے دعوے کے خلاف جوش پھیلانا۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کا جوش کسی دعوے کی حقیقت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

(۷) الفاظ کے طمطراق اور فقروں کی چستی کے ذریعے سے عوام سے اپنا دعویٰ منوانا اسکی ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی امیدوار امتحان قانون میں اپنی کامیابی کی درخواست کرے کہ وہ گانا بہت اچھا جانتا ہے۔

(۸) بعض باتیں جنکی حمایت میں عام خیال بہت زور کے ساتھ قائم ہے۔ اُن کے بہانے سے غلط باتوں کی تائید کرنی۔

یہ ایک نہایت عام طریقہ سوفسطائیوں کا ہے۔ خواہ وہ پولٹیکل ہوں یا مذہبی۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادی سے عوام میں بدخیالات پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ بدخیالات کی اشاعت سے لوگوں میں مادۂ فساد پیدا ہوتا ہے۔ لوگ فساد کرتے ہیں۔ امن عامہ میں خلل ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کو خطرہ ہوتا ہے۔ اب جس گروہ کی نظر میں کسی گورنمنٹ کا قائم رکھنا لازم ہے وہ تو گورنمنٹ کے خطرے کا نام سُنتے ہی آزادی کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ مذہبی سوفسطائی اسطرح دلیل کرتا ہے۔

ج کے کتاب پڑھنے سے ب قوم کی تعریف پائی جاتی ہے۔ ب قوم کا مذہب ط ہے۔ ط کے خیالات ن عقیدے کے بارے میں بُرے ہیں ن عقیدے کے ماننے والے خدا پر سچا یقین رکھتے ہیں۔ اور بڑے نمازی ہیں۔ بس ج کی کتاب سے خدا یتعالیٰ کے سچے مذہب میں شک پیدا ہوجاتا ہے۔ اب وہ عوام کو ورغلاتے ہیں کہ ج کی کتاب نہ پڑھو یا تقریر نہ سُنو ورنہ دہریے ہوجاؤگے۔

علمی سوفسطائی سب سے عام سوفسطائی وہ ہیں جو اپنی معلومات علمی یا خیالات کی تائید میں وہ سب تدبیریں مغالطہ دہی کی کرتے ہیں جو اوپر شمار کی گئی ہیں۔ دوسرے کی بات کو پورے طور پر نہ سمجھنا

دوسرے کو عوام یا اپنے ہم خیال لوگوں میں پہلے سے بدنام کرنا - دوسرے کے مطلب کو غلط بیان کرنا - اپنی رائے کی تائید میں کسی نیک نام پرانے آدمی کا قول پیش کردینا - اسطور پر گویا اب مسئلے کا خاتمہ ہوگیا -

یہ عیوب قدیم یونان میں گو کثرت سے تھے مگر اب بھی دنیا ان سے خالی نہیں ہے - الغرض سوفسطائی اگرچہ ہزاروں برس ہوئے ختم ہوگئے مگر اب تک ہر ملک ہر شہر ہر قریہ - ہر محلہ - بلکہ ہر گھر میں موجود ہیں اور بکثرت موجود ہیں - ہم ان کو ایوانِ وزارت میں صاحب السیف والقلم دیکھتے ہیں - پارلیمنٹوں میں صاحب اقتدار ممبر، مسجد کے ممبر، یا کلیسا کی کرسی، یا بتکدے کے پھاٹک پر عوام وخواص کا مقتدا پاتے ہیں - اڈیٹروں کے اخبارات میں، علما کی تصانیف میں، اور فصحا کی اسپیچوں میں، ہم سوفسطائیت کا جلوہ دیکھتے ہیں - یہ ایک گروہ ہے جو غالبًا طوفانِ نوحؑ کے قبل موجود تھا - اور جو یقینًا اسوقت تک دنیا پر حکمراں رہے گا جبکہ اہرام مصری کا نام بھی تاریخ میں باقی نرہیگا - ان کے کارنامے سوانح عالم کے ہر صفحے پر نمایاں ہیں - اور ان کی قوت کے سامنے انسانوں اور دیوتاؤں کی سعی بیکار ہے

نخواہد این چمن از سرو ولالہ خالی ماند
یکے ہمیرود و دیگرے ہمے آید

(غلام الثقلین)

عرب کی تصنیفات اور یورپ کی فیاضی

(۱)

دنیا میں عربی کتابوں کے مشہور کتبخانے

عرب کے مشہور مولفات میں سے بہت سی کتابیں ایسی ہیں کہ اب تک اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی - قدیم سے صرف اُن کے قلمی نسخے موجود ومحفوظ چلے آتے ہیں - انکا ایک بڑا حصہ یا تو افراد قوم کے ہاتھوں میں ہے - یا اُن مدارس کے کتبخانوں سے تعلق رکھتا ہے جنکا جوامع سے علاقہ ہے - یہ وہ کتابیں ہیں جن کے اسماء اور حالات پر کسیکو اطلاع نہیں ہے - نہ اُن کی فہرستیں کہیں چھپی ہیں -

مگر ان کے علاوہ ایک بڑا حصہ مولفاتِ عرب کا ایسا بھی ہے جسکے بہت سے قلمی نسخے اسوقت تک اُن کتبخانوں میں موجود ہیں جنکو موجودہ اصطلاح میں (خزائنِ عمومیہ) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں - انکی فہرستیں پورے طور پر مرتب ہوچکی ہیں اور اکثر اُن میں سے چھپ چکے ہیں - اُن کے ذریعہ سے ہر ایک شائقِ علم موجودہ کتبِ عربیہ پر خواہ وہ اُن میں سے مطبوعہ ہوں یا قلمی - باسانی اور بخوبی عبور اور اطلاع حاصل کرسکتا ہے -

جن مشہور کتبخانوں میں عربی کی قلمی یا مطبوعہ صدہا کتابیں موجود ہیں اُن میں سے ہمارے موجودہ زمانے میں یہ بیس کتبخانے زیادہ مشہور و معروف ہیں اور دور و دراز مسافتوں سے اقرب جہات تک پھیلے ہوئے ہیں -

(۱) کتبخانۂ برلن - یہ شہر جرمن کا پای تخت ہے -
(۲) کتبخانۂ اسکوریال - یہ ایک مشہور قصر ہے جو میڈرڈ میں واقع ہے اور یہ اسپین کا دارالحکومت ہے -
(۳) کتبخانۂ فلارنز - یہ شہر دارالسلطنت ٹسکنی کا ہے اور اٹلی کے مضافات میں سے ہے -
(۴) کتبخانۂ گوتھا - یہ امیریہ کا پای تخت ہے اور جرمن کے سنٹرل پراونس میں واقع ہے -
(۵) کتبخانۂ کوپن ہیگن - یہ شہر ڈنمارک کا دارالسلطنت ہے

(۶) کتبخانۂ لیپزگ - یہ ملک سیکسن میں واقع ہے اور جرمن کے شمالی مشرقی حصوں سے علاقہ رکھتا ہے

(۷) کتب خانۂ لیڈن - یہ شہر ہالینڈ میں واقع ہے

(۸) کتب خانۂ لندن - یہ شہر انگلینڈ کا دار الخلافت ہے - اسکے متعلق دو کتب خانے ہیں - ایک برٹش میوزیم - اور دوسرا گورنمنٹ انڈیا سے تعلق رکھتا ہے -

(۹) کتب خانۂ لوند - یہ جنوبی ناروے میں واقع ہے -

(۱۰) کتب خانۂ اوپسالا - یہ بھی ناروے سے علاقہ رکھتا ہے -

(۱۱) کتب خانۂ اوکسفورڈ - یہ انگلستان میں واقع ہے -

(۱۲) کتب خانۂ پیرس - یہ فرانس کا دار السلطنت ہے

(۱۳) کتب خانۂ روما - یہ ملک اٹلی کا پایہ تخت ہے -

(۱۴) کتب خانۂ سینٹ پیٹرس برگ - یہ شہر روس کا حکومت گاہ ہے -

(۱۵) کتب خانۂ ویانا - یہ آسٹریا کا دار الحکومت ہے

(۱۶) کتب خانۂ قسطنطنیہ - یہ ممالک محروسۂ آل عثمان کا دار الخلافہ ہے -

(۱۷) کتب خانۂ بغداد - یہ دریائے دجلہ کے ساحل پر واقع ہے -

(۱۸) کتب خانۂ دمشق الشام - یہ کتب خانہ قبۃ الملک الظاہر سے علاقہ رکھتا ہے -

(۱۹) کتب خانۂ ٹونس مغربی - یہ کتب خانہ صادقیہ میں شامل ہے -

(۲۰) کتب خانۂ مصر قاہرہ - یہ کتب خانہ خدیویہ سے متعلق ہے

ان مقامات مذکورہ میں جو عربی کتابیں جمع ہیں اُن میں بہت سی کتابیں غیر مطبوعہ اسوقت تک موجود ہیں - تقریباً چار صدیاں گذریں جب کہ اہل لغت کی مختلف سوسائٹیاں قائم ہوئیں، اور اُنھوں نے عربی کی ہر ایک مشہور کتاب کے اصلی عربی متن کی طرف خواہ سادہ ہو، یا انگریزی ترجمے اور شرح کے ساتھ طبع کرنیکا اہتمام کیا - اُسوقت سے جب کسی عربی نایاب کتاب کے طبع کا خیال کیا جاتا ہے تو مؤلف کتاب کے ہاتھ کے جسقدر قلمی نسخے موجود ہوتے ہیں اُنکو فراہم کرکے اُن کے ذریعے سے اصلی متن کے ضبط اور تصحیح میں پوری کوشش کیجاتی ہے - ہاں البتہ اگر کسی کتاب کے متعدد نسخے دستیاب نہیں ہوتے تو اُسوقت اُن کو مجبور ہونا پڑتا ہے - یہ اہتمام طبع اور عملی کارروائی چار صدیوں سے برابر چلی آتی ہے - اسلیئے دو یا تین صدیوں سے یورپ اور مشرق میں عربی کی نفیس مطبوعہ کتابوں کی تعداد ترقی کرتی جاتی ہے اور ایک کافی ذخیرہ اس قسم کی کتابوں کا موجود ہوگیا ہے - اس میں کچھ شک نہیں کہ کتب مطبوعۂ یورپ تمام مشرقی مطابع کی کتب مطبوعہ سے زیادہ صحیح اور واضح ہوا کرتی ہیں - اُسکا سبب یہ ہے کہ وہاں متعدد صحیح قلمی نسخے بآسانی دستیاب ہوتے ہیں -

ہم نے دنیا کے تمام کتب خانوں میں سے صرف اُن بیس کتب خانوں کا ذکر کیا ہے جو کتب عربی سے مالا مال ہیں - اُن میں سے ہر ایک کتبخانے کی مرتب اور مطبوعہ فہرستیں تیار ہیں جنمیں موجودہ قلمی یا مطبوعہ کتابوں کے نام بالتفصیل درج ہیں - اگر کوئی شخص (ناظرین میں سے) عربی کی مشہور موجودہ تصانیف پر (جو ان فہرستوں میں درج ہیں) مطلع ہونا چاہے تو اُسکو مذکورۂ بالا فہرستیں طلب کرنا چاہئیں لیکن جو کوئی اتنی مقدرت و استطاعت نہ رکھتا ہو کہ ان بیش بہا ضخیم فہرستوں کو خرید سکے تو اُسکو عربی کتابوں کی اُن عام فہرستوں پر اکتفا کرنا چاہیئے جنکو ہم ذیل میں لکھتے ہیں اور وہ نو فہرستیں ہیں -

(۱) کتاب الفہرست لابن ابی یعقوب الندیم - اسکے مؤلف کا اصلی نام محمد بن اسحاق ہے - یہ شیعہ مذہب

یا ۹۸۰ عیسوی میں گذرا ہے - اس فہرست کو علماء جرمن میں سے ان تین شخصوں نے چھپوایا ہے - فلوگل - (Flueegal) - روڈیجر (Roediger) و مولر - (Mueller)

یہ کتاب بمقام لیپزگ میں ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۲ء تک دو حصوں میں چھپ کر شائع ہوئی -

(۲) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون - یہ کتاب مصطفےٰ بن عبداللہ کاتب چلپی کی تالیف ہے جو حاجی خلیفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے - اوسنے ۱۰۶۷ ہجری یا ۱۶۵۷ عیسوی میں وفات پائی - یہ فہرست سات حصوں میں بمقام لیپزگ اور لنڈن ۱۸۳۵ عیسوی سے لغایۃ ۱۸۵۸ء فلوگل کے اہتمام سے چھپکر تیار ہوئی - بعدازاں یہ فہرست مطبع بولاق مصر میں دو حصوں پر تقسیم ہوکر ۱۲۷۴ ہجری میں چھپی - مگر جو کتاب یورپ میں چھپی ہے - وہ اسماء کتب اور مؤلفین کے سنین وفات کے اعتبار سے زیادہ جامع ہے - جب مطبوعہ یورپ اور مصر کے نسخے کمیاب ہوگئے اور قیمت چڑھ گئی تو مشہور کتب فروش حسن حلمی افندی نے اُسکو دوبارہ قسطنطنیہ میں طبع کرایا - یہ صاحب خاص شہر قسطنطنیہ میں رہتے ہیں - اُنکا ایڈرلیس (پتہ) یہ ہے الآستانۃ العلیۃ سلطان بایزید جامع شریفی قربنج حکاکلر جار سرشی نومرو ۲۱ - ان کے ایجنٹ ایک مصر میں بھی موجود ہیں جو مشہور کتب فروش ہیں اور اُنکا نام امین افندی ہندیہ ہے - اور قاہرہ کی نئی سڑک پر رہتے ہیں -

(۳) فہرست کتب خانہ علامہ ڈی ، ڈیساسی (Desacy) اسکو فرنچ زبان میں فاضل مرلین (Merlin) نے بمقام پیرس ۳ - مجلد میں چھپوایا جو ۱۸۴۲ عیسوی سے ۱۸۴۷ عیسوی تک چھپکر تیار ہوئی -

(۴) الفہرست المکتبۃ الشرقیۃ - لیٹن زبان میں اسکا نام یہ ہے - (Bibliotheca orientalis) اس فہرست کو جرمنی فاضل زنکر (Zenker) - نے جمع کیا اور یہ کتاب ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۱ء تک دو جلد میں بمقام لیپزگ طبع ہوکر شائع ہوئی - اسمیں عرب کی مشہور کتابوں کے نام تو عربی زبان اور عربی خط میں لکھے ہیں مگر اُن کی کیفیت اور اُن کے مصنفوں کے نام فرنچ زبان میں درج کیے گئے ہیں - جس زمانہ میں چھاپا ایجاد ہوا ہے اُسوقت سے لیکر ۱۸۶۱ء تک جسقدر مہتم بالشان کتابیں مشرقی زبان کی چھپی ہیں وہ سب اس فہرست میں موجود ہیں - اسکے مؤلف نے صرف عربی زبان کی مطبوعہ کتابوں کے لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اوسمیں ہر ایک زبان پارسی - سریانی - ہندی - چینی - جاپانی وغیرہ او مثل یعنی مشرقی زبانوں میں جتنی ضروری کتابیں مطبوعہ ہیں اُن سب کا ذکر کیا ہے -

(۵) مذکورۂ بالا فہرست یعنی (المکتبۃ الشرقیۃ) کے نام سے ایک اور فہرست لکھی گئی ہے - لیٹن زبان میں بھی اُسکا وہی نام ہے جو نمبر ۴ کی کتاب الفہرست میں مذکور ہے اسکا مؤلف بھی ایک جرمنی عالم فریڈریسی (Friederici) ہے - بمقام لیپزگ میں ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۳ء تک آٹھ جلد میں طبع ہوئی - یہ کتاب چھوٹے چھوٹے اجزا رسالوں پر شامل ہے - اور اُس فہرست کا تتمہ یا تکملہ ہے جسکا ذکر نمبر ۴ میں کیا گیا ہے اسمیں وہ سب جدید کتابیں درج ہیں جو ۱۸۶۱ء کے بعد چھاپی گئی ہیں -

(۶) - کراسات - انکا فرنچ زبان میں نام یہ ہے (Catalogue periodique de livres orientaux) یہ چھوٹی چھوٹی نو کراسیں (جلدیں) ہیں جو مختلف اوقات میں طبع ہوئی ہیں - انمیں وہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبان

کے درج ہیں جو جدید چھپی ہیں ان کو صاحب مطبع بریل (Brill) نے لیڈن میں جو ہالینڈ کے شہروں میں سے ہے - چھاپنا شروع کیا اور ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۱ء تک شائع ہوتی رہیں - یہ بھی اُسی فہرست کا ضمیمہ ہیں جنکا نام نمبر۴ اور نمبر۵ میں مذکور ہے -

(۷) کتاب مفتاح السعادۃ یہ طاشکبری زادہ متوفی ۹۶۸ھ ہجری کی تالیف ہے - اور ابھی تک چھپی نہیں - اسکا ایک نسخہ قاہرہ کے خدیوی کتبخانہ میں موجود ہے -

(۸) فہرست الکتب العربیۃ والترکیہ والفارسیہ والجاویہ یعنی عربی - ترکی - فارسی اور جاوی زبان کی فہرست - یہ ایجپٹ (مصر) میں دس بڑی بڑی جلدوں میں چھپی ہے - اور کتبخانہ خدیوی میں موجود ہے -

(۹) الکتاب - یہ (وصف الکتب الشرقیہ) کے نام سے موسوم ہے - اور جرمنی زبان میں اسکا نام یہ ہے Orientalische Bibliographie) اسکو جرمن کے مشہور فاضل اگسٹ مولر August Mueller) نے جمع کیا اور برلن میں ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۴ء تک سات جلدوں میں چھاپکر مشتہر کیا - اسمیں مشرقی زبانوں کی جسقدر کتابیں سنین مذکورہ میں چھپی ہیں سبکے نام موجود ہیں مگر یہ فہرست جرمنی زبان میں ہے - *

(علی حسن خاں)

حالاتِ صقلی

(۶)

(فتوحاتِ اسلامیہ)

اب[1] ہم اس زمانے میں پہنچتے ہیں جبکہ عربوں نے شارعِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الٰہی اور ربانی تعلیمات سے متاثر ہوکر جزیرہ نمائے عرب سے قدم باہر نکالا - خواہ اسکے اسباب کچھ ہی کیوں نہ قرار دیے جائیں لیکن بے شبہ میری راے میں اسکی وجوہات وہی تھے جو تمام اقوام دنیا کے یکساں طور پر ہوتے چلے آئے ہیں اور جسپر کوئی اعتراض کرنا اصول تمدن کو نظرانداز کردینا ہے -

عربوں کا قدم باہر نکلنا تھا کہ ہر طرف فتوحاتِ اسلامیہ کا سیلاب جو ذرا بھی خوفناک نہ تھا بلکہ جسکے فیض کی بدولت عیاشی - کفر وبت پرستی - جہالت - حکام کے ظلم وستم ہر طرح کے خس وخاشاک کی صفائی ہوجاتی تھی ، بہنے لگا - شام - عراق - عرب ایران - غرضکہ ایشیا کا کل مشرقی حصہ اور مصر ونوبہ حبشہ کے بیئے اسلامی نوآبادیاں بنگئیں - بیس سال سے کم عرصے میں اسلام نے ایسی عظیم الشان فتوحات حاصل کیں

---

* ناظرین میں سے جو شخص ان فہرستوں کی خریداری کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو اوسکیلئے ہماری یہ کتاب (جسمیں تمام جلیل القدر کتب عربی مطبوعہ یورپ ومشرق کا ذکر ہے) بہت کچھ کافی ووافی ہے اوسکو چاہیے کہ اس جامع اور مستحسن کتاب سے استفادہ حاصل کرے ۱۲ اکرنل فانڈیک -

[1] مسلمانوں کے حالات میں جیسا کہ میں نے تمہید میں بیان کردیا ہے ایک جرمن مصنف نے عربی کتابوں سے صقلیہ کے متعلق حالات جمع کردیے ہیں اس کتاب کا دیباچہ جرمن زبان میں ہے اور چونکہ مجھے جرمن زبان سے بالکل ناواقفیت ہے لہذا مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اُس دیباچے کے مضمون سے ناواقف رہا ہوں جو کتابیں مجھے اس تاریخ کی مل سکیں ان کو میں نے دیکھا اور جو مل نہ سکیں - اُن کی نسبت بحوالہٗ "تاریخ صقلیہ" لکھدیا گیا - جس سے مراد یہی جرمن مصنف کی کتاب ہے ۱۲ -

جو تمام دیگر فاتحین کو صدیوں میں بمشکل میسّر ہوسکی ہیں - یہ اُس قسم کی اعلیٰ درجے کی فتوحات تھیں جنکا محض تمدنی حیثیت سے ہی حاصل ہونا کبھی ممکن نہ تھا - اور اس پُرزور کامیابی کی وجہ سے ہمکو خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اِن مقدس فاتحین کے ایمانی اور للّٰہی جذبات و تخیلات تمام فاتحینِ عالم کے جذبات و تخیلات سے بالکل جُداگانہ تھے - اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوجاتی تو ایک ایسا زرنگار زمانہ دنیا میں پیدا ہو جاتا جس کی نسبت موسیو لے بان اپنی کتاب (ص ۵۳۰ - تمدن عرب) میں لکھتے ہیں -

شعرا ہمیں ایک زرنگار زمانے کی داستان سُناتے ہیں جب کل اقوامِ عالم میں باہمی ایک عام اخوت تھی - نہایت ہی مشکوک ہے کہ ایسا کوئی زمانہ ہوا ہو - اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ زمانہ ہمیشہ کیلیے نابود ہو گیا

مگر زمانے یا قسمت نے (یا موسیو لے بان کے الفاظ میں (ص ۳۰۷ تمدنِ عرب) "تاریخ عالم میں یہ تباینِ واقعی نتائج اور متوقعہ نتائج میں اس کثرت سے دیکھا گیا ہے کہ کہا جا سکتا ہے یہ ایک کلیہ ہے") بہت جلد اس ہونیوالے زرنگار زمانے کا خاتمہ کردیا - خلفای راشدین کی مبارک صورتیں دنیا سے چھپ گئیں - اور اُن کے جانشین خلفای بنی اُمیہ ہوئے جنھوں نے سلاطین مشرقیۂ رومیہ کی تقلید شان و شوکت میں شروع کردی - اور سچّی اور اصلی اسلامی برکتیں ایک حد تک دلوں سے جاتی رہیں - گو یہ سب کچھ تھا اور اسلام کی پہلی صورت باقی نہ رہی تھی تاہم اسلامی جھنڈا برابر ترقی کرتا جاتا تھا - مگر اسی تمدنی ذریعے سے سسلی[له] کی بدقسمتی تھی کہ

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو فی الواقع ایک زرنگار زمانہ تھا - اور اُن کے بعد[سله] حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جو اسی کا تتمہ تھا سسلی تک سیلابِ فتوحات موجزن ہوا تھا جو تعلقات اسوقت سسلی کے سلطنت مشرقیۂ رومیہ کے ساتھ تھے اور نیز جو حالت اسوقت اسکی تھی اُسکے ظاہر کرنے کے لیئے ہم دائرۃ المعارف سے ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں -

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اُن کے خلفاء کے زمانے میں رومیوں کی طاقت دن بدن کم ہونے لگی - عربوں نے بہت جلد (اُن مقامات پر جنکا ہم نے اوپر ذکر کردیا ہے) اپنا پورا پورا قبضہ کرلیا - اور اُس زمانے میں بائی زنٹن سلطنت بجاے اسکے کہ اپنے مخالفوں کے خلاف پھرتی کے ساتھ کوئی کوشش کرتی - اُن مذہبی مناقشات کے فرو کرنے میں مشغول تھے جو اسکی رعایا میں آئے دن برپا ہوتے رہتے تھے -

باقی آیندہ (محمد مرتضیٰ)

له اس نمبر میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے - فتوح البلدان للبلاذری ص ۲۳۵ مطبوعہ یورپ - کامل التواریخ لابن الاثیر جلد سوم مطبوعہ لیڈن ص ۱۶۰ و ۴۰۹ و دیگر مقامات - البیان المغرب فی اخبار المغرب لابن عذاری المراکشی مطبوعہ لیڈن ص ۱ - مقدمۂ تاریخ ابن خلدون ص ۲۲۰ مطبوعہ بیروت - المؤنس فی اخبار افریقیہ و تونس تالیف ابن ابی دینار مطبوعہ تونس ص ۲۵ - الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ تالیف الشیخ احمد بن خالد الناصری - مطبوعہ مصر ص ۳۶ - بحوالہ منتخب تاریخ صقلیہ یہ کتابیں ہیں - نہایۃ الارب فی فنون الادب للنویری ص ۴۲۶ منتخب تواریخ صقلیہ - فتوح الشام و مصر (جو واقدی کیطرف منسوب کیگئی ہے) ص ۱۹۸ و ۲۰۰ منتخب تواریخ صقلیہ - فتوح مصر تالیف ابن اعین القرشی ص ۱۶۲ منتخب تواریخ صقلیہ - دیوان صلۃ السمط و سمت المرط للقاضی ابن شتباط ص ۴۰۹ و ۲۱۱ منتخب تواریخ صقلیہ

سله تمام مستند مورخین کے صریح قول کے مطابق اس زمانہ خلافتِ راشدہ میں سسلی کی طرف کوئی توجہ نہ ہوئی - مگر ان سب مورخین کے خلاف ایک روایت اور بھی ہے

باقی آیندہ

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۲۵	۱	۴	شا	مشعرا	۳۵	۲	۲۲	معروات	معجزات	۳۴	۲	۲۴	حرارت	حرارت [illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

ایڈیٹران { حاجی محمد اسمٰعیل خاں
مولوی وحید الدین سلیم }

نمبر ۳	یکم ستمبر ۱۸۹۹ء	جلد ۳
قیمت فی پرچہ نمونہ ۵ر		قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ...... للعہ

مقامِ اشاعت دفتر معارف علی گڑھ

مطبع مفید عام واقع علی گڑھ میں چھپا

جدید تصانیف

(تربیۃ علیہ)

[illegible] کے نمبر (۲) و (۳)، راقم کی تصنیف [illegible] علم اکرمین [illegible] ہیں۔ یہ دونوں کتابیں [illegible] کے متعلق چھاپی گئی ہیں۔ نمبر ۲۔ (تربیت الدجاج) یعنی مرغیوں کے پالنے کے فن میں جو سوائے ذاتی اور دوسرے واقف کاروں کے تجربوں کے، انگریزی، ترکی اور اُردو کتابوں کو دیکھ کر ہندوستانیوں کے مذاق کے موافق بیان اور لکھی گئی ہے۔ اس کی ابتدا میں فن پالنے کے متعلق [illegible] فوائد کو بیان کیا گیا ہے۔ باقی فصلوں میں اس فن کے متعلق تمام [illegible] سے ضروری و [illegible] کار آمد [illegible] بیان کیے گئے ہیں۔ ایسی جامع کتاب غالباً کسی دوسری زبان میں موجود نہ ہوگی۔ ہر ایک [illegible] اور غیر شائق امیر اور ہر ایک اُس شخص کے پاس [illegible] کو تجارت کی راہ سے پالنا چاہیے اور [illegible] کے خاندانوں کے پاس اس کتاب کی ایک ایک جلد ضرور موجود ہونی چاہیے۔ انگریزی پڑھے ہوئے [illegible] اور [illegible] ہوئے صاحب لوگوں کے واسطے بہتر ہوگا کہ وہ انگریزی کی کتاب کے اس کتاب کو خرید یں۔ کتاب تربیت الدجاج میں یہ فصلیں ہیں۔

[illegible] ضروری گزارش۔ مقصد۔ اقسام مرغ [illegible] [illegible] مرغیاں [illegible] [illegible] مرغ کا انتخاب۔ انڈوں [illegible] [illegible] انڈوں کا انتخاب [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] اور [illegible] کی حفاظت [illegible] [illegible] نمبر (۳) [illegible] اور [illegible] [illegible] الاسلامیہ

یہ ایک مجموعہ احادیث شریفہ کا ہے جو راقم نے انتخاب جمع کیا ہے۔ اس مجموعے میں ڈھائی سو کے قریب ایسی حدیثیں داخل کی گئی ہیں جو روزمرہ کی زندگی کے متعلق ہیں۔

مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے افعال و کردار کو سنتِ نبوی کے مطابق کر سکے اور اس ذریعے سے وہ تفریق کم ہو جائے جو مسلمانوں میں بوجہ علم و [illegible] ایک دوسرے سے بڑھتی جاتی ہے۔ ہر ایک حدیث کے نیچے بامحاورہ اُردو ترجمہ اس کا لکھ دیا گیا ہے اور جہاں تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں پر تشریح کر دی گئی ہے۔ ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا گیا ہے۔ اُن والدین اور مربیوں سے جو اپنی اولاد کو تعلیم دلانے میں مصروف ہیں خاص کر سفارش کی جاتی ہے کہ ایک ایک کاپی اس کی خود لیں اور اپنے بچوں اور طالبعلموں کو بالضرور پڑھائیں یا مطالعہ کرنے کی ہدایت کریں۔ اس کے سوا ہر ایک دیندار۔ ہر ایک دنیادار۔ ہر ایک تاجر۔ ہر ایک ڈپلومیٹ۔ ہر ایک اخبار نویس۔ ہر ایک مضمون نگار۔ اور اُن تعلیم یافتوں میں سے ہر ایک کو اسلام کی اصل [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] ایک ایک جلد اس کی اپنے مطالعے [illegible] [illegible] لازم [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] یہ کتاب بھی [illegible]

قیمت

[illegible]

[illegible]

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

نمبر ۳	یکم ستمبر ۱۸۹۹ء	جلد ۳

بقیۂ مضمون حالاتِ سسلی

(٦)

فتوحاتِ اسلامیہ

اور آخر کار اسی مناقشے کی بدولت صقلیہ کے چند شہروں میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی اور کچھ ایسی زیادہ مدت نہ گذرنے پائی تھی کہ ان شہروں نے سلطنتِ مشرقی کی اطاعت کا جوا اپنے کندھے پر سے بالکلیہ اُتار کر پھینکدیا۔ مذہبی مناقشات پر طُرّہ یہ ہوا کہ خود سلطنت کے دعویداروں میں تنازعات برپا ہوگئے۔ ہرقلیوناس جلاوطن کر دیا گیا۔ اور قسطنطین ثانی تخت قیصریہ پر بٹھایا گیا۔ مگر جو تباہی دن بدن بڑہتی جا رہی تھی اوسکا روکنا قسطنطین سے محض ناممکن تہا۔ قبرس و روڈس عربوں کے ہاتہ میں چلے گئے۔ اور اِدہر لمبارڈیوں نے جنوبی ایطالیہ میں رومی فوج کو سخت شکستیں دیں۔ قسطنطین جبکہ وہ بحر متوسط کے سواحل پر عربوں سے اپنے ملک کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہا اور مختلف مذہبی فرقوں میں اتحاد پیدا کرنے کی بیفائدہ محنت اُٹھا رہا تہا۔ سرقوسا میں ایک سازش کے قربان ہوگیا۔

قسطنطین کے مارے جانے کی افسوسناک کیفیت ہم کو عربی مورخوں کے ذریعے سے مفصل طور پر معلوم ہوتی ہے جس سے اُس زمانے کے عیسائیوں کی سوسائٹی کے اخلاق اور اُن کی زمانہ شناسی اور وعدہ وفائی کی ایک نظیر ملتی ہے۔

متواتر شکستوں سے عاجز آکر قسطنطین نے آخری کوشش عربوں کو ملک سے خارج کرنے کے لینے کی ایک بہت بڑا بیڑہ جہازات تیار کیا گیا اور قسطنطین

یہ روایت واقدی کی طرف منسوب کردہ کتاب فتوح مصر میں بیان کیگئی ہے۔ اور منتخب تواریخ صقلیہ میں بہی اسکو نقل کیا گیا ہے اس روایت کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں پہلا حملہ صقلیہ پر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ روایت بالکل غیر معتبر ہے اور روایت اور درایت ہر لحاظ سے اسکی تکذیب ہوتی ہے لہذا میں نے بخوفِ طوالت اسکو چھوڑ دیا ہے ۱۲۔

"خلّد معاویۃ بن حُدیج بافریقیۃ آثارٌ حسنۃً"
اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان فاتح (گو
اُسکے جذبات خلافت راشدہ کے زمانے کے فاتحوں کے
سے خالص ربانی اور محض للّٰہی نہ تھے اور اُن میں ذاتی اغراض
کی بھی بہت کچھ جھلک پائی جاتی تھی) بنسبت رومن قوم
یا قرطاجنہ یا یونانیوں یا زمانۂ حال کے فاتحوں کے کسقدر
اپنی اقوام مفتوحہ سے رعایت و مہربانی کے ساتھ پیش
آنیوالا تھا۔ اسنے اس امر کو بھی تاڑ لیا کہ اگر بربری اقوام
کی فوج میں بھرتی کیجائے تو وہ ایک مفید اور کارآمد فوج
ثابت ہوگی۔ چنانچہ اسنے بربریوں کی بھرتی شروع کی
اور جیسا اسکا خیال تھا ان بربریوں نے (گو وہ عربوں کے
سے مہذب نہ تھے) ملک گیری کے بارے میں بہت کچھ
آئندہ چلکر نمایاں کام کر دکھلائے۔ اسلامی خدمات بھی انہنے
ادا کیں۔ اور اسی کی وجہ سے بربری اقوام میں اسلام کی اشاعت
ہوئی۔ ان نمایاں کامیابیوں کے بعد جب معاویہ بن حدیج
افریقہ سے واپس آگیا تو حضرت معاویہ رضؓ نے بھی اس کی
پوری قدردانی کی۔ اور آخر جب عمرو بن العاص کی وفات
کے بعد جو معاویہ رضؓ کے ایک زبردست معاون تھے اور
جنکو درحقیقت مستقل فرمانروا کہنا چاہیے ان کے بیٹے عبداللہ
سے جنکو ان کے والد کے حقوق و حسن خدمات کے صلے
میں والیٔ مصر بنایا گیا تھا، ناتجربہ کاری کی بدولت کام نہ چل
سکا اور بہت جلد ایک لائق مدبر کی ضرورت محسوس ہونے
لگی تو ایسے وقت میں حضرت معاویہ رضؓ کی غائر نظر نے
معاویہ بن حدیج کو والی بنانے کے قابل دیکھ لیا اور اب
معاویہ بن حُدیج والیٔ مصر کے عظیم الشان عہدے پر ممتاز
کر دیا گیا جسکی تمنا مدت سے اسکے دل میں تھی۔ والیٔ مصر
بننے کے بعد اسنے اپنے خیالات کو اور ترقی دی۔ اور
دن بدن بڑھنے والی ضرورت سے آخرکار ایک بحری
زبردست طاقت اُس زمانے کی ضرورتوں کے موافق
تیار کیگئی جس کی تعداد (ہوسیولیان کے بیان کے مطابق)
بارہ سو جہاز کی تھی۔ اس بیڑۂ جہازات نے سارے بحر متوسط
کا دورہ کرنا شروع کیا۔ اور جب قوصرہ اور جربا (دو جزیرے
ہیں) پر علم اسلام نصب ہو چکا تو اب صقلیہ کی باری
آئی۔ اس حملے کے لیئے دوسو جہازات کا بیڑہ روانہ کیا گیا
اور اُن کی سپہ سالاری عبداللہ بن قیس الفزاری کو دی
گئی جیسا ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس حملے کا مقصد محض فوجی مشق
و قواعد اور نقل و حرکت کو قائم رکھنا تھا۔

صقلیہ کی اسوقت جو تباہ حالت تھی وہ ہم نے بیان کر دی
ہے اور ایسے وقت میں کہ صقلیہ کے لیئے عرب فاتحوں
کے سامنے راستہ کھول دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا
حملہ کیا گیا۔ اور صقلیہ کے ساحل پر سب سے پہلے عربی فاتح
عبداللہ بن قیس نے قدم رکھا۔ اگر اس حملے کا مقصد وہی
تھا جو عبیدہ بن الجراح یا سعد بن ابی وقاص (سپہ سالاران
زمانۂ راشدہ) جیسے مقدس سپہ سالاروں کے دلوں میں
موجزن تھا تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جسطرح
سے آج خلافت راشدہ کے زمانے کے مفتوحہ ممالک خالص
اسلامی مرکز بنگئے ہیں، اسیطرح سے صقلیہ بھی ایک اسلامی
نوآبادی رہتی مگر ان فاتحین کے خیالات و جذبات محض
اسی حد تک تھے کہ مال غنیمت حاصل کریں۔ چنانچہ ان کو
اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی جس میں کسی قسم کا شک ہو ہی
نہیں سکتا تھا۔ بہت سا مال غنیمت ملا۔ اور بہت سے
لوگ بردہ بنائے گئے۔ مہینے بھر تک یہ بیڑہ جہازات صقلیہ
کے ساحل پر لنگر زن رہا۔ اسکے بعد وہ مال غنیمت اور
بردوں کو ساتھ لیکر واپس ہوئے۔ مصر میں پہونچ جانے
کے بعد معاویہ بن حدیج نے مال غنیمت کا خمس جس میں
مستند مورخین کے قول کے مطابق کئی سونے چاندی کے
مرصع کار صنم بھی تھے معاویہ رضؓ کی خدمت میں بھجوا دیا۔

عربوں کا مال غنیمت لینا اسطرح یہ پہلی فوجکشی
ختم ہوئی۔ اس فوج کشی کے متعلق دو باتوں پر غور کرنا
ہے۔ ایک بردہ بنانے کے متعلق۔ دوسرے مال غنیمت

اور اسی لیے صقلیہ کا حملہ بھی بیکار چھوڑ دیا گیا - اور اس سے کوئی اور فائدے نہ اُٹھائے گئے -

(محمد مرتضیٰ)

حالاتِ سسلی

(۷)

مسلمانوں کے ابتدائی حملے

اس[1] پہلے حملے کے بعد جسکو ہمنے بیان کر دیا اور بھی کئی حملے صقلیہ پر بنی امیہ کے زمانے میں ہوئے - اور چونکہ ان سب حملوں کا مقصد وہی قریب قریب ہوا کرتا تھا جو پہلے حملے کا تھا لہذا ہم کو ان حملوں کے ذکر میں زیادہ تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں صرف ایک سرسری بیان کافی ہوگا - معاویہ بن حدیج کے بعد عقبہ بن نافع جیسے اسلام کے فدائی اور زہیر بن قیس جیسے عابد و زاہد اور حسان بن النعمان الغسانی جیسے بہادر و مدبر والیوں نے بالترتیب افریقہ کی خدمت نائب السلطنتی کو انجام دیا - ان تینوں نامور والیوں کے زمانے میں صقلیہ پر کوئی حملہ نہ کیا گیا - آخر ۹۱ھ شروع ہوا اور اب ہم اس مشہور و معروف اسلامی جنرل موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس کے زمانے میں پہونچتے ہیں جسکے عالی شان کارناموں نے دولتِ بنی امیہ کے لیے ایک پُر فخر و ناز سرمایہ اضافہ کر دیا -

موسیٰ کے اعلیٰ دماغ اور اسکے زبردست ہاتھ نے بہت جلد وقتاً فوقتاً بڑھنے والی بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا - بحری طاقت کی اصلاح کیگئی - سو نئے جہاز تیار ہوئے اور مستقل طور پر تونس میں دار الصناعۃ (بحری کارخانہ) قائم کیا گیا - فتح اندلس کے بعد اسنے اپنی تیز نظر صقلیہ پر ڈالی اور غالباً اسنے یہاں بھی ایک زبردست حملہ کرنے کے منصوبے سوچے تھے - چنانچہ پہلے پہل ابتدائی کارروائی کی غرض سے

دوسرا حملہ ایک چھوٹا سا بیڑہ جہازات عیاش بن اخیل کی زیر حکومت صقلیہ بھیجا گیا اور اس بیڑے نے اپنے مقصد میں معمولی کامیابی حاصل کی جس میں کوئی تعجب کی بات نہیں - ابھی یہیں تک کارروائی کیگئی تھی کہ فرمانروائے وقت کی تلون مزاجی اور اس افسوسناک ابتری کی بدولت جسنے خود مختار سلطنتوں میں ہمیشہ ایک منٹ میں دفعتاً افسوسناک انقلابات پیدا کر دیے ہیں - موسیٰ کو اپنے سارے کام ادھورے چھوڑ کر دار الخلافہ میں حاضر ہونا پڑا - اور اسکا جانا تھا کہ اسکے لگائے ہوئے پودوں پر خزاں آگئی سارے کام جو اسنے ادھورے چھوڑے تھے ویسے ہی رہ گئے - اور کوئی ان کا پورا کرنیوالا باقی نہ رہا -

افریقہ کی بالطبع آزادی پسند رعایا نے جو اس وقت تک برسر اطاعت رہتی تھی جبکہ کوئی زبردست ہاتھ اسکی کما حقہ نگرانی کر رہا ہو اور جہاں وہ ہاتھ اُٹھ گیا تو وہ بھی اپنی اصلی طبیعت کے مقتضیٰ کے مطابق کام کرنے لگتی تھی پھر فساد مچا دیے اور ہر طرف ملک میں بدامنی - لوٹ مار - سرکشی کا دور دورہ ہو گیا -

تیسرا حملہ اسی افسوسناک ابتری و بدامنی کے زمانے میں محمد بن اوس نے صقلیہ پر حملہ کیا - یہ حملہ بھی اسی معمولی فوجی سالانہ مشق و قواعد و نقل و حرکت کے لحاظ سے تھا -

چوتھا حملہ آخر اس بدنظمی کا خاتمہ کرنے کے لیے بشر بن صفوان والیٔ افریقہ کی نہایت ہی اہم خدمت پر مامور کیا گیا - بشر

[1] جن کتابوں سے انتخاب کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے
البیان المغرب ص ۲۷ و ۳۵ و ۳۸ و ۴۹ و ۵۳ -
المونس ص ۳۳ و ۳۸ و ۳۹ و ۴۴ - تاریخ الکامل جلد خامس صفحہ ۱۰۸ و ۱۳۷ و ۱۴۱ و ۲۴۹ مطبوعہ یورپ و جلد سادس ص ۱۰۰ مطبوعہ یورپ و نیز مقامات مختلفہ در حالات خلفای عباسیہ - نہایۃ الارب للنویری - بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۴۲۵ و ۴۳۶ - المقفیٰ للمقریزی بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۲۶۱ و ۲۶۲

حاصل کرنے پر۔ پہلی بات پر بحث کرنی اصولاً ہمارے مضمون سے خارج ہے۔ اور اجمالاً دوسرے نمبر میں ہمنے اسکے متعلق بحث کردی ہے۔ باقی رہا مالِ غنیمت حصول کرنا۔ اسپر بھی تمدنی طور سے کوئی اعتراض ہو نہیں سکتا۔ تمام فاتحین جو مسلمانوں سے پہلے ہو گذرے اور جو ان کے بعد ہوئے۔ سب کی یہی عادت ہوتی چلی آئی ہے۔ خود رومن فاتحین کی جنکا بہت کچھ راگ گایا جاتا ہے یہی حالت عام طور پر ہوا کرتی تھی کہ وہ اپنی اقوامِ مفتوحہ سے سخت ٹیکس وصول کرتے اور ان کو ایسی حالت میں پہونچا دیتے تھے کہ وہ پھر اُبھر نہ سکیں۔ عربوں نے بھی دوسرے فاتحین کی طرح مالِ غنیمت تو لیا مگر بالکل خفیف مقدار میں جس سے انکو کوئی نقصان نہ پہونچا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس خفیف ٹیکس کی بدولت (جس کے بالکل ہلکے ہونے کا ثبوت اسی سے ملتا ہے کہ جب عرب فاتحین واپس چلے جاتے تو ملک پر کوئی تباہی نہ رہتی اور سب کاروبار بدستور جاری رہتے) ان کو سلطنتِ مشرقیہ کے جابرانہ محصولات اور مشرقی سلطنت کے حکام کے سخت و خوفناک پنجے سے نجات ملی۔ گویا عرب فاتحین کی یہ فوجیں فوجِ کنٹنجنٹ تھیں جسکی بدولت اونکی حفاظت ہوتی رہتی تھی اور اسکے معاوضہ میں زیادہ سے زیادہ وہ ایک کافی مقدار رقم وصول کرتے تھے۔

جب خمسِ غنیمت حضرت معاویہ رضؓ کی خدمت میں پہونچ گیا تو ان اصنام کو جو مالِ غنیمت میں حاصل ہوئے تھے حضرت معاویہ رضؓ نے ضائع کردینا مناسب سمجھا بلکہ یہ بت ہندوستان میں بھجوا کر فروخت کر دیئے گئے (جس کے ساتھ اسوقت عربوں کی تجارت و آمد و رفت بصرے کے راستے سے برابر جاری تھی) یہ محض ان کی شہنشاہی لحاظ سے کارروائی تھی (نہ کہ مذہبی) اور اسی لیئے عام طور پر حضرت معاویہ رضؓ کی اس کارروائی کو سخت ناپسند کیا گیا۔ اور بہت کچھ اعتراض کیئے گئے۔ جو اس زمانے میں پبلک اُپینین (عام رائے) کے باوقعت ہونے کے لحاظ سے کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

ہمارے مشہور اور بے نظیر فلاسفر مؤرخ ابو ریحان البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں بت پرستی کے متعلق محققانہ بحث کرتے ہوئے ضمناً اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ اور جو رائے اس بارے میں اوسنے دی ہے ہم اُسکو نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ جو تفریق ہم نے مذہبی اور تمدنی حیثیات کے جدا جدا ہونے کی بتائی ہے ہمارا نامور فلاسفر بھی اُسکو تسلیم کرتا ہے (ص ۶۰ کتاب الہند)۔

ہمارے بیانِ سابق سے معلوم ہوگیا کہ اس آفت (بت پرستی) کا پہلا سبب یادگار بنانا اور دل کو اس سے تسلی دینا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے یہی بات خراب اور خراب کردینے والی افسوسناک درجے پر پہونچ گئی۔ اسی پہلے سبب کے خیال سے معاویہ نے صقلیہ کے بتوں کو (جبکہ ۵۳ھ کے موسم صیف میں اسپر حملہ کیا گیا اور مالِ غنیمت میں سونے کے مرصع و مکلل بت بھی ہاتھ آئے) بغرضِ فروخت سندھ کے ہندو راجاؤں کے پاس بھجوایا اور آخری آفت کی طرف جو اس سے پیدا ہوتی ہے کوئی خیال نہ کیا۔ اور ان کا ایسا کرنا ایالت (سلطنت) کی حیثیت سے تھا نہ کہ دیانت (مذہب) کے لحاظ سے۔

چند روز کے بعد معاویہ بن حدیج ولایت مصر کی خدمت سے معزول کردیا گیا، یا آجکل کی اصطلاح کے مطابق اُسنے استعفا دیدیا، یا اُسکی نائب السلطنتی کی مدت ختم ہوگئی۔

معاویہ بن حدیج کے جانشینوں میں اسکا سا اعلیٰ دماغ نہ تھا جسکی وجہ سے وہ کام جنکی معاویہ رضؓ نے ابتدا کی تھی ویسے ہی ادھورے چھوڑ دیئے گئے

نے آتے ہی فوجی تیاریاں شروع کیں اور بذاتہ صقلیہ پر حملہ کیا۔ یہ پہلا وقت تھا جبکہ صقلیہ پر حملہ کرنیوالی فوج کی کمان والی افریقیہ نے بذاتہ لی تھی۔ کامیاب واپس آنے کے چند ہی مہینوں بعد بشر کا انتقال ہوگیا۔ اور اب اسکی جگہ عبیدہ بن عبدالرحمن قیسی والی بنایا گیا۔

پانچواں حملہ

اسکے زمانے میں مستنیر بن الحارث نے صقلیہ پر حملہ کیا مگر اس حملے کا نتیجہ پہلے تمام حملوں کے بالکل برخلاف ہوا۔ کامیاب ہوکر جب فوج صقلیہ سے واپس آ رہی ہوئی تو راستے میں بحیرۂ روم کے خوفناک طوفان نے تمام جہاز غرقِ آب کردیئے۔ اور جو نتیجہ ایک مدت پہلے قیصر روم کا ہوا تھا وہی اب مستنیر کا بھی ہوا۔ صرف وہ جہاز جس میں مستنیر تھا اور اسکے علاوہ چند اور جہاز بچ رہے جنکو خوش قسمتی نے ساحلِ طرابلس پر پہونچا دیا۔ اس بڑے کی ایسی مہلک بربادی پر فوراً توجہ کیگئی (مسلمانوں کے سپہ سالاروں کو جیسا کہ خیال کیا گیا ہے اپنی من مانی کارروائی کرنے کا ہرگز اختیار نہ تھا۔ انھیں اپنے حکامِ بالادست کے احکام کی تعمیل ضروری ہوتی۔ اور ساری کارروائی کا ذمہ دار رہنا پڑتا تھا) اور آخر کار والی نے فیصلہ صادر کیا کہ "اس تباہی کا سارا الزام کمانڈر مستنیر پر عائد ہوتا ہے جسنے اسوقت تک صقلیہ میں فوج روک رکھی، جبکہ طوفان کا زمانہ شروع ہوگیا" اس جرم کی سزا میں مستنیر فوراً طرابلس سے گرفتار ہوکر افریقیہ کے صدر مقام قیروان میں پہونچا دیا گیا۔ اور یہاں پہونچنے کے بعد اسکو سزا سے تازیانہ دیکھی اور شہر میں اچھی طرح تشہیر ہوچکنے کے بعد آخر کار حبسِ دوام کا حکم دیدیا گیا[1]۔

اسکے بعد اور چھوٹی چھوٹی مہیں صقلیہ پر حسبِ ذیل بھیجی گئیں جن سب کا مقصد وہی ہوا کرتا تھا جو پہلے مذکور ہوا۔

[1] مستنیر اسوقت تک محبس میں رہا جبکہ دوسرے والی نے جو اسکے بعد مقرر ہوا تھا رحم کھاکر اسکی سزا میں تخفیف کردی۔ اور محبس سے رہا کردیا ۱۲۔

سنہ ۱۱۳ھ زیر کمانِ ثابت بن ہیثم۔ سنہ ۱۱۴ھ زیر کمانِ عبدالملک بن قطن۔ سنہ ۱۱۵ھ زیر کمانِ بکر بن سوید۔

عبیدہ کے بعد عبیداللہ بن الحجاب والی مقرر ہوا۔ اسکے زمانے میں بہت کچھ کارروائی صقلیہ کے بارے میں کیگئی

بنی امیہ کے زمانہ میں آخری حملہ

سنہ ۱۲۲ھ میں عبیداللہ نے صقلیہ پر چڑھائی کرنے کے لیئے ایک زبردست مہم تیار کی۔ اور اس مہم کی کمان حبیب بن ابی عبیدہ کے تفویض کیگئی جسنے عبیدہ بن عبدالرحمن کے زمانے میں بہت کچھ ناموری اور شہرت حاصل کرلی تھی اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اب سپہ سالار افواجِ افریقیہ کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ یہ حملہ تمام پہلے حملوں سے ہر طرح بڑھا ہوا تھا اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ عبداللہ بن قیس کے پہلے حملے کے بعد جو معاویہ بن حدیج کے زمانہ میں ہوا تھا یہی پُرشوکت اور شاندار حملہ تھا۔ حبیب نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنی فوج ساحلِ صقلیہ پر اُتار دی۔ اور پہلے اپنے لائق لڑکے عبدالرحمن بن حبیب کو ایک چیدہ فوج کے ہمراہ طلیعہ بناکر آگے آگے بھیجدیا۔ عبدالرحمن صقلیہ کے صدر مقام سرقوسا تک پہونچ گیا۔ اور بقولِ مورخین اپنی جرأت و بہادری کی ایک زبردست مثال یہ دکھلائی کہ شہر کے دروازے پر اپنی شمشیرِ آبدار کے کئی وار کیئے۔ جن سے آخر کار دروازے کے پرخچے اُڑ گئے اور باشندگانِ سرقوسا پر ایک حیرتناک حالت طاری ہوگئی۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اسوقت صقلیہ کی کیسی تباہ حالت تھی۔ رومی سلطنت اپنی آپ حفاظت کے قابل نہ رہی تھی۔ باشندگانِ صقلیہ میں خود اسقدر بل بوتا نہ تھا کہ بنی امیہ کی زبردست طاقت کا مقابلہ کرسکیں اور نہ ایسا کرنے میں انکا کوئی فائدہ تھا۔ ملک میں ایک عام بدامنی تھی۔ اُدھر اٹلی کی طرف سے ہر وقت حملے ہوتے رہتے تھے۔ اِن سب باتوں پر غور کرلینے کے بعد اب انہوں نے یہی ایک عمدہ و مناسب

تدبیر سوچی کہ اپنے آپ کو سلطنتِ بنی امیہ کی حفاظت میں دیدیں جس سے پھر اُن کو نہ رومی سلطنت کے ضعیف وظالم حکام سے سابقہ رہیگا نہ ملک کی بد امنی ہی باقی رہ سکیگی۔ انھوں نے عبدالرحمٰن کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیے۔ اور جزیہ ادا کرنیکا اقرار کرلیا۔ اور اسطرح صقلیہ بنی امیہ کی گورنمنٹ کی خراج گزار ریاستوں میں شامل ہونے لگا۔ بہادر و مدبر جنرل حبیب کے اعلیٰ دماغ نے صقلیہ کی تباہ و زار حالت فوراً پہچان لی۔ اسنے مستقل طور پر ارادہ کرلیا کہ ایک کافی مدت تک یہاں قیام پذیر رہ کے صقلیہ کے تعلقات سلطنت کے ساتھ پورے طور پر مضبوط کرلیئے جائیں۔ اور ملک میں اسطرح کا نظم و نسق جاری کردیا جائے جس سے رعایا کو امن۔ سرسبزی۔ خوشحالی نصیب ہو۔ اور ساتھ ہی بنی امیہ کی سلطنت بھی ان سے منتفع ہوسکے مگر ابھی وہ وقت نہ آیا تھا کہ صقلیہ پورے طور سے مسلمانوں کی آغوشِ عاطفت میں آجائے بلکہ ابھی ایک مدت تک اسکی قسمت میں تباہی لکھی تھی۔ حبیب کی امیدیں دل ہی دل میں رہیں اور بہت جلد اسکو صقلیہ چھوڑ کر افریقہ جانا پڑا۔ اسکی اصل وجہ عبید اللہ بن الحباب کی سوء تدبیر تھی۔ گو عبید اللہ ایک باوقعت امیر تھا اور فنِ کتابت میں اسکی لیاقت اعلیٰ درجے کی تھی۔ ایام العرب اور تاریخ کا وہ اچھا ماہر تھا اسنے اسلامی خدمات بھی بہت سی انجام دی تھیں۔ تونس کی جامع مسجد اسی نے بنائی تھی مگر اسمیں انتظامی مادّے کی کمی تھی۔ اُسنے اپنے رشتہ داروں کو ذمہ داری کی خدمات سپرد کردیں اور باغیوں کے ساتھ رحمدلی برتی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ کی آزادی پسند رعایا پھر اپنی اصلی طبیعت کے مقتضی کے مطابق باغی بنگئی اور اس زور شور سے یہ بغاوت پھیلی کہ عبید اللہ سے اسکے سوا اور کوئی علاج نہ بن سکا کہ اپنے دست و بازو حبیب کو فوراً صقلیہ سے اپنی مدد کے لیئے بلوا بھیجے۔ اور اسطرح مجبور ہو کر حبیب کو صقلیہ کو اس افسوسناک حالت میں چھوڑ کر

واپس جانا پڑا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بغاوت کچھ اس زور شور کے ساتھ پھیلی تھی کہ حبیب کی ساری کوششیں اسکے فرو کرنے میں ناکام رہیں اور آخر انھیں ہنگاموں میں حبیب بھی کام آیا۔ اب بغاوت دن بدن بڑھتی گئی اور سلطنت کی ساری کوششیں ملکی بھی مطلق فائدہ نہ پہونچا سکیں۔ کلثوم بن عیاض جو سپہ سالار بنا کر قیامِ امن کی غرض سے بھیجا گیا تھا وہ بھی مارا گیا۔

عبدالرحمٰن بن حبیب کا زمانہ | یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بنی امیہ کی سلطنت کی چولیں ڈھیلی ہورہی ہیں۔ بغاوتیں ہیں اور خانہ جنگیاں۔ دعویٰ دارانِ خلافت ہیں اور خفیہ سازشیں خود سلطنت ایسے ہاتھوں میں ہے جو اسکو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جب خود سلطنت کو اپنے قیام کی فکر ہورہی تھی تو افریقہ پر کون توجہ کرتا۔ وہ زبون حالت جو افریقہ کی ہوگئی تھی دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ اور ہر شخص خود مختاری کے سامان کررہا تھا۔ پس ایسی حالت میں کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہمارے نامور جنرل حبیب کے نامور بیٹے عبدالرحمٰن نے جو حبیب جیسے باپ کا بیٹا ہونے کے ساتھ ہی ذاتی اوصاف جنگجوئی۔ بہادری۔ دلیری۔ جرأت۔ تدبّر میں باپ سے دو قدم آگے ہی تھا۔ اور جسکی بہادری ناظرین نے صقلیہ کے حملے میں ابھی ابھی ملاحظہ کرلی ہے۔ افریقہ پر اپنی حکومت جمانے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ اسنے اپنی مشہور جرأت و دلیری سے ایسی ہولناک اور مدتوں کی پھیلی ہوئی بغاوت کی آگ جسکے فرو کرنے میں اسکے باپ کی کوششیں ناکام رہی تھیں یکلخت بجھا دی۔ سارے قبائل اپنے مطیع بنا لیئے۔ ممالکِ مغرب میں ہر طرف اسیکا ڈنکا بجگیا۔ باغیوں کے دل میں اسکے رعب و دہشت نے وہ کام کیا جو خونفشاں اسلحۂ حرب سے بھی نہ ہوسکا تھا۔ یہ پہلا متغلب تھا جسنے افریقہ میں بنی امیہ کی سلطنت کا جُوا اپنے کندھے سے اُتار کر پھینکدیا۔ اور بطور ایک فرمانروائے مطلق کے کام کرنے لگا۔ جب اسنے افریقہ میں اپنا سکّہ اچھی طرح

سے جالیا تو اب ممالکِ غیر کی طرف توجہ مبذول کی۔ جزیرۂ سارڈینیا نے جزیہ دینا منظور کرلیا۔ صقلیہ پر بھی اسنے حملہ کیا۔ مگر اُسی معمولی غرض کے لیئے جسمیں وہ کامیاب بھی ہوا

بنی عباس کی خلافت عبدالرحمٰن اپنی سطوت وجبروت کا ڈنکا بجا رہا تھا کہ بنی امیہ کی سلطنت کا چراغ بالکل خاموش ہوگیا۔ اور سلطنت کی روشنی بنی عباس کے خاندان میں نظر آنے لگی۔

بنی عباس کے پہلے تاجدار سفاح کی خلافت اپنی سلطنت کی نیو جمانے ہی میں گذری۔ اور اسقدر فرصت نہ مل سکی کہ دور دراز صوبجات کی طرف توجہ کی جائے۔ جنمیں خود مختار حکام نے بجائے خود اپنی اپنی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ دوسرے تاجدار منصور کے زمانے میں اسطرف توجہ کیگئی۔ بیدار مغز منصور نے یہ تدبیر نہایت مناسب خیال کی کہ انہی والیوں کو اگر ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جائے تو غالبًا بہت آسانی کے ساتھ کام نکل آئیگا۔ اور ایک حد تک اسکی تدبیر نہایت درست تھی۔ چنانچہ اسنے عبدالرحمٰن سے بھی اس امر کی درخواست کی کہ اگر ہماری خلافت تسلیم کرلیجائے تو تمہاری خودمختاری قائم رکھی جائیگی۔ ہوشیار عبدالرحمٰن نے بھی ابتدائً یہی مناسب سمجھا کہ بنی عباس کی خلافت تسلیم کرلینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی لیئے اسنے منصور کے جواب میں اطاعت منظور کرلی۔ اور خطبے میں اسکا نام لینا بھی شروع کردیا گیا۔ مگر جب چند دنوں کے بعد اسکو معلوم ہوگیا کہ بنی عباس کی سلطنت ابھی ایسی زبردست نہیں ہے کہ وہ ایسے دور دراز صوبوں میں جیسے کہ افریقہ ہے اپنی فوج بھجوا سکے۔ اور بغاوت کو اپنے زور سے روک سکے تو اسنے کوئی وجہ نہ پائی کہ کیوں اپنی خودمختاری اپنے ہاتھ سے کھو دی جائے اسنے صاف اطاعت سے انکار کردیا۔ اور اسی دبدبہ وشان کے ساتھ جو پہلے تھی افریقہ کی وسیع حکومت کرنے لگا۔

یہ صاف ظاہر تھا کہ افریقہ کی یہ حالت اُسیوقت تک قائم رہ سکتی ہے جبتک کہ عبدالرحمٰن کا سا بارعب حاکم ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کی آنکھیں بند ہونی ہی تھیں کہ پھر ملک میں قدیم بغاوتیں از سرنو لوٹ آئیں۔ اور جو اسکے جانشین تھے افسوس ہے کہ ان میں وہ اعلیٰ قابلیت نہ تھی جس سے وہ عبدالرحمٰن کی جمائی ہوئی خودمختاری کو قائم رکھ سکتے۔

صقلیہ کیحالت اس زمانہ میں جب یہ بغاوتیں اور خانہ جنگیاں آپس میں برپا تھیں تو ناممکن تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے فوج بیرونی ممالک میں نقل وحرکت کرسکے چنانچہ سالانہ موسمِ بہار وموسمِ خریف کی مہمیں معطل ہوگئیں۔ اور بیرونی ممالک کے باشندے ایک مدت تک بے خوف ہوگئے۔ صقلیہ بھی ہر وقت کے حملوں سے مطمئن ہوگیا۔ اور اسکے ساتھ ہی رومیوں کے جوق کے جوق صقلیہ میں قدم رکھنے لگے جو قدیم زمانے سے ہر وقت نو واردوں کیلئے ملجا و ماوی رہا کی ہی۔ ان سب باتوں سے مل ملاکر باشندگانِ صقلیہ میں ایک موثر تخیل اپنی حفاظت کا پیدا ہوگیا۔ اور ان میں عصبیت کی علامتیں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے ہر طرف صقلیہ میں قلعے۔ فصیلیں پناہ گاہیں بنائیں۔ اور کوئی چھوٹا سا پہاڑ بھی ایسا باقی نہ رہا جس پر کوئی برج یا گڑھی نہ بنالی گئی ہو۔ اندرونی حفاظت کا سامان کرلینے کے بعد انہوں نے اپنے جہاز بھی بنوائے اور ان جہازوں کے ذریعے سے وہ سمندر کا دورہ اور اکے دُکے اسلامی تجارتی جہاز کو گرفتار بھی کرنے لگے۔ اسطرح وہ تمام کارروائی جو اسلامی فاتحین نے معاویہؓ بن حدیج کے زمانے سے لیکر عبدالرحمٰن بن حبیب کے زمانے تک کی تھی سب کالعدم ہوگئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اب ان کی جیسی قوی حالت ہوگئی تھی ابتدائے زمانۂ معاویہ بن حدیج سے اس زمانے تک کسی وقت میں نہ ہوئی تھی۔ اور یہ کہنا درست تھا کہ بغیر زبردست حملوں کے کوئی غنیم صقلیہ پر فتح نہیں پاسکتا۔ گویا باشندگانِ صقلیہ

کی اُن تمام کوششوں کی مثال اُس فتیلۂ چراغ کی
بڑھ جانے والی لَو کی مانند تھی جسکا بڑھ جانا ہی خود اُسکو
بجھنے کی خبر دیتا ہے۔

(محمد مرتضیٰ)

حالات سسلی

(۸)

خلافت بنی عباس - آلِ مُہلّب کا زمانہ اور آلِ اغلب کی بنیادیں افریقہ میں۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں بیان کر دیا ہے کہ اسوقت افریقہ کی کیا حالت تھی۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ سفّاح نے اپنے زمانۂ خلافت میں محمد بن الاشعث کو افریقہ بھجوادیا تھا مگر افریقہ پہونچکر اس سے کام نہ چل سکا۔ بہرتقدیر عبدالرحمٰن بن حبیب کی زندگی تک کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔ اسکے مرنے کے بعد منصور نے اس طرف توجہ کی اور اُسکو معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی لائق مُدبّر ہو تو افریقہ بہت جلد مطیع بنالیا جاسکتا ہے۔ مگر کمی تھی تو ایسے ہی لوگوں کی۔ بنی عباس کی سلطنت پر ابھی کوئی ممتد زمانہ نہ گذرا تھا اور مدبرین کا کوئی لائق و فائق گروہ ابھی تک جمع نہیں ہوسکا تھا جو مختلف ممالک کے تجربے رکھتا ہو۔ آخر منصور کی دوراندیش نظر نے اِسکام کے لائق شخص ڈھونڈھ نکالا۔ یہ مدبر شخص جس سے افریقہ کے مشہور خاندان بنی الاغلب کی بنیاد پڑی - بنی تمیم کا عربی النسل اغلب بن سالم بن عقال بن خفاجہ تھا اغلب ابومسلم خراسانی کا ساتھی اور اسکی موافق پارٹی میں سے تھا - وہ محمد بن الاشعث کے ساتھ افریقہ چلا گیا تھا - اور افریقہ پہونچکر اوسنے ایسا قیام کیا کہ یہیں کا ہو رہا - اور واپس جانیکا نام نہ لیا - اسنے ملک کی حالت سے کافی واقفیت پیدا کی - اور اس زمانے میں اس سے بہتر شخص افریقہ کے والی بننے کے لیئے موجود نہ تھا - چنانچہ منصور نے اسکے نام پروانۂ ولایت بھیجدیا - اغلب نے گو بنی عباس کی سلطنت افریقہ میں قائم تو کر دی مگر اسکو بہت سی دشواریاں پیش آئیں - قیروان میں وہ پہونچا ہی تھا کہ بغاوت ہوئی اور آخرکار اس بغاوت کو فرو کرتے ہوئے سنہ ۱۵۰ھ میں اسکی جان بھی گئی اور اسطرح اس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا - اگرچہ مرگیا تھا مگر اسنے اپنے خاندان کے لیئے افریقہ کی سلطنت کی بنیاد ڈالدی تھی -

خاندانِ مُہلّب | جب منصور کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اب اسنے افریقہ اس مشہور عربی خاندان آلِ مہلب کے تفویض کرنا چاہا، جسکے کارنامے ہمیشہ تاریخ میں چمکتے ہوئے رہینگے - اسطرح اب افریقہ ایک مدت کے لئے گویا آلِ مُہلّب کے قبضے میں آگیا - اس خاندان کے چار معزز رکن یکے بعد دیگرے اِس خدمت پر مامور کیئے گئے - سب سے پہلے عمرو بن حفص والی مقرر ہوا مگر اسکی بھی جان انھیں بغاوتوں کے نذر ہوگئی - اسکے مارے جانے کے بعد ٹھیک اسیطرح جسطرح آجکل مہذب سلطنتیں بدلہ لینے اور اپنی وقعت قائم رکھنے کے نام سے حملہ کرتی ہیں - منصور نے ساٹھ ہزار جرار فوج دیکر مشہور مُدبّر و سپہ سالار یزید بن حاتم کو جو اُسی آلِ مہلب کا ایک رکن تھا افریقہ بھجوایا - سنہ ۱۵۴ھ میں یزید افریقہ پہونچ گیا اور اب پھر افریقہ ایک زبردست ہاتھ میں تھا - یالثارات عمرو بن حفص (عمرو بن حفص کا بدلہ) کہتے ہوئے تیس ہزار باغی مارے گئے - مہینے بھر کے قتل عام کے بعد ہر طرف امن قائم ہوگیا - اور قیروان میں مقیم یزید بے کھٹکے حکومت کرنے لگا - یزید بن حاتم جو معرکۂ کارزار میں نہایت سخت گیر ثابت ہوا تھا اب امن کے زمانے میں پرلے درجے کا فیاض و منتظم نظر آیا - اُس نے اپنے رفاہ عام کے کاموں سے اُس نقصان کا جو اس

بغاوت فرو کرنے میں مجبوراً اسکے ہاتھ سے پہونچا تھا پورا پورا معاوضہ کر دیا۔ اسنے صنعت کو بہت کچھ ترقی دلوائی اُسنے ثابت کر دیا کہ اسلامی فاتحین بالطبع رحمدل ہوا کرتے تھے۔ اور جب کبھی انھیں تلوار اُٹھانی پڑی ہے تو مجبور ہو کر پندرہ سال کی پُرامن وآسایش حکومت اور منصور۔ مہدی ہادی۔ ہارون۔ چار خلیفوں کا زمانہ دیکھنے کے بعد سنہ ۱۷۱ھ میں وہ اس دنیا سے سدھار گیا۔

اسکی جگہ رشید نے اسکے بھائی روح بن حاتم کو مامور کیا۔ اور اسکے زمانے میں افریقہ پہلی جیسی مطمئن حالت میں رہا یزید بن حاتم کے باندھے ہوئے اصول و قواعد ایسے نہ تھے کہ کسی کو اُن کے اُٹھانے کی جرأت ہوتی۔ مورخین اقرار کرتے ہیں کہ اس طویل زمانے تک امن قائم رہنے کا باعث یزید بن حاتم کی مدبرانہ سیاست ہی تھی۔

ہرثمہ بن اعین سنہ ۱۷۴ھ میں روح بن حاتم مر گیا اور اسکی جگہ اسکا بیٹا فضل بن روح والی مقرر ہوا۔ اور اسی پر آل مہلب کی حکومت افریقہ میں ختم ہو گئی۔ فضل کی ناتجربہ کاری نے سارا ابنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ افریقہ کے جنگجو باشندے لڑائی پر پھر آمادہ ہو گئے۔ اور بغاوت کے پھیل جانے اور فضل کے کام آنے پر قدیم اصول کے مطابق اب سلطنت بنی عباس کو بھی قیام امن کی غرض سے اپنا مشہور جنرل ہرثمہ بن اعین افریقہ میں بھجوانا پڑا۔ سنہ ۱۷۹ھ میں ہرثمہ افریقہ پہونچا۔ اور اسکے آتے ہی سارے فسادات چند روز کے لیئے دب دبا گئے۔ ہرثمہ نے قصر الکبیر نامی ایک عالیشان محل تیار کروایا۔ اور بعض فوجی عمارتیں بھی بنوائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس تمدن کو جو آب بغداد میں روز افزوں ترقی کر رہا تھا افریقہ جیسے ملک میں پھیلائے اگرچہ وہ ڈھائی برس تک افریقہ میں رہا مگر اسی مدت میں اسکو کافی واقفیت حاصل ہو گئی اور اُسکو معلوم ہو گیا کہ افریقہ کی حکومت اس طرز پر ناممکن ہے۔ بغداد کی شاندار تمدن اور عالی دماغ سوسائٹی کی یاد نے اسکو مجبور کر دیا کہ اس خدمت سے اپنا استعفا پیش کر دے۔ اور اس نے درخواست دی کہ میں دار الخلافہ میں واپس بلوا لیا جاؤں۔ آخر کار اسکی متواتر درخواستوں کے پہونچنے پر ہارون کو اسکی درخواست منظور کر لینی پڑی۔ ہرثمہ کے زمانہ کا ایک واقعہ ہمارے آیندہ بیان کے لحاظ سے نہایت اہم ہے

ابراہیم بن الاغلب کی ابتدا خاندان بنی الاغلب کا بانی اور افریقہ میں بنی عباس کی طرف سے پہلا والی اغلب ایک ہونہار بیٹا چھوڑ کر مرا تھا جسکا نام ابراہیم تھا۔ اس ہونہار لڑکے کو جو باپ کا نام چمکانیوالا تھا۔ حوصلہ۔ جرأت۔ تدبیر۔ معاملہ فہمی۔ باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں ہی اسنے تربیت پائی اور یہیں اسنے آپ کو ایک مشہور شخص ثابت کیا۔ ہرثمہ کے افریقہ میں آنے کے وقت وہ صوبہ زاب میں مقیم تھا۔ اسنے اپنی کارروائی ہرثمہ پر ثابت کر دی۔ اور تاریخ کامل کے مطابق ابراہیم نے اسکو بہت سے افریقہ کے ہدیے اور تحفے بھی دیے۔ جس پر خوش ہو کر ہرثمہ نے اسکو صوبہ زاب کے ایک ضلع کا والی و تعلقدار بنا دیا۔ ابراہیم کی خوش تدبیری سے بہت جلد اس ضلع کی حالت میں نمایاں ترقی ہوئی۔

محمد بن مقاتل ہرثمہ کے استعفا دینے پر رشید نے اپنے رضاعی بھائی محمد بن مقاتل کو افریقہ کا والی مقرر کیا چند ہی دنوں کے بعد صاف نظر آیا کہ محمد بن مقاتل کا انتخاب کسی طرح سے درست نہیں تھا۔ محمد بن مقاتل جو دار الخلافہ کی ہوا کھائے ہوئے تھے ان سے افریقہ کا انتظام دشوار تھا۔ اسکے ساتھ ہی محمد بن مقاتل کی روش بھی غیر منصفانہ تھی۔ باغیوں نے ایکا کر کے محمد بن مقاتل کو شکست دی اور محمد بن مقاتل اپنی جان سلامت لیئے ہوئے دار الخلافہ کی طرف بھاگا۔ راستے میں وہ ابراہیم بن الاغلب کے ضلع میں ہو کر گذرا اور ایسے نازک وقت میں جبکہ محمد بن مقاتل کے ساتھ ہی بنی عباس کی سلطنت افریقہ میں نزع کی حالت میں تھی۔ اسنے نہایت مستعدی کے ساتھ امداد دی

اور اسکی عمدہ کارروائی سے باغیوں کے جتھے ٹوٹ گئے اور پھر ایک بار محمدؐ بن مقاتل والی بنگیا - مگر اسکی روش ویسی ہی خراب حالت میں ہی - ابراہیم کی کوششیں جو محمدؐ بن مقاتل کو سنبھالنے کے لیئے ہوئیں بالکل بے سود تھیں - اسکی حالت نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی - ہاں ابراہیم کی عمدہ کارروائیوں سے اسکی نسبت عام رائے اچھی پیدا ہولی جاتی تھی - آخرکار باشندگانِ افریقہ نے ہارون کی خدمت میں عرضداشت پیش کی کہ وہ محمدؐ بن مقاتل سے انتظام ہو نہیں سکتا - ابراہیم بن الاغلب ہمارا والی ہو" اور اسکے ساتھ ہی ابراہیم کو بھی مجبور کردیا کہ وہ بھی ایک عرضی دے جس میں اپنے لیئے اس عہدے کی درخواست کرے - مجبور ہوکر اسنے بھی اس مضمون کی عرضی ہارون کی خدمت میں بھیجی کہ "اگر مجھے والی بنا دیا جائے تو میں اسبات کا اقرار کرتا ہوں کہ ایک حبہ بھی خزانۂ مصر سے انتظامِ افریقہ کے لیئے دینے کی ضرورت نہوگی بلکہ چالیس ہزار دینار سالانہ خراج افریقہ سے دارالخلافہ میں حاضر کیا[۱] جائیگا" ابراہیم کی اس عرضداشت پر غور کرنے کے لیئے ہارون نے شاہی کونسل جمع کی - اور اس بارے میں اراکین سلطنت سی رائے پوچھی گئی - ہرثمہ بن اعین نے جو موجودہ اراکین دولت میں سے سبسے زیادہ افریقہ کے حالات سے واقف تھا رائے دی کہ بیشک ابراہیم کی درخواست قابلِ منظوری ہی اور اسنے اپنے ذاتی تجربے سے ابراہیم کی دیانت - کارگزاری - خوش تدبیری - انتظامِ ملکی کی شہادت دی - اور یہ بھی بیان کیا کہ اب تک افریقہ میں جو بنی عباس کی سلطنت کا نام باقی ہے وہ محض ابراہیم ہی کی وجہ سے ہے - اور محمدؐ بن مقاتل کے ساتھ جو کچھ کارروائی اسنے کی اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اسی نے افریقہ کی حفاظت و نگہداشت کی - آخر بہت کچھ غور کے بعد جب خوب سمجھ لیا گیا کہ افریقہ سے فائدہ کچھ نہیں - بلکہ آئے دن کی بغاوتوں کی وجہ سے ملک کو خطرہ لگا رہتا ہے - ایسے اشخاص بہت کم ہیں جو افریقہ کی کٹھن ولایت کی خدمت کو منظور کریں اور ساتھ ہی ان میں اسکی قابلیت بھی ہو - اور ہر طرح سے اس معاملے کے پہلوؤں پر نظر ڈال لی گئی تو ۱۸۴ھ میں ہارون نے ابراہیم کی درخواست منظور کرلی - اور باضابطہ طور پر اسکا اعلان کردیا گیا - اب اغلب کی کوششیں اپنی آیندہ نسل کے لیے بارآور نظر آنے لگیں - اور وہ وقت آگیا کہ اسکی نسل اسکے اعمال سے مستفید ہو - اور گویا اب سے افریقہ درحقیقت بنی الاغلب کے زیرِ حکومت آگیا - گو بظاہر سلطنت بنی عباس کی حفاظت اسپر تھی -

(محمدؐ مرتضیٰ)

ریفارم

ریفارم - وجہ - حقِ اصلاح - ایک غلطی - اصلاح طلبی اور بیعزتی ایک نہیں -

ریفارم | ریفارم انگریزی لفظ ہے جسکے معنی اصلاح کے ہیں - اور اصلاح درستی یا درست کرنے کو کہتے ہیں - علم اخلاق و تمدن میں اس سے مراد یہ ہے کہ ضرر رساں عادات و اطوار کو انسان سے دور کیا جائے اور بجائے اُسکے مفید طریقے رائج کیئے جائیں -

عاداتِ انسانی کے درست ہونے کا ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیشہ سے پیش رہا ہے اور یقیناً ہمیشہ رہیگا - جب سے تاریخ سے واقفیت ہے اُسوقت سے اب تک کوئی ملک

---

[۱] یہاں یہ بیان کردینا ضروری ہوگا کہ افریقہ سے سلطنت بنی عباس کو کسی قسم کی آمدنی نہ تھی بلکہ اُسٹے لاکھ دینار سالانہ افریقہ کے اخراجات کے لیئے خزانۂ مصر سے ادا کرنے پڑتے تھے اور وہاں حکومت قائم رکھنے سے محض سرحدِ مصر کی حفاظت اور سلطنت کا رعب داب قائم رکھنا مقصود تھا - ۱۲

کوئی قوم اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا ہی کہ جس میں عادات ورسوم میں ترمیم نہ ہوتی رہی ہو۔ اور کوئی قوم کسی ملک میں ایسی موجود نہیں ہی کہ جس میں وہی تمام باتیں من وعن جاری ہوں جو مثلاً باوا آدم کے وقت میں جاری ہونگی۔ مذہب جو سب سے زائد کنسرویٹو اور پُرانے خیالوں کے قائم رہنے کا آلہ ہی۔ اور جو کہ آسمانی نورِ ہدایت کا پرتو ہوتا ہی وہ بھی ترمیم و اصلاح سے یا ریفارم سے خالی نہیں رہا ہی۔ اگر مذاہب باطلہ شرکیہ کو چھوڑ بھی دیا جائے اور صرف مذاہبِ حقہ توحید کی ہسٹری ہی پیش نظر کرلیجائے تو بھی صحفِ آدم علیہ السلام سے لیکر قرآن کریم تک میں (سوای توحید ذات باریتعالے کے) اور تمام دیگر امور میں اتحاد نہیں ملیگا۔ غرض یہ ہے کہ عادات واخلاق میں تبدیلی ہوتی رہنے کی ضرورت ایک ایسی شدید ضرورت ہی کہ اُس سے نہ کوئی زمانہ خالی ہوا اور نہ کوئی مکان باقی رہا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ جن اقوام نے اس خدائی قانون کی حقارت کی ہی اور یہی چاہا ہی کہ ہم پُرانی لکیر کے فقیر ہی رہینگے وہ خدا کی دیرگیری اور سخت گیری نے بچ نہیں سکے ہیں۔ پورٹ بلیر۔ امریکہ۔ اور اسٹریلیا کے اصلی باشندے کتّے کی موت مارے گئے اور جارہے ہیں۔ افریقہ کے باشندے اور چینی اب نہیں جانتے کہ وہ کیونکر بچ سکتے ہیں۔ بخلاف انکے یورپ کے سیماب طبیعت باشندے کرۂ ارض پر اُسی طرح چھائے چلے جارہے ہیں جسطرح اساڑہ کے مہینے میں ہندوستان کی زمینیں بادلوں سے چھائی چلی جاتی ہیں۔

ریفارم کی حاجت اسلیئے ہوتی ہی کہ جو رواج جس زمانے میں پڑجاتا ہی یا ڈالا جاتا ہی وہ اُسی زمانے کے حسب حال ہوتا ہی۔ زمانے کی عادت ایک طرح پر قرار پکڑے رہنے کی نہیں ہی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہی کہ جسطرح زمانے کی حالت میں تبدیلی ہو اُسی طور پر مراسم میں بھی کمی بیشی یا ترمیم کیجائے تار اور ریل کے جاری ہونے کے بعد اگر ایک ملک کے رہنے والے دوسرے ملک کے باشندوں سے سلسلۂ رسل و رسائل و خط وکتابت اوّل کی سسٹم پر جاری رکھیں۔ اور علیگڈہ کے باشندے کلکتے یا بمبی کو پیادہ پا چلنے والے آدمیوں کے ہاتھ خطوط بھیجیں۔ اور اجناس کے نرخوں کو اسطرح سے معلوم کرنے یا جتانے کی عادت کی پابندی کریں تو کون ہی جو اس میں شک کریگا کہ یہ لوگ تجارتی معاملات میں ایک بڑے خسارے والے نہیں ہیں۔ اب ایسے ناواقفوں یا متعصبوں کو یہ سمجھایا جاوے کہ میاں ریل سے تار سے کام لو۔ بھائی پُرانے طریقے اب کارآمد نہیں ہیں یا آنکہ کہا جائے کہ ہرگز ایسا نکرو۔ خبردار جو تم نے کہنا نہ سُنا تو اس کا نام ریفارم اور اصلاح و ہدایت ہی۔

درجے ریفارم یا اصلاح میں مختلف درجے ہیں اور اُسکی مختلف تقسیمیں ہیں۔ اعلےٰ درجہ اُسکا اصلاحِ مذہبی ہی لیکن یہ کام جناب سرورِ کائنات خاتم الانبیا علیہم السّلام پر ختم ہوگیا۔ مقصد نیچر کا اُن ذواتِ عالیات کے بعث کرنے سے جنکو ہم انبیا علیہم السّلام کہتے ہیں یہ تہا کہ وہ اپنے ابنای جنس کو شرک کی ضلالت اور گمراہی سے نکالدیں اور سمجھادیں کہ اس لائق کہ اُسکے آگے سر جہکایا جائے نہ کوئی بادشاہ ہی نہ کوئی درخت اور جانور ہی نہ کوئی فرشتہ اور دیو ہی نہ کسی کی روح ہی بلکہ وہ ایک ذاتِ واحد لاشریک ہی جو نہ زمان میں مقید ہی نہ مکان میں۔ نہ وہ ذات کسی سے پیدا ہوئی ہی نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا ہی جل جلالہ۔ اگرچہ سب انبیاؑ کے بعثت اور اُن کے مواعظ کا ماحصل و خلاصہ یہی تہا مگر چونکہ انسان کی عقل و تجربے میں رفتہ رفتہ ترقی ہوتی ہی تو لازم تہا کہ اُن کی فہمایش کے طریقے بھی حسب حال ہوتے اور رفتہ رفتہ تکمیل کو پہونچائے جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جناب سرور انبیا خاتم الرسل محمد ابن عبد اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کی شن نے بیان وحدت کو اپنی فصاحت و بلاغت و سلاست بیان سے ایسا مکمل کردیا کہ اب توحید کے وعظ کی ضرورت نہیں ہی اور آپکو خاتم الانبیا کا ممتاز لقب عنایت ہو کر آپ

سلسلے میں رفارمر اور مصلحوں کا پیدا کرنا مالک کائنات جل و علی شانہٗ نے بند کر دیا ہے۔ اور اب صرف ادنےٰ درجہ رفارم اور اصلاح کا باقی رہا ہے یعنی طرز زندگی و معاملات کی درستی کا۔ اور یہی اصلی موضوع ہماری اس تحریر کا ہے۔

حق اصلاح ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ مذہبی رفارم اور اصلاح ختم ہو چکا ہے صرف دنیوی امور باقی رہے ہیں جن کی اصلاح اور ترمیم پر غور کرنا جاری ہے لیکن قبل اسکے کہ آگے کچھ بیان کیا جائے اسپر بحث کرنا ضرور ہے کہ حق اصلاح کسکو حاصل ہے۔ جسکا مختصر جواب یہ ہے کہ اس امر میں ہر ایک انسان کو مرتبہ مساوات حاصل ہے اور کسیکا حق مرجح نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانوں میں باعتبار سمجھ اور عقل کے مختلف درجے اور رتبے نہیں ہیں کیونکہ اگر اس سے انکار کیا جائے تو بدیہیات سے انکار ہوگا۔ جسطرح ظاہری بناوٹ میں دو شخص یکساں نہیں ہیں اسیطرح قوائے عقلی میں سب برابر نہیں ہیں۔ پھر اُسکے بعد علم و واقفیت کی کمی و بیشی کے سبب سے قوت ادراک کی جلا کی کمی و بیشی ہوا کرتی ہے۔ لیکن باوجود اسکے بھی چونکہ صفت عقل میں کل افراد مشترک ہیں اسواسطے حق اصلاح میں بھی کل افراد کو شامل سمجھنا چاہیے اور ہمارا یہ خیال کوئی ایسا خیال نہیں ہے کہ جس میں ہم تنہا ہوں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تمام عقلا اسپر متفق ہیں۔ مشورہ کرنا جسکا نام ہے اُسکا مبدأ یہی خیال ہے کہ ہر شخص کو رفارم تجویز کرنیکا حق و صلاحیت ہے۔ ہر ایک بڑے سے بڑا شخص اسکا قطعی محتاج ہے کہ وہ کسی دوسرے یا دوسروں سے صلاح مانگے۔ اور کچھ شک نہیں ہے کہ کبھی ایک ایسا شخص جسکی سلامت فہم کا اعتقاد نہیں ہوتا ایسی بات کہتا ہے کہ بڑے بڑے مسلم سمجھدار دنگ رہجاتے ہیں۔ مدبران ملک و مال میں بکثرت ایسے اشخاص موجود ہیں کہ جنکو اول کوئی جانتا بھی نہوگا مگر آخر کار اُن کے منہ سے نکلے ہوئے کلام کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا تک دشوار ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رفارم اور اصلاح کو اشخاص معلوم یعنی زید و عمر پر محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہر ایک شخص میں اصلاح کرنے کی قابلیت و صلاحیت موجود ہونیکو تسلیم کرنا چاہیے۔

ایک غلطی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اشخاص اس غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ اُنھوں نے ریفارمر یا مصلح کی ایسی صورت اپنے ذہن میں بٹھالی ہے جو شاید فرشتے کی ہو تو ہو مگر کسی انسان کی نہیں ہو سکتی۔ یعنی بہت سے یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص اُسی وقت اصلاح کا دعویٰ کر سکتا ہے جبکہ وہ تمام عیوب ظاہری و باطنی سے پاک ہو اور یہ ایک ایسا فرض ہے کہ اگر حقیقت میں تسلیم کر لیا جائے تو اُسکے دوسرے معنی یہ ہونگے کہ دنیا میں کسی شخص کو صلاح دینے کا حق ہی نہیں ہے اسوجہ سے کہ دنیا میں کوئی شخص اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جسپر کوئی نہ کوئی اعتراض کیا گیا ہو۔ اور جبکہ ایسا شخص ملنا ناممکن ہے تو گویا "ریفارم" اور "رفارمر" الفاظ ہی بیکار ہوئے جاتے ہیں۔

سر سالار جنگ اعظم کا رتبہ تدبیر مملکت میں اور حیدرآباد اسٹیٹ کے ریفارم اور اصلاح میں جیسا اونچا ہے وہ سب کوئی جانتا ہے مگر ایسی حالت میں کہ ریاست حیدرآباد کا مالی اعتبار بوجہ اپنی خوش انتظامی کے وہ قائم کر سکے خود مقروض رہی یعنی اپنی ذاتی آمدنی و مصارف کا انتظام نہیں کر سکی۔ مسٹر پارنل جو آیرلینڈ کی حالت کے درست کرانیوالے آخری زمانے میں تسلیم کیے گئے ہیں اخلاقی اور سوشیل بعض آداب میں بہت ہی انگشت نما تھے۔

مسٹر گلیڈسٹون باوجود ایک عجیب روشن ضمیری اور لبرل خیال کے اپنی آخری عمر میں مذہبی تعصب کے داغ سے پاک نہیں بچے۔

سر سید علیہ الرحمہ نے بھی باوجود ایک مسلم رفارمر ہونے کے بعض ایسی غلطیاں کیں جو ہمیشہ حیرت انگیز رہینگی۔ غرض یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ ریفارمر کا بے عیب ہونا ضرور ہے۔

اصل یہ ہی کہ خالقِ کائنات مدبرِ عالم نے ہر ایک آدمی کو مختلف قوتوں کا مجموعہ پیدا کیا ہی اور مقدارِ قویٰ بھی سب میں مختلف ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ ہر ایک انسان میں۔ ہمدردی ۔ حرص ۔ غصہ ۔ احتیاط ۔ قوتیں موجود ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہی کہ مثلاً پاؤ پاؤ سیر یہ چاروں قوتیں ہر ایک شخص کو دیگئی ہوں بلکہ کسی کو تو ہمدردی چھٹانک بھر دی ہی اور کسی کو ڈیڑھ پاؤ۔ اسیطرح باختلافِ اوزان تمام قوتیں عطا کیگئی ہیں۔

ظاہر ہی جبکہ مختلف قوتیں مختلف مقدار میں ہیں تو افعال بھی (جو کہ تابع قوتوں کے ہوتے ہیں) یکساں نہ ہونگے اس سوال کو اچھی طرح سمجھنے کیواسطے دو چار مثالوں پر ابھی اور غور کرنا چاہیے یعنی مثلاً ایک شخص ہی کہ جسمیں ہمدردی کا مادہ سیر بھر ہی مگر حرص اور غصہ اور احتیاط تولہ تولہ بھر ہیں تو ظاہر ہی کہ اُسکے جذبات میں ہمدردی اندھا دھند ہوگی

اب ایک ایسی مثال لو کہ ایک شخص میں ہمدردی تو اُسی طرح سیر بھر ہی اور حرص اور غصہ بھی اُسیطرح تولہ تولہ بھر ہیں مگر احتیاط کا مادہ بجائے تولہ بھر کے آدھ سیر ہی۔ ایسی حالت میں اُس شخص میں ہمدردی تو مثال اوّل والے آدمی کی مانند ہوگی مگر بوجہ بیشی احتیاط کے اظہار ہمدردی اندھا دھند نہ ہوگا۔ غرض یہ ہی کہ اسی طرح خدا تعالےٰ نے تمام بنی آدم میں اصلاح اور ریفارم کا مادہ رکھا ہی۔ ہاں البتہ فرق یہ ہی کہ کبھی وہ کم ہوتا ہی اور کبھی زیادہ اور کبھی دوسرے مادوں سے دبا ہوا ہوتا ہی اور کبھی دوسرے معاون مادے اُسکو قوت پہنچاتے ہوتے ہیں۔

نتیجے اِس بیان کے یہ ہیں کہ (۱) ہر ایک میں ریفارم کرنے کی قابلیت ہی (۲) جب کسی شخص میں یہ قابلیت کچھ زیادہ ہوتی ہی تو اس بارے میں اُسکی شہرت اُسی تناسب سے زائد ہو جاتی ہی (۳) ریفارمر میں اُن عادات کا موجود ہونا جنکو ہم عیوب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوں کوئی عجیب بات نہیں ہی (۴) عیوب کے ہونے سے ریفارمر ناقابل ریفارم نہیں ہوسکتا۔

ایک شخص جسمیں دینداری کی نمایش کم ہو فنِ تجارت میں اصلاح کے ناقابل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور کوئی عقلمندی کی بات نہیں کہ ایک ماہر تاجر کے اُن اقوال و نصائح کو جو تجارت کے متعلق ہیں اسوجہ سے نہ سنیں کہ وہ تو دیندار نہیں ہی۔ یا ایک عالم جبکہ درستی اخلاق کے واسطے ہدایت کر رہا ہو تو صرف اس بنا پر کہ وہ تجارت کے فن سے ناواقف ہی لائقِ حقارت نہیں ہوسکتا۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہی کوئی عجیب بیان نہیں ہی بلکہ عملی طور پر ایسا ہی کیا جاتا ہی یعنی لکڑی کے کام کیواسطے بڑھئی ۔ لوہے کے کام کیواسطے لوہار۔ قانونی مشورت کیواسطے وکیل اور معالجے کیواسطے حکیم کے پاس ہی ہمیشہ جایا جاتا ہی اور ایسی حاجتوں میں صرف اسکا خیال کیا جاتا ہی کہ وہ اپنے پیشے اور کام میں کسقدر مہارت رکھتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہی کہ ریفارم اور اصلاح کی عام بحث جب پیش ہوتی ہی تو ہمیشہ ضرورت سے بہت زائد تنقید اور تدقیق کیجاتی ہی اور بال کی کھال نکال کر بھی تسکین نہیں ہوتی۔

علماء مذہب کی کساد بازاری کا سبب اس ماننے میں بھی خیال ہی کہ ریفارمر اور مصلح فرشتہ ہونا چاہیے۔ عالم اور مولوی کی عزت کا اندازہ اس بنا پر کیا جاتا ہی کہ وہ دولتمند ہی یا نہیں اور جبکہ ثابت ہوتا ہی کہ وہ دولتمند نہیں ہی تو اُسکو احمق کہا جاتا ہی۔ اور اُس کے قول کو ناقابلِ سماعت اسوجہ سے قرار دیا جاتا ہی کہ اگر یہ صاحب عقل ہوتا تو مفلس کیوں ہوتا۔ اور جبکہ بیعقل ہی تو اُسکو بیان کا اعتبار کیا ہی۔ حالانکہ یہ خیال خود اُس عمل کے خلاف ہی جو خود ہمارا ہی۔ یعنی جب کبھی ہم بڑھئی کے پاس جاتے ہیں تو یہ خیال نہیں کرتے کہ اُسنے ڈاکٹری پڑھی ہی یا نہیں۔ یا جب کبھی ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں تو اُسکی قانونی قابلیت اور عدم قابلیت کا اندازہ نہیں کرتے ہیں۔ دنیا کے حال پر اگر غور کیا جائے تو اور بھی

عجیب مثالیں ملتی ہیں یعنی صلاح دینے والے کی ظاہری کامیابی پر ہی غور کرنا ہمیشہ لازم نہیں قرار دیا جاتا۔

ایک پولیٹیکل اکانومی کے پروفیسر اور عالم کے واسطے ہرگز یہ لازم نہیں ہی کہ وہ سب سے زائد دولتمند ہو۔ حالانکہ وہ دولت کی پیدایش اور اسکی تقسیم کے ہر ایک نہجے سے واقف ہوتا ہی۔ (انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال) کا معا یہی ہی کہ ایک سمجھدار کا کام یہہ ہی کہ وہ دیکھے کہ کیا کہا گیا ہی (ور نوشتہ است پند بر دیوار)۔

اصلاح طلبی اور بیغیرتی ایک نہیں ہی۔

جو اشخاص یا اقوام کہ قابل اصلاح ہوں وہ بے غیرت سمجھے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔ دنیا میں کوئی ملک یا قوم ایسی نہیں گذری ہی کہ جسمیں سلسلۂ ریفارم جاری نہ رہا ہو۔ اور نہ اسوقت کوئی سمجھدار قوم یا کوئی ترقی یافتہ قوم ایسی ہی کہ باوجود اوج ترقی پر پہنچ جانے کے اُن کو یہ محسوس ہو رہا ہو کہ اب بھی اُن میں اصلاح کی ضرورت ہی۔ جبکہ یہ حال ہی تو قابل اصلاح و درستی ہونا کسی قوم کیواسطے باعث ذلت متصور نہیں ہوتا۔

یورپ کی قومیں باوجودیکہ اپنی قوم کی اصلاح کے ہر وقت در پے رہتی ہیں ہرگز اپنی قوم کو حقیر اور ذلیل نہیں جانتیں۔ اور نہ اُن سے نفرت کرتی ہیں۔ بہت کم باپ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کی لائق اصلاح نہ جانتے ہوں مگر عام طور پر والدین کا ایسا خیال اولاد سے نفرت پیدا ہو جانے کا باعث نہیں ہوتا۔

(اسمٰعیل)

کیمیاے قدیم

(جس سے ہمارا مقصد سونا اور چاندی بنانا ہے)

یورپ کے علما اور حکما کی محنتی اور جفاکش طبیعتوں کے نزدیک کسی شئے کا ناممکن ہونا محال ہی۔ یعنی وہ لوگ اپنی ناکامیابیوں کا نام خارج از امکان نہیں رکھتے بلکہ اپنے تجربوں کو ناقص قرار دینے پر ہمیشہ مائل رہتے ہیں بخلاف ہم لوگوں کے کہ ہم مشکل اسپر راضی ہوتے ہیں کہ اپنے تجربوں کو غیر مکمل سمجھیں جسکا نتیجہ یہ ہی کہ یورپ میں آئے دن نئی چیزیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ اس مثال میں ہم کیمیای قدیم یعنی سونے، چاندی، کے بنانے کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں۔

سونا، یا چاندی بنانا ایک قدیم خیال ہی جو مشرقی اقوام میں چلا آتا ہی مگر علم میں ترقی اور اُس کے اصول میں تبدیلیاں واقع ہو جانے سے اب یہ خیال ہم لوگوں میں ایسا ہی کہ نہ صرف اُسکے مدعی کو احمق کہا جاتا ہی بلکہ تانبے سے مثلاً سونا بنانے کو غیر ممکن یقین کر لیا گیا ہی۔ حالانکہ یورپ کی باہمت طبیعتیں جو کسی حالت کا اعتبار نہیں کرتی ہیں اسپر مائل ہوگئی ہیں کہ گو اسوقت تک تانبے سے سونا، رانگے سے چاندی بنانا مثلاً ہم لوگوں کو معلوم نہیں ہی مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ناممکن ہی! اسپر وہ دو طرح سے استدلال کرتے ہیں (اول) وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی کتابوں سے ایسے ایسے اشخاص کی شہادت اس بارے میں پائی جاتی ہی جنکے اوپر غلط گمانی کا شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہی (دوم) یہ قاعدہ روز بروز غلط ثابت ہوتا جاتا ہی کہ معدنیات عناصر بسیطہ میں اور جبکہ معدنیات عنصر نہیں ہیں تو اُن میں سے کسی ایک کا دوسرے میں تبدیل ہو جانا ناممکن کیونکر کہا جا سکتا ہی۔

(گندھک) جسکو اب سے چند سال اول بسیط سمجھا جاتا تھا (سویڈن) کے رہنے والے (سلر مینڈبرگ) نامی عالم کے تجربوں سے مرکب ثابت ہوئی ہی۔ اُسکا دعویٰ ہی کہ (گندھک) ہیڈروجن۔ اوکسیجن۔ اور کاربن سے مرکب ہی۔ اسطرح پر: - گندھک ایک سو ساٹھ اور دو سو درجے کے درمیان کی درجۂ حرارت میں اگر گرم کیجائے تو اُس کی حالت۔ کوٹ چوک (ربڑ) ہلکی سی ہو جاتی ہی

جس سے ثابت ہوتا ہی کہ اُس میں ہیڈروجن اور آکسیجن ہی
اگرلونگ کے روغن میں گندھک کو جوش دیا جائے
تو وہ روغن کافور سے مشابہ ہوجاتا ہی اسوجہ سے کہ گندھک
سے وہ کسیقدر آکسیجن حاصل کرلیتا ہی۔

گندھک کو جلاڈالنے سے ایک سیاہ مادہ باقی
رہجاتا ہی جس سے (کاربانک ایسڈ) حاصل ہوتا ہی۔
اس سے ثابت ہوتا ہی کہ گندھک مین کاربن شامل ہی
اب (نیکل) کو لو جو ایک دھات ہی۔ (سلر نیڈبرگ)
کہتا ہی کہ میں نے اِس تیل میں تانبے کے مرکب کو حل کرکے
پھر اُسکو جبکہ تحلیل کیا تو بجای تانبے کے (نیکل) دھات
دستیاب ہوا جس سے ثابت ہوا کہ تانبا نیکل میں
تبدیل ہوجاتا ہی۔

یہ خیال کہ ایک دھات سے دوسرا دھات بنجانا ممکن
نہیں ہی صرف اِسی اصول پر قرار دیا گیا تھا کہ دھات عنصر ہیں
اور عنصر کا تبدیل ہونا غیر ممکن ہی لیکن علم کے ایک اور قدم آگے
بڑھجانے سے یہ معلوم ہوا ہی کہ جن اشیا کو عناصر کہا گیا ہی اُن
کی نسبت قطعاً یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اشیا عناصر ہیں
جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہی کہ (گندھک) عنصر نہیں ہی اور
(نیکل) اور (کاپر) عنصر نہیں ہیں۔ ان کے سوا اور بھی
مادّے ہیں جو اب مفرد یعنی عنصر باقی نہیں رہے ہیں۔
مثلاً:۔ (کلورین) کہ بظاہر عنصر معلوم ہوتی ہی اور ایک
مدت تک عنصر تسلیم کیگئی مگر اب اُسکا بسیط ہونا ثابت
ہوگیا ہی۔ ہوا (ایٹماسفیر) کی نسبت خیال تھا کہ وہ صرف
(ہیڈروجن) اور (آکسیجن) سے مرکب ہی مگر اب ایک تیسرا
عنصر اُسمیں ملا ہوا پایا گیا ہی جسکو (آرگون) کہتے ہیں۔

غرضکہ اِن جدید تجربوں کی بنا پر سونا چاندی وغیرہ معادن
کو مفرد اور عنصر تسلیم کرنیکی مجبور کرنیوالی کوئی دلیل باقی نہیں
رہی ہی اور جبکہ اُنکا مرکب ثابت ہوجانا ممکن ہی تو اُن میں سے
ایک کا دوسرے میں تبدیل ہوجانا بھی محال نہیں ہی۔
مسٹر (سوبرن وبرلہ) نامی ایک عالم نے اس باب
میں ایک خاص تھیوری قائم کی ہی۔ وہ کہتا ہی کہ جسطرح
حیوانات اور نباتات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی رہتی ہی
اُسیطرح جمادات بھی اس حکم کے دائرے سے باہر نہیں
ہیں۔ یعنی اُن میں بھی ترقی اور تبدل جاری رہتا ہی۔ ہاں
البتہ نوعیت تبدیلی و ترقی میں فرق ہی یعنی حیوانات
اور نباتات میں ترقی اور تبدیلی اُن کے بڑھنے کی صورت میں
ظاہر ہوتی ہی اور معادن کی ترقی اور تبدیلی اُن کی اشکال
اور اوصاف کی تبدیلی کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہی۔
اُسکا خیال ہی کہ (سیسہ) وہ چاندی ہی جسنے اپنے اوصاف
میں تکمیلیت حاصل نہیں کی ہی اور (چاندی) وہ سونا ہی جو اپنے
اوصاف میں ابتک ناقص ہی۔

چاندی اور سونا بنجانے کے معتقد اہل یورپ ایک
اور مثال پیش کرتے ہیں کہ جبکہ زمانہ حال میں برقی قوت
کے ذریعے سے کوئلہ، ہیرے میں تبدیل کرلیا جانا
ممکن ہوگیا ہی تو تانبے یا رانگ کو سونے یا چاندی میں تبدیل
ہوجانے کی کسی ترکیب کے معلوم ہوجانے کو کس بنا پر محال
اور ناممکن کہا جاسکتا ہی۔

غرض یہ ہی کہ گو اسوقت تک سونے اور چاندی کا دوسری
دھاتوں سے بنالیا جانا یورپ میں معلوم نہیں ہوچکا ہی
مگر ایک تو وہاں کے اہل فن اس کی تحقیقات سے غافل
نہیں ہیں۔ اور وہ ہماری طرح نہیں ہیں کہ چند علمی باتوں کو ادھر
اُدھر سے صرف سُن لینے پر احکام قطعی صادر کرنے لگیں
بلکہ وہ برابر غور کررہے ہیں کہ آخر پرانی زمانیکے اہل علم و عقل نے
جبکہ اسکا اقرار کیا ہی تو کچھ نہ کچھ تو حقیقت ہوگی اور دوسرے
علم کی ترقی اور جدید تحقیقاتوں کی بنا پر وہ اصول ہی ٹوٹ گیا ہی
کہ عناصر معلوم حقیقت میں عناصر ہیں بلکہ تمام عناصر اور معادن پر
شبہ کرنیکی گنجایش ہوگئی ہی۔

اِس مضمون کا میٹیریل ہم نے ثروت فنون سے لیا ہی
اور اپنے رسالے کے ناظرین کے سامنے دو غرض سے
پیش کیا گیا ہی ایک یہ کہ معلوم ہوجائے کہ کیمیای قدیم کی

بابت زمانۂ جدید میں کیا خیالات ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی خیال صرف اسوجہ سے قابلِ حقارت نہیں ہو کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔

(اسمٰعیل)

عورتوں کی تربیت

آجکل عزت لُو قاسم بک امین سنے جو مصر کے ایک مشہور فاضل ہیں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر عربی زبان میں ایک کتاب لکھی ہو۔ اس کتاب کا مصر روم او شام کے اخباروں اور رسالوں میں بہت چرچا ہو رہا ہو۔ مصنف نے اس کتاب میں عورتوں کے متعلق نہایت عمدہ عمدہ مضامین درج کیے ہیں۔ انمیں ایک مضمون عورتوں کی تربیت پر ہو۔ ایک فصل میں پردے کی بحث ہو جسپر مصنف نے مذہبی اور تمدنی پہلو سے نظر ڈالی ہو۔ ایک بحث اس مضمون پر ہو کہ عورت کا درجہ قوم میں کیا ہو۔ اسیطرح اُنھوں نے شادی طلاق اور تعددِ ازواج پر نہایت عمدگی اور خوبی سے بحث کی ہو۔ کتاب کے خاتمے میں عورتوں کی تعلیم اور تربیت کیطرف مردوں کو متوجہ کیا ہو۔ اس کتاب کا نام (تحریر المرأۃ) ہو۔ کوئی اخبار اور کوئی رسالہ عربی یا ترکی زبان کا ایسا نہیں ہو جس نے مصنف کی قابلیت اور لیاقت اور کتاب کی خوبی اور لطافت کی تعریف نہ کی ہو۔ بعض اخباروں اور رسالوں نے اس کتاب کے خاص خاص مضمون چھاپکر شایع کیے ہیں اور اُنپر ریویو کیا ہو۔

چونکہ اس کتاب کا ہر مضمون فی الحقیقت غور اور دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہو اس لیے ہم ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی قوم کے فائدے کے لیے ایک مضمون کا ترجمہ کریں جو عورتوں کی تربیت پر نہایت عمدگی اور خوبی سے لکھا گیا ہو۔ فاضل ممدوح اپنے اِس مضمون کو اِسطرح شروع کرتے ہیں،

عورتیں بھی مردوں کی طرح انسان کی جنس میں داخل ہیں۔ اگر دونوں کی جسمانی ترکیب پر غور کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ اعضا۔ حواس۔ عقل و فکر۔ جذبات و خیالات اور اُن تمام باتوں کے لحاظ سے جو انسان ہونے کے لیے درکار ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہو۔

موجودہ حالت میں جسمانی اور روحانی قوتوں کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر جو فضیلت اور فوقیت حاصل ہو۔ اس کا سبب یہ ہو کہ مرد ہزاروں برس سے علمی و عملی ترقیوں کے میدان میں برابر دوڑتا رہا ہو اور عورت ان قوتوں کے استعمال سے محروم رہی ہو۔ اور ایسی پست حالت میں رہنے پر مجبور کی گئی ہو جو بلحاظ مختلف زمانوں اور ملکوں کے مختلف رہی ہو۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال آجتک قائم ہو کہ عورتوں کو تعلیم و تربیت دینی جائز نہیں ہو۔

بہت سے لوگ آپس میں سوال کرتے ہیں کہ عورتوں کو لکھنا پڑھنا شرع کی روسے جائز ہو یا قطعًا حرام ہو۔

مجھے خوب یاد ہو کہ میں نے ایکدفعہ ایک شخص کو سمجھایا کہ وہ اپنی لڑکی کو تعلیم دے جسکی عمر نو برس کی تھی اور جسمیں حسن و جمال کیساتھ دماغی قابلیت کی چمک دمک پائی جاتی تھی۔ اُس نے ناک بھوں چڑھاکر کہا کہ آخر آپ کا مطلب کیا ہو؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اُسکو سرکاری ملازمت میں داخل کیا جائے؟

میں نے کہا تو کیا آپ کے نزدیک صرف وہی لوگ تعلیم پانیکا حق رکھتے ہیں جو سرکاری ملازمت کرنا چاہیں؟ اُسنے کہا میں تو خانگی انتظام کے سوا کسی چیز کی تعلیم دینا پسند نہیں کرتا۔ یہ بات اُسنے ایسے لہجے میں کہی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی راے پر کسی نکتہ چینی کا روادار نہیں ہو۔ یہ ظالم باپ خانگی انتظام کے لفظ سے یہی معنی مراد لیتا تھا کہ اُس کی لڑکی کو معمولی طور پر کچھ سینا پرونا۔ کھانا پکانا آجائے اور بس۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ تعلیم بھی لڑکیوں کیلیے مفید ہو مگر میں بلاخوف تردید کے بآوازِ بلند کہتا ہوں کہ اُسکی رای غلط

اور اُسکا خیال نادرست تھا کیونکہ جس لڑکی کی اتنی ہی معلومات ہوں وہ گھر کا انتظام خاک نہیں کر سکتی۔

میری راے میں کوئی عورت گھر کا انتظام نہیں کر سکتی جبتک کہ اُسکو عقلی اور اخلاقی علوم میں ایک خاص حد تک دستگاہ نہو۔ اسلیئے ضروری ہی کہ اُسکو ابتدا میں کم سے کم اتنی تعلیم دیجاے جتنی کہ شروع میں لڑکوں کو دیجاتی ہی۔ تاکہ علوم کی ابتدائی باتیں اُسکو معلوم ہو جائیں اور وہ جب کبھی چاہے اپنے مذاق کے موافق کسی علم کو پسند کر سکے اور اُسکو درجۂ کمال پر پہونچا سکے۔

اگر عورتوں کو لکھنا پڑھنا آجاے اور وہ علمی اصولوں پر مطلع ہو جائیں۔ دنیا کے جغرافیے اور قوموں کی تاریخ سے آگاہی حاصل کریں۔ ہیئت اور طبعیات پر بھی کچھ اُنکو عبور ہو جاے۔ مذہبی عقائد اور مذہبی مسائل سے بھی بیخبر نہ رہیں تو اُن کے دماغ اس قابل ہو جائینگے کہ وہ صحیح راے کو تسلیم کر سکیں اور اوہام کا مقابلہ کر سکیں جنھوں نے اُنکی زندگی کو برباد کر دیا ہی۔

جو لوگ عورتوں کی تربیت کرنا چاہیں اُن پر فرض ہی کہ بچپن سے اُن کو ایسے عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کا خوگر کریں جنکا اثر انسان کی ذات پر۔ خاندان کے لوگوں پر اور تمام قوم پر ہوتا ہی۔ تاکہ وہ اخلاق رفتہ رفتہ اُن کے دل میں جگہ پکڑیں اور اُن کا نقش گہرا بن جاے۔ یہ مطلب بانی ہدایتوں کے سننے اور عمدہ اور نیک مثالوں کے دیکھنے سے حاصل ہو سکتا ہی۔

یہ وہ تربیت ہی جسکی نسبت میری دلی آرزو ہی کہ وہ مصری عورتوں کو حاصل ہو۔ اگرچہ میں نے اس کی طرف مجملاً اشارہ کیا ہی مگر اس موضوع پر اکثر زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں ایک سنٹ کیلیئے بھی خیال نہیں کر سکتا کہ کوئی عورت بغیر اس تربیت کے اُن فرائض کو ادا کر سکتی ہی جو قومی اور خانگی لحاظ سے اُسکی گردن پر ڈالے گئے ہیں۔

ہر شہر میں عورتیں کم سے کم نصف آبادی کی برابر ہیں۔ اُن کے جاہل رہنے کا یہی نتیجہ ہی کہ قوم کے آدھے افراد کے کام کرنے سے جو فائدے پہونچ سکتے ہیں، اُن سے قوم بالکل محروم ہی اور صریح طور پر ہمکو نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑتا ہی۔

مصری عورتوں کو کوئی امر اس بات سے مانع نہیں ہی کہ وہ یورپ کی عورتوں کیطرح علوم و فنون تجارت اور صنعت و حرفت میں مشغول ہوں۔ عدمِ تربیت اور جہالت کی جو تاریکی عام طور پر چھائی ہوئی ہی وہی ایک سبب مصری عورتوں کے ترقی نہ کرنے کا ہی۔ اگر ہم انکا ہاتھ پکڑکر اُن کو زندوں کے مجمع میں لائیں۔ زندوں کے سے کام کرنا سکھائیں۔ اُن کی جسمانی اور عقلی قوتوں میں جنبش پیدا کریں تو وہ بھی مردوں کیطرح جاندار اور کام کرنیوالی نظر آئیں۔ وہ جسقدر قوم کی دولت کو برباد کرتی ہیں اُسیقدر پیدا کرنے لگیں۔ اور دوسروں کے سہارے اور امداد پر زندگی بسر کرنا چھوڑ دیں۔ اِس سے ملک کی عام دولت کو ترقی ہوگی اور قوم کی دماغی قابلیتیں معراجِ کمال پر پہونچ جائینگی۔

ہماری مثال آجکل ایسی ہی ہی جیسے کوئی شخص مالِ کثیر پیدا کرے اور اُسکو صندوقوں میں بند کرکے رکھ چھوڑے اور ہر روز صندوق کھول کر سونے اور چاندی کو دیکھا کرے۔ اگر وہ پولٹیکل اکانومی سے واقف ہوتا تو اُس دولت کو استعمال میں لاتا اور اُس سے نفع اُٹھاتا اور چند ہی سال میں اُسکو دوچند دیکھتا۔

سب سے بڑا سبب قوم کی پستی اور تباہی کا یہ ہی کہ اُسکے افراد کا بہت بڑا حصہ عضوِ معطل اور بیکار ہو۔ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیئے کوئی کام نہ کرتے ہوں۔ اور اگر کوئی کام کریں تو مثل ایک بے زبان جانور یا بے شعور کل کے یہ نہ جانتے ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں اور اُسکا نتیجہ کیا ہوگا۔

عورتیں تعلیم کی محتاج ہیں تاکہ وہ سوچنے سمجھنے والے

آدمیوں کے گروہ میں داخل ہوسکیں۔ ہماری قوم میں عورتوں کی حالت اسقدر زبون اور پست ہوگئی ہو کہ جب ہم عورت کا تصور کرتے ہیں تو اُسکے ساتھ ہی یہ خیال ہمارے ذہنوں میں گذرتا ہو کہ اُسکا کوئی ولی اور سرپرست ہو جو اُس کی حاجتوں کو پورا کرے اور اُسکی ضرورتوں اور خواہشوں کو انجام دے۔ گویا ولی اور سرپرست کا ہونا ایک ایسا امر ہی جو ہر حال میں ضروری ہو۔ حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ بہت سی عورتوں کے لیئے کوئی ولی اور سرپرست نہیں ہوتا۔ وہ لڑکی جسکے رشتے دار غائب ہوں اور اُسکا نکاح نہ ہوا ہو۔ وہ عورت جسکو طلاق دی گئی ہو۔ وہ عورت جسکا شوہر دنیا سے گذر گیا ہو۔ وہ ماں جسکی اولاد میں کوئی لڑکا نہو۔ اور اگر ہو تو کم سن اور نابالغ ہو۔ یہ سب صورتیں ایسی ہیں جن میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہی تاکہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیئے (اگر اولاد ہو) معاش پیدا کرسکیں۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہونگی تو وہ معاش کے ناجائز ذریعے اختیار کرینگی، یا اُن کو کسی فیاض خاندان کے سہارے پر زندگی بسر کرنی ہوگی۔

اگر ہم اُس تحریک کو تلاش کریں جس سے رات کی تاریکی میں بکثیرا مدنا دار حسین عورتوں کو شیطان سیرت نوجوانوں کے جذبات کا شکار ہونا پڑتا ہی تو ہمکو معلوم ہوگا کہ اس ذلت کے قبول کرنیکا باعث لذائذ نفسانی کے حاصل کرنیکی اُمنگ نہیں ہی بلکہ وہی چیز ہی جس کی نسبت مولانا روم فرماتے ہیں ؎

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

مصر میں کوئی خاندان ایسا نہیں ہی جسکے ذمہ بہت سی اُن عورتوں کا نان ونفقہ نہ ہو جو زمانے کی گردش سے مفلس ہوگئی ہیں۔ اور اپنی معاش کے لیئے کوئی کام کرنا نہیں جانتیں۔

پس یہ کہنا کچھ بیجا نہوگا کہ اکثر خاندان اسی باعث سے کفایت شعاری کے پابند نہیں رہ سکتے۔

یہی سبب ہی کہ اکثر خاندانوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہی۔ مصر کے ایک باشندے کو جو اپنی ذات کے لیئے اور اپنی اولاد کے لیئے محنت کرتا ہی، اپنی کمائی کا ایک حصہ اپنے رشتہ داروں یا دوستوں، یا ایسے شخصوں پر صرف کرنا پڑتا ہی جن سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہی۔ انسانی ہمدردی اُسکو مجبور کرتی ہی کہ اپنی کمائی میں سے تھوڑا سا روپیہ اُن لوگوں پر بھی صرف کرتا ہی تاکہ وہ بھوک سے مرنے نپائیں۔ مگر وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق اسکی گردن پر ہی اور وہ اسی حق کو پورا کرتا ہی۔ یہ ہوسکتا ہی کہ وہ بھی محنت کرکے معاش پیدا کریں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ اُن قوتوں کا استعمال کرنا نہیں جانتے جو قدرت نے اُن کو عطا کی ہیں۔ اور اسکا باعث صرف یہی ہی کہ وہ تربیت سے محروم ہیں۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ کسی عورت کا شوہر یا سرپرست موجود ہی جو اپنی کمائی سے اُسکو مدد دیسکتا ہی، تاہم یہ کون کہسکتا ہی کہ اُسکو تربیت کی کوئی ضرورت نہیں ہی۔ کیونکہ اگر عورت تربیت یافتہ ہو تو وہ اپنے شوہر یا سرپرست کی مدد کرسکتی ہی، اگر وہ محتاج ہو، یا اُسکے بوجھ کو ہلکا کرسکتی ہی، اگر وہ مالدار ہو۔

اگر عورت بذاتِ خود مالدار ہو (اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہی) اور اُسکے پاس جائداد ہو تو کیا اُس جائداد کا انتظام کرنے اور اپنی دولت کو محفوظ رکھنے اور اُسکے ترقی دینے کے لیئے اُسکو تعلیم کی ضرورت نہیں ہوگی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی عورتیں اپنا روپیہ کسی رشتہ دار یا غیر آدمی کو سپرد کردیتی ہیں، اور اُن کو اپنے معاملے میں مختار کرلیتی ہیں۔ یہ مختار بہ نسبت اُن کے معاملات اپنے کاموں میں زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ اور اُن جائدادوں کی پروا نہیں کرتے جنکا اُن کو مختار تسلیم کیا گیا ہی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ مختار تو چند روز میں مالدار

ہوجاتے ہیں اور صاحب جائداد عورتیں افلاس میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں حساب کی فرد، یا دستاویز یا اقرارنامے کا مطلب نہیں سمجھتیں اور نہیں جانتیں کہ اس میں کیا لکھا ہے اور اُن پر بجائے دستخط کے اپنی مُہر ثبت کرتی ہیں۔ اور شوہر یا رشتہ دار یا مختار کی چالاکی اور مکاری سے اپنے قانونی حقوق سے محروم ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں تو ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا تھا۔

بہرحال تعلیم بذات خود ایک ایسی چیز ہے جسکی ہر حال میں ضرورت ہے کیونکہ وہ آجکل انسانی زندگی کی ضروریات میں شامل ہوگئی ہے۔ اور جس قوم میں تمدن اور شائستگی نے قدم رکھا ہے اُس کی سب سے مقدم ضرورت ہے۔ علم ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جسکے لیے ہر انسان دوڑ دھوپ میں ہے۔ اور اُسی پر روحانی اور جسمانی ترقیوں کا مدار ہے۔

تنہا علم ہی اسکا ذریعہ ہے کہ انسان پستی اور تنزل کے درجے سے گذر کر فضیلت اور شرافت کے بلند مرتبے تک ترقی کرے۔ اور ہر انسان کو قدرتی حق ہے کہ وہ اپنی فطرتی قوتوں کو اُس حد تک پہونچائے جہاں تک اُسکی قابلیت اجازت دے۔

تمام ربّانی شریعتیں اور انسانی قانون مردوں اور عورتوں سے یکساں طور پر خطاب کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ۔ فلسفۂ عالیہ۔ ایجادات و اختراعات کا دروازہ ہر عورت کے لیے اُسیطرح کھلا ہے جسطرح مردوں کے لیے۔ کون انسان ہے جو علوم و فنون کے مطالعے کا شوق نہ رکھتا ہو۔ اور دنیا اور آخرت کی کامیابی اور حقائق کا سُراغ لگانے کے لیے قدرت کے خزانوں سے مستفید ہونا نہ چاہتا ہو؟ یہ اُمنگ جو قدرتی طور سے ہر انسان کے دل میں اُٹھتی ہے اُس کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کیا فرق ہے؟ بچوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی چیز اُن کی آنکھ کے سامنے آتی ہے تو اُسکی نسبت بار بار سوال کرتے ہیں اور جو واقعات اُن کے سامنے ظہور میں آتے ہیں اُنکا سبب دریافت کرتے ہیں۔ اس بات میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر ہیں۔ بلکہ بعض اوقات بنسبت لڑکوں کے یہ خاصہ لڑکیوں میں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

کون جاندار ہے جس میں روح اور عقل ہو اور وہ اس بات پر راضی ہو کہ اُسکے بازو توڑ دیے جائیں اور اُسکو ایک پنجرے میں بند کردیا جائے اور وہ سر جھکائے آنکھیں بند کیے اُس پنجرے میں پڑا رہے۔ اور اُسکے سامنے ایک وسیع اور پُر فضا میدان ہو جسکی کوئی انتہا نہیں۔ اُسکے سر پر آسمان کا نیلگوں شامیانہ ہو۔ ستارے اُس کی نظر کے ساتھ کھیلتے اور اپنا جلوہ دکھا کر اوجھل ہوجاتے ہوں۔ کائنات کی روحیں اُسکو اُمیدوں اور آرزوؤں کے میدان کیطرف کھینچے لیے جاتی ہوں۔ قدرت نے اپنے خزانے کھولدیے ہوں کہ وہ اُن پر قبضہ کرے اور اُن سے متمتع ہو۔

شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر مکلف قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عقل و دانش مرد کو عطا کیگئی ہے وہی عورت کو دی گئی ہے۔ کیا کوئی شخص جسکو خود غرضی نے اندھا نہیں کیا ہے خیال کرسکتا ہے کہ خدا نے جو عقل و درایت انسان کو عطا کی ہے وہ بیکار ہے اور جو حواس اور جو قوتیں اُسکی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں وہ اسلیئے ہیں کہ اُن کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ اُن کو ہمیشہ معطل رہنے دے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ عورتیں پردہ نشین اور گھر کی زینت ہیں۔ اُن کے فرائض گھر کی چوکھٹ پر تمام ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ قول انھیں لوگوں کا ہے جو خیال کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور جنکو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

اگر مسلمان غور کرینگے تو اُن کو معلوم ہوجائیگا۔ کہ

سب سے پہلا فرض جو عورت کے ذمہ ہے وہ یہ ہے۔ کہ وہ بذاتِ خود اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ جس کے نہ ہونے سے اسکے حقوق پامال کیئے جاتے ہیں۔

جب تمام خانگی معاملات میں مرد ہی جوابدہی کرتا ہے اور اُسی سے بازپرس کیجاتی ہے تو اُسکو قدرتی حق ہے کہ عورت کے حقوق پر قبضہ کرے۔ اور اُسکی نظر میں عورت کی اتنی ہی وقعت ہو جتنی کسی جانور کی ہوتی ہے۔ جسطرح کسی جانور کا مالک اُسکے لیئے چارہ مہیا کرتا ہے؟ اسیطرح مرد عورت کے لیئے معاش کا بندوبست کرتا ہے۔

صدیاں گذر چکی ہیں کہ عورتیں مردوں کے حکم کے سامنے گردن جھکاتی رہی ہیں۔ اور اُن کے ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ مردوں نے اُن کی آزادی چھین لی ہے۔ اُنہوں نے عورتوں کے لیئے یہی بات ہمیشہ پسند کی ہے کہ وہ اُنکی خدمت کرتی رہیں۔ اُن کے اشاروں پر چلتی رہیں۔ انہوں نے عورتوں پر روزی حاصل کرنے اور معاش پیدا کرنے کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔ یہانتک کہ اب وہ بذاتِ خود معاش پیدا کرنے سے عاجز ہیں اور اِس بات پر مجبور ہیں کہ شوہر کی کمائی پر گذر کریں، یا ناجائز طریقوں سے معاش پیدا کریں۔

چونکہ عورتوں کے دماغ کے لیئے غور و فکر کا کوئی میدان باقی نہیں رہا۔ اور زندگی کے مفید کاموں کی ذرا بھی وقعت اِن کی نظر میں نہیں ہے۔ اور ان کا مشغلہ یہی رہ گیا ہے۔ کہ وہ مردوں کی دلجوئی کریں۔ اور مرد جسطرح چاہیں اُن کو اپنے نفسانی جذبات کا تختۂ مشق بنائیں۔ اس لیئے عورتوں نے اپنی تمام قوتیں اِس کوشش میں صرف کر دی ہیں کہ شوہر کی دلجوئی کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں اور اُن کی خواہشوں اور ارادوں کے رُخ کو پہچان کر کٹ پتلیوں کی طرح اُن کے اشاروں پر ناچا کریں۔

بہت زمانہ اس بات کو گذر چکا ہے۔ کہ عورتوں کو سچی تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور اُن کی دماغی قوتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اب اُن میں صرف احساس کی قوت باقی ہے۔ ادراک کی نہیں۔ بھلائی اور بُرائی۔ نفع اور نقصان میں تمیز کرنے کے لیئے وہ صرف اِسی قوت سے کام لیتی ہیں۔ عورتوں میں نفرت بھی ہے۔ محبت بھی مگر اُن میں سے کسی کی بنیاد عقل پر نہیں ہے اگر وہ کسی سے محبت کرتی ہیں تو اُن کی محبت خالص ہوتی ہے۔ اور اُن سے بڑے بڑے کارنمایاں ظہور میں آتے ہیں مگر اسکا مدار عقل و دانش پر نہیں ہے بلکہ محض خواہشِ نفسانی پر ہے۔ اسیطرح وہ جب نفرت کرتی ہیں تو اُن سے بڑے بڑے گناہ صادر ہوتے ہیں جنکے انجام سے وہ بیخبر ہوتی ہیں۔ اگر اُن کو عقلی اور اخلاقی تربیت دیجاتی تو اُن میں وہ قوت ضرور ترقی کرتی جو خواہشِ نفسانی پر حکمرانی کرتی ہے۔ اور اُن کے ہر کام کی بنیاد حکمت اور اخلاق کے اصولوں پر ہوتی۔

گذری ہوئی صدیوں کی تاریکی میں عورتوں کی عقل بھٹکتی رہی ہے اور وہ سیدھے رستے پر چلنا نہیں جانتیں۔ اور شریعت اور اخلاق کی منزل سے کوسوں دور رہ گئی ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ حیلہ اور مکر کی چال چلیں۔ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ جو اُن کے آقا اور سرپرست ہیں وہی برتاؤ کرتی ہیں جو قیدی جیلر سے کرتے ہیں۔ اُن میں مکاری اور فریب کی قوت بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ وہ خانہ داری کے اسٹیج پر طرح طرح کی ایکٹ کرتی ہیں۔ اُن کو ہر قسم کے لباس میں جلوہ گر ہونا۔ ہر سانچے میں ڈھل جانا۔ ہر شکل میں درآنا اور ہر حال اور ہر وقت کی مناسب اپنے تئیں بنا لینا خوب آتا ہے۔ اُن کے یہ سب کام عقل و حکمت سے نہیں بلکہ لومڑی جیسی مکاری اور فریب کی قوت سے ظاہر ہوتے ہیں۔

مگر عورتوں کو اس باب میں ملامت کرنا بے سود ہے۔ اُن کے لیئے یہ عذر معقول ہر وقت موجود ہے کہ اُن کی آزادی چھین لی گئی ہے۔ اُن کو تاریک گھر کے پنجرے میں اِس لیئے بند کیا گیا ہے کہ اُن میں عقل و تمیز کی کوئی بات نہیں ہو

عورتوں کی تربیت

اور بےعقلی اور بے تمیزی اسلیئے ہے کہ اُن کو تعلیم و تربیت سے محروم کیا گیا ہے - اسکا گناہ درحقیقت مردوں کی گردن پر ہے - جنہوں نے اُن کو تعلیم نہیں دی - جنہوں نے تربیت سے اُن کو محروم رکھا ہے - وہی اُن کی عقل و تمیز کی قوت کو پامال کرنیوالے ہیں - اور وہی اُن کی آزادی کا خون اپنی گردن پر لینے والے -

ہر ایک انسان کو جس کے دماغ میں سوچنے اور سمجھنے کا مادہ ہے اُسکو اپنے خاندان کی حالت پر نظر ڈالنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اگر یہی حالت باقی رہی تو اس مصیبت کا برداشت کرنا ناممکن ہو جائیگا -

میں اس مضمون کو لکھ رہا ہوں اور میرا دماغ اُن واقعات سے بھرا ہوا ہے جنکا تجربہ ہو چکا ہے اور جو میرے تمام خیالات پر غالب آگئے ہیں - میں اُن میں سے کسی واقعے کا ذکر نہیں کرونگا - کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اُن میں سے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے - جو آنکھوں کے سامنے نہ آتا ہو اور جسکا خیال دل میں نہ گذرتا ہو - ان تمام واقعات کی بنیاد صرف ایک چیز ہے اور وہ جہالت کی ہولناک بیماری ہے جو تمام خاندانوں پر چھائی ہوئی ہے - اور جسمیں امیر وغریب ادنیٰ و اعلیٰ سب کی عورتیں مبتلا ہیں - تمام عورتیں جہالت اور نادانی کے لحاظ سے یکساں حالت میں ہیں اگر ان میں کوئی اختلاف ہے تو وہ لباس اور زیور کا ہے - بلکہ یہ کہنا ممکن ہے کہ جوں جوں عورتیں دولتمندی میں ترقی کرتی ہیں اُن کی جہالت بھی بڑھتی جاتی ہے - اور یہی سبب ہے کہ ادنیٰ طبقے کی عورتوں میں بہ نسبت اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے عقل و دانش کی جھلک کچھ زیادہ پائی جاتی ہے -

کسانوں کی عورتیں اُن سب کاموں کو جانتی ہیں جو اُن کے شوہر کیا کرتے ہیں - ان میں تقریباً عورت اور مرد ایک درجے اور ایک حالت میں ہیں - مگر اعلیٰ یا متوسط طبقے کی عورتیں مردوں سے بہت پیچھے رہگئی ہیں - کیونکہ مردوں کے دل و دماغ تربیت یافتہ ہیں - اور اُن کی عقلیں علم کی روشنی سے منور ہیں مگر ان کی عورتوں نے ترقی کی اس رفتار میں مردوں کا ساتھ نہیں دیا ہے - بلکہ وہ اُن کے پیچھے کوسوں دور رہ گئی ہیں - مردوں اور عورتوں کا یہ اختلاف دونوں کی بدبختی اور بدقسمتی کا بڑا بھاری سبب ہے -

تعلیم یافتہ مرد اپنے گھر میں ترتیب و انتظام دیکھنا چاہتے ہیں - اُنکا مذاق شائستہ ہے - اُن کے خیالات لطیف ہیں - اُن کے جذبات نازک ہیں - اُن میں سے بعض مرد ایسے ہیں جن کی توجہ مادی اور جسمانی امور کی طرف بہت کم ہے - وہ کبھی خاموش رہتے ہیں کبھی آپ ہی آپ بولنے لگتے ہیں - اور کبھی ہنس پڑتے ہیں - اُن میں سے ہر شخص کے دماغ میں خاص خیالات گردش کرتے ہیں - ہر شخص ایک خاص مشرب کو پسند کرتا ہے - ایک خاص سوسائٹی کا ممبر ہے جسکی وہ خدمت کرتا ہے - ایک خاص ملک میں رہتا ہے جسکی وہ عزت کرتا ہے اُس کی تمام تکلیفیں اور خوشیاں باطن سے تعلق رکھتی ہیں - وہ محتاجوں کو دیکھکر روتا ہے - مظلوموں کو دیکھکر غمگین ہوتا ہے - لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے سے خوش ہوتا ہے - وہ چاہتا ہے کہ جو خیال اُس کے ذہن میں پیدا ہو - اور جو فیلنگ اُسکے حواس پر اپنا اثر ڈالے اُسکے اظہار کے لیئے کوئی ہمدرد اور ہم خیال اُسکے پہلو میں بیٹھا ہو - اور وہ اپنے دلی خیالات اور جذبات کو اس سے بیان کرتا ہو - یہ ایک قدرتی میلان ہے جو ہر شخص کی طبیعت میں موجود ہے - اگر عورت تعلیم یافتہ نہو تو وہ اپنی تکلیفوں اور خوشیوں کو اُس سے پوشیدہ رکھیگا - اور اپنے تئیں ایک نئی دنیا میں اور اپنی عورت کو دوسری دنیا میں دیکھیگا - کیونکہ عورت تو یہی جانتی ہے کہ مرد کو دنیا میں اسلیئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ ہمارے لیئے نفیس کپڑے اور عمدہ زیور مہیا کرے -

اور اپنی اوقات کو اُن کے ساتھ کھیلنے میں بسر کریں مرد جب اپنی عورتوں کو اس درجہ اور اس حالت پر پاتے ہیں تو اُن کے دل میں حقارت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اُن کو مُردہ تصور کرتے ہیں جنکا کوئی اثر اُنکی معاملات اور زندگی پر نہیں ہے۔ عورتیں بھی جب مردونکو دیکھتی ہیں کہ وہ اپنے خیال میں سر جھکائے محو رہتے ہیں اور اُن کیطرف التفات کی نظر سے نہیں دیکھتے تو اُن کا دل رنجیدہ ہوتا ہے اور وہ اُن کو ظالم خیال کرتی ہیں اور اپنی بدبختی پر روتی ہیں جس نے اُن کو ایسے مردوں کے پنجے میں قید کر دیا ہے جو اُن کی قدر نہیں پہچانتے اس طرح ان کے دل میں رفتہ رفتہ بغض اور عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اب اُن کی وہ ہولناک زندگی شروع ہوتی ہے جسکو دوزخ کے عذاب سے کہیں زیادہ خیال کرنا چاہیے اور جسمیں ہر ایک دوسرے کو اپنا دُشمن جانی تصور کرتا ہے۔ جو اسکے اور کامیابی اور خوش نصیبی کے درمیان حائل ہے۔

یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ یہ حالت اُن مردوں اور عورتوں کی ہے۔ جن کے اخلاق فاسد ہیں بلکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ عورت نہایت پاکیزہ اخلاق اور نیک ہے اور مرد بھی شریف طبیعت کا ہے باوجود اسکے دونوں میں ایسی دشمنی رہتی ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوتی مگر فی الحقیقت نہ اس مرد کا کوئی گناہ ہے اور نہ اس عورت کا بلکہ اس بدبختی کا باعث صرف یہی ہے کہ تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے دونوں کی حالت مختلف ہے۔ اس حالت کا انجام یہی ہوتا ہے (اگر دونوں میں تعلق باقی رہے) کہ اُن میں سے ایک شخص دوسرے کے آرام کے لیئے اپنے حقوق کو بالکل تلف کر دے، یا دونوں آخیر عمر تک اس بھاری طوق کو اپنی گردن میں ڈالے رہیں۔ لیکن اس صورت میں بیوی اور شوہر کی کوئی حالت ہو۔ ان کے درمیان محبت کا رشتہ نہیں ہو سکتا، اگر محبت کے اصلی معنی لیئے جائیں۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں ہے۔ کہ مرد اور عورت کیلئے دنیا میں اس سے زیادہ کوئی خسارہ نہیں ہے کہ وہ محبت کی لذت سے محروم ہوں وہ مذہبی قصے جو آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حوّا کو آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا ہے میرے نزدیک یہ لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مرد اور عورت دونوں ملکر ایک انسان ہیں۔ پورا انسان بغیر ان دونوں کے اتحاد کے نہیں ہوتا۔ اہل یورپ نے غالباً اسی سبب سے عورت کا نام آدھا انسان رکھا ہے یہ عمدہ اور پاکیزہ کنایہ اس بات پر اچھی طرح دلالت کرتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک جسم کے ٹکڑے ہیں۔ ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے کی ضرورت ہے اور دونوں کے ملنے سے ایک پورا جسم طیار ہوتا ہے۔

یہ قدرتی کشش جو مرد اور عورت میں موجود ہے، خدا نے تمام زندہ مخلوقات میں پیدا کی ہے۔ بعض نباتات میں بھی پیوند لگانیکے وقت نر اور مادہ کے درمیان ایک قسم کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ جسکو دیکھکر طبیعیات کے علما حیران ہیں۔ یہی قدرتی کشش ایک ضروری جز ہے جو عشق اور محبت کی ماہیت میں داخل ہے۔ اسی سے مرد اور عورت دونوں کا ایکدوسرے کیطرف میلان ہوتا ہے۔ انسان میں جو کشش موجود ہے وہ حیوانوں کی کشش سے مختلف نہیں ہے۔ مگر اس کشش کی اصلیت اور حقیقت اور اسکا سبب اسیطرح تاریکی میں ہے جسطرح کہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کی ماہیت اور حقیقت معلوم نہیں ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا سیال ہے، جو اعصاب کے مرکزوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جب یہ کشش مرد اور عورت دونوں کے درمیان پیدا ہوتی ہے، تو اُن کو آپس میں ملنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب دونوں آپس میں ملتے ہیں تو اُنپر ایک خوشی طاری ہوتی ہے۔ اُن کی آنکھوں سے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اُن کے سینوں میں موجزن ہوتے ہیں اگرچہ وہ زبان سے نہ بولتے ہوں۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ گویا دونوں کی روحیں اس دنیا میں آنے سے پہلے ایک اور دنیا میں باہم الفت رکھتی تھیں۔ پھر جدا ہو گئیں۔ اور ایک نے دوسرے کو تلاش کرنا شروع کیا۔ جب دونوں اس دنیا میں آپس میں مل گئیں۔ تو ان میں سے ہر ایک نے یہی سمجھا کہ اُسنے اپنی کھوئی ہوئی چیز پائی ہے۔ جسکو وہ مدت سے ڈھونڈھ رہا تھا۔ اسکے بعد مرد اور عورت دونوں کے دل میں طرح طرح کی امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ دونوں میں اتحاد شروع ہوجاتا ہے۔ اور اسکا گویا اقرار ہوجاتا ہے کہ وہ کبھی ایکدوسرے سے جدا نہ ہونگے۔ دونوں میں سے ہر ایک اپنی کامیابی اور خوش قسمتی کا مدار دوسرے کی ملاقات پر تصور کرتا ہے

لیکن یہ مادی اور جسمانی کشش جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے کچھ دنوں کے بعد کم ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ فنا ہوجاتی ہے۔ پہلی ملاقات میں کیسی ہی گرمجوشی کا اظہار کیا گیا ہو مگر آخر کار اُسکو زوال ہوجاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے مزاج مختلف ہیں اسلیئے گرمجوشی اور الفت کا زوال کبھی دیر میں ہوتا ہے کبھی بہت جلد۔ امیدیں دھندلی پڑجاتی ہیں۔ آرزوئیں دھیمی ہوجاتی ہیں، اور بجائے رغبت اور الفت کے نفرت اور عداوت پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر خدا نے انسان میں اس بات کی قابلیت رکھی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہمیشہ اس فیلنگ کو زندہ اور اس خیال کو تازہ رکھ سکتا ہے۔ وہ جسمانی اور دلفریب منظر جسنے مرد کو فریفتہ کیا تھا، اُسکے ساتھ ایک اور دلچسپ منظر پیش آتا ہے جو عقلی اور روحانی ہے۔ احساس کی ناپائدار لذت عقلی اور وجدانی لذت کیساتھ بدل جاتی ہے جسکی کوئی انتہا نہیں۔ مرد کی پہلی نظر عورت کے چہرے کی صفائی۔ آنکھوں کی خوشنمائی۔ قد کی موزونی۔ بالوں کی درازی پر پڑتی ہے۔ اگر حسن و جمال کے ساتھ عادت کی نیکی۔ عقل کی جودت مذاق کی نفاست۔ معلومات کی وسعت۔ رای کی اصابت۔ باطن کی پاکیزگی۔ ظاہر کی صفائی۔ دلکی نرمی زبان کی سچائی۔ انتظام کی لیاقت۔ خانہ داری کی قابلیت محبت کی راستی۔ عہد و پیمان کی پختگی اور دیگر اخلاق حمیدہ اور عادات شایستہ عورت میں موجود ہوں تو مرد کی فریفتگی اور دلبستگی ہزار درجہ بڑھ جاتی ہے اور عورت کا عشق مرد کی روح میں پیوست ہوجاتا ہے۔ باطنی خوبیاں ظاہری خوبیوں پر فوق لیجاتی ہیں اور جو لطف اُن سے حاصل ہوتا ہے وہ ظاہری خوبیوں کے لطف سے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔ کامل اور پائدار عشق انھیں دو عنصروں سے مرکب ہے جنکو دوسرے لفظوں میں حسن صورت اور حسن سیرت کہسکتے ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرد کو عورت کے ساتھ یا تو محض روحانی عشق ہوتا ہے، یا محض جسمانی۔ مگر میری رائ میں پہلا شخص خیال پرست۔ اور دوسرا شہوت پرست ہے۔ خالص محبت کا وہی لطف اُٹھا سکتا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی صفات پر عاشق ہو۔ جو عشق محض جسمانی لذت کی اُمنگ سے پیدا ہوتا ہے وہ کبھی پائدار نہیں ہوسکتا۔ اسکی مثال ایک آتشگیر مادے کی ہے جو ایکدم سے بھڑک اُٹھتا ہے اور فوراً ہی بجھ جاتا ہے۔

جسمانی لذتیں کیسی ہی مختلف ہوں نوعیت کے لحاظ سے سب ایک سی ہوتی ہیں۔ اور اُن میں وقت اور موقع کے لحاظ سے بہت کم فرق ہوتا ہے۔ پہلی بار جو لذت حاصل ہوتی ہے وہی دوسری بار اور وہی تیسری بار وقس علیٰ ہذا۔ تجربے سے ہر شخص کو معلوم ہوجائیگا کہ بار بار ایک ہی قسم کی لذت کا محسوس ہونا خواہ اُس لذت کو قوت شامہ سے تعلق ہو، یا باصرہ، یا سامعہ، یا ذائقہ، یا لامسہ سے، اکثر اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ انسان کی رغبت اُس لذت کی طرف کم ہوجاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ حالت پیدا ہوجاتی ہے کہ اعصاب پر اُسکا کوئی اثر نہیں ہوتا روحانی لذتوں کا یہ حال نہیں ہے۔ اس قسم کی لذتیں ہر لحظہ اور ہر آن میں بدل جاتی ہیں۔ اور اُن سے نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اُن دوستوں کی حالت پر خیال کرو جن میں روحانی

اور باطنی تعلق ہو اور جنکی محبت محض جسمانی لذتوں پر مبنی نہیں ہو۔ ان میں سے ایک کی روح دوسرے کی روح میں پیوست ہوجاتی ہو۔ اُن کو ہر صحبت میں نیا لطف اور ہر ملاقات میں نیا سرور حاصل ہوتا ہو۔ وہ کوئی بات کرتے ہوں۔ کسی کام میں مشغول ہوں۔ انکو ہر بات اور ہر کام میں ایک جدید لذت حاصل ہوتی ہو، اور اُن کی عقل کو ایک نئی غذا ملتی ہو۔ ہر خیال اور ہر جذبہ اُن کی زندگی پر ایک نئی روشنی ڈالتا ہو اور اُنکی الفت اور محبت کو ترقی دیتا ہو۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہو کہ سچی محبت میں کسقدر طاقت ہو۔ اور اُسکو انسان پر کسقدر غلبہ حاصل ہو۔ شریف انسان کے لیئے دنیا میں اس سے بڑھکر کوئی کامیابی اور کوئی خوشی نہیں ہو۔ اگر دولت زندگی کی زینت ہو تو اصلی محبت کو خود زندگی کہنا ذرا بھی غلط نہیں ہو۔ وہ مرد اور عورت جنکی تعلیم و تربیت میں تناسُب نہ ہو، اس خوشی اور اس سعادت سے بالکل محروم ہیں۔ اگر کوئی نکتہ چیں یہ کہے کہ اچھا فرض کرو کہ مرد تعلیم یافتہ ہو اور عورت تعلیم یافتہ نہیں ہو۔ اس صورت میں یہ ممکن ہو کہ اگر مرد کو عورت کے ساتھ الفت نہ ہو تو عورت کو مرد کے ساتھ ہو۔ مگر ایسا خیال کرنا اپنے تئیں ایک خطرناک غلطی میں ڈالنا ہو۔ کیونکہ وہ اصلی محبت جسکی ترکیب جسمانی اور روحانی عنصروں سے ہوتی ہو اُس کی بنیاد اس بات پر ہو کہ دونوں ایک دوسرے کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ مگر ایک کو دوسرے کی نسبت عزت کا خیال اُسیوقت پیدا ہوتا ہے کہ یہ اُس دوسرے کی قدر و قیمت سے واقف ہو۔ اور یہ ممکن نہیں ہو کہ جاہل عورت تربیت یافتہ شوہر کی قدر و قیمت جان سکے۔

جن لوگوں کی شادی ہوچکی ہو، اگر تم اُن سے دریافت کرو کہ آیا اُنکی عورتیں اُن سے دلی محبت رکھتی ہیں؟ تو وہ یہی جواب دینگے کہ ہاں بیشک ہماری عورتیں ہم سے دلی محبت رکھتی ہیں مگر اصل میں اُنکا خیال درست نہیں ہو۔ وہ خود دھوکے میں ہیں اور اصلی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ میں نے بہت سے خاندانوں کی حالات دریافت کیئے ہیں اور اُن کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ یہ وہ خاندان تھے جنکی نسبت کہا جاتا تھا کہ اُن میں ہر بیوی اور شوہر میں کامل محبت اور دلی اتفاق ہو مگر افسوس ہو کہ میں نے اُن میں کوئی مرد نہیں پایا۔ جو اپنی بی بی سے دلی الفت رکھتا ہو۔ نہ کوئی عورت دیکھی جو اپنے شوہر کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتی ہو۔ یہ ظاہری اتفاق جو بہت سے گھروں میں پایا جاتا ہو اسکا مطلب بس اتنا ہی ہو کہ ان میں تکرار اور لڑائی نہیں ہو۔ مگر ایسا کیوں ہو؟ اسکا سبب یہ ہو کہ یا تو شوہر تنگ اور مجبور ہوکر خاموش ہوگیا یا عورت نے شوہر کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا ہو کہ وہ اپنی ملک اور جائداد میں جسطرح چاہے تصرف کرے، یا عورت اور مرد دونوں جاہل اور ناتربیت یافتہ ہیں جو عمدہ زندگی کی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ اور اصلی خوشی اور اصلی کامیابی کے راز سے بیخبر ہیں۔ یہ اخیر حالت مصر کے خاندانوں میں عام طور پر ہے۔ اور اُس میں کسیقدر خوشی اور کامیابی کی جھلک پائی جاتی ہو گو کہ وہ اصلی کامیابی اور اصلی خوشی نہ ہو۔ مگر پہلی دو صورتوں میں اتفاق بہت بڑی قیمت دیکر حاصل ہوا ہو۔ کیونکہ ان صورتوں میں ایک نے دوسرے کے فائدے کے لیئے اپنے تئیں بالکل فنا کردیا ہو۔ ان حالتوں سے قطع نظر کرکے اگر شاذونادر کوئی ایسی مثال پائی جائے جس میں مرد اور عورت میں گہرا اور دلی تعلق ہوا اور دونوں کو ایک درجے پر تعلیم و تربیت نہ دی گئی ہو تو یہ نادر مثال اُس قاعدہ کلیہ کو نہیں توڑ سکتی جو اوپر بیان ہوچکا ہو عام طور پر مرد اور عورت اس نعمت سے محروم اور اس سعادت سے بے بہرہ ہیں۔ محبت کا نہ ہونا عام طور پر

رد کی طرف سے ہی کیونکہ عورت علم و شایستگی میں اس سے بہت دور پیچھے رہ گئی ہی۔

کوئی بات ایسی نہیں ہی جسپر مرد اور عورت باہم گفتگو کریں اور دونوں کو تبادلۂ خیالات سے یکساں خوشی ہو۔ اور کوئی رای ایسی نہیں ہی جسکو دونوں دلی اتفاق سے تسلیم کر سکیں۔ اسکا سبب ظاہر ہی کیونکہ مرد ان خیالات میں محو رہتا ہی، جو جذبات اُسکے سینے میں موجزن ہوتے ہیں، جن کاموں میں اُسکی زندگی بسر ہوتی ہی اور جن کیفیتوں سے اُسکا دل مسرور ہوتا ہی، اُن سے عورت کو کوئی علاقہ نہیں۔

سب سے بڑھکر یہ ہی کہ وہ کام جنکے لیئے عورت پیدا کی گئی ہی اور جو قدرتی طور پر عورتوں ہی کے لیئے موضوع ہوئے ہیں اُن میں بھی مرد کو کوئی لطف نہیں آتا اور عورت کے ساتھہ بیزرگی اور بے لطفی کی زندگی بسر کرتا ہی۔ اکثر تعلیم یافتہ عورتیں نہ ہر روز بالوں میں کنگھی کرتی ہیں، نہ اُن کو سنوارتی ہیں، نہ ہفتے میں ایکدفعہ سے زیادہ نہاتی ہیں، نہ مسواک یا منجن کا استعمال کرنا جانتی ہیں، نہ دانت اور مُنہ صاف رکھتی ہیں، نہ لباس کی صفائی کا خیال رکھتی ہیں، نہ یہ جانتی ہیں کہ شوہر کے دل میں کن باتوں سے رغبت پیدا ہوتی ہی اور اُس رغبت کو کیونکر پایدار کریں اور اُسکو کسطرح ترقی دیں۔

اِسکا باعث یہ ہی کہ جو عورت تعلیم یافتہ نہیں ہی وہ مردوں کی اندرونی اُمنگوں اور خواہشوں سے ناواقف ہی اور نفرت اور رغبت پیدا ہونے کے اسباب سے بیخبر ہی۔ اِسی لیئے جب وہ چاہتی ہی کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اُن کی طبیعت مائل ہو، تو میلان طبیعت کے بالکل برخلاف کام کرتی ہی، اور اپنی کوشش میں ناکام رہتی ہی۔

عورت جو مرد کے ساتھہ محبت نہیں رکھتی، اُسکی وجہ اِسکے سوا نہیں ہی کہ وہ محبت کے معنی نہیں جانتی۔

عورت کا جو خیال مرد کی نسبت ہی، اگر ہم اُس خیال کی تحلیل کریں اور اُس کے اجزا کو جدا جدا کرکے دیکھیں تو وہ دو باتوں سے مرکب پایا جاتا ہی۔ ایک تو یہ کہ وہ مرد کو اپنے نفسانی جذبات کا پورا کرنیوالا خیال کرتی ہی۔ دوسرے یہ کہ وہ اُسکو اپنے لیئے اسباب معیشت کا مہیا کرنیوالا سمجھتی ہی۔ وہ گہرا تعلق جسکا ذکر ہم کر چکے ہیں اور جسکے سبب سے میاں بیوی ایک جان اور دو قالب ہو کر رہتے ہیں اور جس کے لیئے ایک دوسرے کو اپنے مذاق کے موافق انتخاب کرتا ہی اور دوسرے ہزاروں آدمیوں سے وہ تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا اور جس کے سبب سے دونوں ملکر ایک کامل وجود کہلاتے ہیں۔ اور جس کے لیئے ہر ایک اپنی ہستی کو بھول جاتا ہی اور اپنے رفیق اور محبوب کے سوا دوسرا خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔ اس کی کوئی مثال ہم اپنے ملک میں نہیں پاتے، ماں کو اپنی اولاد سے جو محبت ہوتی ہی وہ قدرتی ہی۔ اگر اس درجے کی محبت قدرتی نہ ہو اور دو شخصوں کی درمیان پائی جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اُن کو دنیا میں نعمت کبریٰ اور سعادت عظمیٰ حاصل ہی۔

مصر کی ہر عورت اپنے شوہر میں اس سے زیادہ کسی بات کی جستجو نہیں کرتی کہ اُسکا قد و قامت دراز ہی، یا کوتاہ۔ اُسکا رنگ گورا ہی یا کالا۔ شوہر کی عقلی اور اخلاقی پاکیزگی، اُسکی عمدہ سیرت، اُسکی پاکدامنی، اُسکی نازکخیالی، اُسکی علمی قابلیت، اُسکے شایستہ کام، اُسکے اعلیٰ مقاصد، اور وہ تمام صفات جن سے وہ اپنے ملک اور قوم میں ممتاز اور معزز خیال کیا جاتا ہی۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہی جو عورت کے خیال میں آئے۔ یا اُسکے دل میں شوہر کی وقعت اور عزت پیدا کرسکے۔

پس سب سے پہلا شخص جو مرد کی اِن صفات کی پروا نہیں کرتا، اور جو اُسکی قدر و قیمت سے جاہل ہی، وہ

اُس کی عورت ہی۔

ہم مصر میں دیکھتے ہیں کہ ہماری عورتیں اُن مردوں کی تعریف کرتی ہیں جن کے ساتھ کوئی شریف آدمی مصافحہ کرنا کبھی نہیں چاہتا اور اُن مردوں سے نفرت کرتی ہیں جنکے وجود کو ہم اپنی قوم کے لیئے مایۂ نازش و افتخار جانتے ہیں۔ عام طور پر جاہل عورتوں کی رای مردوں کی نسبت اُسی درجے کی ہوتی ہی جس درجے پر اُن کی عقل و فراست ہی۔ سب سے اچھا مرد اُن کے نزدیک وہ ہی جو شب و روز اُن کے ساتھ لہو و لعب میں مصروف رہے اور جس کے پاس اسقدر دولت ہو کہ اُن کے لیئے زرق برق لباس چمک دمک کے زیور، میوے اور شیرنیاں اور عمدہ غذائیں مہیا کر سکے۔ اسیطرح اُن کے نزدیک سب سے زیادہ حقیر اور قابلِ نفرت وہ مرد ہی جو کتابوں کے مطالعے میں محو رہتا ہو جب کوئی عورت اپنے شوہر کو پڑھنے لکھنے میں مشغول دیکھتی ہی تو اُسپر غضبناک ہوتی ہی، اور اُن کتابوں اور علموں پر لعنت بھیجتی ہی جنھوں نے اُسکو عورت کے ساتھ لہو و لعب کرنے سے باز رکھا۔ اور اُسکے اوقاتِ عیش میں خلل ڈالا۔ اور اُسکو اُن حقوق سے محروم رکھا جو شوہر کی گردن پر ہیں۔ اِس سے مرد اور عورت میں دائمی تکرار اور مخالفت کی بنیاد پڑجاتی ہی۔ ابھی ایک لڑائی ختم ہونے نہیں پاتی کہ دوسری لڑائی شروع ہو جاتی ہی۔ بیچارہ مرد کوئی تدبیر نہیں پاتا۔ جس سے اِن دو دشمنوں یعنی عورت اور علم کے درمیان صلح کرا سکے۔ وہ اُس مرد سے بھی زیادہ حیران اور پریشان ہوتا ہی جس کے دو بیویاں ہوں۔ کیونکہ بسا اوقات دو سوکنوں میں آشتی اور صلح کا ہونا ممکن ہی لیکن یہ ممکن نہیں ہی کہ جاہل عورت اور تربیت یافتہ مرد میں کسیطرح موافقت ہو جائے۔

مصر کی کوئی عورت اِس بات پر راضی نہوگی کہ وہ ایک عالم کی صحبت میں زندگی بسر کرے۔

یہ ظاہر ہی کہ جس مرد کی یہ حالت ہو، اُسکی علمی قابلیت رفتہ رفتہ بالکل ناپید ہو جاتی ہی کیونکہ کسی شخص کا علم بار آور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسکا دماغ افکار سے خالی نہو، اور جب تک کہ اُسکی طبیعت کو کامل اطمینان اور سکون میسر نہ آئے۔ مرد تو آرام اور اطمینان چاہتا ہی جسکی کنجی اُسکی عورت کے ہاتھ میں ہی مگر وہ اُسکے دینے میں بخل کرتی ہی۔ اس حالت میں کیونکر ممکن ہی کہ کوئی تعلیم یافتہ مرد اپنے علم سے کام لے سکے، اور اپنے اعلیٰ ارادوں کو عمل میں لا سکے۔

اِس بیان سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہی کہ مصری عورتیں عام طور پر محبت کی لذّت سے ناواقف ہیں۔ خاصکر وہ عورتیں جنکے شوہر تعلیم یافتہ ہوں اور اپنے تئیں مفید کاموں میں مشغول رکھتے ہوں۔

ایک معترض کہ سکتا ہی کہ "جس محبت کا تمنے ذکر کیا بیشک وہ اعلیٰ درجے کی سعادت ہی۔ مگر ایسی نہیں ہی جسکے بغیر میاں بیوی کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ کیونکہ اگر میاں بیوی میں ایسی اعلیٰ درجے کی محبت نہ ہو تو یہ بات ممکن ہی کہ اِس نقصان کو اور بہت سی صفات پورا کر سکیں۔ ہمارے نزدیک تو اتنا ہی ہونا کافی ہی کہ عورت مرد کی غمخوار اور اُسکی شریکِ رنج و راحت اور زندگی کی بعض ضرورتوں میں اُسکی معاون و مددگار ہو"۔

ہاں معترض کیطرح ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ عورت مرد کی ہمدم و ہمراز اور اُس کی دست و بازو ہو مگر ایسا ہونا کب ممکن ہی جبکہ عورت جاہل و ناتربیت یافتہ ہو۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ کسانوں کی عورتیں باوجود جہالت کے اپنے مردوں کے ہر کام میں شریک رہتی ہیں۔ اور گھر کے اندر اور باہر ہر قسم کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ مگر اس حالت میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا اسلیئے ممکن ہی کہ دیہات کی زندگی نہایت سادہ اور وحشیانہ ہی۔ اور دہقانوں کی خانگی ضرورتیں بہت کم ہیں۔ مگر

اُن شہروں میں جہاں شائستگی ترقی کرگئی ہے، جہاں انسانی ضرورتوں کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے، جہاں معیشت کے طریقے بہت اور مختلف ہیں، جہاں ایک گھر کا انتظام کرنا ایک بڑے کارخانے کے انتظام کرنے کی برابر ہے۔ اگر وہاں عورت کے ہاتھ خانہ داری کی باگ دیجائے تو بغیر تعلیم و تربیت کے اُس انتظام کا چلانا ناممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانہ داری کا فن آجکل اسقدر وسیع ہوگیا ہے کہ اُسکے لیئے بہت سے علوم و فنون کے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ آجکل عورت ہی کے ذمّہ یہ کام ہے کہ وہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ ایسی لیاقت اور غور و فکر سے تیار کرے کہ گھر کی مالی حالت میں کبھی مشکلات پیش نہ آئیں۔ نوکروں کے کام کی نگہبانی بھی اُسی کے ذمّہ ہے تاکہ وہ ایک لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہوں۔ کیونکہ بغیر کامل نگرانی کے ممکن نہیں ہے کہ خدمتگار اپنے کام کو عمدگی سے انجام دیں۔ عورت ہی کا یہ فرض ہے کہ وہ گھر کو شوہر کی نظر میں دلچسپ اور مسرت خیز بنائے تاکہ جب وہ محنت سے فارغ ہوکر گھر میں قدم رکھے تو در و دیوار سے اُسکو اُنس ہو اور اس چار دیواری میں وہ آرام و راحت پائے۔ گھر میں چند ساعت قیام کرنا اُسکے لیئے نعمت عظمیٰ ہو۔ کھانے اور پینے۔ سونے اور جاگنے میں اُسکو انتہا کا لطف آئے۔ بازار، یا قہوہ خانے کی صحبت سے اُسکو دلی نفرت ہوجائے

عورت ہی کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اولاد کو جسمانی۔ عقلی اور اخلاقی ہر قسم کی تربیت سے آراستہ کرے

یہ ظاہر ہے کہ ان اصولوں کو جنکا ذکر اجمالاً ہوا۔ موجودہ زندگی کے جزئیات پر تفصیل کے ساتھ منطبق کرنا ایسا کام نہیں ہے جسکے لیئے ایک تربیت یافتہ دماغ کی ضرورت نہ ہو۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ جبتک عورت کی عقل وسیع نہ ہو۔ دماغ مختلف معلومات سے منوّر نہ ہو، مذاق صحیح اور طبیعت شائستہ نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خانگی انتظام کو عمدگی اور خوبی کے ساتھ چلا سکے۔ خاصکر اولاد کی تربیت تو بغیر تربیت یافتہ ماں کے ہو ہی نہیں سکتی

(عبد العلی خاں)

ریاضتِ جسمانی

مثل مشہور ہے کہ "حرکت میں برکت ہے"، حرکت کا لفظ عام ہے جسمانی حرکت ہو، یا عقلی و دماغی، ہر ایک حرکت انسان کیلئے مفید ہے۔ سائنس میں یہ اصول مسلّم مانا گیا ہے کہ جو اعضا یا قوےٰ سکون کی حالت میں رہتے ہیں وہ مُردہ اور معطل ہوجاتے ہیں اور اپنا کام نہیں دیسکتے۔ اگر ہم کجلی بن یا ہمالیہ کے سادھوؤں کی طرح ایک ہاتھ ہمیشہ اونچا رکھیں یا ایک پاؤں پر مدتوں کھڑے رہیں تو وہ ہاتھ اور پاؤں ہمیشہ بیحس و حرکت ہوجائینگے اور اپنے کام سے رہ جائینگے۔ ایک آنکھ پر اگر مدتِ دراز تک پٹی بندھی رہے تو وہ دیکھنے سے محروم ہوجاتی ہے۔ یہ تو جسمانی اعضا ہیں اگر دماغی قُوےٰ میں سے کسی قوت سے کام نہ لیا جائے اور ایک عرصۂ دراز تک اُسکو بیکار رکھا جائے تو وہ فی الحقیقت بیکار ہوجاتی ہے۔ دماغ میں بہت سی قوتیں ہیں اور انھیں قوتوں کے لحاظ سے دماغ کے مختلف حصے ہیں جیسا کہ فرنیالوجی (علمِ دماغ) میں ثابت کیا گیا ہے۔ اِس علم کے جاننے والوں نے مختلف جانوروں پر تجربے کیئے ہیں اور بتایا ہے کہ دماغ کے کسی حصے پر اگر تیز مخدّر دوا کا پلاستر چڑھا دیا جائے تو وہ قوت جو اُس حصے میں ہے اپنا عمل نہیں کریگی۔ اُنھوں نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ قدرتی طور پر انسان میں بعض قوتیں طاقتور اور بعض کمزور ہوتی ہیں۔ اگر اقتضائے حالات کی رُو سے

اُن قوتوں کے کام میں لانے کی ضرورت پیش آجائے جو کمزور ہیں تو وہ بتدریج طاقتور ہو جاتی ہیں اور طاقتور قوتیں جن سے کام نہیں لیا گیا رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتی ہیں۔ مگر کمزور قوتوں کے زندہ اور طاقتور کرنے میں ایک زمانۂ دراز صرف ہوتا ہے اور اسکے لیے سخت استقلال و محنت اور جفاکشی کی ضرورت ہے۔ برخلاف اُن کے اگر طاقتور قوتوں کو جنبش دیجائے تو وہ اپنا کام سُرعت کے ساتھ کرنے لگتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ جو لوگ اپنی طبیعت کے قدرتی میلان کا خیال نہیں رکھتے اور طاقتور قوتوں کو چھوڑ کر کمزور قوتوں سے دنیا میں کام لینا چاہتے ہیں، وہ اگر استقلال اور اولوالعزمی سے کام کریں تو ایک مدت کے بعد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ عموماً ناکام اور نامراد رہتے ہیں اور قسمت کے جھوکوں میں برباد ہو جاتے ہیں۔

عقلی اور دماغی قوتوں سے صحیح طور پر کام لینا بھی اس بات پر موقوف ہے کہ انسان کا جسم تندرست اور توانا ہو جن لوگوں کے جسم توانا اور تندرست نہیں ہیں اُن کی تمام قوتیں آہستہ آہستہ دھیمی پڑجاتی ہیں اور عقلی اور دماغی قوتوں کی چمک دمک باقی نہیں رہتی شگفتگی اور زندہ دلی اُسی جسم میں رہ سکتی ہے جو تندرست ہو اور چستی اور ہوشیاری اُسی بدن میں ہو سکتی ہے جس میں خون اپنی قدرتی رفتار پر گردش کر رہا ہو۔ جسمانی تندرستی اور توانائی کا جسمانی ریاضت پر مدار ہے۔ اکثر امراض جو طب کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اُن کی بنیاد اکثر جسمانی کمزوری ہوا کرتی ہے۔ جب ہم جسمانی ریاضت میں مشغول ہو جاتے ہیں تو امراض بھی آہستہ آہستہ کافور ہو جاتے ہیں کیا سچا مقولہ ہے ایک حکیم کا کہ "اَلْعَقْلُ السَّلِیْمُ فِی الْجِسْمِ السَّلِیْمِ" یعنی جو بدن بیماریوں سے خالی اور تندرست ہیں اُنھیں میں تندرست عقل رہ سکتی ہے۔

جس قوم میں لوگ عام طور پر دوڑ دھوپ میں رہتے ہوں اور محنت اور جفاکشی کے عادی ہوں، وہی قوم دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔ ہر قوم میں تقریباً اسی غرض سے مختلف کھیل تماشے، میلے ایجاد ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کو محنت اور ریاضت کی عادت ہو۔ یونان کی تاریخ کا مطالعہ کرنیوالے جانتے ہیں کہ اُن میں کسقدر محنت اور جفاکشی کے کھیل ہوا کرتے تھے اور کسقدر علما اور حکما اُن میں پیدا ہو چکے ہیں۔ آجکل یورپ کی اقوام میں بھی طرح طرح کے کھیل ہیں جن سے جفاکشی اور محنت کی تعلیم دیجاتی ہے۔ جو فوج آرام طلب ہے وہ نہ اپنے ملک کی حفاظت کر سکتی ہے، نہ دشمنوں پر غالب آسکتی ہے۔ جو قوم عیش پرستی اور تن آسانی میں محو رہتی ہے، وہ نہ علم میں ترقی کر سکتی ہے، نہ شائستگی میں۔

عام انسانوں میں کسان اور مزدور اور محنت پیشہ لوگ بہ نسبت آسودہ اور متمول لوگوں کے زیادہ تندرست اور طاقتور ہوتے ہیں۔ علاّمہ مقریزی نے مصر کے حالات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "وَاَھْلُ الرِّیْفِ اَکْثَرُ حَرَکَۃً وَرِیَاضَۃً مِّنْ اَھْلِ الْمُدُنِ وَلِذٰلِکَ ھُمْ اَصَحُّ اَبْدَاناً لِاَنَّ الرِّیَاضَۃَ تُصَلِّبُ اَعْضَائَھُمْ وَتُقَوِّیْھَا"[1]

یہی حال پہاڑی باشندوں کا ہے جنکو ہمیشہ نشیب و فراز میں اُترنا اور چڑھنا پڑتا ہے اور اسی باعث سے وہ نہایت طاقتور اور تندرست رہ سکتے ہیں۔ میدانوں کے باشندوں میں جو لوگ پہلوانی کرتے ہیں یا ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں، یا ایسے پیشے کرتے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں کو حرکت دینی پڑتی ہے، وہ بھی نہایت تندرست رہتے ہیں۔

ریاضتِ جسمانی سے کیا فائدہ ہے؟ اسکی نسبت علامہ حسن بن عبداللہ نے اپنی کتاب آثار الاُوَل فی ترتیب الدُّوَل میں لکھا ہے کہ "خدا نے انسان کے بدن میں مختلف اخلاط جو ایک دوسرے پر غالب

[1] دیکھو الخطط والآثار علامۂ مقریزی جلد اوّل صفحہ ۵۴۔

آنا چاہتے ہیں، پیدا کیے ہیں۔ یہ اخلاط مختلف غذاؤں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر خلط کے لیے خاص جگہ مقرر ہے جہاں اُسکے فضلے جمع ہوتے ہیں۔ خاص خاص منفذ اور مخرج ہیں جہاں سے وہ فضلے نکلتے رہتے ہیں۔ چونکہ فضلے انسان کے جسم میں بیکار اور مضر ہوتے ہیں اسلیے اگر جسم کو سکون ہو اور حرکت نہ دیجائے تو وہ فضلے جہاں جمع ہوتے ہیں وہیں ٹھر جاتے ہیں۔ جب وہ رُکتے ہیں اور باہر نہیں نکلتے تو رفتہ رفتہ پھیلنا شروع کرتی ہیں۔ اور برابر بڑھا کرتے اور متعفن ہوا کرتے ہیں۔ آخرکار یہ متعفن فضلے بدن کی اصلی حالت میں خلل ڈالتے ہیں اور صحت قائم نہیں رہتی۔ اگر کسی قسم کی ریاضت کیجائے اور بدن کو حرکت دیجائے تو وہ فضلے تحلیل ہوجاتے ہیں اور نکلنے لگتے ہیں۔ یہ حرکت ہی میں برکت ہے کہ وہ طبیعت کو اُسکے اصلی افعال پر جاری رکھتی اور صحت کو قائم رکھتی ہے یہی حکمت ہے کہ قدرت نے ہر انسان کے لیے ورزش کی حرکت کو لازم کردیا ہے۔ اور ہر انسانی گروہ نے ورزش جسمانی کے لیے خاص خاص طریقے ایجاد کرلیے ہیں۔"

علامۂ ممدوح کا بیان اگرچہ طبِ قدیم کے اصول پر مبنی ہے مگر وہ جدید طب کی رُو سے بھی اسیقدر صحیح ہے جسقدر کہ اُسکو صحیح ہونا لازم ہے۔ اسکے بعد اُنہوں نے مختلف قسم کی ورزشوں کا بیان لکھا ہے جو اُس زمانے میں جاری تھیں۔ مثلاً گوی و چوگاں۔ گھوڑے کی سواری۔ صبح کی ہواخوری۔ دوڑکر چلنا۔ کُشتی کرنا۔ بوجھ اُٹھانا تیراندازی۔ شباک اور طابہ (اُس زمانے کے کھیل جن سے ہاتھوں اور کلائیوں کی ورزش مقصود تھی)

علامۂ ممدوح کے بیان سے یہ نتیجہ بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مسلمانوں میں عام طور پر ورزشِ جسمانی کا شوق تھا۔ اور مختلف قسم کی ورزشیں جاری تھیں۔ مگر ہمکو اپنے زمانے کے مسلمانوں پر افسوس آتا ہے جنکو ریاضتِ جسمانی کا شوق نہیں ہے اور بجائے اُسکے ایسی بدکاریوں اور بےاعتدالیوں میں سرگرم رہتے ہیں جن سے قوم کی بربادی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔

غدر ۵۷ستاون سے پہلے دہلی اور دہلی کے سوا بہت سے شہروں کے شریف مسلمانوں میں عام طور پر ورزشِ جسمانی کا شوق تھا۔ اور وہ عموماً تندرست اور توانا تھے۔ پُرانی فیشن کے لوگ تو اب برگِ خزاں دیدہ کیطرح برباد ہوگئے اور جو باقی ہیں وہ مرتے جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ نئی نسلیں پھیلتی جاتی ہیں۔ نئی نسلوں کے نوجوان کئی قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ نوجوان ہیں جن کو علم سے سروکار نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اکھاڑوں کی زینت ہیں اور لنگر لنگوٹ کس کر دنگلوں میں اُترتے ہیں۔ علم کے نہونے سے ان کے اخلاق شرافت سے کوسوں دور رہ گئی ہیں۔ یہی گروہ ہے جسکی ذلیل حالت دیکھکر شریفوں نے ریاضتِ جسمانی بالکل ترک کردی ہے۔ اور اُسکو اپنے اور اپنی اولاد کے لیے موجبِ ننگ وعار جانتے ہیں

دوسرا گروہ وہ ہے جو اسکولوں کی زینت ہے۔ اس گروہ کو انگریزی کھیلوں کی طرف رغبت ہے مگر یہ رغبت اسکولوں کی چار دیواری میں رہ جاتی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ کبھی نہ کرکٹ کا نام لیتے ہیں، نہ فٹ بال کا وہ سخت ترین دماغی محنت اور جفاکشی جو سرکاری ملازمت میں اُن کو کرنی پڑتی ہے اُن کو اس قابل نہیں رکھتی کہ وہ تندرستوں میں شمار ہوسکیں، یا مدت تک زندہ رہسکیں۔ اُن کے بدن کے عضلات ڈھیلے۔ جسم کمزور۔ آنکھیں بیٹھی ہوئی۔ رنگت زرد۔ دماغ ضعیف اور قوی مضمحل ہوجاتے ہیں۔ وہ اکثر دائمی قبض یا بدہضمی کے شاکی رہتے ہیں۔ اُن کے مزاج کمزوری کے سبب سے چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔ سوسائٹی سے نفرت ہوجاتی ہے۔ نہ وہ دین کے کام کے رہتے

ہیں نہ دنیا کے۔

کاش یہ گروہ اُس قوم کی تقلید کرتا جو دماغی محنت کے ساتھ ریاضتِ جسمانی کو کبھی نہیں چھوڑتی اور جسکے ہر فرد کے چہرے سے تندرستی اور زندہ دلی اور قوت اور شگفتگی ٹپکی پڑتی ہے۔ یہ وہ قوم ہے جسکی علم ادب کی ستایش میں اُن کی زبان سرگرم رہتی ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کچھ عیب اور کچھ خوبیاں نہوں۔ مگر اُس قوم پر ہزار افسوس ہے جس میں جدّت کا مادّہ نہ ہو بلکہ نری تقلید کی عادت ہو۔ اور تقلید بھی خوبیوں کی نہیں بلکہ بُرائیوں کی۔ ہماری قوم کے نوجوان اگر شایستہ قوموں کی خوبیوں کی تقلید کرتے اور اُن کی بُرائیوں سے نفرت کرتے تو کیا اچھا ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ اُن میں یہ عمدہ عادت نہیں ہے۔

اگر سچ پوچھو تو مسلمان نوجوانوں کے لیئے بہت کم امور ہیں جن میں اُن کو غیر قوموں کی تقلید درکار ہے۔ ریاضتِ جسمانی اُنھیں امور میں سے ہے جن میں اپنے ہی اسلاف کی تقلید ہو تو ہو غیر قوموں کی تقلید کی چنداں حاجت نہیں ہے۔

ہماری قوم کی گذشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں ریاضتِ جسمانی کا ہر شخص عام طور پر شائق تھا۔ سلاطین اُمرا۔ عُلما۔ عوام سب ریاضتِ جسمانی میں مشغول رہتے تھے۔ بڑے بڑے مقدس علما ریاضت کی تاکید کرتے ہیں بلکہ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ مذہب اسلام کو ایک نظامِ ریاضت قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ مذہبِ اسلام نے جہاں روحانی ریاضت کا خیال رکھا ہے، وہاں جسمانی ورزش کا بھی لحاظ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس باب میں علامہ ابن القیم نے جو اعلے درجے کے محدث تھے اور جو مقدس علما کے گروہ میں شمار کیئے جاتے ہیں، اپنی کتاب زاد المعاد میں جو کچھ تحریر کیا ہے، اُسکا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ [1]

وہ لکھتے ہیں کہ "یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ بدن کے باقی رہنے کے لیئے کھانے پینے کی حاجت ہے۔ مگر تمام غذا جزوِ بدن نہیں ہوتی بلکہ ہر ہضم کے بعد کچھ نہ کچھ غذا بدن میں باقی رہتی ہے، اگر وہ جمع ہوتی رہے تو کچھ عرصے کے بعد اُسکی کمیت اور کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ کمیت کا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ بدن میں سُدّے پیدا ہو جاتے ہیں اور ثقل و گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اگر اُن سُدّوں اور فضلوں کو دست آور، یا قے آور دواؤں سے خارج کیا جائے تو اُن دواؤں سے بدن کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کیونکہ اکثر دوائیں زہریلی ہوتی ہیں۔ اِس کے علاوہ فضلوں کے ساتھ بہت سا مفید اور صالح مادّہ بھی ضرور نکل جاتا ہے۔ فضلوں کی کیفیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یا وہ گرم ہو کر متعفن ہو جاتے ہیں، یا سرد ہو کر حرارت غریزی کو کم کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ واضح طور پر نکل آتا ہے کہ غذا کے فضلوں سے جو سُدّے بدن میں پیدا ہو جاتے ہیں خواہ اپنے حال پر چھوڑ دیئے جائیں یا اُن کے نکالنے کی کوشش کیجائے، ہر حالت میں مضرت رساں ہیں۔ البتہ حرکت نہایت قوت کے ساتھ فضلوں کے پیدا ہونے کو روکتی اور بدن کے اعضا کو گرماتی ہے۔ اور جو فضلے پیدا ہو گئے ہوں اُنکو بہاتی رہتی ہے۔ حرکت کیساتھ فضلے دیر تک جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اس سے بدن میں پھرتی اور چستی اور غذا کے قبول کرنے اور اُس کے جزوِ بدن ہونے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ بدن کے تمام جوڑ سخت ہوتے ہیں۔ رگ پٹھے طاقتور ہو جاتے ہیں۔ حرکت کی برکت سے انسان تمام مادّی امراض اور اکثر مزاجی امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ اس ہی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریاضت کرنا نہایت مفید ہے مگر اُسکو

[1] دیکھو زاد المعاد علامہ ابن قیم جلد دوم صفحہ ۸۵ و ۸۶۔

لیئے اعتدال کی شرط ہے۔ اگر معتدل ریاضت مناسب وقت پر کی جائے تو انسان تندرست اور توانا رہتا ہے۔ معتدل ورزش سے بشرہ سرخ ہوتا۔ بدن بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ افراط کی حالت میں پسینہ زیادہ آتا ہے، اور جسم کمزور ہوتا ہے۔ انسان میں جتنی قوتیں ہیں، ورزش سے ان میں ترقی ہوسکتی ہے۔ ہر عضو کے لیئے ایک طرح کی ریاضت مخصوص ہے ۔ مثلاً پھیپھڑے کی ریاضت گانے اور بلند آواز سے تقریر کرنے میں ہے۔ کان کی ریاضت اونچی نیچی آوازوں کے سننے میں ہے۔ پاؤں کی ریاضت بتدریج آہستہ اور تیز قدم اٹھانے میں ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ گھوڑے کی سواری۔ تیر اندازی۔ کشتی ۔ دوڑنا تمام بدن کی ریاضت ہے۔ اور اس سے مزمن امراض جذام۔ استسقاء۔ قولنج وغیرہ دور ہوتی ہیں۔ اسیطرح نفس ناطقہ کی ریاضت تعلیم و تربیت ۔ صبر و تحمل۔ ثابت قدمی و دلیری۔ فیاضی اور نیکی وغیرہ عمدہ اور پاکیزہ اخلاق میں ہے۔ صبر۔ محبت۔ شجاعت۔ اور احسان ایسے اخلاق ہیں جن سے نفس کی تدریج ریاضت ہوتی ہے۔ اور آخرکار یہ صفات انسان کے نفس میں پورے طور پر مرکوز ہو جاتی ہیں

اگر ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ ریاضت پر غور و فکر کی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بدن کی صحت اور قویٰ کی حفاظت کے لیئے سب سے کامل طریقہ اور دنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہے۔ کچھ شک نہیں ہے کہ نماز ایک قسم کی ریاضت ہے جس سے بدن کی صحت قائم رہتی ہے۔ اخلاط اور فضلے تحلیل ہوتے ہیں۔ یہ اس فائدے کے علاوہ ہے جس سے ہماری مراد ایمان کی حفظ صحت اور آخرت کی سعادت ہے۔ رات کو عبادت کے لیئے کھڑا ہونا بھی منجملہ اسباب حفظان صحت کے ہے۔ اس سے روح اور دل کو نشاط حاصل ہوتا ہے اور تمام جسمانی کلفتیں دور ہوتی ہیں چنانچہ احادیث میں اس امر کی طرف صاف صاف اشارہ پایا جاتا ہے۔ روزے میں بھی حفظ صحت اور بدن اور نفس کی ریاضت مقصود ہے جسکا کوئی صحیح الفطرت شخص انکار نہیں کرسکتا۔ حج کے لیئے سفر کرنا بھی حفظان صحت کا باعث ہے۔ یہی حال تمام مذہبی اعمال کا ہے۔ گھوڑ دوڑ۔ تیر اندازی (جو سنت نبوی ہیں) خانگی ضرورتوں کے لیئے چلنا پھرنا۔ دوستوں اور عزیزوں کے پاس جانا اور ان کے حقوق ادا کرنا۔ بیماروں کی عیادت کرنا۔ جنازے کے ساتھ قبر تک جانا۔ جمعہ اور جماعت کے لیئے معین اوقات میں مسجدوں میں جانا۔ نماز کے لیئے وضو کرنا اور غسل کرنا۔ یہ سب حرکتیں ریاضت میں داخل ہیں جو کم و بیش حفظ صحت کی معین و مددگار اور ناقص اور مضر صحت فضلوں کے خارج کرنے کا باعث ہیں۔ ''

علامہ ابن قیم کی تحریر اس دعوے کے ثابت کرنیکے لیئے کافی ہے کہ اسلام بلند آواز سے ریاضت جسمانی کی تاکید کرتا ہے اور تاکید ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے تمام اعمال میں ریاضت روحانی کے ساتھ ریاضت جسمانی کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

اس تحریر کے بعد کوئی مسلمان اس امر میں شک کرنے کی گنجایش نہیں رکھتا کہ جسمانی ریاضت کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے اور دنیا اور آخرت کی سعادت اور کامیابی اسی ریاضت جسمانی پر مبنی ہے۔ مگر ہمکو نہایت افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے مسلمانوں نے ان تمام پاکیزہ اور بیش قیمت مذہبی ہدایتوں کو فراموش کر دیا ہے جن پر ہماری ترقی کا مدار ہے، اور جنکو دیگر اقوام عالم نے نہایت شد و مد سے اختیار کر لیا ہے۔

(وحید الدین سلیم)

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران { حاجی محمد اسمٰعیل خان
مولوی وحید الدین سلیم

جلد ۲	یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء	نمبر ۴

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک .... للعہ | قیمت فی پرچہ نمونہ ۵ر

مقام اشاعت - دفتر معارف - علی گڑھ

مطبع فیض عام واقع علی گڑھ میں چھپا

مقاصد اور قواعد

۱۔ یہ دو جزکا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو علیگڈھ سے شایع ہوا کریگا

۲۔ اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اُردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اس میں ہر قسم کے علمی، فلسفی، اخلاقی، مذہبی، تمدّنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی، عربی، اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید، دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شایع کیے جاینگے

۴۔ بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں

ا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں۔

ب۔ مولوی وحید الدین سلیم۔

۵۔ ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشاپردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمتیں درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں۔ اگر مہربانی سے وہ خود، یا اُن کے احباب اُنکے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُنکی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہونچائیں۔ جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶۔ اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دللو روپے جو نقد قیمت نہ بھیجے، یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرینگے خریداروں کی خدمتیں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہوگی۔ نمونے کے پرچے کیلئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کی جائیگی۔ اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہئے۔ اور اُن ہی کے نام قیمت آنی چاہیئے۔ جواب طلب امور کے لیے آدھ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷۔ جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں اُنسے اُمید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸۔ حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہینگے۔

۹۔ اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گُم ہوجائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا۔ ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰۔ جو حضرات مضامین اسلئے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے۔

۱۱۔ پتہ مولوی وحید الدین سلیم کا علیگڈھ دفتر رسالہ معارف ہے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲ | یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء | نمبر ۴

احکامِ اسلام کی پابندی اور اُنکا اثر عمر و صحت پر

زمانۂ حال میں جو سیلاب خیالات کے انقلاب کا موجب ہی۔ اُسنے مذہب اور اُسکے احکام کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا ہی۔ عہدِ قدیم میں مذہبی احکام باعتبارِ اکثر محض تقدس یا مذہبی ہونے کی حیثیت سے قابلِ تسلیم سمجھے جاتے تھے اب ہر شخص اُن کو اِس نظر سے دیکھتا ہی کہ آیا وہ اُس کی عقل کے مطابق ہیں یا نہیں۔ جن احکام کے وجوہ وہ اپنے اصول کے مطابق معقول خیال کرتا ہی، اُن کو مانتا ہی اور جن باتوں کی علت اُس کے فہم سے خارج سی ہی، یا اُس کے مانے ہوئے اصول کے موافق نہیں اُن کو علانیہ رَد کردیتا ہی۔ پہلے بھی لوگ مذہبی قیود سے آزاد ہوکر زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اِس بے قیدی کو سرمایۂ شرمندگی تصور کرتے تھے۔ اب یہ بے قیدی مایۂ فخر خیال کیجاتی ہی۔ اکثر احکام کی جانچ باعتبارِ صحت انسانی کے کیجاتی ہی اِس زمانے کے ایک نامآور مسلمان نے جنکی رای معاملاتِ اسلامی پر مسلم خیال کیجاتی ہی، شراب کی نسبت یہ بیان کیا تھا کہ حرمتِ خمر کا حکم ملکِ عرب کے لیئے ہی کیونکہ وہ ملک حد درجے کا حار یابس ہی۔ نہایت سرد ملک مثل کوہ قاف اِس حکم سے مستثنے ہیں۔ اسواسطے کہ وہاں کے باشندے بدون اِس آتشِ سیال کی مدد کے سردی کے حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے روزوں پر اِس بنا پر اعتراض کیا جاتا ہی کہ فاقہ صحتِ انسانی کے لیئے مضر ہی۔ اِس موقع پر یہ امر قابلِ لحاظ ہی کہ اِس قسم کے اعتراضوں اور بے قیدیوں کو جہاں تک نظرِ تأمل سے دیکھیے، اُن کا محرک دل آپ راحت طلبی اور خواہشِ نفسانی کو پاینگے۔ اِس تحریک کے بعد فلسفی کو کھینچکر جبریہ شہادت دلوائی جائیگی۔

حکمای حال نے تحقیقات سے دو زبردست اصول مقرر کیئے ہیں۔ اِن اصول نے علمی عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا ہی۔ اور گذشتہ حکمت کی صدہا باتوں کو جو یقینی اور قطعی مانی جاتی تھیں محض بے اصل اور بے بنیاد ثابت

کر دکھایا ہے - وہ اصول ہیں تجربہ اور مشاہدہ - جبتک کسی رای کو اِس معیار پر نہ پرکھا جائے اُس وقت تک وہ رای ہرگز قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتی - پس ہمکو یہ دیکھنے کے لیئے کہ فلاں امر صحت کے لیئے مضر ہے - اور فلاں شے صحت کے لیئے ضروری ہے، اُن لوگوں کی صحت کی تفتیش کرنی چاہیئے جنہوں نے امرِ اول کو اختیار کیا اور شئے ثانی سے احتراز - اگر اُن کی آنکھیں عینک کی محتاج نظر آئیں، اُن کے دماغ کمزوری کے چکر میں ہوں، اُن کے دلوں کو اختلاج کا دھڑکا لگ رہا ہو - اور اُن کی عمریں کوتاہ یا وبالِ جان ہوئی ہوں - تو ہمکو سمجھنا چاہیئے کہ بیشک احکام اپنی پابندی کیواسطے صحت کی قربانی چاہتے ہیں - اگر ہم اُن کی عمروں کو طویل اور قوی کو ساری عمر کا رفیق پائیں تو ہمکو اپنی خلاف واقع رایوں کے ساتھ فلسفے کو بدنام نکرنا چاہیئے -

سب سے زیادہ احکامِ اسلام کی پابندی کرنیوالے صوفیای کرام اور علما ہوئے ہیں - جو کتابیں صوفیہ و علما کے حالات میں لکھی گئی ہیں، اُن کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی عمریں عموماً زیادہ ہوئی ہیں - ہم نے تذکرۃ الحفاظ - ابن خلکان - شقائق نعمانیہ اور بعض رسائل شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ سے ایک فہرست مرتب کی ہے - اس فہرست میں ساڑھے آٹھ سو سے زائد علما کے سنہ ولادت و وفات لکھکر مدتِ عمر نکالی گئی ہے - قبل اسکے کہ ہم اس فہرست کی تشریح کریں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ کتابیں اور ان کے مطالب کس پایہ کے ہیں - فنِ رجال کی عظمت اور جلالت کی شہادت محققینِ یورپ بھی دے چکے ہیں - چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی لٹریچر کی عظمت اُس کے لٹریری بیوگرفی میں ہے - کوئی قوم دنیا میں نہیں ہے اور نہ ہوئی ہے جسنے بارہ سو برس کے زمانے کی ہر ایک عالم کی سوانح عمری لکھی ہو - اگر مسلمانوں کے رجال کی کتابیں اکھٹی کیجائیں تو ہم غالباً اُن میں پانچ لاکھ ممتاز لوگوں کی سوانح عمریوں کے بیان پائینگے - اور یہ واضح ہوگا کہ اُن کی تاریخ کا کوئی دس برس کا زمانہ ایسا نہیں ہے نہ کوئی مشہور مقام ہے جسکے علما کا مذکور نہو - یہ بیش بہا تاریخی مواد اُسیقدر زیادہ باعظمت ہوتا جاتا ہے جسقدر ہم ان لوگوں کے دماغی جودت کے نتائج (اسلامی ادب اور علومِ حکمت) سے زیادہ واقف ہوتے جاتے ہیں"۔ (دیکھو اصابہ کا انگریزی دیباچہ مطبوعۂ مقام کلکتہ ١٨٥٦ء) - فنِ رجال میں جو مرتبہ امام ذہبی کی تصانیف کا ہے اُس سے ایک زمانہ واقف ہے - ابن خلکان کی توثیق یہی کافی ہے کہ امام ذہبی نے جابجا اُنکا حوالہ دیا ہے - ہماری تمام فہرست انھیں دونوں کتابوں سے ماخوذ ہے - دوسری کتابوں سے جن عالموں کی مدتِ عمر لیگئی ہے اُن کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے - یہ نہ سمجھنا کہ ہمنے طویل عمریں چھانٹکر لکھی ہیں بلکہ ایک سرے سے ہمنے تمام ان علما کی عمریں لکھی ہیں جنکی سنہ ولادت و وفات اُن کتابوں میں نظر پڑے - یا آنکہ سنہ وفات درج تھی اور اُسکے ساتھ بالتصریح یہ درج تھا کہ اسقدر عمر ہوئی - عام اِس سے کہ عمر طویل تھی، یا قصیر - ہم نے مزید احتیاط یہ کی ہے کہ جہاں مدتِ عمر میں اختلاف تھا وہاں ہم نے اُس قول کو لیا ہے جس میں سب سے کم عمر تھی - ہماری فہرست کے دو حصے ہیں - ایک میں اُن علما کے نام درج ہیں جن کی عمریں دراز ہوئیں - اِس حصے میں ٧٧٥ علما کے نام ہیں - دوسرے حصے میں وہ علما ہیں جن کی عمر طویل نہیں ہوئی - اِس میں ٨٤ عالم ہیں -

بڑی فہرست کے معائنے سے واضح ہوتا ہے کہ منجملہ ٧٧٥ کے دس عالم ساٹھ برس کے تھے - ٤ عالم اکسٹھ ٦١ برس کے - نو ٦٢ برس کے - ١٤ تریسٹھ ٦٣ برس کے - ١٠ چونسٹھ ٦٤ برس کے - گیارہ ٦٥ برس کے - آٹھ ٦٦ برس کے - گیارہ ٦٧ برس کے - گیارہ ٦٨ برس کے

نو عالم ۶۹ برس کے - پچیس ۷۰ برس کے - نو ۷۱ برس کے - سولہ ۷۲ برس کے - بیس ۷۳ برس کے - اُنیس ۷۴ برس کے - چوبیس ۷۵ برس کے - سولہ ۷۶ برس کے - ۳۴ ستتر برس کے - اٹھائیس ۷۸ برس کے - اٹھارہ ۷۹ برس کے - چالیس ۸۰ برس کے - اُنیس ۸۱ برس کے - بائیس بیاسی برس کے - بائیس ۸۳ برس کے - ۳۷ چوراسی برس کے - ۲۹ پچاسی برس کے - اٹھائیس ۸۶ برس کے - ۳۰ ستاسی برس کے - اکیس ۸۸ برس کے - ۳۲ نواسی برس کے - ۲۴ نوے برس کے - سترہ ۹۱ برس کے - اُنیس ۹۲ برس کے - ۲۳ ترانوے برس کے - ۲۶ چورانوے برس کے - اٹھارہ ۹۵ برس کے - بارہ ۹۶ برس کے - پانچ ۹۷ برس کے - نو ۹۸ برس کے - چار ۹۹ برس کے - پندرہ ۱۰۰ برس کے - دو ۱۰۱ برس کے - دو ۱۰۲ برس کے - دو ۱۰۳ برس کے - ایک ۱۰۴ برس کے - دو ۱۰۵ برس کے - ایک ۱۰۶ برس کے - ایک ۱۱۰ برس کے - ایک ۱۱۳ برس کے - ایک ۱۱۶ برس کے - ایک ۱۱۸ برس کے - اور دو ۱۲۰ برس کے -

ابھی یہ امر بحث طلب ہی کہ ان دراز عمر بزرگوں کی زندگی اُن زندہ نما مُردوں کی سی تھی جنکو سکندر نے آبحیات کے کنارے پر پڑا پایا تھا - یا آنکہ اُن کے قویٰ نے عمر کا ساتھ دیا - اور وہ زندہ رہکر مرے نہ یہ کہ مر مر کر جیے -

اسکا فیصلہ واقعات ذیل سے ہوگا - ابو عمر و لغوی جن کی عمر ایک سو دس برس کی ہوئی - اُن کی نسبت ابن خلکان نے لکھا ہی - كَانَ يَكْتُبُ بِيَدِهِ اِلَى اَنْ مَاتَ - یعنی مرتے دم تک وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے -

ایک لکھنا کتنی قوتوں پر دلالت کرتا ہی - نگاہ کی قوت پر - دماغ کی قوت پر اور ہاتھ کی قوت پر - قاضی شریح تابعی جلیل القدر نے سو برس کی عمر پائی - بہتر برس اُنھوں نے عہدۂ قضا کی خدمات انجام فرمائیں - اور اِس قوتِ اجتہاد کے ساتھ کہ اُن کے فیصلے مجتہدوں کے لیئے رہنما او رفقہ کے واسطے اُصول قرار پائے -

علامۂ عینی نے ہدایہ کی شرح (جسکی چار ضخیم جلدیں اور (۴۱۸۵) صفحے ہیں) جب لکھی ہی تو اُن کی عمر نوے برس سے زائد تھی - علامۂ ممدوح نے شرح مذکور کے آخر میں خود اِس امر کی تشریح کی ہے کہ اُسکے لکھنے کا اتفاق اکثر شب کو ہوتا تھا -

امام ابن السّنّی کا سن اسّی سے متجاوز تھا - جب اُنکا دم واپسیں رخصت ہوکر چلا تو وہ اس حالت میں تھے کہ لکھتے لکھتے قلم دوات کے منہ میں لگا تھا اور دعا کو ہاتھ اُٹھائے تھے - اِسی عالم میں روح عالم بالا کو پرواز کرگئی -

امام ادب ثعلب نے اکیانوے برس دنیا کی سیر دیکھی - ایک روز جمعہ پڑھکر بازار میں چلے آتے تھے - اور چلتے چلتے کتاب کا مطالعہ ہوتا جاتا تھا - اتفاقاً کسی جانور کا دھکا لگا اور یہی صدمہ مرضِ موت بن گیا - اس قسم کے واقعات تلاش سے اور بہت ملسکتی ہیں - لیکن نمونے کے لیئے یہ ہی کافی ہیں -

اِن حالات کے پڑھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ ممکن ہی کہ کامل ہونا درازیِ عمر کو چاہتا ہو - کتابوں میں مشاہیر و کاملین کے احوال درج ہوتے ہیں - پس کتابوں میں اُنھیں علما کا ذکر ہی جو معمر ہوئے - لہذا اُنکا طویل العمر ہونا اس امر کیواسطے حجت نہیں ہوسکتا کہ اس فرقے میں اکثر نے عمریں بڑی پائیں - مگر واقعات پر غور کرنے سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہی - اور معلوم ہوتا ہی کہ حصولِ کمال سالخوردگی پر منحصر نہیں - بلکہ قوتِ دماغ - جودتِ ذہن مناسبتِ طبع پر منحصر ہی - ذیل میں ہم ایک فہرست قصیر العمر علما کی لکھتے ہیں جس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوگی جو عالم ساٹھہ برس سے کم دنیا میں رہے وہ اِس فہرست میں درج ہیں -

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	امام قتادہ	۱۷	۱۶۰	۵۷ سال
۲	حضرت سعید ابن جبیر	۳۰	۹۵	۹۴ سال
۳	امام محمدؒ	۱۳۰	۱۸۹	۵۴ "
۴	امام شافعی	۱۵۰	۲۰۴	۵۴ "
۵	عبداللہ ابن ابی جعفر	۶۰	۱۰۶	۴۶ "
۶	حضرت امام باقر	۵۶	۱۱۴	۵۸ "
۷	ابن السکن	۲۹۴	۳۵۳	۵۹ "
۸	ابوالحسن سعالمی	۳۶۸	۴۱۵	۴۷ "
۹	کمال الدین فقیہ	۵۷۵	۶۲۲	۴۷ "
۱۰	اشہب فقیہ مالکی	۱۵۰	۲۰۴	۵۴ "
۱۱	شیخ الرئیس ابن سینا	۳۷۰	۴۲۸	۵۸ "
۱۲	ابن الدبان	۰	۵۸۲	قریب ۶۰ "
۱۳	ابوالقاسم فقیہ	۴۲۷	۴۷۸	۵۱ "
۱۴	خطیب ابویحییٰ امام ادب	۳۳۵	۳۷۴	۳۹ "
۱۵	امام الحرمین	۴۱۹	۴۷۸	۵۹ "
۱۶	ابوالفتح فقیہ	۵۵۱	۵۸۳	۳۲ "
۱۷	ابن الفارض	۵۷۶	۶۳۲	۵۶ "
۱۸	امام غزالی	۴۵۰	۵۰۵	۵۵ "
۱۹	ابن زکی الدین	۵۵۰	۵۹۸	۴۸ "
۲۰	علامہ ابوبکر انباری	۲۷۱	۳۲۷	۵۶ "
۲۱	ابوالحسن سلامی	۳۳۶	۳۹۳	۵۷ "
۲۲	شریف رضی امام ادب	۳۵۹	۴۰۶	۴۷ "
۲۳	شرف الدین	۵۴۷	۶۰۱	۵۴ "
۲۴	زامی ادیب	۳۱۸	۳۵۲	۳۴ "
۲۵	ابوالوفا مجاسب مشہور	۳۲۸	۳۷۶	۴۸ "
۲۶	قطب الدین واعظ	۴۹۱	۵۴۷	۵۶ "
۲۷	ابن قلاقس	۵۳۲	۵۶۷	۳۵ "
۲۸	شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول	۰	۵۸۷	۳۸ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۲۹	سیرافی لغوی	۰	۳۸۵	۵۵ سال
۳۰	ابراہیم تیمی	۰	۹۲	کم از ۴۰ "
۳۱	حافظ زبیدی	۰	۲۲۴	۵۶ "
۳۲	ابوعلی بلخی	۰	۲۴۴	۴۹ "
۳۳	ابراہیم ابن اورمہ	۰	۲۶۶	۵۵ "
۳۴	ابن شریح	۰	۳۰۶	۵۷ "
۳۵	ابوبکر رازی محدث	۰	۳۱۵	۵۴ "
۳۶	ابن سُریج	۰	۳۰۶	۵۷½ "
۳۷	ابن فطیس	۳۴۸	۴۰۲	۵۴ "
۳۸	ابن میمونہ	۰	۴۰۰	۴۷ "
۳۹	ابن شنظیر	۰	۴۰۲	۵۰ "
۴۰	ابوموسیٰ شیخ حنابلہ	۰	۴۷۰	۵۹ "
۴۱	ابن سفوز	۴۲۹	۴۸۴	۵۵ "
۴۲	ابوالفتیان اُستاد امام غزالی	۴۵۶	۵۰۳	۴۷ "
۴۳	ابن طاہر	۴۴۸	۵۰۷	۵۹ "
۴۴	ابوبکر شاطبی	۰	۵۱۵	۴۲ "
۴۵	ابن الحداد	۴۶۳	۵۱۷	۵۴ "
۴۶	امام سمعانی	۰	۵۱۰	۴۳ "
۴۷	ابوبکر خفاف	۰	۵۴۳	۵۳ "
۴۸	تاج الاسلام سمعانی	۵۰۶	۵۶۲	۵۶ "
۴۹	عبدالعزیز قرشی	۰	۵۶۴	۵۷ "
۵۰	نسیم بغدادی	۰	۵۹۷	۵۳ "
۵۱	شاطبی	۰	۵۹۰	۵۳ "
۵۲	شیخ الصوفیہ شیرازی	۵۲۹	۵۸۵	۵۶ "
۵۳	ابوالمواہب	۵۳۷	۵۸۶	۴۹ "
۵۴	امام زیدی	۵۲۹	۵۷۵	۴۶ "
۵۵	امام حازمی	۵۴۸	۵۸۴	۳۶ "
۵۶	ابوالمحاسن قرشی	۵۲۶	۵۷۵	۴۹ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۵۷	شیخ المغرب بن عبداللہ	۵۵۵	۵۹۱	۳۶ سال
۵۸	عبدالغنی مقدسی	۵۴۱	۶۰۰	۵۹ ״
۵۹	ابن القرطبی	۵۵۶	۶۱۱	۵۵ ״
۶۰	عز الدین مقدسی	۵۶۶	۶۱۳	۴۷ ״
۶۱	ابن الانماطی	۶۱۹	۵۷۰	۴۹ ״
۶۲	ابو موسیٰ حنبلی	۵۸۱	۶۲۹	۴۸ ״
۶۳	شمس الدین	۰	۶۳۷	۵۸ ״
۶۴	یمین الدین احمد محدث عالم ابن سلطان صلاح الدین۔	۰	۶۳۴	۵۷ ״
۶۵	تقی الدین مقدسی	۰	۶۴۳	۵۲ ״
۶۶	علامہ ابو عبداللہ حنبلی	۰	۶۵۶	۳۳ ״
۶۷	ضیاء الدین قیسی	۰	۶۶۲	۳۷ ״
۶۸	ضیاء الدین نابلسی	۰	۶۶۲	۵۷ ״
۶۹	سیف الدین حنبلی	۶۰۵	۶۴۳	۳۸ ״
۷۰	شرف الدین مقدسی	۰	۶۵۹	۵۴ ״
۷۱	ابن الحاجب دمشقی	۵۹۳	۶۳۰	۳۷ ״
۷۲	رعینی	۰	۶۲۲	۵۱ ״
۷۳	امام نواوی شارح مسلم	۶۳۱	۶۷۶	۴۵ ״
۷۴	علی ابن عبد الکافی	۰	۶۶۲	۲۶ ״
۷۵	امام حارثی	۶۵۲	۷۱۱	۵۹ ״
۷۶	محمد ابن عبدالرحمن	۰	۷۰۸	۴۶ ״
۷۷	ابوالعلاء	۰	۷۰۰	۵۶ ״
۷۸	فتح الدین اندلسی	۷۰۱	۷۳۴	۳۳ ״
۷۹	محب الدین مقدسی	۶۸۲	۷۳۷	۵۵ ״
۸۰	فخر الدین	۰	۷۰۱	۴۲ ״
۸۱	امین الدین	۶۸۴	۷۳۵	۵۱ ״
۸۲	محمد ابن احمد	۷۰۶	۷۴۴	۳۸ سال
۸۳	امام مسلم مصنف صحیح مسلم	۲۰۴	۲۶۱	۵۷ ״
۸۴	متنبی شاعر مشہور	۳۰۳	۳۵۴	۵۱ ״

جب ہم اس فہرست میں حضرت امام باقر۔ حضرت سعید ابن جبیر۔ امام قتادہ۔ امام شافعی۔ امام محمد۔ امام مسلم۔ امام غزالی۔ امام الحرمین۔ امام نواوی۔ شیخ الرئیس ابن سینا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول۔ وغیرہ مشاہیر ائمہ وحکما کے نام پاتے ہیں تو ہمکو اس فیصلے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا کہ درازی عمر شہرت کمال کے لیئے علت تام نہیں۔ علی ابن عبدالکافی کی مستعدی طلب اور جودت ذہن کی قسم کھانی چاہیئے کہ اُن کو دفتر قضا سے صرف ۲۶ برس دنیا میں رہنے کی اجازت ملی تھی تاہم اُنھوں نے اپنے کمال کا نقش صفحۂ تاریخ پر بٹھادیا۔ ان کی جلالت شان اس سے خیال میں آسکتی ہی کہ وہ امام ذہبی کے اُستاد تھے۔ اس سے اُس عہد کی خوبی تعلیم کا بھی اندازہ ہوسکتا ہی۔

اب ہم پھر فہرست طولانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں فہرست[1] مذکورہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ سب کے سب محدث تھے جنھوں نے عفت وزہد کو داخل عادات وشمائل زندگی فرمالیا تھا۔ فقہا میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی نسبت (جنکی عمر ۶۰ سال کی ہوئی) ابن خلکان لکھتے ہیں کان فی غایۃ من الورع والتشدد فی الدین۔ یعنی تقویٰ اور احکام دین کی سختی میں انتہا کو پہونچے ہوئے تھے۔

اگر ہم اپنی نظر کو بلند تر کریں اور صوفیای کرام کی عمر ود

[1] فہرست ہذا میں نمبر ۲۰ سے لغایۃ نمبر ۵۴ قریباً کل محدث ہیں ۱۲

دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بالامرتبہ فرقہ اگرچہ زہاد مجسم اور سراپا ریاضت تھا۔ تاہم نہایت طویل العمر ہوا۔ ذیل میں ہم ایک فہرست ان بزرگوں کی عمروں کی بھی درج کرتے ہیں۔ یہ فہرست تذکرۃ الحفاظ و ابن خلکان سے ماخوذ ہے۔ اور اکثر خزینۃ الاصفیا (مولفہ مرحوم مفتی غلام سرور لاہوری) سے۔ مارہرہ کے خاندان کے بزرگوں کی عمریں کاشف الاستار سے لی ہیں جو اس خاندان کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ اور مولٰنا فضل الرحمن صاحب کے سنہ ولادت و وفات ارشاد رحمانی سے نقل کیے گئے ہیں۔ خزینۃ الاصفیا وہ کتاب ہے جس سے پروفیسر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام میں مدد لی ہے۔

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	حضرت بشر حافی	۱۵۰	۲۲۷	۷۷ سال
۲	خواجہ حسن بصری	۲۰	۱۱۰	۹۰ "
۳	حضرت ابراہیم بن ادہم	۰	۲۸۱	۱۰۲ "
۴	خواجہ ابو الحسن نساج	۰	۳۲۲	۱۲۰ "
۵	خواجہ شبلی	۰	۳۳۴	۸۷ "
۶	امام سفیان ثوری	۹۷	۱۶۱	۶۴ "
۷	خواجہ سہل تستری	۲۰۱	۲۷۳	۷۱ "
۸	شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی	۵۳۹	۶۳۲	۹۳ "
۹	ابن باب	۸۰	۱۴۴	۶۴ "
۱۰	ابو العباس فاسی	۴۷۸	۵۶۰	۸۲ "
۱۱	شیخ علی پیر حضرت پیران پیر	۰	۵۶۱	۱۱۰ "
۱۲	حضرت پیران پیر	۴۷۱	۵۶۱	۹۰ سال ۷ ماہ ۹ روز
۱۳	شیخ فرید الدین عطار۔	۵۱۳	۶۲۸	۱۱۵ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۴	شیخ ابن عربی	۵۶۰	۶۳۸	۷۸ سال
۱۵	خواجہ معین الدین چشتی۔	۵۳۷	۶۳۳	۹۶ "
۱۶	خواجہ قطب الدین بختیار کاکی	۰	۶۳۴	۵۲ "
۱۷	خواجہ فرید الدین گنجشکر	۵۸۲	۶۶۴	۸۲ "
۱۸	حضرت سلطان الاولیا	۶۳۴	۷۲۵	۹۱ "
۱۹	خواجہ بہاؤ الدین نقشبند	۷۲۸	۷۹۱	۶۳ "
۲۰	خواجہ محمد پارسا	۰	۸۲۳	۷۳ "
۲۱	خواجہ احرار	۶۰۶	۸۹۵	۸۹ "
۲۲	خواجہ باقی باللہ	۹۷۲*	۱۰۱۲	۴۰ "
۲۳	حضرت مجدد الف ثانی	۹۷۱	۱۰۳۵	۶۴ "
۲۴	میرزا مظہر جانجاناں	۱۱۱۱	۱۱۹۵	۸۴ "
۲۵	شاہ غلام علی صاحب	۱۱۵۸	۱۲۴۰	۸۲ "
۲۶	شاہ احمد سعید صاحب	۱۲۱۷	۱۲۷۷	۶۰ "
۲۷	شاہ برکت اللہ صاحب سرگروہ سلسلۂ مارہرہ	۱۰۷۰	۱۱۴۲	۷۲ "
۲۸	شاہ اچھے صاحب	۱۱۵۹	۱۲۳۵	۷۶ "
۲۹	شیخ ابو اسحق پسر پیران پیر	۵۲۷	۶۲۳	۹۶ "
۳۰	سید عبد القادر ثانی	۸۶۲	۹۴۰	۷۸ "
۳۱	خواجہ ابو احمد ابدال چشتی	۲۶۰	۳۵۵	۹۵ "
۳۲	خواجہ مودود چشتی	۴۳۰	۵۲۷	۹۷ "
۳۳	خواجہ عثمان ہارونی	۰	۶۱۷	۹۱ "

* فٹ نوٹ۔ یہ سنہ زبدۃ المقامات سے نقل کیے گئے ۱۲

احکام اسلام کی پابندی اور اُنکا اثر عمر و صحت پر

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۴	خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی	۰	۸۰۸	۱۲۰ سال
۳۵	خواجہ سید محمد گیسو دراز	۷۲۰	۸۲۵	″ ۱۰۵
۳۶	شیخ علی متقی	۸۸۵	۹۷۵	″ ۹۰
۳۷	شیخ جلال تھانیسری	۰	۹۸۹	″ ۹۵
۳۸	سید میران بھیکھہ	۱۰۴۶	۱۱۳۱	″ ۸۵
۳۹	مولانا فخرالدین دہلوی	۱۱۲۶	۱۱۹۹	″ ۷۳
۴۰	خواجہ یوسف ہمدانی	۴۴۱	۵۳۴	″ ۹۳
۴۱	مولانا جامیؒ	۸۱۷	۸۹۸	″ ۸۱
۴۲	مولانا خواجگی	۰	۱۰۰۸	″ ۹۰
۴۳	خواجہ محمد معصوم	۱۰۰۹	۱۰۸۰	″ ۷۱
۴۴	شاہ ابوسعید صاحب	۰	۱۲۵۰	″ ۵۴
۴۵	شیخ عبداللہ خفیف	۰	۳۳۱	″ ۹۵
۴۶	شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی	۵۷۸	۶۶۱	″ ۸۳
۴۷	شیخ سعدی شیرازی	۵۷۱	۶۹۱	″ ۱۲۰
۴۸	میر حسینی	۰	۷۱۸	″ ۱۱۷
۴۹	مخدوم جہانیاں جہاں گشت	۷۰۷	۷۸۵	″ ۷۸
۵۰	شیخ ابوسعید ابوالخیر	۳۵۷	۴۴۰	″ ۸۳
۵۱	شیخ احمد جام ژندہ پیل	۴۴۱	۵۳۶	″ ۹۵
۵۲	مولانای روم	۶۰۴	۶۷۲	″ ۶۸
۵۳	شیخ علاءالدولہ سمنانی	۶۵۹	۷۳۶	″ ۷۷
۵۴	شیخ محمد غوث گوالیاری	۷۴۰	۸۱۸	″ ۷۸

اولیای کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی نسبت بمقابلہ علما کے اس امر کا زیادہ خیال ہوتا ہی کہ اُن کے کمال کا شہرہ ضرور طول عمر کا محتاج تھا۔ لیکن اس خیال کی تردید کیواسطے ہمارے پاس خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور خواجہ باقی باللہ کی عمریں موجود ہیں۔ یہ بزرگ شہرت اور مرتبے میں کسی سے کم نہیں۔ تاہم خواجہ اول الذکر کی عمر باون برس کی اور آخر الذکر کی چالیس برس کی تھی۔

اس سلسلے میں ایک پہلو اور قابل غور باقی رہتا ہی وہ یہ کہ اُن لوگوں کی عمروں کو دیکھا جائے جو ٹھیک اُس طرز پر زندگی بسر کرنیوالے نہ تھے جس طرز پر صوفیہ و علماء نے زندگی بسر کی۔ ہماری مراد سلاطین و اُمرا سے ہی۔ واقعات یہ تبلاتے ہیں کہ اس فرقے نے نعمت حیات کا حصّہ کم پایا۔ خوبی آب وہوا۔ عمدہ غذا وغیرہ امور جو عمر کے بڑھانے والے صحت کو قائم رکھنے والے ہیں جب طبقۂ اُمرا کو علما سے بہتر نصیب تھے اور اگر اُن میں کوئی فرق تھا تو صرف طرز زندگی کا۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تفاوت دونوں کی عمروں میں ہی اُسکا اصلی سبب طریق زندگی کا فرق ہی۔ ذیل میں ہم ایک فہرست درج کرتے ہیں جس میں خلفای بنی اُمیہ و بنی عباس کی مدت عمر اور مختلف نامور خاندان ہای امرا کی (مثل بنو حمدان۔ آل بویہ۔ سلجوقیہ ایوبیہ و صلاحیہ) مدت حیات درج ہی۔ ان میں سے جو کم عمری میں مقتول و شہید ہوئے اُن کی عمر ہم نے درج نہیں کی۔ البتہ جنکو بڑی عمر میں یہ حادثہ پیش آیا اُن کی عمریں درج کی ہیں۔ ان نقشوں کے ملاحظے سے واضح ہوگا کہ سلاطین و اُمرا کی عمریں عموماً کم ہوئی ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ سلاطین و اُمرا کی شب و روز کی تشویشیں اور فکریں اُن کی عمر کی جڑ کاٹتی تھیں۔ اسوجہ سے کہ عموماً امرا و سلاطین ایسے نہ تھے جو مبتلای تشویش رہتے ہوں بہت سے ایسے گذرے ہیں جو امن و سکون کی حالت میں زندگی بسر کرتے رہے۔

یہ ظاہر ہی کہ انحطاط دولت کی حالت میں جو جو افراد سلطنت کو سنبھالتے ہیں انکو بیحد تشویشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہی۔ حریف زبردست ہوتے ہیں۔ اپنا کوئی معتبر مددگار نہیں ہوتا۔ خزانہ خالی ملتا ہی۔ اور ہر ایک سوء تدبیری کی سزا موت ہوتی ہی۔ اور ہر طرف اُن کو موت کا فرشتہ گھورتا ہوا نظر آتا ہی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بنی عباس میں بہت سے خلیفہ ایسے گذرے ہیں جو کارخانہ خلافت کے درہم برہم ہوجانے کی حالت میں تخت نشین ہوئے۔ ہزاروں روح فرسا تشویشوں سے انکا سامنا کیا تاہم وہ پوری عمر بسر کرکے دنیا سے گئے۔ ہم اُن میں سے بعض کا ذکر بعد ختم فہرست ہذا کے کرینگے۔ علاوہ اسکے اگلے صلحا وعلمار نے بھی آسودہ زندگی نہیں پائی۔ حکام کی سختیاں معاصرین کی ایذائیں قریبًا اکثر اُن کی جان کے لیے وبال رہیں۔ حکام کی تلوار اور فقہا کے کفر کے فتووں کو انہوں نے اپنے استیصال میں پہلو بہ پہلو پایا۔ اسپر اُن کی طلب علم کی محنتیں۔ مجاہدے اور نفس کشی طرہ تھی۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کل اُمرا و سلاطین آرام طلب اور نفس کے بندے تھے۔ اور اُن کی بیکاری اور بے اعتدالی اُن پر موت کو جلد مسلّط کردیتی تھی۔ بس فرق ہی تو یہی کہ دونوں فریق کے طرز زندگی میں تفاوت تھا

خلفای بنی اُمیہ

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	حضرت معاویہ صحابی		۶۰	۷۷ سال
۲	یزید ابن معاویہ	۲۵	۶۴	۳۹ 〃
۳	معاویہ ثانی	۰	۶۴	۲۱ 〃
۴	مروان (مقتول)	۰	۶۵	۶۳ 〃
۵	عبدالملک	۲۶	۸۶	۷ 〃
۶	ولید	۰	۹۶	۵۱ 〃
۷	سلیمان	۶۰	۹۹	۳۹ سال
۸	حضرت عمر ابن عبدالعزیز (زہر دیا گیا)	۶۱	۱۰۱	۴۱ 〃
۹	یزید ابن عبدالملک	۷۱	۱۰۵	۳۴ 〃
۱۰	ہشام	۰	۱۲۵	۵۵ 〃

خلفای بنی عباس

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۱	سفاح	۱۰۸	۱۳۶	۲۸ 〃
۱۲	منصور	۹۵	۱۵۸	۶۳ 〃
۱۳	مہدی	۱۲۷	۱۶۹	۴۲ 〃
۱۴	ہادی	۱۴۷	۱۷۰	۲۳ 〃
۱۵	رشید	۱۴۸	۱۹۳	۴۱ 〃
۱۶	مامون	۱۷۰	۲۱۸	۴۸ 〃
۱۷	معتصم	۱۸۰	۲۲۷	۴۷ 〃
۱۸	واثق	۱۹۶	۲۳۲	۳۶ 〃
۱۹	معتضد	۲۴۲	۲۸۹	۴۷ 〃
۲۰	مکتفی	۲۶۴	۲۹۵	۳۱ 〃
۲۱	القاہر	۰	۳۳۹	۵۳ 〃
۲۲	الراضی	۲۹۷	۳۲۹	۳۱ 〃
۲۳	المتقی	۲۹۵	۳۵۷	۶۲ 〃
۲۴	المستکفی	۲۹۲	۳۳۸	۴۶ 〃
۲۵	المطیع	۳۰۱	۳۶۴	۶۱ 〃
۲۶	الطائع	۳۲۰	۳۹۳	۷۳ 〃
۲۷	القادر	۳۳۶	۴۲۲	۸۱ 〃
۲۸	القائم	۳۹۱	۴۶۷	۷۶ 〃
۲۹	المستظہر	۴۷۰	۵۱۲	۴۲ 〃
۳۰	المقتفی	۴۸۹	۵۵۵	۶۶ 〃
۳۱	المستنجد	۵۱۸	۵۶۶	۴۸ 〃
۳۲	المستضی	۵۳۶	۵۷۵	۳۹ 〃
۳۳	الناصر لدین اللہ	۵۵۳	۶۲۳	۷۰ 〃

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۴	الظاہر	۵۷۱	۶۲۳	۵۲ سال
۳۵	المستنصر	۵۸۸	۶۵۱	۶۳ //

عُبیدیین

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	منصور	۳۰۲	۳۴۱	۳۹ //
۲	مہدی بانی دولت	۲۵۹	۳۲۲	۶۳ //
۳	[illegible]	۴۶۷	۵۴۳	۷۵ //
۴	الظاہر	۳۹۵	۴۱۷	۳۲ //
۵	القائم	۲۸۰	۳۳۴	۵۴ //
۶	المعز	۳۱۹	۳۶۵	۴۶ //
۷	المستنصر	۴۲۰	۴۸۷	۶۷ //
۸	العزیز	۳۴۴	۳۸۶	۴۲ //
۹	المستعلی	۴۶۹	۴۹۵	۲۶ //

اُمرای متفرق

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	ابراہیم ابن مہدی	۱۶۲	۲۲۴	۶۲ //
۲	حسن مہلب	۲۹۱	۳۵۲	۶۱ //
۳	یحیی برمکی	۰	۱۹۰	۷۰ //
۴	فضل برمکی	۱۴۷	۱۹۲	۴۵ //
۵	احمد ابن طولون	۲۲۰	۲۷۰	۵۰ //
۶	نظام الملک طوسی	۴۰۸	۴۸۵	۷۷ //
۷	ابوالقاسم وزیر	۳۰۷	۴۱۸	۱۱۱ //
۸	بہاء الدولہ وزیر	۳۳۶	۴۱۶	۸۰ //
۹	کافور اخشیدی	۰	۳۵۵	۶۵ //
۱۰	صاحب بن عباد	۳۲۶	۳۸۵	۵۹ //

آلِ بویہ

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	عماد الدولہ بانی دولت	۰	۳۳۸	۵۷ //
۲	معز الدولہ	۳۰۳	۳۵۶	۵۳ //
۳	رکن الدولہ	۲۸۴	۳۶۶	۸۲ سال
۴	عضد الدولہ	۰	۳۷۲	۴۸ //
۵	فخر الدولہ	۳۴۱	۳۸۷	۴۶ //
۶	بہاء الدولہ	۰	۴۰۳	۴۴ //

آل حمدان

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	سیف الدولہ	۳۰۱	۳۵۶	۵۵ //
۲	سعد الدولہ	۰	۳۸۱	۴۰ // ۶ ماہ ۱۰ یوم

سلجوقیہ

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	طغرل بیگ بانی دولت	۰	۴۵۷	۷۰ //
۲	ملک شاہ	۴۴۷	۴۸۵	۳۸ //
۳	برکیارق	۴۷۴	۴۹۸	۲۴ //
۴	سنجر	۴۷۹	۵۵۲	۷۴ //
۵	غیاث الدین	۰	۵۱۱	۳۷ // ۴ ماہ ۹ یوم

ایوبیہ وصلاحیہ

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	نورالدین	۵۱۱	۵۶۹	۵۸ //
۲	صلاح الدین	۵۳۲	۵۸۹	۵۷ //
۳	الملک الافضل	۵۶۶	۶۲۲	۵۶ //
۴	الملک الظاہر	۵۷۳	۶۳۲	۵۹ //
۵	الملک المعظم	۵۷۸	۶۲۴	۴۶ //
۶	الملک الناصر	۶۰۳	۶۵۶	۵۳ //
۷	الملک الظاہر	۵۶۸	۶۱۳	۴۵ //
۸	الملک العزیز ابن ملک ظاہر	۶۱۰	۶۳۴	۲۴ //
۹	الملک الصالح	۶۰۰	۶۵۱	۵۱ //
۱۰	الملک العادل	۵۴۰	۶۱۵	۷۵ //
۱۱	الملک الکامل	۵۷۵	۶۳۵	۵۹ //

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۲	الملک المسعود	۵۹۹	۶۲۶	۲۷ سال
۱۳	الملک الصالح ثانی	۶۰۳	۶۴۷	۴۴ "
۱۴	الملک الاشرف	۵۷۸	۶۳۵	۵۷ "
۱۵	الملک المظافر	۵۶۸	۶۲۷	۵۹ "

خلفای بنی عباس کی فہرست میں ہم دورِ انحطاط میں جو گویا بلاؤں کا زمانہ تھا خلیفہ القادر القائم اور المقتفی کا نام پاتے ہیں - انکی عمریں طویل ہوئیں - یہ امر قابل غور ہو کہ اُن کی زندگی اُن اصول پر بسر ہوئی جو علما کی زندگی کے تھے - خلیفہ القادر کی عمر اکیاسی برس کی ہوئی - علامہ سیوطی نے اُن کی نسبت لکھا ہو کہ اس خلیفہ کا شمار فقہا میں ہو - اور امام ذہبی نے اُن کو اپنے عہد کا راس الفقہا کہا ہو - خلیفہ القائم نے ۷۶ برس کی عمر میں وفات پائی - علامہ سیوطی نے اُن کی بابت یہ ریمارک کیا ہو - کَانَ ... وَرِعًا دَیِّنًا زَاهِدًا عَالِمًا - یعنی متقی دیندار زاہد و عالم تھے - خلیفہ المقتفی چھیاسٹھ برس زندہ رہے - اُن کی نسبت علامہ ممدوح فرماتے ہیں - کَانَ زَاهِدًا عَابِدًا وَرِعًا - یعنی زاہد - عبادت گزار و پرہیز گار تھے - اُمرا کی فہرست میں نظام الملک طوسی کی عمر ۷۷ برس کی ہوئی - اُن کی وفات کا قصہ اُن کے طرزِ زندگی پر روشنی ڈالتا ہو - ابن خلکان نے لکھا ہو کہ "خواجہ مذکور اپنے آقا ملک شاہ کی معیت میں اصفہان کو جا رہے تھے - دسویں ماہِ مبارک کو روزہ افطار کر کے ہوادار پر سوار ہوئے - راستے میں ایک دیلمی لڑکا عرضی لیئے کھڑا تھا - نیک نفس وزیر نے اُسکو آگے بلایا اور عرضی لینے کا قصد کیا - عرضی بالای طاق رہی اُس ستمگار نے ایک خنجر کا وار خواجہ کے قلب پر کیا جسنے اُس مربی علم و ہنر کا خاتمہ کر دیا - ایک مشہور مقولہ ہو کہ تاریخ اپنے سلسلے کو دوہراتی رہتی ہو - ایم کارنٹ پریسیڈنٹ فرانس کا واقعہ قتل جو حال میں ہوا ہو کسقدر اس حادثے سے مشابہ ہی - اب ہم فہرست علما پیش کرتے ہیں -

ہماری ناچیز رائ میں جو پہلو آئے وہ ہم نے عرض کر دیئے جو لوگ اہل الرائ ہیں اُن کی نظر جب ان فہرستوں پر پڑیگی تو ممکن ہو کہ وہ اور نتیجہ اخذ کریں اور دوسری رائ قائم کریں
ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست -

اُن علما کی فہرست جنکی عمریں طویل ہوئیں

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱	شیخ ابو اسحٰق شیرازی	۳۹۳	۴۷۶	۸۳ سال
۲	ابن منصور فقیہ	۵۱۰	۵۹۶	۸۶ "
۳	نفطویہ	۲۴۴	۳۲۳	۷۹ "
۴	زجاج	۰	۳۱۰	۸۰ "
۵	السلیلی	۳۵۲	۴۴۱	۸۹ "
۶	ابو اسحٰق	۰	۳۸۴	۷۱ "
۷	ابن خفاجہ	۴۵۰	۵۳۳	۸۳ "
۸	کلبی	۵۰۵	۵۶۹	۶۴ "
۹	شیخ ابو حامد اسفرائنی	۳۴۴	۴۰۶	۶۲ "
۱۰	قدوری	۳۶۲	۴۲۸	۶۶ "
۱۱	ابو عمر قرطبی	۲۴۶	۳۲۸	۸۲ "
۱۲	ابو العلا معری	۳۶۳	۴۴۹	۸۶ "
۱۳	ابو العباس دارمی	۰	۳۹۹	۹۰ "
۱۴	ابو عمرو اندلسی	۳۴۷	۴۲۱	۷۴ "
۱۵	ابن خباط دمشقی	۴۵۰	۵۱۷	۶۷ "
۱۶	قاضی ابوبکر	۴۶۰	۵۴۴	۸۴ "
۱۷	صین الزمان	۴۷۳	۵۴۸	۷۵ "
۱۸	نفیس مالکی	۰	۶۰۳	۷۰ "
۱۹	ابوبکر بصری محدث	۱۱۱	۲۰۳	۹۲ "
۲۰	ابو عمرو لغوی	۰	۲۰۶	۱۱۰ "
۲۱	ابن ندیم موصلی	۱۵۰	۲۳۵	۸۵ "
۲۲	قاضی ابو المکارم	۰	۶۰۶	۶۲ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۲۳	امام مزنی	۰	۲۶۴	۸۹ سال
۲۴	ابوالعتاہیہ	۱۳۰	۲۱۱	۸۱ ״
۲۵	ابوطاہر انماطی	۵۱۰	۵۹۸	۸۸ ״
۲۶	بشار	۰	۱۶۸	زائد از ۹۰ ״
۲۷	قاضی بکار	۱۸۲	۲۷۰	۸۸ ״
۲۸	جعفر قاری بغداد	۴۱۸	۵۰۰	۸۲ ״
۲۹	حسن اصطخری	۲۴۴	۳۲۸	۸۴ ״
۳۰	ابوعلی فقیہ شافعی	۴۳۳	۵۲۸	۹۵ ״
۳۱	سیرافی	۰	۳۶۸	۸۴ ״
۳۲	ابوعلی فارسی	۲۸۸	۳۷۷	۸۹ ״
۳۳	ابواحمد عسکری	۲۹۳	۳۸۲	۸۹ ״
۳۴	حسن لیثی	۳۰۶	۳۸۴	۷۸ ״
۳۵	ابونزار	۴۸۹	۵۶۸	۷۹ ״
۳۶	ابن علاف	۰	۳۱۸	۱۰۰ ״
۳۷	حسن واسطی	۳۸۲	۴۶۰	۷۸ ״
۳۸	ابوعلی شاتانی	۵۱۰	۵۹۹	۸۹ ״
۳۹	خلیج مصری	۱۶۲	۲۵۰	۸۸ ״
۴۰	ابوعلی غسانی محدث	۴۲۷	۴۹۸	۷۱ ״
۴۱	ندیم بغدادی	۴۴۳	۵۲۴	۸۱ ״
۴۲	حماد کوفی نسابہ	۹۵	۱۵۵	۶۰ ״
۴۳	امام قرارت حمزہ	۰	۱۵۶	۷۶ ״
۴۴	ابومروان	۳۷۷	۴۶۹	۹۲ ״
۴۵	خارجہ ابن زیدؓ	۰	۹۹	۷۰ ״
۴۶	ابوالعباس اربلی	۴۷۸	۵۶۷	۸۹ ״
۴۷	ابوالقاسم اندلسی	۴۹۴	۵۷۸	۸۴ ״
۴۸	دعبل خزاعی	۱۴۸	۲۴۶	۹۸ ״
۴۹	قاضی ابن بکار	۰	۲۵۰	۸۴ ״
۵۰	ابوالفضل زبیر	۵۸۱	۶۵۶	۷۵ ״
۵۱	تاج الدین بغدادی	۵۲۰	۶۱۳	۹۳ ״

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۵۲	سالم کوفی قاری	۰	۱۹۳	۹۸ سال
۵۳	سعید ابن مسیب	۱۴	۹۱	۷۷ ״
۵۴	سعید ابن اوس لغوی	۰	۲۱۵	۹۳ ״
۵۵	ابن الدہان	۴۹۴	۵۶۹	۷۵ ״
۵۶	سفیان ابن عیینہ	۱۰۷	۱۹۸	۹۱ ״
۵۷	سلیمان ابن یسار	۰	۱۰۷	۷۳ ״
۵۸	سلیمان ابن مہران	۶۰	۱۴۸	۸۸ ״
۵۹	سلیمان باجی	۴۰۳	۴۷۴	۷۱ ״
۶۰	قاضی شریح	۰	۸۷	۱۰۰ ״
۶۱	قاضی شریک کوفی	۹۵	۱۷۷	۸۲ ״
۶۲	فخر النسا محدثہ و خوشنویس	۰	۵۷۴	۹۰ سال سے زائد
۶۳	ابوالاسود واضع فن نحو	۰	۶۹	۸۵ ״
۶۴	ابوالفضل لغوی	۰	۲۵۷	۷۷ ״
۶۵	عبداللہ ابن وہب	۱۲۴	۱۹۷	۷۳ ״
۶۶	ابن لہیعہ	۰	۱۷۰	۸۱ ״
۶۷	ابن قتیبہ دینوری	۲۱۳	۲۷۶	۶۳ ״
۶۸	ابن درستویہ	۲۵۸	۳۴۷	۸۹ ״
۶۹	قفال مروزی	۰	۴۱۷	۹۰ ״
۷۰	شرف الدین شافعی	۴۹۲	۵۸۵	۹۳ ״
۷۱	عبداللہ نحوی	۴۴۴	۵۲۱	۷۷ ״
۷۲	محب الدین فقیہ حنبلی	۵۳۸	۶۱۶	۷۸ ״
۷۳	ابن الخشاب بغدادی	۴۹۲	۵۶۷	۷۵ ״
۷۴	امام مصری	۴۹۹	۵۸۲	۸۳ ״
۷۵	ابوالحکم مغربی	۴۸۶	۵۴۹	۶۳ ״
۷۶	امام اوزاعی	۸۸	۱۵۷	۶۹ ״
۷۷	ابوعبداللہ فقیہ مالکی	۱۳۳	۱۹۳	۶۰ ״

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۷۸	ابن عساکر فقیہ شافعی	۵۵۰	۶۲۰	۷۰ سال
۷۹	کمال الدین نحوی	۵۱۳	۵۷۷	۶۴ "
۸۰	جمال الدین فقیہ حنبلی	۵۱۰	۵۹۷	۸۷ "
۸۱	ابوالقاسم اندلسی	۵۰۸	۵۸۱	۷۳ "
۸۲	بدرالدین عینی	۷۶۲	۸۵۵	۹۳ "
۸۳	قاضی فاضل میرمنشی سلطان صلاح الدین	۵۲۹	۵۹۶	۶۷ "
۸۴	ابن جریج	۸۰	۱۴۹	۶۹ "
۸۵	اصمعی	۱۲۳	۲۱۴	۹۱ "
۸۶	ثعالبی	۳۵۰	۴۲۶	۷۶ "
۸۷	سحنون فقیہ مالکی	۱۶۰	۲۴۰	۸۰ "
۸۸	جبائی	۲۴۷	۳۲۱	۷۴ "
۸۹	دیک الجن	۱۶۱	۲۳۵	۷۴ "
۹۰	قاضی منصور مؤلف سراجیہ	۷۲۲	۸۰۰	۷۸ "
۹۱	ابو نصر	۳۲۷	۴۰۵	۷۸ "
۹۲	روبانی فقیہ شافعی	۴۱۵	۵۰۲	۸۷ "
۹۳	عبدالقاہر جرجانی	۴۹۰	۵۶۳	۷۳ "
۹۴	ابوالقاسم قشیری	۳۷۶	۴۶۵	۸۹ "
۹۵	ابوبکر صنعانی شیخ حدیث	۱۲۶	۲۱۱	۸۵ "
۹۶	ابن الصباغ	۴۰۰	۴۷۷	۷۷ "
۹۷	ابومحمد ثعلبی	۳۶۲	۴۲۲	۶۰ "
۹۸	ابوالحسن فاسی محدث	۴۵۱	۵۲۹	۷۸ "
۹۹	شمس الدین عراقی	۵۰۵	۵۹۶	۹۱ "
۱۰۰	صبوری	۰	۴۱۹	۸۰ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۰۱	تقی الدین فقیہ	۵۷۷	۶۴۳	۶۶ سال
۱۰۲	ابن حاجب صاحب کافیہ	۵۷۰	۶۴۶	۷۶ "
۱۰۳	عروہ ابن زبیرؓ	۲۲	۹۳	۷۱ "
۱۰۴	امام عطا	۰	۱۱۵	۸۸ "
۱۰۵	امام عکرمہ	۰	۱۰۷	۸۰ "
۱۰۶	ابوالحسن اسکندرانی	۵۴۴	۶۱۱	۶۷ "
۱۰۷	سیف الدین آمدی	۵۵۱	۶۳۱	۸۰ "
۱۰۸	ابوالحسن مانی	۲۹۶	۳۸۲	۸۶ "
۱۰۹	ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی	۲۸۴	۳۵۶	۷۲ "
۱۱۰	ابن عساکر مؤرخ	۴۹۹	۵۷۱	۷۲ "
۱۱۱	شریف مرتضی	۳۵۵	۴۳۶	۸۱ "
۱۱۲	قاضی ابوالحسن	۴۰۵	۴۹۲	۸۷ "
۱۱۳	ابن القاسی	۳۲۴	۴۰۳	۷۹ "
۱۱۴	ابوالقاسم لغوی	۴۳۳	۵۱۵	۸۲ "
۱۱۵	ابومحمد اموی	۳۸۴	۴۵۶	۷۲ "
۱۱۶	ابوالحسن بغداوی	۳۲۸	۴۲۰	۹۲ "
۱۱۷	شیخ الاسلام ہکاری	۴۰۹	۴۸۶	۷۷ "
۱۱۸	ابوالقاسم انطاکی	۲۷۸	۳۶۴	۶۴ "
۱۱۹	ناشی اصغر	۲۷۱	۳۶۶	۹۵ "
۱۲۰	ابوزید بصری	۱۷۳	۲۶۲	۸۹ "
۱۲۱	ابن البنری	۴۷۱	۵۶۰	۸۹ "
۱۲۲	ذوالنسبین محدث	۵۴۴	۶۳۳	۸۹ "
۱۲۳	ابواسحق کوفی	۳۳	۱۳۲	۹۹ "
۱۲۴	ابوعثمان	۸۰	۱۴۴	۶۴ "
۱۲۵	ابن العلا امام قرأت	۷۰	۱۵۴	۸۴ "
۱۲۶	ابن السوادی	۴۸۲	۵۵۶	۷۴ "
۱۲۷	ابومحمد قاسم	۰	۱۰۱	۷۰ "
۱۲۸	حریری صاحب مقامات	۴۴۶	۵۱۵	۶۹ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۲۹	امام لیث مصری	۹۴	۱۷۵	۸۱ سال
۱۳۰	امام مالک	۹۵	۱۷۹	″ ۸۴
۱۳۱	ابن الدہان	۵۳۲	۶۶۲	″ ۸۰
۱۳۲	امام زہری	•	۱۲۴	″ ۷۲
۱۳۳	ابن ابی لیلی	۷۴	۱۴۸	″ ۷۴
۱۳۴	ابو الحرث مدنی	۸۱	۱۵۸	″ ۷۷
۱۳۵	ابن الحداد	۲۶۴	۳۴۵	″ ۸۱
۱۳۶	ابو الحسن ماسرجسی	•	۳۸۴	″ ۷۶
۱۳۷	ابو عبد اللہ استرآبادی	•	۳۸۶	″ ۷۵
۱۳۸	ابو سہل اصفہانی	۲۹۶	۳۶۹	″ ۷۳
۱۳۹	قاضی ابو عاصم	۳۷۵	۴۵۸	″ ۸۳
۱۴۰	فخر الاسلام شافعی	۴۲۹	۵۰۷	″ ۷۸
۱۴۱	ابو نصر فقیہ	۴۵۲	۵۲۸	″ ۷۴
۱۴۲	محی الدین	۵۲۲	۵۹۶	″ ۷۴
۱۴۳	ابن نحل بغدادی	۴۸۲	۵۵۲	″ ۷۰
۱۴۴	نجم الدین خبوشانی	۵۱۰	۵۸۷	″ ۷۷
۱۴۵	کمال الدین شافعی	۴۹۲	۵۷۲	″ ۸۰
۱۴۶	ابن الخطیب رازی	۵۲۴	۶۰۶	″ ۶۲
۱۴۷	عماد الدین سہلی	۵۳۵	۶۰۸	″ ۶۲
۱۴۸	جُبائی امام معتزلہ	۲۳۵	۳۰۳	″ ۶۸
۱۴۹	عبد الکریم شہرستانی	۴۷۹	۵۴۸	″ ۶۹
۱۵۰	ابو عبد اللہ مازاری	•	۵۳۶	″ ۸۳
۱۵۱	فربری راوی صحیح بخاری	۲۳۱	۳۲۰	″ ۸۹
۱۵۲	ابو موسیٰ مدینی محدث	۵۰۱	۵۸۱	″ ۸۰
۱۵۳	کمال الدین نیشاپوری	۴۴۲	۵۳۰	″ ۸۸
۱۵۴	ابن دُرید	۲۲۳	۳۲۱	″ ۹۸
۱۵۵	غلام ثعلب	۲۶۱	۳۴۱	″ ۸۰
۱۵۶	ابو المنصور لغوی	۲۸۲	۳۷۰	″ ۸۸
۱۵۷	یزیدی نحوی	•	۳۱۰	″ ½۸۲

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۵۸	ابن العیناء	۱۹۱	۲۸۲	۹۱ سال
۱۵۹	امام واقدی	۱۳۰	۲۰۷	″ ۷۷
۱۶۰	ابو عبد اللہ مرزبانی	۲۹۷	۳۸۴	″ ۸۷
۱۶۱	ابوبکر قرطبی	•	۳۷۹	″ ۶۳
۱۶۲	ابو المعالی بغدادی	۴۹۵	۵۶۲	″ ۶۷
۱۶۳	قاضی ابوبکر بغدادی	•	۳۶۷	″ ۶۵
۱۶۴	ابن تیمیہ	۵۴۲	۶۲۱	″ ۷۹
۱۶۵	عتابی لغوی	۴۸۴	۵۵۶	″ ۷۲
۱۶۶	ابن الدبیثی	۵۵۸	۶۳۷	″ ۷۹
۱۶۷	ابن زہر اندلسی	۵۰۷	۵۹۵	″ ۸۸
۱۶۸	صفی الدولہ	۳۹۴	۴۷۳	″ ۷۹
۱۶۹	ابن ابی الصقر	۴۰۹	۴۹۸	″ ۸۹
۱۷۰	ابن القیسرانی	۴۷۸	۵۴۸	″ ۷۰
۱۷۱	ابن تعاویذی	۵۱۹	۵۸۳	″ ۶۴
۱۷۲	نجم الدین	۵۰۱	۵۹۲	″ ۹۱
۱۷۳	ابن مقلہ خوشنویس	۲۶۸	۳۳۸	″ ۷۰
۱۷۴	حکیم ابو نصر فارابی	•	۳۳۹	″ ۸۰
۱۷۵	علامہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف	۴۶۷	۵۳۸	″ ۷۱
۱۷۶	قطب الدین نیشاپوری	۵۰۵	۵۷۸	″ ۷۳
۱۷۷	موفق الدین	۵۴۴	۶۲۳	″ ۷۹
۱۷۸	ابن طرار	۳۰۳	۳۹۰	″ ۸۷
۱۷۹	ابو عبیدہ بصری	۱۱۰	۲۰۹	″ ۹۹
۱۸۰	ابو محمد قاری	۳۵۵	۴۳۷	″ ۸۲
۱۸۱	ابو منصور لغوی	۴۶۶	۵۳۹	″ ۷۳
۱۸۲	ابو الحسن نیشاپوری	۵۲۴	۶۱۷	″ ۹۳
۱۸۳	ابو سعید	۴۹۴	۵۵۷	″ ۶۳
۱۸۴	ابن منصور نابینا	۵۰۱	۵۸۸	″ ۸۷
۱۸۵	ابو حنیفہ ثانی	•	۳۶۷	″ ۸۸

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۱۸۶	واصل ابن عطاء	۸۰	۱۸۱	۱۰۱ سال
۱۸۷	بحتری	۲۰۶	۲۸۴	۷۸ "
۱۸۸	وہب ابن منبہ	•	۱۱۰	۹۰ "
۱۸۹	ابن الشجری	۴۵۰	۵۴۲	۹۲ "
۱۹۰	ابن القطان	۴۷۸	۵۵۸	۸۰ "
۱۹۱	ہشام ابن عروہ	۶۱	۱۴۶	۸۵ "
۱۹۲	یحییٰ ابن اکثم	•	۲۴۶	۸۳ "
۱۹۳	ابن سعدون	۴۴۶	۵۶۷	۸۱ "
۱۹۴	فراء	•	۲۰۷	۶۳ "
۱۹۵	خطیب تبریزی	۴۲۱	۵۰۲	۸۱ "
۱۹۶	زین الدین	۵۶۴	۶۲۸	۶۴ "
۱۹۷	قوام الدین	۵۲۲	۵۹۴	۷۲ "
۱۹۸	تاج الدین خوشنویس	۵۴۱	۶۱۶	۷۵ "
۱۹۹	امام ابویوسفؒ	۱۱۳	۱۸۲	۶۹ "
۲۰۰	امام ابوحنیفہؒ	۸۰	۱۵۰	۷۰ "
۲۰۱	ابن اسحٰق	•	۲۰۵	۸۸ "
۲۰۲	ابن الصائغ	۵۵۶	۶۴۳	۸۷ "
۲۰۳	ابو الحجاج	۴۱۰	۴۷۶	۶۶ "
۲۰۴	ابن الخلال	•	۳۸۰	۸۶ "
۲۰۵	شہاب الدین حلبی	۵۶۱	۶۲۸	۶۷ "
۲۰۶	یوسف ابن محمدؐ	۵۷۳	۶۵۲	۸۰ "
۲۰۷	یونس نحوی	۹۰	۱۸۲	۹۲ "
۲۰۸	امام ابوموسیٰ شاگرد امام شافعیؒ	۱۷۰	۲۶۴	۹۴ "
۲۰۹	ابوادریس خولانی	۸	۸۰	۷۲ "
۲۱۰	زر ابن حبیش	•	۸۲	۱۲۰ "
۲۱۱	ابورجاء عطاردی	•	۱۰۷	۱۲۰ "
۲۱۲	ابن سیرین	۳۳	۱۱۰	۷۷ "
۲۱۳	امام شعبی	۱۷	۱۰۳ (ابن خلکان)	۸۶ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۲۱۴	میمون ابن مہران	•	۱۱۷	۸۰ سال
۲۱۵	وہب ابن منبہ	۳۴	۱۱۴	۸۰ "
۲۱۶	عبداللہ ابن بریدہ	•	۱۱۵	۱۰۰ "
۲۱۷	امام زہری	۵۰	۱۲۴	۷۴ "
۲۱۸	امام ابن ابی حبیب	۵۳	۱۲۸	۷۵ "
۲۱۹	ایوب سختیانی	•	۱۳۱	۶۳ "
۲۲۰	عبدالملک ابن عمیر	•	۱۳۶	۱۰۰ "
۲۲۱	ابن عبدالرحمٰن	•	۱۳۶	۹۳ "
۲۲۲	ہشام ابن عروہ	•	۱۴۶	۸۰ "
۲۲۳	داؤد ابن ابی ہند	۵۰	۱۴۰	۹۰ "
۲۲۴	امام اعمش	•	۱۴۸	۸۷ "
۲۲۵	امام زبیدی	•	۱۴۹	۷۰ "
۲۲۶	ابن الشہید	۸۰	۱۴۵	۶۵ "
۲۲۷	امام شعبہ	۸۲	۱۶۰	۷۸ "
۲۲۸	امام حسن کوفی	۱۰۰	۱۶۷	۶۷ "
۲۲۹	ابن لہیعہ مصری	۶۹	۱۷۴	۱۰۵ "
۲۳۰	امام اسمٰعیل سانی	•	۱۸۲	۸۰ "
۲۳۱	شیخ الاسلام ابوبکر	۱۰۷	۱۹۳	۸۶ "
۲۳۲	حضرت عبداللہ بن مبارک	۱۱۸	۱۸۱	۶۳ "
۲۳۳	ابومعاویہ	۱۱۳	۱۹۵	۸۲ "
۲۳۴	عبدالاعلےٰ	۱۱۵	۱۹۲	۷۷ "
۲۳۵	امام وکیع	۱۲۹	۱۹۷	۶۸ "
۲۳۶	علی ابن عاصم	۱۰۵	۲۰۱	۹۶ "
۲۳۷	عبدالرحمٰن ابن مہدی	۱۹۸	۱۳۵	۶۳ "
۲۳۸	حسین جعفی	•	۲۰۳	۸۴ "
۲۳۹	ابوداؤد طیالسی	•	۲۰۴	۸۰ "
۲۴۰	امام مکی	۱۲۶	۲۱۵	۹۳ "
۲۴۱	حافظ ابونعیم	۱۳۰	۲۱۹	۸۹ "
۲۴۲	حافظ ابومسہر	۱۴۰	۲۱۸	۷۸ "

احکام اسلام کی پابندی اور انکا اثر عمر و صحت پر

۲

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۲۴۳	ابو ولید	۱۳۳	۲۲۷	۹۴ سال
۲۴۴	ابن صالح	۱۳۷	۲۲۳	۸۶ ″
۲۴۵	ابن ابی مریم	۱۴۴	۲۲۴	۸۰ ″
۲۴۶	ابن جعد	۱۳۴	۲۳۰	۹۶ ″
۲۴۷	ابن عبداللہ	۱۳۲	۲۲۷	۹۵ ″
۲۴۸	ابن موسیٰ	۱۳۲	۲۱۲	۸۰ ″
۲۴۹	یحییٰ ابن یحییٰ	۱۴۲	۲۲۶	۸۴ ″
۲۵۰	بیکندی	۰	۲۲۵	۶۴ ″
۲۵۱	ابن سعد صاحب طبقات	۰	۲۳۰	۶۲ ″
۲۵۲	یحییٰ ابن معین	۱۵۸	۲۳۳	۷۵ ″
۲۵۳	امام ابن حنبل	۱۶۴	۲۴۹	۷۷ ″
		(ابن خلکان)		
۲۵۴	اسحٰق	۰	۲۳۸	۷۷ ″
۲۵۵	ابوخیثمہ	۰	۲۳۴	۷۴ ″
۲۵۶	سلیمان خولانی	۱۵۳	۲۳۳	۸۰ ″
۲۵۷	دولابی	۰	۲۲۷	۷۷ ″
۲۵۸	ابن فروخ	۰	۲۳۶	۹۶ ″
۲۵۹	قتیبہ	۰	۲۴۰	۹۱ ″
۲۶۰	علی ابن حجر	۰	۲۴۴	۹۰ ″
۲۶۱	ہشام ابن عمار	۱۵۳	۲۴۵	۹۲ ″
۲۶۲	ابن شبویہ	۰	۲۳۰	۶۰ ″
۲۶۳	ابن خالد	۰	۲۳۵	۹۰ ″
۲۶۴	دحیم بغدادی	۱۷۰	۲۴۵	۷۵ ″
۲۶۵	ابن منیع	۰	۲۴۴	۸۴ ″
۲۶۶	حرملہ	۱۶۶	۲۴۳	۷۷ ″
۲۶۷	ابن ابی الاسود	۰	۲۲۳	۶۰ ″
۲۶۸	ابن عمر	۰	۲۴۲	۸۰ ″
۲۶۹	احمد ابن صالح	۱۷۰	۲۴۸	۷۸ ″
۲۷۰	ابوکریب	۰	۲۴۸	۸۷ ″

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۲۷۱	دورقی	۰	۲۴۶	۸۰ سال
۲۷۲	ہناد	۰	۲۴۳	۹۱ ″
۲۷۳	ابن ایوب	۱۶۶	۲۵۲	۸۶ ″
۲۷۴	اسحٰق انصاری	۰	۲۰۵	۹۶ ″
۲۷۵	ابوزید	۰	۲۶۲	۸۹ ″
۲۷۶	ابن بہلول	۰	۲۵۲	۸۸ ″
۲۷۷	ابن عبدالاعلیٰ	۱۷۰	۲۶۴	۹۴ ″
۲۷۸	دارمی	۱۸۱	۲۵۵	۷۴ ″
۲۷۹	ابن سلیط	۱۸۲	۲۶۸	۸۶ ″
۲۸۰	صاعقہ	۱۵۸	۲۵۵	۷۰ ″
۲۸۱	امام بخاری	۱۹۴	۲۵۶	۶۲ ″
۲۸۲	ابن سیار	۰	۲۶۸	۷۰ ″
۲۸۳	عجلی	۱۸۲	۲۶۱	۷۹ ″
۲۸۴	رمادی	۰	۲۶۵	۸۳ ″
۲۸۵	ابوالحسن نیشاپوری	۰	۲۶۴	۸۲ ″
۲۸۶	ابوحاتم رازی	۰	۲۷۷	۸۲ ″
۲۸۷	امام داؤد ظاہری	۲۰۰	۲۷۰	۷۰ ″
۲۸۸	ابوجعفر بغدادی	۰	۲۶۱	۸۰ ″
۲۸۹	ابوالفضل ہاشمی	۱۵۸	۲۷۱	۱۱۳ ″
۲۹۰	ابوقلابہ	۱۹۰	۲۷۶	۸۶ ″
۲۹۱	امام حربی	۱۹۸	۲۸۵	۸۷ ″
۲۹۲	ابوداود	۲۰۲	۲۷۵	۷۳ ″
۲۹۳	ابن خیثمہ	۰	۲۷۹	۹۴ ″
۲۹۴	ابوالعباس	۰	۲۸۰	۸۰ ″
۲۹۵	فراء	۰	۲۷۲	۹۵ ″
۲۹۶	وبیرعاقولی	۰	۲۷۸	۸۰ ″
۲۹۷	ابن موسیٰ	۱۹۱	۲۸۸	۹۰ ″
۲۹۸	کدیمی	۰	۲۸۶	۱۰۰ ″
۲۹۹	حرث بغدادی	۰	۲۸۲	۹۷ ″

احکام اسلام کی پابندی اور انکا اثر عمر وصحت پر
احکام اسلام کی پابندی اور انکا اثر عمر وصحت پر

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۰۰	دارمی سجستانی	۲۰۰	۲۸۰	۸۰ سال
۳۰۱	ابواسحق بغدادی	۱۷۹	۲۸۲	〃 ۱۰۳
۳۰۲	ابن مخلد	۲۰۱	۲۷۶	〃 ۷۵
۳۰۳	ابن ماجہ	۲۰۹	۲۷۳	〃 ۶۴
۳۰۴	ابن ابی عاصم	۱۷۰	۲۸۷	〃 ۱۱۷
۳۰۵	جزرہ	۲۰۰	۲۹۴	〃 ۹۴
۳۰۶	ابن وضاح	۲۰۰	۲۸۹	〃 ۸۹
۳۰۷	خیاط السنۃ	۔	۲۸۴	〃 ۹۴
۳۰۸	ابوعبداللہ	۔	۲۹۴	〃 ۹۲
۳۰۹	امام بوشنجی	۲۰۴	۲۹۰	〃 ۸۶
۳۱۰	قاضی یوسف	۲۰۸	۲۹۷	〃 ۸۹
۳۱۱	ابوجعفر کوفی	۲۰۲	۲۹۷	〃 ۹۵
۳۱۲	امام عبداللہ	۲۱۳	۲۹۰	〃 ۷۷
۳۱۳	ثعلب	۲۰۰	۲۹۱	〃 ۹۱
۳۱۴	ابوموسیٰ	۲۱۴	۲۹۴	〃 ۸۰
۳۱۵	ابوحنیفہ	۔	۳۰۵	〃 ۱۰۰
۳۱۶	حسین بغدادی	۲۱۱	۲۸۹	〃 ۷۸
۳۱۷	عبدان مروزی	۲۲۰	۲۹۳	〃 ۷۳
۳۱۸	عبدان اہوازی	۔	۳۰۶	〃 ۹۰
۳۱۹	علامہ فریابی	۲۰۷	۳۰۱	〃 ۹۴
۳۲۰	ابوبکر بلخی	۔	۲۹۸	〃 ۷۷
۳۲۱	امام نسائی	۲۱۵	۳۰۲	〃 ۸۷
۳۲۲	ابویعلی موصلی	۲۱۰	۳۰۷	〃 ۹۷
۳۲۳	ابن جریر طبری	۲۲۴	۳۱۰	〃 ۸۶
۳۲۴	ابن خزیمہ	۔	۳۱۱	〃 ۸۹
۳۲۵	ابوالعباس نیشاپوری	۲۱۸	۳۱۳	〃 ۹۵
۳۲۶	امام بغوی	۲۱۴	۳۱۷	〃 ۱۰۳
۳۲۷	دولابی	۲۲۴	۳۱۰	〃 ۸۶

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۲۹	ابوبکر بغدادی	۔	۳۱۱	۷۷ سال
۳۳۰	ابوعبداللہ اسفنجی	۔	۳۱۰	〃 ۹۲
۳۳۱	ابوبکر اسفرائنی	۲۳۹	۳۱۸	〃 ۷۹
۳۳۲	عبداللہ ابن حباب	۔	۳۱۸	〃 ۹۶
۳۳۳	قاضی القضاۃ یوسف ازدی	۔	۳۱۸	〃 ۷۷
۳۳۴	ابن فطیس	۲۲۹	۳۱۹	〃 ۹۰
۳۳۵	ابن حمدون	۔	۳۲۰	〃 ۸۷
۳۳۶	امام طحاوی	۲۳۷	۳۲۱	〃 ۸۴
۳۳۷	ابن درید	۔	۳۲۱	〃 ۹۸
۳۳۸	ابن خالد قرطبی	۲۴۶	۳۲۲	〃 ۷۶
۳۳۹	ابن عدی	۲۴۲	۳۲۳	〃 ۸۱
۳۴۰	ابن زیاد	۲۳۸	۳۲۴	〃 ۸۶
۳۴۱	ابن شرقی	۲۴۰	۳۲۵	〃 ۸۵
۳۴۲	محاملی	۲۳۵	۳۳۰	〃 ۹۵
۳۴۳	ابن حفص	۔	۳۳۱	〃 ۹۸
۳۴۴	ابن ابی حاتم	۲۴۰	۳۲۷	〃 ۸۷
۳۴۵	ابن عبید بغدادی	۔	۳۳۰	〃 ۷۳
۳۴۶	ابن عبدالملک	۲۵۲	۳۳۰	〃 ۷۸
۳۴۷	محمد ابن یوسف	۔	۳۳۰	〃 ۱۰۰
۳۴۸	ابن عقدہ	۲۴۹	۳۳۲	〃 ۸۳
۳۴۹	ابن علاء جوزجانی	۔	۳۲۸	〃 ۹۳
۳۵۰	ابن عبدالبر	۔	۳۲۸	〃 ۸۲
۳۵۱	ابومحمد	۔	۳۲۸	〃 ۹۲
۳۵۲	ابن المنادی	۔	۳۳۶	〃 ۷۹
۳۵۳	ابن الاعرابی	۲۴۶	۳۴۰	〃 ۹۴
۳۵۴	عبداللہ حارثی جامع مسند ابی حنیفہ	۔	۳۴۰	[illegible]
۳۵۵	ابوالحسن کوفی	۔	۳۴۰	۸۰

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۵۶	قطان	۲۵۴	۳۴۵	۹۱ سال
۳۵۷	ابن الخراب بغدادی	۰	۳۴۰	″ ۸۳
۳۵۸	ابن رستم مازندرانی	۰	۳۴۰	″ ۸۸
۳۵۹	خیثمہ	۲۲۵	۳۴۳	″ ۱۱۸
۳۶۰	امام اصم	۲۴۷	۳۴۷	″ ۱۰۰
۳۶۱	ابن باحزم	۲۵۰	۳۴۴	″ ۹۴
۳۶۲	عبدالمومن	۲۵۷	۳۴۶	″ ۸۹
۳۶۳	ابن سعد قرطبی	۲۴۸	۳۳۱	″ ۸۳
۳۶۴	ابوعمر زاہد	۲۶۱	۳۴۵	″ ۸۴
۳۶۵	ابوبکر شافعی	۲۶۰	۳۵۴	″ ۹۴
۳۶۶	دعلج	۲۶۰	۳۵۱	″ ۹۱
۳۶۷	عبدالباقی	۲۶۵	۳۵۱	″ ۸۶
۳۶۸	حافظ غسال	۲۶۹	۳۴۹	″ ۸۰
۳۶۹	ابوالفوارس صابونی	۰	۳۴۹	″ ۱۰۵
۳۷۰	ابوبکر عطشی	۰	۳۴۹	″ ۹۴
۳۷۱	ابوعبداللہ قصار	۰	۳۴۹	″ ۹۷
۳۷۲	ابوالولید	۰	۳۴۴	″ ۷۲
۳۷۳	ابوسعید	۰	۳۴۰	″ ۶۶
۳۷۴	ابن حداد	۰	۳۴۴	″ ۸۰
۳۷۵	ابوعلی نیشاپوری	۲۷۷	۳۴۹	″ ۷۲
۳۷۶	ابوبکر نقاش	۲۶۶	۳۵۱	″ ۸۵
۳۷۷	طبرانی	۲۶۰	۳۶۰	″ ۱۰۰
۳۷۸	احمد ابن ابراہیم	۰	۳۵۴	″ ۸۴
۳۷۹	ابوالعباس غلیسی	۰	۳۵۴	″ ۱۰۴
۳۸۰	حمزہ ابن محمد	۲۷۵	۳۵۷	″ ۸۲
۳۸۱	عمر البقری	۰	۳۵۷	″ ۷۷
۳۸۲	ابن عدی	۲۷۷	۳۶۵	″ ۸۸
۳۸۳	انبدوقی	۰	۳۶۸	″ ۹۵
۳۸۴	حجاج	۰	۳۶۰	″ ۸۳

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۳۸۵	ابوالشیخ	۲۷۴	۳۶۹	″ ۹۵
۳۸۶	اسماعیلی	۲۷۷	۳۷۱	″ ۹۴
۳۸۷	ماسرجسی	۲۹۸	۳۶۵	″ ۶۷
۳۸۸	نقاش ابوبکر	۲۸۲	۳۶۹	″ ۸۷
۳۸۹	حسن ابن رشیق	۲۸۳	۳۷۰	″ ۸۷
۳۹۰	ابوحفص بغدادی	۰	۳۷۵	″ ۹۰
۳۹۱	ابوعلی فارسی	۰	۳۷۷	″ ۸۹
۳۹۲	ابوالحسن وراق	۰	۳۷۷	″ ۹۵
۳۹۳	ابن المقری	۰	۳۸۱	″ ۹۶
۳۹۴	ابن احمد قاری	۰	۳۸۱	″ ۹۸
۳۹۵	ابواحمد حاکم	۰	۳۷۸	″ ۹۳
۳۹۶	محمد ابن مظفر	۲۸۶	۳۷۹	″ ۹۳
۳۹۷	ابن زیات	۲۸۶	۳۷۵	″ ۸۹
۳۹۸	ابن شاہین	۲۹۷	۳۸۵	″
۳۹۹	ابوالفتح بغدادی	۰	۳۸۵	″ ۸۵
۴۰۰	ابن عبدان	۲۹۳	۳۸۸	″ ۹۵
۴۰۱	دارقطنی	۳۰۶	۳۸۵	″ ۷۹
۴۰۲	ابن النحاس	۰	۳۷۶	″ ۸۵
۴۰۳	ابوزرعہ	۳۱۰	۳۷۵	″ ۶۵
۴۰۴	ابن الباجی	۰	۳۷۸	″ ۸۷
۴۰۵	ابن ابی ذہل	۲۹۴	۳۷۸	۸۴
۴۰۶	ابن المفرح	۰	۳۶۶	۶۶
۴۰۷	نہروانی	۰	۳۹۰	۸۵
۴۰۸	کنانی	۰	۳۹۰	۹۰
۴۰۹	ابن بکیر	۰	۳۸۸	۹۱
۴۱۰	قاضی ابوالفضل	۰	۳۸۸	۱۰۰
۴۱۱	ابن عابد	۰	۳۸۹	۷۶
۴۱۲	ابن خنزابہ	۳۰۸	۳۹۱	۸۳
۴۱۳	خلف ابن قاسم	۳۲۵	۳۹۳	۹۸

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۴۱۴	کلابازی	۰	۳۷۸	۷۵ سال
۴۱۵	ابن لال شافعی	۰	۳۷۸	۹۰ 〃
۴۱۶	بصیر بغدادی	۰	۳۹۹	۹۴ 〃
۴۱۷	حلیمی	۳۳۸	۴۰۳	۶۵ 〃
۴۱۸	ابن منده	۳۱۵	۳۹۵	۸۵ 〃
۴۱۹	سلیمانی	۰	۴۰۴	۹۳ 〃
۴۲۰	حاکم نیشاپوری	۳۲۱	۴۰۵	۸۴ 〃
۴۲۱	ابوعبدالرحمن نیشاپوری	۳۳۰	۴۱۲	۸۲ 〃
۴۲۲	عبدالغنی مصری	۳۳۲	۴۰۹	۷۷ 〃
۴۲۳	ابن مرودیہ	۳۲۳	۴۱۴	۹۳ 〃
۴۲۴	ابن ابی الفوارس	۳۳۸	۴۱۲	۹۳ 〃
۴۲۵	ابوالقاسم بغدادی	۰	۳۱۴	۹۲ 〃
۴۲۶	ابوالقاسم رازی	۳۳۰	۴۱۴	۸۴ 〃
۴۲۷	ابوعمر بصری	۰	۴۱۴	۸۴ 〃
۴۲۸	ابن الباجی	۳۳۰	۳۹۶	۶۶ 〃
۴۲۹	غسانی	۰	۴۰۲	۹۶ 〃
۴۳۰	ابن النجار	۰	۴۰۲	۱۰۰ 〃
۴۳۱	مہروانی	۰	۴۰۲	۹۷ 〃
۴۳۲	ابن وجہ الجنہ	۰	۴۰۳	۹۸ 〃
۴۳۳	خفاف	۰	۴۰۲	۸۵ 〃
۴۳۴	عبقسی	۰	۴۰۵	۹۳ 〃
۴۳۵	قرشی	۰	۴۰۵	۹۱ 〃
۴۳۶	قاضی قضاۃ ابومحمد	۰	۴۰۵	۸۹ 〃
۴۳۷	ابوبکر دمشقی	۰	۴۰۵	۹۶ 〃
۴۳۸	احمد ابن طاہر	۰	۴۰۶	۶۲ 〃
۴۳۹	قاضی القضاۃ ابوالحسن	۰	۴۱۷	۸۸ 〃
۴۴۰	برقانی	۳۳۳	۴۴۵	۹۲ 〃
۴۴۱	ابوعلی بزاز	۰	۴۲۵	۸۷ 〃
۴۴۲	قابسی	۳۲۴	۴۰۳	۷۹ 〃

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۴۴۳	بجیری	۰	۳۹۶	۶۳ سال
۴۴۴	بردی	۰	۴۲۸	۸۱ 〃
۴۴۵	ابونعیم	۳۳۶	۴۳۰	۹۴ 〃
۴۴۶	طلنکی	۳۴۰	۴۲۹	۸۹ 〃
۴۴۷	فرات	۳۵۲	۴۲۹	۸۹ 〃
۴۴۸	ابن الصقر	۰	۴۲۹	۹۴ 〃
۴۴۹	ابوالولید قرطبی	۰	۴۲۹	۹۱ 〃
۴۵۰	حماد قرطبی	۰	۴۳۲	۱۰۰ 〃
۴۵۱	ابوالبرکات مکی	۰	۴۰۴	۸۷ 〃
۴۵۲	امام ربعی	۰	۴۳۶	۷۳ 〃
۴۵۳	خلال بغدادی	۳۵۲	۴۳۹	۸۷ 〃
۴۵۴	علامہ صوری	۳۷۷	۴۴۱	۶۴ 〃
۴۵۵	شیخ الاسلام دالی	۳۷۱	۴۴۴	۷۳ 〃
۶۵۶	زہرادی	۰	۴۵۳	۹۳ 〃
۴۵۷	ابن عبدالبر	۳۶۸	۴۶۳	۹۵ 〃
۴۵۸	ازہری	۰	۴۶۳	۸۹ 〃
۴۵۹	مروزی	۰	۴۶۳	۹۶ 〃
۴۶۰	بیہقی	۳۸۴	۴۵۸	۷۴ 〃
۴۶۱	خطیب بغدادی	۳۹۲	۴۶۳	۷۱ 〃
۴۶۲	ابن حزم	۳۸۴	۴۵۶	۷۲ 〃
۴۶۳	عبدالرحیم بخاری	۳۸۲	۴۶۱	۷۹ 〃
۴۶۴	عبدالعزیز دمشقی	۰	۴۶۶	۷۷ 〃
۴۶۵	مؤذن نیشاپوری	۳۹۹	۴۷۰	۷۱ 〃
۴۶۶	ابن النقور	۰	۴۷۰	۸۵ 〃
۴۶۷	کتانی	۳۸۹	۴۶۶	۷۷ 〃
۴۶۸	عبدالباقی	۰	۴۷۱	۸۷ 〃
۴۶۹	انماطی	۰	۴۷۱	۸۳ 〃
۴۷۰	شیخ الاسلام انصاری	۰	۴۸۱	۸۴ 〃
۴۷۱	حبال	۰	۴۸۲	۹۱ 〃

احکام اسلام کی پابندی اور انکا اثر عمر و صحت پر

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۴۷۲	ابو الحسین اصفہانی	۰	۴۸۲	۹۰ سال
۴۷۳	سلیمان اصفہانی	۰	۴۸۶	۹۰ ″
۴۷۴	ابو الفضل دقاق	۰	۴۸۶	۸۶ ″
۴۷۵	ابن خیرون	۰	۴۸۸	۸۴ سال یک ماہ
۴۷۶	عبد العزیز تیمی	۰	۴۸۸	۸۸ ″
۴۷۷	قاضی القضاۃ حموی	۰	۴۸۸	۸۸ ″
۴۷۸	ابن سکویہ	۴۰۹	۴۸۲	۷۳ ″
۴۷۹	حکاک	۴۱۶	۴۸۵	۶۹ ″
۴۸۰	ابو طاہر کرخی	۰	۴۸۹	۷۳ ″
۴۸۱	ابو المنصور خراسانی	۰	۴۸۹	۶۳ ″
۴۸۲	ابن طاؤس	۰	۴۹۲	۹۹ ″
۴۸۳	خلیلی دہقان	۰	۴۹۲	۱۰۱ ″
۴۸۴	خلفی شافعی	۰	۴۹۲	۸۸ ″
۴۸۵	سمرقندی	۰	۴۹۱	۸۲ ″
۴۸۶	بردانی	۴۲۶	۴۹۸	۷۲ ″
۴۸۷	شیخ الحرم طبری	۰	۴۹۸	۸۰ ″
۴۸۸	ابو سعد اصفہانی	۰	۵۰۳	۹۲ ″
۴۸۹	ابن سوسن یمانی	۰	۵۰۳	۹۲ ″
۴۹۰	شجاع ابن فارس	۴۳۰	۵۰۷	۷۷ ″
۴۹۱	ابن عروس	۰	۵۰۷	۹۴ ″
۴۹۲	ابو بکر شاشی	۰	۵۰۷	۷۸ ″
۴۹۳	ابن مرزوق	۴۴۱	۵۵۷	۱۱۶ ″
۴۹۴	سوتین	۴۴۵	۵۱۲	۶۷ ″
۴۹۵	اعمش	۴۳۱	۵۱۲	۸۱ ″
۴۹۶	ابو العلا نیشاپوری	۰	۵۱۲	۹۵ ″
۴۹۷	ابن مندہ	۴۳۴	۵۱۱	۷۷ ″
۴۹۸	شیخ القراء ابو القاسم	۰	۵۱۱	۸۴ ″
۴۹۹	برجی اصفہانی	۰	۵۱۱	۹۴ ″
۵۰۰	ابو المعالی	۰	۵۱۴	۸۴ سال
۵۰۱	اشقر اصفہانی	۰	۵۱۴	۹۳ ″
۵۰۲	باقرجی	۰	۵۱۶	۷۹ ″
۵۰۳	ابو الفرج صوری	۰	۵۰۹	۶۶ ″
۵۰۴	ابو الغنائم نرسی	۴۲۴	۵۱۰	۸۶ ″
۵۰۵	مسند العراق ابو القاسم	۰	۵۱۰	۹۷ ″
۵۰۶	ابو الخطاب	۰	۵۱۰	۷۸ ″
۵۰۷	امام خوزی	۴۴۲	۵۱۰	۶۸ ″
۵۰۸	ابن السمرقندی	۴۴۴	۵۱۶	۷۲ ″
۵۰۹	ابو الغنائم	-	۵۱۷	۷۵ ″
۵۱۰	ابن غیاث قرطبی	۰	۵۲۰	۸۷ ″
۵۱۱	ابن ہلال	۰	۵۲۰	۱۰۰ ″ چند ماہ
۵۱۲	ابو بکر طرطوسی	۰	۵۲۰	۷۰ ″
۵۱۳	ششتری	۰	۵۲۲	۷۸ ″
۵۱۴	ابن الاکفانی	-	۵۲۴	۸۰ ″
۵۱۵	عبد الغافر	۴۵۱	۵۲۹	۷۸ ″
۵۱۶	غازی	۴۴۸	۵۳۲	۸۴ ″
۵۱۷	ابن مغیث قرطبی	۰	۵۳۲	۸۵ ″
۵۱۸	شیخ الاسلام تیمی	۴۵۷	۵۳۵	۷۸ ″
۵۱۹	بدیع ہمدانی فقیہ	۰	۵۲۵	۷۷ ″
۵۲۰	انماطی	۴۶۴	۵۳۸	۷۶ ″
۵۲۱	ابو المعالی صفار	۰	۵۳۸	۸۶ ″
۵۲۲	ابو سعد بغدادی	۴۶۳	۵۴۰	۷۷ ″
۵۲۳	یونارتی	۴۶۶	۵۲۸	۶۱ ″
۵۲۴	ابن ناصر	۴۶۷	۵۵۰	۸۳ ″
۵۲۵	ابو حفص بغدادی	۰	۵۴۲	۸۱ ″
۵۲۶	ابن العربی	۴۶۸	۵۴۳	۷۵ ″
۵۲۷	امام سلفی	۰	۵۷۶	۱۰۶ ″
۵۲۸	قاضی عیاض	۴۷۶	۵۴۴	۶۸ ″

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۵۲۹	الغالی	۴۷۲	۵۴۶	۷۴ سال
۵۳۰	ابن الدباغ	۴۸۱	۵۴۶	۶۵ //
۵۳۱	ابوسہل	۴۶۳	۵۴۸	۸۵ //
۵۳۲	عبدالخالق	۰	۵۴۸	۸۵ //
۵۳۳	ابوطالب نیشاپوری	۰	۵۴۸	۸۶ //
۵۳۴	ابومسعود کوتاہ	۴۷۶	۵۵۳	۷۷ //
۵۳۵	ابوالوقت	۰	۵۵۳	۹۵ //
۵۳۶	ابوالبرکات	۰	۵۶۲	۷۶ //
۵۳۷	جمال الائمہ کلابی	۰	۵۶۲	۷۴ //
۵۳۸	ابوشجاع بسطامی	۰	۵۶۲	۸۷ //
۵۳۹	ابن ہلال دقاق	۰	۵۶۲	۹۱ //
۵۴۰	رئیس اصفہانی	۰	۵۶۲	۱۰۰ //
۵۴۱	ابواحمد قرشی	۴۹۲	۵۶۴	۷۲ //
۵۴۲	ابومروان	۰	۵۶۴	۸۵ //
۵۴۳	شیخ القراء ابوالحسن	۰	۵۶۴	۹۳ //
۵۴۴	ابوالفتح حاجب	۰	۵۶۴	۸۷ //
۵۴۵	ابوالحسین اصفہانی	۵۰۰	۵۶۸	۶۸ //
۵۴۶	ابوالعلاء	۴۸۸	۵۶۹	۸۱ //
۵۴۷	کتانی	۰	۵۶۹	۹۳ //
۵۴۸	ابوحنیفہ اصفہانی	۰	۵۷۱	۸۳ //
۵۴۹	حافظ ابوسعد	!	۵۸۱	۸۴ //
۵۵۰	اسکندرانی	۰	۵۸۱	۹۶ //
۵۵۱	ابومحمد نجار	۰	۵۸۱	۸۴ //
۵۵۲	ابوالفتح بغدادی	۰	۵۸۱	۹۲ //
۵۵۳	ابوالمجد حمیری	۰	۵۸۱	۸۶ //
۵۵۴	زاغولی	۴۷۲	۵۵۹	۸۷ //
۵۵۵	ابن بشکوال	۴۹۴	۵۷۸	۸۴ //
۵۵۶	ابوالفضل طوسی	۰	۵۷۸	۹۳ //
۵۵۷	حربی	۰	۵۹۷	۸۴ //

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۵۵۸	ابوعبداللہ اصفہانی	۰	۵۹۷	۱۰۰ سال
۵۵۹	ابن حبیش	۰	۵۸۴	۸۰ //
۵۶۰	ابن احمد مصری	۰	۵۸۴	۱۰۲ //
۵۶۱	عمادالدین حنفی	۰	۵۸۴	۷۰ //
۵۶۲	تاج الدین خراسانی	۰	۵۸۴	۶۲ //
۵۶۳	ابن الفخار	۵۲۱	۵۹۰	۶۹ //
۵۶۴	ابوالخیر قزوینی	۰	۵۹۰	۷۸ //
۵۶۵	ابوالخیر دمشقی	۰	۵۸۵	۸۰ //
۵۶۶	ابن شراط	۰	۵۸۶	۷۵ //
۵۶۷	ابن زرقون	۰	۵۸۶	۸۴ //
۵۶۸	ابوبکر اشبیلی	۰	۵۸۶	۹۰ //
۵۶۹	ابوالفضل بغدادی	۰	۵۸۶	۷۰ //
۵۷۰	ابن خیر	۰	۵۷۵	۷۳ //
۵۷۱	قاسم دمشقی	۵۲۷	۶۰۰	۷۳ //
۵۷۲	ابوالفتح شافعی	۰	۶۰۰	۸۵ //
۵۷۳	ابوسعد نیشاپوری	۰	۶۰۰	۹۲ //
۵۷۴	ابوالمعانی	۰	۶۰۰	۸۲ //
۵۷۵	ابوطاہر صوفی	۰	۶۰۰	۸۸ //
۵۷۶	ابوالعباس اصفہانی	۰	۵۹۱	۹۱ //
۵۷۷	ابن الاحقر	۵۲۴	۶۱۱	۸۷ //
۵۷۸	عبدالرزاق	۵۲۸	۶۰۳	۷۵ //
۵۷۹	صیدلانی	۰	۶۰۳	۷۵ //
۵۸۰	رہاوی	۵۳۶	۶۱۲	۷۶ //
۵۸۱	علی ابن المفضل	۵۴۴	۶۱۱	۶۷ //
۵۸۲	ابوالقاسم فرضی	۰	۶۱۱	۷۲ //
۵۸۳	ابن سعالی	۰	۶۱۱	۸۰ //
۵۸۴	ربیعہ صنعانی	۵۲۵	۶۰۹	۶۴ //
۵۸۵	تجیبی	۰	۶۱۰	۷۰ //
۵۸۶	تاج الا منار احمد	۰	۶۱۰	۶۸ //

احکام اسلام کی پابندی اور انکا اثر عمر و صحت پر

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۵۸۷	دارقری	۰	۶۱۰	۵۸ سال
۵۸۸	عین الشمس بنت احمد اصفہانیہ	۰	۶۱۰	۹۰ "
۵۸۹	ابن حوط	۵۴۹	۶۱۲	۶۳ "
۵۹۰	ابن الاثیر مصنف تاریخ کامل	۵۵۵	۶۳۰	۷۵ "
۵۹۱	ابن خلفون	۵۵۵	۶۳۶	۸۱ "
۵۹۲	تاج الدین حنفی	۰	۶۱۳	۹۳ "
۵۹۳	ابن رجار	۰	۶۱۰	۸۵ "
۵۹۴	شیخ السنہ مقدسی	۵۶۹	۶۴۳	۷۴ "
۵۹۵	ابن خلیل	۰	۶۴۸	۹۳ "
۵۹۶	عبدالوہاب ازدی	۰	۶۴۸	۹۴ "
۵۹۷	فخر القضاۃ مصری	۰	۶۴۸	۸۷ "
۵۹۸	ابراہیم ارخی	۰	۶۴۸	۸۵ "
۵۹۹	ابن یونس	۰	۶۴۸	۸۹ "
۶۰۰	قاضی شرف الدین	۰	۶۲۹	۸۵ "
۶۰۱	موفق الدین بغدادی	۰	۶۲۹	۷۲ "
۶۰۲	عیسیٰ ابن عبدالعزیز	۰	۶۲۹	۷۹ "
۶۰۳	علاء الدین خجندی	۰	۶۳۷	۸۹ "
۶۰۴	ابوالغنائم دمشقی	۰	۶۳۷	۹۰ "
۶۰۵	فخر الدین نوقانی	۰	۶۳۷	۸۶ "
۶۰۶	کلاعی	۵۶۵	۶۳۴	۶۹ "
۶۰۷	ابوالحسن قطیعی	۰	۶۳۴	۸۸ "
۶۰۸	ابن ابی الجود	۰	۶۳۴	۸۵ "
۶۰۹	ابوحمزہ مقدسی	۰	۶۳۳	۶۴ "
۶۱۰	قاضی القضاۃ عماد الدین	۰	۶۳۳	۷۰ "
۶۱۱	زاہد قسطلانی	۰	۶۳۶	۷۷ "
۶۱۲	ابوالخیر تبریزی	۰	۶۳۶	۸۴ "
۶۱۳	ابوالفضل اسکندرانی	۰	۶۳۶	۹۰ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۶۱۴	شیخ اسکندریہ جمال الدین	۰	۶۳۶	۹۲ سال
۶۱۵	ابن الرومیہ	۵۶۱	۶۳۷	۷۶ "
۶۱۶	ابن الطیلسان	۵۷۵	۶۴۲	۶۷ "
۶۱۷	تاج الدین شیرازی	۵۷۶	۶۴۲	۶۷ "
۶۱۸	نجم الدین دمشقی	۰	۶۴۲	۷۷ "
۶۱۹	جمال الدین غسانی	۰	۶۴۲	۷۴ "
۶۲۰	ابن النجار	۵۷۸	۶۴۳	۶۵ "
۶۲۱	ابن الصلاح	۰	۶۴۳	۶۶ "
	ابوالحسن نجاری	۰	۶۴۳	۹۷ "
۶۲۲	صریفینی	۰	۶۴۱	۶۰ "
۶۲۳	ام الفضل کریمہ	۰	۶۴۱	۹۵ "
۶۲۴	ابن الاسکاف	۰	۶۴۱	۸۶ "
۶۲۵	قاضی شمس الدین	۰	۶۴۱	۸۴ "
۶۲۶	عبدالعظیم مصری	۵۸۱	۶۵۶	۷۵ "
۶۲۷	ابوالعباس مصری	۰	۶۵۶	۷۸ "
۶۲۸	عفیف الدین واسطی	۰	۶۵۶	۹۵ "
۶۲۹	امام یونینی	۵۷۲	۶۵۸	۸۶ "
۶۳۰	رشید الدین مالکی	۵۸۴	۶۶۲	۷۸ "
۶۳۱	محی الدین شاطبی	۰	۶۶۲	۷۰ "
۶۳۲	سنقر الدولہ صوفی	۵۷۴	۶۵۶	۸۲ "
۶۳۳	خالد ابن یوسف	۵۸۵	۶۶۳	۷۸ "
۶۳۴	معین الدین قرشی	۰	۶۶۳	۶۰ "
۶۳۵	نجیب الدین	۰	۶۶۳	۸۰ "
۶۳۶	بدر الدین	۰	۶۶۳	۸۵ "
۶۳۷	ابن سید الناس	۵۵۷	۶۵۹	۱۰۲ "
۶۳۸	احمد ابن حامد	۰	۶۵۹	۸۵ "
۶۳۹	ضیاء الدین بغدادی	۰	۶۵۹	۸۴ "
۶۴۰	قاضی کمال الدین	۰	۶۵۹	۸۳ "
۶۴۱	عز الدین جزری	۵۸۹	۶۶۱	۷۲ "
۶۴۲	اثیر الدین مصری	۰	۶۶۱	۸۶ "

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۶۴۳	ابن سالم نابینا	۰	۶۶۱	۸۹ سال
۶۴۴	سیف الناظرین	۰	۶۶۸	۸۴ 〃
۶۴۵	بہاء الدین دمشقی	۰	۶۳۰	۶۵ 〃
۶۴۶	شمس الدین حنفی	۰	۶۳۰	۸۸ 〃
۶۴۷	صفی الدین بغدادی	۰	۶۳۰	۷۵ 〃
۶۴۸	علی ابن ابی الفرج	۰	۶۳۰	۷۹ 〃
۶۴۹	ابو جعفر حنفی	۰	۶۳۰	۸۷ 〃
۶۵۰	رئیس الاصحاب	۵۸۸	۶۶۰	۷۲ 〃
۶۵۱	سیف الدولہ انصاری	۰	۶۳۲	۸۰ 〃
۶۵۲	ابو الفتوح اصفہانی	۰	۶۳۲	۷۸ 〃
۶۵۳	قاضی القضاۃ ابن شداد	۰	۶۳۲	۹۳ 〃
۶۵۴	نابلیسی	۶۰۳	۶۷۱	۶۸ 〃
۶۵۵	شمس الدین حرانی	۰	۶۷۱	۶۸ 〃
۶۵۶	ابن الصابونی	۶۰۴	۶۸۰	۷۶ 〃
۶۵۷	موفق الدین	۰	۶۸۰	۹۰ 〃
۶۵۸	شہاب الدین	۰	۶۸۰	۹۱ 〃
۶۵۹	ابو الغنائم محی الدین	۰	۶۸۰	۸۶ 〃
۶۶۰	ابن العمادیہ	۶۰۷	۶۷۷	۷۰ 〃
۶۶۱	ابو اسحٰق دمشقی	۰	۶۷۷	۶۵ 〃
۶۶۲	زبیر ابن عمر	۰	۶۷۷	۸۵ 〃
۶۶۳	قاضی القضاۃ شمس الدین	۰	۶۷۷	۷۸ 〃
۶۶۴	ابن الساعی ۔	۰	۶۷۴	۸۲ 〃
۶۶۵	سعد الدین حموی	۰	۶۷۴	۸۲ 〃
۶۶۶	ظہیر الدین	۰	۶۷۴	۷۷ 〃
۶۶۷	مکین الدین مصری	۰	۶۷۴	۷۴ 〃
۶۶۸	شیخ القرا تیمی	۰	۶۷۶	۸۰ 〃
۶۶۹	نجم الدین واعظ	۰	۶۷۶	۶۰ 〃
۶۷۰	ابن عماد	۰	۶۷۶	۷۴ 〃
۶۷۱	محب الدین طبری	۶۱۵	۶۹۴	۷۹ 〃

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۶۷۲	ابن روزبی	۰	۶۹۴	۶۹ سال
۶۷۳	امام زاہد تقی الدین	۰	۶۶۷	۸۴ 〃
۶۷۴	مجد الدین قشیری	۰	۶۶۷	۸۵ 〃
۶۷۵	ابو البرکات مصری	۰	۶۶۷	۸۰ 〃
۶۷۶	الاسعردی	۰	۶۷۲	۷۰ 〃
۶۷۷	جمال الدین عسقلانی	۰	۶۷۲	۷۰ 〃
۶۷۸	ابو عبداللہ مصری	۰	۶۷۲	۹۰ 〃
۶۷۹	قاضی عز الدین	۰	۶۷۲	۷۱ 〃
۶۸۰	ناصر الدین علی	۰	۶۷۲	۹۲ 〃
۶۸۱	ابن محمدؒ	۰	۶۷۲	۷۵ 〃
۶۸۲	امام دمیاطی	۶۱۳	۷۰۵	۹۲ 〃
۶۸۳	شمس الدین	۰	۷۰۵	۸۰ 〃
۶۸۴	شرف الدین مالکی	۰	۷۰۵	۹۶ 〃
۶۸۵	شیخ القراء بدر الدین	۰	۷۰۵	۷۷ 〃
۶۸۶	فزاری	۰	۷۰۵	۷۵ 〃
۶۸۷	ابن طاہری	۶۲۶	۶۹۶	۷۰ 〃
۶۸۸	زین الدین	۰	۶۹۶	۸۶ 〃
۶۸۹	ضیاء الدین مصری	۰	۶۹۶	۷۸ 〃
۶۹۰	تاج الدین شافعی	۰	۶۹۶	۹۳ 〃
۶۹۱	عز الدین	۰	۶۹۶	۶۵ 〃
۶۹۲	ضیاء الدین انصاری	۰	۶۹۶	۸۳ 〃
۶۹۳	شمس الدین مقدسی	۰	۶۹۶	۷۶ 〃
۶۹۴	ابن عبداللہ اسوی	۰	۶۹۶	۶۳ 〃
۶۹۵	محی الدین مقدسی	۰	۶۹۶	۶۴ 〃
۶۹۶	بدر الدین یوسف	۰	۶۹۶	۷۷ 〃
۶۹۷	ابو ثعلب قارونی	۰	۶۹۶	۹۱ 〃
۶۹۸	شیخ الاسلام تقی الدین	۶۲۵	۷۰۲	۷۷ 〃
۶۹۹	شرف الدین دمشقی	۰	۷۰۲	۸۹ 〃
۷۰۰	بدر الدین دمشقی	۰	۷۰۲	۷۳ 〃

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۷۰۱	ابن محی نماز	•	۷۰۲	۸۳ سال
۷۰۲	عبداللہ قرطبی	•	۷۰۲	۹۹ ″
۷۰۳	ابن الزبیر	۶۲۷	۷۰۸	۸۱ ″
۷۰۴	ابو جعفر	•	۷۰۸	۹۴ ″
۷۰۵	شیخ مستنصر اسمعیل	•	۷۰۸	۸۷½ ″
۷۰۶	ابن فرح	۶۲۴	۶۹۹	۷۵ ″
۷۰۷	امیر حاج عماد الدین	•	۶۹۹	۹۰ ″
۷۰۸	ابو الفضل	•	۶۹۹	۸۵ ″
۷۰۹	شمس الدین عباسی	•	۶۹۹	۹۴ ″
۷۱۰	بہار الدین برزالی	•	۶۹۹	۶۳ ″
۷۱۱	شیخ الادبا جمال الدین	•	۶۹۹	۹۴ ″
۷۱۲	ابوطالب غسانی	•	۶۹۹	۹۴ ″
۷۱۳	شیخ الادب ابو الحکم	•	۶۹۹	۹۵ ″
۷۱۴	ابو زید انصاری	•	۶۹۹	۹۴ ″
۷۱۵	امام تقی الدین	•	۶۶۲	۸۳ ″
۷۱۶	قاضی کمال الدین	•	۶۶۲	۷۰ ″
۷۱۷	ابن قدامہ	•	۶۸۲	۸۵ ″
۷۱۸	ابن ابی دہران	•	۶۸۲	۶۸ ″
۷۱۹	محی الدین ابو الخطاب	•	۶۸۲	۸۳ ″
۷۲۰	ابو اسحٰق نابینا	•	۶۸۲	۷۶ ″
۷۲۱	قاضی القضاۃ نجم الدین	•	۷۲۳	۶۸ ″
۷۲۲	صفی الدین	•	۷۲۳	۷۶ ″
۷۲۳	ابن الفوطی	•	۷۲۳	۸۱ ″
۷۲۴	بہار الدین	•	۷۲۳	۹۴ ″
۷۲۵	ابو نصر شیرازی	•	۷۲۳	۹۵ ″
۷۲۶	تاج الدین قشیری	•	۷۲۳	۸۷ ″
۷۲۷	ابن عبد القصیری	•	۷۱۱	۹۶ ″
۷۲۸	ام محمد فاطمہ	•	۷۱۱	۸۶ ″
۷۲۹	ابن ابی جرادہ	•	۷۱۱	۷۸ ″

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۷۳۰	ابو عبداللہ دباہی	•	۷۱۱	۸۴ سال
۷۳۱	ابو المعالی	•	۷۱۱	۷۳ ″
۷۳۲	ابو البرکات زاہد	•	۷۱۱	۸۷ ″
۷۳۳	منشی فاضل جمال الدین	•	۷۱۱	۸۲ ″
۷۳۴	رشید الدین	•	۷۱۱	۸۶ ″
۷۳۵	شیخ الاسلام ابن تیمیہ	۶۶۱	۷۲۸	۶۷ ″
۷۳۶	عز الدین عراقی	•	۷۲۸	۹۰ ″
۷۳۷	قاضی جمال الدین یوسف	•	۷۲۸	۸۲ ″
۷۳۸	جمال الدین عاقولی	•	۷۲۸	۹۰½ ″
۷۳۹	جمال الدین فقیہ	•	۷۲۸	۸۹ ″
۷۴۰	ابو الحجاج	۶۵۴	۷۴۲	۸۸ ″
۷۴۱	حافظ شہید ابو الحسین	•	۷۰۱	۸۱ ″
۷۴۲	علی ابن مسعود	•	۷۰۴	۷۰ ″
۷۴۳	شرف الدین فزاری	•	۷۰۵	۷۵ ″
۷۴۴	ابو محمد برزالی	۶۶۵	۷۳۹	۷۴ ″
۷۴۵	قطب الدین مصری	۶۶۴	۷۳۵	۷۱ ″
۷۴۶	شیخ الحرم فخر الدین	•	۷۱۳	۸۳ ″
۷۴۷	علاء الدین	۶۴۰	۷۱۶	۷۶ ″
۷۴۸	نجم الدین	•	۷۰۳	۷۴ ″
۷۴۹	ابو الحسن شافعی	•	۷۲۴	۷۰ ″
۷۵۰	نجم الدین سفراوی	•	۷۰۲	۷۸ ″
۷۵۱	شرف الدین صابونی	•	۷۲۰	۷۶ ″
۷۵۲	محمد ابن مسلم	•	۷۲۶	۶۵ ″
۷۵۳	فخر الاسلام صدر الدین جوینی (انھوں نے سلطان غازان ہلاکو خاں کے پوتے کو مسلمان کیا)	•	۷۲۶	۷۸ ″
۷۵۴	زین الدین	۶۶۳	۷۲۶	۶۳ ″
۷۵۵	تقی الدین سبکی	۶۸۳	۷۵۶	۷۳ ″

نمبر شمار	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	مدت عمر
۷۵۶	ضیاء الدین سنبلی	۰	۹۹۶	۸۳ سال
۷۵۷	ابن البزازی صاحب فتاوای بزازیہ	۷۲۹	۸۱۶	۸۷ 〃
۷۵۸	امام جزری	۷۵۱	۸۳۳	۸۲ 〃
۷۵۹	علاء الدین علی	۹۱۸	۹۷۹	۶۱ 〃
۷۶۰	مفتی ابی سعود	۸۹۸	۹۸۲	۸۴ 〃
۷۶۱	قاضی القضاۃ ابن خلکان	۶۰۸	۶۸۱	۷۳ 〃
۷۶۲	سید شریف جرجانی	۷۴۰	۸۱۸	۷۸ 〃
۷۶۳	احمد زرکشی	۶۵۱	۷۴۵	۹۴ 〃
۷۶۴	علامہ تفتازانی	۷۲۲	۷۹۲	۷۰ 〃
۷۶۵	شیخ الاسلام اسبیجابی	۴۵۴	۵۳۵	۸۱ 〃
۷۶۶	ابن محمود موصلی	۵۹۹	۶۸۳	۸۴ 〃
۷۶۷	امام بزدوی	۴۰۰	۴۸۲	۸۲ 〃
۷۶۸	امام ذہبی	۶۷۳	۷۴۸	۷۵ 〃
۷۶۹	ابن حجر عسقلانی	۷۷۳	۸۵۲	۷۹ 〃
۷۷۰	امام سخاوی	۸۳۱	۹۰۲	۷۳ 〃
۷۷۱	شیخ عبد الحق محدث	۹۹۸	۱۰۵۲	۹۴ 〃
۷۷۲	شاہ عبد الرحیم دہلوی	۰	۱۱۳۱	— 〃
۷۷۳	شاہ ولی اللہ دہلوی	۱۱۱۴	۱۱۷۹	۶۵ 〃

(محمد حبیب الرحمن خان شروانی)

روانی آب

ہمارے مخدوم خان بہادر مولوی سید اکبر حسین ڈسٹرکٹ و سشن جج الہ آباد نے انگریزی زبان کی ایک مشہور شاعر سودی کی ایک نظم کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے۔ یہ اُردو نظم دو پنی ریڈنگ کے ایک جلسے کے لیئے تیار کیگئی تھی۔ جو لوگ سودی کی اصلی نظم سے واقف ہونگے، اُن کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ ہمارے مخدوم نے اُس نظم کی مشکلات پر کیونکر فتح پائی ہے۔ نظم کا موضوع "روانی آب" ہے جسمیں شاعر نے پانی کی رفتار اور اُس کی مختلف اوضاع و اصوات کو انگریزی زبان کے مختلف افعال سے تعبیر کیا ہے۔ اُردو میں اُن کے لیئے اس کثرت سے افعال تجویز کرنا (اگرچہ اُن میں سے بعض افعال بطور استعاری کے استعمال کیئے گئے ہوں) اور اس روانی اور لطافت سے اصل مضمون کو بیان کر جانا فی الحقیقت انھیں کا کام تھا۔ ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیئے ہم اس نظم کو نہایت مسرت سے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

وہ سودی سخنگوی شیریں مقال — جو انگریزی شاعر تھا اک بے مثال
بہ فرمایش دختر باتمیز — کہ رکھتا تھا جسکو وہ دلسے عزیز
لکھی اُسنے ہے نظم اک لاجواب — دکھائی ہے شکل روانی آب
جو بہتا ہے پانی سیان لڈوبر — اُسیکا دکھایا ہے شاعر نے زور
مناسب جو انگلش مصادر ملے — سقفے کیئے اُن کو سب سلسلے
یہ جمعیت افعال کی خوب لی — کہ دلکشی بھی ہے اور دلچسپ بھی
یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن — کہ میں بھی ہواؤں سخن میں طرف زن
دکھاؤں روانی دریا ئی فکر — کہ گو وہ شناسا نہیں ہو جسکا ذکر
عجب ہے نہیں اُنکی اسپر نظر — کہاں میں، کہاں سودی نامور
سوا اسکے ہیں اور بھی مشکلیر — نہیں سہل اس راہ کی منزلیں
مری پاس سرمایہ کافی نہیں — وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق — ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق
اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط — معانی میں پیدا نہو ربط و ضبط
سوانح یہ میں جن سے ڈرتا ہوں میں — مگر خیر۔ کچھ فکر کرتا ہوں میں
جو تفصیل و تحقیق کہہ چکا بر ملا — غرض کیجئے اب یہ پانی چلا
اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

یہ بہتا ہوا اور وہ تھمتا ہوا　　ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا　　رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں کی روزن، زمیں کے مسام　　یہ ہی کر رہا ہر طرف اپنا کام
اِدھر پھولتا اور بچکتا اودھر　　رُخ اِس سمت کرتا، کھسکتا اودھر
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا　　چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا　　یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا، غل مچاتا ہوا　　وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا　　یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
اِدھر جھومتا اور چھلکتا ہوا　　اودھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا، جوش کھاتا ہوا　　بگولا کرو کف منھ پہ لاتا ہوا
وہ اونچے سُروں میں ترنّم کا راگ　　وہ خود جوش میں آ کے لاتا یہ جھاگ
سُر دھرتا ہوا اور سنورتا ہوا　　تھرکتا ہوا، رقص کرتا ہوا
اِدھر گونجتا، گنگناتا ہوا　　اودھر خود بخود گنگناتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا　　یہ پھٹتا ہوا، وہ سمٹتا ہوا
سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا　　سرکتا ہوا اور پلٹتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا　　اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا　　دباتا ہوا اور لپٹتا ہوا
پھسلتا ہوا، ڈگمگاتا ہوا　　لچکتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا
یہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا　　وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا　　ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا　　ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
لرزتا ہوا، تلملاتا ہوا　　بلکتا ہوا، بلبلاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا　　نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اوچکتا ہوا اور دوڑتا ہوا　　اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا　　زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا　　وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا　　وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا، وندناتا ہوا　　اومنڈتا ہوا، سنسناتا ہوا
پھسلتا ہوا اور جھلکتا ہوا　　سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا　　حبابوں کی فوجیں بھڑاتا ہوا
تڑپتا ہوا، جگمگاتا ہوا　　شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہیں الغرض ہے یہ پانی رواں　　بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں

وہ سودیؔ کا سیلانِ آبِ لذیذ
یہ بحرِ خیالاتِ اکبرؔ کا زور

مسلمانوں کی تاریخ گوئی کا تاریخی بیان

مسلمانوں کے ہاں یہ نہایت آسان طریقہ ہے کہ وہ ایک واقعے کی تاریخ کو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ جن کے حرفوں کی اعداد بحسابِ ابجد جمع کیے جائیں تو اُس واقعے کا سنہ وقوع معلوم ہو جائے۔ ایسی تاریخیں مورخوں کے بہت کام آتی ہیں اسلیئے کہ واقعات کے سنہ و تاریخ کے ہندسوں میں کاتبوں سے اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں جنکے صحیح کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ مگر جب سنہ الفاظ میں بحسابِ ابجد بیان ہوتے ہیں تو اُن میں تحریف و غلطی کا احتمال بہت کم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں بھی ایک طریقہ اسی قسم کا تاریخ لکھنے کا ہے مگر اسکا رواج نہیں۔ شاذ و نادر ہی وہ کام میں لاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تو زمانۂ حال میں اسکا وہ رواج ہو گیا ہے کہ کوئی کم بخت کتاب ایسی تصنیف ہوتی ہو گی کہ جسکی تاریخیں خود مصنف یا اُسکے دوست آشنا نہ کہتے ہوں گے بعض کتابوں کا نام بھی تاریخی ہوتا ہے۔ بعض شخص اولاد کا نام تاریخی رکھ دیتے ہیں کہ ہر وقت عمر معلوم ہوتی رہے۔ سال گرہوں کی گرہیں نہ گنتی پڑیں۔ نامور شاعروں کے مرنے کی تاریخیں اتنی کہی جاتی ہیں کہ اُن کی عمروں کے سالوں سے کیا مہینوں سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ غالب و ذوق کے مرنے کی تاریخیں اتنی کہی گئی ہیں کہ اگر سب کو جمع کیا جاوے

تو ایک دیوان مرتب ہوتا ہے - دبیر و انیس کی وفات کی تاریخیں اُن کے مرثیوں کی تعداد سے کم نہ ہونگی - جیسے مرنے کی تاریخیں کہی جاتی ہیں ایسی ہی پیدا ہونے کی بھی - اُمرا کے ہاں جب بچے پیدا ہوتے ہیں تو متوسل شاعروں کو تاریخ کہنے کا موقع ملتا ہے اور ہیجڑوں بھانڈوں کیطرح اونکو بھی کچھ دیا جاتا ہے - کچھ اس ولادت و وفات ہی پر تاریخ کا حصر نہیں بلکہ اور تقریبات میں مثل بسم اللہ و ختنہ و نکاح کے لیئے بھی تاریخیں کہی جاتی ہیں - بادشاہوں کی تخت نشینی جشنوں اور فتوحات اور ان کے عہد سلطنت کے واقعات عظیم کی بھی تاریخیں شاعر کہتے ہیں اور بڑی بڑی صنعت اور ایہام کرتے ہیں -

علم ادب کی ہر فرع اپنی اصل کی تاریخ کا بغچہ بغل میں لیے بیٹھی ہوئی ہے - سب جانتے ہیں کہ علم ادب کی ہر فرع کو نشو و نما بتدریج ہوا ہے - اسیطرح تاریخ کو جو علم ادب کی ایک فرع ہے بتدریج فروغ ہوا ہے - اور اساتذہ نے اسکے واسطے قواعد مقرر کیئے ہیں کہ جن کے موافق اُن کے عیب و صواب کے امتحان ہوتے ہیں - حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کے زمانے سے پیشتر شعرا کے کلام میں تاریخوں کا پتہ کہیں نہیں ملتا - زیادہ تر فروغ اسکو حضرت جامی کے زمانے سے ہوا ہے - اُن کے بعد بہت سے شعرا کے کلام میں اشعار تاریخ نظر آتے ہیں - نویں صدی کے آخر میں شعرا نے اسکو فرع نظم قرار دیکر قواعد منضبط کیئے جس کے بعد پھر اُن میں کوئی ترمیم و تغیر و تبدل نہیں ہوا - اس اوپر کے بیان کی تصدیق زیادہ تر عمارات کے کتابوں سے ہوتی ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں - دسویں صدی سے پہلے کا کوئی کتابہ ایسا نہیں ملتا کہ جس میں کوئی نظم کا مصرع یا نثر کا فقرہ تاریخی ہو - اگر کوئی کتابہ ایسا کہیں نظر آجائے کہ جس کا کوئی مصرعہ یا فقرہ تاریخی ہو تو اسکو یہ جان لینا چاہیے کہ وہ زمانہ مابعد میں نصب کیا گیا ہے گو اُس تاریخ میں دسویں صدی سے پہلے کا سنہ موجود ہو مگر وہ تاریخ پیچھے کہی گئی ہے - بعض

شاعروں کو تاریخ گوئی کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ وہ تمام واقعات گذشتہ کی تاریخیں کہہ ڈالتے ہیں یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات کا یہ شعر موجود ہے ؎

نتوان گفت دُرز دریا شد   بلکہ گویم کہ جاں ز دنیا شد

(سلہ ہجری) اور اسیطرح تمام اصحاب و اعیان کی تاریخیں شاعروں نے کہہ ڈالی ہیں -

سکوں پر تاریخ کا سکہ کسینے سوا جہانگیر کے نہیں جمایا - اسی کی اشرفی ہے جسپر یہ شعر منقش ہے ؎

شد چو خورشید زر سکہ نورانی جہاں   آفتاب ملک شد تاریخ آں

گو نویں ۹ صدی کے آخر میں تاریخ بھی ایک نظم کی فرع ہوگئی اور شعرا اس میں طبع آزمائیاں کرنے لگے مگر یہ نہیں ہے کہ پہلے شاعر تاریخ کے مضمون سے بیخبر تھے - حضرت جامی کے زمانے سے پہلے زمانے کی بہت سی تاریخیں موجود ہیں مگر اُن میں بجای الفاظ و فقروں کے ابجد کے حروف جڑے ہوئے بے معانی الفاظ ہوتے تھے جنکے اعداد سے سنہ معلوم ہوتا تھا - جیسے تربینی ضلع ہگلی میں ظفرخاں کی مسجد کی تعمیر کی یہ تاریخ ہے ؎

بتاریخ حا من سنین و صادہا   وخا رحروف الوقف حسنان فاشر

اس میں - ص - ح و خ یعنی ۹۰ + ۸ + ۶۰۰ کل ۶۹۸ نکلتے ہیں - منہاج سراج میں ساتویں صدی کی یہ تاریخ لکھی ہے ؎

آدینہ و سلخ ماہ شوال لقب   خا بود و دو نون و دال تاریخ عجب

شد کوچ تمرخان و طغاخان ز جہاں   او اول شب گذشت وایں آخر شب

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعے کے روز بتاریخ ۲۹ - شوال ۶۵۴ھ میں ان دونوں کا انتقال ہوا - اس سے پہلے زمانے کی تاریخ جو حکیم بو علی سینا کی ولادت و وفات و تحصیل علم کی ہے وہ یہ ہے ؎

حجۃ الحق ابو علی سینا   در شجع آمد از عدم بوجود

در شصا کسب کرد کل علوم   در تکز کرد ایں جہاں پدرود

یعنی ۸۳۲ھ میں پیدا ہوا ۸۹۱ھ میں تحصیل علم سے فارغ ہوا ۹۲۴ھ میں اس جہان سے رخصت ہوا۔

ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ متقدمین نے تاریخ گوئی پر توجہ نہیں کی اور اس فن کو مدوّن نہیں کیا۔ اگر اس زمانے میں پہلے زمانے کی طرح کوئی شاعر تاریخیں کہے تو اُسکا خوب مضحکہ اُڑے۔

جو کچھ اوپر ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں کسطرح کی تاریخیں متقدمین شعرا ارشاد کیا کرتے تھے اور تاریخ گوئی کو شاعری کے مرتبے سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ آٹھویں صدی میں شاعر بڑے لطف کے ساتھ تاریخیں کہنے لگے تھے۔ جب تیمور نے روم پر حملہ کیا ہے تو اُسکی فتح کی تاریخ کس لطف کے ساتھ اس آیت سے نکالی ہے کہ غُلِبَتِ الرُّومُ فِيٓ اَدْنَى الْاَرْضِ یعنی روم پر غلبہ پایا۔ ارض کے آخر میں یعنی ضاد میں جسکے تین حرفوں کے اعداد سے ۸۰۵ھ نکلتے ہیں۔ غرض جو پُرانا طریقہ تاریخ گوئی کا تھا وہ نویں صدی میں کالعدم ہوگیا تھا اس کے بعد تاریخوں اور تذکروں میں اس قسم کی تاریخوں کا تلاش کرنا عبث ہے حضرت جامی علیہ الرحمۃ نے اپنے تیسرے دیوان کے ختم ہونے کی تاریخ تَمَّمْتُہٗ یعنی میں نے اسکو ختم کیا۔ کہی ہے (۸۹۵ھ)۔

ملا منیر بخاری نے بابر کی پیدائش کی یہ تاریخ کہی ہے

چوں در شش محرم آمد شہ کرم تاریخ سال آں ہم آمد شش محرم

یعنی ۶ - محرم ۸۸۸ھ۔

جب سے حضرت جامی کی توجہ عالی تاریخ کی طرف ہوئی وہ ایک فن ہوگیا اول انہوں ہی نے ایک رسالہ ایسا لکھا کہ جسمیں ایسے الفاظ یکجا جمع کرکے جدا جدا لکھے کہ ان کے حرفوں کے عدد مساوی تھے۔ جن شاعروں نے عمدہ عمدہ تاریخیں لکھی ہیں وہ سب اُن کے خوشہ چیں ہیں۔ انھیں کے رسالے کو دیکھ کر جس عدد کا لفظ چاہتے ہیں آسانی سے نکال لیتے ہیں۔

علی شیر وزیر سلطان میرزا ہراتی نے جب مدرسہ تعمیر کرایا۔ اور عطار اللہ کو اُسکی تعمیر کا اہتمام سپرد کیا تو اس ناموَر شاعر نے اسکی یہ تاریخ کہی ہے ؎

چوں مدرسہ ساخت میر عالم ادب
فرمود مرا افادۂ اہل طلب
چوں در ششم ماہ رجب کرد احلاک
تاریخ طلب از ششم ماہ رجب

(یعنی ۶ - رجب ۸۹۰ھ)۔

میر علی شیر خود بھی فارسی اور ترکی زبان کے جاننے میں بڑا مشہور تھا۔ اُسکو تاریخ گوئی کا شوق تھا چنانچہ اسنے حضرت جامی کی وفات کی تاریخ یہ کہی ہے ؎

کاشف سر الٰہی بود بیشک ازاں سبب
گشت تاریخ وفاتش کاشف سر الٰہ

(۸۹۸ھ) نویں صدی کے آخر سے فن تاریخ کا فروغ شروع ہوا ہے۔ اس زمانے سے کتب سیر و تاریخ و تذکرہ و عمارات کے کتبوں اور قبروں کے تعویذوں میں تاریخوں کی افراط پائی جاتی ہے۔ خواجہ حسین ہروی نے شاہزادۂ سلیم کی ولادت کی مبارکباد میں اکتیس۳۱ اشعار اکبر کو نذر میں پیش کیے جنکے ہر مصرعے میں مادۂ تاریخ تھا بادشاہ نے اس تاریخ کے صلے میں دس ہزار روپے اسکو انعام دیے۔ سب سے زیادہ کمال ملا محتشم نے اس تاریخ میں کیا ہے جو اُسنے شاہ اسمٰعیل ثانی کی نذر میں پیش کی ہے۔ اس میں چند رباعیاں تھیں یعنی ۲۴ مصرعے ہر مصرعے کے حرفوں کے اعداد جمع کرنے سے ۹۸۴ھ کے اعداد نکلتے تھے۔ کمال یہ تھا کہ کل چوبیس مصرعوں کے چوبیس۲۴ ہی حروف معجمہ (نقطہ دار) اور چوبیس۲۴ ہی حروف مہملہ (بے نقطہ) کے تھے۔ اور اگر ۴۸ حرفوں میں دو دو حرفوں کا اجتماع ہو تو ۴۸×۴۷/۲ = ۱۱۲۸ ہوتے ہیں

اسیلئے ملا محتشم نے کہا کہ میری تاریخ میں سے ۱۱۲۸ تاریخیں نکلتی ہیں۔ تذکرہ طاہر نصیر آبادی سے اس تاریخ کی ایک رباعی نقل کیجاتی ہی اس میں ناظرین دیکھہ لیں کہ ہر مصرعہ میں حروف معجمہ اور مہملہ میں سے ہر ایک کے اعداد ۲۹۲ ہوتے ہیں۔ پس ہر شعر کے مہملہ و معجمہ حرفوں کو ترتیب و اجتماع کرو تو گیارہ سو اٹھائیس تاریخیں نکلتی ہیں۔ رباعی

میشد چو ز منع رازقِ پاک جلیل
ملک و فلک و ملک بدارا تحویل
ہر ملک و تجمل کہ ہم بود ز لطف
دہر آں ہمہ فگند بشاہ اسمٰعیل

ان قیود کے ساتھ تاریخ کا کہنا اور پھر اسکے ساتھ صنائع شعری کا ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑے کمال کی بات ہی۔ جو فن تاریخ گوئی میں صاحب کمال ہوتے ہیں وہ فقط اپنے ہی زمانے کے واقعات کی تاریخ نہیں کہتے بلکہ پہلے زمانے کے واقعات عظیمہ کی تاریخیں بھی کہہ ڈالتے ہیں اور اور شاعروں کی تاریخوں کو جمع کر کے ایک کتاب بناتے ہیں۔ بدایونی کی تاریخ منتخبات میں اور مختار خاں کی مرآۃ العالم میں دیکھہ لیجئے کہ کیا کیا تاریخیں اس طرح کی لکھی ہوئی ہیں۔ تذکرہ طاہر میں تو چیستانوں اور تاریخوں کا دفتر موجود ہی۔ تاریخوں کے بعض شوقینوں نے ان تاریخوں کو جمع کر کے ایک کتاب بنائی ہی جسمیں اول سے آخر اپنے عہد تک اولیا، امرا اور سلاطین ذی شان وغیرہ کی وفات و ولادت اور اُنکے زمانے کے واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں۔

اقسامِ تاریخ

(۱) تاریخ مطلق۔ اس میں کل مصرعہ کے یا اُس کے ایک حصے کے حرفوں سے تاریخ نکلتی ہی جیسے کہ دہلی میں شہر شاہجہاں کی تعمیر کی تاریخ یہ ہی کہ۔

شد شاہجہاں آباد از شاہ جہاں آباد (۱۰۵۸ھ)

(۲) تاریخ تعمیہ و تخرجہ۔ اس کے اندر ایک اشارہ بعض حروف کے اعداد کے زیادہ کرنے یا خارج کرنے کا ہوتا ہی اس کم زیادہ کرنے کے بعد حروف کے اعداد سے تاریخ نکلتی ہی۔ چنانچہ برسنگھ دیو بندیلہ نے ابوالفضل کو قتل کیا ہی اور جہانگیر بادشاہ کے روبرو اسکا سر رکھا گیا ہی تو یہ تاریخ ایک شخص نے کہی تھی ؎

تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

باغی کا سر ے ہی جسکے عدد دو ہیں اُسکو کاٹا یعنی خارج کیا تو تاریخ ۱۰۱۳-۲ یعنی ۱۰۱۱ھ حاصل ہوئے۔

(۳) تاریخ توشیح۔ اشعار کے اول حرفوں کے اعداد کے جوڑنے سے تاریخ نکلے۔

(۴) تاریخ صوری و معنوی۔ الفاظ میں جو تاریخ ہو وہی اُس کے حروف کے اعداد سے نکلے جیسے تاریخ وفات شاہ بابر۔ در نہصد و سی و ہفت بودہ جیسی کہ لفظوں کے معنی سے تاریخ ۹۳۷ھ نکلتی ہی ویسی ہی نہصد و سی و ہفت کے حرفوں کے اعداد کی

قواعدِ کلیہ تاریخ

(۱) حروف کے اعداد وہی لیئے جاتے ہیں جو ابجد ہوز وغیرہ میں مقرر کیئے گئے ہیں حروف جو مخصوص فارسی یا ہندی وغیرہ زبانوں سے ہیں اُن کی اعداد وہی لیئے جاتے ہیں جو اُن کے مناظر یا مماثل عربی زبان میں حروف ہیں جیسے کہ گ۔ چ۔ پ۔ ژ کے وہی اعداد لیئے جاینگے جو ک۔ ج۔ ب۔ ز کے ہیں۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ کے وہی اعداد لیئے جاینگے جو ت۔ د۔ ر کے ہیں۔

(۲) تاریخ میں بلحاظ مکتوبی الفاظ کے حساب ہوتا ہی ملفوظی الفاظ کے لحاظ سے حساب نہیں ہوگا۔ اسیلئے تشدید و مد کے دو حرف اور الف جیسے کہ رحمٰن میں ہی اعداد کے حساب میں نہیں شمار ہونگے مگر بعض الفاظ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں جیسے کہ ستر (بعید) اکثر اس کے عدد ۹۶۰ لیئے جاتے ہیں تاکہ اسکی

فارسی زبان کے لفظ سنہ اور ہندی کے لفظ سنہ سے تیز ہو جائے۔ اگر الف ممدودہ کو دو شمار کرنا ہو تو بجای ایک الف کے دو الف لکھنے چاہئیں اور جب رحمن کے الف کو شمار کرنا منظور ہو تو رحمان لکھنا چاہیئے۔

(۳) فارسی اردو و ہندی میں ہمزہ شاذونادر مستعمل ہوتا ہی اسلیئے اُسی ساقط کر دیتے ہیں، یا ی بنا لیتے ہیں جیسے کہ عربی الفاظ قائل و جزاء کو فارسی اور اُردو و ہندی زبان میں قایل اور جزای بنا لیتے ہیں مگر کبھی کبھی اس ہمزہ کو بھی الف کی گنتی شمار کر لیتے ہیں

(۴) تاریخ کا حصہ سنہ ہجری پر موقوف نہیں ہی وہ ہر سنہ کے لحاظ سے کہی جاتی ہی۔ عیسوی ہو یا سمت ہو، یا اور سنہ ہو مگر سنہ کا ظاہر کر دینا ضرور ہی۔

(۵) اکثر تاریخ کا مادہ ایک مصرعہ میں، یا اسکے کسی حصے میں ہوتا ہی۔ ایک بیت سے زیادہ میں نہیں ہوتا۔

ہندوؤں کی تاریخ گوئی

گو ہندوؤں کے ہاں تاریخ گوئی کا رواج زیادہ تر نہیں ہی مگر انکا علم ادب بھی اس سے خالی نہیں ہی۔ وہ جس سنہ کی تاریخ کہتے ہیں اُسکے ہندسوں کے مراتب کو الگ الگ لیتے اور ہر ہندسے کے موافق اس چیز کو لکھتے ہیں جسکی تعداد معین اس ہندسے کی برابر ہو۔ اور ان الفاظ کو اشلوکوں میں اسی ترتیب سے لاتے ہیں جو سنہ کے ہندسوں کی ترتیب سے مرتب ہوتے ہیں مثلاً ان کو ۱۵۷ کی تاریخ کہنی ہو تو وہ اول سورج کو لکھینگے جو ایک ہی ہی۔ پھر اندریان یعنی حواس لکھینگے جو پانچ ہیں، اور پھر دن لکھینگے جو سات ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار تاریخی میں چیستان و نغز کا مزہ آتا ہی۔ انھوں نے اعداد بہ تفصیل ذیل مقرر کیے ہیں۔

عدد	الفاظ
صفر	اکاش جسکے معنی خلاء غیر متناہی کے ہیں پس جہاں اعداد میں صفر کا کام پڑیگا وہاں اکاش کا لفظ استعمال کرینگے۔
۱	بھوم۔ زمین ایک ہی۔
۲	لوک۔ جہان۔ دو جہان ہیں۔ پرلوک اور یہ لوک۔
۳	اگنی۔ جو تیسرا نکشتر ہی۔
۴	یوگ۔ جگ۔ چار جگ ہیں۔
۵	بان۔ تیر کام دیو کے پانچ تیر مشہور ہیں
۶	رپو۔ دشمن۔ آدمی کے چھ دشمن ہیں۔ کام (شہوت) کرودھ (غصہ) لوبھ (لالچ) موہ (عشق) مد (غرور) مسرا (حسد)
۷	دویپ۔ جزیرہ۔ سات جزیرے مشہور ہیں
۸	گجا۔ ہاتھی۔ آٹھ ہاتھی زمین کو سہارے ہوئے ہیں۔
۹	گرہ۔ سبعہ سیارہ اور دو راہو اور کیتو یا دوار جو نو سوراخ آدمی کے اندر ہیں۔
۱۰	رودر۔ اس خاندان کے گیارہ راجہ مشہور ہیں۔
۱۱	ماس۔ ماہ۔ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں
	ایسی ہی ۲۷ تک اعداد ۲۷ نکشتروں کے ناموں سے میسر ہوتے ہیں۔
	(ذکاء اللہ)

جدید کتابیں

رہنمائے فوٹاگرفی
یا
اصولِ مصوری

ہمارے دوست حافظ محمد ابراہیم صاحب نے یہ کتاب فنِ تصویرِ عکسی پر حال میں تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب (۱۹۶) صفحوں پر تمام ہوئی ہے۔ اسکی تقطیع ۲۶ × ۲۰ ہے۔ اور اس میں (۱۳) ابواب اور (۸) فصلیں ہیں۔ اور ہر ایک فصل و باب کا بیان نہایت مشرح ہے اور ہر قسم کی تصویر بنانے کے قواعد علحدہ علحدہ تحریر کیے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) تصویرِ عمارت یا باغ و زمین کی بنانا۔

(۲) تصویرِ انسان یا جانور کی میدان پر بنانا۔

(۳) تصویرِ انسان کی مکان کے اندر بنانا۔

(۴) اکٹھی تصویر ایک بہت بڑی مجمع کی بنانا۔

(۵) تصویرِ قدِ آدم بنانا۔ بڑی تصویر کو نہایت چھوٹی کرنا۔ تصویر کی نقل ہو بہو اُتارنا۔

علاوہ اسکے اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ باب ششم و ہشتم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نگیٹو و پرنٹ میں کن اسباب سے نقص پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے دور کرنیکا علاج کیا ہے۔

یہ کتاب انگریزی زبان کی تیرہ[۱۳] کتابوں سے، جو اس فن میں مستند تصنیفات خیال کیجاتی ہیں اور جنکی فہرست ابتدا میں دی گئی ہے، اس کتاب کی تیار کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ کوئی مسئلہ اس فن کا ایسا نہیں ہے، جسپر مصنف نے بحث نہ کی ہو۔ اسوقت تک جتنی کتابیں اردو زبان میں اس فن پر شائع ہوئی ہیں غالباً یہ کتاب اُن سب سے بہتر ہے۔ سب سے عمدہ بات جو اس کتاب میں ہے، وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے آخر کتاب میں ایک فرہنگ طویل اصطلاحات کی دی ہے۔ یہ اصطلاحات بترتیب حروف تہجی مرتب کی گئی ہیں۔ ہر اصطلاح کا انگریزی تلفظ اوّل اردو خط میں، پھر انگریزی خط میں بتایا ہے۔ پھر اُن کے معنوں کی تشریح کی ہے۔ جن اصطلاحات کے معنی تفصیل طلب ہیں، اُن کے لیے کتاب کے صفحے کا حوالہ دیا ہے۔ اس فرہنگ کے بعد کتاب کے مضامین کی فہرست بھی بترتیب حروف تہجی شامل کی ہے۔ یہ انڈکس بالکل علمی قاعدے سے مرتب کیگئی ہے، تاکہ مطالعہ کرنے والے کو جس خاص مضمون یا اُس کے جزئیات کے دیکھنے کی ضرورت ہو، اُس کو کتاب میں آسانی سے نکال سکے۔ اسمیں اوّل مضمون کا عنوان ہے، جو جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ اُس کے ذیل میں چھوٹی چھوٹی سرخیاں اُس عنوان کے جزئیات پر مع نشانِ صفحات کے دی گئی ہیں۔ اُردو کتابوں میں کنٹنٹس یعنی فہرست مضامین بترتیب صفحات تو اکثر دیکھی جاتی ہے۔ لیکن انڈکس یعنی فہرست مضامین بترتیب حروف تہجی بہت کم لگائی جاتی ہے۔ پہلی قسم کی تمام فہرست کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس مضمون کو یا مضمون کے کسی جزئی مسئلہ کو پڑھنا مطلوب ہے، وہ کتاب کے کس صفحے پر ملیگا۔ دوسری قسم کی فہرست کا فائدہ یہ ہے کہ جس مضمون کو دیکھنا چاہو، اُسکو اُس حرف کی جدول میں تلاش کر لو، جس سے اُس مضمون کا نام شروع ہوتا ہے اور اگر اُس مضمون کی جزئی باتوں کو دریافت کرنا ہے، تو اصلی مضمون کے عنوان کو نکال کر اُس کی ماتحت سرخیوں کو پڑھ لو۔ عنوانوں اور ماتحت عنوانوں کے سامنے کتاب کے اُن تمام صفحات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن میں وہ مضمون درج ہے۔ اگر کتابوں کے ساتھ انڈکس

لگانے کا دستور عام طور پر جاری ہو جائے، تو پڑھنے والوں کا بہت سا قیمتی وقت بچ سکتا ہے۔ یہ کتاب فی الحقیقت نہایت اہتمام سے تیار ہوئی اور چھاپی گئی ہے۔ چھپائی نہایت پاکیزہ۔ خط نہایت عمدہ۔ کاغذ نہایت چکنا اور سفید۔ آلاتِ فوٹاگرفی کی تصویریں جو اس کتاب میں جابجا لگائی گئی ہیں، وہ بھی نہایت خوشنما اور صاف۔ غرضکہ جہانتک کتاب کے ظاہری اور باطنی حُسن میں اہتمام کرنا ممکن ہے، اُسمیں مصنف نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اسپر بھی قیمت صرف دو روپیہ رکھی گئی ہے۔ ہمکو اُمید ہے کہ جو نوجوان اس فن کو اپنی زبان میں سیکھنا چاہتے ہیں، وہ ضرور اس کتاب کو خرید کر مطالعہ کرینگے۔ درخواست اس پتہ پر ہونی چاہیئے (حافظ محمدؐ ابراہیم صاحب مصنفِ اصولِ مصوری۔ رسل گنج۔ علی گڈھ)

یاروں کی محنت برباد

انگلستان کے مشہور شاعر اور ڈراما نویس ولیم شیکسپیر کے ایک پلے کا اُردو ترجمہ اس نام سے شائع کیا گیا ہے۔ پلے کا اصلی نام لوز لیبرس لوسٹ ہے۔ اسکے مترجم مولوی محمد سلیمان صاحب بیرسٹرایٹ لا وکیل ہائی کورٹ حیدر آباد دکن ہیں۔ اس سے پہلے شیکسپیر کے کئی پلے اُردو میں ترجمہ کیئے گئے ہیں، مگر افسوس ہے کہ اُن میں رجالِ داستان کے نام بدل دیئے گئے ہیں اور اس سے قصے کا تمام پلاٹ غارت ہو گیا ہے۔ ترکوں نے، یا یورپ کی دوسری قوموں نے جو ترجمے اپنی زبانوں میں کیئے ہیں، اُن میں رجالِ داستان کے نام وہی ہیں، جو شیکسپیر نے لکھے ہیں۔ شیکسپیر کی تصنیفات میں ایک دشتکل یہ ہے اور وہ یہ کہ ایک زمانے میں یورپ کے باشندے بُت پرست تھے اور بہت سے دیوتاؤں کو مانتے تھے۔ عیسائی مذہب کے جاری ہونے سے دیوتاؤں کی پرستش تو جاتی رہی، لیکن شاعری میں دیوتاؤں کے نام اب تک باقی ہیں۔ اور اُن کے قصوں کی طرف مختصر اشارے کئے جاتے ہیں۔ جبتک دیوتاؤں کے حالات معلوم نہ ہوں، ڈراما اور اشعار کے پڑھنے میں کوئی لطف نہیں آ سکتا۔ مترجم ممدوح نے اس ترجمے کے آخر میں اُن تمام تلمیحوں اور قصہ طلب اشاروں کو حل کیا ہے، جو اس پلے میں داخل ہیں، تاکہ ڈراما کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مگر ہمکو یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ زبان کے لحاظ سے فاضل مترجم کو ایک نظر اُسپر اور ڈالنی چاہیئے۔ بہرحال ان کی محنت ضرور قابلِ شکریہ ہے۔ اس ترجمے کی قیمت ایکروپیہ ہے۔ اور مترجم صاحب سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

امیرانہ و غریبانہ زندگی۔

یونان کے مشہور فلاسفر زِنوفن نے اپنے ملک کے تاجدار ہائرو ثانی اس کے لیئے ایک اخلاقی رسالہ تصنیف کیا تھا، جس میں حکیمانہ طور پر امیروں اور غریبوں کی زندگی پر بحث کیگئی تھی۔ اس رسالے کا اُردو ترجمہ (غالباً انگریزی سے) مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب نے کیا ہے، جو (۵۰) صفحات (۲۲×۱۸) پر تمام ہوتا ہے۔ اسمیں شک نہیں ہے کہ یہ رسالہ جس موضوع پر لکھا گیا ہے، وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ خاصکر جب اُس میں ایک مشہور یونانی حکیم کے خیالات درج ہیں، تو اُسکا مطالعہ ہر شخص پر خواہ وہ امیر ہو یا غریب، لازم ہے۔ ہم مترجم کی اس قیمتی محنت کی دل سے داد دیتے ہیں۔ اسکی قیمت ہمکو معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ رسالہ مطبع معلم شفیق حیدر آباد دکن میں چھپا ہے۔

شہنشاہِ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ

۱۸۹۸ء کے آخر میں شہنشاہِ جرمنی نے جو بلادِ عثمانیہ کی سیر و سیاحت کی اور جس دھوم دھام سے سلطان المعظم نے اپنے معزز مہمان کا استقبال کیا اور جو شان و شوکت کے جلسے اُن کے خیر مقدم میں تمام ممالک محروسہ میں برپا ہوئے، اُنکا دلچسپ اور مفصل حال بطور ایک تاریخی واقعے کے (۸۶) صفحے کے ایک رسالے میں جمع کیا گیا ہے۔ اسکے مؤلف حافظ احمد علی خاں شوق مالک مطبع احمدی ریاستِ رام پور ہیں جنہوں نے نہایت محنت اور سلیقے سے عربی۔ ترکی اور انگریزی اخبارات سے اس رسالے کو مرتب کیا ہے۔ اس رسالے کی قیمت ۸ر ہے اور مؤلفِ ممدوح سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے۔

ملخصِ تسلیم

یہ (۱۱۸) صفحے کی کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اسکے مصنف منشی انوار حسین صاحب تسلیم مرحوم و مغفور ہیں جو مشہور شاعر تھے اور جو تاریخگوئی میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اس کتاب میں تاریخگوئی کے تمام قاعدے نہایت شرح و بسط سے درج کیے گئے ہیں۔ تاریخگوئی کے جسقدر اقسام ہیں، اُن سب کے نمونے اس کتاب میں موجود ہیں۔ اِس فن کے تمام نکات جو نہایت عجیب و غریب ہیں، اُس میں تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اس فن کی کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مولوی سید امجد علی مالک نیرِ اعظم و رئیس مرادآباد نے اس کتاب کو چھاپ کر اُن لوگوں پر بیحد احسان کیا ہے، جو اس فن کے جویا اور طالب ہیں۔ اِس کی قیمت عہ ہے۔ اور مولوی صاحب سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

لکچر

حکیم امین الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا

یہ لکچر جو انجمن حمایۃ الاسلام لاہور کے چودھویں سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا، (۱۰۸) صفحے پر چھاپا گیا ہے۔ حکیم صاحب نے مسلمانوں کے لیئے اس میں بہت سے عمدہ نصائح مذہب۔ اخلاق اور معاشرت کے متعلق درج کیئے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ مسلمان اس لکچر کو پڑھکر مستفید ہونگے۔ اس کی قیمت ۳ر ہے۔ اور انجمن حمایت الاسلام سے درخواست کرنے پر ملسکتا ہے۔

اُردو تعلیم حصّہ اوّل

اس کتاب کے مصنف خان بہادر مولوی سید علی محمد شاد آنریری مجسٹریٹ و رئیس پٹنہ ہیں۔ اسمیں الف با سے لیکر تمام مرکبات بتدریج اس طریقے سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ لڑکے نہایت آسانی سے دو مہینے میں اُردو عبارت لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ دوسرے حصّے میں (جو ابتک نہیں چھپا) اُردو زبان کی بیش قیمت معلومات درج کیگئی ہیں۔ دعوی کیا گیا ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد اُردو دانی کے لیئے کسی دوسری کتاب کی حاجت نہو گی۔ ہم پبلک سے سفارش کرتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم میں اس مفید اور عمدہ کتاب کی ضرور آزمائش کیجائے۔ کیا عجب ہے کہ یہ کتاب سررشتۂ تعلیم میں بعد تجربے کے مقبول ہو جائے۔ ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ مصنف ممدوح کو اُن کے ارادے میں کامیابی ہو۔ اِسکی قیمت عہ ہے۔ اور انھیں سے درخواست کرنے پر ملسکتی ہے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲ | یکم نومبر ۱۸۹۹ء | نمبر ۴

برسات کا پہلا دن

دُھندلا ہے آج منظرِ مطلع پہ تیرگی ہے
اُٹھتا ہے کچھ دُھواں سا، رہ رہ کے آسماں پر
بھیگی ہوئی ہوا ہے، بجلی تڑپ رہی ہے
جل تو جلال تو ہے، ہر ایک کی زباں پر
دیکھو وہ سر اُٹھایا سبزہ نے ناگہاں سے
مرجھاکے رہ گیا تھا جو دھوپ کی کرن سے

(۲)

منڈلا رہے ہیں بگلے، مل چل رہے ہیں مینڈک
پاکر سنک ہوا کی، لہریں مچل رہی ہیں
طوطے لٹک رہے ہیں آموں کی ڈالیوں میں
چیلیں گگن چڑھ کر، پہلو بدل رہی ہیں
وہ سانپ نکلتے ہیں، سایہ میں یاسمن کے
طاؤس ناچتے ہیں، وہ صحن میں چمن کے

(۳)

ہیں اب کہاں وہ شعلے اُٹھتے تھے جو زمیں سے
ہیں اب کہاں وہ کانٹے، پڑتے تھے جو زباں میں
ہیں اب کہاں وہ دریا، بہتے تھے جو جبیں سے
ہیں اب کہاں وہ پنکھے کھنچتے تھے جو مکاں میں
وہ دھوپ چلچلاتی، آتی نہیں نظر اب
بادِ سموم کے وہ جھونکے گئے کدھر اب

(۴)

دیکھو تو آسماں پر کیا حشر سا ہے برپا
کیا جھوم کر گھٹائیں، پورب سے آ رہی ہیں
وہ بدلیاں گرج کر کرتی ہیں شور کیسا
وہ بجلیاں چمک کر کیا تلملا رہی ہیں
پیدا ہے ٹھنڈی ٹھنڈی بادل میں کالا کالے
لو آگیا وہ پانی، بہنے لگے وہ نالے

آر - ایس

انسان کی زندگی کیونکر دراز ہو سکتی ہے

(۲)

اس مضمون کے پہلے نمبر میں بیان کیا گیا ہے کہ "جسطرح ہر جاندار کی جسامت - قوت - اعضا کی جنبش اور فنا و تجدید کی قابلیت محدود ہے، اسیطرح اُنکی زندگی بھی محدود ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ زندگی اُس حد سے آگے بڑھ جائے" انسان کی عمر فی الحقیقت ایک حد سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی کیسی ہی تدبیریں کیجائیں اور کیسی ہی قواعدِ صحت کی پابندی کی جائے کوئی اُس حد سے آگے انسان کی عمر کو نہیں بڑھا سکتا - جو عمر اُس حد تک ہے، وہ عمرِ طبعی کہلاتی ہے - عمرِ طبعی طوفانِ نوح سے پہلے (۵۰۰) اور (۹۰۰) سال کے درمیان بیان کی گئی ہے، مگر کوئی علمی شہادت، جسپر کامل طور سے وثوق ہو سکے، موجود نہیں ہے - تاریخ سے عام طور پر عمرِ طبعی کی حد (۱۲۰) سال نکلتی ہے اہلِ یورپ اس زمانے میں اُسکی مقدار (۱۰۰) سال قرار دیتے ہیں - جن ملکوں میں افلاس یا صغر سنی کی شادی کا دستور عام ہے، وہاں عمرِ طبعی اس سے بھی کم بیان کی جاتی ہے، مگر ان تمام اختلافات سے قطع نظر کرکے یہ امر تمام علماءِ طبیعیات میں مسلم ہے کہ انسان کی زندگی غیر محدود نہیں ہے، بلکہ محدود ہے، خواہ اُسکی حد (۱۰۰) سال ہو یا (۱۲۰) سال ہے - قرآنِ مجید میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، جہاں خدا فرماتا ہے - إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ٥ یعنی جب اجل (اجلِ طبعی) آتی ہے، تو زندگی نہ ایک ساعت کم ہوتی ہے، نہ آگے بڑھ سکتی ہے -

پس اس آیت میں عمرِ طبعی کا بیان ہے، جو قانونِ قدرت کی رو سے محدود اور معین ہے - اگر انسان عمرِ طبعی کو پہونچے، تو اُس میں ذرا کمی نہیں ہوتی، مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ اس سے زیادہ مدت تک زندہ رہے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بیشمار انسان عمرِ طبعی کو نہیں پہونچتے، بلکہ بہت سے اسباب اور بہت سے حالات ایسے پیش آتے ہیں، جو اُس وقت سے پہلے ہی انسان کو فنا کر دیتے ہیں - اُنھیں سے بعض اسباب ناگہانی ہیں اور اُنکا تدارک کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے، لیکن بہت سے اسباب ایسے ہیں، جن کا تدارک کرنا ممکن ہے - اور اگر اچھی طرح تدارک کیا جائے، تو غیر طبعی عمر آگے بڑھکر عمرِ طبعی کی حد تک پہونچ سکتی ہے - یہی اسباب جن سے انسان عمرِ طبعی تک پہونچ سکتا ہے، اس مضمون کے پہلے نمبر میں بیان کیے گئے ہیں اور انھیں اسباب پر ہم اس دوسرے نمبر میں بحث کرینگے -

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی آرزو کرنے سے بار بار منع کیا ہے اور بیسیوں حدیثیں ہیں جن سے درازیِ عمر کی ترغیب پائی جاتی ہے - مثلاً فرمایا ہے - كلما طال عمر المسلم كان له خيرا - یعنی مسلمان کی عمر جسقدر دراز ہو اُسیقدر اُسکے لیئے بہتری ہے - ایک حدیث ہے - إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَبْنَاءَ الثَّمَانِينَ - یعنی خدا اسی برس کی عمر والوں کو پسند کرتا ہے - ایک حدیث میں ہے - خيارکم اطولكم اعمارًا واحسنكم اعمالًا - یعنی اے مسلمانو تم میں اچھے وہی ہیں، جنکی عمریں دراز ہیں اور جنکے کام اچھے ہیں - اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر مسلمان کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ اُسکی عمر دراز ہو، تاکہ نیک اور عمدہ اور مفید کام کرنیکا زیادہ موقع ملے -

پہلے نمبر میں زندگی کے دراز کرنے کے لیئے جو امور بیان ہوئے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں -

(۱) روشنی (۲) حرارت (۳) آکسیجن (۴) پانی (۵) غذا (۶) نفسانی جذبات سے بچنا (۷) سخت محنت سے بچنا (۸) کافی نیند - امورِ مذکورۂ بالا سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہمکو ایسے مکان میں رہنا چاہیئے جو صاف اور پاک ہو، یعنی جس میں کافی روشنی اور حرارت اور ہوا کا گذر ہو

کیونکہ کوئی مکان بغیر اس کے کہ ان امور کا لحاظ کیا جائے پاک صاف نہیں رہ سکتا۔ پینے کے لیے صاف پانی مہیا رکھنا چاہیے۔ غذا۔ مباشرت۔ نیند اور جسمانی یا دماغی محنت میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اطبا نے ان امور کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے جو عملی اصول بتائے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہوادار اور صاف مکان میں رہو۔

(۲) صاف پانی پیو۔ اور کھانے پینے میں اعتدال کا خیال رکھو۔

(۳) زود ہضم غذا صاف برتنوں میں کھاؤ، اور قدری بھوک رہے، تو کھانا چھوڑ دو۔

(۴) ہر روز تازہ پانی سے غسل کرو اور پاکیزہ اور سفید کپڑے پہنو۔ ہلکی خوشبو استعمال کرو۔

(۵) معتدل جسمانی ریاضت کرو۔ سات یا آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ سوؤ۔

(۶) مسکرات سے بالکل پرہیز کرو۔ عیاشی اور بدکاری سے بچو۔

(۷) محنت جسمانی ہو، یا دماغی، اعتدال کے ساتھ کرو

(۸) غم اور فکر کو اپنے دل میں زیادہ راہ نہ دو اور ہر حال میں اپنے تئیں خوش رکھو۔

تمام امور متذکرۂ بالا کو ہم اختصار کے ساتھ تین لفظوں میں بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) صفائی (۲) اعتدال (۳) پرہیزگاری۔ یہی تین لفظ ہیں جن میں صحت اور درازی عمر کا راز چھپا ہوا ہے۔ اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس باب میں مذہب اسلام نے جو تمام اخلاقی۔ تمدنی اور روحانی امور میں ہمارا رہنما ہے، ہمکو کیا تعلیم دی ہے۔

متعلق صفائی کے باب میں ان احادیث پر غور کرو۔

ان اللہ طیب یحب الطیب نظیف یحب النظافۃ یعنی اللہ پاک ہے، اور پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ صاف ہے اور صفائی ہی چاہتا ہے۔ تنظفوا بکل ما استطعتم فان اللہ تعالیٰ بنی الاسلام علی النظافۃ۔ یعنی جسطرح ہو سکے، صفائی کا خیال رکھو۔ کیونکہ خدا نے اسلام کی بنیاد صفائی پر رکھی ہے۔ الاسلام نظیف فتنظفوا فانہ لا یدخل الجنۃ الا نظیفٌ۔ یعنی اسلام پاکیزہ ہے۔ پس تم بھی پاکیزگی کا خیال رکھو، کیونکہ جو شخص پاک صاف رہتا ہے، وہی جنت میں داخل ہوگا۔ اوّل ما یحاسب بہ العبد طہورہ۔ یعنی سب سے پہلے جس بات کی پرسش انسان سے ہوگی، وہ صفائی ہے۔ الطہور شطرٌ من الایمان۔ یعنی صفائی ایمان کا جز ہے۔

اعتدال کے لیے ذیل کی چند حدیثوں پر خیال کرو۔

الاقتصاد جزء من خمسۃ وعشرین جزء من النبوۃ یعنی اعتدال پیغمبری کا پچیسواں[۲۵] حصہ ہے۔ یا ایہا الناس علیکم بالقصد، علیکم بالقصد، علیکم بالقصد، یعنی اے لوگو اعتدال کی عادت اختیار کرو۔ اعتدال کی عادت اختیار کرو۔ اعتدال کی عادت اختیار کرو۔ (تاکید کے لیے تین دفعہ فرمایا)۔ علیکم من الاعمال ما تطیقون یعنی تم وہ کام کرو جو کر سکتے ہو۔ لا تشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم۔ یعنی تم اپنے نفسوں پر سختی نہ کرو۔ خدا بھی تم پر سختی کریگا۔

پرہیزگاری کے متعلق ان احادیث کو دیکھو۔

اکرم الناس اتقاہم۔ یعنی سب سے بزرگ وہی ہیں، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہیں۔ من رزق تقی فقد نال خیر الدنیا والاخرۃ۔ یعنی جسکو خدا نے پرہیزگاری کی عادت بخشی ہے، اسکو دنیا اور آخرت کی خوبیاں دیگئی ہیں۔ التقی کریم علی اللہ والفاجر شقی ھین علی اللہ۔ یعنی پرہیزگار آدمی خدا کو عزیز ہے اور بدکار خدا کے نزدیک ذلیل و بدبخت ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکدفعہ خطبے میں فرمایا کہ یا ایہا الناس

لا ان ربکم واحد الا ان اباکم واحد الا لا فضل عربی علی عجمی الا لا فضل لاسود علی احمر الا بالتقویٰ۔ یعنی ای لوگو تم سب کا خدا ایک ہے۔ تم سب کا باپ ایک ہے۔ عرب کے باشندے کو عجم کے باشندے پر اور سیاہ فام نسل کو سرخ فام نسل پر سوای پرہیزگار ہونے کے کوئی ترجیح نہیں ہے۔

یہ ایک اجمالی بیان تھا۔ اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُن تمام امور کی نسبت، جو صحت اور طوالت عمر کا باعث ہیں، مذہب اسلام نے کیا نصیحت کی ہے۔ سب سے اوّل ہم صفائی پر نظر ڈالتے ہیں۔ متعلق صفائی کی نسبت ہم چند احادیث بطور مثال کے لکھ چکے ہیں۔ اب ہم چند احادیث ہر چیز کی صفائی کے متعلق مثلاً درج کرنی چاہتے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ ہم اُن احادیث کو نقل کریں، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وضو اور غسل کے وہ تمام قواعد جو حدیث کی کتابوں میں درج ہیں، اُن کا مقصد اعظم صفائی اور پاکیزگی ہے۔ بدن کو صاف رکھنے کی تاکید خاصکر اس حدیث سے پائی جاتی ہے۔ طھّروا ھذہ الاجساد طھّرکم اللّٰہ۔ یعنی اے مسلمانو تم اپنے بدنوں کو پاک صاف رکھو، خدا بھی تم کو ہر قسم کی کثافتوں سے پاک صاف کریگا۔ مکان کی صفائی کے متعلق فرمایا۔ طھّروا افنیتکم فانّ الیھود لا تطھّر افنیتھا۔ یعنی ای مسلمانو تم اپنے مکانوں کے صحنوں کو پاک صاف رکھو۔ دیکھو یہودی اپنے مکانوں کو صاف نہیں رکھتے۔ یہ حدیث دوسرے الفاظ میں اس طرح روایت کیگئی ہے۔ طیّبوا ساحاتکم فانّ انتن الساحات ساحات الیھود۔ یعنی تم اپنے گھروں کے آنگن صاف اور پاکیزہ رکھو۔ دیکھو یہودیوں کے مکان سب مکانوں سے زیادہ گندے اور کثیف ہوتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے ایک دفعہ کچھ لوگوں سے، جو اپنے مکانوں کو گندہ اور کثیف رکھتے تھے، خطاب کرکے فرمایا۔ مالکم لا تنظفون عذراتکم۔ یعنی اے لوگو تمھاری کیسی بُری عادت ہے کہ تم اپنے گھروں کو پاک صاف نہیں رکھتے۔ ایک حدیث میں ہے۔ ترفع البرکۃ من البیت اذا کانت فیہ الکناسۃ یعنی برکت اُس مکان سے اُٹھ جاتی ہے، جس میں کوڑا اور کثافت ہو۔ کھانیکی صفائی اور پاکیزگی کے متعلق آنحضرتؐ فرماتے ہیں طھور الطعام یزید فی الطعام والدین والرزق یعنی کھانیکی صفائی اور پاکیزگی سے کھانے میں۔ دین میں اور روزی میں۔ ترقی ہوتی ہے۔ کھانے سے پہلے اور اُسکے بعد ہاتھ مُنہ دھونے اور صاف کرنے کے متعلق ان احادیث پر غور کرو۔ الوضوء قبل الطعام وبعدہ ینفی الفقر یعنی کھانے سے پہلے اور اُسکے بعد ہاتھ مُنہ دھونے سے افلاس دور ہوتا ہے۔ سعۃ الرزق الوضوء قبل الطعام وبعدہٗ یعنی کھانے سے پہلے اور اُسکے بعد ہاتھ مُنہ دھونے سے رزق میں وسعت ہوتی ہے۔ برکۃ الطعام الوضوء قبلہ والوضوء بعدہ یعنی کھانے سے پہلے اور اُسکے بعد ہاتھ مُنہ دھونے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ من احبّ ان یکثر اللّٰہ خیر بیتہ فلیتوضأ اذا حضر غداءہ واذا رفع۔ یعنی جو آدمی چاہتا ہے کہ خدا اُسکے گھر میں بہت سی برکتیں نازل کرے، اُسکو چاہیے کہ جب کھانا آئے اور جب کھانا بڑھایا جائے، ہاتھ مُنہ ضرور دھوئے۔ تخللوا علی اثر الطعام وتمضمضوا فانہ مصحّۃ للناب والنواجذ یعنی کھانے کے بعد خلال کرو اور کُلّی کرو، کیونکہ خلال اور کُلّی کرنا تمام دانتوں کیلئے موجب تندرستی ہے۔ لا یبیتنّ احدکم وفی یدہ غمر الطعام فان اصابہ شیٔ فلا یلومنّ الا نفسہ یعنی ای مسلمانو تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں سوئے کہ اُسکے ہاتھ کھانے کی چکنائی سے آلودہ ہوں۔

انسان کی زندگی کیونکر دراز ہوسکتی ہے؟

اگر اسکے بعد اُسکو کوئی تکلیف ہو جائے، تو اُسکو اپنے ہی تئیں ملامت کرنی چاہیئے۔ (کیونکہ اُسنے ہماری نصیحت پر عمل نہیں کیا)۔ سوتے وقت پاک صاف رہنے کے لیئے فرمایا۔ من بات علی طھارۃ ثم مات من لیلۃ مات شھیدًا۔ یعنی اگر کوئی شخص رات کو پاک صاف ہوکر سو جائے اور اُسی رات کو مرجائے، تو وہ شہیدوں میں شمار کیا جائیگا۔ الطاھر النائم کالصائم القائم یعنی جو شخص پاک صاف ہوکر سوتا ہے، وہ مرتبے کے لحاظ سے اُس روزہ دار کے برابر ہے، جو دن بھر نماز پڑھتا رہا ہو کئی حدیثوں میں سونے سے پہلے وضو کرنے کی تاکید ہے۔ کئی حدیثیں اس مضمون کی ہیں کہ سونے سے پہلے اور سو کر اُٹھنے کے بعد بستر کو جھاڑو۔ سونے سے پہلے کھانے پینے کے برتن ڈھکدو، تاکہ کوئی کثافت اُن میں گرنے نہ پائے۔ پاک صاف کپڑے پہننے کی تاکید ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ البسوا الثیاب البیض فانھا اطھر و اطیب یعنی اُجلے اور سفید کپڑے پہنو، کیونکہ وہ بہت پاکیزہ اور صاف ہوتے ہیں۔ خیر ثیابکم البیاض فالبسوھا احیاءکم وکفنوا فیھا موتاکم یعنی تمھارے لیئے سب سے اچھے کپڑے وہ ہیں، جو سفید اور اُجلے ہوں یہی زندوں کو پہناؤ۔ اور انھیں میں اپنے مُردوں کو کفناؤ جوتیوں کی نسبت یہ ارشاد ہوا۔ استجدوا النعال فانھا خلاخیل الرجال۔ یعنی جوتیاں نئی پہنو کیونکہ وہ مردوں کے لیئے زیور ہیں۔

اعتدال اور پرہیزگاری کے متعلق ذیل کی احادیث کو غور سے مطالعہ کرو۔

اذا اقل الرجل الطعام ملأ جوفہ نورًا یعنی جو شخص کھانا بھوک سے کم کھاتا ہے، وہ اندرونی روشنی سے بھر جاتا ہے۔ کلوا فی انصاف البطون یعنی آدمی بھوک کھانا کھایا کرو۔ من قل طعامہ صح بطنہ وصفا قلبہ ومن کثر طعامہ سقم بطنہ وقسا قلبہ۔ یعنی جو شخص کھانا کم کھاتا ہے، اُسکا جسم تندرست اور دل صاف رہتا ہے۔ اور جو شخص کھانا بہت کھاتا ہے، اُسکا جسم بیمار اور دل سخت ہو جاتا ہے۔ ما زین اللہ رجلاً بزینۃ افضل من عفاف بطنہ۔ یعنی خدا نے انسان کو اس سے زیادہ کوئی زینت کی چیز نہیں دی کہ وہ اپنے معدے کو صحیح و تندرست اور پاک و صاف رکھے۔ ان کثرۃ الاکل شؤم یعنی بہت کھانا بدبختی اور نحوست کی علامت ہے۔ حضرت عمرؓ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ایاکم والبطنۃ فی الطعام والشراب فانھا مفسدۃ للجسد مورثۃ للسقم مکسلۃ عن الصلوۃ وعلیکم بالقصد فیھا فانہ اصلح للجسد وابعد من السرف وان الرجل لن یھلک حتی یوثر شھوتہ علی دینہ۔ یعنی اے مسلمانوں کھانے پینے میں زیادتی کرنے سے بچو، کیونکہ یہ عادت جسم کو بگاڑتی۔ بیماری پیدا کرتی اور نماز سے غافل کرتی ہے۔ تم پر لازم ہے کہ کھانے پینے میں اعتدال سے کام لو، کیونکہ اعتدال کی عادت سے جسم کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور فضول خرچی نہیں ہوتی۔ جو شخص اپنی نفسانی اُمنگوں کو مذہبی فیلنگ پر ترجیح نہیں دیتا، وہ کبھی تباہ اور برباد نہیں ہوگا۔ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ البطنۃ تذھب الفطنۃ۔ یعنی پُرخوری سے عقل انسانی ضائع ہو جاتی ہے۔

معتدل ریاضت کرنی بھی نہایت ضروری ہے۔ ریاضت جسمانی کے لیئے جو مذہبی تاکید ہے، وہ مخدومی و مطاعی مولانا سید وحید الدین صاحب سلیم دام ظلہ کے اُس پاکیزہ مضمون سے معلوم ہوسکتی ہے، جو ستمبر کے رسالے میں عنقریب چھپ چکا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب سے سخت ممانعت کی ہے اور فرمایا ہے اجتنبوا الخمر فانھا مفتاح کل شر یعنی شراب سے پرہیز کرو، کیونکہ وہ تمام بُرائیوں کی جڑ ہے۔ شراب کے سوا تمام نشے کی چیزوں سے بھی صاف طور پر ممانعت کی ہے اور فرمایا ہے اجتنبوا کل مسکر یعنی ہر نشے کی چیز سے پرہیز کرو۔ علمای اسلام

کا مقولہ ہے۔ من قل جماعہ فھو اصح بدناً واتقی جلداً واطول عمراً یعنی جو شخص صحبت داری کم کرتا ہے، اُسکا بدن تندرست اور بدن کی جلد صاف اور پاکیزہ رہتی ہے۔ اور اُسکی عمر بہت دراز ہوتی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسکی نسبت فرماتے ہیں۔ یکفی المؤمن الوقعۃ فی الشھر۔ یعنی مسلمان آدمی کو مہینہ میں ایک مرتبہ صحبت داری کرنا کافی ہے۔ احادیث میں جسطرح کثرت جماع سے بچنے کی نصیحت ہے، اسیطرح عیاشی اور فسق وفجور سے بھی سخت ممانعت کیگئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔ الزنا یورث الفقر۔ یعنی بدکاری سے انسان پر افلاس کی مصیبت طاری ہوتی ہے۔ ایاکم والزنا فان فیہ اربع خصال۔ یذھب البھاء عن الوجہ ویقطع الرزق ویسخط الرحمن والخلود فی النار یعنی اے مسلمانو زنا سے بچو، کیونکہ اسمیں چار خرابیاں ہیں۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے۔ انسان کی روزی بند ہو جاتی ہے۔ خدا غضبناک ہوتا ہے۔ بدکار آدمی جہنّم کی آگ میں ڈھکیلا جاتا ہے۔ یا معشر المسلمین اتقوا الزنا فان فیہ ستۃ خصال ثلٰث فی الدنیا وثلٰث فی الاخرۃ فاما اللواتی فی الدنیا فیذھب ببھاء الوجہ ویورث الفقر وینقص العمر الخ یعنی اے مسلمانو بدکاری سے دور رہو کیونکہ اسمیں چھ خرابیاں ہیں۔ تین خرابیاں دنیا میں ہیں اور تین آخرت میں۔ دنیا کی خرابیاں یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان کے چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے۔ دوم یہ کہ اس سے افلاس کی بلا نازل ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ اُس سے عمر کوتاہ ہو جاتی ہے۔

ان تمام نصیحتوں اور ہدایتوں کے ساتھ تقدیر کے مسئلے کو شامل کرو۔ اور سوچو کہ اگر کوئی شخص اِن نصیحتوں اور ہدایتوں پر عمل کرے، تو اُسکی حالت کیا ہوگی۔ وہ صاف اور ہوادار مکان میں رہنا پسند کریگا۔ گھر کے کسی کونے میں کوڑا اور کثافت نہ رہنے دیگا اپنے بدن کو ہر قسم کی نجاست اور میل سے پاک وصاف رکھیگا۔ کھانے اور پینے کی چیزوں کو صاف وپاک رکھنے کی کوشش کریگا۔ جب قدری بھوک رہی تو کھانا چھوڑ دیگا۔ کھانا کھانے کے بعد مُنہ ہاتھ دھوئیگا۔ سونے اور جاگنے کے وقت بستر کو جھاڑیگا اُجلے اور سفید کپڑے پہنیگا۔ غرضکہ ہر چیز میں صفائی اور نفاست کو پسند کریگا۔ نشے کی تمام چیزوں سے پرہیز کریگا۔ بدکاری اور فسق وفجور میں کبھی مبتلا نہوگا۔ صحبت داری میں بھی کمی کریگا۔ ریاضت جسمانی میں مشغول رہیگا اعتدال کو ملحوظ رکھیگا۔ ہر حال میں، تکلیف ہو، یا آرام، خدا پرست رہیگا۔ اور کبھی اپنے تئیں غم ورنج میں نہ پھنسائیگا۔ یہی وہ تمام ہدایتیں اور نصیحتیں ہیں، جو علمای طب وحفظانِ صحت نے تندرستی قائم رکھنے اور عمر کے دراز ہونے کے لیئے بیان کی ہیں۔ پس کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے شخص کو کامل تندرستی نصیب ہوگی۔ اور وہ ہر عمدہ اور مفید کام کرنے کے قابل ہوگا اور عمر کی بہت سی منزلیں کامل آرام وراحت میں طے کر جائیگا۔

(مرشید احمد سالم)

عورتوں کی حالت زمانۂ جاہلیت میں

آجکل[1] عورتوں کی حالت اور معاشرت پر نہایت شد ومد کے ساتھ بحث ہو رہی ہے۔ بعض مضمون نگار اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ عورتوں کو سوسائٹی سے کیا تعلق ہے۔ بعض انشا پرداز عورتوں کی تعلیم پر زور دیتے ہیں بعض مصنف عورتوں کی آزادی کے حامی ہیں ہم اس موقع پر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کی عورتوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے

[1] یہ مضمون مصر کے مشہور ماہوار رسالہ "الہلال" سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

اُن کی حالت میں کیا تغیر پیدا کیا- ہم اپنے مضمون کو پانچ حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں- (۱) عورتوں کی حالت آغازِ عمر میں (۲) عورتوں کی نسبت (۳) عورتوں کی شادی (۴) عورتوں کی طلاق (۵) عورتوں کی وراثت-

عورتوں کی حالت آغازِ عمر میں-

اس زمانے میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ کسی قوم میں جو حالت اُس قوم کی عورتوں کی ہوتی ہو، اُس سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوسکتا ہو کہ وہ قوم ترقی کررہی ہو یا تنزل کی طرف جارہی ہو- عورتیں فی الحقیقت قوم کی حالت کا آئینہ اور اُن کی پستی اور بلندی کا مرقع ہیں- اگر عورتوں کی حالت کسی قوم میں اعلیٰ درجے کی ہو، تو وہ قوم بھی اعلیٰ درجے کی خیال کیجائیگی- عرب کے زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کی حالت پر غور کرو، جو ہمارے دعوے کے لیئے بیّن ثبوت ہی- یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ عرب کے باشندے جہالت اور نادانی کے سمندر میں غرق تھے- وہ کھانے اور پہننے کے سوا زندگی کی کسی ضرورت سے واقف نہ تھے-

اُن کا کام لوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا- اُس زمانے میں عورتوں کی حالت پیدا ہونے کے دن سے مرنے کے وقت تک نہایت پست اور ذلیل تھی- جب کسی عورت کو حمل رہ جاتا اور وضعِ حمل کا زمانہ قریب آتا، تو اُسکا شوہر چندروز کیلیئے لوگوں کی نظر سے غائب ہوجاتا تھا- اگر اُسے معلوم ہوتا کہ اُسکے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہو، تو وہ خوش ہوتا تھا- اور اگر یہ خبر سُنتا کہ لڑکی ہوئی ہو، تو اُسکے چہرے پر غم کی تیرگی دوڑجاتی تھی- اور وہ ایک مدّت تک لوگوں کے سامنے نہیں آتا تھا اور اسی اُدھیڑبُن میں رہتا تھا کہ اُس لڑکی کی نسبت کیا کرے[۱]- چنانچہ قرآن مجید میں اسی بات کی طرف اشارہ ہو، جہاں خدا نے فرمایا ہو وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ یعنی جب اُن میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دیجائے، تو (مارے رنج کے) اُسکا مُنہ کالا پڑجائے- اور (زہر کے سے گھونٹ) پیکررہجائے لوگوں سے بیٹی کی عار کے مارے جس کے پیدا ہونے کی اُسکو خبر دی گئی ہو چھپا چھپا پھرے- (اور دل میں منصوبے سوچے کہ) آیا اس (ذلّت پر بیٹی کو لیئے) رہے یا اُسکو مٹی میں گاڑدی- دیکھو تو ان لوگوں کی (کیا) بُری رائی ہو- چندروز کے بعد وہ اپنے گھر میں واپس آتا تھا اور اُسکی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہی اور ایسی ہولناک مصیبت طاری ہوئی ہو، جس کا کوئی علاج نہیں ہو- جب وہ بدقسمت لڑکی ذرا جوان ہوتی، تو اُسکو زندہ درگور کرنے کی تدبیر کرتا تھا- یہ دستور ایّامِ جاہلیت میں عام طور پر شائع تھا- زندہ درگور کرنے کی رسم کچھ لڑکیوں ہی پر موقوف نہ تھی، بلکہ افلاس کے خوف سے لڑکے بھی جیتے جی زمین میں دفن کردیئے جاتے تھے[۱]- لڑکوں کے قتل کرنے کی عادت اُس حکایت سے معلوم ہوتی ہو، جو آنحضرتؐ کے دادا عبد المطلب کی نسبت بیان کیجاتی ہو، کہ اُنھوں نے اپنے دس لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو کعبے پر قربانی چڑھانے کے لیئے ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا- لڑکیوں کے زندہ درگور کرنیکا دستور عرب کے قبائل میں سے ربیعہ اور مضر میں[۲] کم کم اور کندہ میں[۳] بہت زیادہ تھا- اسکے اسباب مختلف تھے- بعض تو لڑکیوں کو اسلیئے ہلاک کرتے تھے کہ وہ کچھ کما نہیں سکتیں اور لڑکے اُن کے ساتھ لوٹ مار میں شریک ہوسکتے ہیں- بعض کا یہ خیال تھا کہ لڑکی کے مفلس ہونے کے سبب اُس کے قبیلے میں

[۱] تفسیر کبیر جلد پنجم-

[۱] تفسیر کبیر جلد چہارم- [۲] السیرۃ الحلبیۃ جلد دوم- [۳] السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل-

کوئی اُسکا خواہاں نہ ہوگا- اور غیر قبیلے میں لڑکی دینا نہایت ذلت ہے- قرآنِ مجید میں اسی کیطرف اشارہ ہے، جہاں خدا فرماتا ہے وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ یعنی تم افلاس کے ڈرسے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو- اُن کو اور تمکو ہم روزی دیتے ہیں اولاد کا مارنا بڑا بھاری گناہ ہے۔[2]

لڑکیاں، اگر وہ بدصورت ہوں، تو اس خیال سے بھی ہلاک کی جاتی تھیں کہ اُن کو عُمدہ شوہر دستیاب نہیں ہوسکتا چنانچہ آنحضرتؐ کی والدۂ ماجدہ یعنی حضرت آمنہ کے باپ وہب کی چچی سودہ بنت زہرہ کا یہی حال ہوا- جب سودہ پیدا ہوئی، تو اُسکے باپ نے یہ دیکھکر کہ وہ سیاہ فام اور بدصورت ہے، اُسکے زندہ دفن کرنے کا ارادہ کیا- مگر ایک ہاتف کی آواز نے اُسکو اس ہولناک فعل سے روک دیا- سودہ بال بال بچگئی اور جوان ہوکر قبیلۂ قریش کی کاہنہ کہلانے لگی[1] جب کسی شخص کے گھر میں حسین لڑکی پیدا ہوتی، تو لوگ اُسکے باپ کو مبارکباد دیتے اور کہتے تھے کہ یہ نافجہ تجکو مبارک ہو- اس کہنے سے اُن کا یہ مطلب تھا کہ جب وہ جوان ہوگی، تو سینکڑوں دولتمند آدمی اُسکی درخواست کرینگے اور لڑکی کے باپ کو اُسکی مہر میں سے اونٹ بکری، یا زرِ نقد کا جو حصّہ ملیگا، وہ اُس سے مالدار ہوجائیگا- ابنِ عربی کا قول ہے کہ نافجہ مہر کے اُس حصّے کو کہتے ہیں، جو لڑکی کے باپ کو اُس کی شادی کے وقت ملا کرتا تھا-

لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کا کیا طریقہ تھا؟ اسمیں مورخین کا اختلاف ہے، مگر صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض تو زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیتے تھے- بعض پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیتے تھے- بعض اُنکو دریا میں غرق کرتے تھے- اور بعض اُن کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے تھے مگر اُس تاریک زمانے میں بھی بعض خدا کے بندے ایسے تھے، جو اس فعلِ قبیح سے سخت نفرت کرتے تھے- اور ایسی لڑکیوں کو فدیہ دیکر بچا لیتے تھے- اُنہیں رحمدل لوگوں میں سے ایک شخص عمرو بن نفیل تھا- جب اُسکو کسی لڑکی کے زندہ درگور کرنے کی خبر ہوتی، تو فوراً اُس لڑکی کے باپ کو بُلاتا اور روپے دلاکر، یا جسطرح ممکن ہوتا، لڑکی کو اُس سے لے لیتا اور خود اُسکی پرورش کرتا تھا- لڑکی کے جوان ہونے کے بعد اُسکے باپ سے کہتا کہ اگر تم چاہو تو میں تمھاری لڑکی تمھیں واپس دوں- اور اگر نہ چاہو، تو میں اُسکا بار بے تکلف اُٹھا سکتا ہوں- عرب کے نامور شاعر فرزدق کا دادا صعصعہ بھی لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچاتا اور اُنکا فدیہ ادا کرتا تھا[1]

عورتوں کی نسبت جب کسی شخص کو کسی عورت کے ساتھ نسبت کرنی منظور ہوتی، تو اپنے رشتے کی عورتوں کو اُس عورت کے پاس بھیجتا تھا، تاکہ وہ اُسکے پاس آکر اُس عورت کا حال بیان کریں- اگر رشتے میں کوئی عورت اس کام کے قابل نہ ہوتی، تو ایسی عورتوں کو تلاش کرتا تھا، جو اکثر لوگوں کے گھروں میں آمد و رفت رکھتی تھیں کبھی یہ کام کسی مخنث سے لیا جاتا تھا- اُس زمانے میں ایک گروہ مخنثوں کا تھا، جو مردوں کا سا لباس پہنتے اور عورتوں سے میل جول رکھتے تھے- جب کسی شخص کو کسی عورت کے ساتھ نسبت کرنی ہوتی، تو وہ ایسے مخنث کو تلاش کرتا، جو اُس عورت کے قبیلے میں آتا جاتا ہو- وہ اُس عورت کی شکل صورت اور دیگر صفات کا حال اُس شخص سے بیان کرتا تھا- اگر وہ راضی ہوگیا تو خیر، ورنہ دوسری عورتوں کا حال اُس سے بیان کرتا- جب کوئی عورت اُس شخص کو پسند آجاتی، تو یہی مخنث اُسکے اور اُس عورت کے قبیلے کے درمیان پڑکر نسبت کرا دیتا[2]

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل- [2] تفسیر کبیر جلد پنجم-

[1] السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل [2] الاغانی جلد چہارم-

نسبت کرنیکا خاص طریقہ تھا، جسکا اِس موقع پر بیان کرنا
۱ مناسب معلوم ہوتا ہی۔ جب کوئی مرد کسی عورت کو اپنے لیئے پسند کرلیتا، تو اپنے اور اُس عورت کے مرتبے کے موافق مہر تجویز کرتا تھا۔ پھر مہر کا روپیہ ایک معتبر اور ذی وجاہت شخص کے ہاتھ اُس عورت کے باپ یا سرپرست کے پاس بھیجتا تھا۔ یہ شخص یا تو مرد کے رشتہ داروں میں سے انتخاب کیا جاتا تھا، یا اُسکے احباب میں سے ہوتا تھا وہ عورت کے باپ یا سرپرست کے پاس پہونچکر کہتا تھا کہ میں نسبت کے لیئے آیا ہوں۔ اگر اُسکو نسبت کرنی منظور ہوتی، تو اُس سے پوچھتا کہ تم کس کیطرف سے نسبت کا پیغام لائے ہو و جب نام بتاتا، تو وہ کہتا کہ ہاں وہ بیشک ہمارا کفو ہی اور ہمکو نسبت منظور ہی، یا کہتا کہ ہاں وہ ہمارا ہمسر اور عالی خاندان ہی اگر نسبت منظور نہ ہوتی، تو کہتا کہ نسبت ہونی ناممکن ہی اور اس سے یہ مطلب نہیں ہی کہ ہمکو نسبت کرنیوالے کے خاندان سے نفرت ہے، یا اُسکے عالی خاندان ہونے سے ہم ناواقف ہیں۔ اسکے بعد کوئی سبب انکار کے لیئے تراشکر بیان کردیتا تھا کبھی نسبت کرنیوالا خود عورت کے باپ، یا سرپرست سے ملتا اور اپنی درخواست آپ پیش کرتا تھا۔

اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کی نسبت منظور کرلیتا، تو نسبت کرنے والے کی طرف سے لڑکی کا مہر پیش ہوتا تھا۔ مہر کی مقدار دس درہم سے دس ہزار دینار تک، یا اس سے کم و بیش ہوتی تھی مہر کے ساتھ کبھی غلام۔ کنیزیں۔ اونٹ۔ بکریاں۔ کپڑے۔ زیور۔ غلہ، یا کھجور وغیرہ چیزیں نسبت کرنیوالے کی استطاعت کے موافق شامل ہوتی تھیں۔ مہر پر لڑکی کا باپ، یا سرپرست قابض ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی بات کی ممانعت کیگئی ہی، جہاں خدا فرماتا ہی۔ وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا۔

یعنی عورتوں کو اُن کے مہر خوشدلی کیساتھ دیدڈالو۔ پھر اگ
وہ خوشدلی سے اُسمیں سے کچھ تم کو چھوڑدیں تو وہ تمہا
لیئے مالِ طیب ہی)۔ اُسے مزے سے چٹ کرو۔ علقمہ۔
نخعی اور قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہی بیان کیا ہی
فریقین میں رضامندی ہونے کے بعد لڑکی کا باپ، یا اُ
کا سرپرست لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتا تھا کہ
اِس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے فلاں لڑکی کو فلاں شخص
کے ساتھ منسوب کردیا ہی[۱]

اگر لڑکی بالغ اور عاقل ہوتی، تو نسبت کرنے
پہلے اُسکا باپ تنہائی میں اُس سے پوچھتا تھا کہ فلاں آ
جو عرب کے شہسواروں (یا سرداروں، یا دانشمندو
یا فلاں طبقے کے لوگوں) میں سے ہی، میرے پاس
نسبت کرنے کی غرض سے آیا ہی۔ میں چاہتا ہوں
تم کو اُس سے منسوب کروں۔ اسمیں تمہاری کیا را
ہی؟۔ اگر لڑکی رضامند ہوتی، تو خاموش ہوجاتی تھی،
منظوری کے لیئے کچھ الفاظ کہدیتی تھی۔ بہت دفعہ ایسا
ہوتا تھا کہ لڑکی باپ کی بات کا جواب دیتی تھی اور ا
سے اپنے معاملے میں بحث کرتی تھی اور انکار اور نا
کا سبب بیان کرتی تھی۔ اسکے بعد کبھی تو باپ غالب
آجاتا اور نسبت ہوجاتی تھی اور کبھی لڑکی اُسپر فتح پا
تھی اور نسبت کا پیغام رد کیا جاتا تھا۔

نسبت کرنے کے لیئے مختلف قبیلوں میں مختلف
رسمیں تھیں۔ بعض قبیلے تو اپنے قبیلے ہی میں نسب
کرتے تھے اور دیگر قبائل سے کچھ تعلق نہ رکھتے
بعض قبیلے کے لوگ یہ شرط کرلیتے تھے کہ جب لڑ
حاملہ ہوا ور وضع حمل کے دن قریب ہوں، تو وہ ا
باپ کے گھر میں پہونچا دیجائے، تاکہ وہیں اولاد پیدا
بہت سے لوگ اس شرط کو منظور کرتے تھے او

[۱] الاغانی جلد دہم۔

بیویاں اپنے باپ کے گھر میں زچہ بنکر رہتی تھیں - اور اس قبیلے کے لوگ اسکو عورت کے لیئے موجب عزت وافتخار سمجھتے تھے - مدینے میں جو بنو نجار کا قبیلہ آباد تھا، اُن میں یہی رسم جاری تھی[1] بعض عورتیں منسوب ہونے سے پہلے یہ شرط منظور کرا لیتی تھیں کہ طلاق دینے کا اختیار مرد کو نہ ہوگا، بلکہ عورت کے ہاتھ میں رہیگا - تاکہ وہ جب کبھی اپنے شوہر سے ناراض ہو، آسانی سے نجات پاسکے -

لڑکی کا باپ کبھی یہ شرط کرتا تھا کہ اس لڑکی سے جو اولاد ہوگی، اُن کے نام ہمیں رکھینگے اور اُن کی شادیاں بھی ہمیں کرینگے - عمرو بن حجر کی نسبت کہتے ہیں کہ جب وہ عوف بن محلم شیبانی کے پاس اُس کی بیٹی امّ ایاس کے ساتھ نسبت کی درخواست لیکر گیا، تو عوف نے کہا کہ میں اس شرط پر منظور کرتا ہوں کہ اُسکے بیٹوں کے نام میں رکھونگا اور بیٹیوں کی شادیاں بھی میں ہی کرونگا - عمر نے کہا - یہ نہیں ہوسکتا - ہم لڑکوں کے نام تو اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے ناموں پر رکھینگے - اور لڑکیوں کی شادیاں اُن مردوں سے کرینگے، جنکو حکومت حاصل ہے اور جو ہمارے ہمسر ہیں - ہاں یہ سلوک میں ضرور کرسکتا ہوں کہ بنی کندہ میں ایک جائداد اُسکے مہر کے لیئے مخصوص کردوں - اور اُسکے کنبے والوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤں اور اُن کی ہر حاجت کو پورا کروں - عوف نے ان شرطوں پر نسبت منظور کرلی[2]

صعصعہ بن معاویہ نے عامر بن ظرب کی بیٹی عمرہ سے نسبت کرنی چاہی، تو اُسنے کہا کہ "اے صعصعہ تم میرے پاس اسلیئے آئے ہو کہ میرے جگر کے ٹکڑے کو خرید و - جو شخص عالی خاندان ہے، وہ عالی خاندان کا ہمسر ہوتا ہے اور نیک شوہر باپ کے بعد دوسرا سرپرست ہے - میں نے تمھاری نسبت اپنی بیٹی سے کردی، اس خیال سے کہ تم جیسا شوہر مشکل سے ملیگا - میں اسکو پوشیدہ نہیں بلکہ علانیہ طور پر کہتا ہوں" - اسکے بعد اُسنے اپنے گھر کے آدمیوں کو خطاب کرکے کہا کہ "اے قبیلۂ عدوان تمھاری عزیز لڑکی تم سے لیجاتی ہے، مگر یہ نہ کسی لالچ سے ہے، نہ خوف سے میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہمارے بزرگوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی قسمت پر راضی نہ ہوتا، تو پہلے لوگ پچھلوں کے لیئے زندگی بسر کرنے کو کچھ بھی نہ چھوڑتے" - بعض دفعہ مرد اور عورت دونوں نسبت کی گفتگو بلا واسطہ کرتے تھے[1]

قبیلۂ قریش کے لوگ عرب کے دیگر قبائل کی نسبت اس بات میں مستثنٰے تھے کہ وہ مذہب کی سخت پابندی کرتے تھے اور اسی سبب سے اُنکو حمس کہتے تھے - وہ اپنی لڑکیوں کی نسبت جب شرفاء عرب سے منظور کرتے تھے، تو اُسکے ساتھ یہ شرط ضرور لگاتے تھے کہ اُن کی اولاد بھی اُنھیں کیطرح مذہب کی سخت پابندی کریگی - عرب کے باشندوں کی عام عادت تھی کہ جب کسی مرد اور عورت کے درمیان رشتہ قرار پاجاتا، تو اُن کو یہ دعا دیجاتی تھی کہ خدا کرے دونوں اتفاق اور موانست سے زندگی بسر کریں - اور اُن کو یکجہتی اور اولاد میسر ہو -

عورتوں کی شادی زمانۂ جاہلیت میں چار طرح مردوں اور عورتوں میں تعلق ہوتا تھا - (۱) ایجاب وقبول (۲) مُسافحات (۳) استبضاع (۴) جمع پہلی قسم کا تعلق طرفین کے اقرار و ایجاب سے پیدا ہوتا تھا، جیساکہ ہمارے زمانے میں عام طور پر نکاح

[1] السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل - [2] العقد الفرید جلد سوم -

[1] العقد الفرید جلد سوم -

ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے تعلق سے یہ مراد ہی کہ اُس زمانے میں عورتوں کا ایک خاص گروہ تھا، جن کی مکانوں پر جھنڈیاں لہراتی تھیں اور وہ اسی علامت سے پہچانی جاتی تھیں۔ اُنکو بغایا کہتے تھے۔ جو شخص چاہتا، اُن کے مکان پر بے تکلف چلا جاتا اور اُن سے مباشرت کرتا۔ اگر اُن میں سے کسی کو حمل رہ جاتا، تو وضع حمل کیوقت اُن تمام آدمیوں کو جمع کیا جاتا تھا جو اُسکے پاس آمدورفت رکھتے تھے۔ قیافہ شناس اُن میں سے جس شخص کے ساتھہ اولاد کو مشابہ بتاتے، وہی اُسکا باپ قرار پاتا تھا۔ اور وہی اُس کی پرورش کرتا تھا۔ تیسری قسم کا تعلق یہ تھا کہ جب عورت ایام سے نہ ہوتی، تو اُسکا شوہر اُس سے کہتا تھا کہ جاؤ تم فلاں شخص سے ملکر اولاد پیدا کرو۔ جب تک حمل کی کوئی علامت نمودار نہوتی، شوہر اُس سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ پھر جب چاہتا، اُس سے نکاح کرسکتا تھا۔ چوتھی قسم کے تعلق اور دوسری قسم کے تعلق میں اتنا ہی فرق تھا کہ پہلی حالت میں شوہروں کی تعداد محدود ہوتی تھی اور دوسری حالت میں غیر محدود۔ اس طرح کے تعلق کے بعد بھی اولاد کو قیافہ شناس دیکھتے تھے اور جس سے مشابہ قرار دیتے، وہی اُسکا باپ کہلاتا تھا[۱]

اسطرح کی رسمیں زمانۂ قدیم کی قوموں میں بھی جاری تھیں۔ یونان کے مشہور مؤرخ ہیرودوٹس نے اگاتھرین۔ اسکیتھین اور میساجیٹ قوموں کی نسبت بیان کیا ہی کہ اُن میں ہر مرد کو ہر عورت کے ساتھہ مباشرت کرنیکا حق حاصل تھا۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اس دستور سے قرابت کی گرہ زیادہ مضبوط ہوتی ہی۔

[۱] السیرۃ الحلبیۃ بروایت امام بخاری۔

عرب جاہلیت میں بیٹوں کو باپ کی عورت کے ساتھہ نکاح کرنا جائز تھا۔ جب کوئی شخص اپنی کوئی عورت چھوڑکر مرجاتا، تو وہ لڑکے جو اُسکی دوسری بیوی کی اولاد سے ہوتے، اپنے باپ کی عورت کے پاس جمع ہوتے تھے۔ اُن میں سے جو کوئی سب سے پہلے اُس عورت پر چادر ڈالدیتا، وہی اُسکا شوہر قرار پاتا تھا اور وہی اُسکے جدید مہر پر قبضہ کرتا تھا۔ عورت کو اُتنا ہی مہر ملتا تھا، جتنا کہ متوفی نے اُسکو دیا تھا۔ اس سے زیادہ اُسکو کچھ نہ ملتا تھا۔ اگر وہ چاہتا، تو اُس عورت کا نکاح اپنے سوا کسی اور سے کردیتا اور اُسکا مہر خود لیتا اور اُسکو بالکل محروم کردیتا تھا۔ اور اگر چاہتا، تو اُسکو شوہر کے پاس جانے سے روک رکھتا اور اُسکو تنگ کرتا کہ وہ جبتک اپنا فدیہ ادا نکرے، اپنے شوہر کے پاس جانے نہ پائے[۱] اس باب میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۚ وَسَاءَ سَبِيلًا ۝ یعنی جن عورتوں کے ساتھہ تمھارے باپ نے نکاح کیا ہو، تم اُن کے ساتھہ نکاح نہ کرنا۔ مگر جو ہوچکا (سو ہوچکا)۔ (تاہم) یہ بڑی بیحیائی اور غضب کی بات تھی اور بہت ہی بُرا دستور تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کسی عورت سے اور اُسکی بہن سے ایک ساتھہ نکاح کرسکتا تھا۔ اُن میں یہ ناپاک دستور بھی جاری تھا کہ عورت کچھہ دنوں تک مرد سے ناجائز تعلق رکھتی تھی۔ پھر اگر مرد چاہتا، تو اُس سے نکاح کرلیتا اور اگر نہ چاہتا، تو عورت اُسکی بیوی نہیں ہوسکتی تھی[۲] مگر ہم اس بات کو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ اُس زمانے میں بھی جو لوگ شریف کہلاتے تھے، وہ ایسی بیہودہ باتوں سے نفرت کرتے تھے۔

[۱] تفسیر کبیر۔ [۲] السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل۔

ظاہرا یہ بات معلوم ہوتی ہو کہ اُس زمانے کے لوگ نہایت قریب رشتے کی عورتوں سے شادیاں کرلیتے تھے۔ چنانچہ اُن رشتوں کی عورتوں کے ساتھہ شادی کرنا قرآن مجید کی اس آیت سے ممنوع ہوگیا۔ خدا فرماتا ہی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ یعنی (اے مسلمانو)، تمھاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور دائیاں جنھوں نے تمکو دودھ پلایا اور دودھ شریکی بہنیں اور تمھاری ساسیں (یہ سب) تم پر حرام ہیں اور جن بیبیوں کے ساتھہ تم صحبت داری کرچکے ہو اُن کی گیلڑ لڑکیاں جو (غالبًا) تمھاری گودوں میں پرورش پاتی رہیں تم پر حرام ہیں، لیکن اگر ان بیبیوں کے ساتھہ تم نے صحبت داری نہ کی ہو، تو (گیلڑ لڑکیوں کے ساتھہ نکاح کرلینے سے) تم پر کچھ گناہ نہیں اور تمھاری بہوئیں (یعنی) تمھارے اپنے (صلبی) بیٹوں کی بیبیاں (بھی تم پر حرام ہیں) اور دو بہنوں کا ایک ساتھہ نکاح میں رکھنا (بھی تم پر حرام ہی) مگر جو ہوچکا (سو ہوچکا)۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہی۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنی پھوپھیوں اور خالاؤں ہی سے نہیں بلکہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے بھی شادی کرلیتے تھے۔ اگرچہ یہ امر حیرت انگیز ہی اور شاید بہت سے لوگ اس بنا پر انکار کرینگے کہ عرب کی تاریخ میں صریح طور پر کہیں اس دستور کا وجود نہیں پایا جاتا

مگر ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہی، کیونکہ ہمکو معلوم ہی کہ بہت سی قدیم بت پرست قوموں میں ایسے جاری تھے۔ ملک اشور کے رہنے والے بہنو ساتھہ نکاح کرتے اور اُسکو ملکۂ سمیر امیس کی تقلی اسپر فخر کرتے تھے۔ یونان کے باشندے اُن کے ساتھہ جو باپ کی طرف سے ہوں اور اس کے باشندے اُن بہنوں کے ساتھہ جو ماں کی سے ہوں، نکاح کرنا جائز سمجھتے تھے۔ مصر اور کے باشندے بھی بہنوں کے ساتھہ شادی رکھتے تھے۔ چنانچہ مصر میں بطلیموس فیلا ولفوس اور فارس میں کیبز (سیاوش) نے اپنی بہنوں ساتھہ نکاح کیا۔ زردشت کے مذہب کی روسے قسم کا نکاح کرنا نہایت ہی افضل خیال کیا جاتا ہی آتش پرست اس باب میں آجتک اپنے اسلاف تقلید کرتے ہیں [1]

ایام جاہلیت میں ایک اور عجیب دستور تھا کوئی شخص مرجاتا اور اُسکی عورت کھڑی ہوکر اُ نوحہ خوانی کرتی، تو سب لوگ سمجھہ جاتے تھے اپنے شوہر کی عزت کرتی ہی اور اُسکے بعد کسی او شادی کرنا نہیں چاہتی۔ برخلاف اسکے اگر وہ گریہ وزاری کرتی، تو سمجھہ لیا جاتا تھا کہ وہ متوفی بعد دوسری شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہی [2]

عورتوں کی طلاق قدیم زمانے سے آج کوئی مہذب قوم ایسی نہیں ہوئی جس نے طلاق نہ رکھا ہو۔ جسطرح وہ بابل۔ فنیشیا اور مصر باشندوں میں جائز تھی، اسیطرح زمانۂ حال میں بھی اُسکا رواج ہی، مگر ہر قوم کے نزدیک خاص حالات میں ہوسکتی ہی اور اسکے لیئے خاص

[1] دائرۃ المعارف جلد نہم۔ [2] الاغانی جلد اول و دو

شـ ۔ انکا کہیں نرم ہیں اور کہیں سخت - مگر عرب جاہلیت
ں طلاق کے لیئے کوئی حد نہ تھی - ہر مرد اپنی عورت کو
لسی سبب سے فورًا طلاق دیسکتا تھا اور جب چاہتا،
دبارہ اُس سے شادی کرسکتا تھا - اگر کوئی شخص
ار بار طلاق دے اور ہزار بار عورت سے نکاح کرے،
اُسکو کچھ عیب جانتے تھے[1] اس باب میں قرآن
یدنے جو حکم دیا، وہ یہ ہی اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ
مَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ یعنی طلاق (جس کی
در رجوع بھی ہوسکتا) ہی - (وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو)
دفعہ (کرکے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے
دیا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہی
سن سلوک کے ساتھ رخصت کردینا -

اگر کوئی شخص چاہتا کہ اپنی عورت سے زناشوی
تعلق نہ رکھے اور کوئی دوسرا بھی اُس سے
خلق پیدا نہ کرے، تو اُس سے جُدا ہوجاتا تھا -
ں دستور کو ایلا کہتے تھے - مرد قسم کھاتا تھا
وہ اپنی عورت کے پاس نہ جائیگا - اور اُسکو دوسرا
وہر بھی نہ کرنے دیگا - اِس فعل سے عورت کو ایذا
سانی مقصود ہوتی تھی - اسلام نے اسکی بھی ممانعت
- چنانچہ قرآن مجید میں ہی - لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ
تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ یعنی جو
ے بیبیوں کے پاس جانے کی قسم کھا بیٹھیں اُنکو چار مہینے
مہلت ہی پھر (اس مدت میں) اگر رجوع کرلیں تو اللہ
بخشنے والا مہربان ہی - اور اگر طلاق کی ٹھان لیں تو (بھی
سُننا (اور) جانتا ہی -

طلاق کے الفاظ یہ ہوتے تھے "ہرنیں گایوں پر"
جملہ جب کسی شخص کی زبان سے نکلتا تھا، تو اُسکی
عورت سمجھ جاتی تھی کہ اُسکو طلاق دی گئی ہی - اور وہ
فورًا اُس کے گھر سے نکل جاتی تھی[1]

بعض عورتیں شادی کیوقت ایسی خاص شرطیں لگاتیں
کہ اُن کے باعث سے وہ مردوں کے جور و ستم سے
بآسانی آزاد ہوسکتی تھیں - چنانچہ عمرہ بنت سعد جو
ام خارجہ کے نام سے مشہور ہی، اُس کی نسبت بیان
کیا جاتا ہی - کہ وہ جب چاہتی، اپنے شوہر کو طلاق
دیسکتی تھی - چنانچہ اُسنے چالیس سے زیادہ نکاح کیئے
اور مختلف شوہروں سے اُسکی اولاد ہوئی - ماریہ
بنت جعید عبادیہ - عاتکہ بنت مرہ بن ہلال
سلمیہ - فاطمہ بنت خرشب انماریہ - سوا ء
عنزیہ اور سلمیٰ بنت عمرو بن زید (والدۂ عبدالمطلب
بن ہاشم) بھی وہ عورتیں تھیں جنکو ام خارجہ کی طرح شادی
اور طلاق کا پورا اختیار حاصل تھا - ان میں سے ہر ایک
کو اس بات کی آزادی تھی کہ جب وہ کسی مرد سے
شادی کرے اور اُس کے گھر میں جائے، تو مخالفت
اور نارضامندی کی حالت میں فورًا شوہر سے جُدا
ہوسکے - رضامندی کی علامت یہ تھی کہ بیوی شوہر
کے لیئے کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرے[2]

عورتوں کی وراثت اُس زمانے کے باشندوں
میں یہ عجیب دستور تھا کہ عورتوں کو وراثت میں کچھ
حصہ نہ ملتا تھا - تنہا شوہر ہی جائداد کے وارث ہوتے
تھے - خاصکر اُس حالت میں، جبکہ یتیم لڑکیاں کسی شخص کی
سرپرستی اور نگرانی میں ہوں - اگر کوئی یتیم لڑکی حسین
ہوتی، تو اُسکا سرپرست اُس سے نکاح کرلیتا اور
اُسکا مال اُڑا لیتا تھا - اور اگر بدصورت ہوتی، تو اُسکو
شادی کرنیسے منع کرتا تھا اور اُسکے مرنے کے بعد اُسکی
جائداد پر قبضہ کرلیتا تھا - اِسی باب میں یہ آیۃ نازل ہوئی

---

[1] تفسیر کبیر جلد دوم -

[1] تفسیر کبیر جلد دوم - [2] زائد الآل فی مجمع الامثال جلد اوّل

وَیَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِیْھِنَّ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَھُنَّ مَا کُتِبَ لَھُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ - یعنی (اے پیغمبر لوگ) تم سے (یتیم) عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم مانگتے ہیں تو (تم انکو) سمجھادو کہ اللہ تمکو اُن کے (نکاح کے) بارے میں اجازت دیتا ہے (اور پہلے بھی اجازت ہی تھی) اور (پہلے) قرآن میں تمکو سُنایا جاچکا ہے - سو (وہ حکم واقع میں) اُن یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جن کو تم اُنکا حق نہیں دیتے - اور (باوجود اسکے) اُن کے ساتھ نکاح کرنے کی طرف راغب ہو -

جب کوئی عورت ایام سے ہوتی، تو اُسکے تمام رشتہ دار اُس سے جُدا ہوجاتے تھے - نہ اُسکے ساتھ ایک گھر میں رہتے، نہ اُسکے ساتھ کھاتے پیتے تھے - اصل میں یہ عادت آتش پرستوں کی ہے - اُن کی یہی عادت تھی کہ ایسی حالت میں عورتوں کو گھر سے نکال دیتے تھے -

اوپر کے تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتیں زمانۂ جاہلیت میں مثل ایک بے شعور کل کے تھیں، یا یوں کہو کہ مردوں کی غلامی میں تھیں اور اپنی ذات کے نفع اور نقصان پر اُن کو ذرا اختیار نہ تھا - یہ اس سبب سے تھا کہ اُس زمانہ کی عورتیں بالکل جاہل تھیں - اس سے صاف طور پر معلوم ہوگا عورتیں درحقیقت قومی حالت کا آئینہ ہیں - عورتوں کی پستی اور ذلت قوم کی پستی اور ذلت کا عکس ہے - اور اُن کی ترقی اور شایستگی قوم کی ترقی اور شایستگی پر دلیل ہے -

(عبدالعلی خاں)

وراثتِ طبعی

۱

وراثت کا اثر جسمانی اور دماغی قوتوں پر

وراثتِ طبعی کا مسئلہ ایک ایسا عجیب مسئلہ ہے جسکی
پہونچنا، انسان کی عقل و دانش کے لیئے نہایت دشو
اس مسئلے کی برابر کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں ا
اپنی نادانی اور ہیچمدانی کا اقرار کرنا پڑے - اس میں ا
مشکلات ہیں کہ جن پر نہ علم کی روشنی اپنا پر تو ڈال سک
نہ ذہن کی جودت اُن کی بلندی تک پرواز کر سکتی
گویا کہ قدرت ہی نے اُسپر ایک تاریکی کا پردہ ڈال د
تاکہ بلند پرواز انسان اپنی بے علمی اور نادانی کو تسلیم
نیچرل سائنس کے علما وراثت کے لفظ سے جو
لیتے ہیں، وہ فقیہوں کی اصطلاح سے بالکل جُدا ہے
جیسا کہ ہم آگے چلکر بیان کرینگے - اس مسئلے پر غور
والوں کے لیئے سب سے زیادہ عجیب و لطیف ا
یہ ہے کہ وہ نطفے کا انڈا، جس سے کوئی انسان پیدا
ہوتا ہے اور جس میں بچہ نہایت سادہ اور بسیط حالت
میں ہوتا ہے، اس میں اُس شخص کے ساتھ جسکا و
ہے، اعضا - حواس - مزاج - طبیعت - جذبات ا
خیالات کے لحاظ سے پوری پوری [illegible] یا
جاتی ہے - دوسری طرح یوں کہہ سکتے ہیں کہ
انسانی کا انڈا اس بات کی قابلیت رکھتا ہے کہ ا
میں ماں اور باپ اپنی مشابہ مخلوق ودیعت رکھ
ماں باپ کی مشابہت جو نطفے میں [illegible] جاتی ہے
بلحاظ فزیالوجی (علم افعال الاعضا) کے دائمی او
پیتھالوجی (علم الامراض) کے اکثری اور بلحاظ
لوجی (علم النفس) کے کم ہوتی ہے، جیسا کہ تازہ
اور جدید تحقیقات سے دریافت ہوا ہے - اور ا
علوم کے لحاظ سے میں اس مسئلے پر بحث کر
چاہتا ہوں -

* یہ عمدہ مضمون جو ڈاکٹر امین آفندی ابو خاطر کے قلم سے
مصر کے نامور عربی میگزین "المقتطف" سے ترجمہ کی

وراثت بھی منجملہ قوانین قدرت کے ایک قانون ہی، جس کے سبب سے زندہ اور جاندار مخلوقات اپنی بعض صفات کو، جن کے باعث سے وہ دیگر مخلوقات سے ممتاز ہیں، اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد تک نسلاً بعد نسلٍ پہونچاتی ہیں۔ یا یوں کہو کہ وہ صفات جن کو اعضا، یا افعال الاعضا سے تعلق ہی، اور جن سے کوئی نوع نوع بنتی ہی، باپوں سے اُن کی اولاد میں اور اولاد سے اُن کی اولاد میں منتقل ہوتی ہیں۔ کوئی نوع جب نوع بنتی ہی، تو اسی طریقے سے بنتی ہی کہ ایک نسل سے دوسری نسل میں وہ صفات منتقل ہوتی رہیں، جن سے اُس نسل کو اور نسلوں سے امتیاز ہوسکے۔ تجربہ اور مشاہدہ دونوں اس بات پر گواہ ہیں کہ اس طریقے سے ہمیشہ وہی عام صفات ایک نسل سے دوسری نسل تک پہونچتی ہیں، جو تمام نوع میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ حال تو نوعی صفات کا ہی، مگر خاندانی صفات بہ نسبت نوعی صفات کے بہت کم منتقل ہوتی ہیں، یعنی وہ صفات جن سے ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے امتیاز ہوتا ہی، بہ نسبت اُن صفات کے جن سے ایک نوع دوسری نوع سے ممتاز ہوتی ہی، وراثت کا اثر بہت کم قبول کرتی ہیں۔ خاندانی صفات کی نسبت وہ شخصی صفات، جن سے ایک شخص کو دوسرے شخص سے امتیاز حاصل ہوتا ہی، اور بھی کم آگے چلتی ہیں چنانچہ بعض مشہور علمائی طبعیات کی رای یہ ہی کہ ذی نسل مخلوقات کی شکلیں، اُن قدرتی حادثوں کے سبب سے، جو ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے ممتاز کرنے والی صفات پر، طاری ہوتے ہیں، صدہا سال کے بعد بدلتی اور تغییر قبول کرتی ہیں۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہی کہ جوں جوں صفات میں خصوصیت اور امتیاز آتا جاتا ہی، اُسیقدر قانون وراثت کی حکمرانی اُن پر کمزور ہوتی جاتی ہی۔ اور اس بات کی قابلیت زیادہ ہوتی جاتی ہی کہ جو صفات باپ دادا میں ہوں، وہ بیٹوں اور پوتوں میں نہ پائی جائیں۔ اسیطرح جوں جوں صفات عام اور مشترک ہوتی جائیں، اسیقدر وراثت کا قانون اُنپر اپنی قوت اور حکومت ثابت کرتا جاتا ہی۔ اور اس بات کی قابلیت بہت کم ہوتی جاتی ہی کہ جو صفات باپ دادا میں ہوں، بیٹوں اور پوتوں میں نہ پائی جائیں، یا بیٹوں اور پوتوں کی صفات باپ دادا کی صفات سے بالکل مختلف ہوں۔ لیکن صفات عام ہوں یا خاص، مشترک ہوں یا غیر مشترک، سب کی نسبت اس بات کا احتمال رہتا ہی کہ وہ وراثتاً ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوں۔

وراثت سے وہ حالات، جنکا تعلق علم افعال الاعضا یا علم الامراض سے ہی، ہمیشہ یکساں طور پر جاری رہتے ہیں، جیسا کہ مختلف لوگوں کی ہیئت اور بشرہ اور خاص کر ناک کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی۔ اولاد ہونا اور عمر کا دراز ہونا بھی ایسی ہی مثالیں ہیں، جن سے اس قاعدے کا ثبوت ہوتا ہی۔ بعض خاندان اس باب میں مشہور ہیں کہ اُن کے تمام افراد صاحبِ اولاد ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے بعض خاندان ایسے ہیں جنکے افراد بہت ہی کم صاحبِ اولاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک خاندان میں ایک شخص کے بارہ[۱۲] بچے تھے اور اُس کے تین[۳] دادا تھے ہر ایک دادا کی اولاد میں اٹھارہ[۱۸] بچے ہوئے تھے، جن میں سے پندرہ[۱۵] لڑکے اور تین[۳] لڑکیاں تھیں۔ یہ ایک ایسا مسلّم امر ہی، جس کے لیے بہت سی دلیلیں اور مثالیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہی۔ درازیِ عمر کبھی عام ہوتی ہی اور کبھی خاص۔ عام درازیِ عمر مقام سکونت کی عمدگی۔ قوانینِ صحت کی پابندی اور تمدن کی خاص حالت پر موقوف ہی۔ خاص درازیِ عمر

ی خاص بات پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ کبھی کبھی وہ
ب جنکو سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جو طرح طرح کی
یفوں میں بسر کرتے ہیں، بہ نسبت اُن لوگوں کے
ت دلنوں تک زندہ رہتے ہیں، جو رات دن اپنی
حت کا خیال رکھتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم
وتا ہے کہ درازیِ عمر کا تعلق زندگی کی اُس اندرونی قوت
سے ہے، جو باپ دادا سے وراثتاً اولاد تک پہونچتی ہے
چنانچہ انگلستان میں زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں اِس
ات کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کمپنی
یں اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے، تو اُسکے آبا و اجداد
ی عمریں دریافت کیجاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک خاندان
یں کوئی شخص ۵۹ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہتا
تھا، اُس خاندان کے ایک شخص نے، جبکہ وہ عمر کی
پچاس منزلیں طے کر چکا تھا، یہ سمجھکر کہ اب اُسکی موت
ریب ہے، وصیت نامہ لکھا۔ اور ابھی پورے ترپن[۵۳]
سال نہیں گذرے تھے کہ اُسکو پیامِ اجل آ پہونچا۔

بعض خاندانوں کے افراد میں عضلات کی قوت
ت زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ قدیم زمانے کے خاندانوں
یں بڑے بڑے زبردست اور قوی ہیکل لوگ مشہور
ہوئے ہیں۔ انگریزوں میں ایک خاندان ہے، جو خاندانِ
شت زناں کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ مشت زنی
یں وہ اوروں سے بہت زیادہ مہارت رکھتے ہے
ن لوگوں میں کُشتی کرنے یا کشتی چلانے کی بہت زیادہ
بلیت اور اسباب میں اُن کی بہت زیادہ شہرت
، وہ غالباً ایسے خاندان سے ہیں، جن میں چُستی اور
پھرتی وراثتاً ایک نسل سے دوسری نسل تک
تی ہے۔ یورپ کے بعض گھرانے ایسے ہیں، جنکے افراد
ن کے لوچ اور لچک و رناچنے میں جلیت پھرت کی زیادہ
بلیت رکھتے ہیں۔ آواز اور لہجے کی خصوصیت بھی

ایک شخص سے اُس کی اولاد میں اور اولاد کی اولاد میں
منتقل ہو سکتی ہے۔ ناک میں بولنا۔ حروف کا اچھی طرح
ادا نہ کرسکنا۔ ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف بول جانا
- آواز میں درد، یا گلے میں گنکری کا ہونا، یہ سب
حالتیں ایسی ہیں، جو وراثت کا اثر قبول کر سکتی ہیں۔
ایک ڈاکٹر نے اپنی خادمہ کی نسبت بیان کیا کہ وہ
پرلے درجے کی زبان دراز تھی۔ جب وہ بکواس پر اُترتی
تھی، تو کسی اور کی مجال نہ تھی کہ دم بھر بات کر سکے۔ اگر
اُسکو کوئی مخاطب نہ ملتا، تو جانوروں۔ درختوں۔
مکان کی دیواروں سے باتیں کرتی تھی، یا بلند
آواز سے اپنے تئیں مخاطب کرتی تھی۔ میں نے
ایکدفعہ اُس کی اس عادت پر سخت ملامت کی۔ اُس
نے کہا کہ میرے پیارے آقا یہ میرا قصور نہیں ہے بلکہ
میرے باپ دادا کا قصور ہے۔ میری ماں تو اسی حسرت
میں مرگئی کہ اُسے کوئی بات کرنیوالا نہیں ملتا۔

خِلقی عیوب میں بھی وراثت جاری ہوتی ہے۔ ایک
شخص کا حال کتابوں میں لکھا ہے کہ سوائے چہرے اور
ہتیلیوں اور تلوؤں کے اُسکے تمام بدن پر ایسے
اُبھار تھے، جیسے کچھوے کی پشت پر ہوتے ہیں۔
اُسکے چند لڑکے ہوئے، جن کی پیدائیش سے چند
ہفتے بعد یہی نقص اُن کے تمام بدن میں موجود تھا۔
سوائے ایک کے سب مرگئے۔ جو زندہ رہا، اُس سے
یہ نقص اُسکی اولاد میں پانچ پشت تک جاری رہا۔
بدن کا رنگ پھیکا ہونا، یا اُس پر داغوں کا نمودار
ہونا۔ لنگڑا ہونا۔ بھینگا ہونا۔ اندھا ہونا۔ گونگا ہونا
بہرا ہونا۔ ہونٹ کٹا ہونا۔ اور ہاتھ کے پنجے میں چند
اُنگلیاں ہونا، یہ تمام جسمانی عیوب بھی باپ سے
بیٹے کو وراثتاً پہونچ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی محض شخصی
عادات بھی منتقل ہوتے ہیں۔ ایک شخص کو چپت

لیٹنے اور سوتے وقت دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھنے کی عادت تھی۔ اُس سے جو لڑکی پیدا ہوئی، اُس میں بھی یہی عادت نمودار ہوئی۔ جب اُسکو گہوارے میں لٹاتے، تو وہ اپنے باپ کی طرح چت لیٹتی اور ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ لیتی تھی۔ بائیں ہاتھ سے کام لینا۔ بعض رنگوں کو دیکھنا اور بعض کو نہ دیکھ سکنا (جیسا کہ مشہور عالم کیمیا ڈالٹن اور اُسکے دونوں بھائیوں کا حال تھا اور یہ آنکھوں کا عیب اُسی کے نام سے مشہور ہی) اور زبان کے ذائقے کا خراب ہونا بھی وراثت کا اثر قبول کرتا ہی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو آدمی کے گوشت کھانیکا سخت لپکا تھا اور کسیطرح اُسکی یہ عادت چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ اُس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اور پیدا ہوتے ہی ماں باپ سے جنکو زندہ آگ میں جلادینے کا حکم تھا، جدا کر لیگئی۔ اُس کی تربیت ایسے خاندان میں کیگئی، جو تربیت اور شایستگی کے باب میں نہایت مشہور تھا۔ باوجود اس تربیت کے ممکن نہ ہوا کہ آدمی کے گوشت کھانے کا لپکا، جو اُس کو باپ سے ورثے میں ملا تھا، اُس سے دُور کیا جائے۔ آخر کار ماں باپ کی طرح اُسکو بھی زندہ آگ میں جلا دیا گیا اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ ایک طرح کا جنون تھا۔

جنون کا وراثتًا ایک نسل سے دوسری نسل تک پہونچنا علمای طب کے نزدیک ایک مُسلّم بات ہی۔ ایک دفعہ حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ (۱۳۷۵) مجنونوں میں سے (۳۳۷) مجنون ایسے تھے، جنکو جنون ورثے میں حاصل ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہی کہ مجنونوں کا چوتھائی حصّہ، یا چوتھائی سے زیادہ حصّہ اسی قسم کا ہوتا ہی مجنونوں سے اُن کی اولاد کو وراثتًا جنون ہی نہیں ملتا، بلکہ اختناق۔ مرگی۔ کوریا۔ خلقی حماقت اور مراق وغیرہ امراض بھی اُن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسیطرح جو لوگ اِن بیماریوں میں مبتلا ہوں، وہ اپنی اولاد میں جنون بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اِسکے علاوہ قریبًا تمام عصبی بیماریاں ایک پشت سے کئی پشت تک منتقل ہوتی ہیں۔ ایک طبیب کا بیان ہی کہ (۲۴۴۳) مریض جو مرگی میں مبتلا تھے، اُن کے آباو اجداد کی بیماریاں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ منجملہ اُن کے (۷) کو مرگی تھی (۲۱) مجنون تھے۔ (۲۷) دیگر دماغی امراض میں مبتلا تھے۔ جن اطبا نے عصبی بیماریوں کے وراثت میں چلنے کی نہایت غور سے تحقیق کی ہی، اُن کا اسبات پر اتفاق ہی کہ حماقت اور کُند ذہنی بہت زیادہ وراثت میں چلتی ہی۔

نشہ بازوں کی اولاد میں نہایت سخت عصبی بیماریاں نمودار ہوتی ہیں۔ اگر نشے کی حالت میں حمل ٹھر جائے، تو اولاد غالبًا مرگی، یا جنون، یا حماقت، یا کسی ایسے ہی مرض میں مبتلا ہوگی یہ مسئلہ قدیم زمانے سے مشہور ہی۔ کارتھیج کے لوگوں میں دستور تھا کہ شادی کے دن سوائے پانی کے اور کوئی پینے کی چیز استعمال نہ کرتے تھے۔ متقدمین اور متاخرین سب کا قول یہ ہی کہ نشہ باز آدمی ممکن نہیں ہی کہ عمدہ اولاد پیدا کر سکے۔ نہایت غور سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہی کہ نشے سے جنون کا نطفہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہی اور اولاد میں کوئی نہ کوئی عیب اُسکی چھوڑ جاتا ہی، اگرچہ نشے سے مدہوشی چند لمحے کے لیئے رہی ہو۔

عصبی بیماریوں کے علاوہ خنازیری امراض۔ سرطان۔ آتشک۔ نقرس۔ وجع مفاصل۔ بعض مُزمن جلدی بیماریاں۔ مجملاً وہ تمام مزمن بیماریاں، جو طب میں سُوءمزاج کے نام سے مشہور ہیں، والدین سے اولاد میں منتقل ہوتی ہیں۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہی کہ ذاتی جسمانی صفات اور مشترک بیماریاں اکثر ماں باپ سے اولاد کو پہونچتی ہیں۔ اسمیں انسان اور حیوان سب شامل ہیں، مگر یہ کلیہ

قاعدہ نہیں ہے، اور جسطرح اعضا کی صفات اور بیماری کے حالات وراثت میں چلتے ہیں، اسیطرح عقلی قویٰ - اور نفسانی جذبات ورغبات بھی ایک سے دوسرے کو ورثے میں پہونچ سکتے ہیں، مگر ان کی وراثت کمزور ہے - علماے طبیعیات کا قول ہے کہ عقل وادراک کی تیزی اور جودت کا بڑا حصّہ وراثت پر موقوف ہے، مگر بہت بڑا حصہ اُسپر موقوف نہیں ہے - بعض علما اس باب میں مبالغے سے کام لیتے ہیں، ہم اس موقع پر صحیح صحیح راے بیان کرتے ہیں، جسکا جاننا عام لوگوں کے لیے ضروری ہے - گالٹن نے لکھا ہے کہ مشہور انگریز عالم رچرڈ پورسن کا خاندان قوتِ حافظہ میں ضرب المثل ہے - مصوروں - شاعروں - موسیقی دانوں کی ایک جدول تیار کیگئی ہے، جس سے ان فنون کا وراثت میں چلنا ثابت ہوتا ہے - بعض نے خیال کیا ہے کہ بائرن - گاتھے اور شلیر شاعروں کی طبیعتوں میں اُن کے آبا واجداد کا اثر تھا، حالانکہ شاید یہ صحیح نہ ہو - مصوری میں وراثت کا چلنا بیشک مُسلّم ہے - گالٹن نے اٹلی - اسپین اور ہالنڈ کے (۴۲) مصوروں کی جدول بنائی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اُن میں سے (۲۱) مصوروں کے اسلاف مصوری میں نامور ہوئے ہیں، بعض خاندانوں کا اس باب میں مشہور ہونا اور بعض میں اسکا محدود ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس فن کی طرف میلان ہونا وراثت کے سبب سے ہے - بیت اللحم کے باشندے اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ نقاشی اور مصوری وراثتاً حاصل ہوتی ہے - موسیقی والوں کی تاریخ بھی وراثت کو ثابت کرتی ہے - جرمن میں باخ کا خاندان سنہ ۱۵۵۰ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۸۰۰ء میں تمام ہوا - اس خاندان کا سردار وایٹ باخ پرسبرگ میں تنور کا کام کرتا تھا - اُس نے اپنے پیشے کو چھوڑ کر موسیقی کا فن اختیار کیا - اُسکی اولاد میں دو لڑکے تھے - وہ دونوں بھی اس فن میں مشغول ہوئے - وہ جرمن کے صوبوں میں گشت لگاتے تھے - اگلی نسل میں دو پشت تک اس فن نے خوب ترقی کی اور وہ سب کے سب موسیقی داں اور گویّے تھے - جب اس خاندان کے افراد کی تعداد بہت بڑھ گئی، تو وہ سب ایک جگہ جمع ہو کر نہ رہ سکے - بلکہ مختلف شہروں میں پھیل گئے - اُن میں یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال میں ایک دفعہ ایک جگہ جمع ہوا کریں، تاکہ اُن میں اتحاد قائم رہے - اٹھارہویں صدی کے وسط تک اُن میں یہی عادت جاری تھی - بعض دفعہ جمع ہونے کے موقعوں پر اُن کا شمار کیا گیا، تو مرد - عورت اور بچے سب ملکر (۱۲۰) کے قریب ہوئے - اس خاندان میں (۲۹) اعلیٰ درجے کے اور (۱۸) ادنیٰ درجے کے موسیقی داں خیال کیے جاتے تھے -

نفسانی اُمنگوں اور بے اعتدالیوں کے منتقل کرنے میں بھی وراثت کو بہت کچھ دخل ہے، چنانچہ لہو ولعب، فسق وفجور اور نشہ بازی کی طرف بعض لوگوں کو ایسا شدید میلان ہوتا ہے کہ ہم اُسکا کوئی سبب بیان نہیں کر سکتے سواے اسکے کہ یہ بُری اور ناشایستہ اور خطرناک قابلیت اُن کو ماں باپ سے ورثے میں پہونچی ہے - ایک شخص نے اپنی بیوی کی نسبت بیان کیا ہے کہ اسکی طبیعت کو لہو ولعب کی طرف سخت میلان تھا - وہ تمام رات نہیں سوتی تھی اور آخر کار عین نوجوانی میں پھیپڑے کی بیماری میں مرگئی - اُس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی دونوں میں یہی بدعادت موجود تھی اور دونوں کا وہی انجام ہوا، جو اُن کی ماں کا ہوا تھا - اسیطرح چوری - زنا - خونریزی - خودکشی وغیرہ کا میلان بھی وراثت میں پہونچ سکتا ہے -

اعضا اور اُن کے افعال اور حالات سے جوں جوں ہم اوپر چڑھتے اور عقلی قویٰ کے قریب پہونچتے جاتے ہیں، اسیقدر قانونِ وراثت کی حکمرانی کمزور ہوتی جاتی ہے

یہ مانا کہ ایک خاندان علم میں مشہور ہی - ایک ادب میں - ایک سیاست میں - ایک فنونِ جنگ میں اور ایک کسی اور بات میں اور یہ صفات چند پشتوں تک اُن خاندانوں میں رہیں اور منتقل ہوئیں، مگر اصلی بات یہی ہی کہ عقلی اور دماغی قوتوں میں وراثت بہت کم اثر کرتی ہی۔ اور اسکا مدار جتنا تربیت پر ہی، اتنا وراثت پر نہیں ہی۔

وراثت کا اثر کبھی باپ سے بیٹی میں اور ماں سے بیٹے میں ہوتا ہی۔ کبھی اسکے برخلاف باپ سے بیٹے کو اور ماں سے بیٹی کو اثر پہونچتا ہی۔ کبھی اولاد میں ماں باپ دونوں کا اثر نمودار ہوتا ہی۔ کبھی ماں باپ کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا، بلکہ دادا، یا پردادا، یا کسی دور کے رشتہ دار کا اثر دیکھا جاتا ہی - عروہ بن الورد جو عبسی خاندان کا تھا، اُسکی نسبت تاریخوں میں لکھا ہی کہ وہ ایک دفعہ سفر کر رہا تھا - رات کیوقت قبیلہ ہذیل کی آبادی کے قریب پہونچا، تو اُس نے آگ جلائی، مگر اس خوف سے کہ مبادا اس قبیلے کے لوگ اُس پر حملہ کریں، فورًا آگ بجھا دی اور ایک درخت کے پیچھے ہو رہا - ہذیل کے چند آدمی دور سے آگ دیکھکر اُس موقع پر پہونچے، مگر اُن کو کوئی آدمی نہیں ملا - اُن میں سے ایک سوار نے اپنا نیزہ وہیں پر گاڑ دیا اور کہا کہ میں نے اس جگہ آگ دیکھی ہی - ساتھیوں نے اُسکی بات نہ مانی اور اُسکو بُرا بھلا کہا - اُس نے کہا کہ تم معاف کرو، شاید میری نظر نے غلطی کی ہو - یہ کہکر سب واپس چلے گئے - عروہ فورًا اُن آدمیوں کے پیچھے ہو لیا - اور اُس شخص کے گھر میں چھپ رہا جس نے آگ جلنے کی جگہ بتائی تھی - وہ شخص کسی کام کے لیئے گھر سے باہر چلا گیا - اُسکی غیبت میں ایک اجنبی شخص اُس گھر کے دروازے پر آیا اور اُس نے پانی مانگا، مالکِ مکان کی بیوی نے دودھ کا ایک پیالہ بھر کر اُسکو دیا، وہ دودھ پیکر چلا گیا - جب وہی شخص واپس گھر میں آیا، تو اُس نے اپنی بیوی سے دودھ مانگا - وہ دودھ پیکر اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ آج اِس دودھ میں اجنبی آدمی کی بو آتی ہی - عورت نے اُسکو ملامت کی اور وہ خاموش ہو رہا - جب وہ سونے لگا، تو عروہ اُسکی گھوڑے کے پاس گیا، تاکہ اُسکو چُرا کر لیجائے - گھوڑے کی دولتیاں پھینکنے پر وہ شخص چونک پڑا اور شور کرنے لگا - مگر عروہ فورًا دبک گیا - جب کوئی آدمی نہ پایا، تو عورت نے پھر اُسکو بُرا بھلا کہا - اور وہ اپنے بستر پر جا لیٹا - عروہ نے تین دفعہ گھوڑا کھولنے کا ارادہ کیا - ہر دفعہ وہ شخص جاگتا اور غُل مچاتا تھا اور اُسکی عورت اُسکو ملامت کرتی تھی - چوتھی دفعہ عروہ نے گھوڑا کھول لیا اور اُسپر سوار ہوکر بھاگا - وہ شخص بھی دوسرے گھوڑے پر سوار ہوکر عروہ کے پیچھے لپکا - اور اُسکو جا پکڑا - عروہ نے گھوڑے کی باگ روک لی اور اُس سے کہا کہ اگر تم میری بات کا جواب دو، تو میں تمہارا گھوڑا پھیر دونگا - یہ کہکر اُسنے وہ تمام حالات جو گذرے تھے، بیان کیئے اور کہا کہ میں نے ایک حالت میں تو تمکو نہایت عقلمند پایا - اور دوسری حالت میں سریع الاعتقاد دیکھا - آخر اسکا سبب کیا ہی؟ اُس نے ہنسکر کہا کہ پہلی بات تو ہذیل کی طرف سے ہی، جو میرے باپ کے رشتہ دار ہیں - اور دوسری بات قبیلہ خزاعہ کی طرف سے ہی، جو میری ماں کے قرابت دار ہیں - اگر یہ دوسری بات مجھ میں نہ ہوتی، تو عرب کا کوئی باشندہ مجھپر قابو نہ پا سکتا -

عرب کے ہر قبیلے میں جو صفت غالب ہوتی تھی، اُسی صفت کے ساتھ وہ قبیلہ مشہور ہوتا تھا - اور اسکی مثالیں تاریخ میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ یہاں اُن کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہی - حجاج ابن قریۃ سے جو عرب کا نہایت مشہور فصیح البیان شخص تھا، عرب کے ہر قبیلے کا

حال پوچھتا ہے اور وہ ہر قبیلے کی نسبت بے تکلف مختصر اور مسجع فقرے بولتا جاتا ہے، اور اُن میں وہ صفات بیان کرتا ہے، جن کی وجہ سے ہر قبیلے کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ابن قریہ کا یہ دلچسپ اور فصیح و بلیغ خطبہ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں موجود ہے۔

باوجود اسکے وراثت کا قانون کلّی اور دائمی نہیں ہے جس سے عقلی قوی باپوں سے بیٹوں کی طرف ہمیشہ منتقل ہوتے رہیں، نہ اسکے ثابت کرنے کے لیئے کوئی دلیل کافی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو اسباب وراثت کے قانون کو توڑتے اور اُسکی حکومت کو کمزور کرتے ہیں، وہ اُسپر غالب آجاتے ہیں اور اُسکے اثر کو باطل کردیتے ہیں۔ اسلیئے وراثت کو قوائے عقلیہ کے منتقل کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اسباب میں جو کچھ ہمکو بیان کرنا منظور ہے، وہ دوسرے نمبر میں بیان کرینگے۔

۲
وہ اسباب جو وراثت کی برخلاف عمل کرتے ہیں

پہلے نمبر میں ہم فزیالوجی (علم افعال الاعضا) اور پیتھالوجی (علم الامراض) کے لحاظ سے جسمانی اور عقلی وراثت پر بحث کرچکے ہیں۔ اس نمبر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ وراثت کا قانون کلّی نہیں ہے بلکہ اکثر واقعات اُسکے خلاف ظہور میں آتے ہیں۔ عقلی قوتوں میں وراثت کا وجود شاذونادر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بہت سے اسباب ہیں جو وراثت کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اُسپر غالب آجاتے ہیں، اور جن سے وراثت کا اثر دب جاتا ہے اور اُسکا عمل باطل ہوجاتا ہے۔ انھیں اسباب میں سے ایک قوی سبب تعلیم و تربیت ہے۔ اُسکا اثر یہ ہے کہ انسان اُن اخلاق کا خوگر ہوجاتا ہے، جن پر چلنا اُسکی زندگی کے لیئے ضروری ہے اور اُسکا دماغ اُن معلومات سے لبریز ہوجاتا ہے جن سے وہ اپنے پیشے میں کام لیتا ہے۔

جوں جوں بچے کے قوی پھیلتے اور بڑھتے جاتے ہیں اور وہ خاص اخلاق کا خوگر ہوتا جاتا ہے اور خاص معلومات سے اپنے دماغ کو روشن کرتا جاتا ہے، اسیقدر تعلیم و تربیت کا اثر زور پکڑتا جاتا ہے۔ بچہ تربیت سے بولنا اور ایسی حرکتیں کرنا سیکھتا ہے، جو اُسکے چلنے اور دوڑنے کے لیئے ضروری ہیں اور اُن چیزوں میں اپنے حواس کا استعمال کرنا سیکھتا ہے، جو اُسکی سمجھ کے لائق ہیں، یا جن میں اُسکو راے لگانی پڑتی ہے، یا جن سے رغبت کرنے پر مجبور ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بچے کو جیسے اخلاق کی گود میں پرورش کیا جاتا ہے اور جیسی معلومات سے اُسکے دل و دماغ کو آراستہ کیا جاتا ہے، اُسکے ویسے ہی اخلاق ہوجاتے ہیں اور ویسے ہی خیالات اُسکے ذہن میں جم جاتے ہیں۔ پس تعلیم و تربیت وہ چیز ہے، جو انسان کی فطرت پر نہایت عظیم الشان اثر ڈال سکتی ہے یہاں تک کہ ماں باپ اور اولاد میں جو عقلی اور اخلاقی مشابہت ہوجاتی ہے، اُسکو اکثر ماں باپ کی تربیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ وراثت پر نہیں۔

تربیت کی بنیاد اُس میلان پر ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی تقلید کرنے کا ہے۔ بچے کے مربی جو باتیں اُسکو سکھاتے ہیں، وہی باتیں وہ سیکھ جاتا ہے اور اُنکی تقلید کرکے اُنھیں پر چل پڑتا ہے۔ نوجوان بچہ اپنے ہم صحبت لوگوں کی تقلید سے اُنکی اخلاق سیکھ جاتا ہے۔ اور اُسی سے اُسکا خاص مذاق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ تقلید کا میلان اوّل اُن لوگوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے جو سادہ لوح اور کم علم ہیں۔ پھر اُن لوگوں پر تاثیر کرتا ہے جو طبیعت کے ذکی اور ہوشیار ہیں اور بحث مباحثہ اور مقابلے کو پسند کرتے ہیں، خواہ وہ مقابلہ پیشہ میں ہو، یا فنون میں، طرز معاشرت میں ہو، میں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی جادو نگار انشا

فصاحتِ بیان اور لطافتِ تحریر میں اپنے ہمسروں پر فائق ہو اور اپنے خیالات پر، خواہ وہ بُرے ہوں، یا اچھے، لوگوں کی توجہ کی باگ اپنی طرف کھینچے چلا جاتا ہو، تو ہزارہا آدمی اُسکی تقلید پر جُھک پڑتے ہیں، خواہ یہ تقلید اُن کو دھوکے کے تاریک غار میں گرا دے، یا کامیابی کی بہشت میں پہونچا دے۔ اسکے بعد تھوڑے ہی دنوں میں تمام مصنف اور مضمون نگار اُسی کے نقشِ قدم پر چلنے لگتے ہیں۔ ایکدفعہ لوگوں نے اخبار ٹائمس آف لنڈن کے مہتمم سے پوچھا کہ اس اخبار کے مضامین کیوں ایکدوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں؟ حالانکہ لکھنے والے بہت سے مختلف مضمون نگار ہیں اُسنے کہا کہ تمام اڈیٹروں اور مضمون نگاروں پر ایک قادر الکلام شخص حکمراں ہے جسکو چیف اڈیٹر کہتے ہیں۔ سب اُسی کی تقلید کرتے ہیں۔

مذاہبِ عالم کی تاریخ پڑھنے والے خوب جانتے ہیں کہ وہ آدمی جو اسی میلان کے سبب کسی پیشوا کی نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور دلائل کی پروا نہیں کرتے اور جو کچھ دیکھتے اور سُنتے ہیں، اُسی پر عمل کرتے ہیں اور اُس شخص کی سیرت پر چلتے ہیں جو اُن میں نیکی اور استقامت کی زندگی بسر کرتا ہو، بہ نسبت اُن لوگوں کے بہت زیادہ ہوئے ہیں، جو مذہب کی حقیقت کو پرکھتے اور اُس کے حُسن و قبح کے دلائل تلاش کرتے ہوں۔ یہی میلان جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی تقلید کرنے پر آمادہ کرتا ہے، حق کی حمایت پر ہزاروں کو کمربستہ کردیتا ہے اور اُن کے دلوں میں غیرت کی آگ بھڑکاتا اور اُنکو عدل و انصاف پر اُکساتا ہے۔ اگر یہ میلان انسان کی فطرت میں نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ لوگ جو حکمراں اور اربابِ سیاست ہیں، تمام لوگوں کو اپنی رای کے ماننے اور اپنے خیالات کیساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور کر سکتے۔ اس میلان

کا ظہور مدرسوں میں نہایت صفائی سے دیکھنے میں آتا ہے، جہاں طالب العلموں کے اخلاق و عادات میں، خیالات و جذبات میں، اشتغال و افعال میں ہر سال تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ بعض طالب علم بہ نسبت بعض کے عقل و ذہانت میں نہایت تیز ہوتے ہیں اور وہ اُن طالب العلموں پر غالب آجاتے ہیں، جنکا دماغ کمزور ہے۔ اور جنکے قویٰ ضعیف ہیں۔ قوی دماغ والے ضعیف دماغ والوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اُنھیں کے اقوال اور افعال کی تقلید کریں اور اُن کو ذرا بھی اس بات کی خبر نہیں ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طالب علم تنہا تمام طالب علموں کی عقلوں اور دماغوں پر حکومت کرتا ہے اور اپنے جذبات اور خیالات کی روح اُن میں پھونکتا ہے۔ سب طالب علم اُسکے اشارے پر ناچتے اور اُسکی آواز پر چلتے ہیں اور اُسکے افعال اور اقوال کی ایسی تقلید کرتے ہیں کہ گویا وہ اُس کے افعال و اقوال کی ہُوبہُو تصویریں ہیں۔

تقلید کا میلان جاہلوں اور نامہذب اور وحشی لوگوں میں خاصکر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ افریقہ کے وحشی باشندے بہ نسبت یورپ کے شایستہ اور مہذب باشندوں کے تقلید کیطرف بہت جلد مائل ہوتے ہیں۔ شایستہ قوموں میں جو لوگ جاہل ہوتے ہیں، وہ اپنی قوم کے علما کی نسبت کہیں زیادہ تقلید پرست ہوا کرتے ہیں۔ بچوں میں جوانوں کی نسبت یہ مادّہ زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ اُن میں کوئی چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو تقلید کے زور کا مقابلہ کرسکے۔ عالم اور عاقل اور شایستہ لوگ بہت کم اور بہت دیر میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں کیونکہ جو اصول اُن کے نزدیک پہلے سے مُسلّم ہیں، اور جو خیالات سالہا سال سے اُن کے دلوں میں گردش کرتے رہتے ہیں، وہ اُنھیں کو مانتے اور اُنھیں پر عمل کرتے ہیں۔ اُن اصولوں اور اُن خیالات

سے اُن کا جُدا ہونا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اسی سبب سے کہتے ہیں کہ ہر نئی چیز کو بوڑھے مشکل سے قبول کرتے ہیں۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں تقلید کا جو میلان ودیعت رکھا گیا ہے، وہ انسان کو دوسروں کے افعال - اقوال اور حرکات کی پیروی پر مجبور کرتا ہے۔ اسی میلان سے بچے کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور اسی سے نوجوانوں کو بات چیت کرنے اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان کے عادات - اخلاق - خیالات - علوم و فنون پر اُسکا بہت بڑا اثر ہے۔ کبھی تو اُسکی رفتار وراثت کی رفتار کے متوازی ہوتی ہے اور دونوں ایک ہی عمل کرتے ہیں اور کبھی تقلید کا میلان اپنا اثر مستقل طور پر کرتا ہے اور اُسکا عمل وراثت کے برخلاف ہوتا ہے۔ شخصیت بھی اُن اسباب میں سے ہے، جو وراثت کے برخلاف اپنا عمل کرتے ہیں۔ شخصیت سے انسان کی ذاتی صفات مراد ہیں، جو قانونِ وراثت کی حکمرانی سے آزاد ہوں۔ اوپر کے بیان سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جو لوگ اپنے باپ دادا سے نہایت ممتاز اور مستثنیٰ پیدا ہوئے ہیں، اُن کی ذاتی صفات اسلاف کے صفات کی یادگار نہیں ہوتیں بلکہ وہ وراثت کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ زید نے فلاں صفت اپنے باپ عمرو سے اور عمرو نے اپنے باپ بکر سے اور بکر نے اپنے باپ خالد سے وراثت میں پائی ہے اور اسیطرح ہم اوپر تک اُس صفت کا سُراغ لگاتے جائیں، تو ہم ضرور ایک ایسے شخص تک پہونچ جائینگے جس نے وہ صفت اپنے باپ دادا سے حاصل نہیں کی بلکہ وہ اُسکی ذاتی صفت تھی اور یہی اُسکی شخصیت ہے۔ پس ہر صفت کی انتہا، اگر اُسکو اوپر تک تلاش کریں، شخصیت پر ہوتی ہے۔ اسیطرح اگر ہم کسی صفت کا کھوج باپ دادا کی طرف سے اولاد اور اولاد کی اولاد میں لگاتے جائیں، تو ایسے شخص تک پہونچ جائینگے جس میں وہ صفت نہیں ہے بلکہ اُس سے اور اُس کی اولاد سے منقطع ہو گئی ہے اور یہی اُس شخص کی شخصیت ہے۔ اِس سے ثابت ہوا کہ وراثت کی ابتدا شخصیت سے ہوتی ہے اور اُسکی انتہا بھی شخصیت ہی پر ہوتی ہے وراثت کی تاثیر شخصیت کی تاثیروں کے بالکل مخالف ہیں۔ کبھی تو وراثت شخصیت پر غالب آ جاتی ہے اور اُسکا اثر نسلاً بعد نسلٍ ہوا کرتا ہے۔ اور کبھی شخصیت کا غلبہ وراثت پر ہو جاتا ہے اور وہ اُس کی حکومت چھین لیتی ہے۔ اور اُس کی قوت کو پامال کر دیتی ہے۔ دونوں قوتیں ہمیشہ ایکدوسرے کے تعاقب میں ہیں اور دونوں میں کشمکش اور جنگ وجدل برپا رہتی ہے۔ ہماری اس بیان کی بہت سی دلیلیں ہیں، جنکی تفصیل کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ مگر مجملاً اسقدر کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ہیں جو مجنوں ہیں، یا تشنج کے دوروں میں مبتلا ہیں، اختناق کے حملوں سے مغلوب ہیں، یا ایسے ہی امراض میں گرفتار ہیں، اور بہت سے مصوّر، یا مغنّی، یا شاعر، یا انھیں جیسے فنون میں مشغول رہنے والے لوگ ہیں، جنھوں نے یہ صفات اپنے باپوں سے وراثتاً حاصل کی ہیں لیکن اُن کے باپ یہ صفات کہاں سے لائے؟ اگر کہا جائے کہ اُنھوں نے اپنے باپوں سے ترکہ میں پائی ہیں، تو پوچھا جائے گا کہ اُنھوں نے کن سے حاصل کیں۔ ہم برابر یہی سوال کرتے رہینگے یہاں تک کہ ہم ایسے اشخاص پر جا پہونچینگے جنھوں نے یہ صفات کسی سے وراثت میں نہیں

پالیں۔ مجبورًا ہمکو ماننا پڑیگا کہ وراثت کی ابتدا شخصیت سے ہوئی تھی، جہاں سے وراثت کی حکومت کا آغاز ہُوا۔ اب ہم سلسلے کو معکوس کردینگے اور پہلے مورثوں سے آخری مورثوں تک جا پہونچینگے، جن کی شخصیت وراثت پر غالب آئی اور اُسکے اثر کو باطل کردیا۔ جب ہم نامور علما کی تاریخ مطالعہ کرتے ہیں، تو یہی پاتے ہیں کہ وہ لوگ جو حافظے کی قوّت، یا طبیعت کی جودت، یا ذہن کی لطافت، یا خیالات کی نُدرت، یا جذبات کی قُدرت میں اپنے آباؤ اجداد سے ممتاز ہوئے ہیں، اُن کی ممتاز اور مستثنٰی قابلیت اور لیاقت کو وراثت سے کچھ تعلق نہیں ہے اور وہ جوہر جو اُن میں ہے، اُسکی چمک سے اُنکے اسلاف بالکل محروم تھے۔ یہ حقیقت ایسی ہے، جس سے کسیکو انکار کرنے کی مجال نہیں ہے۔ یورپ اور امریکا میں دس، یا بارہ خاندانوں سے زیادہ نہیں ہیں، جن میں علم نسلاً بعد نسل چلا آتا ہے، حالانکہ علما کی تعداد بے انتہا ہے۔ پھر اگر وراثت کا انسان پر کچھ اثر ہے، تو تربیت اور شخصیت کا اثر اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ کونسی وراثت تھی، جس نے بیو۔ فرسنل۔ لامارٹین۔ ماجندی۔ متنبّی اور اُن کے سوا ہزاروں اہلِ کمال کو علم اور عقل کے بلند ترین درجے پر پہونچا دیا، حالانکہ اُن کے باپ عوام میں سے تھے، جو نہ عقل کی بلندی پر پہونچے، نہ علم کی وسعت میں مشہور ہوئے۔

شخصیت کا جلوہ زیادہ تر فلاسفہ اور علماے مابعد الطّبیعیات میں نظر آتا ہے، کیونکہ اُن کا جولانگاہ روحانی خیالات کا میدان ہے۔ وہ مادّے کی صفات اور کیفیات سے بحث نہیں کرتے، بلکہ ایسے عنصر پر بحث کرتے ہیں، جو محض روحانی اور مادّے سے مجرّد ہے اور ایسی دنیا میں پرواز کرتے ہیں، جہاں جسمانیات کے علما نہیں پہونچ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ بہ نسبت شخصیت کے اُنپر وراثت کا اثر نہایت کمزور ہوتا ہے، کیونکہ وراثت کی تاثیر انسان کی عقلی اور اخلاقی صفات میں نہایت ضعیف ہے، جیسا کہ ہم پہلے نمبر میں بیان کرچکے ہیں۔ پس جو لوگ فلسفہ اور علم مابعد الطبیعیات میں مشہور ہوتے ہیں، اُن کی شہرت کی بنیاد اُنھیں کی ذاتی فطرت پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اسلاف سے یہ لیاقت اور قابلیت وراثت میں نہیں پاتے بلکہ وہ اُنھیں کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہ اکثر نہ اوروں کے وارث ہوتے ہیں، نہ کسیکو وارث بناتے ہیں۔ مشہور حکما سقراط۔ ڈیکارٹ۔ نیوٹن۔ اسپائی نوزا اور بہت سے دیگر علماے فلسفہ کی زندگی اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے۔ شاید کوئی شخص کہے کہ اگر یہ مشہور قابلیت اُنکو وراثتًا نہیں ملی، تو تربیت کے اثر سے، یا اُس مقام کے اثر سے، جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے یا اُس مقام کے باشندوں کے تیحر یا اور ایسے اسباب سے پیدا ہوئی ہو، جنکا انسان پر تھوڑا یا بہت اثر ہوا کرتا ہے۔ ہم اسکے جواب میں کہینگے کہ وہ ممتاز حالت، جو اُنھوں نے پیدا کی، اس سے بہت زیادہ ارفع ہے کہ وہ ایسے امور سے حاصل ہوئی ہو۔ اُن پر تعلیم و تربیت کا اثر بہت کم ہوا بلکہ یہ اثر اُس چیز کا تھا جو کسی خاص انسان کو اصلی اور شخصی نشو و نما سے، اُس ذاتی اور بجید سرگرمی سے، جو اُسکو اُسکے مقصد کیطرف کھینچ لے جاتی ہے اور اُسکو غیرت سے مخصوص اور ممتاز کرتی ہے، جو اُسکو اُسکی قوم کے باطل خیالات اور اوہام سے یا اُسکو ملک کے خاص فرقوں کی جنبہ داری سے اونچا رکھتی ہے اور اُسکو اُن خیالات میں محو رکھتی ہے، جو اُس کے دل میں موجزن ہوتے ہیں اور وہی اُسکی زندگی کی آخری منزل اور اُسکی سرگرمیوں کی انتہائی حد ہیں۔ اُسکی نظر اسی منزل اور اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا کی تمام اشیا اور تمام واقعات اور حادثات سے بے پروا اور غافل رہتا ہے

اور اُس دنیا میں رہتا ہے، جہاں اُسکے سوا کوئی مخلوق آباد نہیں ہے۔

(۳)

وہ تدبیریں جن سے عمدہ اولاد پیدا ہوسکتی ہے

ہم نے پہلے نمبر میں بیان کیا ہے کہ اعضا۔ افعال الاعضا اور قوائے عقلی پر وراثت کا کیا اثر ہوتا ہے۔ دوسری نمبر میں ہم نے اُن اسباب کی تشریح کی ہے جو وراثت کے برخلاف اثر کرتے ہیں۔ اس نمبر میں ہم اُن تدبیروں پر بحث کرنی چاہتے ہیں، جن سے عمدہ اولاد پیدا کرسکیں۔

بہت سے مشاہدات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ ماں باپ جن کے بدن قوی اور تندرست ہوں اور جن کے دماغ صحیح اور عقلیں روشن ہوں، اُن کی اولاد میں بھی جسمانی اور عقلی قوی نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔ اسلیے جب ہم چاہیں کہ اولاد میں عقلی اور اخلاقی طاقتیں پُرزور ہوں، تو بیوی اور شوہر میں عقل وفہم۔ اخلاق و عادات۔ قوت وصحت اور درازی عمر کے لحاظ سے چار یا پانچ پشت تک بہت سی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے اُن میں سے بہت سی باتیں سر کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوسکتی ہیں، کیونکہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عقلی قوی اور سر میں بہت بڑا تعلق ہے۔ قدیم زمانے میں بھی یہ خیال مشہور تھا۔ پریکلاس اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اُسکا سر بہ نسبت عام یونانیوں کے بہت بڑا ہے۔ کرمول۔ ڈیکارٹ۔ لیبنٹز۔ والٹر۔ بائرن۔ نپولین اور کوفیہ سب کے سر عام لوگوں کی نسبت بہت بڑے تھے کوفیہ کا دماغ (۱۸۲۹) گرام[1] تھا، حالانکہ عام طور پر اہل یورپ کا دماغ (۱۳۵۰) سے (۱۴۰۰) گرام تک ہوتا ہے۔ انتھروپالوجی (علم الانسان) کے مطالعہ کرنیوالوں کا قول ہے کہ جس شخص کے سر کا دائرہ (۵۰) سنٹی میٹر[2] ہو، اُسکا دماغ متوسط درجے کا ہوتا ہے اور جس کے سر کا دائرہ (۵۸) سنٹی میٹر یا اس سے زیادہ ہو، اُسمیں ترقی کرنے کی بہت بڑی قابلیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص ناموری اور شہرت پا جائے اور اُسکا سر چھوٹا ہو، تو غالباً اُسکی شہرت کسی خاص امر میں ہوگی۔ باوجود اسکے کہ سر کی شکل اور ہیئت سے قوائے عقلی کا جو حال معلوم ہوتا ہے، وہ یقینی اور قطعی نہیں ہے، بلکہ تقریبی ہے۔ تاہم بعض علمائے فرنیالوجی (علم دماغ) اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر ہم سر کو اور بشرے کو غور سے دیکھیں، تو انسان کے قوائے عقلی کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ اگر ہم سر کو ایک طرف سے دیکھنا شروع کریں اور پیچھے سے آگے کیطرف نظر دوڑائیں، تو ہمکو معلوم ہوجائیگا کہ پیشانی اور کان کی لَو کی بلندی اور اُن کی چوڑائی میں کیا نسبت ہے۔ اور سر کے پچھلے اور اگلے حصے کی دائروں کی خاص حالت دکھائی دیگی۔ اگر بھویں اُبھری ہوئی ہوں اور کان کی لَو سیدھی ہو، یا ٹیڑھی، مگر بلند ہو۔ پیشانی چوڑی اور اونچی ہو اور بشرہ شگفتہ ہو اور اُسپر بیجیائی یا کُند ذہنی کے آثار نہ ہوں، تو اُس سے انسان کا کامل اور عالی ہمت ہونا پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز نے اپنے نوکر سے کہا کہ فلاں دکان پر جاؤ اور شیکسپیر کو بلالاؤ نوکر نے کہا میں شیکسپیر کو کسطرح پہچان سکتا ہوں؟ اُس نے کہا۔ یہ تو بہت آسان بات ہے۔ تم اُسکو دیکھتے ہی پہچان جاؤگے، کیونکہ وہ حقیقت میں کامل انسان ہے اور اسی لیے عام آدمیوں سے بالکل ممتاز اور مستثنیٰ دکھائی دیتا ہے۔ اسمیں ذرا بھی شک نہیں کہ شیکسپیر کامل

[1] فرانسیسی وزن جو ۱۵٫۴۳۲ گرین یا ایک ماشہ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

[2] فرانسیسی پیمانہ جو $\frac{39}{100}$ انچ کے برابر ہوتا ہے۔

انسان تھا اور جیسا کہ اُس انگریز نے بیان کیا۔ اُسکی شکل ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں انسانیت کی تمام اعلیٰ ترین صفات موجود ہیں۔ یہی وہ کمال ہے جس کا نوعِ انسان میں پھیلانا ضروری ہے۔ کوئی تدبیر جس سے نوعِ انسان کی رہی سہی علاماتِ حیوانیت دور ہو سکتی ہیں اور اُن میں عام طور پر صفاتِ انسانیت پھیل سکتی ہیں، اس سے بہتر نہیں ہے کہ ہم وراثت کے مسئلے پر غور کریں اور اُسکے نتائج کی اصلاح پر نظر ڈالیں، یعنی اس بات کی کوشش کریں کہ جسم اور دماغ کے لحاظ سے قوی اور عمدہ اور تندرست نسل پیدا ہو۔

انگریز ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اُنکی اولاد جسمانی عقلی اور اخلاقی صفات کے لحاظ سے نہایت قوی اور تندرست ہو۔ عموماً ہر انگریز شادی کا مدار خواہشِ نفسانی پر نہیں رکھتا، بلکہ اُن باتوں کا خیال رکھتا ہے، جن سے اولاد تندرست اور قوی پیدا ہو، کیونکہ اُسکے نزدیک کامیابی اور ترقی کی اُمید اسی حالت میں ہے۔ انگریزی قوم کے شایستہ اور اعلیٰ صفات ہونے کا بڑا باعث یہی ہے کہ وہ شادی کرنے کے وقت عورتوں میں عمدہ اخلاق اور پاکیزہ تربیت کی تلاش کرتے ہیں اور اُن کی دولتمندی کو دوسرے درجے پر خیال کرتے ہیں۔ اس لیئے تمام مردوں پر فرض ہے کہ وہ جن عورتوں سے شادی کرنی چاہیں، اُن کی دولتمند اور آسودہ حال ہونے کو دریافت نہ کریں، بلکہ ان کی صورت اور سیرت کی عمدگی اور خوبی کا حال دریافت کریں، کیونکہ ایسی عورتوں سے، جنکی صحت قوی، اخلاق شایستہ اور تربیت عمدہ نہ ہو، جو نسل پیدا ہوتی ہے، وہ بھی کمزور، مرجھنی اور ناشایستہ ہوا کرتی ہے۔ تندرست اور قوی اور تربیت یافتہ عورتیں بھی، اگر ایسے مردوں سے شادی کریں، جو کمزور اور بدقوارہ ہوں، تو اسکا نتیجہ بھی ویسا ہی خطرناک ہوگا۔ ایک عالم کہتا ہے کہ جب تم کسی نوجوان لڑکی سے شادی کرنی چاہو، تو اپنی نفسانی

اُمنگوں کی باگ یکدم سے ڈھیلی نہ کردو۔ ایسا نہو کہ فوری جذبات تمھاری زندگی کو تباہ کردیں۔ تم پہلے اپنے دل سے اسطرح سوال کرو کہ آیا میں اس بات پر راضی ہو سکتا ہوں کہ میری اولاد ہر لحاظ سے ایسی ہی ہو جیسی کہ یہ نوجوان لڑکی ہے؟ اگر اسکا جواب نفی میں ہو، تو شادی نہ کرنی چاہیئے۔ دانشمند آدمی کا یہ فرض ہے کہ آیندہ زمانے کی کامیابی اور بہبودی کو، جو سالہا سال تک قائم رہیگی، تھوڑی دیر کی موجودہ لذّت پر ترجیح دے۔ ورنہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ پشیمانی اور ندامت کے سوا کوئی چارہ نہوگا۔

اگر والدین میں، یا دونوں میں سے ایک میں کوئی موروثی بیماری ہو، تو اُن کو ایسی تدبیر اختیار کرنی لازم ہے جس سے وہ بیماری اُن کی اولاد میں منتقل نہو۔ مثلاً اگر ماں کو سل کی بیماری ہو، تو اُسپر فرض ہے کہ اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے، بلکہ دودھ پلانے کے لیئے ایسی دائی کو مقرر کرے جو تندرست اور قوی الجثّہ ہو۔ اگر ماں باپ دونوں کو سینہ کا کوئی مرض ہو، تو اُن کی اولاد کو ثقیل غذاؤں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور والدین کو لازم ہے کہ گرد و غبار اور گرمی و سردی کے اثر سے اپنے تئیں محفوظ رکھیں اور اپنی طاقت سے زیادہ بلند آواز سے نہ چلائیں۔ اُن مقامات میں سکونت اختیار کریں جو سمندر کے کنارے ہوں اور جہاں سل کی بیماری شاذ و نادر ہو۔ اور یہ اس مہلک اور خطرناک مرض سے بچنے کی نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ جو لوگ آبا و اجداد کیطرف سے خنازیر بیماریوں کی قابلیت رکھتے ہوں، اُنکو صاف ہوا میں رہنا، مقوّی غذا کھانا اور گرم سمندری ملکوں میں سکونت اختیار کرنا لازم ہے۔ جو لوگ نقرس یا مثانے کی پتھری وغیرہ امراض پر آمادہ ہوں، اُنکو اعتدال کی زندگی بسر کرنی اور کثرت کے ساتھ ریاضت کرنی چاہیئے۔ جن لوگوں میں سرطان کی قابلیت ہو، اُن کو حفظانِ صحت کے کُل قاعدوں کی پابندی کرنی چاہیئے۔ اور ساتھ ہی ان کو

گی نہایت ترتیب و انتظام کے ساتھ بسر کرنی لازم ہے- لوگوں میں مرگی، یا تشنج کا مادہ ہے، اُن کو ایسی باتوں سے بنا چاہیے، جو اُن کے اعصاب کو ہیجان میں لائیں اور سی محنت اور ایسے کام سے پرہیز کرنا چاہیے، جس سے ان پیدا ہو- جو لوگ جنون کی قابلیت رکھتے ہیں، انکو ر کام سہولت سے کرنا چاہیے- اور اُن باتوں سے بچنا ہیے، جو نفسانی جذبات میں جنبش، یا دماغ میں پریشانی راکریں- یہ وہ تدبیریں ہیں، جن سے بیماریوں کا مادہ ھنے نہیں پاتا، یا انھیں کی ذات میں محدود ہو جاتا جو اُن کی قابلیت رکھتی ہیں- مگر یہ تدبیر بیماریوں کو روکنے نسل کو تقویت پہونچانے کی دوسرے درجے پر ہے- ب سے عمدہ اور سب سے اعلیٰ تدبیر تو یہی ہے کہ اگر بیوی اور شوہر دونوں میں سے کسی میں کوئی موروثی بیماری ہو، تو ن کو شادی نہ کرنی چاہیے- خاصکر اُس حالت میں جبکہ دونوں یک ہی قسم کے خطرناک مرض میں مبتلا ہوں- طبیب کا رض یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں شادی کی ہرگز اجازت دے- لیکن اگر دونوں میں سے ایک کا تندرست مزاج وسرے کے بیمار مزاج کے برخلاف ہو، یا ایک تندرست ور قوی ہیکل ہو، تو اجازت دینے میں کچھ بہت خطرہ نہیں ے- اگر اس تجویز پر عمل کیا جائے، تو اولاد میں بیماری کا ادہ کم منتقل ہوگا-

اس موقع پر ہمکو ایک سرسری نظر اس مسئلے پر بھی ڈالنی چاہیے کہ قریب کے رشتہ داروں میں شادی کا ہونا بلحاظ حفظانِ صحت کے کیسا ہے؟ - درحقیقت اس مسئلے میں علما کی رائے مختلف ہے- بعض اطبا اور علمائے انتھروپالوجی (علم الانسان)، کی رائے یہ ہے کہ وہ نسل جو خالص ہو اور کم مخلوط ہوئی ہو، اور گردوپیش کی نا ملائم حالتوں کا مقابلہ اچھی طرح کر سکتی ہو، تو اس نسل سے بہت زیادہ ہے، جو مخلوط اور غیر خالص ہے- جن لوگوں کی یہ رائے ہے، اُن کے نزدیک اُن شادیوں میں جو قریب کے رشتوں میں ہوتی ہیں، بدنتائج کا پیدا ہونا اس سبب سے نہیں ہے کہ قریب کے رشتہ داروں میں ازدواج ہوا ہے، بلکہ اسکا سبب غالبًا وہ خرابیاں ہیں، جو والدین سے ورثے میں حاصل ہوئی ہیں- اگرچہ پروفیسر تروسو اور پروفیسر بوڈین نے ثابت کیا ہے کہ قریب کی شادیوں میں اولاد غالبًا مرگی، کمزور، مجنون اور احمق پیدا ہوتی ہے، مگر بہت سی نازک اور دقیق بحثوں کے بعد یہ امر طے ہو گیا ہے کہ یہ نتیجہ غلط ہے، کیونکہ (۱۵۰۰) بیماروں میں سے جو مختلف امراض جنون و حماقت وغیرہ میں مبتلا تھے، ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کی بیماری کا باعث قریب کے رشتے میں شادی کا ہونا کہا جائے جو لوگ قریب کے رشتے میں شادی کو خطرناک قرار دیتے ہیں، اگر اُن کا قول صحیح ہو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہم اُن بیماروں کی فہرست میں کوئی ایسا مریض بھی دیکھیں جسکی بیماری کی اصلی وجہ اُسکے والدین میں قرابت کی شادی ہو

جو لوگ مسئلہ وراثت کے ماننے والے ہیں اور اسکے ثبوت میں شد و مد سے دلائل پیش کرتے ہیں، اُنکا قول صحیح ہو، یا غلط، مگر اسمیں شبہ نہیں ہے کہ انسان کے مزاج اور ترکیب جسمانی میں وراثت کو بہت بڑا دخل ہے- اور اسکے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ اگر خاص شرائط کی پابندی کی جائے، تو عمدہ اخلاق اور عمدہ جذبات ماں باپ سے اولاد میں منتقل ہو سکتے ہیں- جو شخص قدیم تاریخ کا مطالعہ کریگا، اُسکو معلوم ہو جائیگا کہ قدیم زمانے کے لوگ اپنی نسل کے محفوظ رکھنے کے لیے کسقدر اہتمام کرتے تھے اور اسکے لیے ایسی ایسی تدبیریں بھی کر گذرتے تھے کہ اگر آج اُن پر عمل کیا جائے، تو وہ نہایت شرمناک افعال ثابت ہوں- مگر ہمارے زمانے کے لوگوں کا اپنی آیندہ نسل کی طرف سے بالکل چشم پوشی اور غفلت کرنا بھی نہایت خطرناک ہے- اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر لوگوں پر یہی غفلت طاری رہی، تو بہت جلد اسکا خمیازہ کھینچنا پڑے گا-

ابھی وقت باقی ہے کہ آیندہ کے خطروں کا تدارک کرلیا جائے۔ اوپر کی بحثوں سے قطع نظر کرکے میرے نزدیک اُن خطروں کا باعث زیادہ تر قریب کے رشتوں میں شادی کا ہونا ہے کیونکہ قریب کے رشتہ داروں سے، جنکی باہم شادی ہوئی ہو نہایت آسانی سے خطرناک بیماریوں کا مادہ اُن کی اولاد میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اسکے علاوہ اخلاق بھی اس قسم کے ازدواج کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ ہمکو اس بات سے غافل نہ ہونا چاہیئے کہ عمدہ تربیت کو نسل کے شایستہ کرنے میں بہت بڑا دخل ہے۔ جس طرح اولاد کو سخت اور محنت طلب کاموں سے بچانا، خواہ وہ دماغی ہوں، یا جسمانی، ہم پر لازم ہے، اسیطرح یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ہم اُنکو جسمانی ریاضت میں مشغول رکھیں اور اسمیں ذرا کوتاہی نہ کریں۔۔ اس موقع پر اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

وراثت کے خطرناک اثر کو روکنا اور اُس کے مہلک نتایج سے نسل کو محفوظ رکھنا بیشک نہایت ضروری اور نہایت مفید اور نہایت مہتم بالشان امر ہے۔ اور اس بات کی اشاعت تمام دنیا میں کرنی چاہیئے، اگرچہ اسمیں کیسی ہی مشکلات حائل ہوں۔ چونکہ انسان پر ترغیب اور تحریک کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، اسلیئے ہمپر فرض ہے کہ عمدہ وراثت کے نتایج لوگوں کے سامنے بیان کریں، تاکہ وہ اُن تدبیروں کو اختیار کریں اور اُسکے ساتھ عمدہ تربیت کا خیال رکھیں، تاکہ نسل شایستہ ہو۔ اور دنیا میں عام بہبودی اور شایستگی پھیلجائے۔ اگر عام اور خاص آدمی سب اس طریقے پر چلیں، یعنی کوئی مرد کسی عورت سے شادی نہ کرے، جبتک یہ دریافت نہ کرلے کہ اس شادی کا نتیجہ اچھا ہوگا اور اس سے عمدہ اور پاکیزہ نسل پیدا ہوگی۔ پھر شادی کے بعد اولاد کو عمدہ تعلیم اور پاکیزہ تربیت سے آراستہ کریں، تو نوع انسان جسمانی اور دماغی حالت کے لحاظ سے معراج کمال پر پہونچ جائیگی اور دنیا سے اکثر خرابیاں اور تباہیاں ہمیشہ کے لیئے مٹ جائینگی، جن سے انسان کے جسم میں گھن لگ گیا ہے اور اُسکی عقل تباہ ہوگئی ہے۔

(رشید احمد سالم)

بصرہ
منصور عباسی کے عہد حکومت میں

حال میں ایک کتاب ہماری نظر سے گذری ہے جس کا نام حضارۃ الاسلام فی دار السلام ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اسکے مصنف کا نام جمیل افندی نخلہ ہے۔ یہ بطور ایک فرضی سفرنامہ کے ہے اور اس میں آل عباس کی سلطنت۔ سیاست قوانین۔ محکمہ جات۔ دولت و ثروت اور شایستگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس سفرنامہ کی ضمن میں عام مسلمانوں کے عادات و اشغال کا۔ اُن کی جلسوں اور صحبتوں کا۔ اُن کی تجارت اور صنعت و حرفت کا۔ اُن کی عمارات و مکانات کا۔ اُن کے طریقہ اکل و شرب اور لباس کا مفصل بیان ہے۔ اس سے پیشتر کوئی کتاب اس طرز کی عربی زبان میں تصنیف نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں جو واقعات اور حالات درج کیئے گئے ہیں، اُن کی نسبت مصنف نے جابجا اُن کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو عربی زبان میں تاریخ۔ جغرافیہ اور سیر و سیاحت پر تصنیف کی گئی ہیں۔ وہ فرضی سیاح جسکے سفر کے حالات لکھے گئے ہیں کرمان کا باشندہ ہے۔ وہ سب سے اول بصرہ میں وارد ہوا ہے جہاں مسلمانوں کی تجارت اہل عجم اور اہل ہند کے ساتھ جاری ہے۔ اسکے بعد وہ منصور عباسی کے اخیر عہد حکومت میں بغداد میں داخل ہوتا ہے اور وہاں قاضی القضاۃ ابو یوسف کے ہاں مہمان ہوتا ہے۔ اسی ذریعہ سے اُسکی رسائی وزیروں تک ہوتی ہے اور کبھی شاہی محلات میں بھی اُسکا گذر ہوتا ہے۔ مہدی عباسی جو اُس زمانے میں ولیعہد تھا۔ اُسکو اپنے بیٹوں موسیٰ اور ہارون کا اتالیق مقرر کرتا ہے۔ تحفت

خلافت پر بیٹھتے ہی وہ اُسکو خراسان میں سفیر بناکر بھیجتا ہے۔ اور وہاں ہارون رشید کے ایام خلافت تک رہتا ہے۔ اسکے بعد وہ ۱۷۰ ہجری میں بغداد کو واپس آتا ہے۔ یہاں پہونچکر وہ مسلمانوں کی علمی ترقیوں کو مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ انھوں نے علم ہیئت۔ رصد۔ فلسفہ منطق۔ علوم ریاضیہ۔ جغرافیہ۔ علوم حدیث۔ تاریخ۔ لغت۔ شاعری۔ طب۔ کیمیا۔ موسیقی اور فقہ وغیرہ علموں میں انتہا درجے کا کمال حاصل کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی علمی حالت کیساتھ دولت عباسیہ کی ثروت اور آمد وخرچ کا حال لکھتا ہے۔ پھر برمکی خاندان کی شان وشوکت اور امارت وفیاضی کی تصویر کھینچتا ہے۔ اسکے بعد نامور مسلمان امیروں اور سپہ سالاروں کے حالات درج کرتا ہے۔ اسکے ضمن میں وہ رومیوں اور دیگر سلاطین فرنگ کیساتھ مسلمانوں کی پالسی کا ذکر کرتا ہے۔ اُن باغیوں اور سرکشوں کا حال اور اُنکا آغاز وانجام بھی لکھتا ہے جنھوں نے سلطنت میں ہنگامے برپا کیے۔ ہارون رشید کے دربار خلافت میں جو علمی جلسے منعقد ہوتے تھے، اُن کے بیان میں ہارون کے مصاحبوں اور ندیموں کی لیاقت اور قابلیت۔ ابونواس کی شاعری اور بذلہ سنجی۔ اصمعی کی ادب دانی اور نکتہ پردازی۔ مغنیوں کی نغمہ ریزی اور کمال موسیقی کا صحیح صحیح خاکہ کھینچتا ہے۔ پھر ہارون کی اولاد کا۔ اُن کے نازو نعمت اور سواری وجلوس کا حال لکھتا ہے۔ جب ہارون رشید اُسکو بطور سفارت کے شارلمین شاہ فرانس کے پاس بہت سے ہدیے اور تحفے دیکر بھیجتا ہے، تو وہ اثناء سفر میں بنی امیہ کے دار الحکومت دمشق کی سیر کرتا ہے اور اُن کی گذشتہ سلطنت اور سیاست اور عمارات پر نکتہ چینی کی نظر ڈالتا ہے۔ یورپ میں پہونچکر وہ مسلمانوں کی شائستگی اور اہل یورپ کی وحشیانہ حالت کا مقابلہ کرتا ہے۔ لوٹتے وقت وہ ملک تونس سے گذر کر اسکندریہ میں پہونچتا ہے۔ پھر فسطاط میں اہرام کے عجیب وغریب میناروں کی سیر کرتا ہے۔ اور مصر کی زراعت وسرسبزی۔ دریای نیل کی روانی وطغیانی اہل مصر کی عادات وخصائل کا حال لکھتا ہے۔ مصر سے آگے بڑھکر وہ ملک نوبہ میں پہونچتا ہے۔ یہاں بندرگاہ عیذاب سے جہاز پر سوار ہوکر جدہ میں پہونچتا ہے۔ پھر ۱۸۶ ہجری میں عین حج کے زمانے میں وہ مکہ معظمہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ ہارون رشید کے ساتھ جو حج کے لیے آیا تھا، بغداد کو واپس آتا ہے۔ بغداد میں پہونچکر برامکہ کے زوال حکومت اور اُن کے قتل ہونیکا دردانگیز واقعہ چشم دید بیان کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کی طرز حکومت وسیاست پر ریمارک کرتا ہے۔ یہاں سفرنامہ کا آخری باب تمام ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ فرضی سفرنامہ ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں مگر اسمیں کوئی واقعہ اور کوئی حال ایسا نہیں ہے، جسکا استناد تاریخ۔ جغرافیہ اور سیر وسیاحت کی مستند کتابوں سے نہ کیا گیا ہو۔ ناظرین معارف کے لیے ہم اس دلچسپ کتاب میں سے بصرہ کے وہ حالات ذیل میں درج کرتے ہیں، جو سیاح مذکور نے منصور عباسی کے عہد حکومت میں بیان کیے ہیں

میں جب بصرہ میں تھا تو وہاں کے گورنر ہیثم بن معاویہ[1] کے پاس اکثر جایا کرتا تھا، جو کھانے سے فارغ ہوکر کبھی گھنٹوں تک سلطنت عباسیہ کے حالات بیان کرتا تھا۔ کبھی موجودہ حکومت کے لحاظ سے بصرہ کے موزوں اور مہتم بالشان ہونے پر گفتگو[2] چھیڑتا تھا۔ منصور نے گورنر مذکور کو اس شہر کی فصیل بنانے کا حکم دیا تھا اور اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ اس مطلب کے لیے اہل شہر سے چندہ وصول کرے[3]۔ اُسنے چندہ وصول کرنیکے بعد معماروں اور مزدوروں کا ایک مجمع عظیم جمع کیا اور فصیل کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کی۔ تھوڑے ہی خلا

[1] کامل ابن اثیر۔ [2] الف لیلہ ولیلہ۔ [3] کامل ابن اثیر۔

میں فصیل کا بہت بڑا حصہ تیار ہوگیا۔ میں جس روز بصرہ میں پہونچا ہوں، اُسکے دوسرے ہی دن ہیثم نے مجھسے کہا کہ اگر تم شہر اور فصیل کی سیر کرنا چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ میں نہایت اشتیاق سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس وقت گورنر کے جلوس میں بہت سے آدمی تھے۔ جب ہم فصیل کے قریب پہونچے، تو ہم نے بڑے بڑے خیمے اور چھولداریاں دیکھیں، جن میں بہت سے لوگ اینٹیں بنا رہے تھے[1] ہزاروں معمار اور مزدور تھے جو فصیل پر چڑھتے اور اُترتے تھے اور جو دور سے چیونٹیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں نے گورنر سے پوچھا کہ فصیل کے تمام ہونے میں کسقدر عرصہ باقی ہی۔ اُسنے کہا کہ اب اختتام کے قریب آپہونچی ہی اور اُسکا دَوْر (۴) میل کے قریب ہوگا[2]۔ اسکے بعد ہم دیر تک عمارت کی سیر کرتے رہے۔ گورنر نے کچھ دیر کے بعد مجھسے رخصت چاہی اور وہ مع اپنے جلوس کے سواروں کے دار القضا کو چلا گیا۔ اُسکے حکم سے ایک افسر جو اُسکے اسٹاف میں داخل تھا، میرے ساتھ رہا، جو مختلف سیرگاہوں اور قابل دید عمارتوں میں مجکو لیگیا۔

میں پہلے خیال کرتا تھا کہ بصرہ چھوٹا سا شہر ہی مگر اُس میں داخل ہونے اور سیر کرنے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرنا پڑا فی الحقیقت بصرہ نہایت وسیع ہی۔ اور اُسکی آبادی نہایت گنجان ہی[3] چپہ چپہ بھر زمین بھی آبادی سے خالی نہیں ہی۔ بصرہ کی مٹی میں سُرخ ریت کی آمیزش ہی۔ سوای مسجد کے کُل عمارتیں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ مسجد کی تعمیر البتہ چونے گچ کی ہی جو نہایت مضبوط اور پائدار عمارت ہی۔ آغاز اسلام میں عتبہ بن مروان نے اس مسجد کو تعمیر کرایا تھا۔ اُس زمانے میں یہ نرکل سے تیار ہوئی تھی۔ اسمیں حکمت یہ تھی کہ جہاں چاہا اسکو اُٹھالے گئے اور جہاں مناسب معلوم ہوا، اُسکو قائم کر دیا[4]۔ ابوموسیٰ اشعری نے جو بصرہ کے مشہور گورنر تھے، اپنی حکومت کے زمانے میں اس کو

[1] جغرافیۂ ابوالفداء و سفرنامۂ ابن حوقل۔ [2] سفرنامۂ ابن بطوطہ۔
[3] ماوردی۔ [4] تاریخ مسعودی۔

اینٹ سے تیار کرایا۔ اُن کے بعد زیاد کے حکم سے یہ عمارت اُس میں زیادہ کیگئی اور اُس کی خوشنمائی میں ترقی ہوئی اُسنے چونے گچ سے کُل تعمیر کو مستحکم کرایا۔ اہواز سے اُسکے لئے بڑے بڑے خوشنما ستون منگائے۔ ساج کی لکڑی کی چھت تیار کرائی۔ اُس زمانے میں اُسکی آرایش اور زینت انتہا کو پہونچگئی۔ ہم اُس مسجد کو دیکھکر حضرت علی مرتضیٰ کی مسجد کی زیارت کرنے گئے۔ جو شہر کے وسط میں فصیل سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہی۔ یہ مسجد نہایت وسیع ہی۔ اُسکے صحن میں سنگریزۂ سُرخ کا فرش ہی حضرت عثمان کی شہادت کے وقت جو نسخہ قرآن مجید کا اُن کے سامنے رکھا ہوا تھا اور جسپر اُن کے خون سے افشاں ہوگئی ہی، وہ اِس مسجد میں موجود ہی[1] اس مسجد کے سات بُرج بہت بلند ہیں جو بہت دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اس مسجد میں جمعہ ہی کو نماز پڑھ سکے کیونکہ سوا جمعہ کے ہفتے کے باقی دنوں میں وہ بند رہتی ہی اور کسی کو اُسکے اندر جانے کی اجازت نہیں ہی۔ جمعہ کے روز اُسمیں جوق جوق مسلمان ہر طرف سے آتے ہیں[2]۔ جمعے کی نماز پڑھکر ہم بازاروں کی سیر کو گئے۔ دُکانوں میں قسم قسم کی عجیب و غریب چیزیں پائی جاتی ہیں جو دور دراز ملکوں سے آئی ہیں اور جو دنیا کی مختلف قوموں کی محنت اور صنعت سے تیار ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی اشیا خاصکر ایسی نادر و نفیس ہیں جنکی ہم پلہ کوئی چیز ان اطراف میں نہیں ہی[3]۔ ہر بازار میں کچھ لوگ سیلان کی مٹکیاں سروں پر رکھے بیچتے پھرتے ہیں۔ سیلان ایک قسم کا شہد ہی جو کھجور سے تیار کیا جاتا ہی۔ اور یہاں بہت کثرت سے ملتا ہی۔ اُسمیں سے گلاب کی سی خوشبو محسوس ہوتی ہی[4]۔ دُکانداروں کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہونا اور اُنکی خرید و فروخت کے طریقے بالکل ویسے ہی ہیں جیسا کہ میں اس سے پیشتر ہر شہر میں دیکھ چکا ہوں۔ اور بغداد میں بھی یہی دستور اور یہی طریقے ہیں جیسا کہ میں آیندہ بیان کرونگا۔ بصرہ تجارت کے لحاظ سے فی الحقیقت نہایت ضروری

[1] سفرنامۂ ابن بطوطہ۔ [2] سفرنامۂ ابن بطوطہ۔ [3] جغرافیۂ قزوینی۔ [4] سفرنامۂ ابن بطوطہ۔

اور بہت بالشان مقام ہے۔ کیونکہ عراق سے جو اسباب تجارت باہر جاتا ہے اور جو اسکے اندر آتا ہے سب اسی راہ سے گذرتا ہے[1] یہی سبب ہے کہ خلفای عباسیہ نے اس شہر کے استحکام و انتظام پر نہایت توجہ کی ہے۔ اسمیں بڑی بڑی مسجدیں اور عالیشان محل بنائے گئے ہیں۔ اسمیں گورنر اور جج بھی ایسے ہی لوگ مقرر ہو کر آئے ہیں جو نہایت دانشمند اور مدبر ہوتے تھے۔ اسوقت ہیثم بن معاویہ بھی جو خلیفہ کیطرف سے گورنر ہیں، نہایت ذکی اور منتظم شخص ہیں۔ اس سے پہلے کعب بن سوار[2]۔ یزید بن منصور۔ محمد بن سلیمان نہایت نامور گورنر ہو چکے ہیں۔ خلفار کی اس توجہ کا اثر تھا کہ چند ہی روز میں اسکی تجارت بڑھ گئی۔ یہاں کے باشندے ہنرمند ہو گئے[3]۔ اور یہ شہر ترقی کر کے بلاد اسلامیہ کا مرکز ہو گیا[5]۔

اس شہر کی بنیاد پڑنے کا قصہ جیسا کہ مجھسے ہیثم نے بیان کیا، یہ ہے کہ اسلام کی آغاز فتوحات میں مسلمانوں کو ایسے مقام کی سخت ضرورت تھی، جہاں جنگ و جدل کے پرآشوب زمانے میں قیام کر سکیں اور جہاں دشمنوں کے حملے کے وقت پناہ لے سکیں۔ حضرت عمر فاروق نے عتبہ بن مروان کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ عراق میں ایسی جگہ تلاش کرے، جہاں سے قریب پانی اور چارہ اور ایندھن بآسانی دستیاب ہو سکے[6]۔ عتبہ نے اس مقام پر پہونچکر دربار خلافت کو لکھا کہ میں نے ایسا مقام خشکی کا تلاش کر لیا ہے جو تری سے متصل ہے اور جسکے قریب پانی کی جدولیں واں ہیں اور جسپر نرکل کا جنگل محیط ہے۔ فاروق اعظم نے اسکو اشارہ کیا کہ وہ اپنی ہمراہی فوج کے ساتھ اسی مقام پر اتر پڑے۔ چنانچہ اسطرح سنہ ١٤ ہجری میں اس شہر کی بنیاد پڑی، جو ہمارے زمانے میں بے انتہا ترقی کر گیا ہے[7]۔ میں جب خلیل کے پاس گیا اور

[1] قزوینی کا جغرافیہ۔ [2] تاریخ خطیب [3] تاریخ ابوالفدا، وکامل ابن اثیر۔ [4] جاحظ کی تصنیفات۔ [5] تاریخ ابن خلکان۔ [6] تاریخ
[illegible]

اُس سے بصرہ کی ابتدائی آبادی اور اسلام کی ابتدائی فتوحات پر گفتگو کی تو مجکو اُسکی زبانی معلوم ہوا کہ بصرہ کی بنیاد اسلیئے ڈالی گئی تھی کہ ایران کے باشندوں پر مسلمانوں کا پولٹیکل دباؤ قائم رہے اور بلاد ایران کی تجارت منتقل ہو کر یہاں فروغ پائے[1]۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور اُن کی فوجی طاقت زبردست ہو گئی اور انھوں نے جنگجوئی کی زندگی از سرنو اختیار کر لی اور دُنیا اُن سے آباد ہونے لگی، تو انھوں نے چاہا کہ تجارت اور صنعت و حرفت کی باگ بھی اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ انھوں نے اس شہر کے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی۔ عام و خاص اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے آدمی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور اُسکی آبادی گنجان ہوتی گئی اور اُسکی شائستگی ترقی کرتی گئی یہانتک کہ زیاد کے دورِ حکومت میں عرب کی فوج جو یہاں مقیم تھی، اُس کی تعداد اسّی ہزار تک پہونچ گئی[1]۔

بصرہ کے باشندے عموماً علم دوست ہیں۔ یہاں کی عورتیں بھی روم و چین کی عورتوں سے اچھی ہیں[2]۔ اہل بصرہ پردیسیوں کے ساتھ اسقدر مہمان نوازی اور فیاضی سے پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے وطن اور اہل و عیال کو بھول جاتے ہیں[3]۔ اگر میں اپنے وطن اور والدین سے جدا ہو کر بصرہ کے سوا کسی اور شہر میں وارد ہوتا، تو شاید حسرت اور افسردگی سے میرا کام تمام ہو جاتا۔ یہ لوگ علم اور ادب کے بے انتہا شائق ہیں اور اس لحاظ سے وہ نہایت عالی ہمت اور عالی مرتبہ خیال کیئے جاتے ہیں۔ یہاں کے علما اور کوفہ کے علما میں اکثر زبان۔ ضبط الفاظ اور صحت قواعد کے متعلق نازک اور دقیق بحثیں ہوا کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ باکمال اور محقق نہ ہوتے تو کوفہ کے علما کے ساتھ ہمسری کرنا نہایت مشکل تھا۔ مگر میں باوجود اپنی ہیچمدانی کے یہ رائے رکھتا ہوں کہ

[1] یزید بن الرشک۔ [2] اخبار البصرہ لابی عبیدہ۔
[3] سفرنامہ ابو دلف۔

 بصرہ منصور عباسی کی عہد حکومت میں۔

ضبط الفاظ کی لحاظ سے بصریوں کا مذہب کوفیوں کے مذہب سے زیادہ صحیح اور قابل ترجیح ہی۔ یہاں کے باشندے بلحاظ ترکیب جسمانی کے قوی الجثہ نہیں ہیں۔ ان کی رنگت زرد اور ملگجی ہی اور اس باب میں وہ ضرب المثل ہیں۔ شاید اسکا باعث یہاں کی آب ہوا کا اختلاف ہو، کیونکہ ایک دن میں اسقدر مختلف ہوائیں گرم و سرد چلتی ہیں کہ کبھی تو وہ قمیص پہننے پر مجبور ہوتی ہیں اور کبھی اُنکو دُہرے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ بصرہ کو شاید اسلیئے رعنا کہتے ہیں کہ وہ آب ہوا کے اختلاف سے ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔ فرزدق نے ایک مقام پر لکھا ہی۔

لولا ابو مالک المرجو نائلہ۔

ماکانت البصرۃ الرعناء لی وطنا۔

یعنی اگر بصرہ میں جو کبھی ایک رنگ پر نہیں رہتا، ابو مالک نہ ہوتا جسکی فیاضی کی مجکو توقع ہی، تو میں کبھی وہاں نہ ٹھہرتا۔ بصرہ سے عبادان ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہی۔ یہاں دجلہ اور فرات دونوں دریاؤں کا پانی ملجاتا ہی۔ پھر دونوں چلکر بحر شور میں جا گرتے ہیں۔ جب بصرہ کے قریب ان دریاؤں کا شیریں پانی آتا ہی، تو بالکل نمکین ہوجاتا ہی کیونکہ جزر کی حالت میں سمندر کا پانی جوش مارتا ہی، تو بصرہ سے اوپر تین دن کی مسافت تک پہونچ جاتا ہی اور اُسکا نمکین پانی ان دریاؤں کے پانی میں گھل مل جاتا ہی[1]۔ عراق عرب کے دیگر شہروں کی نسبت اس شہر کی ہوا گرم ہی۔ اسکا سبب یہ ہی کہ جو پانی دجلہ سے یا سمندر سے اُسکے قریب آتا ہی، وہ اُسکی باد سموم کو لطیف کردیتا ہی اور اُسکو نسیم جانفزا بنا دیتا ہی۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہاں شدت کی گرمی پڑتی ہی، اُنکی رائے یقیناً صحیح نہیں ہی[2]۔ موسم سرما میں میرا قیام وہاں نہیں رہا، اسلیئے اُسکی اصلی کیفیت بیان نہیں کرسکتا مگر سننے میں آیا ہی کہ یہاں سردی نہایت سخت پڑتی ہی[3]۔

بصرہ میں ہمارا ابتدائی زمانہ محلات کی سیر اور جلسوں اور دعوتوں میں گذرا۔ ہم نے یہاں کے عیسائیوں کو نہایت خوشحالی اور آسودگی میں پایا[1] اُن کا طرز معیشت بہ نسبت عام مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کا ہی کیونکہ وہ اپنی قدیم شائستگی کے لحاظ سے عیش پرستی اور ثروت کی زندگی سے بہ نسبت اوروں کو زیادہ خوگر ہیں۔ مگر اسکے ساتھ ہی وہ بہت سی باتوں سے محروم بھی ہیں۔ کم سے کم یہ کہ اُنکو قاضی۔ حاکم شہر۔ ناظر احکام اور مہتمم صدقات وغیرہ عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا ہی باوجود اسکے وہ بہ نسبت اُس زمانہ کی جبکہ اُنکی گردن میں ذلت کا طوق تھا، نہایت فارغ البالی و آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُنکو زمانہ میں شہر کی سڑکوں پر سوار پھرنا عیسائیوں کو ممنوع تھا (لیکن اگر کوئی بے سواری چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو) اُنکو حکم تھا کہ اگر وہ سوار بھی ہوں تو جانور کی ایک ہی پہلو پر آسن جمائیں یعنی دونوں ٹانگیں ایک ہی طرف لٹکا کر بیٹھیں[2]۔ اُنکو تلوار حمائل کرنے یا ہتیار باندھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی عیسائی مسلمانوں کی عیب جوئی کرے اور اُنکی کمزور حالت کی دشمنوں کو خبر کردے، یا کسی مسلمان عورت کیساتھ متہم ہو، تو اُسکی سزا قتل کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ کہاں وہ خطرناک حالت اور کہاں اس زمانہ میں عیسائیوں کی آزادی جنپر نہ کوئی جور و ستم ہوتا ہی، نہ کسی طرح کا مواخذہ کیا جاتا ہی۔

ماہ ربیع الآخر کے اخیر دنوں میں جبکہ بصرہ کے قیام پر بیس دن گذر چکے تھے، ہم نے اُسکے مشہور و معروف مربد کی سیر کرنی چاہی۔ یہ ایک بہت وسیع چراگاہ یا سبزہ زار ہی جو جنگل کی سمت واقع ہی[3] یہاں کثرت سے اونٹ چراکرتے ہیں۔ اس مربد میں جابجا بہت سے اشعار آویزاں ہیں جنکو عرب کے باشندے خوش الحانی کیساتھ پڑھتے ہیں۔ یہاں لوگوں نے مجکو آگاہ کیا کہ اس میدان میں ہفتہ کے خاص ایام میں عرب کے باشندے جمع ہوا کرتے ہیں اور شعر خوانی کے جلسے برپا ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کا بازار گرم ہوتا ہی[4]۔ میں نے اس چراگاہ کے اِدھر اُدھر ہر طرف نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ

[1] [illegible]

[1] ابن النقاش۔ [2] ماوردی۔ [3] ابن نقاش۔

[illegible]

کہ سوای اس سبزہ زار کے کوسوں تک ٹیلا اور چٹیل میدان چلا گیا ہی جسمیں کسی پرند کی راگنی سنائی دیتی ہی۔ نہ سوای کھجور کے کوئی درخت نظر آتا ہی کیونکہ اس میدان پر کبھی بارش نہیں ہوتی[1] مگر بصرہ کے قریب ایک آباد اور سرسبز قصبہ بھی ہی جسمیں ایک نہر دجلہ سے کاٹکر لائی گئی ہی اور وہ اُسکے درمیان سے ہوکر گذر جاتی ہی۔ نہر کا طول ۱۲ میل کا ہی[2] اسکے دونوں طرف باغات کی مسلسل قطار ہی۔ یہاں ہندوستان کی جہاز لنگر کرتے ہیں۔ اس قصبے کا نام اُبلہ ہی۔ اسکی زمین نہایت شاداب اور زرخیز ہی۔ جسپر سورج کی کرن کبھی نہیں پڑتی۔ کیونکہ جو درخت اُس پُرفضا میدان میں ہیں، وہ نہایت گنجان اور تاریک ہیں[3]۔ اس زمین کی شادابی اور سرسبزی سی بصرہ کے باشندے ہمیشہ متمتع ہوتے ہیں۔ جب ہم شہر کو واپس آے، تو ایک وسیع میدان ہمکو نظر آیا جو کھجور کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا[4]۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا، تم بتا سکتے ہو کہ ان درختوں کی قیمت کیا ہوگی؟ میں نے کہا، تمھیں بتاؤ، آخر کیا قیمت ہوگی؟۔ اُس نے کہا کہ روی زمیں پر جسقدر سونا اور چاندی موجود ہی، وہ بھی ان درختوں کی قیمت کو نہیں پہونچتا[5]۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ درخت کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں؟۔ اُس نی کہا۔ تقریبًا ۵۰ میل مربع میں[6]

بصرہ میں ایک شریف نوجوان سے میری جان پہچان ہوگئی تھی، جسکی عمر میری عمر سے تین برس کم ہوگی۔ اسکو ابونواس کہتے ہیں[7]۔ اس نوجوان کی پیشانی پر جودت اور شرافت کی روشنی پائی جاتی ہی۔ وہ ہمیشہ میرے پاس آیا جایا کرتا تھا اور مجکو اکثر سیرگاہوں میں لے جاتا تھا۔ اُسکی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ میں باوجود غمگین ہونیکے ہنستے ہنستے لوٹ جاتا تھا۔ ابونواس کی

[1] جغرافیہ ابو الفدا۔ [2] جغرافیہ خوارزمی۔ [3] جغرافیہ قزوینی۔
[4] تاریخ الدول للقرمانی۔ [5] ہارون رشید کا مقولہ ہے[6]
[6] تاریخ الدول للقرمانی۔ [7] محمد بن داؤد بن جراح۔

سوا ایک اور شخص بھی مجھسے ملا کرتا تھا، جسکو نضر بن شمیل کہتے تھے اور جو خلیل کا شاگرد تھا[1]۔ میں نے ایکروز اُس سے درخواست کی کہ وہ مجکو اپنے ساتھ خلیل کے پاس لیچلے چنانچہ وہ جمعے کی شام کو مجھے اپنی ہمراہ لیگیا۔ میں نی خلیل کی زیارت کی حقیقت میں یہ شخص اُن نامور فاضلوں میں سے ایک ہی، جنکو میں نے اس سفر میں دیکھا ہی[2]۔ اُسکی باپ کا نام احمد تھا۔ رسولِ خدا کی بعد یہ نام سب سے پہلے اُسیکا لکھا گیا تھا[3]۔ خلیل نہایت فیاض اور بامروّت انسان ہی۔ وہ ایام العرب اور تاریخ جاہلیت میں نہایت ماہر ہی مگر زمانے کی دیگر علما کیطرح اُسکی زندگی فقر و فاقہ میں بسر ہوتی ہی[4] وہ سب سے پہلا شخص ہی جس نے نحو کو ترقی دی۔ اُسکی تصنیف کا نام کتاب العین ہی۔ اُسکی وجود پر دولت عباسیہ کو جسقدر فخر و ناز ہو، بجا ہی[5]۔ اُسی نے سب سے پہلے عروض کی بنیاد رکھی، جسکا آجکل ہر طرف چرچا ہو رہا ہی[6]۔ اُس نے عروض میں پانچ دائرے ایجاد کیے جن سے پندرہ ۱۵ بحریں نکل آتی ہیں۔ اس فن کی ابتدا اسطرح ہوئی کہ ایکدفعہ خلیل کا دھوبیوں کی محلے میں گذر ہوا، جہاں اُسنے کپڑوں کے دھونے اور کوٹنے پیٹنے کی مختلف آوازیں سُنیں۔ اور اُسی کے نمونے پر یہ فن ایجاد کیا[7]۔ سیبویہ ادب میں خلیل کا شاگرد ہی۔ کیونکہ اس فن میں اُسکی شہرت انتہا کو پہونچ گئی تھی۔ اور بیشمار آدمی اُس سے ادب کی تعلیم پانے کو آتے تھے۔ یہ نامور عالم اس وقت تک زندہ ہی۔ ہماری آرزو ہی کہ دُنیا میں ایسے اور بھی نامور عالم پیدا ہوں۔

(رشید احمد سالم)

[1] تاریخ ابن خلکان۔ [2] حمید الطویل۔ [3] المقتبس للمرزبانی
[4] نضر بن شمیل۔ [5] المقتبس للمرزبانی۔ [6] تاریخ ابن خلکان
[7] تاریخ ابن خلکان۔

معارف

ایک ماھوار علمی رسالہ

اڈیٹران: حاجی محمد اسمٰعیل خاں / مولوی وحیدالدین سلیم

جلد ۲	یکم دسمبر ۱۸۹۹ء	نمبر ۶

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک .... لعہ | قیمت فی پرچہ نمونہ ۵ر

مقام اشاعت - دفتر معارف - علی گڈھ

مطبع فیض عام واقع علی گڈھ میں چھپا

مقاصد اور قواعد

۱—یہ دو جز کا ماہوار علمی رسالہ جو معارف، کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علیگڈہ سے شائع ہوا کریگا-

۲—اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اُردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اُس میں ہر قسم کے- علمی فلسفی- اخلاقی- مذہبی- تمدّنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں- انگریزی- عربی- اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید، دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کئے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو

۳—یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے- بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کئے جاینگے-

۴—بالفعل اس سالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں-

ا- حاجی محمد اسمٰعیل خاں-

ب- مولوی وحید الدین سلیم-

۵—ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشا پرداز و مضمون نگاروں کی خدمتیں درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں-
جن بزرگوں کے نام ہم کو معلوم نہیں ہیں- اگر مہربانی سے وہ خود، یا اُنکے احباب اُنکے نام و نشاں سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُنکی خدمتیں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس سالے کو اپنی قیمتی تحریر و نسے امداد پہونچائیں
جو حضرات کسی مضموں میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا-

۶—اِس سالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپیہ ہے جو نقد قیمت بھیجنے، یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرنیسے خریداروں کی خدمتیں بھیجا جائیگا- ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہو گی- نمونے کے پرچے کے لیئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کیجائیگی- اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی- رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیئے- اور اُن ہی کے نام قیمت آنی چاہیے- جواب طلب امور کے لیئے آدھ آنے کا ٹکٹ، یا جوابی کارڈ آنا ضرور ہے-

۷—جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائینگے اُنسے اُمید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائیٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائیے-

۸—حضرات خریداران معارف سے اُمید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہینگے-

۹—اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ہفتہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا- ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں-

۱۰—جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے-

۱۱—پتہ مولوی وحید الدین سلیم کا علیگڈہ دفتر رسالہ معارف ہے-

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

نمبر ۶	یکم دسمبر ۱۸۹۹ع	جلد ۲

حالاتِ سسلی

(۹)

(بنی الاغلب کی حکومت افریقہ میں - اور اُن کے فتوحات)

اب[1] ابراہیم بن الاغلب افریقہ کی وسیع سرزمین پر خود مختاری کیساتھ بیے کھٹکے کام کرنے لگا اور اس مشہور خاندانِ اغلب کا پہلا سرپرآرا بنا جسنے تقریباً ایک صدی تک افریقہ میں فرماں روائی کی - اس خاندان میں بے شبہہ وہ سارے اوصاف موجود تھے جن سے ایک متمدن خاندان سلطنت کو متصف ہونا ضروری ہے - گو یہ بات تسلیم کرلیگئی ہو کہ بربریوں کی باہمی رقابت ان کی ضعیف تمدن پذیری وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن سے افریقہ میں تمدن کا چراغ جلانا نہایت ہی دقت طلب اور قریب قریب محال کے ہو مگر بنی الاغلب نے جس طریقے پر کام کیا وہ اسبات کی ایک نہایت عمدہ دلیل ہو کہ فاتحین اسلام فتح کے ساتھ ہی کس حد تک تمدن پھیلانا چاہتے تھے یہی عمدہ کارروائیاں ہیں جن سے بنی الاغلب کی قدر و منزلت ہماری آنکھوں میں بڑھ جاتی ہو اور معلوم ہوتا ہو کہ یہ خاندان کس قدر عظمت کا مستحق ہو جسنے ایسی سخت زمین میں ایسے نازک پودے کو بارور کرنا چاہا - ہم ذیل میں موسیو سیدیو کی تحریر نقل کرتے ہیں، جو اغالبہ کے کارناموں کے متعلق نہایت ہی مختصر مگر مکمل تحریر قرار دی جاسکتی ہو -

"اس سال بنی الاغلب کی مستقل حکومت قائم ہوگئی - اغلبیوں نے اس غرض سے کہ عربوں اور بربریوں کے آئے دن کے جھگڑے دفع ہوں، باہمی میل جول کے ذریعے سے دونوں کا خون ملا دیا - جسکی وجہ سے یہ دونوں قومیں دینی اور اخلاقی طور پر متحد ہوگئیں اور ان کا باہمی

---

[1] اس نمبر میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہو - ابن اثیر کی تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد سادس صفحات ۵۱ و ۵۲ و ۱۱۱ و ۱۱۲ و ۱۱۳ - موسیو سیدیو فرانسیسی کی تاریخ عرب کا عربی ترجمہ مطبوعہ مصر ص ۱۴۲ و ۱۴۳ ائرۃ المعارف (حالات سلاطین قسطنطنیہ) - المونس فی اخبار تونس صفحہ ۳۷ و ۳۸ - البیان المغرب جلد اول صفحہ ۸۲ تا ص ۹۹ - ریاض النفوس فی طبقات علما افریقیہ للشیخ ابی بکر عبداللہ محمد المعروف بالمالکی - بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۱۸۰ تا ص ۱۸۵ - الحلۃ السیرا لابی بکر بن الابار القضاعی البلنسی بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۲۳۱ - نہایۃ الارب للنویری بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ

اوقیانوس (اٹلانٹک) کے سواحل سے لیکر مصر غربی تک پھیلی ہوئی تھی اور ان تمام مقامات میں اسکا نام عباسی خلیفہ کے نام کے ساتھ ملاکر خطبہ میں پڑھا جاتا تھا۔ بنی الاغلب نے بہت جلد ہر طرح کی ترقی شروع کردی۔ ممالکِ افریقہ اور بلادِ مغرب ان کے زیر حکم ہوچکے تو انہوں نے بحر ابیض متوسط کے ساحل پر نصرانی سلطنتوں سے لڑائیاں لڑیں اور ان میں فتحمند ہوئے۔ (بلحاظ ملکی حالت کے یہ بیان تھا اب تمدن کے کارنامے سنئے)۔ انہوں نے افریقہ میں اُس اسلامی تمدن کی روشنی پھیلائی جو اسوقت شام و عراق میں ضوفگن تھا۔ قصر قدیم اور رقادہ نامی دو عالیشان شہر بسائے۔ ان کا مستقر۔ تونس قیروان طرابلس میں ہوا کرتا تھا۔ اور اسلیئے خاص کر یہ شہر شاندار عمارتوں سے پُر ہوگئے۔ سیل کے گذرگاہوں پر پُل بنوائے، علوم۔ تجارت صنعت۔ فلاحت کو زندہ کرنے میں انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کی کئی تجارتی منڈیاں قائم کیں، جن کی وجہ سے صحرا کے رہنے والوں کو باشندگان ساحل کے میل جول کے لیئے راستہ ملگیا، سڑکیں نئے سرے سے بنائیں اور اُن پر امن کا انتظام کیا۔ اس غرض سے کہ باہمی تعلقات قائم رہیں ڈاکخانے بنائے اور اُن ڈاکخانوں کا انتظام اعیان بلاد کو تفویض کردیا گیا اور اُن کی تنقیح کے لیئے ناظر مقرر تھے۔ یہ ڈاک جو ابتدا میں حدود مغرب سے مملکتِ مصر کے حدود تک جاری تھی گھوڑوں اور ہرکاروں کی ڈاک تھی۔ بحری طاقت کیطرف بھی کامل توجہ کی اور بیڑہ جہازات ترتیب دیا جن سے وہ بحر ابیض متوسط کے مالک بنگئے"۔

یہ نہایت ہی مکمل خلاصہ ہے جسکو موسیو سیدیو نے لکھا ہے اب ہم سلسلہ وار ہر ایک والی کا حال لکھتے ہیں اور دکھلاتے ہیں کہ اس خاندان کی حالت کس طرح تدریجاً بڑھتی گئی جس کا بیان کرنا فن تاریخ کا اصلی مقصد ہے۔

ابراہیم ابن اثیر لکھتا ہے "ابراہیم کا والی ہونا ہی تھا کہ فساد کی جڑ کٹ گئی۔ اس نئے ملک کا بندوبست کیا۔ سارے باغی گرفتار کرلیئے اور عقلمندی یہ کی کہ گرفتار ہونے کے بعد سب کو دارالخلافہ میں بھیجدیا جس سے بظاہر یہ مقصد تھا کہ اسکی اطاعت گزینی کا ایک عمدہ نقش خلیفہ کے دل پر بیٹھے۔ مگر در اصل بات یہ تھی کہ ان کے یہاں سے روانہ ہوجانے کی وجہ سے افریقہ خس و خاشاک سے پاک ہوگیا اور آئے دن کے خطرے مٹ گئے۔ جب قیام امن کی طرف سے اُس کو فرصت ملی تو قوانین قدرت کے مطابق ضرور ہوا کہ قیام تمدن کی طرف توجہ کیجائے۔ قیروان کی آبادی دن بدن بڑھ رہی تھی اسلیئے قیروان کے قریب ہی ایک شہر بسایا اور جب تیار ہوچکا تو مع خدم و حشم وہیں اُٹھ آیا۔ ملک کی رفاہیت اور سرسبزی کے اصول ابھی سوچے ہی جارہے تھے کہ بارہ سال کی امارت اور آیندہ اپنی اولاد کیلیئے ایک مستقل حکومت کی بنیاد کھڑی کردینے کے بعد سنہ ۱۹۶ھ میں ابراہیم مرگیا۔

عبداللہ بن ابراہیم ابراہیم کے دو لڑکے تھے۔ عبداللہ۔ زیادۃ اللہ۔ بڑا لڑکا عبداللہ ابراہیم کے مرنے کے وقت طرابلس میں کسی بغاوت کے فرو کرنے کے لیئے گیا ہوا تھا اسنے چھوٹے لڑکے زیادۃ اللہ کو بھائی کی اطاعت قبول کرنیکی نصیحت کی اور لائق بیٹے نے بھی باپ کی وصیت کے مطابق بڑے بھائی کو باپ کے مرنے اور اسکی امارت قبول کرنے کی اطلاع دی۔ خبر ملنے پر عبداللہ قیروان آپہونچا۔ ابراہیم کی جمائی ہوئی نیو ایسی نہ تھی کہ اسکے مرنے کے ساتھ ہی منہدم ہوجائے۔ عبداللہ کو کسی بغاوت کی آگ بجھانے میں وقت صرف کرنا نہ پڑا۔ مگر باپ کی رکھی ہوئی بنیادیں اُٹھاتے ہوئے پانچ سال کی امارت کے بعد سنہ ۲۰۱ھ میں مرگیا۔

زیادۃ اللہ عبداللہ کے مرنے کے بعد زیادۃ اللہ اسکا جانشین ہوا جسکو سارے خاندان بنی الاغلب کا سب سے زبردست اور سب سے اعلی امیر سمجھنا چاہیئے، جیسا کہ اس

حالاتِ سسلی

زمانے کا خلیفہ مامون سارے خلفاے عباسیہ میں ممتاز رتبہ رکھتا تھا - ابن واوران لکھتا ہے " ملک کی حالت اسکے زمانے میں بھی ویسی ہی قابلِ اطمینان تھی اسی نے قیروان کی فصیل بنوائی - سوسہ کی فصیل کو مدوّر بنایا - قیروان کی جامع مسجد از سرِ نو تیار کرائی اور چھیاسی ہزار دینار اسکی تعمیر میں صرف کیے - باب الربیع کا پُل بنوایا - سوسہ کی رباط مستحکم بنوائی "-

فتحِ سسلی کی کوششیں | جب تمدن کی مبارک ہوائیں افریقہ کی خشک و ریتیلی زمین اور گرم آب و ہوا میں سبز ہونے لگیں تو اب وقت آگیا کہ بیرونی ترقی کیجائے - اور اس غرض کیلئے بحری طاقت کا زعم کرنا ضرور تھا، جو بنی اُمیہ کی خلافت کیساتھ ہی مردہ ہو رہی تھی - چنانچہ زیادۃ اللہ نے ایک زبردست بحری طاقت تیار کی - اور اب پھر وہ منقطع سلسلہ جو ایک مدت سے بند ہوگیا تھا کُھل گیا - زیادۃ اللہ کے جہاز بحرِ ابیض متوسّط کے سواحل پر نمودار ہونے لگے - بقولِ موسیو سیدیو اٹلی اور فرانس کے سواحل و جزائر کورسکا اور سارڈینیا ان کی آماجگاہ بن گئے - اور وہ بحرِ روم کے چکّر لگاتے ہوئے اب سسلی کے قریب ہو نکلے - اور اب وہ وقت آگیا کہ متحد دفاتحین اسلام کی کوششیں پوری کیجائیں اور سسلی پر نورِ اسلام کی شعاعیں اپنی چمک دمک برسانے لگیں -

باشندگانِ سسلی کی تباہ حالت ہم نے پہلے بیان کر دی ہے اور اس تباہی کی دلیل وہ بہت جلد زائل ہو جانیوالی قوتیں تھیں جو اُن میں پیدا ہوگئی تھیں اور جو چراغ گُل ہونیکے وقت پیدا ہوتی ہے - وہ تمام تمدّنی اسباب جن کی طرف ہم نے جابجا اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے، موجود ہو گئے تھے اور جن پر کوئی الزام لگانا دنیا کی رفتارِ ترقی سے آنکھیں بند کر لینا ہے - صرف ایک فتیلے کی ضرورت تھی، جو اس آتشیں مادہ میں جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا آگ لگا دے - اور اتفاق سے یا یوں کہو کہ عین قوانینِ قدرت کے مطابق ایسا واقعہ پیش آہی گیا -

ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ شاہانِ قسطنطنیہ دن بدن تنزّل کرتے جاتے تھے اور ان کی سلطنت کا محض ایک ڈھانچہ رہگیا تھا - تاہم سسلی کے ایک حصّے پر برائے نام ان کی حکومت باقی تھی - چنانچہ ۲۱۲ھ ہجری میں اسوقت کے قیصر میکائیل الثغ نے قسطنطین نامی بطریق کو سسلی کا حاکم بناکر بھیجا - قسطنطین نے وہاں پہونچکر باشندوں کے اُس تخیّل سے فائدہ اٹھایا جسکا ہم نے ذکر کر دیا ہے - ایک بیڑہ جہازات مرتب کیا اور اسکو افریقہ میں بھجوایا - اس بیڑہ کی کمان فیمی نامی ایک چالاک رومی افسر کو دیگئی جو قسطنطین کے سربرآوردہ افسروں میں تھا - فیمی نے اس زمانے کے اُصول کے بموجب جہانتک اُس سے ہو سکا لُوٹ مار مچا دی اور اس طرح سے وہ گویا اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا - ادھر تو فیمی اپنے کام میں مشغول تھا اور اُدھر شاہنشاہ نے قسطنطین کے نام حکم بھیجا کہ فیمی خدمت سے معزول ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ ایک سخت وحشیانہ سزا اُس کو دیجائے - نویری اس حکم کی وجہ ان الفاظ میں لکھتا ہے لشئی بلغہ عنہ - گبن اسکی وجہ یہ لکھتا ہے کہ وہ ایک پارسا عورت کو عبادتگاہ سے بھگا لایا - موسیو سیدیو کا بیان ہے کہ قسطنطین نے اسکو بُرا بھلا کہا تھا جسکی وجہ سے وہ اس سے بگڑ گیا - بہرحال کوئی وجہ ہو جب فیمی کو اس حکم کی اطلاع ملی تو اُسنے اس طاقت کے بھروسے پر جسپر وہ حکمران تھا شاہی حکم کی مطلق پروا نہ کی بلکہ علانیہ سلطنت کے برخلاف اُٹھ کھڑا ہوا - جھٹ سسلی پر چڑھ دوڑا اور بیڑہ کی وجہ سے بہت جلد اُسکو کامیابی ہوگئی - قسطنطین مارا گیا - اور فیمی سرقوسہ میں بیٹھکر مزے اوڑانے لگا - مگر فیمی کی قسمت اچھی نہ تھی - جو برتاؤ سیاقسطنطین کو فیمی کے ہاتوں نصیب ہوا تھا تقدیر سے وہی اسکی قسمت میں بھی بدا تھا - اس کا

ایک افسر بلاطہ نامی نے جو جزیرہ کے ایک حصے کا حاکم تھا بغاوت کی اور فیمی کو مار کر بھگا دیا۔ اب فیمی کے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں آئی کہ اپنے آپ کو دربار بنی الاغلب میں پہونچا دے (جس کی شوکت و طاقت ان دونوں پورے زوروں پر تھی اور یورپ بھر میں اسکا غلغلہ بلند ہو رہا تھا) اور زیادۃ اللہ سے خواستگار مدد ہو۔

زیادۃ اللہ کے پاس فیمی اپنے بقیۃ جہازوں کو لیئے ہوئے پہونچا۔ اور یہاں پہونچکر مکار اور چالاک فیمی نے اپنے مقدور بھر زیادۃ اللہ کو سسلی پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ اسنے کہا کہ سسلی پر بہت آسانی کے ساتھ قبضہ ہو سکتا ہے۔ کوئی وہاں اسکو روکنے والا نہ ملیگا۔ رومی سلطنت جو اسپر برائے نام حکمران ہے اسکا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایسے واقعات سسلی میں گذرے اور اسنے توجہ بھی نہ کی۔

مجلس مشاہیر قیروان کی رائے[۱]

زیادۃ اللہ نے اس مسئلہ پر بذاتہ خوب غور کر لینے کے بعد جیسا کہ اسکا قاعدہ تھا، قیروان کے مشہور و معروف اشخاص و فقہاء وقت کی مجلس جمع کی۔ مجلس سے سوال کیا گیا کہ وہ سسلی پر حملہ کرنے میں کیا رائے ہے، بعضوں نے رائے دی،، ہمارے خیال میں وہی طریقہ جو اب تک حملہ آوران سابق نے برتا ہے، اب بھی برتنا چاہیئے۔ ہم ایک فوری حملے کے بعد واپس ہو جائینگے اور اسکو وطن نہ بنائینگے۔ حاضرین میں سے ایک دوسرے شخص نے سوال کیا کہ وہ سسلی اور رومی سرحد میں کسقدر فاصلہ ہے، جواب دیا گیا کہ وہ آدمی دن میں دو تین دفعہ جا کر واپس آ سکتا ہے،، پھر اسنے سوال کیا کہ وہ افریقیہ سے سسلی تک کتنی مسافت ہے،، جواب دیا گیا کہ وہ ایک دن ایک رات،، اس پر اسنے رائے دی کہ وہ لو کنتُ طائراً ما طرتُ علیہا،، (اگر میں پرندہ ہوتا تو بھی کبھی وہاں اُڑکر نہ جاتا)۔ باقی تمام حاضرین کی رائے لڑائی کی طرف مائل رہی اور اُنہوں نے زیادۃ اللہ کو جہاں تک ہو سکتا تھا اس طرف راغب کیا۔

اس طرح اسبات کا تصفیہ تو ہو چکا کہ لڑائی کرلی چاہیئے مگر اب ایک اور سخت مشکل درپیش تھی جسکو بغیر سسلی پر حملہ ہو نہیں سکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ عبد اللہ بن ابراہیم کے زمانے میں باشندگان سسلی سے ایک عہدنامہ ہو چکا تھا۔ اور اسوقت تک یہ عہدنامہ قائم تھا۔ اور اسکے توڑنے کے لیئے کوئی وجہ نہ تھی۔ انیسویں صدی کے عالیشان تمدن کے لحاظ سے تو صلحنامہ کا توڑ دینا ایک دلی سی بات ہے اور جیسا جی میں آیا کھینچ تان کر اسکے لیئے وجوہات قرار دے لیئے مگر اُس اسلامی عظمت و جبروت کے زمانے میں عہدنامے کی پابندی سختی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اور گویا یہ بھی قاضی اسلام کا فرض تھا کہ سلطنت کو عہدناموں کی پابندی پر مجبور کرے اور اس کی نگرانی کرتا رہے۔ چالاک فیمی نے اس عہدنامے کے باطل کرنے کے لیئے بیان کیا کہ وہ باشندگان سسلی اپنے عہد پر قائم نہیں ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے مسلمان گرفتار کر رکھے ہیں (غالباً فیمی ہی ذاتِ شریف ہونگے جنھوں نے اُن کو گرفتار کیا تھا) حالانکہ صلحنامہ کے لحاظ سے، جسکی ایک شرط یہ بھی تھی،، (کہ جو مسلمان سسلی میں جائیگا اور وہاں سے پھر اپنے وطن واپس جانے کی خواہش ظاہر کریگا تو باشندگان سسلی کو اسکا واپس پہونچا دینا ضروری ہوگا) ان کو ایسا کرنا ناجائز تھا۔ پس جبکہ انہوں نے عہدنامے کی شرط پوری نہ کی بلکہ اُلٹا کام کیا تو اُن سے لڑائی کرنی عہدنامہ کا توڑنا نہ ہوگا،، مگر صرف فیمی کے اس قدر کہہ دینے سے کیا ہو سکتا تھا جبتک کہ قاضی کا فتویٰ جو عام رائے پر حاکم تھا صادر نہ ہو جاتا۔ افریقیہ کی عدالت العالیہ کے دونوں قاضی جن کے نام نامی قاضی اسد اور قاضی ابو محرز تھے بلوائے گئے۔ اور اُن سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا گیا۔ یہ دونوں حضرات اور ایمان دار قاضی

[۱] اس مجلس کے واقعات جو ہم نے بیان کیئے ہیں اس سے اُن فوائد کے علاوہ جن سے اس زمانے کی حالت واضح ہوتی ہے موسیو ہان کے بیان کردہ فرق کی بھی تائید ہوتی ہے، جو اُنہوں نے حملہ آوران اسلام کی نسبت قائم کیا ہے اور جسکا ہم نے گذشتہ نمبروں میں ذکر کر دیا ہے۔

اسلام کی سچی اور خالص تعلیم کے نمونے تھے اور اُن کی بے لوثی۔ بے باکی۔ سچی و دیانت داری۔ کے کارنامے ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتے ہیں۔

قاضی ابومحرز نے تو فوراً صاف جواب دیدیا "کہ سسلی پر حملہ کرنا ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔ تاوقتیکہ ہم کو اس بات کا یقین کامل نہو جائے کہ باشندگان سسلی نے عہد شکنی کی۔ ہاں جب اس بات کا پورا پورا یقین ہوجائے تو خیر اُسوقت ایک بات ہے"۔ قاضی صاحب کے اس فرمانے سے گویا حملہ سسلی کی راہ ہی بند ہوگئی مگر قاضی اسد نے کہا "ہم اُن کے قاصدوں سے اسکی تحقیق کرسکتے ہیں"۔ قاضی ابومحرز نے جواب دیا "قاصدوں کی شہادت ان کے حق میں کس طرح تسلیم کرلی جاسکتی ہے اور کسطرح محض قاصدوں کے بیان پر حکم لگایا جاسکتا ہے" قاضی اسد نے کہا "قاصدوں ہی کے ذریعے سے ہم نے صلح کی تھی اور انہی سے ہم عہد شکنی کا ثبوت بھی حاصل کرسکتے ہیں"۔

جب یہ[1] دونوں قاضی فتویٰ دے چکے تو زیادۃ اللہ نے قاصدوں سے دریافت کیا۔ اور ان سے یہ جواب ملا "ہاں کئی مسلمان گرفتار کیے ہیں اور وہ اُن کو واپس دینگے"۔ (قاصدوں میں ایک شخص مسلمان بھی تھا) اس قدر کارروائی کے بعد اب یہ مشکل طے ہوگئی کہ عہد نامہ توڑنے کا الزام نہ آئے اب زیادۃ اللہ نے بیڑے کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ نیز حکم دیا کہ بیڑہ کے تیار اور مکمل ہونے تک بندرگاہ سوسہ میں ٹھہرے رہو، جو اُس زمانے میں افریقیہ کا مشہور بندرگاہ تھا اور اسی مقام سے جہازات یورپ کو بھیجے جاتے تھے۔

اب زیادۃ اللہ کو اس امر کا تصفیہ کرنا پڑا کہ اس اہم بیڑے کی امارت کس کو دی جائے۔ بڑے غور و تجویز کے بعد قاضی اسد بن الفرات اس خدمت پر مامور کیے گئے۔

قاضی اسد کے حالات

درحقیقت ایک قاضی کے لیے یہ نہایت ہی تعجب خیز امر ہوگا کہ وہ ایک خوفناک مہم کا جس میں کامل تجربے اور سیاست کی ضرورت ہے، کمانیر بنایا جائے اور اسلیئے اگر ہم اس مقام پر قاضی صاحب کا جو اب امیر البحر بھی بنگئے تھے کسیقدر مختصر تذکرہ لکھیں تو غیر مفید نہوگا ان کے تذکرے سے اس امر کا علم حاصل ہوجائیگا کہ فی الواقع علم اور سیاست میں کوئی بیر نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے)

ہماری خوش قسمتی ہے کہ خود قاضی صاحب نے اپنے حالات کسی شخص سے بیان فرمائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "[illegible] میں پیدا ہوا۔ میرے والد فرات مجھے ساتھ لیکر محمد بن الاشعث کے لشکر کے ساتھ (جس کا حال ہم نے بیان کر دیا ہے) افریقیہ میں آئے۔ میری عمر اسوقت صرف دو سال کی تھی۔ پانچ سال تک ہم قیروان میں ٹھیرے رہے اور اس کے بعد تونس میں گئے، جہاں نو سال مقیم رہے۔ تونس میں اسوقت علم کی روشنی پڑنے لگی تھی۔ میں نے وہیں قرآن مجید تجوید کے ساتھ پڑھا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری پشت پر گھانس اُگی ہے اور جانور اُس میں چر رہے ہیں۔ ایک معبر کے پاس گیا اور اُن سے خواب کی تعبیر پوچھی۔ نیک نیت معبر نے سنکر جواب دیا "عنقریب تم کو علم حاصل ہوگا۔ اور لوگ اس سے مستفید ہونگے"، غرض اس قسم کی غیبی خوش خبریوں نے میری ہمت بڑھائی اور میں پورے طور سے علم کیطرف

[1] ہم نے اس بیان کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے تاکہ قاضیانِ اسلام کا اعلیٰ درجے کا رویہ معلوم ہو۔ علماء اسلام کی نیک نیتی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ گو باضابطہ فتویٰ ہوچکا تھا مگر تاہم علماء قیروان کی راے یہی تھی کہ لڑائی نہ کرنی چاہیے بایں خیال کہ عہد شکنی کا پورا ثبوت نہیں ملا چنانچہ ریاض النفوس میں لکھا ہے "وکرہ علماء افریقیۃ غزو صقلیۃ للعہد الذی کان لہم لانہ لم یصح عندہم انہم نقضوا العہد" ۱۲

مشغول ہوگیا - ابن زیاد نامی ایک بزرگ تھے اُن سے
موطا پڑھی - تجوید - حدیث - جو علم اُسوقت تونس میں حاصل
ہوسکتا تھا وہ میں نے سب سیکھ لیا - ظاہر ہے کہ اس قدر
علم سے شوق کی پیاس بجھنی مشکل تھی مگر اس سے زیادہ
مشکل یہ تھی کہ اس سے زیادہ علم تونس میں تھا ہی نہیں -
اسی حیص بیص میں تھا کہ شوق نے قدم آگے بڑھا دیئے اور
ہمت و مستعدی نے شوق کی آنچ اور تیز کردی آخر کار
میں وہاں سے طالب علمی کے ارادے سے نکل ہی پڑا اُسوقت
میری عمر اٹھارہ سال کی تھی - تونس سے چلکر ملکوں کی خاک
چھانتا اور مفید تجربے حاصل کرتا ہوا مشرق[1] میں پہونچا - امام
مالکؒ اسوقت زندہ موجود تھے - اُن کے حلقۂ درس میں
شریک ہوا - موطا سُنی اور اُن سے بہت کچھ مستفید ہوا -
علم کے دروازے کھل گئے - مدینے سے روانہ ہوکر عراق
میں آیا - یہاں امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ہوچکا تھا مگر ان کے
نامور شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ وغیرہ موجود تھے
اُن سے فقہ سیکھی - جب تک امام مالکؒ زندہ رہے میں
عراق ہی میں رہا - مگر جسوقت ان کا بھی انتقال ہوچکا تو
اب زیادہ ٹھیرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی - عراق سے
چل پڑا اور مصر میں آیا - یہاں امام مالکؒ کے شاگرد امام ابو القاسم
تھے - چند روز ان کی خدمت میں بھی حاضر رہا "، جس قدر
علم اس زمانے میں حاصل ہوسکتا تھا اور جو عام طور پر اس زمانے
میں رائج تھا، قاضی صاحب اسکو حاصل کرچکے تھے - معقولات
کے شاخ شانے ابھی تک نمایاں طور پر پیدا نہیں ہوئے تھے
کہ قاضی صاحب ان کو سیکھتے - مختلف ممالک کی سیاحت
سے بہت کچھ تجربہ حاصل ہوگیا تھا اور معلومات وسیع ہوگئی تھیں
ممالک اسلام پر قاضی صاحب نے ایک غائر نظر ڈال لی تھی
اُس تمدن کے پودے کسیقدر نشو و نما پانے لگے تھے جس نے
بغداد میں آیندہ چلکر ایک عظیم الشان تناور درخت کی صورت

[1] ملحوظہ - یعنی مغرب وافریقیہ جب مشرق کا لفظ لکھتے ہیں تو اُس
سے عراق، عرب وغیرہ مقصود ہوتا ہے ۱۲

پیدا کی - اور یہ رفتار ترقی قاضی صاحب نے اپنی آنکھوں سے
ملاحظہ فرمالی تھی - غرضکہ اسقدر علم - تجربہ - معلومات - وسعت
نظر کے بعد قاضی اسد افریقیہ میں واپس آئے - اور یہاں
بیٹھکر لوگوں کو مستفید کرنا شروع کیا - اور اس طرح سے
وہ خواب درست ثابت ہوا جسکو اپنی نشو و نما کے زمانے
میں دیکھا تھا - بہت جلد قاضی اسد کی شہرت پھیل گئی -
اور ملک بھر میں قاضی صاحب ہی کا نام تھا جو فقہی اور شرعی
مسائل کے طے کرنے کے لیئے ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا -
شدہ شدہ ان کی شہرت علی بن حمیلہ نامی ایک مشہور
افسر کے کان تک پہونچی اور وہ اُنکا پورا معتقد ہوگیا -
اسنے زیادۃ اللہ کی خدمت میں اسد کی بہت کچھ مدح و ثنا
کی اور رائے دی کہ ابو محرز کو جو اُسوقت قاضی افریقہ تھے
معزول اور ان کی جگہ پر اسد کو مامور کیجیئے - غالبًا اُس
کے شخصی وجوہات ہونگے - مگر زیادۃ اللہ نے علی کی رائے
منظور نہ کی - ساتھ ہی وہ قاضی اسد کے لیئے بھی کوئی خدمت
دینی ضروری خیال کرتا تھا - اُسنے ایک جدت کی اور سنہ ۲۰۴ھ
میں دونوں کو افریقہ کا مشترک قاضی بنادیا - دونوں معزز
قاضی ملکر قضا کی خدمت انجام دیا کرتے تھے اور زیادۃ اللہ
کے دل پر ان کی بے لوثی اور ایمانداری کے نقش روز بروز
بیٹھتے جاتے تھے - جب منصور طنبذی نے بغاوت
کی اور زیادۃ اللہ کو مجبور ہوکر شہر چھوڑنا پڑا تو دونوں قاضیوں
نے بڑے زور شور کے ساتھ زیادۃ اللہ کی موافقت کی -
اور مضبوطی کے ساتھ اسکی رفاقت میں ثابت قدم رہے
بلکہ خود اسکو فوج وارکین دولت کے سامنے ایسے ایسے
کڑے جواب دیئے کہ منصور بھی دنگ رہگیا -
زیادۃ اللہ منصور کی بغاوت فرو کرچکا تو اسکو دونوں معزز
قاضیوں کی ایمانداری پر کامل بھروسہ ہوگیا - اور اب
اُن سے مہمات سلطنت میں بھی مشورہ لینے لگا -
قاضی صاحب جیسا کہ ہم نے بیان کردیا ہے مختلف ممالک کے
تجربے اور دنیا کی تمام حالت سے پوری طرح پر واقف

حالات سسلی

کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ قاضی صاحب نے فوجی تعلیم کہانتک پائی مگر اس لحاظ سے کہ قاضی صاحب کے والد محمد بن الاشعث کے ساتھیوں میں سے تھے قیاس ہوتا ہے کہ اسقدر فوجی تعلیم جو اس زمانے میں عموماً عرب حاصل کرتے تھے قاضی صاحب نے بھی اپنے بچپن میں پائی تھی۔ (اس قیاس کی تائید قاضی صاحب کے اُس خطبے سے ہوتی ہے جسکو ہم آئندہ چلکر بیان کرینگے) جب سسلی پر فوجکشی کی تیاری ہونے لگی، تو بقول صاحب بیان مغرب خود قاضی صاحب نے اپنے لیئے سسلی بھجوائے جانے کی درخواست دی۔ جب ان کی درخواست پر غور کیا جانے لگا، تو اسوقت قاضی صاحب نے ارشاد فرمایا (چونکہ لوگوں نے مجھے ستایا یا لہذا منظور نہیں کرتے۔ ایسے اشخاص بہت سے موجود ہیں جو جہازوں کو چلائیں مگر ایسے اشخاص کی سخت ضرورت ہے جو ان کو کتاب و سنت کے طریقے پر چلائے) غرض غور و تجویز کے بعد قاضی صاحب مامور کیئے گئے۔ اسوقت انہوں نے زیادۃ اللہ سے یہ کہا ”اصلح اللہ الامیر۔ کیا قضا اور شریعت کے حلال و حرام کے دریافت کے بعد امیر مجھے قضا سے معزول کرتے اور امارت کی خدمت عطا کرتے ہیں“۔ زیادۃ اللہ نے جواب دیا ”میں نے آپ کو خدمت قضا سے معزول نہیں کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ امارت کی خدمت اور بڑھا دی ہے۔ قاضی کا نام آپکے لیئے باقی رہیگا اور آپ قاضی امیر کے لقب سے پکارے جائینگے“۔ افریقہ میں یہ پہلا وقت تھا کہ ایک شخص کو قضا اور امارت کے دو بظاہر مختلف منصب عطا کیئے گئے۔ قاضی صاحب پر ہی اسکا خاتمہ بھی ہوگیا اور ان کے بعد پھر کسی شخص کو یہ دونوں خدمتیں ملا کر نہیں دی گئیں۔

جسطرح سے قاضی صاحب نے قضا کی خدمت بے لوثی اور ایمانداری کے ساتھ انجام دی اسیطرح آئندہ چلکر ناظرین ان کی امارت کے کارناموں کو بھی ملاحظہ کرینگے۔ قاضی صاحب خشک مزاج عالم نہ تھے بلکہ ادیب بھی تھے اور خوش مزاج بھی۔ چنانچہ انکا ایک لطیفہ یہ ہے۔ کہتے ہیں ”انا اسد والاسد خیر الوحوش، و ابی الفرات۔ والفرات خیر الماء۔ وجدی سنان والسنان خیر السلاح“، (میں اسد ہوں اور اسد (شیر) سارے جانوروں میں بہتر ہے۔ اور میرے باپ فرات ہیں اور فرات سارے دریاؤں میں بہتر دریا ہے۔ اور میرے دادا سنان ہیں اور سنان (برچھی) سب سے عمدہ ہتیار ہے)۔

بیڑہ کی حالت اور اسکی روانگی

بیڑہ کی تیاری مکمل ہوچکی۔ جہازوں کی تعداد عموماً مورخین (نویری وغیرہ) ایک سو بیان کرتے ہیں اور بقول صاحب بیان مغرب ان کی تعداد نوسو تھی۔ (یہ تعداد فیجی کے جہازوں کے علاوہ ہے)۔ سات سو گھوڑے اور دس ہزار سپاہی تھے۔ جب سب تیاری پوری ہوچکی، تو قاضی اسد فوج کے ساتھ قیروان سے سوسہ کو روانہ ہوئے۔ قاضی صاحب کے کوچ کا نظارہ قابل دید ہے اور اس سے اس زمانے کی عام حالت بالکل آئینہ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ مصنف ریاض النفوس لکھتا ہے۔

”ربیع الاول کا مبارک مہینہ تھا جبکہ قاضی اسد روانہ ہوئے۔ زیادۃ اللہ نے اپنے تمام افسران سلطنت کے نام یہ حکم جاری کردیا تھا کہ سارے افسر قاضی صاحب کی مشایعت کے لیئے نکلیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی وہ باضابطہ سرکاری مشایعت کو چھوڑ دیجیئے۔ قاضی صاحب کی ہر دل عزیزی اور نیک نفسی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جسقدر علما قیروان میں تھے وہ سب موجود تھے۔ عام لوگوں کی کثرت سے قطع نظر کیجیئے، جنکا بیشمار مجمع قاضی صاحب کے ساتھ تھا۔ غرض کہ بل دھرنے

کو جگہ نہ تھی۔

"سامنے پیچھے۔ دائیں بائیں۔ ہر طرف خلقت کا بے شمار مجمع۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی صدائیں۔ طبل جنگ کی آواز، بے شمار جھنڈوں کا لہرانا۔ ان سب باتوں نے قاضی صاحب پر بہت ہی بڑا اثر کیا اور اسوقت بے اختیار، قاضی صاحب کی زبان سے یہ موثر اور پرجوش تقریر (جو قیروان میں اُن کی آخری تقریر تھی اور جسکو اب وہ آخری دفعہ دیکھ رہے تھے) نکلی

"لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ اے جماعت مسلمین۔ میری نسل میں اب تک نہ میرے باپ کو خدمت ولایت ملی تھی، نہ میرے کسی دادا کو نہ کسی شخص کو ایسی اہم خدمت دیگئی ہوگی جیسی کہ مجھکو دو میری آخری نصیحت سُن لو۔ جس چیز کو تم ضروری خیال کرتے ہو، میں اُسکو بجز قلم کے اور کوئی چیز نہیں پاتا۔ واسطے اے میرے بھائیو جہاں تک ہوسکے علم کی طلب اور اُسکی تدوین میں کوشش کرو، اور اُسمیں جسقدر محنت و مشقت، تم سے ہوسکے گوارا کرو۔ اور بکثرت اسطرف مشغول رہو۔ اور اس راہ میں جو سختیاں پیش آئیں اُن پر صبر کرو، علم ہی وہ شی ہے جس سے تم دنیا اور آخرت دونوں چیزوں کو پاسکتے ہو"

قاضی صاحب قیروان سے روانہ ہو کر سوسہ میں آئے۔ اور ۱۵۔ ربیع الاول روز شنبہ ۲۱۲ھ ہجری مطابق ۸۲۷ء کو جہازوں نے اپنے لنگر اٹھائے۔ سہ شنبہ کے روز سسلی کے ساحل پر پہونچ گئے۔ مازر (جسکو زمانہ حال میں مزیرہ لکھا جاتا ہے) نامی مقام پر جہازوں کے لنگر ڈالے گئے۔ باشندگان سسلی کے پاس جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کوئی بیڑہ جہازات نہ تھا جس سے وہ مدافعت کرتے۔ بغیر کسی روک ٹوک کے ساری فوج ساحل پر اُتر آئی۔ اور احتیاطاً آئندہ حملہ کی تدابیر سوچنے کے لیے تین دن اسی جگہ مقام رہا۔ (محمد مرتضیٰ)

(۱۰)
جنگ اور فتحیابی

وہ قابل افسوس تباہ و برباد حالت جو اسوقت سسلی کی[1] تھی، بار بار بیان ہوچکی ہے اور اسی کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ قاضی اسد کو اپنے روبرو کوئی ایسا بیڑہ نہ ملا، جو اُن کے راستے میں حائل ہوتا۔ اور اسی لیئے بغیر اسکے کہ کسی کی نکسیر بھی پھوٹی ہو، ساری فوج ساحل سسلی پر اُتر آئی۔

ساحل پر پہونچتے ہی فوج کا جائزہ لیا گیا (فوج کی تفصیل گذشتہ نمبر میں ہوچکی ہے) اور اب جس طریقے پر قاضی اسد نے کام کیا وہ ان کی جنگی قابلیت کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔

خبر ملی کہ بلاطہ جو خود مختار بن بیٹھا تھا، مرج بلاطہ نامی تفرجگاہ میں جو اسی کے نام سے موسوم تھا، مقیم ہے، جہاں غالباً وہ اپنی بہت جلد زائل ہوجانے والی بیفکری کے مزے لے رہا ہوگا۔ وقت کی ضرورتوں پر پوری طرح غور کر لینے کے بعد جنمیں ایک اہم ضرورت سامان رسد کی فراہمی تھی اور جسکی بغیر ایک دیرپا جنگ میں، جو کسی ملک پر قبضہ کرنیکے وقت مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیئے بالضرور پیش آتی ہے، ثابت قدمی ناممکن ہے۔ بیدار مغز جنرل نے آیندہ کارروائی کے لیئے یہ طریقہ جس سے بہتر اور کوئی طریقہ

[1] اس نمبر میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ تاریخ کامل جلد سادس مطبوعہ لیڈن از ص ۲۳۵ تا ص ۲۳۸۔
البیان المغرب ص ۹۰ و ۹۱ جلد اول۔ تاریخ ابن خلدون ص ۱۹۹ جلد چہارم مطبوعہ مصر۔ نہایۃ الارب بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹۔ ریاض النفوس بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ ص ۸۴ و ۱۸۵۔
موسیو سدیو کی کتاب کا عربی ترجمہ مطبوعہ مصر ص ۱۴۶۔

ہو نہیں سکتا تھا، قرار دیا کہ فوراً آگے بڑھکر تازہ دم اور پُرجوش فوج سے اچانک حملہ کر دینا چاہیئے۔ جس میں باسباب ظاہر ہم کو فتح نصیب ہوگی۔ اور جب بلاطہ کا تصفیہ ہوگیا تو پھر کسی سخت مقابلے کا خرخشہ باقی نہ رہیگا اور سامانِ رسد کی فراہمی میں بھی اس فتح سے بہت کچھ آسانی پیدا ہوجائیگی۔ اسی مجوزہ تدبیر کے مطابق فوج کو اطلاع دی گئی اور تین دن کا مقام مزیرہ میں اس غرض سے کیا گیا کہ آیندہ کوچ کی تیاری مکمل ہوجائے۔

اسی مقام پر قاضی صاحب نے ایک اور ضروری امر کا فیصلہ کردیا یعنی اوفیمیوس (فیمی) اور اُسکی فوج بالکل الگ کردی۔ اُن سے کہدیا گیا کہ ہمکو تمہاری امداد کی ذرا بھی حاجت نہیں ہے۔ تم کو چاہیے کہ ہم سے علیحدہ رہو اور اسیلئے کہ نادانستگی میں تم کو ہمارے ہاتوں سے کوئی اذیت نہ پہونچ جائے۔ اپنے سروں پر کسی خاص قسم کا نشان رکھو جس سے تمہاری تمیز ہوسکے، چنانچہ بتعمیل حکم انہوں نے اپنے سروں پر حشیش (ایک قسم کی نبات ہے جو بلادِ مغرب میں اُگتی ہے) لگالی۔

قاضی صاحب کی اس کارروائی سے صرف یہی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ صرف ایک پُرفخر بہادرانہ خیال تھا، بلکہ اصل یہ ہے کہ مکار افیمیوس مطلق اعتبار کے قابل نہ تھا اور جیسا کہ آیندہ چلکر معلوم ہوگا اسنے فائدہ تو کچھ بھی نہیں پہونچایا بلکہ اور اُلٹی مشکلیں ڈالدیں اور اسیلئے اسکا علیحدہ رکھنا قاضی صاحب کے تدبر اور دور اندیشی کا ایک زبردست بیّن ثبوت ہے۔

مزیرہ سے روانگی جب سب تیاری مکمل ہوچکی تو اب مزیرہ سے آگے بڑھے اور سیدھے مرج بلاطہ پر بڑھ آئے۔ اسقدر طویل مدت کے بعد جس میں قاضی صاحب ساحل پر بے روک ٹوک اُتر آئے اور پھر ساحل سے اتنی مسافت بغیر ذرا سی روک ٹوک کے طے کرلی اب بلاطہ کی آنکھیں کھلیں۔ جہانتک ہوسکا فوج جمع کی اور جسطرح ہوسکا، عرب حملہ آوروں کی سیلاب کو روکنے کے لیئے سنبھلا۔

بلاطہ کے لشکر کی تعداد بعض راویوں نے ڈیڑھ لاکھ بیان کی ہے۔ گو یہ تعداد سراسر مبالغے سے بھری ہوئی ہے اور اُسکے جھوٹ ہونے میں ذرا بھی کسی عقلمند کو اختلاف نہیں ہوسکتا مگر تاہم اسمیں شک نہیں کہ بلاطہ کے پاس رومی فوج کی ایک کافی تعداد اور مختلف قسم کے والنٹیر یا زبردستی بھرتی کی ہوئی فوج کا ایک بیشمار مگر بیکار انبوہ موجود تھا۔ اور چونکہ اب وہ آخری لڑائی ہونے والی تھی، جسکے بعد رومی سلطنت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ کے لیئے سسلی سے گل ہونا تھا اسلیئے جیسا کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے اور جسکی نظیریں تاریخ کے صفحوں پر بے شمار نظر آتی ہیں، آخری مقابلے کے لیئے اُنھوں نے جان توڑ کر مستعدی ظاہر کی ہوگی۔

لڑائی لڑائی چھڑی اور خوب ہی گھمسان کا معرکہ ہوا۔ بلحاظ اُن شہادتوں کے جو ہمارے پاس موجود ہیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عربی فوجیں بمقابلہ رومی فوجوں کے زیادہ قواعد داں اور اُصولِ جنگ سے بہت زیادہ واقف تھیں۔ ان کی صف آرائی پورے طور سے مکمل تھی[1] پس جب یہ قواعد داں فوج انتظام کے ساتھہ مختلف حصّوں سے حملہ کرتی ہوئی آگے بڑھی ہوگی، جن کا جوش پوری طرح سے

[1] مثل سارے علوم و فنون کے عربوں نے فن حرب میں بھی بہت بڑی ترقی کی ہے۔ جبکہ ہم ان کی عظیم الشان حیرت انگیز فتوحات کو تاریخ کے صفحات میں مطالعہ کرتے ہیں تو ساتھہ ہی ہمکو مان لینا پڑیگا کہ یہ عظیم الشان فتوحات بغیر کامل فن حرب کے حاصل نہیں ہوسکتیں جیسا کہ موسیو لیبان نے تصریح کردی ہے۔ لیکن ہم صرف اسیقدر کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ صاف اور صحیح تاریخی شہادت اس بارے میں پیش کرتے ہیں۔ اور ہم دعوے کے ساتھہ کہہ سکتے ہیں کہ جن اصولوں کو یورپ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے وہ فی الواقع مسلمانوں کے ہی ایجاد ہیں۔ آجکل کا فن حرب فی الحقیقت ریاضیات کے عملی طور پر استعمال کرنیکا نام ہے اور اسی پر یورپ اپنے جدید علوم کے

زوروں پر تھا اور متواتر فتوحات نے اُن میں کامیابی کی روح پھونکدی تھی تو رومی فوج جو ان کے سامنے بالکل نیم وحشی حالت رکھتی تھی اور پھر اُن کا تخیل مُردہ اور ان کے جوش سرد ہوچکے تھے کب بھلا اس زبردست نہ رُکنے والے ریلے کی تاب لاسکتے تھے - وہی ہُوا جو ہونا تھا - رومی جبتک اُن سے بَرسکار رُکے رہے مگر جب یہ نہ رُکنے والا سیلاب بڑھتا ہی چلا آیا، تو ایک راہِ فرار ہی تھی جو اُنکو اُمید دلاتی ہوئی نظر آئی - بے انتہا رومی مارے گئے - اور بلاطہ کو کامل شکست ملی -

قاضی اسد نے جسطرح اپنے آپ کو اب تک ہر طرح سے قابلِ تعریف ثابت کیا تھا، اسیطرح وہ عین معرکۂ جنگ میں بھی ایک شجاع اور بہادر سپاہی کی حیثیت میں نظر آئے - چنانچہ ایک راوی اس لڑائی کی چشم دید کیفیت اسطرح بیان کرتا ہے "میں نے اسد کو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں علم لیئے ہوئے رجز کے اشعار پڑھ رہے تھے جب قاضی صاحب قرارت وغیرہ سے فارغ ہوئے تو اسوقت فوج سے مخاطب ہوکر یہ بہت ہی مختصر فقرے جو نہایت ہی پرجوش دل سے نکلے تھے، بیان کئے -

"هٰؤُلَاءِ عجم السّاحِل، عجم الساحل سے مراد وہ لوگ ہیں، جو بوقت فتح افریقیہ ساحل سے بھاگ گئے تھے اور سسلی میں آکر مقیم ہوئے تھے، هٰؤُلَاءِ عبيد كم لا تهابوهم"

قاضی صاحب نے جو دادِ شجاعت اس معرکہ میں دی اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب وہ میدان جنگ سے واپس ہوئے ہیں تو علم کے نیزے سے لیکر بازو اور بغل کے نیچے تک سارا جسم خون میں شرابور تھا - بلاطہ اس جنگ سے اپنی جان سلامت لیکر قصریانہ کو بھاگ گیا جو اسوقت سسلی میں سرقوسہ کے بعد دوسرے درجے کا شہر تھا مگر وہ ہولناک وہشت جو عرب فاتحین سے اسکے

نام سے مخر کرتا ہے - گرہم ثابت کرینگے کہ عرب بھی اس صیغے میں برابر ریاضیات کا استعمال کرتے تھے - ہم اس بارے میں کتاب مفتاح السعادۃ سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں - مفتاح السعادہ علامہ طاش کبری زادہ کی تصنیف ہے، جو ترکوں میں ایک نامور عالم گذرا ہے - اس کتاب میں اسنے تمام علوم وفنون کی حقیقت اور ہر علم کے متعلق ایک اجمالی تاریخی بیان درج کیا ہے، جس سے ہر علم کی مشہور کتابوں اور اُن کے مصنفوں کا اجمالی حال معلوم ہوسکے - کشف الظنون میں جو بے شمار علوم کی فہرست گنوائی گئی ہے وہ سب اسی سے منقول ہے جیساکہ خود صاحب کشف الظنون نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے - یہ نایاب کتاب سرکار نظام کے کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے - اور میں نے اسی سے یہ عبارت نقل کی ہے مصنف مفتاح السعادۃ علم ترتیب عساکر کے سرخی سے لکھتا ہے -

"علم ترتیب عساکر - اس علم میں امور ذیل سے بحث کی جاتی ہے - لشکروں کی قیادت - ان کی ترتیب - فوجکی حالت کی نگرانی کے لیئے افسروں کا مقرر کرنا - فوج کی رسد کا انتظام - بزدل و شجاع سپاہیوں کی تمیز - دشمن کی فوج کو احسان کے ساتھ اپنی طرف توڑلینا - فوج کے لباس کی تیاری - ہتیاروں کا فراہم کرنا - فوجکی اخلاقی حالت پر کافی نگرانی رکھنی کہ وہ ظلم نہ کرنے پائیں عہد شکنی نہ کریں - مذہب کے پابند رہیں - کیونکہ فوجکی اخلاقی حالت کا خراب ہوجانا سلطنت کے استیصال کا باعث ہے - ماوردی مشہور مصنف کی کتاب احکام سلطانیہ میں اس فن کے متعلق کافی بیان موجود ہے -" پھر اسکے بعد علم تعابی عددیہ کے عنوان سے لکھتے ہیں -

"علم تعابی عددیہ (ریاضی کے اصول کے مطابق صف آرائی) اس علم میں ان باتوں سے بحث ہوتی ہے - لڑائی کیوقت فوجوں کی صف آرائی - صفوں کا سیدھا رکھنا - منفرد اشخاص کا قائم کرنا اور جماعتوں کا قائم کرنا - صفوں کی مقدار فوج کا متعین کرنا - پھر اُن صفوں کی ہیئت کبھی مدوّر کبھی مثلث کبھی مربع وغیرہ جیسا جیسا وقت کے مناسب ہو - (تعبیہ عربوں میں جس قدر رائج تہا اسکا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ ان میں یہ مقولہ مشہور ہے - ان الرجال كالاشباح والتعابى كالارواح فاذا احلت الارواح الاشباح حصلت الحياة - یعنی فوج کی

دل میں سما گئی تھی کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی تھی۔ اس خوف کے مارے وہ قصریانہ کو بھی چھوڑ کر قلوریا کو بھاگ گیا، جہاں وہ کسی طور سے مار ڈالا گیا۔

مرج بلاطہ کی فتح قاضی صاحب کی مجوزہ تدابیر کے بالکل مطابق واقع ہوئی۔ اب صاف نظر آرہا تھا کہ سسلی عربوں کا ہوگیا۔ اب کسی بڑے حملے کا خوف باقی نہ رہا تھا اسکے ساتھ ہی سامانِ رسد کا بھی پورا انتظام ہوگیا یعنی اس تمام سامان پر جسکو رومی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے عربوں نے قبضہ کرلیا۔

مالِ غنیمت بہت سے مویشی اور سواری کے جانور اور اسیرانِ جنگ، یا یوں کہو کہ بیگار، یا فوجی سامان اُٹھانے والے مہیا ہوگئے۔ عرب فاتحین کی یہی غنیمت ہوا کرتی تھی جسپر رحمدل مسیحی مصنفین نے دل کھول کر فاتحینِ عرب کو ظالم۔ لوٹیرے اور وحشی کے القاب سے یاد کیا ہے اور جسکی وجہ سے فاتحینِ عرب ان کے خیال میں غارتگری کے مجسّم پتلے اور تہذیب انسانیت کے سخت۔ خوفناک دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ مگر فی الواقع یہ سارا طوفان محض غنیمت کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور جہاں ہم نے غنیمت کے مفہوم کو خیال کرلیا تو پھر یہ سارا طوفان بالکل سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ غنیمت کا مفہوم اسیقدر ہے جتنا کہ ہم نے بیان کیا اور یہ صاف ظاہر ہے کہ اس غنیمت پر کوئی مدتمغ سے مدتمغ یورپین مدعی انسانیت بھی الزام نہیں لگا سکتا۔ کوئی ہمکو بتائے کہ انیسویں (۱۹) صدی کی وہ کون ایسی فرشتہ خصلت فاتح قوم ہے جو دشمن کی فوج کے اندوختہ سامان سے فائدہ نہیں اُٹھاتی ؟

[اسی پہلی مجوزہ تدبیر کے مطابق قاضی صاحب آگے بڑھنے لگے۔ اور اس غرض سے کہ جہازوں کی نگرانی ہو اور افریقہ اور سسلی میں سلسلۂ خط وکتابت جاری رہ سکے جزیرہ میں ایک مستقل کیمپ قائم کیا گیا اور اُسکی حکومت ابوزکی نامی ایک افسر کو دی گئی۔

عربوں کا رویّہ اثنائے جنگ میں اس امر کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ابتدائی فوجکشی کیوقت بہت کم مبادیِ انسانیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جا سکتا ہے مگر ان

مثال اگر جسم کی سمجھی جائے تو تعبیہ کو فرض کرو کہ وہ بمنزلہ روح کے ہے اور جسطرح روح کے جسم میں حلول کرنے سے زندگی نمودار ہوتی ہے اسیطرح فوج میں تعبیہ ہونے سے کامیابی ہوتی ہے۔ سنّۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ جو لشکر تعبیہ کے طریقے سے مرتب کیا جاتا ہے وہی مظفر و منصور ہوتا ہے۔ بعض مشہور مصنفین نے اس فن میں کتابیں لکھی ہیں چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن کی اس فن میں ایک تصنیف ہے ۱۲ اسکے ساتھ ہی عرب آلاتِ حرب کی تیاری میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے چنانچہ یہی مصنف

علم الآلات الحربیۃ کے ضمن میں لکھتے ہیں وہ اس علم سے آلاتِ حربیہ مثل منجنیق وغیرہ کی ساخت معلوم ہوتی ہے۔ یہ فن بھی علم ہندسہ کے فروع میں سے ہے۔ مشہور اسلامی مترجم کتب فلسفہ (؟) کے لڑکوں نے اس فن میں ایک بہت مفید کتاب لکھی ہے۔ تیر اندازی کا طریقہ بھی اس میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس علم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک

[illegible]

کا علم۔ اس علم میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ یہ کہنا کہ یہ کتابیں لکھی گئی ہیں، بے شبہہ یہ کہنا ہے کہ فن حرب عربوں میں اعلیٰ درجے پر تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کتابیں بالفعل ہمارے ملک میں مفقود ہیں، جن سے ہم پوری پوری کیفیت بیان کر سکیں اس نامداری کے زمانے میں صرف ایک کتاب آثار الاول ہے جو مصر میں چھپی ہے۔ جس سے کسیقدر علم حاصل ہوتا ہے تاریخ ابن خلدون سے بھی ایک حد تک کسیقدر اجمالی حالت معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک مختصر سا بیان ہے جسکو ہم نے اس مقام پر درج کرنا مناسب سمجھا۔ آئندہ کسیوقت ہم اس مضمون کو بسط کے ساتھ لکھینگے۔ ۱۲

حالاتِ سسلی

نئے فاتحین سسلی نے جس باضابطگی اور عمدگی کے ساتھ کام کیا اسکی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہو کہ کسی مورخ کی زبان سے ہم خونریزی اور جبر و تعدی کا ایک حرف بھی نہیں سنتے اور یہی وجہ تھی کہ جوں جوں قاضی صاحب آگے بڑھے مدتوں کے ستائے ہوئے باشندگانِ سسلی نے اپنے آپ کو نئے فاتحین کے قدموں پر ڈالنا شروع کیا، جن کے سایئے میں آتے ہی انھیں اپنی جان و مال کا کامل امن نصیب ہوجاتا تھا۔

جبکہ ملک میں ہر طرف عربی حکومت جمنے کے آثار نظر آرہے تھے اور قاضی اسد کا کیمپ سسلی کی دارالحکومت سرقوسہ کے قریب پہونچ گیا تھا تو اسوقت سرقوسہ میں رومی سلطنت کے بچے کھچے افسر اپنی ظالمانہ حکومت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو نہ بجھنے دینے کی غرض سے جانیں لڑا رہے تھے۔

سرقوسہ کے پادریوں کی دغابازی۔

وہ اچھی طرح سے اسبابت کو جانتے تھے کہ اب ہم میں عربوں کے روبرو ٹھیرنے کی ذرا بھی طاقت نہیں ہے۔ یہ خیال کہ رومی سلطنت شاید اپنے اس ہاتھ سے جاتے ہوئے ملک کے لیے کچھ سنبھالا لیگی، ایک بالکل بجھا ہوا خیال تھا۔ کسی خارجی مدد کی بھی مطلق امید نہ تھی۔ غرض ہر طرح سے عربوں کے مقابلے میں ٹھیرنا بیفائدہ اور لاحاصل تھا۔ بالآخر ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد بالاتفاق یہ رائے قرار پائی کہ بجز اسکے اور کوئی چارہ نہیں کہ دغابازی اور مکر و فریب سے کام نکالا جائے۔ مگر دغابازی کرنے کے لیے بھی کسی عیار رہنما کی ضرورت تھی، جو ان کو مناسب وقت رستہ تبلائے۔ اور اتفاق سے خود بخود ان کے لیے ایسا رستہ نکل آیا۔ ادھر تو سسلی کے پادری اپنی دغابازی کی چالیں سوچ رہے تھے ادھر اوفیمیوس اپنے دل میں خیال کر رہا تھا کہ عربوں نے مجھکو بالکل الگ کردیا۔ اور وہ بالکل اپنی حکومت جماتے جاتے ہیں جس سے میری اصلی غرض ان سے مدد مانگنے کی فوت ہوئی جاتی ہے۔ اب وہ سوچنے لگا کہ کس طرح چال کی جائے۔ جب دونوں جانب کے خیالات اس حد تک پہونچ گئے تھے۔ اور ہر طرف مادّہ تیار ہوگیا تھا تو اب ان دو مادّوں کا باہم ایک ہوجانا ایک ضروری امر تھا۔ غالبًا پادریوں نے اسکو ورغلایا ہوگا کہ "بلاطہ تو مر ہی گیا۔ اب یہاں تمہارا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اگر کوئی حریف ہے تو وہ عرب ہی ہیں۔ وہ تمکو سسلی کا مالک بنانے سے رہے۔ پس سسلی اُسوقت تمہارا ہوسکتا ہے، جب عرب یہاں سے نکل جائیں" بہرصورت دونوں میں سازباز ہوگئی۔ اوفیمیوس نے جیسا کہ مورخین نے صاف تصریح کردی ہے، ان سے کہلا بھیجا کہ ثابت قدم رہو اور کوشش کیے جاؤ۔ اب آیندہ کارروائی کا پروگرام تیار ہوگیا۔

سرقوسہ کے کئی بڑے نامور بطریق عرب فاتحین کے قدموں پر گرے اور نہایت رحم اور شفقت پیدا کرنے والے لہجے میں التجا کی کہ "ہم جزیہ دینے اور عربی حکومت کے زیر حمایت آنے کے لیے مستعد ہیں۔ صرف اتنی عرض ہے کہ قاضی اسد اور چند دنوں تک سرقوسہ میں داخل نہوں تاکہ اس عرصے میں ہم عربی جھنڈے کے نیچے آنے کے لیے تیار ہوجائیں"۔ جسکا جواب خود انکو یقین تھا کہ حتی المقدور خونریزی سے بچنے والے فاتحین کے پاس "ہاں" کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور ایسا ہی ہوا قاضی اسد نے ان کی درخواست منظور کرلی کہ ہم فلاں تاریخ سے پہلے سرقوسہ کے قریب آئینگے۔ وہ اپنی کیمپ ہی میں ٹھیرے رہے اور ان دغابازوں کی بات کے اعتبار پر اُن کی طرف سے آنکھ بند کرلی۔ جب سسلی کے پادریوں کو اپنی مجوزہ تدبیر کے ابتدائی حصے میں خاطرخواہ کامیابی ہوئی تو اب انہوں نے اپنی تدبیر کے باقی اور اہم حصے کو پورا کرنا شروع کیا۔ کراتا نامی قلعے کو جو سرقوسہ کا قدیم مضبوط اور زبردست قلعہ

تھا، اپنا مامن قرار دیا۔ اور جسقدر ضروری تیاری جلدی میں ہوسکتی تھی پوری کی گئی اور کافی طور پر قلعے کو مضبوط کرلیا گیا۔ سسلی کے کشت زاروں میں جسقدر غلہ اور سامانِ رسد ملسکتا تھا اور جزیرے کے قدیم گرجاؤں پر (جن کی نسبت کہا گیا ہی کہ مسیحی دنیا کے سب سے پہلے بنائے ہوئے گرجے ہیں) چڑھائے ہوئے سونے چاندی کے زیورات سب قلعے میں لاکر جمع کیے گئے۔ گو باشندگانِ سسلی اس کارروائی سے ناراض تھے۔ اوران کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنے آپ کو اسد کے ظلِّ عاطفت میں دیدیں مگر چالاکی اور دھمکی سے ان کا منہ بند کیا گیا۔

غرضکہ جب سب تیاری مکمل ہوچکی تو اب انہوں نے جزیہ قبول کرنے سے انکار کردیا اور کسیقدر ضروری مایحتاج اشیا بھیجدیں، جنکو لیکر مسلمان جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں پھر جائیں۔

یہ اُن کی طفلانہ حرکات تھیں جن سے ان کا خیال تھا کہ ہم عربی سیلابِ فتوحات کا رُخ پھیر سکینگے مگر یہ سیلاب جس زبردست زور کے ساتھ اور بغیر کسی کجروی کے اپنا کام کیے جارہا تھا اسکے سامنے دغا بازی اور مکّاری کے بنائے ہوئے کمزور بند کیا حقیقت رکھتے تھے اور کیونکر اس سے فاتحینِ عرب کا قدم پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

سرقوسہ کا محاصرہ جب مسلمانوں کو اسکی اطلاع ہوئی تو قاضی اسد نے اُسی مدبرانہ روش کے مطابق جس پر وہ کاربند ہوتے آئے تھے آیندہ کارروائی کے لیے غور کیا۔ اور بہت جلد بغیر اختلاف کے طے ہوگیا کہ پادریوں کی اس احمقانہ کارروائی کا علاج اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ ہر طرف سے سرقوسہ کا محاصرہ کرلیا جائے جس سے ان کو اُن کی بدکرداری کا مزہ چکھایا جائے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے جہازوں کے بیڑے کو جو مازر میں لنگر انداز تھا یہ حکم بھیجکر کہ ساحل سے ہوتے ہوئے سرقوسہ کے بندرگاہ میں آجائیں۔ خود فوراً آگے بڑھکر خشکی کی جانب سے محاصرہ کرلیا۔ اور جب چند ہی دنوں کے بعد عربی جہازوں کے بادبان سرقوسہ کے بندرگاہ پر ہوا میں اُڑتے ہوئے نظر آنے لگے تو سرقوسہ کے پادریوں کو معلوم ہوا کہ وہ خشکی اور تری دونوں جانب سے نہایت سخت نرغے میں پڑ گئے۔ سامانِ رسد کے جمع کرنے کے لیے قاضی صاحب نے مختلف چھوٹے چھوٹے دستے بناکر ہر طرف بھیجے جنہوں نے اسی پہلے طریقے کے مطابق فتح کے ساتھ ہی رسد کی مشکل بھی آسان کردی۔ کافی سامانِ رسد ملگیا۔ اسکے ساتھ ہی سرقوسہ کے سوا اُسکے باقی اضلاع و تعلقات بھی عربوں کے زیرِ حمایت آگئے جن میں عربوں نے اپنا انتظام شروع کردیا۔ اسکے بعد افریقہ سے بھی ان کی کمک میں چند اور نئے جہاز آگئے۔

محاصرہ کی کارروائی جس سختی کے ساتھ جاری تھی اور جس تیزی کے ساتھ عرب ہر طرف جزیرے میں اپنا قبضہ کرتے جاتے تھے اسکے بعد ممکن نہ تھا کہ سرقوسہ والے زیادہ دن تک صبر کرسکتے۔

پلرمو والوں سے مقابلہ اگر کوئی افسردہ خیال اُنکو اسوقت تھا تو وہ یہ تھا کہ شاید قیصرِ روم مدد دے مگر قسطنطنیہ کے عیاش اُمرا سلطنت اپنی خوابِ ناز میں تھے اُن کو خبر بھی نہ ہوئی کہ سسلی میں کیا ہورہا ہی۔ ہاں پلرمو کے حاکم نے جو ابھی تک عربوں کی بابرکت حمایت سے مستفید نہ ہوا تھا کسیقدر حمیت کے ساتھ مدد دینے کا ارادہ کیا۔ اُسنے بہت سی فوج جمع کی اور سرقوسہ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اسوقت مسلمانوں کو نہایت خطرہ درپیش تھا۔ اگر پلرمو والوں سے لڑائی اسوقت باشندگانِ سرقوسہ بھی حملہ کرتے تو نہایت بُرا ہوتا مگر ایسی خفیف رکاوٹیں ان زبردست فاتحوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھیں۔ مدبر جنرل نے حکم دیدیا کہ اپنی حفاظت کیلیے خندقیں کھودلی جائیں

اور ایک نئی تدبیر یہ کام میں لائی گئی کہ خندق کے اُس پار بہت سے گڑھے کھدوا دیئے گئے اور بظاہر اُن کو پاٹ دیا گیا - یہ ساری کارروائی اسقدر پھرتی اور خفیہ طور سے ہوئی کہ پلرمو والوں کو خبر بھی نہ ہونے پائی - اور جب وہ بڑے زور شور سے چلے آ رہے تھے تو دفعتہً یہ معلوم ہوا کہ زمین نے اپنا مُنہ کھول دیا ہے اور اُن کو نگلے جا رہی ہے ابھی وہ اس بلائے جان ستاں سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ عربوں نے اچانک حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ساری فوج کاٹ کے ڈال دی - اور اسطرح اُس خفیف سی اُمید کا روزن بھی بند ہو گیا جو اہلِ سرقوسہ کو نظر آ رہا تھا -

اب آخر بار کر وہی ایک بات اُن کی سمجھ میں آئی، جو بغیر اِس بیغائے خونریزی کے بھی اچھی طرح حاصل ہو سکتی تھی - امان کا لفظ پھر قاضی صاحب کے کیمپ میں سنا گیا اور صلح پسند جنرل ان کی درخواست منظور کر لیتے مگر تمام افسر اسقدر پُرجوش ہو رہے تھے کہ اُنہوں نے متفق ہو کر صلح سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ "جب ہم بزورِ شمشیر فتح کر سکتے ہیں تو پھر ہیٹے بنکر صلح کیوں کریں"

افسوس ہے کہ عربوں کا یہ جوش نہایت ہی بُرا تھا اور فی الواقع خود مرتے ہوئے کو مارنا عربی اخلاق اور بہادری کے خلاف تھا اور اسی کی شامت تھی کہ آیندہ چلکر ایسی سخت مصیبت اُٹھانی پڑی کہ سارا جوش کرکرا ہو گیا

قاضی اسد کا انتقال ایک سخت وبا پھیلی جو ایسے موقعوں میں ایک لازمی بات ہے اور اس وبا نے ہزاروں بہادروں کو جو سرقوسہ کی فتح پر تلے ہوئے تھے بغیر ایک تلوار چلانے کے بھی جامِ شہادت پلا دیا - اور اسی وبا کا شہید بنکر افریقہ کی زمین کا پلا ہوا، ایماندار عالی دماغ فقیہ اور محقق اور فوجِ اسلام کا مدبر - مستقل مزاج - صلح پسند جنرل، جسکو آپنے اب تک ہر وقت عربی فوج کا سپہ سالار رہتے ہوئے دیکھا ہے

یعنی قاضی اسد دُنیا ہی سے اُٹھ گیا - یہ پہلی ہی مصیبت تھی، جو عربی فوج کو پیش آئی اور جس سے اُنکے ہوش باختہ ہو گئے قاضی اسد کی نعش اُسی سرزمین میں دفن کی گئی جس کے فتح کرنیکو وہ افریقہ سے چلے تھے - جس طرح زندگی میں قاضی اسد عربوں کی رہنمائی اور ان کی حفاظت کرتے رہتے تھے اُن کے مرنے کے بعد اُن کی قبر بھی گویا زبانِ حال سے اُن کو جوش دلاتی اور ہر وقت یہ کہتی تھی کہ کیا تم اپنے سپہ سالار کی قبر کو جسنے تمہارے لیئے اپنی جان فدا کر دی، اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے ؟

عربوں کے لیئے یہ بہت ہی نازک وقت تھا - ایک زبردست ہاتھ کے موجود نہ رہنے کا اثر اب صاف طور سے نمایاں اور محسوس ہونے لگا - ایک پُرزہ ایسا نکل گیا کہ سارے کیل کانٹے بگڑ گئے، انتظام درہم برہم ہو گیا، اسیرانِ جنگ موقع پاکر بھاگ گئے - وبا اُسی زور شور سے جاری تھی اور اسنے ناک میں دم کر رکھا تھا - ان سب آفتوں پر طرّہ یہہ ہوا کہ اب سلطنتِ مشرقی کی بھی آنکھیں کھلیں اور اُسنے ایک بیڑۂ جہازات تھیوڈوشیس نامی ایک بطریق کے زیرِ حکم بھجوایا، جو روز بروز سسلی کے قریب آتا جاتا تھا -

اب ضرورت عربوں کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیئے مجبور کر رہی تھی - سب نے ملکر محمد بن ابی الجواری نامی ایک افسر کو اپنا کمانیر مقرر کیا اور فیصلہ ہو گیا کہ جسقدر جلد ہو سکے سسلی کو چھوڑ دیں - جہازوں کی درستی کر لی گئی اور بیڑہ نے بسم اللہ کہکر لنگر اُٹھا دیا - مگر قسمت پکار کر کہہ رہی تھی کہ مجھسے بچکر کدھر جاؤ گے - آبنائے کے پاس پہونچکر معلوم ہوا کہ رومی بیڑہ راستہ روکے کھڑا ہوا ہے - مجبور ہو کر وطن کی یاد بالکل اپنے دلوں سے بھُلا دی اور یہ ٹھان لی کہ جب جان دینی ہے تو بہادری کے ساتھ کیوں نہ جان دیں - یہہ سوچکر واپس چلے آئے - ساحل پر اُترکر جہازوں کو جلا دیا، جنکی خاک اب سمندر میں بکھری ہوا

نظر آتی تھی۔ وہ ساحل سے حصن بیناو پر بڑھ آئے جس پر آسانی کے ساتھ قبضہ ہوگیا اور یہاں بیٹھکر رومیوں کی مدافعت کی تدبیریں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کا مقصد اسوقت صرف اپنی حفاظت تھی۔

عربوں اور رومیوں کے محاربات

تھیوڈوشیس نے وہی طریقہ اختیار کیا جو عربوں نے کیا تھا اسنے فوراً حملہ کردیا مگر فی الحقیقت اسنے غلطی کی مسلمانوں کے مقابل بلاطہ جیسا نامرد تھا اور یہاں تھیوڈوشیس کے کے مقابل عرب جیسے جری و بہادر لوگ تھے۔ عربوں نے رومیوں کے دانت کھٹے کردیئے۔ (۹۰) افریقیت رہے، بے انتہا فوج مقتول ہوئی۔ مگر محاربہ کا اسی پر خاتمہ نہیں ہوگیا بلکہ دو سال تک لڑائی کی آگ عربوں اور رومیوں میں اپنا خوفناک شرر دکھلاتی رہی اور ان میں کبھی رومیوں کا پلہ گراں ہوجاتا اور کبھی عرب بازی لے جاتے تھے۔

رومیوں کی کامیابی کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ ان کی فوج (جسمیں زیادہ تر ارمنی باشندے شریک تھے) عربوں کی فوج سے تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ دوسرے یہ بات تھی کہ عربوں کو مختلف سمتوں میں اپنی توجہ مبذول رکھنی پڑتی تھی جس سے اُن کی قوت میں بہت کچھ ضعف آیا انہی محاربات کے ضمن میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے آئندہ چلکر مسلمانوں کے لیئے راہ صاف ہوگئی۔

اوفیموس کا مارا جانا

اوفیموس کی سازشانہ کارروائیوں کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ جب اسنے دیکھا کہ رومی فوج آرہی ہے تو پھر عربوں سے آملا اور عربوں کو بھی وقت کی ضرورتوں سے مجبور ہوکر بادلِ ناخواستہ اس کی امداد قبول کرنی پڑی۔ اور یہی پہلا اور آخری مرتبہ تھا کہ وہ عربوں کی حمایت میں سرگرم نظر آیا۔ مگر اس کی خود غرضانہ اور دورُخی چالیں ایسی تھیں کہ ہر کوئی اس سے نالاں تھا۔ آخر کار باشندگانِ قصریانہ نے اس سازش سے جس میں اُسنے اپنی ساری عمر گذاری تھی، الحسن جان لے ڈالی۔

بات یوں ہوئی کہ عرب قصریانہ پر بڑھے۔ اوفیموس بھی اُن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا ہوا جارہا تھا۔ باشندگانِ قصریانہ نے اوفیموس کا نہایت تپاک کے ساتھ استقبال کیا اور اُس سے معاہدہ کرلیا کہ ہم تمکو اپنا فرمانروا تسلیم کرتے ہیں یہ چونکہ تم اُسی وقت سسلی کے بالاستقلال حاکم بن سکتے ہو جبکہ کوئی تمہارا حریف باقی نہ رہے لہذا پہلے ہم اور تم اور عرب تینوں کو متفق ہوکر رومیوں کو شکست دینی چاہیئے اسکے بعد شکستہ دل عربوں کا بھگا دینا کتنی بڑی بات ہے،،۔ اوفیموس کو قابو میں لے آنے کے بعد انہوں نے عاجزانہ لہجے میں اُس سے درخواست کی کہ ایک دن کی ہمکو مہلت ملے تاکہ ہم سامانِ صلح کی تیاری کرسکیں دوسرے دن چند اعیانِ قصریانہ ہتیار چھپائے ہوئے اوفیموس کے پاس آئے اور اس سے چاپلوسی کی خوشامدانہ تقریر شروع کی اور استدعا کی کہ شہر میں تشریف لے چلیئے۔ وہ دھوکے میں آیا ہوا اوفیموس خوشی سے ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ جب اوفیموس اپنے لشکر سے جدا ہوکر شہر کے قریب پہونچگیا، تو انہوں نے فوراً اپنے ہتیار کھینچ لیئے اور اوفیموس کو سسلی کی حکومت کا طرا دل ہی دل میں لیتے ہوئے نامراد دنیا سے رخصت کردیا۔

دو سال تک عربوں اور رومیوں کی لڑائیاں برابر جاری رہیں۔ محمد بن ابی الجواری نے عربوں کی حالت کو بگڑنے نہ دیا اور جہانتک ہوسکا اُن کی ساکھ قائم رکھی مگر جب اتفاق سے محمد بن ابی الجواری کا انتقال ہوگیا تو پھر عربوں کی حالت بہت ہی تباہ ہوگئی۔ دن بدن سامانِ رسد میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ دو کثیر مقدار لشکر میں کو سسلی کے تباہ اور افتادہ کشت زاروں سے رسد ملنی ایک نہایت مشکل امر تھا۔ آخر یہ نوبت

پہونچ گئی کہ فوج کے مویشی ذبح ہونے لگے۔ عرب اگر کسی قریہ میں رسد تلاش کرنے جاتے تو رومی انکا مقابلہ کرتے۔ غرضکہ اب مسلمان بالکل محصور ہوگئے۔ اور قریب تھا کہ یہ آوارہ وطن جماعت سسلی کی سرزمین میں وطن کی گرم زمین اور احباب کی گرم جوشیوں کو یاد کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوجائے کہ یکایک قسمت (یا بالفاظ دیگر متوقعہ اور مستحصلہ نتائج کا تبایُن) عربوں کے سامنے ہنستی ہوئی نمودار ہوئی اور ایک خوشنما چمکتا ہوا جہازوں کا بیڑہ اُن کو دکھلائی دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قدرت نے عربوں کے سامنے اپنے سارے بیش بہا خزانے کھول دیے تھے۔ اور ہر طرف اُن ہی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جس طرح بغداد خلیفہ مامون کی بدولت علوم کی پُرنور کرنوں سے فیضیاب ہو رہا تھا اور جسطرح زیادۃ اللہ کی سرگرم کوششوں کی بدولت افریقیہ کی اُجاڑ ریتلی زمین میں تمدن کا نازک پودا بارور ہونے لگا تھا اسی طرح سرزمین اسپین یا اندلس میں بھی عبدالرحمٰن ثانی کے زیر سایہ عربوں کا جاہ و جلال روز افزوں ترقی پر تھا۔ یہاں ہمکو اُن کی تاریخ بیان کرنی مدنظر نہیں ہے۔ سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اسقدر بیان کردیتے ہیں کہ شاہان اندلس نے بھی ایک زبردست بیڑہ جہازات مرتب کرلیا تھا اور ان کے جہاز ہمیشہ بحر ابیض کو پیماتے رہتے تھے[1] یہی بیڑہ تھا، جو سسلی کے مسلمانوں کو نظر آیا۔ یہ بیڑہ موسمی دورہ لگاتا ہوا سسلی کیطرف آنکلا جب اس بیڑے کے آنے کی خبر مسلمانوں کو ملی، جو بالکل محصور ہوگئے تھے تو انھوں نے امداد کی درخواست کی۔

اندلس کے جہازات اُس زمانے کے مشہور امیر البحر اصبغ بن الوکیل المعروف بہ فرغلوش کے زیر حکم تھے جسنے ان کی درخواست منظور کی مگر اس شرط کے ساتھہ کہ اُن کو بھی اسکے زیر حکم رہنا پڑیگا۔ افریقیہ والوں نے جنکے دو جنرل باری باری سے کام آچکے تھے۔ اور کسی مدبر کے نہونے کی وجہ سے ہی ان پر یہ ساری مصیبتیں ٹوٹ پڑی تھیں نہایت خوشی کے ساتھہ فرغلوش کو اپنا امیر تسلیم کرلیا۔ جسکے بعد فوراً یہ عظیم الشان فوج ساحل پر اُتر آئی۔ خوش قسمتی دیکھیے کہ اسی وقت زیادۃ اللہ کے بھیجے ہوئے جہاز بھی آپہونچے جو سب ملاکر قریب تین سو (۳۰۰) جہازوں کے ہوگئے۔

رومیوں کی پوری شکست

اب رومیوں کا بھگا دینا کتنی بڑی بات تھی۔ رومی جس طرح اُن سے بن سکا اس خطرناک مقابلہ سے بھاگ رہے تھے اور گویا فرغلوش کے لیے خود بخود جگہ خالی کرتے جاتے تھے۔ غرضکہ تھوڑی ہی مدت میں میدان صاف ہوگیا اور مسلمان محصورین آزادی کیساتھہ پھرتے ہوئے نظر آئے۔ مگر اب پھر وہی پہلی قباحت پیش آئی۔ وبا نے پھر اپنے منحوس قدم دکھلائے اور اس میں قاضی اسد کیطرح فرغلوش بھی کام آیا۔ اور کئی اندلسی افسروں کا یہی حال ہوا جس سے گھبراکر باقی ماندہ افسروں نے فوراً واپس چلے جانے کا قصد کرلیا۔ اور گو شکستہ حال رومی جیسا ان سے بن سکا ان افسروں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہے اور اسمیں ان کی فوج کا ایک حصہ بھی کام آیا مگر آخرکار یہ افسر اپنے جہازوں تک پہونچ گئے۔ اور انہوں نے بلاتامل اندلس کا قصد کردیا۔

اب قدرتی طور پر بنی الاغلب کے لیے راستہ صاف ہوگیا اور آیندہ کے لیے کوئی حریف باقی نہ رہا جبکا کھٹکا ہوسکے۔ اوفیمیوس اور بلاطہ دنیا سے ناکام و نامراد

[1] بنی امیہ اندلس کی بحری طاقت بہی نہایت زبردست تھی۔ عبدالرحمٰن ناصر کے زمانے میں جو تمام خلفاء اندلس کا سرتاج تھا، اندلس کے بیڑہ جہازات میں دو سو سے زیادہ جہاز موجود تھے۔ ان جہازوں نے تمام بحر ابیض کے جزیروں اور ساحلوں کو چھان ڈالا تھا۔ چنانچہ موسیو سیدیو لکھتے ہیں دونارمنوں کا پیچھا کرتے ہوئے عربوں کے جو جہاز آتے جاتے رہتے تھے ان میں سے ایک جہاز مغربی فرانس کے دریائے لوار کے دہانہ میں بھی جاگھسا تھا۔ جیسا کہ قدیم انگریزی زبان کی تاریخوں میں مندرج ہے ۱۲

گذر چکے تھے۔ اندلس والے جن سے خوف تھا، اپنے نامور اسیر البحر کو کھو کر جدھر سے آئے تھے چلے گئے تھے رومی فوج تھی، تو وہ خود اپنی خستہ حالی سے پریشان تھی اب اس ابتدائی محاربے کا خاتمہ ہوا جس کی بدولت سسلی آیندہ چلکر اغلبی سلطنت کے زیر فرمان بنا۔ مسلمانوں نے کئی بیڑہ جہازات اور کثیر التعداد نامی افسروں اور قاضی اسد اور فرغلوش جیسے بیش بہا جانوں کے معاوضے میں یہ ملک حاصل کیا، جسکی نسبت یورپین مورخ یوں اگلتے ہیں "چونکہ جس زمانہ میں کہ مسلمانوں نے فتوحات حاصل کیں، یہ ملک خود ضعیف ہو رہے تھے لہذا اُن پر فتح پانا چنداں قابل تعریف ہو نہیں سکتا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں نہایت سستے داموں یہ فتوحات حاصل ہوئیں"، مگر افسوس ہے کہ یہ آزاد خیال مورخ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر غریب مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے۔ دنیا میں جتنی فاتح اقوام گذری ہیں اور جنمیں سے بعض کا اب تک یورپ راگ گاتا ہے ان میں سے کوئی بھی چنداں قابل تعریف ثابت نہیں ہو سکیگی۔ اور خود یورپ جو آج بڑی ہی ڈونگی لیتا ہے اسکو سارے عظیم الشان فخر بادِ ہوا نظر آئینگے۔

یورپین مورخ اپنی عنایت یہیں تک محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ واقعات کو بھی اور ہی رنگ میں بیان کرتے ہیں اور بے بنیاد غلط روایتوں کے یورپ میں شائع رہنے کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ موسیو سیدلو جیسا آزاد خیال مصنف بھی ان روایات کے اثر سے نہ بچ سکا چنانچہ اُسنے ان الفاظ میں اس محاربہ کو ذکر کیا ہے

> اوفیمیوس اور زیادۃ اللہ دونوں نے ملکر لڑائی کی۔ کھلے میدانوں میں تو وہ دشمن پر فتحیاب ہوئے مگر شہروں کے فتح کرنے سے اور علی الخصوص پلرمو۔ سرقوسہ۔ قصریانہ سے وہ عاجز رہے۔ اس اثنا میں قاضی اسد کا انتقال ہو گیا اور ان کی فوج نے اوفیمیوس کے اشارے سے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا یونانی جہاز ان کے سامنے ان کا راستہ روکے ہوئے پڑے تھے، لہذا مجبوراً وہ واپس آئے اور قسم کھائی کہ سسلی فتح کئے بغیر نہ چھوڑینگے چند دنوں کے بعد اوفیمیوس بھی مرگیا، جسکی وجہ سے عربوں کی حالت بہت ہی تباہ ہو گئی، اور وہ قریب ہلاکت پہونچ گئے۔ تاآنکہ محمد بن اغلب افریقیہ سے آیا اور ان کی اعانت کی۔"

ناظرین ہمارے مضمونِ بالا کو پڑھ لینے کے بعد اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اوفیمیوس کی تائید و اعانت سے فتح حاصل ہونا کہاں تک درست ہے۔ اور آیا اوفیمیوس نے فائدہ پہونچایا یا نقصان؟ بیشک مسلمان سرقوسہ پر قبضہ نہ کر سکے مگر کیوں؟ اسلیئے نہیں کہ وہ کمزور تھے بلکہ اسلیئے کہ وہ دغابازی سے کام کرنا بُرا سمجھتے تھے اور گو اُن کے ساتھ دغابازی کی جاتی مگر وہ اپنے عربی شریفانہ اصولِ تہذیب پر قائم رہنا چاہتے تھے۔

بیانِ بالا کا خلاصہ جو کچھ ہم نے اس نمبر میں بیان کر دیا ہے اس کا خلاصہ اس طرح پر ہو سکتا ہے۔

زمانۂ محاربہ میں عربوں نے نہایت اعلیٰ درجے کی شجاعت کے ساتھ اصولِ اخلاق کا بھی پرلے درجے کا خیال رکھا۔ یونانی۔ قرطاجنی۔ رومی فاتحین کی حالت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور ایسے وقت میں جبکہ آجکل کے روشن زمانہ میں بھی مارشل لا کے نام سے بالکل تہذیب و انسانیت کی مخالف کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے، عربوں نے شائستگی اور تہذیب کے قواعد پوری طرح ملحوظ رکھے۔ ان کے مخالفین ان سے دغابازی کے ساتھ داؤ پیچ کرتے تھے مگر عرب باوجود ان تمام نقصانات کے اپنے اُسی پہلے طریقے پر قائم رہے اور آخر تک اُسکو نباہا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہمارے اُس قول کی تصدیق ہوتی ہے، جسکو ہم اپنے پہلے نمبر میں بیان کر آئے ہیں کہ "عرب حملہ آوروں اور دیگر اقوام گذشتہ کے حملہ آوروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔　(محمد مرتضیٰ)

ضمیمہ

حیاتِ جاوید (یعنی سرسید کی لائف)

ہم نے سرسید مرحوم کی لائف میں جہاں اُنکی مذہبی خدمات کا ذکر کیا ہی، وہاں اُنکی تفسیر کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں مگر سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت، جو تفسیر کی جان ہی اور جس سے مراد قرآن اور حقائق موجودات میں مطابقت ثابت کرنا ہی، اُسپر لائف میں اسلیے بحث نہیں کیگئی کہ وہ بحث بہت طولانی تھی جسکی ایک بایوگرفی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اور نیز عام ناظرین کو اُس سے چنداں دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن ہمارا ارادہ ہی کہ تفسیر مذکور کی اس خصوصیت پر جو کچھ ہمنے لکھا ہی، یا آیندہ لکھیں اُسکو بدفعات رسالۂ معارف کے نمبروں میں شائع کردیں۔ بالفعل ہم ذیل کے عنوان پر پہلا مضمون شائع کرتے ہیں

نمبر (۱)

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہی، یا نہیں؟

سرسید کی تفسیر جسمیں بیسیوں آیتوں کے معنی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ اُس کی نسبت پہلا شبہہ، جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہی، یہ ہی کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے، جو گذشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید پر لکھی گئی ہیں۔ اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا ہی جسکو علمای سلف نے طے نہ کیا ہو؟ اور اگر رسول خدا صلعم نے جن کی

قرآن کا علم کسی اُمتی کو نہیں ہوسکتا۔ جن آیتوں کے معنی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبان مبارک سے اُنکا مطلب ارشاد فرمایا۔ پھر آپ کے بعد صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور علمای اُمّت نے، جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے، قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کردیا۔ پس زمانۂ حال میں مفسر کے لیے اسکے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ اُنھیں تفسیروں کا ماحصل، جو علمای سلف لکھ گئے ہیں۔ زیادہ شرح وبسط، یا زیادہ اختصار، یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھہ بیان کردے، یا ایک زبان سے دوسری زبان میں اُنکا ترجمہ کردے۔ یہ منصب اب کسیکا نہیں ہی کہ ایک آیت کے معنی بھی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کیے ہوں۔ چنانچہ اسی شبہہ کی بنا پر بعض کم ظرفیوں کو کہتے سُنا ہی کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہی وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمای اُمّت کو۔ اس مضمون میں ہمکو اسی شبہہ کا حل کرنا مقصود ہی۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے، چند باتیں ذہن نشین کرلینی ضرور ہیں۔

ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اُنسے کیا مراد ہی؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہی۔ محکمات وہ آیتیں ہیں جنمیں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہو، اور متشابہات وہ ہیں جنمیں متعدد معنوں کا احتمال ہو۔ مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہوں۔ اس سے ظاہر ہی کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جنمیں معانی متعددہ کا احتمال ہوسکتا ہی وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے اسکی کئی وجہیں بیان کی ہیں، مگر سب سے عمدہ وجہ، جسکو اُنھوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہی، یہ ہی کہ وہ قرآن ایک

ایسی کتاب ہی جسمیں خواص اور عوام سب کو حق کی طرف بُلایا گیا ہی، اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں، مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے، جو نہ جسیم ہو، نہ کسی مکان میں ہی، اور نہ اُس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہی، تو اُن کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہوسکتی ہی؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ اُن کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے، جو مِن وَجہٍ اُن کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں،، شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ البالغہ میں اسطرح بیان کیا ہی۔ کہ ،، شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق۔ جو دقائق علم و حکمت تک پہونچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی۔ اُن سے خطاب کیا ہی، اور اسی لیئے (اُن کی سمجھ کے موافق) فرمایا ،، اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ،، اسکے بعد لکھتے ہیں کہ ،، آنحضرتؐ نے ایک عورت حبشیہ سے پوچھا کہ خدا کہاں ہی؟ اُسنے آسمان کی طرف اشارہ کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ مومنہ ہی،، یعنی آنحضرت نے، باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے، اُسکے آسمان کیطرف اشارہ کرنے کو اُسکے ایمان کے لیئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ جہت اور مکان سے پاک ہی۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہی کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد، جو عموماً انسان کے فہم و ادراک سے اور خاصکر عرب کے اُمیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا۔ اُن کو مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہی تاکہ اُمی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اُس سے ہدایت حاصل کریں۔ عہدِ عتیق کی کتابیں، جنکو مسلمان اور یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں۔ چونکہ وہ اُس زمانے میں الہام کیگئی تھیں جب کہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اِس لیئے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز و استعارہ پر رکھی گئی ہی، تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہوئے ہیں، جیسے خدا کا طوفانِ نوح پر اسقدر رونا کہ اُسکی آنکھیں آشوب کر آئیں، یا دوسرے موقع پر اُسکا ایسا ہنسنا کہ کچلیاں نظر آنے لگیں، یا سرکشوں کا اُسکو کھجا کر غصّہ دلانا اور اُسکی ناک میں دھوئیں کا سا اثر کرنا، اُسکی سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا، شہر اسور کا اُس کی آواز سے تباہ ہونا اور اُسکا اسور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ۔ ایک جگہ کتاب یرمیاہ میں یروسلم کی تباہی پر خدا تعالیٰ اپنا غصّہ اسطرح ظاہر کرتا ہی،، اے میری انتڑیو! اے میری انتڑیو! میرے دل کے پردے میں درد ہی، میرے دل کی ایسی گھبراہٹ ہی کہ میں چُپ نہیں رہ سکتا۔ اے میری جان! تو نے تُرہی کی آواز اور لڑائی کی للکار سُنی، شکست پر شکست کی خبر ہوئی، یقیناً تمام سرزمین برباد ہوگئی، میرے خیمے اچانک اور میرے پردے ایکدم میں غارت کیئے گئے، کب تک میں یہ جھنڈا دیکھا کروں اور تُرہی کی آواز سُنا کروں،، زبور میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤد کے مقرب اور محبوب ہونیکو اسطرح بیان کرتا ہی ،، میں نے تجھے جنا ہی، میں آجکے دن تیرا باپ ہوا،، دوسری جگہ زبور ہی میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اسطرح ہی ،، آخر خداوند خواب سے بیدار ہوا اور اُس پہلوان کی طرح جو شراب پیکر عربدہ کرے، اپنے دشمنوں کی پچھاڑی ماری ،، غرضکہ تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اسی قسم کی متشابہات سے مالامال ہیں جنمیں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرائے میں کی گئی ہی۔ اسیلیئے شاہ ولی اللہ صاحب انبیا کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں ،، ومن سیرتھم ان لایکلموا الناس الا علی قدر عقولھم التی خلقوا علیھا و علومھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ ،،

تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضرور ہی کہ متشابہات

کی تاویل جسکی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہی "وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ" اس سے کیا مراد ہی؟ ظاہر ہی کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً، یا تفصیلاً کسیطرح پر انسان کو نہیں دیا گیا۔ ورنہ مسلمانوں کا یہ دعوی غلط ہوجائیگا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہی جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کی متعلق لکھتے ہیں "ویبعد ان یخاطب الله عباده بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفته، وقد اتفق اصحابنا وغیرهم من المحققین علی انه یستحیل ان یتکلم الله تعالی بما لا یفید" (یعنی بعید از عقل ہی کہ اللہ جلشانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جسکے سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لیے نہو، اور ہمارے علمائے مذہب اور ان کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالی کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہو محال ہی)۔ غرضکہ آیۂ مذکور کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاصکر مبدا و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں، اور جنکا بیان آیات متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہی، اور جنپر ایمان لانے کو "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہی۔ اُن کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور اسلیئے انسان جن الفاظ و عبارات سے اُن حقائق کو تعبیر کریگا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنی مقصود سے قاصر ہوگی۔ طیبی شرح مشکوۃ میں لکھا ہی کہ "وہ جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہی وہ صفات باری تعالی، یا قیامت کے حالات کا بیان ہی جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہوسکتا اور نہ لوگوں کو اُسکا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہی"۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے مثلاً سورۂ کُوِّرَتْ میں ہول قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہی "وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ" (یعنی جب کہ عنقریب بیانے والی اونٹنیاں چھٹی پھرینگی اور انکی کوئی خبر نہ لیگا) بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہی اُس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہی اور اُس کی قدرت سے باہر ہی کہ اُس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کرسکے۔ لیکن یہ سمجھنا اُس کی طاقت سے باہر نہیں ہی کہ یہ بیان اُس کیفیت کی ایک تمثیل ہی اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جسکی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی، اُسکو ہول قیامت کا تصور دلانے کے لیئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتا، کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیانے کے قریب ہو اُسوقت مالک اُسکی نگرانی سے غافل ہوجائے پس اُنھوں نے اُسوقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جب کہ ایسی اونٹنیوں کی خبرگیری کا ہوش باقی نہ رہیگا۔

لیکن یہاں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہی کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالی کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنیکو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اُس سے کیسلئے مواخذہ کیا جاتا تھا؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینۂ منورہ سے جلاوطن کرکے بصرہ

8 قال الطیبی فی شرح المشکوۃ "المتشابه الذی یجب رده هو صفات الله تعالی التی لا کیفیة لها والاوصاف القیمة التی لا سبیل الی ادراکها بالقیاس والاستنباط ولا سبیل الی استحضارها فی النفوس"

کو سمجھا دیا۔ اور جب امام مالکؒ سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو اُنھوں نے اِسکے سوا کچھ جواب نہیں دیا کہ "استوا کے معنی معلوم ہیں اور اُس کی کیفیت مجہول ہی اور اُسپر ایمان لانا واجب ہی اور اُس سے سوال کرنا بدعت ہی"۔

سو اِس شبہہ کا جواب یہ ہی کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اُسوقت اہل کتاب تحریف کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اسطرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا اُنپر تحریف کا الزام لگایا گیا ہی اور بہت سی حدیثیں اِس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہی کہ بلاشبہہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہی کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہل کتاب اُسکی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنیکی اجازت تھی اور دونوں اصول دین میں عموماً باہم مشابہت رکھتے تھے اسلیئے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا، لہٰذا اُن میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسداد تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیات متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہدیا گیا کہ "فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ"، اور آنحضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ "مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"، اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا "مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"۔

اسی بنا پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل بری تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اُس سے حذر کرتے تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں، اُن کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے تھے اور اُن کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نکرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کے اصلی معنوں کی، جو خدا نے مراد رکھے ہیں، تصدیق کرتے ہیں اور اُنکا علم خدا پر چھوڑتے ہیں، کیونکہ اُن کے سمجھنے کی ہمکو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً یَدٌ یا وَجْہ یا اِسْتَوٰی کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو اُنھیں الفاظ کو بعینہ ترجمے میں لکھدیتے تھے، حالانکہ عربی زبان جسمیں شاعری نزول قرآن کیوقت حد کمال کو پہونچ چکی تھی۔ استعارہ وکنایہ اور اقسام مجاز سے مالامال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، باوجود اسکے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہونے پائے۔ تاویل متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہانتک ممکن ہوتا تھا، متشابہات قرآن کے الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر مقصور رکھتے تھے۔ اور بغیر سخت ضرورت کے اُن کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کی تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اُس کی مؤید نہو۔ عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اسکی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہو، بیان کرنے جائز نہیں

ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہو کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ "اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل"، نعوذ باللہ بیکار ٹھیرتا ہے باوجود اسکے سلف صالح جہانتک ہوسکتا تھا بغیر روایت کے سُنے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرأے کی ممانعت فرمائی ہی۔ وہ مصلحت فوت نہو اور تحریف کا رستہ مسدود رہی لیکن یہ مصلحت اُسی وقت تک ملحوظ رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب اُن کے اصلی معنی بیان کرنے سے علمانے سکوت کیا اور اُنکو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا، تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفے کا رواج زیادہ ہوتا گیا اُسیقدر آیات متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون وچرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمای اسلام کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض ازراہ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اُسکو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز و استعارہ کی طور پر اطلاق کیے گئے ہیں بقدر ضرورت اُن کے اصلی معنی صاف صاف بیان کیے جائیں چنانچہ سب سے پہلے علماے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی اور آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلّم ٹھیر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہیئں جن سے وہ تعارض رفع ہوجائے یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اُسکو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔ یہ اصول علم کلام کی عام کتابوں میں مثل مقاصد، مواقف، تفسیر کبیر، دُرر غُرر شریف مرتضیٰ، تہافت الفلاسفہ غزالی، فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہی اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ "حمیدیہ"، حکمای زمانۂ حال کے مقابلہ میں لکھی ہی، اُس میں بھی اس اُصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہل اسلام قرار دیا ہی۔ بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو، جو معجزات حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ ہدایت کی ہی کہ [8] "علیھم ان یقتنعوا بما تقبلہ عقولھم، ثم ما لم تقبلہ ویرفضہ البرھان العقلی القاطع یرجعون فیہ الی التاویل الجامع بین النقل والعقل"، (یعنی اُن کو چاہیئے کہ جس بات کو اُن کی عقل قبول کرے اُسپر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اُس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہوجائے)

اگرچہ ابو الحسن اشعری۔ جو فرقۂ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں۔ متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر اُن کی یہ ممانعت صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے مخصوص معلوم ہوتی ہی جن کے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے پاک ہیں؛ کیونکہ ضرورت کیوقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہی۔ امام غزالی۔ جو خود بھی اشعری المذہب ہیں، رسالۂ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ"، میں لکھتے ہیں کہ "اہل اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں، جو تاویل کا محتاج نہوا ہو؛ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبل ہیں

8 حمیدیہ صفحہ ۳۸۔

باوجود اسکے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں"

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے انکے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" آیا ہے۔ اُس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم، جو آسمان و زمین پر محیط ہے۔ سمجھا جاتا تھا، بعضے اُسیکو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جُدا جُدا جسم سمجھتے تھے، بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے، یہانتک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علما کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مُہرِ سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کیے جائیں۔ چنانچہ امام رازی نے علماے شافعیہ میں سے قفّال کا یہ قول آیۂ مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھہ خطاب کیا ہے، جنکو وہ امرا و سلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اُسنے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے جسکے گرد وہ بادشاہوں کے محلوں کی طرح طواف کرتے ہیں، اور اُس کی زیارت کا حکم دیا جسطرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، اور حجر اسود کو اپنا دایاں ہاتہہ قرار دیا اور اُسپر بوسہ دینے کا حکم کیا جسطرح کہ وہ سلاطین کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہیں، اسیطرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیا اور شہدا کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور اسیطرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى"، پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ "وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ"، پھر فرمایا "وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ"، اور فرمایا "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ"، اور کہا "اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ"، پھر اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا کہ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"، اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں "اذا عرفت هذا فنقول كل ما جاء من الالفاظ الموهمة للتشبيه في العرش والكرسي فقد ورد مثلها بل اقوى منها في الكعبة والطواف وتقبيل الحجر ولما توافقنا ههنا على ان المقصود تعريف عظمة الله وكبريائه مع القطع بانه منزه عن ان يكون في الكعبة فكذا الكلام في العرش والكرسي" (یعنی جب تم قفّال کا قول سُن چکے اب میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ موہم تشبیہ عرش و کرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ موہم تشبیہ کعبہ اور طواف اور بوسۂ حجر اسود کے متعلق آئے ہیں، پس جب ہم نے یہاں اتفاق کرلیا ہے کہ ان الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریا کا تصور دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبے میں ہونے سے پاک ہے، تو ایسا ہی ہمکو عرش و کرسی کی نسبت سمجھنا چاہیے)

لیکن چونکہ اُس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اسلیئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہوسکتے ہیں اُس زمانے میں اُنکا خطرہ بھی کسیکو دل میں نہیں گذرتا تھا، اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں اُن کی تاویل کرنے کی ضرورت علماے سلف کو محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً جب تک

یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسہ نے راہ نہیں پائی لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض[8] علما۔ جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفہ کا رواج نہیں ہوا، زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم و حکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائلِ قاطعہ سے زمین کی کُرویت ثابت ہوگئی تو علماے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فَرَشْنٰهَا اور دَحٰهَا اور طَحٰهَا اطلاق کیے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اسوقت تک زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہونچا تھا اسلیے قرآن کے بعض الفاظ جو بظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں اُن کی کچھ تاویل نہیں کیگئی۔ یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہی جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی، لوگ اُن آیتوں کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سَمَاء سے جو قرآن میں جابجا وارد ہوا تھا مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چونکہ اُسوقت تک یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان در حقیقت کوئی جسم محیط عالم مثل گول گنبد کے۔ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہی نہیں ہی بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضاے بحت میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جسکا نام جاذبیّہ یعنی کشش ہی اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اسلیے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود یا مجسّم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے اُن کی کچھ تاویل نہیں کیگئی۔

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں حقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسیکو محسوس نہیں ہوئی اسلیے اُن کی تاویل کرنیکا کسیکو خیال نہیں آیا۔ اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری، جو تاویل متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اسلیے اُسکو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریبًا تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گیا۔ اور معتزلہ، جنھوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویل متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور اُسکو عند الضّرورت واجب سمجھتے تھے۔ جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اُسی قدر وہ اور اُنکا مذہب اور اُن کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبرًا اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا یہانتک کہ وہ رفتہ رفتہ دُنیا سے معدوم ہوگئے۔ یہی وجہ ہی کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیر [illegible]

8 شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہی کہ وہ دین اسلام میں امریکا کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی کُرویّت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہی، جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہی، شیخ اُنکی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اسبات پر مجبور کیا ہی کہ ایک محسوس چیز کا انکار کریں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں ۱۲

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہی یا نہیں؟

بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جسقدر تاویلات اِن تفسیروں میں منقول ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں، جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں، صرف اُن کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ قفال۔ جنکا قول لفظ کُرسیؔ کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہی۔ وہ بھی معتزلہ میں شمار کیے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے۔ جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہی ایک قول یہ بھی منقول ہی کہ عند الضرورت تاویل کرنی جائز ہی اور اسی بنا پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے، جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو۔ تاویل کو جائز سمجھتے ہیں، لیکن جہانتک دیکھا جاتا ہی وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں "من اصول الدین ترك الخوض بالعقل فی المتشابهات من الكتاب والسنة" اسکے بعد فرماتے ہیں "ومن ذلك (ای من المتشابهات) امور كثيرة لا يدرى أاريد حقيقة الكلام او اقرب مجاز اليها، وذلك فيما لم يجمع عليه الامة ولم ترتفع فيه الشبهة" (یعنی قرآن اور حدیث میں ازقبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں، جن کی نسبت نہیں معلوم کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں، یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں، اور یہ تردد اُن بیانات میں ہی جنکی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا) شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُن کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہی اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں نہایت مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اسبات کا فیصلہ نہیں کیا کہ اُن مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو محتمل ہیں اُن سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں، یا مجازی۔

قطع نظر اِس محققانہ کلام کے، جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہی، تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے، جو ہم پہلے دے چکے ہیں، صاف پایا جاتا ہی کہ خدا کا کلام، جو کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہی اُسکی طرز بیان ایسی ہونی چاہیے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اُس سے ہدایت پا سکیں، جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اُسکی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اُسوقت بھی اُسکی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو، جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہونچنے کے وقت حاصل ہو، ورنہ اُسکی نسبت یہ کہنا صحیح نہو گا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہی۔ اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہی کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہی کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائینگے اُسیقدر کلامِ الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہونگے۔

علامہ[8] ابن الحاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں "قال عليه الصلوة والسلام فی القرآن۔ "لا تنقضی عجائبه ولا يخلق على كثرة الرد"، فعجائب القرآن لا تنقضی الى يوم القيمة، فكل قرن لا بد له ان يأخذ منه فوائد جمة خصه الله تعالى بها وضمها اليه لتكون بركة هذه الامة مستمرة الى قيام الساعة" (یعنی آنحضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہی کہ وہ اُسکے عجائب۔ یعنی دقائق و اسرار جو اُس میں مضمر ہیں، ختم نہونگے اور وہ باوجود بار بار دوہرانے

8 از رسالہ حمیدیہ ۱۲

کے پرانا نہوگا،، پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اسلیئے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیئے کہ اُس سے فوائد کثیرہ، جو اُن کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تاکہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔ اسکے بعد علامۂ موصوف لکھتے ہیں ،، وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام،، مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام آخرہ،، یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالی وتبئین الاحکام،، (یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ۔ ،، میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جسکا نہیں معلوم کہ اول بہتر ہے یا آخر،، یعنی برکت اور خیر میں اور لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں،،

دونوں مذکورۂ بالا حدیثوں سے، جو علامۂ ابن اسحاج نے نقل کی ہیں، صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہینگے اور جسطرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق و اسرار خلقت پر ظاہر ہوئے ہیں اسیطرح اُسکے اخیر قرنوں میں بہت سے نئے دقائق و اسرار دنیا پر منکشف ہونگے۔

امام حجۃ الاسلام غزالی بھی اسی باب میں لکھتے ہیں کہ ،، وکم من معان دقیقۃ من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر یخلو عنہا کتب التفاسیر ولا یطلع علیہا افاضل المفسرین،،۔ (یعنی قرآن کے بہت سے ایسے دقائق و اسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو اُن کی خبر نہیں ہوتی۔ اُن لوگوں کے دل پر وارد ہوتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں)۔

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا، کہ باوجود بیشمار تفسیروں کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا، بہت سے مقامات اُسمیں اب بھی ایسے موجود ہیں، جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق و اسرار ایسے باقی ہیں، جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہاں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں، یا مجازی معنوں میں؛ آیا عند الضرورۃ اجماع امت کے خلاف اُن مقامات میں خوض کرنا اور اُن متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے، یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے، یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کیجائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ہے، اُن کے معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام سے اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ ،، الضرورات تبیح المحظورات،، (یعنی ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز کر دیتی ہیں) ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، چونکہ اُنکو اُس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی، انھوں نے کہا ،، میں مکروہ جانتا ہوں اسبات کو کہ تیرے لیے حلال کر دوں جسکو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جسکو خدا نے حلال کیا ہے۔ ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ ،، قرآن اور حدیث کے بغیر کبھی فتویٰ نہ دینا، اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کریگا۔ اسیطرح ابو سلمہؓ جب بصرہ میں آئے، تو انھوں نے حسن بصریؒ سے کہا ،، میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتوے دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن اور حدیث کے فتوے

نہ دینا،، شعبی سے کسی نے پوچھا کہ جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا "جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا، تو وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو۔ اور دوسرا تیسرے کی طرف وَھَلُمَّ جَرًّا۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی،، (یعنی جب کسیکو اُس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو سب جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے) مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا، کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھکر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ "اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُمْ،، مگر جب ضرورت داعی ہوئی علما کو چار ناچار اُسپر بحث کرنی پڑی، بنی امیّہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لیے سخت خونریزیاں ہونے لگیں، اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ کیوں مسلمان قتل کیے جاتے ہیں تو اُن کو یہ جواب ملا کہ "القدر خیرہ و شرہ من اللہ،، آخر علما کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

پھر چوتھی صدی ہجری تک اسلام میں تقلید شخصی کا بالکل وجود نہ تھا عوام کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا وہ جس عالم سے چاہتے تھے مسئلہ پوچھتے تھے اور خواص کو جب احادیث نبوی یا آثار صحابہ و تابعین میں کوئی بات اطمینان کے قابل نہ ملتی تھی تو جس فقیہ کے قول کو چاہتے تھے، اختیار کرتے تھے۔ خواہ اہل مدینہ سے ہو، یا اہل کوفہ سے۔ مگر اسکے بعد وقتاً فوقتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ رفتہ رفتہ تقلید شخصی قرین مصلحت سمجھی گئی۔ حالانکہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا کہ نہ وہ خود کسی خاص شخص کا ہر ایک بات میں اتباع کرتے تھے اور نہ اوروں کا ایسا کرنا پسند کرتے تھے مگر زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ ہر شخص ائمۂ اربعہ میں سے کسی امام کو تمام احکام میں اپنا مقتدا قرار دے ورنہ اسلام میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہونگے۔ اور جسکا جو جی چاہیگا سو کریگا۔ چنانچہ آج تک تمام ممالک اسلامیہ میں تقلید شخصی کی پابندی برابر چلی آتی ہے اور کوئی شخص علی الاعلان اس پابندی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

اسیطرح متشابہات کی تاویل ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جب تک شکوک و وسوسہ کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اُس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علما کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کیساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے، جو انبیاے بنی اسرائیل نازل ہوئے۔ چونکہ اُن میں کثرت سے آیات متشابہات وارد ہوئی تھیں اسلیے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ اُن کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جسقدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اُسیقدر اُن کے مجازی معنی، جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔ یہودی۔ جیسا کہ ملل و نحل شہرستانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ زمانۂ دراز تک متشابہات توریت کو جنکی چند مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ عموماً اُن کے حقیقی معنوں پر محمول

کرتے تھے مگر آخر کار علماے یہود میں سے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اُٹھنے شروع ہوے جنھوں نے اس بات کو ظاہر کیا کہ تمام آیات متشابہات مُاوّل ہیں- چنانچہ فرقہ یوذعانیہ اور موسکانیہ اور دونوں فرقوں کی بہت سی شاخیں جملہ متشابہاتِ توریت کی تاویل کرتی ہیں اور برخلاف عامۂ یہود کے ذاتِ باری کو اوصافِ بشری سے منزہ جانتی ہیں-

الغرض قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ ابتک ایسے موجود ہیں، جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی - اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اُن کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آپہنچا ہی تو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اُٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں، جنسے کوئی اعتراض، جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہی، رفع ہو جائے- تو بلا تامل وہی معنی اختیار کیے جائیں، اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں مگر سوال یہ ہی کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہی، جو محظورات کو مباح کردیتی ہی؟ سو اسکا جواب یہ ہی کہ جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں کوئی مخالف آواز نہیں پہنچی اُن کے نزدیک تو اسکے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اُسکو فوراً دائرۂ اسلام سے خارج کردیا جائے- اُن کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہی ؎

آفاتِ بحر سے ہیں، ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہی ناخدا جب

مگر جو لوگ اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جسقدر دُنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہی اُسیقدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں، اُن کو وہ ضرورت روزِ روشن کی طرح نظر آتی ہی- وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکماے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلفِ صالح کے برخلاف تاویل متشابہات پر مجبور کیا تھا، وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی ہی- اُس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاصکر علما و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا، جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لیئے حاصل کرتے تھے؛ مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگئی ہی؛ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو، یا اہل حرفہ ہو- مجبور ہی کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اسلیئے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہی- اسکے سوا اُس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اسلیئے جو شبہات اُن سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے اُن کے دفعیہ کے لیئے اکثر حالتوں میں صرف لَانُسَلِّمُ کہدینا کافی تھا؛ مگر اس زمانے میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقرا پر رکھی گئی ہی اور اسلیئے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہوسکتے ہیں وہ صرف لَانُسَلِّمُ کہدینے سے دفع نہیں ہوسکتے۔

غرضکہ گذشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہی- ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں، بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں، بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں- یہانتک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہی- اگرچہ ممکن ہی کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہوجائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہی

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہی یا نہیں؟

اسلیئے بہت ہی کم احتمال اسبات کا ہی کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے کو پہونچ گئے ہیں اُن میں آیندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جبتک کہ اُس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جاسے۔ ضرور ہی کہ یا تو قرآن کو حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اُسکے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہوں۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیات متشابہات پاتے ہیں کہ اگر اُن کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہمکو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفاتِ لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہی اور باوجود اسکے زمانۂ حال کے شبہات، جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں، بالکل رفع ہوجاتے ہیں اور اسلیئے کوئی وجہ نہیں ہی کہ اُن آیتوں کو صرف اس خیال سے، کہ جمہور مفسرین نے اُن کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصور رکھا ہی۔ ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ جو معنی قرآن کے اُنھوں نے لکھے ہیں، نہ وہ خدا کو سوجھے، نہ رسول کو۔ سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر اُن کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہی، یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہی کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کیئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے، یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اُس زمانے میں جب کہ قرآن نازل ہوا، مخاطبین پر ظاہر کرنا شارع کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا، ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق، جو علم و حکمت تک پہونچنے سے پہلے اسکی خلقت میں ودیعت تھی، خطاب کیا گیا ہی اور بہت سے حقائق مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیئے گئے ہیں تا کہ جبتک مخاطبین اپنی عقل طبیعی سے ترقی کرکے علم و حکمت کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچیں اُسوقت تک جو معنی اُن الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں اُنھیں پر قانع رہیں، مگر جوں جوں حقائق اشیا اُنپر منکشف ہوتے جائیں اُسیقدر اُن الفاظ کے معنی مقصود اُنپر کھلتے جائیں، پس جو معنی قرآن کے اب یا آیندہ ایسے بیان کیئے جائیں جو اصولِ عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہوں اور باوجود اس کے اُن کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہی بخوبی رفع ہوتا ہو اُن کی نسبت صرف اس بنا پر، کہ نزولِ قرآن کے وقت اُن کو شارع نے بیان نہیں کیا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ معنی نہ خدا کو سوجھے، نہ رسول کو، قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے مسئلہ جبر و قدر کی نسبت اس کے سوا کبھی کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اُسپر بحث کرتے ہوئے دیکھکر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اُسپر بحث کرنے سے منع فرمایا؛ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی صحابہ ہی کے وقت میں اُسپر بحث شروع ہوگئی۔ چنانچہ عمرو ابن عاص اور ابو موسےٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل و نحل شہرستانی میں مذکور ہی اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے اُن آیات کی تفسیر میں، جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں، اس مسئلہ کے متعلق کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا، پھر کیا کوئی اشعری یہہ کہہ سکتا ہی کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علما اور ائمہ نے بیان کیے ہیں وہ نہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو؟

یہانتک جو کچھ ہمنے بیان کیا اس سے صرف اسقدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار

شادی کا مسئلہ نئی روشنی میں

تفسیروں سے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہے؟ اب ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہانتک اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے موافق ہے؟ اور جن اعتراضات کے رفع کرنے کی غرض سے اُنھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اُن کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟ اور جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا اُنھوں نے قرار دیا ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سوان عنوانوں پر ہم آیندہ اپنے خیالات ظاہر کرینگے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

(الطاف حسین حالی)

شادی کا مسئلہ نئی روشنی میں

نئی روشنی کے اکثر نوجوان جو صاحب استطاعت ہیں اور انگریزی کی اعلےٰ تعلیم کے لیے ولایت کو جاتے ہیں، اُن کو انگریزوں کی سوسائٹی میں شامل ہو کر ایک نئی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ہندوستان میں آکر جب وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے گرد و پیش جو لوگ موجود ہیں اُنکو ورزش جسمانی کا ذرہ بھر شوق نہیں ہے۔ نہ وہ انگریزوں کی طرح کلب بنا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ اخباروں کے مطالعے سے اُن کو کچھ دلچسپی ہوتی ہے۔ نہ اولاد کی تربیت کی پروا کرتے ہیں۔ نہ سوشیل زندگی میں حفظانِ صحت اور صفائی کا کچھ خیال کرتے ہیں۔ نہ ہوا اور روشنی میں سکونت رکھنے کے عادی ہیں۔ نہ پوشش اور غذا میں اصولِ تہذیب اور قواعدِ طب پابندی کرتے ہیں۔ نہ آداب مجلس میں شایستگی اور حسن اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں، تو ایسے لوگوں سے بالطبع نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اُس سوسائٹی کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اولڈ فیشن کے لوگ اُنپر طرح طرح کی پھبتیاں کستے ہیں اور اُن کی نرالی وضع اور نئی تراش پر آوازے کستے ہیں۔

اگرچہ بظاہر ابھی تک کوئی خطرہ اس گروہ کی طرف سے پیدا نہیں ہوا ہے مگر عنقریب وہ وقت آنیوالا ہے جبکہ اس گروہ کی تعداد بہت بڑھ جائیگی۔ اُن کی مستقل سوسائٹی تیار ہو کر اپنا نیا وجود دنیا میں قائم کریگی۔ اور وہ اُن تمام قاعدوں اور رسموں کو جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں یکلخت درہم برہم کر ڈالینگے۔ اُنکی تُند اور سرکش اور آزاد طبیعتیں سوسائٹی کے کسی قانون کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکائینگی۔ اور ایک عام سوشیل بغاوت پھیل جائیگی جو سیلاب کی طرح تمام اچھے اور بُرے دستوروں کو، جن پر صدیوں سے سوسائٹی کا عملدرآمد رہا ہے، بہالیجائیگی۔ اُسوقت کسی دستور کی نسبت نہیں کیا جائیگا کہ وہ اچھا تھا یا بُرا تھا اور اُسکی اچھے، یا بُرے ہونے کی کیا دلیل تھی۔ اور کیوں اُسکو ترک کیا گیا۔ کیونکہ زمانے کا عام میلان اور رجحان جس طرف ہو جاتا ہے کوئی اُسپر غور نہیں کرتا کہ یہ عام میلان اور رجحان کیونکر پیدا ہوا اور ہوا کا یہ رُخ بدلنا فائدہ پہونچائیگا، یا نقصان۔ ایسے نازک وقت میں اس زبردست قوت کے میلان اور اس پُرزور دریا کے بہاؤ کو عقلی، یا نقلی استدلال سے روکنا دشوار ہو جاتا ہے پس اُس سے پیشتر کہ یہ ہولناک خطرہ نمودار ہو، ہم کو نئی روشنی والوں کے خیالات پر مطلع ہونا چاہیے اور ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ وہ کیا مانگتے ہیں اور ہم کیا دیسکتے ہیں۔

میں اسوقت اُن تمام حقوق پر بحث نہیں کروں گا، جو نئی روشنی والے مانگتے ہیں اور ہم اُن کے دینے میں تامل کرتے ہیں بلکہ صرف شادی کے مسئلہ پر ایک نظر ڈالوں گا۔ نئی روشنی کے علمبردار نوجوان ذیل کے حقوق شادی کے باب میں طلب کر رہے ہیں۔

شادی کا مسئلہ نئی روشنی میں

(۱) عورت حسین اور تندرست اور نیک سیرت ہو اور شادی سے پہلے شوہر اُسکو دیکھ سکے اور اُس سے بات چیت کر سکے۔

(۲) عورت قریب کے رشتے کی نہ ہو اور شریف خاندان کی اور تربیت یافتہ ہو۔

(۳) مہر حسب حیثیت باندھا جائے۔ اور شادی کی فضول رسمیں جن سے اِسراف اور بدتہذیبی پائی جاتی ہو ادا نہ کی جائیں۔

یہ تین۳ مہتم بالشان باتیں ہیں جنکا نئی روشنی کے نوجوانوں میں چرچا ہے اور جنکی نسبت یہ صدا اُن کی مجلسوں میں بلند ہوتی ہے کہ اگر یہ حقوق ہمکو نہ ملے، تو یا تو ہم عمر بھر تجرّد کی زندگی بسر کرینگے

یا ولایت جاکر اپنی ہم خیال اور ہم تربیت حسین بیویاں بیاہ کر لائینگے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا یہ تین باتیں ایسی ہیں جن کے باب میں مذہب کوئی فتویٰ نہیں دیتا، یا مذہب کے احکام اُنکی خواہشوں کے بالکل برخلاف ہیں۔

امام غزالی نے جن کی کتاب احیاء العلوم ادب اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "میاں بیوی کے درمیان نکاح سے جو تعلق پیدا ہوتا ہے، اُسکے ہمیشہ قائم رکھنے اور زندگی کی لطافت اور مسرت کو ترقی دینے کے لیے اسباب کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ عورت خوبصورت ہو۔ کیونکہ حسن و جمال الفت کے سلسلے میں مضبوط گرہ لگاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نکاح سے پہلے عورت کو دیکھ لینا مستحب ہے"۔ چنانچہ آنحضرت فرماتے ہیں کہ جب تم کسی عورت سے نکاح کرنا چاہو تو شادی سے پہلے اُس کو دیکھ لیا کرو۔ اِس سے زوجین کی وابستگی ہمیشہ قائم رہیگی۔ ہمارے اکثر مقدس اور متقی اسلاف شریف زادیوں سے بھی نکاح بھی کرتے تھے جبکہ اوّل اُن کو دیکھ لیتے تھے تاکہ دھوکے سے محفوظ رہیں۔ امام اعمش جو نہایت نامور محدث ہیں فرماتے ہیں کہ جو نکاح بدوں پیشتر دیکھ لینے کے ہوتا ہے اُسکا انجام رنج و غم ہوا کرتا ہے۔ اسکے بعد امام صاحب لکھتے ہیں کہ صورت کا دھوکا تو دیکھ لینے سے دور ہو جاتا ہے مگر سیرت کے دھوکے سے بچنے کے لیے سُننا ہی کافی ہے مگر عورت کے اوصاف ایسے ہی شخص سے سُننے چاہئیں جو عاقل۔ راست گو۔ ظاہر و باطن کے حال سے واقف ہو۔ نہ عورت کا طرفدار ہو کہ اُسکی تعریف میں مبالغہ کرے، نہ اُس سے دشمنی رکھتا ہو کہ گھٹا کر بیان کرے کیونکہ آجکل لوگ نکاح سے پیشتر کمزوری امور بیان کرنے اور عورت کی سیرت اور اوصاف کے ذکر کرنے میں افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو سچ بولتے ہوں بلکہ فریب اور مغالطہ دینے کا رواج بہت ہو رہا ہے۔ یہ حال تو امام صاحب کے زمانے کا ہے لیکن ہمکو یقین ہے کہ اگر امام صاحب ہمارے زمانے میں ہوتے تو اس دھوکے سے بچنے کے لیے بھی اجنبی عورتوں سے ملاقات کرتے اور اُن سے کچھ دنوں تک بات چیت کر کے اُن کی عادات و خصائل کے اندازہ کرنے کی بھی ضرور اجازت دیتے۔ ہم کو یقین ہے کہ جب وہ اسکی اجازت دیتے تو یہ قید بھی ضرور لگاتے کہ عورت اور مرد میں جو ملاقات اس غرض سے ہو وہ عورت کے رشتہ داروں کے سامنے ہوا کرے۔ عورت کا تندرست ہونا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ جو عورت تندرست نہیں ہے اُسکی اولاد مریل اور کمزور ہو گی، یا اُس سے اولاد ہی نہ ہو گی۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "علیکم بالولود الودود"، یعنی ایسی عورت سے شادی کرو جو اولاد پیدا کر سکے اور جو شوہر سے الفت رکھتی ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عورت قریب کے

رشتے سے نہ ہو۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا ہے قریب کے رشتہ والی عورت سے نکاح نہ کرو کیونکہ اُس سے اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔ اسیطرح بقول امام صاحب کے اگر عورت عالی خاندان کی اور تربیت یافتہ نہ ہوگی اُس سے اولاد کی تربیت ہونی ناممکن ہے۔ آنحضرت ایسی عورت کو جو خوبصورت تو ہو مگر شریف خاندان کی اور تربیت یافتہ نہو خضراء الدمن یعنی کوڑی کا سبزہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں صاف صاف یہ مضمون ہے کہ اپنے لیئے اچھی عورتیں پسند کرو کیونکہ نکاح کا رشتہ وہ تعلق ہے جس سے والدین کے اخلاق اولاد میں بآسانی منتقل ہوجاتے ہیں۔ مہر کی کمی کی نسبت بھی امام صاحب نے بہت سی حدیثیں لکھی ہیں اور عہد نبوی کے واقعات سے استدلال کرکے یہ تاکید کی ہے کہ جہانتک ممکن ہو مہر باندھنے میں افراط سے کام نہ لیا جائے۔ شادی کی فضول اور بیہودہ رسمیں بھی جو طرفین کے اسراف اور ذلت اور بربادی کا باعث ہیں، علماء اسلام کی نکتہ چینی سے نہیں بچیں۔ پس ان مطلوبہ حقوق میں جو نئی روشنی والوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں کوئی حق ایسا نہیں ہے جو مذہبی لحاظ سے بیجا کہا جاسکے اور اُسکے نہ دینے میں شریعت کی پابندی کا بہانہ اُٹھایا جاسکے۔ اگر ہم اسیطرح ٹھنڈے دل سے اُن تمام باتوں کو سُنیں جو نئی روشنی کے نوجوان کہتے ہیں اور اُنکی درخواستوں کو اصلی مذہب کے مطابق کرکے اُنکے دلکی آرزو پوری کردیں تو وہ ہولناک خطرہ رُک جائیگا جسکی طرف ہم نے اپنے مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا ہے، ورنہ تمام رفارمرڈں کی کوششیں اُس سوشیل بغاوت کی آگ کو نہیں بُجھا سکینگی جسکا دھواں ابھی سے اُٹھتا نظر آرہا ہے۔ اور والدین ور سرپرست اُس طوفان کی زور کو فرو نہیں کرسکینگے، جسکے خوفناک آثار ہمارے زمانے کے کرۂ ہوا میں نمودار ہونے لگے ہیں۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْن۔

(اے۔ کے۔ م)

کانپور کی بڑی جنتری سنہ ۱۹۱۰ء

مشہور نامی پریس کانپور کی جنتری سنہ ۱۹۱۰ء نہایت خوبی اور خوشنمائی سے شائع ہوگئی ہے۔ اسسال قابل ذکر جنتری کا پہلا مضمون ہے، جس میں ماہ فروری کے ۲۸ یا ۲۹ دن ہونے کی بحث میں ابتدا سے آج تک سنہ عیسوی کی پوری تاریخ درج کیگئی ہے جو ہر شخص کے لیئے غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ تاریخ روم کا تیسرا نمبر ہے جسمیں سلطان سلیم اور سلیمان اعظم کے حالات مع اُنکی تصویروں کے جو زرنگین مطلا اور رنگین کارچھاپی گئی ہیں درج ہیں۔ تاریخ کی پیشانی پر مدینۂ منورہ کا نقشہ ہے جسکے سبز گنبد اور طلائی منارے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ کے درمیان ایک رنگین اور نفیس نقشہ عروج سلطنت عثمانیہ کا ہے جس کے جُدا جُدا رنگوں کے باعث دور سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ سلطان بایزید ثانی کی حکومت کا رقبہ کسقدر تھا اور پھر سلیم اوّل اور پھر سلیمان ثانی نے اپنے اپنے عہد میں کس کس قدر اضافہ کیا۔ یہ نقشہ اپنی ترتیب میں بالکل نیا ہے اور اس سے پہلے غالبًا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ تاریخ روم کے بعد فرنیالوجی کا حصہ ہے جس کا ترجمہ نہایت عام فہم اُردو میں کیا جاتا ہے اور اُسکے ساتھ بھی ضروری تصویریں چھاپی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں دیگر مختلف چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جو ناظرین کے لیئے مفید معلومات کا ذریعہ ہیں۔ اور یہ سب مضامین ایک مطلا اور رنگین کار ٹائٹل پیج کے اندر ہیں۔ اسسال اس جنتری کی قیمت فائدۂ عام کی غرض سے بجائے دو روپے کے ایک روپیہ کردی گئی ہے۔ اور منشی محمد رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران { حاجی محمد اسمٰعیل خاں
مولوی وحیدالدین سلیم

جلد ۲	یکم جنوری سنہ ۱۹۰۰ء	نمبر ۷

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک .... للعہ		قیمت فی پرچہ نمونہ ۵/

مقام اشاعت - دفتر معارف - علی گڈہ

مطبع فیض عام واقع علی گڈھ میں چھپا

مقاصد اور قواعد

۱- یہ دو جز کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو علیگڈھ سے شائع ہوا کریگا

۲- اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اُسمیں ہر قسم کے علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی۔ عربی اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳- یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جائینگے۔

۴- بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں

ا- حاجی محمد اسمٰعیل خاں۔

ب- مولوی وحیدالدین سلیم۔

۵- ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشا پردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں۔ جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں اگر مہربانی سے وہ خود، یا اُن کے احباب اُن کے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُنکی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہونچائیں جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶- اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپیہ ہے جو نقد قیمت بھیجنے، یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرنے سے خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہوگی۔ نمونے کے پرچے کیلئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کیجائیگی۔ اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی۔ رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحیدالدین سلیم کے نام ہونی چاہیے۔ اور اُن ہی کے نام قیمت آنی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لیے آدھ آنے کا ٹکٹ، یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷- جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں، اُنسے اُمید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائیٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸- حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہینگے۔

۹- اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰- جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہ جائے

۱۱- پتہ مولوی وحیدالدین سلیم علیگڈھ دفتر رسالۂ معارف۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲ | یکم جنوری سنہ ۱۹ع | نمبر ۷

ترقی انسانی

میرے ایک قابل دوست نے مذکورۂ بالا عنوان پر مضمون لکھنے کی فرمایش کی ہے اور اُن کی یہ بھی خواہش ہے کہ اس مضمون میں اقوام یورپ اور ہند کی ترقیات کا مقابلہ کر کے دونوں کے درجات کو ظاہر کیا جائے۔ میں اُن سے معذرت چاہتا ہوں کہ اُنکے اس ضمنی خیال کے مطابق عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ گو اُن کی فرمایش کی تعمیل کے لیے اصلی مضمون پر اپنے ناقص علم کا اظہار ضروری ہے۔ کسی زمانے کی دو اقوام کی ترقی کے درجات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا نہایت ہی دشوار ہے اور اب تک ماہران فلسفۂ تاریخ کو یہ قدرت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ کونسی قوم کس ترقی کے سطح پر کھڑی ہے۔ ہاں اسباب کو ہر ایک انسان مشاہدہ کر رہا ہے کہ ایک قوم دوسری سے آگے چل رہی ہے یا پیچھے رہ گئی ہے لیکن یہ کہنا کہ کسقدر آگے ہے یا کسقدر پیچھے ہے، ابھی تک احاطۂ قدرت انسانی سے باہر ہے۔ اس امر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اُسی حالت میں ممکن ہوگا جب ہمکو یہ معلوم ہو جائیگا کہ انسان کہاں سے چلا ہے اور اُس کے سفر بے پایاں کی آخری منزل مقصود کیا ہے اور کہاں ہے۔ یعنی جب انسانی ترقی کا کوئی خاص اور محدود معیار قرار پا چکیگا۔

ابتداے ترقی جہاں ترقی ہے وہاں ابتدا کا ہونا لازمی ہے۔ انسانی ترقی محدود ہے لہذا اُس کی ابتدا بھی محدود ہے اور نیز انتہا بھی۔ وہ کیا حالات تھے اور کیا ماخذ تھا جس سے انسانی ترقی کا آغاز ہوا اُسکے متعلق کوئی عینی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں۔ محض قیاسات ہیں۔ اسپر دو تھیوریاں ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اوّل یہ کہ پہلا اور ابتدائی انسان یعنی حضرت آدم گو اپنی نافرمانی کی وجہ سے خلد سے نکالا گیا اور خاک ناپاک اُسکا مسکن قرار پایا لیکن وہ اپنی اولاد کی نسبت بہت زیادہ متبرک اور عاقل تھا۔ اُسنے شہر آباد کیے۔ تمدنی زندگی کے سامان مہیا کیے اور اُنکے واسطے سے اپنی زندگی بسر کر کے دنیاے فانی سے گذر گیا۔ اُسکو قدرت نے وہ قابلیت عطا کی تھی کہ اُس کی اولاد میں ہمیشہ بڑے

عاقل آدمی کو بھی نصیب نہیں۔ چونکہ اسوقت ہمارا مقصد ہی ترقی کی ابتدا کا بیان نہ کہ تنزل کی ابتدا کا اور اس تھیوری کی روسے ہم نے ایک اعلےٰ درجے سے ادنیٰ کیطرف حرکت کی ہی لہذا اسوقت اس کو بالکل نظرانداز کرنا مناسب ہی۔ دوسری تھیوری یہ ہی کہ ہم نے اُس حالت سے ترقی شروع کی تھی جب ہم وحشی جانوروں کے ہمخصال تھے۔ جب انسان اپنے ہاتھ سے حشرات الارض کے سوا اور کسی جانور کا شکار کرنے کے قابل نہ تھا۔ جب جنگلی خودرو درختوں کے پھل اور پتے اور جڑیں اُس کی مرغوب غذا تھی۔ جب گیدڑوں اور بھیڑیوں کیطرح زمین کے سوراخوں اور پہاڑوں کے غاروں میں گھس کر گرمی اور سردی کی شدت اور خونخوار درندوں کی دستبرد سے اپنی جان بچاتا تھا۔ جب ماں اور بیٹی بہن اور بھائی اور جورو اور خاوند کی تمیز نہیں کرسکتا تھا جب اپنی جسمانی بیماریوں کا کچھ علاج نہیں کرسکتا تھا۔ غرضکہ جب یہ محض ایک وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اسوقت اُسکی اُن قویٰ میں ترقی اور شگفتگی شروع ہوئی جو قدرت نے اُسکے لیے مخصوص کیے تھے۔ دنیا میں اب بھی ایسی قومیں موجود ہیں، جن کی بعینہٖ ایسی ہی حالت ہی جسکا اوپر بیان ہوا ہی۔ وسط آسٹریلیا کے باشندے ابھی تک موجود ہیں اور انسانی ادنےٰ سے ادنےٰ درجہ تہذیب اور ترقی کا نمونہ ہیں یعنی جسقدر یہ لوگ وحشی ہیں اُن سے بڑھکر کوئی درجہ وحشت کا ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ یہ لوگ آگ کا استعمال مطلق نہیں جانتے۔ جانوروں کا شکار کرنا بھی نہیں جانتے۔ ان میں اتنی بھی عقل نہیں کہ یہ ایک درخت سے لکڑی توڑکر اپنے کسی دشمن کو یا کسی جانور کو ماریں۔ دریا کے کنارے پر صبح سے شام اور شام سے صبح تک اس امید میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ پانی کسی مچھلی کو اُچھال کر کنارے پر پھینکدے تو وہ اُس سے اپنا پیٹ بھریں۔ غرضکہ اُسی درجے کے وحشی ہیں جسکا مفصل بیان اوپر ہوچکا ہی۔ پس ایسے وحشیوں کی مشابہت سے اس تھیوری کو تقویت ہوتی ہی کہ ابتدا میں سب انسان ایسی ہی وحشیانہ حالت میں ہونگے۔ لیکن تاریخ سے اس تھیوری کو کسیطرح تقویت نہیں ہوتی۔ بعض تاریخی واقعات اس تھیوری کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً مصر میں قوم کاپٹ اُن مصریوں کی اولاد ہیں، جنہوں نے حروف ایجاد کیے مصوری اور صناعی میں نمایاں ترقی کی جنہوں نے اقلیدس جیسی کتاب تصنیف کی۔ اور جنکی تہذیب اور ترقی کا پرتو کل دُنیا پر پڑا لیکن اُن کی اولاد دنیا کی پست ترین اقوام میں سے ہی۔ اسی قسم کی متعدد مثالیں تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہی، جن سے ہمکو اس مسئلہ کے سچا ہونے میں بہت کچھ شبہہ ہوتا ہی اور خیال پیدا ہوتا ہی کہ اگر ہم وحشیانہ حالت سے ہی بڑھ کر یہانتک پہونچے اور ادنےٰ درجے سے اعلےٰ کیطرف حرکت محقق ہوتی، تو پھر ایسی مثالیں کیسے پیدا ہوتیں کہ ہم بعض اقوام کو بلندی سے پستی کی جانب گرتے دیکھ رہے ہیں۔ قاعدے کا یکساں اور بے خطا ہونا ثابت نہیں۔ اور یہ ممکن ہی کہ تاریخی زمانے سے پیشتر ہمارے بزرگ کوئی اعلےٰ درجہ ترقی اور تہذیب کا حاصل کرچکے ہوں اور پھر گرتے گرتے پستی کے اُس درجے پر پہونچ گئے ہوں جہاں پر تاریخ نے اُن کی حالت کا نقشہ کھینچ لیا اور پھر اُن کی حرکت بلندی کی جانب شروع ہوگئی اور اسیطرح دَور در دَور انسان ترقی اور تنزل کرتا چلا آیا ہی اور ہمارا یہ کہنا غلط ہی کہ اول پستی تھی اور پھر بلندی پر پہونچے۔ کیونکہ جب بلندی اور پستی کا دَور تسلیم کیا جائے تو ایک دَور لامحالہ پستی سے شروع ہوگا تو دوسرا بلندی سے۔

اب گو مذکورہ بالا تاریخی واقعات سے ہمارے یقین کو متعلق مسئلۂ ابتداے ترقی بہت کچھ تزلزل ہوتا ہے تاہم مزید احتیاط سے اگر غور کیا جائے تو یہ تھیوری زیادہ تر قابلِ اعتبار ہوگی کہ ہماری ابتدائی حالت ادنےٰ تھی اور انسان نے وحشیانہ حالت ہی سے ترقی شروع کی تھی۔ اس مضمون میں ہماری مراد انسانی ترقی سے بحیثیت مجموعی ہے نہ کہ فرداً فرداً اقوام انسانی کی ترقی سے بحث۔ گو مصریوں کی اولاد میں ضعف آیا لیکن وہ ترقی جو انہوں نے کسی زمانے میں کی تھی اُس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہوا۔ وہ راس المال کی طرح دیگر اقوام کے ہاتھ آئی جنہوں نے اُسکو ہزار گنا بڑھایا اور ٹھیک اُس مقام سے آگے چلنا شروع کیا جہاں پر مصری پہونچ چکے تھے۔ مصریوں کی ترقی کو تنزل نہیں ہوا بلکہ مصریوں کی اولاد کو تنزل ہوا۔ حروف جو مصریوں کی ایجاد تھی اُنکو اہل یونان اور اہل روما نے اختیار کیا۔ اقلیدس مشرق سے مغرب تک ہر ایک مہذب قوم کو ترقی انسانی کے ترکے میں پہونچی ہے۔ گویا کہ اگر پوری طرح سے غور کی جائے تو خود تاریخ ہی اس مسئلے کی معاون و مددگار بن جاتی ہے کہ انسان جو کچھ ترقی کرتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک قوم ایک خاص ترقی کا درجہ حاصل کرکے پھر نیچے کو گر جائے لیکن ہمیشہ اُسکی قائم مقام کوئی اور قوم بنجاتی ہے اور اُس خاص درجے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اور اُسی مقام کو اپنی پہلی منزل قرار دیکر آگے کو بڑھنے لگتی ہے۔ آج اقوام یورپ اُس مقام سے ہزارہا منزل آگے ہیں جہاں پر مصریوں نے اپنی ترقی کی رفتار کو ختم کیا تھا۔ لیکن اگر مصریوں کی ترقی یورپ کے پاس نہ ہوتی تو غالباً اہل یورپ ابتک اُس مقام تک بھی مشکل سے پہونچتے جہاں مصری پہونچ چکے تھے۔ بہرحال جبکہ ترقی میں ہم زوال نہیں پاتے بلکہ دن بدن اُس کی پرواز بلندی ہی کی جانب ہے تو ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کبھی نہ کبھی بہت ہی پست اور ادنےٰ حالت ہوگی جہاں سے انسان نے آگے بڑھنا شروع کیا ہوگا۔ یہ ہمارا قیاس ایسا ہی ہے کہ اگر ہم ایک گھڑے میں کچھ پانی پائیں اور کسی مقام سے پانی کے قطرے اُس میں گرتے دیکھیں اور اُس گھڑے میں اور کوئی راستہ پانی کے آنے کا نہ معلوم ہو تو لامحالہ ہم یہ قیاس کرینگے کہ یہ گھڑا کبھی بالکل خالی ہوگا اور اِن قطرات کی بدولت اس میں یہ پانی جمع ہوگیا ہے۔

انجام ترقی انجام سے ہماری مراد فقط خاتمہ ہی سے نہیں بلکہ غایت سے بھی ہے۔ ترقی کی ابتدا کے بارے میں ہم کچھ نہ کچھ تو اپنے قیاس سے کام لے سکتے ہیں لیکن خاتمہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ گو مختلف اقوام کی ترقی اور تنزل کے دَور کو دیکھ کر کسی روشن دماغ سوچنے والے نے یہ کہا ہے کہ ہر کمالے را زوالے۔ لیکن آیا یہ مقولہ مجموعی ترقی انسانی کے کمال پر بھی عائد ہوسکتا ہے اسکا جواب ابھی تک ہم نہیں دے سکتے۔ اور اغلب یہ ہے کہ انسان اسکا شافی جواب دینے سے ہمیشہ قاصر رہیگا چونکہ انسان خود محدود ہے اسلیئے اُس کی غیر محدود ترقی تصور میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہ کہ اُس کی ترقی کا خاتمہ کب ہوگا کسطرح ہوگا اور ترقی کے کس درجے تک پہونچکر انسان پیچھے کو لوٹیگا اِن سوالات کے جوابات محالات سے ہیں۔ اگر علماے طبقات الارض کے اس قیاس کو تسلیم کیا جائے کہ انسان اس دُنیا کے اسٹیج پر ایک خاص زمانے تک ایکٹ کرنیکے بعد مثل اور ہزارہا مخلوق کے جو اُس سے پیشتر اپنا اپنا دور پورا کرکے نیست و نابود ہوگئی غائب ہوجائیگا اور وہ موسم بھی کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں تو ہمکو اپنا اور نیز اپنی ترقی کا خاتمہ آنکھوں کے سامنے نظر آرہا ہے۔ پیشوایان مذاہب اور نیز علماے دین کا خیال ہے کہ انسان کی ترقی صرف اس دنیوی زندگی

پر ہی منحصر نہیں بلکہ اُس کی روح کی ترقی بعد از انفصال جسم و روح بھی جاری رہیگی - ہم اس مسئلے کی نسبت اس موقع پر کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسوقت بحث اس ظاہری اور محسوسات کی زندگی سے ہے - یہ سوال کہ انسان کی ترقی کی غایت کیا ہے ؟ اور بھی زیادہ حیران کرنیوالا ہے ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ انسان بغیر کسی مطلب یا مدعا کی اوپر کو جا رہا ہے یا اُس کی بڑی شد و مد کی تیز رفتاری کی غایت ہی کچھ نہیں - ہاں ہماری عقل اور علم اور تجربہ تینوں یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کیا چیز ہے جسکو غایتِ ترقی قرار دیا جائے - ایک بڑے گروہ کا یہ خیال ہے کہ آزادی غایتِ ترقی ہے - جب ہر ایک انسان کل خارجی روک اور دباؤ سے نجات پا جائیگا جب زبردست اور زیر دست کی کچھ بحث باقی نہ رہیگی ، جب ہر فرد انسانی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے اُن قویٰ سے کام لے سکے ، جو فطرت نے اُس کو عطا کئے ہیں تو ہم سمجھینگے کہ ہم نے ترقی کا ثمرہ پا لیا - اِسمیں کچھ بھی شبہہ نہیں کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن جس آزادی کی خواہش کی گئی ہے اُسکو ثمرۂ ترقی کہنا غلط ہے - ایسی آزادی مانع ترقی ہے - اور دیگر یہ بات ہے کہ اگر بالفرض ایسی آزادی حاصل بھی ہو جائے تو وہ بطور غایت ترقی کے نہیں سمجھی جائیگی بلکہ وہ خود ذریعہ ہوگا حصولِ مدعا کا - ایک اور گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ خوشی غایت ہے ترقی کی - جب بنی نوعِ انسان کے لیئے بغیر کسی رنج اور تکلیف کے خوشی ہی خوشی مخصوص ہو جائیگی تو ترقی کا مدعا پوری طرح سے حاصل ہو جائیگا اب اگر رنج اور راحت کا وجود لازم اور ملزوم نہیں تو ضرور ہم خوشی کو ہی غایتِ ترقی تجویز کرینگے -

---

اسبابِ ترقی اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ترقی حاصل کرنے کے کیا ذریعے ہیں - دو قسم کے اسباب سے انسان ترقی حاصل کرتا ہے - اول اور نہایت ہی ضروری اسباب خود انسان کی فطرت میں موجود ہیں صانع قدرت کی حکمت تھی کہ انسان اپنی حالت کی اصلاح کرے اور اپنے کو کل مخلوق کا سرتاج بنائے اور سب سے اعلےٰ اور ارفع مقام حاصل کرے اسلئے اُس کی فطرت ہی میں ترقی کے ذریعے رکھدیئے گئے ہیں - انسان کی نیچر میں خواہشات اور اُمنگیں موجود ہیں ، جنکو خود بخود تسکین اور سیری حاصل نہیں ہو سکتی - یہی خواہشیں اور دل کی اُمنگیں انسان کو کوشش اور سخت سعی کے لیئے مجبور کرتی ہیں - کوشش اور جد و جہد کے لیئے آمادہ کرتی ہیں - دیگر حیوانات میں بھی خواہشیں ہیں لیکن وہ محض جسمانی ضرورتوں تک ہی محدود ہیں اور اُن کے پورا کرنے کے لیئے قدرتی سامان موجود ہیں پھر بھی اپنی ضروریات کو حاصل کرنے میں جو کوشش اُن کو کرنی پڑتی ہے اُس سے اُن کی عقل حیوانی کسیقدر ترقی پا جاتی ہے - مثلاً ہاتھی اور چیتے وغیرہ جانوروں کے متعلق مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بعض بعض کاموں میں ترتیب اور عقل پائی جاتی ہے - لیکن انسان کی کُل خواہشات کو پورا کرنے کے لیئے قدرت سے سامان بہم نہیں پہونچا - اُس کی ضرورتوں کا انحصار زیادہ تر اُس کی ذاتی کوشش پر ہے - اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں جو کوشش اُسکو کرنی پڑتی ہے وہی کوشش اُس کی عقل کی ترقی کا باعث ہوتی ہے - اب انسان کی ضروریات محض بھوک اور پیاس اور اپنے دشمنوں سے اپنی جان بچانا ہی نہیں - اُس کی خواہشات اور ضروریات کا دائرہ بہت وسیع ہے - اُسکو اسباب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک مقام سے دوسرے

مقام تک بہت کم وقت میں اور آسانی سے پہونچ جائے۔ اُسکا ذہن سب سے پہلے اُس چیز کی طرف منتقل ہوتا ہی جو قدرت نے اُس کے لیئے مہیّا کر دی تھی اور جسمیں اُسکو بجز اُسکے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا کہ اپنے قبضۂ تصرف میں لائے۔ لہٰذا اول ہی اول اُسکو گھوڑا نظر آیا پھندا ڈالکر پھانسا اور اوپر چڑھ بیٹھا۔ رفتہ رفتہ رتھ اور بہلی تیار ہوئی۔ یکّا بنا۔ گاڑی اور ریل ایجاد ہوئی۔ اُس کو ضرورت پڑی کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس اپنے حالات فی الفور پہونچا دے۔ آدمیوں کی ڈاک باندھی۔ کبوتر پالے۔ گھوڑوں کی ڈاک قائم کی اور آخر کو تار برقی ایجاد کرکے اپنا کمال دکھایا۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر کاموں کو رفتہ رفتہ اُسنے کمال کو پہونچایا اور ابھی تک دن بدن آگے ہی کو بڑھ رہا ہی اور کمال میں کمال پیدا کر رہا ہی۔

کسی بڑے فلاسفر کا قول ہی کہ دنیا میں انسان سے بڑی اور کوئی شے نہیں اور انسان میں بڑی سے بڑی جو چیز ہی وہ روح ہی۔ انسان میں قوت گویائی بھی اگر سب سے بڑی شے نہیں تو بہ لحاظ اپنی ضرورت کے کسی دیگر شے سے کم بھی نہیں۔ محض عقل یا روح کا موجود ہونا چنداں مفید نہ ہوتا اگر انسان کو فطرت قوت گویائی عطا نہ کرتی۔ ترقی کو قائم رکھنے یا ترقی کو حاصل کرنیکا بڑے سے بڑا ذریعہ اُس کی قابلیت ہے اپنے خیالات اور تجربوں اور مشاہدات کو دوسروں پر ظاہر کرنیکی۔ اگر ایک انسان کچھ علم حاصل کرے کے بعد اس قابل نہوتا کہ کسی دوسرے کو علم سکھا سکے تو وہ اپنا علم اپنے ساتھ ہی لیکر دنیا سے چلد تیا اور اپنے بعد کچھ بھی نہ چھوڑتا۔ اور اسیطرح ہر ایک انسان کا علم، یا تجربہ، یا ایجاد اُس کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتی۔ پھر ترقی چہ معنی دارد۔ حیوانوں کی سی ہماری بھی حالت ہوتی۔ لیکن زمانۂ گذشتہ کے علمی خزانوں کو قائم رکھنے کے لیئے محض گویائی ہی گویائی کافی نہیں جب تک انسان کی یہ قدرتی خواہش اُسکی معاون اور مددگار نہو کہ وہ اپنے علم کو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے غارت نہونے دے۔ تاریخی عہد سے بہت پیشتر ہی سے اُسنے اپنی اِس فطری خواہش کے موافق عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو باتیں اُسکے مشاہدے سے گذرتی تھیں، یا تجربے میں آتی تھیں گو اُن کو بوجہ نہ جاننے حروف کے تحریر میں نہیں لا سکتا تھا لیکن مصنوعی نشانات اور تصویروں سے کام لیتا تھا اور اُن کی یادداشت قائم رکھنے کی فکر کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ حروف ایجاد کیئے اور اپنے علم کی حفاظت اور قیام کو بدرجہا زیادہ تقویت پہونچائی۔ فوٹوگرافی ایجاد کی تاکہ فانی اشیا مثل انسان یا مکانات یا خاص قدرت کے نظاروں کی ہیئت کو فنا نہ ہونے دے اب تو اُسنے وہ درجہ حاصل کیا کہ جس کی وجہ سے وہ در اصل کل مخلوقات کا سردار کہلانے کا پورا مستحق ہی یعنی انسان کی آواز اور گفتگو کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اسباب ترقی کی قسم دیگر خارجی ذرائع ترقی ہیں۔ خارجی اسباب کو کچھ کم دستگاہ ترقی پر اثر ڈالنے کی نہیں۔ اگر خارجی اسباب کی مدد نہوتی تو انسان کے فطری قویٰ غالباً محض بیکار ہوتے۔ جیسے ہم اپنی بصارت سے کچھ کام نہیں لے سکتے جبتک روشنی ہماری مدد نہ کرے۔ اسیطرح انسان میں جو قدرتی اسباب ترقی ہیں وہ بیکار ہیں جبتک خارجی اسباب کی مدد نہ ہو۔ افریقہ کی حبشی اقوام کو صدیوں کی غلامی نے نہایت ہی پست اور کمزور بنا دیا ہی حالانکہ قدرت کی فیاضی حبشیوں اور دیگر اقوام کے لیئے یکساں ہے۔ گرین لینڈ کے باشندوں کی طرز معاش ایسی ہی کہ وہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ بحر الکاہل کے جزائر کے باشندے بوجہ اسکے کہ کل دنیا سے الگ ہیں اور کسی مہذب قوم سے اُنکا میل جول نہیں، ابتک وحشت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ خارجی اسباب

میں سے آب و ہوا بھی ایک بڑا سبب ہے۔ سرد ملکوں کے باشندے محنتِ شاقہ کو زیادہ برداشت کر سکتے ہیں بہ نسبت گرم ملک کے رہنے والوں کے۔ اور ترقی ہمیشہ متناسب ہوتی ہے کوشش اور محنت کے۔ لیکن محض آب و ہوا پر کچھ ترقی کا زیادہ تر دار و مدار بھی نہیں۔ وہی خطۂ یونان ہے جس میں ارسطو اور افلاطون جیسے لوگ پیدا ہوئے تھے اور اب بھی وہی یونان ہے۔ نہ آب و ہوا میں فرق آیا اور نہ ملک کی شکل و ہیئت میں لیکن آجکل یونانیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ایک ہی ملک اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں بسنے والے دو انسان یا دو فرقے ایک ہی وقت میں مختلف ترقی کے درجات حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان میں برہمنوں اور شودروں کے لیئے آب و ہوا بالکل ایک ہی تھی لیکن اُن کی ترقی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کیونکہ شودروں کی ترقی کو برہمنوں نے روک دیا تھا اسلیئے نہ اُن کے قدرتی قویٰ اور نہ آب و ہوا اور نہ کوئی اور فطری، یا خاص ذریعہ اُن کی ترقی کا معاون و مددگار بن سکتا تھا۔ اِنہیں باتوں پر غور کرنے کے بعد کسی دانا نے لکھا ہے کہ "وہ انسان اپنے گرد و نواح کے احوال اور واقعات کا بندہ ہے"۔

اسباب مانع ترقی دنیا میں رہنا اور پھر دنیا سے بے اعتنائی ظاہر کرنا ترقی انسانی کے لیئے زہرِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ بے زبان حیوانوں کی مانند مصائب اور سختیوں کا متحمل ہونا اور اُن کو دور کرنیکی کوشش نہ کرنا ضروریات اور خواہشات کو محسوس کرنا اور اُن کے پورا کرنیکے لیئے اپنے دست و بازو کو حرکت نہ دینا گویا اپنے ہاتھوں سے اپنی ترقی کا گلا گھونٹنا ہے۔ دوسری اقوام کو راہِ راست پر چلتے دیکھکر بھی اُس راہ کو اختیار نہ کرنا تنزل کے گڑھے میں گرنا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ ایک خنجر ہے جس سے عقلمندوں کے دشمنوں کا گلا کٹتا ہے اور نادان کے دوست کا خون بہتا ہے۔ یہ مسئلہ عاقلوں کی ترقی کا معاون ہے اور کم ہمت جاہلوں کی تنزل کا مددگار۔ بعض اقوام نے اِس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور بعض کی ہلاکت کا باعث ہوا ہے۔ کسی ملک کی افراطِ پیداوار بھی ایک بڑا سبب ہے جس سے وہاں کے باشندوں کی ترقی رُک جاتی ہے۔ معمولی ضروریات کے سامان بغیر کسی سخت محنت، یا کوشش کے بہم پہونچتے رہتے ہیں اسلیئے وہ لوگ مشقت کو برداشت نہیں کر سکتے اور رفتہ رفتہ کاہل اور آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر سے باہر جانا اور دیگر اقوام سے میل جول بھی اُنکو ناگوار گذرتا ہے۔ اُن کے فطری قویٰ کمزور اور بیکار ہو جاتے ہیں اور پھر کوشش کرنے پر بھی کام نہیں دیسکتے۔ عیش و عشرت لازمی نتیجہ ہے دولتمندی کا اور سُستی اور کاہلی لازمی نتیجہ ہے عیش و عشرت کا۔ لہذا زیادہ دولتمندی بھی منجملہ مانع اسباب ترقی ہے۔ لیکن زمانۂ حال کی عقلمند اقوام اپنی دولتمندی کو کسی طرح مانع ترقی نہیں ہونے دیتیں بلکہ اُس کو معاونِ ترقی بنا لیا ہے۔ اور کچھ ایسا ڈھنگ ڈالا ہے کہ جسقدر کوئی قوم زیادہ تر دولتمند ہوتی جاتی ہے اُسیقدر وہ ترقی کے میدان میں بھی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ آزادی کا نہ ہونا ایک بہت بڑا سبب مانع ترقی ہے۔ آزادی دو قسم کی ہے ایک خارجی اور دوسری اندرونی، یا روحانی۔ کسی ظالم حکمراں کا محکوم ہونا، یا ہمیشہ معرضِ انقلابات رہنا اور خانہ جنگیوں اور بیرونی حملجات کے صدمات اُٹھانا بیرونی آزادی کو کھونا ہے اور تعصبات اور توہمات کے گرد و غبار کو اپنے دل پر چھا رہنے دینا اور اپنے دل کو حسد اور بغض اور کینہ اور بدظنی کا گڑھا بنانا انسان کی اندرونی، یا روحانی آزادی کو کھونا ہے اور جبتک انسان کو ہر دو قسم کی آزادی حاصل نہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کو پہلی قسم کی آزادی حاصل ہے مگر دوسری نہیں۔

(عبد اللہ)

سلطنت کی آمد و خرچ کی مدیں

سلطنت کی آمد و خرچ کی مدیں

زمانۂ سابق و حال میں

اس مضمون کے پڑھنے سے ناظرین کو یہ حال معلوم ہوگا کہ زمانے میں کیا کیا عجیب و غریب انقلابات ہوتے ہیں کہ سرکار شاہی کی جو بالفعل آمدنیاں اخراجات ہیں اُن میں سے بعض کا پہلے زمانے میں نام بھی نہ تھا۔ اور جو پہلے زمانے میں آمدنیاں و مصارف تھے اُن میں بعض اب عنقا و کیمیا ہیں۔ شاہی آمدنیوں کے اقسام بہ تفصیل ذیل ہیں۔

اوّل۔ رعایا خود بخود اپنی خوشی سے سرکار شاہی کے خرچوں کے لیئے اپنی گرہ سے زر دیدے۔ ہم تو ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں کہ گورنمنٹ کو اپنی خوشی سے ادھی بھی نہ دیں۔ جب یہ جانتے ہیں کہ ندینے سے گورنمنٹ ہمکو ہماری اس شرارت کی سزا دیگی تو گرہ سے نکال کر زر دیتے ہیں اسلیے ہمارے خیال میں نہیں آتا کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہو کہ اس میں قاعدہ تھا کہ ہر شہری خود بخود اپنی حیثیت اور مقدرت قرار دیتا اور اُس کے موافق گورنمنٹ کے خرچ کی امداد کرتا جو خراج، یا ٹیکس وہ خود اپنے اوپر مقرر کرتا اُس کے ماننے میں گورنمنٹ چون و چرا نہیں کرتی تھی ٹیکس کی تحصیل کے لیئے عملہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص بلایا جاتا اور ایک صندوق اُس کے آگے رکھا ہوا ہوتا اُس سے کہدیا جاتا کہ جو تیرا جی چاہے اس صندوق میں گورنمنٹ کے خرچ کے لیئے ڈالدے۔ وہ ڈال دیتا تھا اس سے کوئی محاسبہ یا کوئی حلف لیا جاتا۔ اُسکو اس پر ناز و فخر تھا کہ اس کے لیئے نہ کوئی ٹیکس کا مجوزہ مقرر ہوا نہ سپاہی اور چپراسی کا وحشیانہ تقاضا ہوا۔

دُوم زمین کے محاصل کی آمدنی۔ زمین کے تردد میں جو خرچ ہوتا ہے اُس خرچ سے بہت زیادہ آمدنی زمین کے محاصل سے ہوتی ہے۔ اس فاضل آمدنی میں گورنمنٹ کا حصّہ اس سبب سے ہوتا ہے کہ وہ زمین کی مالک ہوتی ہے۔ جہاں زمیندار کا واسطہ نہیں ہوتا، وہاں رعایا خود لگان سرکار کو دیتی ہے اور جہاں زمیندار کا واسطہ ہوتا ہے وہاں کاشتکار زمیندار کو لگان دیتا اور زمیندار سرکار کو جمع کا روپیہ دیتا ہے جو بمنزلہ لگان ہوتا ہے۔ یہ آمدنی سب سے بڑھ کر ہے اس کے لیئے جُدا مضمون لکھا جائیگا۔

سوم لاوارث مال کی سرکار مالک ہوتی ہے اس سے اس کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ سے تمام ملکوں میں اور وحشی قوموں تک میں جاری رہا ہے کہ جس مال کا کوئی وارث و مالک و دعویدار نہو اس کی مالک گورنمنٹ ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بلحاظ آمدنی کے اس اصول کے منشاء کی وسعت یا تنگی مطابق اُن قوانین کے ہوسکتی ہے جو اولاد اور وصیت کے باب میں ضوابط اور ثبوت دعوی کے طریقے اور دعوی کی حدِ سماعت کا وقت مقرر کرتے ہیں۔ ان اعتبارات سے ایک گورنمنٹ بہ نسبت دوسری گورنمنٹ کے زیادہ فیاض ہوسکتی ہے پہلے زمانے میں ایسے انتظامات تھے کہ اس لاوارث مال کی ضبطی سرکار شاہی کی آمدنی کا بڑا صیغہ ہوتا تھا۔ مگر زمانۂ حال میں قوانین وراثت اور وصیت کو ایسی وسعت دی گئی ہے کہ اس آمدنی کا صیغہ مفقود ہونے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ بعض ملکوں میں بڑے بڑے مدبروں کی راے ہے کہ وراثت کے قوانین ایسے جاری کرنے چاہئیں کہ چند ہی قریب کے وارثوں کو ورثہ پانے کی امید ہو۔ دور کے سب رشتہ دار محروم الارث کردیئے جائیں۔ اور وصیت کی بھی وسعت کم کردی جائے اور جو وارث کہ بے اولاد ہوں اور اُن کے ہاں اولاد ہونے کی توقع نہو، تو مال متروکہ سب ضبط سرکار ہو

اور اُسکا سود اُنکے وارثوں کو تاحین حیات ملا کرے - جب ایسے قوانین نفاذ پا چکینگے کہ دور کے رشتہ داروں کو ورثہ پانے کی امید ہی دل میں نہیں پیدا ہوگی تو اُن کو مایوسی بھی نہیں ہوگی مایوسی تو اس حالت میں ہوتی ہو کہ امید ہو جب امید نہیں تو مایوسی نہیں، جب مایوسی نہیں تو کوئی رنج و تکلیف نہیں - پس ایسے قوانین کے اجرا میں کسی پر سختی و درشتی نہیں ہوگی - گو قوانین کے موافق مال کا لاوارث قرار دینا اور وصیت کا قافیہ تنگ کرنا بہت کم ہوگیا ہو مگر اُس کی بجاے ایک اور صیغہ آمدنی کا ہوگیا ہو کہ وارثوں سے وراثت کے مالک ہونے کے لیئے کچھ فیصدی سرکار میں داخل کرنا پڑتا ہے

چہارم - مجرموں کے جرمانوں اور ڈونڈوں اور ضبطی جائداد کی آمدنی -

پہلے زمانے میں سرکار شاہی کی آمدنی کا یہ بڑا صیغہ تھا قاعدہ ہو کہ جو لوگ بادشاہ سے سرتابی کرتے ہیں وہ اکثر سیر ہوتے ہیں - اُنپر جرمانے ہوتے ، اور ڈونڈ لیئے جاتے، اور اُن کی جائداد ضبط کی جاتی جس سے خزانۂ شاہی معمور ہوتا تھا - ہندوستان کی ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء میں دیکھو کہ کسقدر جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطی سے سرکار کی آمدنی بڑھ گئی تھی - مگر اب اس قسم کی سرکشیاں بہت کم ہوتی ہیں اسلیئے اس آمدنی میں بڑا فرق آگیا ہے - اکثر مجرم مفلس ہوتے ہیں - اُن سے جرمانے میں کیا وصول ہوسکتا ہو؟ یہ آمدنی پولس اور عدالتوں کے خرچ کے لیئے بھی کافی نہیں ہوتی - مگر پھر بھی یہ ایک آمدنی ہو جو خرچ کا ایک حصہ بنتی ہو -

پنجم نوآبادیوں اور مفتوحہ قوموں اور محکوم رعیتوں سے خراج لینے کی آمدنی -

قاعدہ ہو کہ جب کہ جنگ برپا ہوتا ہو تو اس کے خرچ کا سارا بوجھ مفتوح و مغلوب پر پڑتا ہو - لے تاوان اور پھر سالانہ (مال بمعاوضۂ امن) کہا جاتا ہے -

ششم عہدوں اور القاب و خطابوں کی فروخت کی آمدنی -

پہلے یورپ کی سلطنتوں میں اور یوپ کی گورنمنٹ میں دستور تھا کہ سرکار کی طرف سے ہر عہدہ و خطاب و لقب کی قیمت معین ہوتی تھی - جب یہ قیمت خزانۂ شاہی میں داخل ہوتی تھی تو وہ عہدہ اور خطاب ملتا تھا - سلاطین ہند بھی عہدوں و خطابوں کے لیئے ایک نذرانہ لیا کرتے تھے - اب یہ طریقہ معدوم ہونے کے قریب ہوگیا ہو

ہفتم بادشاہ کی ذاتی جائدادوں و جاگیروں کی آمدنی - یعنی سرکاری زمینوں کی آمدنی -

فی الحال یہ اصول ہو کہ جس شخص کے قبضے میں جو ریاست یا بہت زمین ہوتی ہو وہ اُسکے محاصل سے مستفید ہوتا ہو - ایسی ہی خاص جاگیریں اور زمینیں ہوتی تھیں کہ وہ سرکار کے ساتھ مخصوص ہوتی تھیں - ان کے انتظامات غیر سرکاری زمینوں کے مقابلہ میں بُرے ہوتے تھے اگر یہ سرکاری زمینیں اور لوگوں کے پاس ہوتیں تو انکا محاصل بنسبت سرکار کے چوچند ہوتا - جسقدر سرکاری زمین وسیع ہوتی ہو اسی قدر اسکا بندوبست خراب ہوتا ہو - یہ انتظام خواہ کیسا ہی بُرا بھلا ہو وہ سرکار کی آمدنی کا ایک صیغہ ہوتا ہو

ہشتم تجارت اور صنعت گری سے سرکاری آمدنی

تجارت اور سلطنت میں مغایرت ہو - تاجر اچھا بادشاہ اور بادشاہ اچھا تاجر نہیں ہوتا - چنانچہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب تک تجارت اور سلطنت کو شامل رکھا تو تجارت نے اُسکو خراب فرماں روا بنایا - اور فرماں روائی نے بُرا تاجر جب اسنے تجارت سے دست کشی کی تو اچھی طرح فرماں روائی کی - گو یہ امر ہو مگر گورنمنٹ کو تجارت اور صنعت گری سے اتنا فائدہ ہوتا ہو کہ وہ اسے چھوڑتی نہیں - ہندوستان میں افیون کی تجارت سرکار کا ایک بڑا صیغہ آمدنی کا ہو - ہیم برگ کی ریاست میں

سلطنتِ جمہوری کی آمدنی کا بڑا صیغہ پنساری کی دُکان اور شراب کا گودام ہے۔ روس میں شراب مقطر کی تجارت سے سرکار کی بڑی آمدنی ہے۔ مصر میں شکر کے صاف کرنے کی تجارت سے سرکار مالامال ہوتی ہے۔ بنکوں کے قائم کرنے سے سرکار اپنی آمدنی بڑھاتی ہے۔ ہندوستان کے سارے شہروں میں سیونگ بنک ہیں جو گورنمنٹ کی آمدنی کا ایک صیغہ ہے۔ ریل کی سڑکوں کے بنانے کا صیغہ ہے جسکو گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں رکھکر بہت روپیہ حاصل کرتی ہے مگر اسکا ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ کام گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں رکھے یا اوروں کے ہاتھ میں دے۔

نہم اجاروں اور ٹھیکوں کے دینے کی آمدنی۔

اجاروں اور ٹھیکوں کے دینے سے بھی سرکار کو بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ گو زمانۂ حال کا اقتضا یہ ہے کہ اجاروں کا سررشتہ اُجاڑ ہو جائے مگر وہ سرکار کی جائز آمدنی کا ایک عمدہ صیغہ ہے۔ اجارے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ تجارت کے۔ محنت کے۔ محاصل کے۔ پہلے اور حال کے زمانے کے اجاروں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے زمانے میں گورنمنٹ اپنی آمدنی کے لیئے خاص آدمیوں، یا گروہوں کو اجارے دیتی تھی۔ یہ اجارہ دار مختلف طرح کے وہ کام کرتے تھے جو سوا ان کے اور لوگ بھی کر سکتے تھے اسلیئے ان کے خلاف بہت لوگ جھنجلاتے تھے اور غصے میں آتے تھے اور اُن کو توڑنا چاہتے تھے ملکہ الزبتھ کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی تجارت کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اُس زمانے سے اجاروں کی وسعت کا وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ کوئی چیز ادنےٰ اعلیٰ اجاروں کے ہاتھ سے بچی نہیں یہانتک کہ گوڑا اور چیتھڑوں کے جمع کرنے کا بھی ٹھیکہ دیا گیا۔ یہ اجارے اور ٹھیکے تجارت میں خلل ڈالتے تھے اسلیئے اجاروں کو تجارت لائین نکالتی گئی۔ اب مہذب قوموں میں افیون۔ نمک۔ تمباکو۔ دیاسلائیوں کے اجارے اور ٹھیکے باقی رہ گئے ہیں۔

دہم لاٹری (چٹھی ڈالنا) سے سرکاری آمدنی۔

پہلے زمانے میں مہذب ملکوں میں بجٹوں یعنی آمدوخرچ کے حسابوں میں لاٹریوں کی آمدنیاں داخل ہوتی تھیں۔ اس سرکاری آمدنی کا اثر جو اخلاق اور تمدن پر ہوتا تھا اُسپر مباحثہ کرنے کا یہ مقام نہیں ہے۔ گو یہ لاٹریاں بڑی آمدنی کی مدیں تھیں مگر وہ محنت شعاری کی آمدنیوں میں مخل ہوتی تھیں۔ محنت کی بجاے بخت و اتفاق کا سبق پڑھاتی تھیں اسلیئے اب فقط انکا رواج مذہبی اور رفاہ خلائق کے کاموں میں زیادہ تر ہوتا ہے اور باقی اور صورتوں میں کمتر۔

یازدہم فیس کی آمدنی۔

فیس اُس خدمت کا معاوضہ ہوتا ہے، جو سرکار فیس دینے والے کی کرتی ہے اور جسکے کرنے میں اُسکا خرچ ہوتا ہے۔ مگر اس خرچ کرنے کے بعد فیس میں سے فاضل رہتا ہے وہی سرکار کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس فاضلات کی نسبت بہت کچھ گفتگوئیں ہوتی ہیں کہ وہ کس کام میں آنی چاہیئے سینٹ پال کا مقولہ ہے کہ جو شخص اپنے پاس سے خرچ اُٹھا کر لڑنے جاتا ہے وہ اہلِ مقدمہ ہوتا ہے، جو نا انصافی پر جنگ کرنے جاتا ہے۔ دیوانی عدالتوں میں فیس دینے والوں کو دیکھ لو کہ یہ مقولہ اُنپر صادق آتا ہے۔ علاوہ اِن آمدنیوں کے محصولوں کی اور کاغذی سکوں کے چلانے کی بھی سرکار کو آمدنیاں ہوتی ہیں۔ کورٹ فیس اور اسٹامپ کی بڑی آمدنی سرکار کو ہوتی ہے۔

دوازدہم ٹیکس کی آمدنی۔

ٹیکس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک زمین کا لگان۔ دوم دولت۔ سوم آمدنی۔ چہارم قابلیت۔ گورنمنٹ کی آمدنی کے دو بڑے صیغے ہیں۔ ایک زمین کی مالگذاری دوم ٹیکس۔ ان دونوں کے باب میں جدا جدا

بسوط مضمون لکھے جائینگے جن سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ زمین سے کس کس طرح سے پہلے محاصل وصول ہوتے تھے اور اب کسطرح سے ہوتے ہیں اور پہلے کس طرح سے ٹیکس لگتی تھیں اور اب کس طرح سے لگتی ہیں۔
اب ہم اخراجات سرکار شاہی کا بیان کرتے ہیں۔

(۱) محافظت کا خرچ۔

پادشاہ کا اول فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کو اپنی رعایا کو غیر ملکوں اور غیر قوموں کی حملہ آوری اور ایذا رسانی سے بچائے۔ یہ بچانا صرف سپاہ کے زور اور لشکر کی قوت سے ہوسکتا ہے۔ اس سپاہ کے زور اور لشکر کی قوت پیدا کرنے کے لئے خرچ کی ضرورت ہے۔ خواہ امن امان کا وقت ہو، یا میدان جنگ میں فوج سے کام لینے کا زمانہ ہو۔ اب خرچ کی ضرورت انسان کی تمدن اور معاشرت کی حالت کے مناسب ہوتی ہے۔ ادنے حالت انسان کے تمدن کی شکاری ہوتا ہے اس میں ہر شکاری آدمی سپاہی بھی شکار پکڑنا اور لڑنا دونوں کام اسکے نزدیک برابر ہوتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں اُسکو اپنے گذارے کا سامان خود کرنا پڑتا ہے نہ ان میں کوئی بادشاہ ہوتا ہے نہ ان میں سلطنت جمہوری ہوتی ہے پس جب ان میں ایک فرقہ کو دوسرا فرقہ ستاتا ہے تو انتقام لینے کے لئے آپس میں لڑائی ہوتی ہے۔ ان میں نہ ایسی جنگ کی حالت میں نہ امن کے وقت میں سپاہ کے تیار رکھنے میں خرچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اس تمدن میں محافظت کا خرچ صفر ہوتا ہے۔ شکاری تمدن کے آگے چوپانی، یا شبانی تمدن ہے، جو پہلی حالت سے بہت بہتر ہے۔ چوپانی قومیں چوپایوں اور مویشی کے چرواہی ہوتی ہیں جیسے کہ اہل عرب و اہل تاتار کی بعض قومیں ہیں کہ ان میں ہر ایک آدمی جنگجو سپاہی ہوتا ہے۔ چوپانی قومیں اپنی اقامت و سکونت کے لئے کوئی مستقل و معین مقام نہیں رکھتیں۔ وہ تنبوؤں اور خیموں میں، یا چھتری دار چھکڑوں میں رہتی ہیں، جو ایک مقام سے دوسرے مقام میں آسانی سے آجا سکتے ہیں۔ وہ اپنے مقامات کو سال کے مختلف موسموں کے موافق، یا اور حادثات زمانہ کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ جب ان کی مویشیوں کے گلے اور ریوڑ ملک کے ایک حصے کی چراگاہوں کو کھا پی کر ختم کرتے ہیں تو وہ اپنے چھپرے لیجا کر دوسری جگہ ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ خشک موسموں میں دریاؤں کے کناروں پر رہتے ہیں اور مرطوب موسموں میں اوپر کے حصوں میں چلے جاتے ہیں۔ جب ایسی قومیں میدان جنگ میں لڑنے جاتی ہیں تو لڑنیوالوں کو یہ اعتبار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گلوں اور ریوڑوں کو بوڑھے مردوں اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت میں چھوڑ جائیں۔ یہ بوڑھی عورتیں۔ بچے بھی بغیر اس کے نہیں چھوڑے جا سکتے کہ ان کی محافظت اور کھانے پینے کا سامان کچھ نہو۔ پس یہ قومیں امن وعافیت کے زمانے میں جیسی صحرانوردی کرتی ہیں ویسی ہی میدان جنگ میں جانے کے لئے۔ گو جنگ اور امن کے زمانے میں مقاصد مختلف ہوتے ہیں مگر دونوں حالتوں میں انکا طرز زندگی ایک ہی ہوتا ہے۔ قبیلہ کا قبیلہ لڑنے کو جاتا ہے اور ان میں سے ہر متنفس اپنا کام جتنا اچھی طرح کر سکتا ہے، کرتا ہے۔ تاتاری قوموں میں بارہا میدان جنگ میں عورتوں نے بہادرانہ کام مردوں کی برابر کیئے ہیں۔ جب ان میں ایک قوم کو فتح ہوتی ہے تو وہ دوسری مغلوب قوم سے جو کچھ اُس کے پاس ہوتا ہے چھین لیتی ہیں اور فقط اس غنیمت ہی کو فتح کا صلہ اور معاوضہ جانتی ہیں۔ مغلوب و مفتوح قوم بالکل کنگلا ہو جاتی ہے اور سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔ صرف ان کے گلے اور ریوڑ ہی دشمن نہیں لے جاتے بلکہ اُن کی جوروؤں بچوں کو بھی پکڑ کر لے جاتے ہیں اور لونڈی غلام بناتے ہیں جو آدمی لڑائی میں مرنے سے بچ جاتے ہیں وہ جنگلوں میں آوارہ گرد ہو جاتے ہیں، یا پیٹ کی خاطر دشمن

کے غلام بنجاتے ہیں۔ روزمرہ اہل تاتار اور اہل عرب دوڑتے ہیں۔ کلائی کرتے ہیں۔ نیزہ پھراتے ہیں۔ کمان کھینچتے ہیں۔ تیر چلاتے ہیں۔ سونٹے بازی کرتی ہیں۔ پٹا کھیلتے ہیں۔ تیغ بازی میں ایسی مشقیں اور ورزشیں کرتے ہیں کہ وہ جید سپاہی ہوجاتے ہیں ان ورزشوں کا کرنا ان کی تفریح طبع میں داخل ہے۔ جب اہل تاتار اور اہل عرب لڑنے جاتے تھے تو وہ اپنے گلوں اور ریوڑوں سے اپنا گذارہ کرتے تھے جنکو وہ ہنگام جنگ میں اپنے ساتھ اسیطرح رکھتے تھے جیساکہ زمانہ عافیت و امن میں۔ انکا سردار جو بمنزلہ بادشاہ کے ہوتا تھا اس لڑائی کے وقت میں اسکا خرچ کچھ زیادہ نہ ہوتا تھا اسکا وظیفہ اور تنخواہ یہی تھی کہ وہ غنیمت کے مال میں سے بڑا حصہ لیتا تھا۔

شکاری قوموں کا گذارہ شکار پر ہوتا تھا اسلیئے انکا لشکر دو ڈھائی سو آدمیوں سے زیادہ جمع نہیں ہوسکتا تھا۔ شبانی قومیں ایک ضلع کے چارے کو ختم کرکے بشرطیکہ کوئی انکا مزاحم و مانع نہو، دوسری ضلع میں جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں مشکل ہے کہ ان کی تعداد کا تعین ہو کہ اُن کے کتنے آدمی ساتھ چل سکتے ہیں اور ان کا لشکر کتنا جمع ہوسکتا ہے۔ اکثر دو ڈھائی ہزار کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ شائستہ قوموں کو شکاری قوموں کی ہمسائگی سے کچھ خوف نہیں ہوتا وہ جب چاہیں ان شکاریوں کا شکار کرلیں۔ مگر شبانی قوموں کی ہمسائگی سے اور ڈانڈا مینڈا ملنے سے وہ بڑے گھبراتی اور ڈرتی ہیں۔ ان شبانی قوموں نے مہذب قوموں کے ملک کے ملک اپنی حملہ آوری سے تباہ و خاک سیاہ کردیئے ہیں۔ جب اہل سیتھیا یعنی تاتاری آپس میں متفق ہوگئے ہیں تو یورپ اور ایشیا دونوں کو ہلا مارا ہے دونوں ملکر بھی انکے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکے۔ اہل عرب میں قبل ز اسلام کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر جب اسلام نے انکو متفق کردیا تو جو انہوں نے دنیا میں اپنے کارنامے دکھائے ہیں، وہ یادگار روزگار تاقیامت رہینگے۔

اب ان دونوں شکاری اور شبانی اقوام سے زیادہ شائستہ اور مہذب، وہ قومیں شمار ہوتی ہیں جو مرزبانی یعنی زراعت کرتی ہیں اور غیر ملکوں کے ساتھ کچھ تجارت بھی کرتی ہیں۔ اور موٹی جھوٹی خانہ ساز صناعت بھی رکھتی ہیں۔ ایسی قومیں سپاہ گری آسانی سے سیکھ جاتی ہیں اور سپاہ اُن میں جلد تیار ہوجاتی ہے۔ ان قوموں کے آدمی اکثر دن کو کھلے میدانوں میں رہتے ہیں اور ہر موسم کی سختی اٹھانے کے وہ عادی ہوجاتے ہیں۔ روزمرہ کی جفاکشی اُن کی لڑائی کی مشقت شاقہ اٹھانے کو تفریح طبع بنا دیتی ہے۔ زراعت کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ وہ جنگ کے کاموں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ کھیتی میں جیسا کہ بیلداری کا کام کرنا پڑتا ہے ایسا ہی لڑائی میں مورچوں کے بنانے میں، خیموں کے ایستادہ کرنے میں، ان کے گرد خندق بنانے میں۔ کاشتکاروں کی تفریحات اور ورزشیں بھی مثل شبانی قوموں کے لڑائی کی تصویر ہوتی ہیں۔ لیکن شبانی قوموں کی نسبت کاشتکاروں کو فرصت کم ملتی ہے۔ اس لیئے کاشتکار گو سپاہی ہوتے ہیں مگر سپہگری میں پکّے نہیں ہوتے۔ پادشاہ کو ان کے سپاہی بنانے میں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔

کاشتکاروں کا مقام سکونت معین ہوتا ہے وہ ترک مسکن بغیر نقصان اٹھائے نہیں کرسکتے۔ اس لیئے کل کاشتکار لڑنے نہیں جاسکتے۔ ان میں جن آدمیوں کی عمریں میدان جنگ میں لڑنے کے قابل ہوتی ہیں وہ لڑنے جاتے ہیں۔ ہر قوم

ہیں اُن آدمیوں کی تعداد جو میدانِ جنگ میں جاسکتے ہیں، اُن کی کل تعداد کے پانچویں، یا چھٹے حصّے کی برابر ہوسکتی ہے۔ تخم ریزی اور درو کاشت کے درمیان جو وقت ہوتا ہے اُس میں کاشتکار شریکِ جنگ بغیر کسی نقصان کے ہوسکتے ہیں۔ ایسے وقت میں کھڑی کھیتی کو عورتیں بچے بوڑھے سنبھال لیتے ہیں اسلیئے وہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جانے کو بسر و چشم قبول کرلیتے ہیں۔ اس حالت میں سرکارِ شاہی، یا سلطنتِ جمہوری کو اسقدر اُنکو دینا پڑتا ہے کہ وہ جنگ میں جانے کے لیئے اپنا سامان تیار کرلیں اور جب تک لڑائی میں ہیں، اپنی پوشاک و خوراک کا خرچ اُٹھالیں۔ یونان اور روم میں یہ طریقہ مدت تک جاری رہا کہ کاشتکاروں کا لشکر بھرتی کرکے میدانِ جنگ میں لیجاکر لڑاتے تھے۔ یورپ میں بھی اس کی تقلید کی گئی جب فیوڈل سسٹم (جاگیری نظام) جاری ہوا یعنی اُمرا کو جاگیریں دیدی گئیں کہ اسکے معاوضہ میں امرا بادشاہ کی خدمت سپاہ سے لڑائی کیوقت کیا کریں۔ اور سپاہ کا سارا خرچ اپنے پاس سے اُٹھایا کریں اور بادشاہ سے کچھ تنخواہ، یا وظیفہ نہ مانگا کریں، تو کاشتکاروں کی سپاہ میدانِ جنگ میں کام کرتی تھی۔

جب قوموں میں اعلیٰ درجے کی شایستگی اور تہذیب پھیلجاتی ہے تو یہ بات بالکل مشکل ہوجاتی ہے کہ کوئی شخص میدانِ جنگ میں جائے اور اپنی گرہ سے اپنا خرچ اُٹھائے۔ اِسکی دو وجہ ہیں اوّل صنعت کاری۔ دُوم فنِ جنگ کی ترقی۔

ایک کاشتکار تخم ریزی اور درَو کے درمیان جنگ کے کاموں میں لگایا جاسکتا ہے اور اس سے اسکی آمدنی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ گو وہ خود محنت نہیں کرتا مگر اسکا کام جو باقی رہتا ہے اسکو نیچر پورا کردیتی ہے لیکن جسوقت کوئی صنعت گر۔ لُہار۔ بڑھئی جولاہا وغیرہ اپنے کام کو چھوڑتا ہے۔ تو اس کی آمدنی کا صیغہ بالکل بند ہوجاتا ہے۔ اسکا کام نیچر نہیں سرانجام دیتی۔ اسکو اپنا کام آپ سارا کرنا پڑتا ہے۔ پس جب وہ میدانِ جنگ میں جاتا ہے اور جمہور کی حمایت کرتا ہے اور اپنی آمدنی اپنی خوراک و پوشاک کے لیئے نہیں کھتا ہے تو جمہور پر واجب ہے کہ اُسکی خدمت کا ایسا معاوضہ دیں کہ اُسکے مصارفِ ضروریہ کے لیئے کافی ہو۔ پس جس ملک کے بہت سے باشندے دستکار اور صنعت کار جماعتوں میں سے میدانِ جنگ میں جائیں تو اُن کے گزارے کے لیئے اثنائے جنگ میں خرچ دینا چاہیئے۔

جب فنِ جنگ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی تو اُسکو کام پہلی طرح آسان نہیں رہے کہ ہر شکاری و چوپان و شبان و کاشتکار اُنکو کرنے لگے۔ نہ جنگ کا رنگ ڈھنگ یہ رہا کہ اِدھر شروع ہوئی اُدھر ختم ہوئی۔ لشکرکشیاں اور معرکہ آرائیاں برسوں میں ختم ہونے لگیں۔ اور کئی کئی دفعہ کے لڑنے سے معرکۂ رزم کا فیصلہ ہونے لگا اب علی العموم یہ ضرور ہوگیا کہ سپاہ کا ایک خاص گروہ مرتب کیا جائے جسکا ہر یک آدمی نرا سپاہی ہو اور کچھ اَور نہو۔ وہ جمہور کی محافظت کرے اور جمہور اُس کی محافظت کے معاوضے میں خرچ کریں۔ پس اس طرح پادشاہ کے سر پر بہت سا خرچ آن پڑا کہ امن کے زمانے میں سپاہ کو تیار کرے اور جنگ کے وقت میدانِ جنگ میں لے جائے۔ میدانِ جنگ میں جب سپاہ جاتی ہے تو اُسکو بہت جفاکشی کرنی پڑتی ہے اور زیادہ خرچ اُٹھانا پڑتا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں نے ایک اور طریقہ اُجورہ دار سپاہ کا جاری کیا تھا کہ جس میں سپاہی بنانے کا خرچ سرکارِ شاہی کے ذمّے نہیں پڑتا تھا۔ مگر جب یہ سپاہ میدانِ جنگ میں قدم اُٹھاتی تو جتنی مدت تک اُس میں مصروف رہتی کہ اسکی تنخواہ اُسکو دی جاتی۔ مگر یہ اجورہ دار سپاہ نوکر سپاہ کی برابر میدانِ جنگ میں جان لڑاکر نہیں لڑتی تھی اسلیئے اب اس اجورہ دار

سپاہ کا طریقہ موقوف ہوگیا

ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی ایامِ جنگ میں مرہٹوں کو اجورہ دار سپاہ کے طور پر نوکر رکھا تھا، جو اسکا نتیجہ ہوا وہ تاریخ میں لکھا ہے۔

میدانِ جنگ میں جانے والے آدمیوں کی تعداد کُل آدمیوں کی تعداد سے جو نسبت رکھتی ہے وہ وحشی قوموں میں بہت زیادہ مہذب قوموں سے ہوتی ہے۔ شائستہ قوموں میں فوجوں کا خرچ اُن آدمیوں کی محنت سے اُٹھتا ہے، جو سپاہی نہیں ہوتے۔ ان میں سپاہیوں کی تعداد محنتیوں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یورپ میں کُل آبادی کے سویں حصے سے زیادہ آدمی سپاہ میں نہیں بھرتی ہوتے۔ اگر اس سے زیادہ سپاہ میں بھرتی ہوں تو پھر ملک سپاہ کے خرچ سے زیربار ہوکر برباد ہو جائے۔ یونانیوں اور رومیوں کی جمہوری سلطنتوں میں ہر شہری آدمی پر فنِ سپہ گری کا سیکھنا لازمی تھا۔ وہ اس فن کو سرکاری جنگی اکھاڑوں میں جاکر اُستادوں سے سیکھتا تھا اور سبق کی بڑی مشق کرتا تھا۔ مگر ایک زمانے کے بعد اس فنِ سپہ گری کی تعلیم میں ایسی سُستی آگئی کہ فوج کا خرچ سلطنت کے ذمے آن پڑا۔ فنِ سپہ گری کو سب فنوں پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ روز بروز دقیق اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ سلطنت پر واجب ہوگیا ہے کہ وہ آدمیوں کا ایک فریق جُدا بنائے اور اُسکو فنِ سپہ گری سکھائے اور اسکا سارا خرچ خود اُٹھائے۔ فنونِ زراعت اور صناعت میں بھی ایسی ترقیاں ہوتی جاتی ہیں کہ اہلِ زراعت اور اہلِ صناعت کو اس سے فرصت و فراغت نصیب نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنا وقت فنِ سپہ گری کی تحصیل میں صرف کریں اُنکو اپنے ہی کام سے دم بھر کی مہلت نہیں ملتی۔ اس لیے ضرور ہوگیا ہے کہ خاص آدمیوں کو جُدا ہی فنونِ جنگ کی تعلیم دی جائے کہ وہ اپنا سارا وقت اسی میں صرف کیا کریں اور انکا خرچ وہ لوگ اُٹھائیں جن کی محافظت کے لیے وہ اِن فنون کو سیکھتے ہیں۔

جب تک اسلحۂ آتشی ایجاد نہ ہوئے تھے تو سپاہی جسمانی قُویٰ بڑے زبردست رکھتے تھے چُستی چالاکی میں آفت ہوتے تھے۔ اسلحہ بازی سے خوب ماہر ہوتے تھے۔ ان کی یہی باتیں لڑائیوں کا فیصلہ کیا کرتی تھیں لیکن جب سے کہ اسلحۂ آتشی کا اختراع ہوا ہے اور اُن میں روز بروز ترقی نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے تب سے جسمانی قُویٰ اور چستی چالاکی۔ پھُرتی اور تیزی کی ضرورت نہیں ہے جو پہلے ہتیاروں کے چلانے کے لیے درکار ہوتی تھی۔ مگر دلیری اور شجاعت کی حاجت سپاہی میں جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے۔ زمانۂ حال میں سپاہ کے اوصافِ عظیمہ یہ سمجھے جاتے ہیں کہ اسکو قواعد خوب آتی ہو، اُسکی تربیت و تعلیم اچھی ہو۔ احکام کی اطاعت نہایت مستعدی کے ساتھ کرتی ہو۔ ان ہی باتوں پر اس زمانے کی لڑائیوں کا فیصلہ زیادہ تر منحصر ہے۔ پہلے زمانے کی طرح ہتیاروں کے چلانے میں پہلوانی اور گاؤزوری کی ضرورت زیادہ نہیں ہے۔ زمانۂ سابق میں میدانِ رزم میں اسلحۂ آتشی کی طرح ہتیاروں میں آوازیں نہ تھیں۔ لڑائی کے وقت تلواروں کی شپاشپ تیروں کی سناسن۔ آدمیوں کا غُل غپاڑہ ہوتا تھا۔ یہ بندوقوں کی پٹاپٹ اور توپوں کی دَنادَن اور دُھوا دُھوں کہاں تھی۔ پہلے دشمن سامنے ہوتا تھا اور اُس کے ہتیار نظر آتے تھے۔ جب وہ پاس آتا اور دو دو ہاتھ ہوتے تھے، تو کوئی مجروح، یا مقتول ہوتا تھا اب کا حال یہ تھا کہ دُھوئیں میں دشمن نظر نہیں آتا۔ ہتیار دکھائی نہیں دیتے۔ مگر اُن کے گولے گولیاں سٹاپٹ آتی ہیں جسم کے پار جاتی ہیں، کسی کو مارتی ہیں، کسی کو زخمی بناتی ہیں۔ اُن کی زد سے بچنے میں نہ کوئی سپہ گری کا ہنر کام میں آتا ہے، نہ شجاعت کچھ کام کرتی ہے۔ پھُرتی

گدکا بنیٹی و بکیتی و بنوٹ نباشد۔ پہلے زمانے کی لڑائیوں میں جسمانی قوت و پھرتی ہتیاروں کی زد سے بچنے میں بہت کام آتی تھی مگر اب وہ کچھ کام نہیں کرتی۔ مگر اس سے یہ سمجھنا غلط ہی کہ سپاہی کے لیئے شجاعت و دلیری کی ضرورت نہیں ہی۔ مرد اور نامرد دونوں برابر ہیں جب سر پر آگ برس ہی ہو تو اس میں ثابت قدم رہنے کے لیئے ایسی ہی ہمت و شجاعت کی ضرورت ہی جو تلواروں کی آنچ میں کام آتی تھی۔ بس پادشاہ کی اس مطلب براری میں کہ اپنے ملک کو غیر ملکوں کے حملے سے بچائے اور ملک کے اندر ایسے دنگے فساد اور ہنگامی نہ برپا ہونے دے جن سے سلطنت کی بیخیں ہلجائیں محافظت کا خرچ بہت زیادہ ہوتا چلا جاتا ہی۔ اوپر کے بیانوں سے ظاہر ہوتا ہی کہ جس قدر تہذیب اور شایستگی اور تمدن کی ترقی ہوتی جاتی ہی اُسیقدر سپاہ کا خرچ بڑھتا جاتا ہی۔ صلح و امن کے وقت میں پادشاہ پر واجب ہی کہ قواعد داں جنگی سپاہ رکھے۔ اسکے ہتیاروں اور دیگر اسباب جنگ میں روپیہ بہت خرچ ہوتا ہی۔ اس زمانے کے ہتیار پہلے ہتیاروں سے بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ تلوار و بھالے و نیزے و خنجر و تیر و کمان سے بندوق تمنچے رفل ریوالور کہیں زیادہ گراں قیمت ہوتے ہیں۔ قلعہ شکن توپیں اور غبارے پہلے منجنیق اور سنگ انداز اور فلاخن سے زیادہ بیش بہا ہوتی ہیں۔ باروت کا خرچ ایسا ہوتا ہی کہ اس میں بہت سی دولت کو آگ لگ جاتی ہی۔ پہلے لڑائیوں میں جو تیر و نیزے پھینکے جاتے تھے، وہ تھوڑی دیر میں پھر جمع ہو جاتے تھے۔ مگر باروت پھنک کر ایسی اڑ جاتی ہی کہ پھر ہاتھ نہیں آتی۔ حال کے توپ خانے وہ بلا کے ہوتے ہیں کہ اگر اُن سے کسی شہر و قلعے کو ایک ہفتے تک بچائیں تو اُسکے خرچ کا ٹھکانا نہیں۔ میدان جنگ میں توپوں کے لیجانیکا بڑا خرچ ہوتا ہی، وہ بھاری بہت

ہوتی ہیں۔ اِن کی باربرداری بڑا زیر بار کرتی ہی۔ کلاں توپوں کے بنانے میں بڑی بڑی صناعتیں خرچ ہوتی ہیں۔ ان کی نشانہ بازی کے حساب لوگارثم سے کچھ کم پیچدار نہیں ہوتے۔ چھوٹے ہتیار بھی جانستانی کلیں ہوتی ہیں۔ اِن کے بنانے میں بڑا صرف ہوتا ہی۔ فنون جنگ کی ترقی اور اسلحۂ آتشی کے اختراع اور باروت کی ایجاد نے محافظت کے خرچوں کو بہت بڑھا دیا ہی مگر ان خرچوں کا معاوضہ یوں ہو جاتا ہی کہ زمانۂ سابق میں بہت سی دولتمند قوموں پر وحشی اور مفلس قومیں حملے کرتی تھیں اور اُن کی دولت لوٹ مار کرلے جاتی تھیں۔ اِن کے ہاتھ سے حفاظت کرنی مشکل تھی۔ مگر اب باروت و توپ و بندوق کے سبب سے ان وحشی قوموں کا مُنہ نہیں کہ وہ مہذب قوموں کی طرف رخ بھی کرسکیں۔ خود مہذب قوموں کے ڈر سے چھپی چھپی پڑی پھرتی ہیں اُن کے ہاتھ سے بچنا اُن کو مشکل ہو گیا ہی۔

اسلحۂ آتشی میں جو صنائع و بدائع ایجاد و اختراع ہوئے ہیں وہ ابتدا ءِ نظر میں مُضر اسلیئے معلوم ہوتے ہیں کہ اُنکا مقصود جانستانی ہوتی ہی مگر نظر غور سے دیکھیئے تو وہ جان بخش و جاں فزا ہوتے ہیں وہ شایستگی و تہذیب کی اشاعت و استقامت کے بڑے مُمد و معاون آلات ہیں۔ انھوں نے محافظت کا ایک سائنس بنایا ہے اور حملہ آوری کا فن مرتب کیا ہی۔ اِدھر اُن کے سبب سے جنگ کا خرچ بھی بڑھ گیا ہی اُدھر لڑنا بھی مشکل ہو گیا ہی سنہ ۱۸۵۳ء سے سنہ ۱۸۶۶ء تک لڑائیوں میں ۱۹۱۳۰۰۰۰۰ پونڈ خرچ ہوا ہی سنہ ۱۸۸۰ء میں یوروپ کے جنگی بجٹ میں لڑائی کا خرچ ۱۱۷ ملین پونڈ سے ۱۶۱ ملین پونڈ تک مندرج ہوا ہی۔ اِن لڑائیوں کے خرچ سے قومی قرض بہت بڑھ گیا ہی سنہ ۱۸۶۵ء اور سنہ ۱۸۷۹ء کے درمیان ۱۶۹۷۸۵۰۰۰ پونڈ قرض ہو گیا ہی جس کا سود چار فیصدی کے حساب سے ۶۷۹۱۴۰۰۰ پونڈ ہوتا ہی۔ یہ بارگران عا

کو سر پر اٹھانا پڑتا ہی۔

(۴) عدالتوں کا خرچ۔

بادشاہ کا دوسرا فرض منصبی یہ ہی کہ اپنی رعایا میں سے کسی آدمی کو ایسا کام نہ کرنے دے، جو دوسری کو مضرت وگزند پہنچائے۔ اور ایسا عدالت کا انتظام کرے کہ کوئی زبردست کسی زیردست کو ستانے نہ پائے کوئی ایک دوسرے پر ظلم وستم نہ کرسکے۔ یہ خرچ بھی محافظت کے خرچ کیطرح تمدن کی ان چار حالتوں کے متناسب ہوتا ہی، جو اوپر بیان کیگئی ہیں شکاری قومیں بھوکی ننگی ہوتی ہیں اُن کے پاس مال نہیں ہوتا۔ اگر اُن کے پاس کچھ مال ہوتا ہی تو دو تین روز کی کمائی سے زیادہ نہیں ہوتا اسلیئے اُن میں حاکم کے مقرر کرنے اور عدالت کے قائم کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی اگر آدمیوں میں مال کچھ بھی نہ ہو تو اُن میں ایک آدمی دوسرے آدمی کو صرف جسمانی گزند پہنچا سکتا ہی یا اسکی عزت خاک میں ملا سکتا ہی جب ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار ڈالے، یا زخمی کرے یا پیٹے یا بدنام کرے، تو بیشک ایک آدمی پر ظلم ہوتا ہی اور اسکو تکلیف اُٹھانی پڑتی ہی مگر دوسرے شخص کو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا مظلوم تکلیف پاتا ہی۔ ظالم کے ہاتھ کچھ نہیں آتا ہی۔ حسد کینہ۔ انتقام ایسے اخلاقی جذبات انسانی ہیں جن کے سبب ایک آدمی دوسرے آدمی کو گزند ومضرت پہنچاتا ہی اور اذیت دیتا اور بے عزت کرتا ہی۔ مگر اکثر آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں ان جذبات کا زور وشور نہیں ہوتا اور جن آدمیوں میں ہوتا بھی ہی وہ بھی مصلحت اندیشی کرتی ہیں اور ایسی حرکات نامناسب سے باز رہتے ہیں اگر ان جذبات کے ظلم روکنے کے لیئے ان میں کوئی سول مجسٹریٹ نہ ہو تو بھی آدمی اپنی سوسائٹی میں خاصی طرح امن وعافیت سے رہ سکتے ہیں مگر

مالداروں کی طمع وبلند نظری۔ مفلسوں کی محنت سے کراہیت اور فوری راحت اور آرام کا شوق اور حصول مسرت کا ذوق ایسے جذبات انسانی ہیں جو دوسرے کے مال پر حملہ کرنے پر آمادہ کردیتے ہیں ان جذبات کا اثر مستقل ہوتا ہی اور وہ بہت آدمیوں پر ہوتا ہی۔ جہاں مال جتنا زیادہ ہوگا وہاں آدمیوں میں اتنی ہی نابرابری زیادہ ہوگی یعنی آدمیوں کے مدارج ومراتب متفاوت ہونگے۔ جہاں ایک مالدار آدمی ہوتا ہی وہاں پانچ سو آدمی غریب مفلس ہوتے ہیں چند آدمیوں کی دولتمندی بہت آدمیوں کا دل اپنے افلاس کے خیال سے دُکھاتی ہی۔ مالداروں کی ثروت غریبوں کے غصے کو بھڑکاتی ہی اور اُن کا حسد، یا محتاجی مالداروں کی ملکیت وقبضہ پر حملہ کراتی ہی۔ ایسی حالت میں صرف سول مجسٹریٹ کی محافظت ہی اُن لوگوں کے لیئے دن عید رات شب برات بناتی ہی جن کی پاس بیش بہا مال واسباب ہی، جسکو انھوں نے خود برسوں کی محنت میں جمع کیا ہی، یا اُن کی متواتر پشتوں کی محنت کا جمع کیا ہوا اُن کو ہاتھ لگا ہی۔ اُن مالداروں کے گرد ہر وقت بہت سے دشمن لگے رہتے ہیں، جنکو نہ وہ جانتے ہیں، نہ جنکو انھوں نے کبھی رنجیدہ اور خفا کیا ہی، نہ جنکو وہ مٹا سکتے ہیں۔ ان کی دستبرد سے مالدار جب ہی بچ سکتے ہیں کہ سول مجسٹریٹ کا قوی ہاتھ انکی سرزنش وچشم نمائی وسزادہی کے لیئے موجود ومستعد ہو۔ پس جہاں مال کثرت سے بیش بہا موجود ہو وہاں سول گورنمنٹ کا قائم ہونا ضرور ہی اور جہاں مال نہو اور اگر کچھ ہو تو اتنا تھوڑا کہ دو تین روز کی کمائی کی برابر وہاں سول گورنمنٹ کی حاجت نہیں۔ پہلے اس سے کہ کوئی شخص گورنمنٹ کے عہدہ، یا کسی تعلق سے ممتاز وسرافراز ہو اُسکو اپنے بہت سے بھائی بندوں پر فوقیت اور عظمت چار سببوں سے

حاصل ہوتی ہے۔

اول سبب ذاتی لیاقت۔

آدمی کی قابلیتیں و لیاقتیں جسمانی، یا دماغی ہوتی ہیں جسمانی لیاقتیں یہ ہیں۔ قوت جسامت۔ پھرتی چالاکی دماغی قابلیتیں۔ دانائی۔ نیکی۔ خردمندی۔ دوراندیشی۔ عدل۔ استقلال۔ طبیعت میں اعتدال۔ تمدن انسانی کا کوئی زمانہ ہو جسمانی لیاقتوں سے بغیر دانائی اور فرزانگی کے بہت تھوڑی حکومت حاصل ہوتی ہے۔ اُس آدمی کو بڑا زبردست جانو، جو دو آدمیوں کو اپنی گاؤزوری سے مغلوب کرکے محکوم بنالے۔ مگر دماغی قوی سے آدمی کو بڑی حکومت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوی جسمانی قوی کی طرح نظر کے روبرو نہیں ہوتے اسلیئے ان کے ماننے میں بہت چون وچرا ہوتی ہے۔ ان قابلیتوں کے لیئے جو نظر سے مخفی ہیں۔ کوئی قاعدہ وقانون نہیں بن سکتا کہ اُس کے موافق آسانی سے اُن لیاقتوں کے موافق مدارج عزت و مراتب عظمت مقرر کیئے جاسکیں۔ ہاں جو قابلیتیں نظر کے روبرو آتی ہیں انکے موافق مراتب ادنےٰ و اعلیٰ کا مقرر کرنا کوئی بات نہیں ہے۔

دوسرا سبب عمر کا بڑا ہونا۔

اگر کسی بوڑھے کی عقل نہ جاتی رہی ہو اور سترا بہترا نہ ہوگیا ہو تو اُسکی عزت اُس جوان سے زیادہ کیجاتی ہے جو دولت اور لیاقت میں اُسکا ہمقدم و ہم پلہ ہو۔ شکاری قوموں میں جیسی کہ شمالی امریکہ میں رہتی ہیں صرف عمر کا بڑا ہونا باعث عزت ہوتا ہے۔ ان کے ہاں بڑی عمر والے کو باپ اور برابر عمر والے کو بھائی اور چھوٹی عمر والے کو بیٹا کہتے ہیں۔ نہایت دولتمند و مہذب قوموں میں ہم حالت آدمیوں میں عمر کے اعتبار سے بزرگی مانی جاتی ہے بشرطیکہ کوئی اور قاعدہ بزرگی دینے کا نہ مقرر کیا گیا ہو بڑے بہن بھائیوں کی بزرگی مانی جاتی ہے۔ بڑا بھائی بمنزلہ باپ کے سمجھا جاتا ہے۔ بڑی بہن ماں۔ یوروپ میں بڑے بیٹے کو باپ کی جائداد غیر منقولہ اور ایسی چیزیں جو تقسیم نہیں ہوسکتیں، وہ پوری پوری اور باپ کے القاب وخطاب دیئے جاتے ہیں۔ عمر ایسی ظاہر چیز ہے کہ اس میں کچھ چون وچرا بھی نہیں ہوسکتی۔

تیسرا سبب دولت۔

تمدن کی ہر حالت میں جس میں آدمیوں کے پاس دولت غیر مساوی ہوتی ہے، دولت ہی سے بزرگی عظمت اور حکومت حاصل ہوتی ہے۔ شکاری قوموں میں آدمیوں کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ سب مفلس ہوتے ہیں۔ اسلیئے سب برابر ہوتے ہیں۔ گو اُن میں ذاتی لیاقتوں اور عمر کا خیال بھی ضعیف ہوتا ہے مگر یہی دو باتیں ہیں کہ ان میں حکومت اور ماتحت ہونے کی بنا قائم کرتے ہیں۔ شبانی حالت میں آدمیوں کے پاس دولت میں بڑی غیر مساوات ہوتی ہے۔ تاتاریوں میں دولت ہی کے سر پر سہرا ہوتا ہے۔ وہی حکومت کا بڑا سبب ہوتی ہے۔ ان میں جس شخص کے پاس ریوڑوں اور گلوں کی افراط ہوتی ہے وہی امیر ہوتا ہے۔ مگر اس کے اردگرد سامانِ تنعم و تعیش کچھ موجود نہیں ہوتا، جس میں وہ اپنی دولت کو خرچ کرکے دولت و عشرت کے مزے اُڑا سکے۔ پس وہ اپنی دولت کو سینکڑوں آدمیوں کی پرورش میں خرچ کرتا ہے اور جن کی پرورش کرتا ہے اُن کو بھی روٹی کپڑے کا سہارا کہیں اور نظر نہیں آتا۔ اسلیئے یہ آدمی میدانِ جنگ میں امیر کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں اور امن کے زمانے میں اس کے انتظام سے خوش رہتے ہیں اور ہر طرح کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس امیر کو وہ اپنا جرنیل اور جج مانتے ہیں۔ شبانی تمدن میں جو دولت سے حکومت حاصل ہوتی ہے وہ نہایت دولتمند و مہذب قوموں میں بھی نہیں حاصل ہوتی۔ اگر مہذب قوموں میں کوئی شخص تاتاری امیر سے اپنی جائداد کی آمدنی

ست زیادہ رکھتا ہوا اور ہزار آدمیوں کی پرورش کرتا ہو
ہم وہ کسی ایک شخص کو کچھ دیتا نہیں جسکا معاوضہ اُس سے
یہ نہ لیتا ہوا اور نہ کوئی اور شخص اُسکو کوئی چیز دیتا ہی جسکا معاوضہ
س سے نہ لیتا ہوا اس لیے اُسکی حکومت سوا رچند
سکے اوسے خدمتگاروں کے کسی اور پر چل نہیں سکتی
ن شبانی قوموں میں جو حاکمی اور محکومی ہوتی ہی وہ کسی
ور تمدن کی حالت میں نہیں ہوتی۔ عرب کا شریف
شیخ اور تاتاریوں کا خان شاہانہ حکومت مطلق رکھتا ہی
مذب قوموں میں دولت کی بہت ضعیف حکمرانی
ہوتی ہی۔

چوتھا سبب۔ شرافتِ نسب۔

کسی شخص کی شرافتِ نسب کے معنی یہ ہیں کہ اُسکے
اندان میں پہلے کوئی شخص صاحبِ دولت اور ذی لیاقت
ہوا ہی۔ کل خاندان قدیمی ہوتے ہیں ان میں پادشاہ اور گدا
کے باپ دادا ایک ہی ہوتے ہیں۔ کسی پادشاہ کے
باپ دادا جتنے پادشاہ ہوئے ہونگے۔ اتنے ہی گدا
کے باپ دادا پادشاہ ہوئے ہونگے۔ کسی خاندان کی
قدیمی شرافت کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں قدیم سے دولت
چلی آتی ہی۔ جو شخص کہ جدید دولت، یا سلطنت حاصل
کرتا ہی اُسکی عزت بہ نسبت قدیمی دولتمند، یا بادشاہ کے
کم ہوتی ہی۔ قدیمی بادشاہوں سے خلقت کو محبت و
مؤانست ہوتی ہی اور جدید بادشاہوں سے نفرت،
ان کو غاصبِ سلطنت سمجھتے ہیں۔ انسان کی طبیعت
کا یہ اقتضا ہی کہ وہ پہلے کی عزت اور پچھلے کی حقارت
کرتا ہی۔ فوج میں دیکھو کہ جس افسر کی ماتحتی میں سپاہی ہمیشہ
رہا ہی، اس کے حکم کی اطاعت کرنی اس کی عادت
میں داخل ہو جاتی ہی اور اُس کو وہ خوشی خوشی بجالاتا ہی۔
لیکن اگر کوئی اسکا افسر برابر یا کمتر درجے کا سپاہی مقرر
ہو جائے، تو وہ اسکی نظروں میں خار ہوگا۔ اُس کی اطاعت
کرنے میں اسکے دل سے شعلے اُٹھینگے اور بدن میں
پتنگے نکلینگے۔

شکاری قوموں میں جیسے کہ دولت میں سب برابر
ہوتے ہیں ایسی ہی حسب نسب میں بھی مساوی ہوتے
ہیں۔ نسب کی نابرابری دولت کی نابرابری سے پیدا
ہوتی ہی۔ اگر دو آدمی ہم لیاقت ہوں یعنی ان کی ساری
لیاقتوں میں مساوات ہو مگر ان میں سے ایک کسی دانشمند
بہادر دولتمند کا بیٹا ہو اور دوسرا اپنی بدنصیبی سے
کسی غریب گھر میں پیدا ہوا ہو، تو پہلے کی عزت بہ نسبت
دوسرے کے زیادہ کیجائیگی۔ دولت کی یہ عادت نہیں
کہ وہ مدتوں تک ایک ہی خاندان میں برابر چلی جائے
اسلیئے کسی قوم میں بہت خاندان ایسے نہیں ہوتے،
جن کی تکریم اور تعظیم اس سبب سے کی جاتی ہو کہ وہ بڑے
نامور اور دولتمند آدمیوں کی اولاد میں سے ہیں۔ شرافت
نسب اور دولت ایسی دو چیزیں ہیں، جو ایک آدمی کو
دوسرے آدمی پر بالادست بناتی ہیں۔ یہی حاکمی اور
محکومی کے بڑے اسباب ہیں۔ شبانی قوموں میں
یہ دونوں باتیں اپنی قوت کو تکمیل کے ساتھ دکھاتی ہیں
غرض یہ چار سبب ہم نے اس سبب سے بیان کیے ہیں
کہ ان سے آدمیوں کے مراتب مدارج متفاوت
ہوتے ہیں، جنکے سبب سے پادشاہ کو عدالتوں کے قائم
کرنیکا خرچ اُٹھانا پڑتا ہی تاکہ دولتمندوں کو غریب آدمیوں
کے ہاتھ سے بچائے اور غریبوں کو امیروں کے جور و جفا
سے۔ سول گورنمنٹ میں حاکمانہ عدالتوں کے حکموں
سے محافظت کرنے میں پادشاہ کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔
یہ عدالتیں اپنے لیے آپ ہی خرچ نکال لیتی ہیں۔ کچہریوں کی
منشی کنوئیں میں لگ جاتی ہی۔ وہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں
پادشاہ کی آمدنی کا صیغہ رہتی ہیں۔ جب کوئی مستغیث
استغاثہ پیش کرتا ہی تو اُسکو عدالت کی نذر کچھ نہ کچھ کرنا
پڑتا ہی۔ انصاف کے قدیم طریقوں کے اور انصاف
کرنیکی اُجرتوں کے بیان کرنیکی اس مختصر میں گنجایش

سلطنت کی آمد وخرچ کی مدیں

نہیں۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کبھی عدالتوں کا انتظام ایسا نہیں ہوا کہ اہل مقدمہ کو عدالت کی اُجرت نہ دینی پڑی ہو اور انصاف مفت ہوا ہو۔ پہلے مستغیثوں کو پادشاہ کو نذرانے دینے پڑتے تھے۔ اُسی نذرانے کے موافق انصاف ہوتا تھا۔ اگر نذرانہ معقول نہ ہوتا تھا، تو انصاف بھی نامعقول ہوتا تھا۔ مجرموں سے جرمانے کا ڈنڈ لیا جاتا تھا۔ اب بھی دیکھ لو کہ نالشوں میں اسٹامپ کی قیمت میں اور وکیلوں کے محنتانے میں کتنا روپیہ دینا پڑتا ہے اور کتنی فیس دینی پڑتی ہے۔ چونکہ عدالتوں کی آمدنی میں پادشاہ حصہ دار ہوتا ہے اسلیئے عدالتوں کے لیے کل قوانین ایسے بنائے جاتے ہیں جن سے عدالت کی آمدنی کی افزایش زیادہ ہو۔ اس آمدنی میں سے ججوں کی اور اہل عملہ کی تنخواہیں دی جاتی ہیں اور اس خرچ کے بعد خزانہ شاہی میں بھی کچھ روپیہ داخل ہوتا ہے۔ ایشیائی عدالتوں میں انصاف کرانے کی اُجرتیں ایسی بڑی نہیں دینی پڑتیں جیسی کہ یورپ کی عدالتوں میں۔ ان عدالتوں کے خرچوں کی وجہ سے اور مدتوں میں فیصلہ ہونے کے سبب سے بہت لوگ ایسے عاجز ہوتے ہیں کہ وہ مقدمات کا فیصلہ پنچایت و ثالثی میں کرانے کو عدالت میں دائر کرنے کی نسبت اچھا جانتے ہیں۔

(۳) پبلک ورکس کے اخراجات یعنی رفاہِ عام کی عمارات کا خرچ۔

پادشاہ یا سلطنت جمہوری کا تیسرا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ پبلک ورکس قائم کرکے اُنکی خبرگیری کرے۔ گو ان سے اعلیٰ درجے کا فائدہ ایک جم غفیر کو پہنچتا ہے مگر ان میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ ان کے نفع سے کسی خاص شخص یا کسی خاص گروہ کو نہیں وصول ہو سکتا اسلیئے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ انکو کوئی خاص شخص، یا گروہ قائم کرے اور ان کی خبر رکھے۔ پس ان کا بنانا اور ان کی خبرگیری کرنا پادشاہی کام ہے۔

اب یہ پبلک ورکس مختلف طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو محافظت کے انتظام کے لیئے بنائے جاتے ہیں جیسے کہ قلعے اور فصیلیں وغیرہ۔ دوسرے تجارت کی سہولت کے لیئے جیسے کہ سڑکیں۔ پُل۔ ریل کی سڑکیں۔ نہریں جن میں کشتیاں اور جہاز چلیں۔ بندرگاہ۔ ان میں جو گورنمنٹ روپیہ خرچ کرتی ہے اُس کے وصول کرنیکے لئے محصول گھر بناتی ہے۔ اور ان میں ان لوگوں سے جو اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں محصول لیتی ہے۔ اس محصول کا بوجھ اُن ہی لوگوں کے سر پر پڑتا ہے، جو پبلک ورکس کو فرسودہ اور شکستہ کرتے ہیں اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ عوام الناس پر وہ نہیں پڑتا۔ یہ کام تو عام تجارت کے لیئے گورنمنٹ کرتی ہے مگر خاص فروغ کے لیئے بھی اُسکو تعمیرات بنانی پڑتی ہیں جب وحشی و نیم وحشی قوموں کے ساتھ مہذب قوموں کی تجارت ہوتی ہے تو تاجروں کے مال و اسباب کی محافظت کے واسطے ان وحشی و نیم وحشی قوموں کے ملکوں میں حصار و قلعے استوار اور اَور مکانات بنانے پڑتے ہیں چنانچہ ہندوستان کی بدعملی اور بدانتظامی کے زمانے میں پرتگیزوں اور فرانسیسیوں اور انگریزوں نے قلعے اور کوٹھیاں و حصار بنائے۔ اگر بعض سلطنتیں اپنے ملک میں ان عمارات کی مزاحم و مانع ہو کر نہیں بننے دیتیں تو وہاں سفیر و وکیل و کونسل رکھنی پڑتی ہے تاکہ تجارت کے باب میں امورِ متنازع فیہ کا فیصلہ اُن کی مدد سے ہو جایا کرے۔ ایسے کاموں میں جو گورنمنٹ کا خرچ ہوتا ہے اُسکو اسباب تجارت پر فیصدی محصول لگاکے وہ وصول کرلیتی ہے۔ تجارت کی آسانی کے لیئے ٹکسالیں بنانی ہیں مگر ان کا خرچ ان ہی سے نکال لیتی ہے۔ ایسے ہی پوسٹ آفس ہے کہ گورنمنٹ سے اپنا خرچ اُٹھواتا ہے مگر پھر اُسکو مع سود واپس کر دیتا ہے۔

(۴) تعلیمات۔

تعلیمات بھی گورنمنٹ کے خرچ کی ایک مد ہے۔ یہ

تعلیمات کئی طرح کی ہوتی ہیں- ایک خاص غریبوں مفلسوں کے بچوں کے لیئے- دوسرے علی العموم سب کے بچوں کے لیئے- سوم سب عمر کے آدمیوں کے لیئے- مفلسی کے مٹانے کے لیے عمدہ تدبیر یہ ہو کہ مفلسوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کیجائے- اس سے مفلسوں کی بڑی ترقی ہوتی ہو- افلاس جرائم اور مصائب کی جڑ ہو- اس بات کو سب مانتے ہیں کہ جہالت جرائم کی مادر مہربان ہو اور وہ افلاس کو پال کر بڑا کرتی ہو اسلیئے یہ امر تسلیم کیا گیا ہو کہ گورنمنٹ کا یہ فرض منصبی ہو کہ وہ سررشتہ تعلیم کی نردبان ایسی کھڑی کرے، جس کی پہلی سیڑھی ابتدائی تعلیم پر چڑھکر متوسط تعلیم کی سیڑھی پر اور اس سیڑھی سے اعلیٰ درجے کی تعلیم کی سیڑھی پر بآسانی رعایا چڑھ جائے مگر ابھی اس امر کا فیصلہ کرنا باقی ہو کہ تعلیم میں جو کچھ خرچ ہو اسکا کونسا حصّہ گورنمنٹ کے ذمّہ ہو اور کونسا حصّہ رعایا کے ذمّہ- سررشتۂ تعلیم کا قائم کرنا سخت دشوار کام ہو اور اُس کے قائم کرنے کا کوئی طریقہ ابتک ایسا نہیں مقرر ہوا جس پر سخت اعتراض نہ ہوتے ہوں- ابتک کہیں یہ سررشتہ اسطرح نہیں قائم ہوا کہ وہ اپنا خرچ آپ اُٹھائے اور گورنمنٹ کا خرچ کچھ نہ کرائے-

(ذکاءاللہ)

ہلال ورتارا

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے رسالوں کتابوں وغیرہ پر ہلال ورتارا بنا ہوتا ہو لیکن ہمارے ذہن میں نہیں آتا کہ اسمیں خوبی کیا ہو اور کیوں بنایا جاتا ہو- اگرچہ ہلال ورتارے کی شکل میں ایسی موزونیت ضرور ہو جس کی وجہ سے اُس کے بنانے کو ایک خوبصورتی سمجھا جاتا ہو جیسا کہ اُن زیورات کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہو جو انگریزی دُکانوں پر فروخت ہوتے ہیں

مثلاً مسرس مارکس کمپنی لمٹنڈ- مسرس ہملٹن کمپنی لمٹنڈ وغیرہ- لیکن تاہم اس میں ایسی خوبصورتی نہیں ہو کہ اُسکے بنانے کے بغیر کام ہی نہ چلتا ہو- چند سال ہوئے- ایک ایسے اخبار کے اڈیٹر سے جس کی پیشانی پر ہلال اور تارا بنتا تھا اور اب وہ اخبار بند ہوگیا ہو ہم نے کہا کہ یہ فضول نشان تم کیوں بناتے ہو اُس نے جواب دیا کہ یہ علامت فریمیسن لاج کی ہو اور میں (اڈیٹر نے کہا) فریمیسن ہوں- ایک اور شخص نے ہمارے اسی سوال پر جواب دیا کہ ریاستِ حیدرآباد سے اپنا توسّل ظاہر کرنیکے واسطے میں نے یہ نشان اختیار کیا ہو بعض کی زبانی ہم نے سُنا ہو کہ ہلال علامت اسلام کی ہو اور اُس کے ثبوت میں اُس علامت کو بیان کرتے ہیں جو لندن کے بعض سرکاری مقاموں پر اُسوقت اختیار کی گئی تھی جبکہ سلطان مرحوم عبدالعزیز خان لندن تشریف لیگئے تھے یعنی اُسوقت میں ہلال اور صلیب کو ایک جگہ کر کے بنایا گیا تھا اور گویا یہ دکھایا گیا تھا کہ مسلمان اور عیسائی بادشاہوں میں ارتباط ہو- خیر یہ جو کچھ ہو مگر چونکہ سلطنت ٹرکی نے اُسکو اپنی سلطنت کا نشان قرار دیا ہو اس سبب سے ہماری رائے میں مسلمانانِ ہند کا اس علامت کو اپنی کتابوں وغیرہ کا سرنامہ قرار دینا (گو کہ اس سبب سے نہو کہ یہ ٹرکی سلطنت کا نشان ہو) ضرور ایک فضول بات اور غلطی ہو-

ہم کو اپنے ہم مذہب بھائیوں کے روبرو اس امر کا بیان کرنا ضرور نہیں ہو کیونکہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ دنیوی مصلحتوں اور دینی احکام کا (دونوں کے دونوں کا) ماحصل یہ ہو کہ اپنے حاکم اور بادشاہ کے ساتھ نہایت درجے کی اطاعت اور فرماں برداری کا تعلق رکھا جائے جو مسلمان سلطان کی رعیت ہیں بلاشبہ اُن کو اُس بادشاہ کی اطاعت کرنی چاہیئے لیکن جو مسلمان دیار کے ملک میں ہیں اُنکو زار کی اور جو مسلمان کہ فرانس

کی کالونیوں میں ہیں اُنکو فرانس کی ریپلک گورنمنٹ کی اور جو مسلمان حضور قیصرۂ ہند دام سلطنتہا کے ملک میں ہیں اُنکو حضور ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی فرمانبرداری اور اطاعت اُسی طرح صادقانہ کرنی چاہیئے جسطرح سلطان ٹرکی کے ملک کے باشندوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ نہ ہوں سلطان ٹرکی کی اطاعت صادقانہ طور سے کرنی لازم اور قطعی لازم ہے۔

اس موقع پر اور مثل اسکے عام مواقع پر یہ امر ضرور خیال رکھنے کے لائق ہے کہ مافی الضمیر اور دل کے مخفی جذبات سے صرف عالم الغیب واقف ہوتا ہے انسان کا کام ظاہری امور پر حکم لگانے کا ہے۔ پس جب یہ ضرور ہے کہ اگر ہمکو کسی سے محبت ہے تو اُسکی محبت کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ محبوب کو بھی ہماری محبت کا علم ہو اسیطرح ہمکو یہ بھی لازم ہے کہ جس بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہوں اُس کی فرمانبرداری اور اطاعت و نیازمندی کا خیال نہ صرف دل میں رکھیں بلکہ ہمکو اپنے اعمال اور افعال سے ثابت کرنا چاہیئے کہ ہم اُس کے فرمان پذیر اور اُس کی رضامندی کے خواہاں اور جویاں ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کی بنا پر ہلال و ستارے کے نشان سے ہمکو علانیہ بھی جُدا رہنا چاہیئے۔

ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ اخباروں میں اسپر مضامین لکھے گئے ہیں کہ سلطان خلیفہ ہیں، یا نہیں اور حسیا دستور ہے کچھ لوگ ایک طرف اور کچھ لوگ دوسری طرف گئے ہیں لیکن ہماری راے میں یہ صرف نزاع لفظی ہے۔ سلطان ٹرکی کو باعتبار لُغت اور اصطلاح کے خواہ خلیفہ کوئی کہے، یا نہ کہے لیکن مذہب اسلام کی رو سے اُنکی اطاعت اور فرمانبرداری اُن مسلمانوں پر جو اُن کی رعیت نہیں ہیں اور جو دوسرے بادشاہ کی رعیت ہیں، ہرگز لازم نہیں ہے۔ مذہب اسلام کی رو سے سلطان ٹرکی صرف اُن مسلمانوں کے دُنیوی بادشاہ ہیں، جو اُنکے ملک میں بہ حیثیت اُن کی رعیت کے رہتے ہیں۔ مگر سلطان دینی سردار اُن مسلمانوں کے بھی از روی مذہب اسلام کے نہیں ہیں، جو خود اُن کے ملک میں رہتے ہیں اور جو اُن کی رعیت ہیں۔ اگر سلطان اپنے ملک کے مسلمانوں کے دینی رہنما ہوتے تو شیخ الاسلام کے عہدے کی ضرورت کیا تھی، جو خود اُن کے ہاں موجود ہے اور سلطان کا رتبہ اپنے ملک میں چاہے کچھ ہی ہو، ملک کے باہر اُنکا رتبہ ایک مسلمان ہونے سے زائد نہیں ہے۔ اُن مسلمانوں کے نزدیک، جو اُن کے ملک میں نہیں رہتے، جسطرح کروڑوں مسلمان پردۂ دنیا پر آباد ہیں اُسیطرح سلطان ٹرکی بھی ایک مسلمان ہیں یعنی اُن کے کسی حکم کی تعمیل کرنا کسی اُس مسلمان پر، جو اُن کی رعیت نہیں ہے اور جو اُن کے ملک میں نہیں رہتا، ذرہ بھر لازم نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ مذہبی تعلیم کم ہوتی جاتی ہے اور اس کے سبب سے اصلی مذہب کی واقفیت تو گھٹتی جاتی ہے اور اُسکی جگہ جاہلوں، یا کٹھ ملّوں، یا چند کوڑھ مغز عالموں کے خیالات اور بیانات دین سمجھے جانے لگے ہیں دنیوی حکمت عملیاں از روی مذہب اسلام کے ایسی ہیں کہ اُن میں اقتضاے وقت پر عمل کرنے کے لیئے انسان مختار اور مجاز سمجھا گیا ہے یعنی دنیوی امور میں از روے مذہب مقدس اسلام کے ہر شخص کو اختیار ہے کہ جسطرح مناسب سمجھے ویسا کرے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب مدینہ کو ہجرت کر کے تشریف لیگئے تو وہاں ایک کھجوروں کے باغ میں آپنے ملاحظہ فرمایا کہ نر کھجوروں کا پھول مادہ کھجوروں پر لوگ ڈال رہے ہیں۔ اسکو ملاحظہ فرما کر آپنے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو مناسب ہے۔ لوگوں نے ارشاد کی تعمیل کی مگر اُس سال کھجوریں بالکل پھلیں جسپر آپنے یہ حکیمانہ ارشاد فرمایا اذا امرتکم بشیء من امر دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم

مِنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔
یعنی جب میں کوئی دین کی بات کہوں تو اُسپر عمل کرو۔ اور جب کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو آخر میں بھی آدمی ہوں۔ تم جانو اور تمھارے دنیا کے معاملات جس کے صاف معنی ہیں کہ دنیوی مصلحتیں دینی احکام سے جُدا ہیں۔ لیکن تاہم مذہب اسلام چونکہ ایک حکیمانہ مذہب ہے اسلیئے جو لوگ دنیوی امور میں بھی مذہبی ہدایت حاصل کرنی چاہتے ہیں اُنکے واسطے بھی تشفی دہ فقرات اُس میں موجود ہیں۔ رسول پاک نے ارشاد کیا ہے کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِکَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ یعنی جسطرح کے تم ہوگے ویسی ہی تم پر حکومت کیجائیگی۔ جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ تم حکام اور بادشاہ وقت کو خوش رکھوگے تو وہ تمھاری ساتھ مراعات پیش آئینگے ناخوش رکھوگے تو بدنگہ پکڑے جاؤگے۔ اِن مجمل احکام کے علاوہ مفصّل احکام بھی ہیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ یَاْوِیْ اِلَیْہِ کُلُّ مَظْلُوْمٍ مِّنْ عِبَادِہٖ یعنی بادشاہ سایۂ خدا ہے زمین پر ہر ایک مظلوم اُس کے پاس آکر پناہ لیتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ سلطان کے معنی سلطان ٹرکی نہیں ہیں بلکہ سلطان کے معنی بادشاہ وقت کے ہیں۔ اور اس لفظ کے معنی اسقدر وسیع ہیں کہ پبلک گورنمنٹ کی منتظم جماعت کو بھی سلطان کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ایک حدیث شریف حضرت سلمہ بن یزید الجعفی سے مروی ہے کہ اُنھوں نے جناب رسالتمآب سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر ہمارے حاکم (یہاں حاکم لفظ "اُمیر" کا ترجمہ کیا گیا ہے) ہم سے اپنا حق مانگیں یعنی اپنی اطاعت چاہیں اور ہم کو ہمارا حق نہ دیں یعنی ہمارے ساتھ عدل و انصاف نکریں تو کیا حکم ہے۔ جناب رسالتمآب نے ارشاد کیا کہ (تم اُنکا کہنا سنو اور اُن کی اطاعت کرو۔ اُن کے ذمے اُن کا فرض ہے اور

تمھارے ذمے تمھارا فرض ہے۔) یعنی جناب رسول مقبول نے مسلمانوں کو اپنے حاکموں کی اطاعت کا خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب کے ہوں، یہاں تک حکم دیا ہے کہ حکام بے پروائی اور بے انصافی بھی کریں تب بھی رعیت کا کام یہ ہے کہ وہ اطاعت اور فرمانبرداری کرے۔

اصل عبارت جسکا اوپر ترجمہ کیا گیا یہ ہے سأل سلمۃ بن یزید الجعفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا نبی اللہ أرأیت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقہم ویمنعونا حقنا فما تأمرنا قال اسمعوا واطیعوا فانما علیہم ما حملوا وعلیکم ما حملتم۔

غرض یہ ہے کہ مذکورۂ بالا روایات اور ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ حاکم کی اطاعت کرنا مذہب اسلام کی رو سے لازم ہے۔ اور مذکورۂ بالا روایتوں میں اور مثل اسکی بہت سی روایتیں اور ہیں سب میں ہرگز یہ قید نہیں ہے کہ حاکم مسلمان ہو، یا کون ہو۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ جب مسلمانوں پر بے پروا اور ناانصاف حاکموں کی اطاعت بھی لازم ہو تو ایسے منصف اور راستباز حکام کی جیسے کہ خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہمکو عنایت ہوئے ہیں یعنی انگریز، اُنکی اطاعت بطریق اولےٰ از روی مذہب کے فرض کیوں نہو۔

غرض یہ ہے کہ ہلال و تارے کے نشان کو خواہ وہ کسی وجہ سے اختیار کیا گیا ہو، ترک کردینا اولی ہے تاکہ اُس خلوص اور محبت میں، جو مسلمانوں کو حضور قیصرہ ہند دام ظلہا کی ذات عالی اور اُن کی عادل سلطنت کے ساتھ ہے کچھ شبہہ نہ پیدا ہو اور جیسا کہ ہمارے دلوں میں سلطان ٹرکی سے من حیث السلطنت، یا من حیث المذہب کچھ تعلق نہیں ہے، ویسا ہی ظاہر میں بھی رہنا چاہیے سلطان بادشاہ ہوں، خلیفہ ہوں، یا نہ ہوں، وہ جانیں اور اُنکا ملک جانے۔ ہمارا تو بادشاہ اور سلطان جو کچھ ہے حضور قیصرۂ ہند کی ذات عالی ہے جسطرح ہم اُن کے

اور اُن کے ہم قوم یعنی انگریز حکام کے انصاف اور عدل سے راضی ہیں اسیطرح ہمکو بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ ہم سے راضی رہیں یہی دُنیا کی فلاح ہی اور یہی دین کا حکم ہی۔

(اسمٰعیل)

مذہب - اور علم

ہم اس وسیع مضمون کے متعلق صرف ایک مختصر بات لکھنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کے بیشمار فرقوں میں جن کی تعداد علم طور پر ۷۲ مشہور ہی، ایک فرقہ غسّانیہ گذرا ہی۔ یہ پیرو غسّان بن الکوفی کے ہیں جو غالبًا تیسری چوتھی صدی میں گذرا ہی منجملہ اُن کے عقائد کے ایک عقیدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہی وہ کہتے ہیں کہ خدا نے مجمل طور پر اشیا کو حلال، یا حرام کیا ہی اور مجمل طور پر قرآن میں اوامر اور نواہی موجود ہیں۔ ہمارا یہ کام نہیں کہ اُس اجمال کی توضیح کریں اور توضیح اور تشریح پر ایمان لائیں۔ مثلاً خدا نے مجمل طور پر کہا ہی کہ لحم خنزیر تم پر حرام کیا گیا۔ اور خدا نے حج کعبہ کو فرض کیا ہی۔ اور بکری کو حلال کیا ہی۔ مگر ہم (۱) یقینًا اور علمًا یہ بات وحی اور الہام الٰہی سے نہیں جانتے کہ خوک، یا خنزیر کس جانور کو کہتے ہیں (۲) اور کعبہ ہند میں ہی، یا چین میں، یا عرب میں اور (۳) بکری سے کونسا جانور مراد ہی۔ پس واجب ہی کہ ہمارا اعتقاد بھی اسیطرح اجمالی ہو نہ کہ اُس تفصیل کے ساتھ جیسا عام مسلمانوں کا دستور ہی۔'' اسطور پر کل احکام قرآنی یہانتک کہ نبی اسلام کے تعیّن میں بھی وہ یہی سوال پیدا کرتے ہیں

یہ ایک ایسی بحث ہی جسکا معقول جواب اُس گروہ سے نہیں ہو سکتا جو لفظًا احکام الٰہی کی پیروی کرنی واجب جانتے ہیں اور اُن کے سمجھنے، یا سمجھانے، یا تفسیر و توضیح میں عقل انسانی کو معطل سمجھتے ہیں۔ غسّانیہ کا دعویٰ بالکل منطق اور فلسفہ کے ادلہ پر مبنی ہی جس میں وہ قرآن شریف سے (یا حدیث سے جیسا کہ موقعہ ہو) ایک قدم باہر نہیں جاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جسقدر حکم ہی اُسیقدر عقیدہ ہونا چاہیئے۔ حکم صرف یہ ہی کہ حج اور عمرہ کرو کعبہ کا۔ پس کعبہ کے مقام کا تقرر اور اُسکی حدبندی محض انسانی اور اسیلئے غیر الہامی ایزاد حکم الٰہی میں ہی۔

اسطور پر بالکل ادلہ شرعی کے ساتھ آدمی خنزیر کو غنم اور بنارس کو کعبہ فرض کر سکتا ہی۔

فرقہ غسّانیہ کا جواب کیا ہی

علما اور فقہا اسلام غسّانیہ کا جواب یہی دیسکتے ہیں کہ ''احکام قرآنی اور اوامر دینی اگرچہ یقینی اور واجب العمل ہیں مگر وحی میں یہ امر فرض کر لیا گیا ہی کہ مخاطب (یعنی عام انسان) ایک عقل و تجربہ والا گروہ ہی، ہم اپنے ذاتی علم سے جو علاوہ علم شریعت کے ہی، الفاظ کے معنی۔ چیزوں کی علامات جانتے ہیں اور ہم کو عقل اور علم جو دیا گیا ہی اُسکا فرض ہی کہ احکام کے صحیح معنی سمجھے اور اُن کے اجمال کی معقول تفصیل کرے۔'' یہ جواب، یا قریب قریب اس کے جو تردید فرقہ غسّانیہ کی علما کرینگے (اور اس کی تردید لازمی ہی کیونکہ غسّانیہ کی پیروی میں تو شیرازہ اسلام ایک خیالی اجماع رہجائیگا) اُس سے ہم مفصلہ ذیل نتیجے نکالتے ہیں۔ جو ہمارے نزدیک بالکل صحیح اور جائز طور پر نکالے گئے ہیں۔

(۱) وحی، یا الہام ربانی جبکہ انسانوں کے لیئے نازل ہو، بے معنی چیز ہی جبتک پہلے سے انسانوں میں اُس کے معنی سمجھنے کی قابلیت فرض نکالی جائے۔

(ب) ہر حکم الٰہی جبکہ وہ ہم تک پہنچتا ہی تو اُس میں دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ حکم۔ دوسرے خود ہماری عقل ہی جو بغیر ایسے حکم کے بھی کام کرتی

 فلسفۂ تاریخ پر ایک سرسری نظر

رہتی ہی۔ مگر علم اس کے بغیر عمل نہیں کر سکتا۔

(ج) علم الٰہی کے سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کے لیئے ہمکو لازم ہی کہ جو عقل ہمکو دی گئی ہی (اور جو مطابق نتیجہ (ا) کے موجود ہی) اُس کو استعمال کریں اور تجربے اور مشاہدے سے کافی اور جامع استعداد پیدا کریں کہ احکامِ الٰہی کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں ورنہ اجمالی حکم اور اجمالی عمل اور اجمالی عقیدہ درحقیقت نہ حکم ہی نہ عمل ہی اور نہ عقیدہ ہی۔

اِن تینوں سے ثابت ہوا کہ

مذہب کے سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کے لیے بھی بہت کچھ مشاہدے اور تجربہ اور استدلال یعنی علم و عقل کی حاجت ہی۔

دوسرے لفظوں میں دعوی اُن لوگوں کا، جو کہتے ہیں کہ علم مذہب سے جُدا اور عقل احکامِ الٰہی کی ضرور مخالف ہی، باطل ہی۔ کیونکہ جب مخاطب عاقل نہ ہو تو وہ جھوٹے اور سچے۔ اصلی اور فرضی حکم میں کسطرح تمیز کر سکیگا۔

اگر در خانہ کس ست حرفی بس ست۔

(غلام الثقلین)

فلسفۂ تاریخ پر ایک سرسری نظر

مسٹر بکل نے جو انگلستان کا مشہور مؤرخ ہی، تاریخ کی تعریف یہ کی ہی کہ نیچر جو تبدیلیں انسان میں کرتی ہی اور انسان جو تصرفات نیچر میں کرتا ہی، اُن کے مجموعے کا نام تاریخ ہی۔ اِس تعریف سے وہ تمام مافوق الفطرت واقعات خارج ہو جاتے ہیں جن سے قدیم تاریخوں کا سرمایہ تیار ہوا ہی۔ زمانۂ حال میں تاریخ کے فن نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ آجکل اگر کوئی مؤرخ اپنے زمانے کے واقعات اور حالات اسطرح جمع کردے کہ اُس سے سلاطین کا سلسلۂ نسب۔ اُن کا سنہ جلوس و وفات۔ اُن کے معرکوں کی تفصیل معلوم ہو، تو اُسکو مؤرخ شمار نہیں کرینگے۔ ہمارے زمانے کے مؤرخ کا یہ فرض ہی کہ وہ تاریخ لکھنے سے پہلے جغرافیہ۔ علوم طبعیہ۔ علم دولت (پولٹیکل اکانومی)۔ علم سیاست۔ علم قوانین۔ علم آثار قدیمہ (آرکیالوجی) علم الخرافات (میتھالوجی)۔ علم اللسان (فلالجی)۔ علم انواع الانسان (انتھراپالوجی) اور علم الاحصاء (اسٹیٹسٹکس) وغیرہ علوم و فنون سے آگاہ ہو تاکہ انسان اور نیچر کی باہم کشمکش کے راز کو سمجھ سکے اور اُن واقعات کے اسباب و نتائج کو بیان کر سکے جن کا لکھنا مقصود ہی۔

عمدہ تاریخ وہ ہی جسمیں ایسے تمام واقعات مسلسل اور مرتب طور پر درج ہوں، جن سے کسی قوم کے عروج اور زوال کا سُراغ لگایا جا سکے۔ مثلاً اُسکے مطالعے سے صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ قوم کے وجود کا آغاز کیونکر ہوا۔ اُسنے ترقی کیونکر شروع کی۔ ترقی کے بعد اُسکو کسطرح زوال ہوا۔ طفولیت۔ شباب اور پیری اِن تینوں زمانوں میں اس قوم کا طرز معاشرت کیا تھا۔ اخلاق کیسے تھے۔ مذہب کیا رکھتے تھے۔ کن اوہام میں مبتلا تھے۔ طرزِ حکومت کیسا تھا۔ عورتوں اور مردوں کی حالت بلحاظِ تعلیم کس درجے پر تھی۔ اُنکے اشغال اور پیشے کیا تھے۔ حاکم اور محکوم میں کیا تعلقات تھے۔ عام آدمیوں کے حقوق و فرائض کیا تھے۔ غرضکہ ادنےٰ سے لیکر اعلیٰ تک ہر قسم کے جزئی واقعات جن سے اُس قوم کا تمدن تیار ہوا تھا، پڑھنے والے کی نظر میں آئینہ ہو جائیں اور اُسکو قوم کے عروج و زوال کے اسباب کا سلسلہ با ترتیب اور نتیجہ خیز دکھائی دے۔ جس تاریخ میں محض ملکی، یا جنگی واقعات کا انبار رہے، اُسکا مطالعہ کیسا ہی دلچسپ ہو مگر اُسکے مفید ہونے

میں تامل ہی۔ اگر ہم رومن امپائر، یا کارتھیج کی سلطنت کی تاریخ پڑھیں اور اُن سے سوا بے نتیجہ واقعات کے اور کچھ نہ معلوم ہو تو موجودہ زندگی میں اُن سے ہمکو کیا مدد مِلسکتی ہی۔ ہم نہیں جان سکتے کہ اُن کے تمدّن کو جن اسباب سے زوال ہوا، وہ اسباب ہماری تمدّن کے سلسلے میں موجود ہیں، یا نہیں۔ نہ ہمکو معلوم ہوسکتا ہی کہ وہ کونسے قوانین ہیں، جن کے سایہ میں کوئی قوم ترقی کرسکتی ہی اور اُس کی ترقی پائدار رہ سکتی ہی۔

کسی خاص قوم کی سادہ تاریخ لکھنے والے کا اتنا ہی فرض ہی کہ وہ اُن اسباب و علل کو تلاش کرے، جو اُس قوم کی ترقی اور تنزّل کا باعث ہوئے ہیں مگر جو شخص کسی قوم کی فلسفیانہ تاریخ لکھنا چاہے اُسکا فرض اس سے زیادہ اہم اور بالاتر ہی۔ اُسکا فرض یہ ہی کہ اُس ایک محور کو تلاش کرے، جسپر اُس قوم کے تمدّن کا مدار ہی مثلاً انگریزوں کی تاریخ کو لو۔ یہ قوم دنیا کی تمام قوموں میں نہایت نامور ہی اور اُسکا تمدّن نہایت بلند اور ترقی یافتہ ہی۔ مورّخوں نے اُس کے تاریخی واقعات کو جمع کیا ہی۔ اُن واقعات کے بیان کرنے میں نہایت موشگافی سے کام لیا ہی۔ اُن کے آغاز و انجام کا نہایت عمدگی سے سُراغ لگایا ہی۔ اس قوم کے کاموں اور اُن کو نتایج کے بیان کرنے مین بھی اُن سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے تمام تفصیل حالات کو اوّل سے آخر تک لکھ کر دکھایا ہی۔ یہ تاریخی سرمایہ اسقدر بسیط اور مفصّل ہی کہ اُس نے اس قوم کی ترقی اور نشو و نما کا حال اُس زمانے سے جبکہ اُسکی بنیاد نہایت کمزور تھی، زمانۂ حال تک جبکہ اُسکی عظمت اور جبروت کا پرچم روی زمین کے تمام حصّوں میں لہراتا ہی، نہایت آسانی سے نظر کے سامنے آجاتا ہی۔ یہ تمام شاندار واقعات جن سے اس قوم کی تاریخ زرنگار معلوم ہوتی ہی، بیشک نہایت دلچسپ اور مفید ہیں مگر اس سے زیادہ مفید اُس محور کا تلاش کرنا ہی جس کے گرد یہ تمام واقعات ظہور میں آتے رہے ہیں اور آتے رہینگے۔ اس محور، یا مرکز پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے وہ تمام مسلسل اور باترتیب واقعات باقاعدہ فوجوں کی طرح یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے سے گذر جاینگے اور صاف طور پر معلوم ہو جائیگا کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے کے ساتھ کیونکر وابستہ ہی اور واقعات اور نتایج کیونکر ایکدوسرے کے بعد ظہور میں آتے ہیں اور وہ کونسی غایت ہی جسکی طرف یہ واقعات اُفتاں و خیزاں جارہے ہیں۔ ایک فلسفی مؤرّخ اس قوم کی تمام تاریخ پر امعان کی نظر ڈالکر بتا سکتا ہی کہ وہ محور انگریزوں کی منتظم اور باقاعدہ آزادی ہی۔ جس سے مراد یہ ہی کہ ہر فردِ قوم شخصی آزادی سے کامل طور پر متمتع ہو مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط ہی کہ نظام سیاست میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔ اگر اس منتظم اور باقاعدہ آزادی کو انگریزوں کی تاریخی واقعات کا محور قرار دیلو اور اس محور سے آزادی کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑاؤ تو معلوم ہو جائیگا کہ تمام واقعات اُس کی گرد کسطرح گردش کرتے ہیں اور باہم ایکدوسرے کیونکر وابستہ ہیں۔ اُنکا آغاز کیا ہی۔ انجام کیا ہی اور عام میلان کسطرف ہی۔

جب کوئی فلسفی مؤرّخ کسی قوم کی تاریخ میں اُس محور کو پالیتا ہی جس سے تمام واقعات کی رفتار اور اُنکے آغاز و انجام کا صحیح اندازہ ہوسکے تو اُسکا فرض تمام ہو جاتا ہی۔ اگر اسیطرح دنیا کی تمام اقوام کی تاریخیں مرتب ہو جائیں اور معلوم ہو جائے کہ ہر قوم کی تمدّن کا محور کیا تھا، تو فلسفۂ تاریخ کا محقق ان تمام محوروں پر نظر ڈالکر یہ معلوم کریگا کہ من حیث المجموع نوعِ انسان کی عام تاریخ کا مرکز کیا ہی۔ اور وہ کونسا مدار ہی جس کے

گردیہ تمام محور حلقہ زن ہیں۔ اس سے نوع انسان کی ترقی کی غایت اور اُس کی تاریخ کی رفتار کا عام رُخ معلوم ہو جائیگا۔

یہ ظاہر ہے کہ فلسفۂ تاریخ کا مقصد کتنا اہم اور کسقدر گہرا اور اُسکا پورا کرنا کیسا مشکل ہے۔ اِنھیں مشکلات کی بنا پر علما اس باب میں مختلف ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بعض علما کہتے ہیں کہ نوع انسان کی تاریخ میں وحدت کا تلاش کرنا ناممکن ہے۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ چند مختلف تاریخوں کا ایک مرکز دریافت کیا جائے۔ اگر ان علما کی مراد یہ ہے کہ تمام انسانی گروہ اپنی اپنی تاریخی منزلوں میں ایک غایت اور ایک مقصد کیطرف بالارادہ نہیں چلے۔ نہ انھوں نے اِس بات پر اتفاق کیا کہ اُن کے مختلف کاموں کا انجام و مآل ایک ہی ہوگا تو اُن کا خیال صحیح ہے اور اگر اُن کی مراد یہ ہے کہ بلا ارادہ بھی اُن کے حالات و واقعات کا ایک مرکز مقصود نہیں ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ فرض کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ خدا نے تمام انسانوں کو ایک ہی غایت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہی غایت اُن کے تمام افعال پر حکمرانی کرتی ہے۔ اگرچہ اِس کی نہ اُن کو خبر ہے، نہ اُنھوں نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اُس غایت کیطرف بالاتفاق اپنی ترقیوں کی باگ ڈھیلی کر دیں۔ فلسفۂ تاریخ کے محقق کا یہی کام ہے کہ وہ دنیا کی تاریخ پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالے اور اُسکی علّتِ غائی دریافت کرے اور اُسکے کلّی مفہوم پر بحث کرے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ہیجل نے بیان کیا ہے۔

فلسفۂ تاریخ پر یورپ میں سب سے پہلے جس شخص نے کچھ لکھا وہ سینٹ اگسٹاین تھا جس نے سنہ ۴۱۳ء اور سنہ ۴۲۶ء کے درمیان اس مضمون پر سٹی روگاڈ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۷۴۰ء میں مان ٹسکیو سنہ ۱۸۲۵ء میں شلی جل۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں ہیجل سنہ ۱۸۴۲ء میں کامٹی۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں بکل وغیرہ بڑے بڑے فلسفی مؤرخ یورپ میں ہوئے ہیں مسلمانوں میں صرف ایک شخص ابن خلدون تھا، جس نے اس مضمون پر قلم اُٹھایا۔ اس کے بعد کسی نے اِسپر توجہ نہیں کی۔ ہمارے زمانے تک کوئی شخص فلسفۂ تاریخ کے لکھنے میں کامیاب نہیں ہوا، اگرچہ بہت کچھ محنتیں اور کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

فی الحقیقت دُنیا کی تاریخ کا فلسفہ لکھنا نہایت سخت دشوار کام ہے اور اُس شخص سے پیشتر جو اس میں کامیابی حاصل کرے، ہزاروں فلسفی مؤرخوں کی جانفشانیوں اور دیدہ ریزیوں کی ضرورت ہے۔ ابھی تک ہر ملک اور ہر قوم کی فلسفی تاریخ بھی مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ دُنیا کا فلسفۂ تاریخ ابھی معدوم ہے اور اگرچہ تمام قوموں کی فلسفی تاریخیں ابھی تک تیار نہیں ہوئیں، تاہم جسقدر فلسفیانہ تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ بھی ہمارے لیے نہایت مفید ہیں۔ بعض ملکوں کی تاریخیں تو اپنی انتہا پر پہونچ گئی ہیں۔ اور بعض کی تاریخیں انتہا کے قریب آگئی ہیں اور اُن کی رفتار کی اصلی سمت معلوم ہو گئی ہے۔ ہم ان تاریخوں کے مطالعے سے بعض قوموں کی پستی اور بلندی کے اسباب دریافت کر سکتے ہیں۔ تمدن کی حقیقت۔ اُس کی نشو و نما کے ذریعے اور اُس کے زوال سے محفوظ رہنے کی تدبیریں بھی جان سکتے ہیں۔ مگر ہمکو افسوس ہے کہ مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ تاریخ ابتک نہیں لکھی گئی۔ نہ اُن کے عروج اور زوال کے اسباب پر گہری نظر ڈالی گئی۔ نہ ابتک یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اُن کی تاریخ کا عام مرکز کیا ہے اور اُن کے واقعاتِ تاریخی کی اصلی سمت کونسی ہے۔ شاید کسی وقت وہ مردی از غیب بروں آید و کاری بکند

(وحید الدین سلیم)

آواز نویسی

آواز نویسی یونانی زبان کے ایک لفظ فونوگرافی کا ترجمہ ہے۔ اس سے لکھنے کا وہ عجیب طریقہ مراد ہے جسکی مدد سے اسپیکروں کی اسپیچیں اور تقریریں نہایت سُرعت اور تیزی کے ساتھ قلمبند کیجاتی ہیں۔ اس طریقے کا دوسرا یونانی نام اسٹینوگرافی ہے جسکا لفظی ترجمہ تنگ نویسی ہوسکتا ہے۔ انگریزی میں اُسکو شارٹ ہینڈ رائٹنگ کہا جاتا ہے قدیم عربی زبان میں یہ طریقہ کتابت بالرموز اور حال کی عربی زبان میں اختزال کے نام سے موسوم ہے۔ اس فن کو علمائی عام خطبوں اور تقریروں کے محفوظ رکھنے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ اس غرض کے لیے اُنھوں نے ایسی علامات و اشارات مقرر کیے ہیں جن کو لکھنے والے اُسیقدر تیزی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں جسقدر تیزی سے بولنے والے الفاظ کو بول جاتے ہیں۔ جب کوئی بولنے والا اپنے جوش میں بولتا ہے اور پوری آزادی کے ساتھ فصاحت سے کام لیتا ہے، تو اکثر اُس کی زبان سے جو فقرے نکلتے ہیں وہ بیساختہ اور سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جملے جو طبیعت کی آمد کے ساتھ مُنہ سے نکلتے ہیں، ریشم کے تار پر موتی کی طرح ڈھلکتے آتے ہیں۔ اگر وہی بولنے والا ولولہ اور جوش کے سرد ہونے اور طبیعت کے افسردہ ہوجانے کے بعد آورد اور تصنع سے ویسی ہی فصیح و بلیغ تقریر کرنی چاہے تو کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ آمد کے وقت کی پُرزور اور پُر تاثیر تقریریں اگر کسی طریقے سے بجنسہٖ قلمبند کرلی جائیں، تو وہ لٹریچر کا نہایت بیش بہا ذخیرہ ہو۔

[فنِ کتابت تو بہت قدیم زمانے میں ایجاد ہوچکا تھا حتّی کہ بعض مؤرخوں نے خیال کیا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے عہدِ نبوت میں لکھنے کا طریقہ بنی اسرائیل میں جاری تھا۔ مگر وہ فن جس کی مدد سے فصحا کی تقریریں بجنسہٖ قلمبند ہوسکتی ہیں، بہت بعد کی ایجاد ہے۔ اکثر مؤرخوں نے اُس کو یونانیوں کی ذہانت اور بلند پروازی کیطرف منسوب کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اُن سے پہلے کسی قوم کی تاریخ میں اس فن کا سُراغ نہیں ملتا۔ عرب کے قدیم مصنفوں نے بھی جو شہادت دی ہے، وہ بھی اسی واقعہ کی تائید میں ہے۔ یونانیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں جبکہ وہاں سلطنتِ جمہوری کا عروج تھا، فصیح و بلیغ خُطبہ دینے والے نہایت ادب اور عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کوئی جادو بیان اسپیکر جو پبلک کے حقوق کی حمایت کرنے کھڑا ہوجاتا، اِس بلا کی سیفِ زبانی سے کام لیتا تھا کہ اُسکے مخالف بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یونان میں سینکڑوں مدرسے فنِ بلاغت کی تعلیم کے لیے جاری تھے۔ گھر گھر اسی فن کا چرچا تھا۔ ہزاروں آدمی اسی پیشے کے سیکھنے میں مشغول تھے۔ آواز نویسی کا طریقہ اسی زمانے میں ایجاد ہوا اور قدرتی طور پر یہی زمانہ اسکے لیے موزوں بھی تھا۔

یونان کے مشہور حکیم زینوفن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ عام جلسوں میں بولنے والوں کی تقریریں لکھ لیا کرتا تھا مگر غالب گمان یہ ہے کہ وہ اُن تقریروں کو بجنسہٖ قلمبند نہیں کرتا تھا بلکہ اُنکا ماحصل لکھ لیتا تھا۔ پلوٹارک نے جو اُسی مُلک کا ایک نامور مؤرخ ہے بیان کیا ہے کہ جب کاٹو نے جو آلی رتبہ صوبۂ یونان کا باشندہ تھا، سینٹ (مجلسِ جمہوری) کے ایک جلسے میں اسپیچ کی تو سیسرون نے نہایت تیز دست اور زود نویس کاتبوں کو اُس کی فصیح اور مؤثر تقریر لکھنے کے لیے بٹھا دیا تھا۔ ان کاتبوں کو سیسرون نے ایسے اشارے سکھا دیے تھے، جو بڑے

بڑے لفظوں کے قائم مقام ہو سکتے تھے - یہ اشارے تیرونی کے نام سے موسوم ہوئے جو تیرون کی طرف منسوب ہیں - تیرون ایک نہایت زود نویس کاتب تھا، جو شیشرون کے تمام کاتبوں پر سبقت لے گیا تھا - یہ اشارے اگرچہ آوازنویسی کے لیئے مفید اور کارآمد تھے، مگر اُن میں بہت سے نقص بھی موجود تھے، جن کے سبب سے تنہا ایک شخص کوئی اسپیچ بجنسہٖ اوّل سے آخر تک نہیں لکھ سکتا -

یورپ میں اس فن کا استعمال سترھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا - اس کی ابتدا انگریزوں نے کی، جنکو پارلیمنٹ کی تقریریں اور عام جلسوں کی اسپیچیں لکھنے میں اس فن سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی - مگر آوازنویسی کا جو طریقہ انگلستان میں جاری ہوا، اُسکے قاعدے بہت مشکل تھے، اسلیئے عرصۂ دراز تک اِس طریقے کا عام رواج نہیں ہوا - تاہم علما کا ایک گروہ اس طریقے کو صاف کرنے اور آسان بنانے میں برابر مشغول رہا - یہان تک کہ ہمارے زمانے میں وہ یورپ کے عمدہ اور کارآمد فنوں میں شمار کیا جاتا ہے اور نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسکے مختلف طریقے جاری ہوگئے ہیں - انگریزوں میں آوازنویسی کا صرف ایک طریقہ جاری ہے جسکو ایزک پٹمین نے ۱۸۳۷ء میں ایجاد کیا اور اُس نے اور دیگر علما نے اُس میں بہت سی مفید اصلاحیں کیں - آجکل انگلستان میں اُسی کی تصنیف کی ہوئی کتابیں استعمال کی جاتی ہیں - یا وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جنکو اوروں نے تصنیف کیا تھا مگر پٹمین نے اُن کی تصدیق کی تھی - اضلاع متحدۂ امریکا میں اس فن نے بہت ترقی کی ہے چنانچہ بعض مدارس میں اسکی تعلیم لازمی کردی گئی ہے - امریکا میں اسکے تین مختلف طریقے جاری ہیں - فرانس میں بھی بہت سے مختلف طریقے ہیں، جن کی تفصیل کی بتانے کی

ضرورت نہیں ہے -

اس فن کے جسقدر فائدے بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں اُن سے بہت زیادہ ہیں - کیونکہ اس وقت دنیا کی تمام مہذب قومیں اسباب میں سرگرم پائی جاتی ہیں کہ دولت اور وقت کی جہانتک ممکن ہو، کفایت کی جائے اور تھوڑے سے وقت میں بہت سا کام کرنے کے وسائل بہم پہونچائے جائیں جو کاریگر پہلے ایک کام کو دس دن میں نہیں بنا سکتا تھا، وہ اب اُسکو ایک دن میں تیار کر سکتا ہے - پس اگر کوئی کاتب، یا تصنیف و تالیف کرنیوالا، یا چھاپنے والا بغیر کسی علمی فضیلت، یا طبعی جودت کے محض ایک فن کے ذریعے سے دس دن کا کام ایک دن میں تیار کرلے تو اسمیں کچھ شک نہیں ہے کہ دولت اور وقت کی بہت بڑی کفایت ہوگی - فی الواقع آوازنویسی کا فن نہایت تعجب انگیز ہے مگر اس سبب سے کہ ہمارے زمانے میں اِس فن کے جاننے والے اور اُسکو پھرتی اور تیزی سے کام میں لانیوالے موجود ہیں، کوئی اِس بات پر تعجب نہیں کرتا کہ لمبی لمبی تقریریں، جو نہایت سُرعت کے ساتھ کی جاتی ہیں، کیونکر آن کی آن میں لکھ لیجاتی ہیں - مگر یہ فن ابھی تک اوجِ کمال پر نہیں پہونچا کیونکہ اُس کا استعمال ایک چھوٹے سے گروہ میں محدود ہے اور اُس کے جاننے والے انگلیوں پر گنے جاتے ہیں لیکن کیا عجب ہے کہ آیندہ رفتہ رفتہ ترقی کرجائے اور عام طور پر شائع ہوکر دیگر فنوں کیطرح انتہائے کمال تک پہونچ جائے -

فونوگرافی، یا آوازنویسی سے یہ غرض نہیں ہے کہ لکھنے کے معمولی طریقے بالکل ترک کردیئے جائیں اور عام طور پر لکھنا پڑھنا اسی پر منحصر کردیا جائے - بلکہ اس سے یہی غرض ہے کہ بعض ضرورت کے موقعوں پر جہاں معمولی کتابت سے کام نہیں چل سکتا، اُسکا استعمال کیا جائے مثلاً جب کوئی خطیب، یا اسپیکر فی البدیہہ کوئی

خطبہ دیتا ہے، یا اسپیچ کرتا ہے، یا جب عام جلسوں میں مباحثے اور مناظرے ہوتے ہیں تو انکا ضبط کرنا اور لکھنا معمولی کتابت کے ذریعے سے سخت مشکل کام ہے تا وقتیکہ آواز نویسی سے مدد نہ لی جائے۔ اسی وجہ سے اہل یورپ اپنی قوم کے اسپیکروں اور بڑے بڑے لوگوں کے خطبوں اور تقریروں کے محفوظ رکھنے کے لیے اس فن کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مجلس میں کوئی مباحثہ ہوتا ہے، یا کوئی تقریر کیجاتی ہے، یا خطبہ دیا جاتا ہے تو وہ فوراً ضبط کرلیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات جلسے کے برخاست ہونے سے پہلے ہی اخبار میں چھپکر مشتہر ہوجاتا ہے، جو اس فن کے حیرت انگیز نتائج میں سے ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ آئندہ زمانے میں آواز نویسی کے اشارات بطور ٹائپ کے حرفوں کی ڈھال لیے جائیں اور ضرورت کے وقت انکو سرعت کے ساتھ کمپوز کیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو کاغذ اور وقت کی بیحد کفایت ہوجائیگی۔

آواز نویسی کا طریقہ اب تک یورپ کی زبانوں میں محدود ہے اور مشرقی زبانوں میں اسکا استعمال شروع نہیں ہوا۔ بظاہر اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپ کی زبانوں میں بہ نسبت عربی اور اسی قسم کی دوسری زبانوں کے حرفوں کی تعداد کو گھٹا دینا زیادہ آسان ہے کیونکہ مثلاً عربی میں حرکتیں یا تو بالکل حذف کردی جاتی ہیں، یا کبھی کبھی حرفوں کے اوپر اور نیچے لکھی جاتی ہیں۔ برخلاف اسکے یورپ کی زبانوں میں حرکتیں حرفوں کے ذیل میں داخل ہوتی ہیں اور حرفوں کی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً فرنچ زبان کا ایک لفظ ہے میزون (MAiZOON) اس میں میم کی حرکت دو حرفوں اے (ے) اور آئی (ئی) سے مرکب ہے۔ پس اگر وہ اسکو آواز نویسی کی غرض سے مختصر کرنا چاہیں تو ایک، یا دو حرف کم کرسکتے ہیں۔ اسیطرح مثلاً انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے انف (ENOUGH) یہ لفظ اگر ہماری زبان میں لکھا جائے تو صرف تین حرف ہوتے ہیں۔ حالانکہ انگریزی زبان میں وہ چھ حرفوں سے مرکب ہے۔ پس اگر اسکو مختصر کرنا چاہیں تو تین حرفوں کی کفایت ہوسکتی ہے۔ عربی۔ فارسی۔ اردو اور اسی قسم کی اکثر زبانیں اُن خاموش حرفوں سے بھی خالی ہیں، جو لکھے تو جاتے ہیں مگر پڑھنے میں نہیں آتے یورپ کی زبانوں میں اختصار کیوقت وہ حروف بھی کم ہوسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ زبانیں بہ نسبت السنۂ یورپ کے خود ہی طبعی طور پر مختصر ہیں۔ علاوہ اسکے ان زبانوں کے حروف لکھنے میں چھوٹے چھوٹے اور مرکب ہونے کی حالت میں تو بہت ہی چھوٹے رہ جاتے ہیں۔ ان میں الفاظ بھی عام طور پر چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور کم تعداد کے حرفوں سے بن جاتے ہیں۔ یورپ کی زبانوں کے حروف قد و قامت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے بڑے اور پیچدار ہوتے ہیں، جنکے لکھنے میں ہاتھ کو اوپر نیچے۔ دائیں بائیں مختلف گردشیں دینی پڑتی ہیں اور اُن زبانوں کے کلمات بھی حرفوں کی بڑی تعداد سے مرکب ہوتے ہیں حتیٰ کہ صدہا کلمات ایسے ہیں جو بیس بیس حرفوں سے مرکب ہیں۔ ایک بڑا فرق دونوں قسم کی زبانوں کی طرز کتابت میں یہ ہے کہ ایک قسم کی زبانیں تو دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھی جاتی ہیں اور دوسری قسم کی زبانیں بائیں طرف سے دائیں طرف کو تحریر کیجاتی ہیں۔ چونکہ دوسری قسم کی کتابت میں ہاتھ کو قدرتی طور سے حرکت کرنے میں آسانی ہوتی ہے اس لحاظ سے آواز نویسی کے لیے بہ نسبت پہلی قسم کی کتابت کے یہ زیادہ موزوں ہے۔ بیان بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ یورپ کی زبانوں میں

حروف بآسانی گھٹائے جاسکتے ہیں اور وہ زبانیں خط کی نوعیت کے لحاظ سے آسانی کے ساتھ لکھی جاسکتی ہیں اسلیئے بہ نسبت عربی - فارسی - اُردو اور اسی قسم کی زبانوں کے ان زبانوں میں آوازنویسی کا طریقہ سہولت کیساتھ جاری ہوسکتا ہے۔

مگر ہم یہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے کہ اگر آوازنویسی کا قاعدہ ہماری مشرقی زبانوں میں نکالا جائے اور اُسپر عمل کیا جائے تو بالکل بے سود ہوگا، یا آوازنویسی کا طریقہ ان زبانوں کے لیئے ایجاد ہی کرنا ناممکن ہے - کیونکہ اگر حرکتیں کم کرنیکا موقع ان زبانوں میں نہیں ہے تو حروف تو ضرور ہی کم ہوسکتے ہیں - بلکہ غیر ضروری یا متجانس حروف کی تعداد کم کرنے سے ہمارا طریقہ آوازنویسی اور بھی مختصر اور مفید اور سریع الاستعمال ہوجائیگا - عربی زبان میں شام کے ایک عیسائی عالم سلیم آفندی بستانی نے آوازنویسی کا طریقہ حال میں ایجاد کیا ہے اور اُسکا ایک مختصر سا نمونہ دائرۃ المعارف جو عربی زبان کی مشہور انسائیکلوپیڈیا ہے، درج ہے - جو لوگ آوازنویسی کے فن میں ماہر ہوں وہ بتاسکتے ہیں کہ یہ نمونہ عربی زبان کے لیئے کافی اور موزوں ہے، یا نہیں - مگر اس سے ہم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ اگر کوشش کی جائے تو اُس نمونے پر، یا اُس سے علیحدہ کوئی طریقہ آوازنویسی کا اُردو اور فارسی کے لیئے تیار کرنا ممکن ہے ہم نے سنا ہے کہ ترکوں نے بھی اپنی زبان میں آوازنویسی کا قاعدہ جاری کردیا ہے اور بعض مدارس میں اسکی تعلیم بھی دیجاتی ہے - چونکہ عربی - فارسی - ترکی اور ہماری مادری زبان اُردو سب ایک ہی حروف اور ایک ہی خط میں اور ایک ہی طرح لکھی جاتی ہیں اسلیئے ترکی اور عربی نمونوں پر غور کرنے سے غالباً ہماری زبان کے لیئے یہ مشکل اور بھی آسان ہوجائیگی اور کوئی مستقل طریقہ ایسا نکل آئیگا جو آسانی سے جاری ہوسکے۔

برٹش گورنمنٹ نے جو ہر قسم کی آزادی ہمکو مرحمت فرمائی ہے اُسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اپنی مذہبی - تمدنی - اخلاقی اور تعلیمی اغراض کے لیئے مجلسیں قائم کرتے ہیں ان مجلسوں میں ہم مسلمانوں کے قومی مطالب پر لکچر دیئے جاتے ہیں - اسپیچیں کیجاتی ہیں اور بعض لکچر اور اسپیچیں ایسی اہم اور ایسی فصیح و بلیغ ہوتی ہیں کہ انکا بجنسہ قلمبند نہ ہونا نہایت افسوس کی بات ہے - ایجوکیشنل کانفرنس اور اسی قسم کی اور انجمنوں اور مجلسوں میں جو تقریریں کیجاتی ہیں وہ بالکل برباد جاتی ہیں - اُن کا اثر اُنھیں مجلسوں میں ختم ہوجاتا ہے - اگر وہ بجنسہ اُن مجلسوں اور انجمنوں کی روئدادوں میں درج کی جاتیں تو ممکن نہ تھا کہ وہ جادو جسنے حاضرین کو ڈلیوری کے وقت تڑپا دیا تھا، مطالعے کے وقت ناظرین کو مسحور نہ کردے - اکثر یہی ہوتا ہے کہ جب روئدادوں میں کوئی تقریر درج کی جاتی ہے تو وہ بالکل مصنوعی الفاظ میں لکھی جاتی ہے - اُسکے عمدہ سے عمدہ جملے آورد اور تصنع سے ترکیب دیئے جاتے ہیں اور اسلیئے وہ بے مزہ اور بے اثر ہوجاتے ہیں، یا یہ ہوتا ہے کہ اسپیکر اپنی تقریریں لکھکر جلسوں میں لیجاتے ہیں اور وہی روئدادوں میں چھاپی جاتی ہیں - اس صورت میں نہ وہ ڈلیوری کیوقت موثر ہوتی ہیں، نہ مطالعے کیوقت - اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اگر آمد اور جوش اور ولولے کے وقت کی پُرزور اور پُرتاثیر تقریریں بجنسہ روئدادوں میں درج ہوجایا کریں تو ایسا پاکیزہ اور عجیب لٹریچر ہماری زبان میں تیار ہوسکتا ہے جسکے سامنے ہمارا موجودہ لٹریچر پھیکا اور بے مزہ ہوگا - کاش ہماری قوم کے بعض ہونہار نوجوان جو انگریزی کے طریقہ آوازنویسی میں مہارت رکھتے ہوں اس ضروری کام کیطرف متوجہ ہوں

(وحید الدین سلیم)

علاّمۂ ابوالفرج اصفہانی

ابوالفرج جو کتاب الاغانی کا مصنف ہے، نہایت مشہور اور نامور عالم ہوا ہے۔ اُسکا نام علی۔ کنیت ابوالفرج تھی۔ وہ عبدمناف کی سولھویں پشت میں اور اُمیہ (بانیِ خاندان بنی امیہ) کی چودھویں پشت میں تھا۔ اُسکا دادا مروان بن محمد بنی امیہ کے سلسلے میں آخری تاجدار تھا۔ اُسکی ولادت ۲۸۴ھ میں اصفہان میں ہوئی۔ مگر اُسنے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اُسکو بغداد میں آنا پڑا۔ یہیں اُسنے حدیث اور فقہ کی تعلیم پائی۔ جوان ہوکر وہ دارالخلافہ کے مشہور ادیبوں اور نامور مصنفوں میں شمار ہونے لگا۔ اُسنے بیشمار عالموں سے حدیث کی سند لی۔ وہ مورّخ بھی تھا۔ شاعر بھی۔ محدث بھی۔ اور انساب کے فن میں بھی اُسکو کامل مہارت تھی۔ عرب کے قبائل کے انساب۔ شاعروں کے اشعار، مغنیوں کے راگ۔ ایامِ جاہلیت کے فسانے اُسکو ازبر تھے۔ لغت نحو۔ طب۔ نجوم۔ طبِ حیوانی۔ فنِ آدابِ مجلسی میں بھی اُسکو ضروری واقفیت حاصل تھی۔ اُسنے خود بھی اشعار کہے ہیں، جو متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے عالمانہ اور لطافت اور نزاکت کے اعتبار سے شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُسنے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جنکو ہم آگے چلکر گنوائینگے مگر اُسکی سب میں زیادہ مشہور اور ضخیم کتاب "الاغانی" ہے جسمیں اُسنے شاعروں اور مغنیوں کے حالات اور اُن کے اشعار اور نغمے درج کیے ہیں اور جو علمِ ادب کا ایک جزنِ سمندر ہے۔

ابومحمد مہلبی جو بغداد میں معزالدولہ کا وزیر تھا اور جس نے ۳۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی، لکھتا ہے کہ میں نے ابوالفرج سے ایکدفعہ پوچھا کہ تمنے یہ کتاب کتنے دنوں میں تیار کی ہے۔ اُسنے کہا پورے پچاس سال میں۔ ابوالفرج نے اس کتاب کو ساری عمر میں ایک ہی دفعہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا یہ نسخہ اُسنے سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تھا، جسپر اُسے ایک ہزار دینار انعام ملا۔

صاحب بن عباد نے، جو نامور وزراے اسلام میں سے ہے جب یہ واقعہ سُنا تو کہا کہ سیف الدولہ نے اس کتاب کی پوری قدر نہیں کی۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اُسپر بہت زیادہ انعام دیا جائے۔ اس کتاب کی تعریف میں جو جامع و مانع فقرے صاحب بن عباد کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے کہ اغانی نادر اشعار اور عجیب فقروں سے لبریز ہے۔ وہ زاہدوں کے لیے مونسِ تنہائی۔ عالموں کے لیے خزانۂ معلومات۔ کاتبوں اور ادیبوں کے لیے سرمایۂ انشا۔ بہادروں اور جوانمردوں کیلئے جرأت انگیز۔ غمگینوں اور مصیبت زدوں کے لیے تسلّی بخش۔ بادشاہوں اور امیروں کے لیے باعثِ تفریح ہے۔ میرے کتب خانے میں ایک لاکھ ستر ہزار کتابیں ہیں مگر اُن میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جو اغانی کی طرح میری انیس و ہمدم ہو۔

اِسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ کتاب بے نظیر ہے اور اگر زمانۂ حال کے مذاق پر لحاظ کیا جائے تو وہ عربی لٹریچر کی ایک ضخیم انسائیکلوپیڈیا (قاموس) ہے۔ اُسکی اکیس جلدیں ہیں۔ بیس جلدیں مصر میں ۱۲۸۵ھ میں چھاپی گئی ہیں اور اکیسویں جلد ۱۳۰۵ھ میں ڈاکٹر برونو کے اہتمام سے لیڈن میں مطبوع ہوئی ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ اُسکی تین چار قسم کی انڈکسیں بھی علماے یورپ تیار کر رہے ہیں مثلاً ایک انڈکس اُن اشعار کی جو اس ضخیم کتاب میں درج ہوئے ہیں۔ ایک انڈکس مقامات کے ناموں کی۔ ایک انڈکس اشخاص کے ناموں کی۔ اگر یہ انڈکسیں چھپ گئیں تو اس کتاب سے ہر شخص بآسانی فائدہ اُٹھا سکیگا۔ اس میں (۳۹۵) شاعروں کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور بہت سی لائق اور تعلیم یافتہ عورتوں کے حالات بھی درج ہیں۔ اس کتاب کی شہرت مصنف کی زندگی ہی میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔ عضدالدولہ سفر اور حضر میں اُسکو اپنے مطالعے میں رکھتا تھا صاحب بن عباد جب سفر کو نکلتا تو اسکے ساتھ تیس اونٹ

کتابوں سے لدے ہوئے چلتے تھے۔ جب اغانی اسکو ہاتھ آئی تو اسکے سوا کسی کتاب کو اپنے ساتھ نہیں لیجاتا تھا ابھی بغداد میں کتاب شائع نہیں ہوئی تھی کہ حَکَم نے جو خاندان بنی امیہ اندلس میں نامور فرمانروا ہوا ہے، زرِ کثیر بھیجکر اسکا ایک نسخہ طلب کر لیا۔ اغانی کا مسوّدہ بغداد کے بازاروں میں چار ہزار درہم کو فروخت ہو چکا ہے۔

ابن المغربی۔ ابن واصل۔ ابن ناقیا۔ امیر عزّ الملک حرّانی۔ ابن مکرّم۔ رشیدی۔ ابن الندیر وغیرہ علمانے اپنی اپنی طرز پر اغانی کے انتخاب کئے ہیں۔ حال میں بیروت کے ایک عیسائی عالم نے رنات المثالث والمثانی فی روایات الاغانی کے نام سے اسکا جدید انتخاب شائع کیا ہے۔ اسکی دو جلدیں ہیں۔ ایک جلد میں وہ روایات ہیں جو ادب سے تعلق رکھتی ہیں اور جنمیں مغنیّوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں ایام جاہلیت اور اسلام کے سعر کونکی تفصیل ہے۔

ابو الفرج نے اغانی کے سوا جو کتابیں تصنیف کیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) نزھۃ الملوك والاعیان فی اخبار القیان۔ اس کتاب میں مغنیّہ عورتوں کے حالات لکھے ہیں۔ (۲) کتاب الاماء الشواعر۔ اسمیں شاعرہ کنیزوں کا ذکر کیا ہے (۳) کتاب الدیارات (۴) کتاب دعوة الاطباء (۵) کتاب مجرّد الاغانی۔ اغانی کا خلاصہ (۶) اخبار جحظة البرمکی۔ جحظہ برمکی کی سوانح عمری (۷) کتاب مقاتل الطالبین (۸) کتاب الحانات (۹) کتاب آداب الغرباء (۱۰) کتاب نسب بنی عبد شمس (۱۱) کتاب ایام العرب۔ اسمیں جاہلیت کی ایک ہزار سات سو لڑائیونکا حال ہے (۱۲) کتاب التعدیل والانصاف یا حیرة النسب۔ اسمیں قبائل عرب کے عیوب اور فضائل بیان کئے ہیں (۱۳) کتاب نسب بنی شیبان (۱۴) کتاب نسب المهالبه۔ اسمیں خاندان بنو مہلب کے نسبی سلسلوں کا حال ہے۔ (۱۵) کتاب نسب بنی تغلب ونسب بنی کلاب (۱۶) کتاب الغلمان المغنّین۔ اسمیں مغنّی غلاموں کی حالات ہیں۔ دسویں نمبر سے سولھویں نمبر تک کی کتابیں ہیں جو ابو الفرج نے شاہانِ اندلس کی فرمایش سے تصنیف کیں اور انکے پاس پوشیدہ طور سے روانہ کیں اور پوشیدہ ہی طور سے انعام حاصل کیا۔ (۱۷) کتاب مجموع الاخبار والنوادر (۱۸) کتاب المماليك الشعراء۔ یہ کتاب ویسی ہی ہے جیسی کہ سولھویں نمبر کی کتاب ہے۔ (۱۹) کتاب اعیان الفرس (۲۰) کتاب الفرق والمعیار بین الاوغاد والاحرار۔ یہ کتاب فن انساب میں ہے اور ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن المنجم کی کتاب "اللفظ المحیط بنقض ما لفظ به اللقیط" کے جواب میں لکھی ہے۔ (۲۱) کتاب تحف الوسائد فی اخبار الولائد (۲۲) کتاب تفصیل ذی الحجہ (۲۳) کتاب الطفیلیین (۲۴) کتاب مناجیب الخصیان۔ یہ خواجہ سراؤنکے حال میں ہے۔ (۲۵) کتاب فی النغم۔ یہ عربی گیتونکی کتاب ہے (۲۶) رسالة فی الاغانی۔ یہ بھی عربی گیتوں کی بیان میں ہے۔ انکے علاوہ اُسنے بحتری اور ابو تمام کا دیوان جمع کیا اور انکے اشعار کی ترتیب مضامین کے لحاظ سے رکھی۔ ابو نواس کا دیوان بھی اسی نے ترتیب دیا تھا۔

ابو الفرج وزیر ابو محمد مہلبی کی مدح میں اشعار کہا کرتا تھا اور وزیر بھی اسکے ساتھ فیاضی سے سلوک کرتا تھا۔ اُسی ۳۵۶ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ جس سال وہ پیدا ہوا تھا اُسی سال بحتری شاعر کا انتقال ہوا تھا اور جس سال اُسنے وفات پائی اُسی سال تین بادشاہ اور ایک عالم نے بھی انتقال کیا۔ وہ بادشاہ سیف الدولہ، معز الدولہ بن بویہ کافور اخشیدی تھے اور وہ عالم ابو علی قالی تھا۔ کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اُسکے حواس میں فرق آگیا تھا۔ مؤرخوں نے اسبات پر تعجب کیا ہے کہ وہ باوجود اسکے کہ عباسی یا ہاشمی نہ تھا بلکہ بنی امیہ میں سے تھا، تاہم نہایت پختگی کے ساتھ مذہب اثنا عشری کا پابند تھا۔

(رشید احمد سالم)

یاد دہانی

اگرچہ ہمارے رسالے کے معزز ناظرین اپنے اُس فرض سے بخوبی واقف ہیں جو اُنپر بطور ایک مسلمان رعیت ہونیکے بادشاہِ وقت یعنی حضور قیصرۂ ہند دامت ظلہا کے ساتھہ فرمانبردارانہ اور جان نثارانہ رہنے کا ہی اور اس سے بھی واقف ہیں کہ اُس مصیبت میں شریک ہونا ہمکو کسقدر لازم ہی جو ہمارے بادشاہی بھائیوں یعنی بعض ہم رعیت جوانمردوں کے نٹال کے میدانِ جنگ میں کام آنے سے اُنکے پس ماندہ خاندانوں پر آگئی ہی۔ لیکن بطور یاد دہانی گزارش کیا جاتا ہی کہ اس مذکورہ فنڈ میں سب مسلمانوں کو بقدر اپنی استطاعت کے ضرور شریک ہونا چاہیئے تاکہ اُس محبت اور اخلاص کا (جو ہمارے دلوں میں اپنے اُن تمام ملکی بھائیوں اور ہم رعیت اشخاص کے ساتھہ ہی جنھوں نے حضور قیصرۂ ہند کے حکم سے اپنی جان تک کو نثار کر دینے میں دریغ نہیں کیا ہی) عملی اظہار بھی ہو۔ نیز اُن کی پس ماندہ وابستوں کی کچھ مدد بھی ہو جائے۔

چندہ دینے میں ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اُسکی مقدار بڑی ہی ہو تو دیا جائے۔ نہیں بلکہ ہر ایک کو اول اپنی وسعت اور آمد و خرچ کا دیکھ لینا ضرور ہی اُس کے بعد جو کچھ مناسب ہو فی الفور دیدینا چاہیئے۔

امید ہی کہ ہمارے رسالے کے پڑھنے والے اس بنا پر ہم پر اظہار ناراضگی نکرینگے کہ اسکے کہنے کی اُنکے سامنے حاجت کیا تھی یعنی وہ سب اپنے اُن فرائض سے جو اُن کے مذہب پاک نے پادشاہ کی فرمانبرداری، ہمسایونکی خبرگیری، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کے متعلق اُن پر قرار دیئے ہیں، بالیقین بخوبی آگاہ ہیں لیکن ہم نے صرف بطور یاد دہانی کے یہ چند سطریں لکھدی ہیں ورنہ ہم خود یقین کر رہے ہیں کہ حضور قیصرۂ ہند کی تمام رعیتوں میں سے اُنکی مسلمان رعیت خیرخواہی۔ جان نثاری۔ وفاداری اور اطاعت میں کسی دوسری رعیت سے ہرگز کم نہیں ہی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

اسمٰعیل
سلیم } اڈیٹران معارف

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران | حاجی محمد اسمٰعیل خاں
مولوی وحید الدین سلیم

جلد ۲	یکم فروری سنہ ۱۹۱۸ع	نمبر ۸

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک .... للعہ | قیمت فی پرچہ نمونہ ۵ر

مقامِ اشاعت۔ دفترِ معارف علی گڑھ

مطبع فیض عام واقع علی گڑھ میں چھپا

مقاصد اور قواعد

۱۔ یہ دو جزکا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو علیگڈھ سے شائع ہوا کریگا۔

۲۔ اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اس میں ہر قسم کے علمی، فلسفی، اخلاقی، مذہبی، تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی، عربی اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشنضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جائینگے۔

۴۔ بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں

ا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں۔

ب۔ مولوی وحید الدین سلیم۔

۵۔ ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشاپردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں۔ جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں۔ اگر مہربانی سے وہ خود، یا ان کے احباب ان کے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم ان کی خدمتمیں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہونچائیں۔ جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے ان کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶۔ اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ ہے جو نقد قیمت بھیجنے، یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرنیسے خریداروں کی خدمتمیں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم درخواست منظور نہ ہوگی۔ نمونے کے پرچے کے لیے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کی جائیگی۔ اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہو سکتی۔ رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیے۔ اور ان ہی کے نام قیمت آنی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لیے آدھ آنہ کا ٹکٹ، یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷۔ جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں، ان سے امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸۔ حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہینگے۔

۹۔ اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰۔ **جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط و صاف لکھکر بھیجیں تاکہ طبع میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے۔**

۱۱۔ پتہ مولوی وحید الدین سلیم کاعلی گڈھ دفتر رسالہ معارف ہے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲	یکم فروری سنہ ۱۹ء	نمبر ۸

کانشنس اور اخلاق
پر
ایک دلچسپ مکالمہ

افعالِ انسانی کے حُسن و قبح کا مسئلہ فلسفۂ اخلاق کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہی زمانۂ دراز تک سیر علمی مباحثے ہوا کئے ہیں اور مختلف نظریے فلسفی گروہوں نے اختیار کیئے ہیں جنسے وہ افعالِ انسانی کے حسن اور قبیح ہونے کی توجیہ کرتے ہیں۔ اس مضمون پر ایک دلچسپ فرضی مکالمہ مصر کے مشہور علمی رسالے المقتطف میں شائع ہوا تھا جس میں اُن تمام فلسفی مذاہب کا ذکر آ جاتا ہے جو حُسن و قبح کی نسبت قائم ہو چکے ہیں۔ ناظرین معارف کے لیئے ہم اُس مکالمے کا ترجمہ چھاپنا موزوں اور مناسب خیال کرتے ہیں۔ اور امید ہی کہ غور سے پڑھا جائیگا۔

بدیہی۔ سب سے پہلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کانشنس سے میری کیا مراد ہی اور اخلاق سے کیا مقصد ہی میں کانشنس کے لفظ سے نفسِ انسانی کی وہ قوت مراد لیتا ہوں جس کی مدد سے ہر شخص کسی فعل کو بُرا جانتا ہی اور کسی کو اچھا خیال کرتا ہی۔ ایک فعل کے کرنے کو واجب بتاتا ہی دوسرے کے کرنے کو منع کرتا ہی۔ ایک فعل کے کرنیوالے کو اچھا جانکر اُس کی مدح و ثنا کرتا ہی۔ دوسرے کے مرتکب کو بُرا سمجھکر قابلِ مذمت قرار دیتا ہی۔ کسی کام کو پسند کرنا یا ناپسند کرنا اسی قوت کا کام ہی۔ اگر ہم اسکی اطاعت کریں تو مطمئن رہتے ہیں۔ اگر اُسکے حکم سے سرتابی کریں تو ندامت اُٹھاتے ہیں۔ اپنے دعوے کی وضاحت کے لیئے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زبردست اور قوی ہیکل آدمی ایک کمزور اور ناتوان شخص کو مارتا ہی اور اسکا مال لوٹنا چاہتا ہی تو اسمیں ذرا بھی شک نہیں ہی کہ ہم میں سے ہر شخص یہی فتویٰ دیتا ہی کہ زبردست کا فعل بُرا ہی یا وہ راہِ راست پر نہیں ہی۔ اسکے بعد ہم فوراً اس رائے پر پہنچتے ہیں کہ اس فعل کو روکنا لازم ہی اور اس فعل کے

مرتکب کو لعنت و ملامت کا مستحق ٹھہراتے ہیں اور اسکو اُسکے فعل کو دل سے بُرا جانتے ہیں۔ اسوقت کانشنس نے جو اثر ہمارے دل میں ڈالا وہ یہ ہی کہ ہم نے اچھے اور بُرے فعل میں تمیز کی اور ایک کو لائق تحسین اور دوسرے کو قابل نفرت ٹھہرایا اور اس سے نفرت یا ناپسندیدگی کا احساس ہمارے دل میں پیدا ہوا۔

یہ تو کانشنس کی تعریف ہوئی۔ اب میں زیادہ وضاحت کے لیئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بحث میں جب افعال کا ذکر کیا جائے تو اس سے عاقل بالغ اشخاص کے افعال مراد لیئے جائیں۔ کیونکہ ہم مثلاً کسی جانور کے فعل کو اچھا یا بُرا نہیں کہتے، نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ افعال اُن جانوروں کو اختیار کرنے چاہئیں اور وہ افعال ترک کر دینے چاہئیں۔ اچھا ہونا یا بُرا ہونا انسانوں کے افعال پر بولا جاتا ہی جو اپنے ارادے سے اُن افعال کے فاعل ہوتے ہیں اور اُن کے نتائج کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں اسلیئے ہم ان افعال کو اخلاقی افعال کہینگے تاکہ دیگر افعال سے اُن کی تمیز ہو سکے۔ پس اخلاق سے اسوقت ہمارے نزدیک وہ افعال مراد ہیں جنکی نسبت یہ کہہ سکیں کہ اُن کا کرنا اچھا یا بُرا ہی۔

میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری جانتا ہوں کہ میرے نزدیک کانشنس غلطی کرنے سے معصوم نہیں ہی بلکہ اس سے غلطی کا صادر ہونا ممکن ہی۔ ایسا ہو سکتا ہی کہ وہ غلطی یا دھوکے سے اچھے فعل کو بُرا اور بُرے فعل کو اچھا بتلانے لگے۔ اسکا سبب یہ ہی کہ خاص قسم کی تعلیم یا تربیت کا اسپر اثر ہو جاتا ہی اور وہ اسی تعلیم اور تربیت کے سایہ میں اور اسیکے متوازی اپنی رفتار جاری کرتا ہی۔ مگر کانشنس کیسا ہی غیر معصوم ہو اُسکے موافق عمل کرنا واجب ہے۔

ایک اور بات ہی جس کیطرف میں حاضرین کی توجہ کو مبذول کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہی کہ تمام انسانوں کے کانشنس بعض افعال کی نسبت بُرے ہونے کا اور بعض کی نسبت اچھے ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں اور ایک قسم کے افعال کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور دوسری قسم کے افعال سے منع کرتے ہیں۔ گویا کہ خدا نے ہر ایک کانشنس میں افعال کے حُسن و قبح کی تصویر کھینچ دی ہی۔ اسلیئے جب عقل انسانی نشو و نما کرتی ہی اور کانشنس بیدار ہوتا ہی اور انسانی افعال پر نظر ڈالتا ہی، تو اُسوقت جو تصویر خود بخود اُسکے سامنے موجود ہو جاتی ہی، اُسپر قیاس کر کے فوراً یہ رائے دیتا ہی کہ اُن میں سے کونسے افعال اچھے ہیں اور کونسے بُرے ہیں۔ پس جسطرح انسان کے دل میں پہلے سے مربع۔ مثلث۔ دائرہ وغیرہ ہندسی شکلوں کی تصویریں منقوش ہیں اور کل کا جزو سے بڑا ہونا وغیرہ اوّلیات اور بدیہیات پہلے سے اُس کے ذہن میں موجود ہیں اور وہ جب کبھی بیرونی محسوسات میں ویسی ہی باتیں سُنتا اور ویسی ہی شکلیں دیکھتا ہی تو فوراً اُنکو بغیر کسی دقت کے پہچان جاتا ہی۔ اسیطرح جو صورتیں افعال کے حُسن و قبح کی ہر انسان کے ذہن میں پہلے سے موجود رہتی ہیں، اُن پر قیاس کر کے فوراً اُن افعال کے حُسن و قبح کو پہچان جاتا ہی، جنکو وہ اوّل ہی نظر میں دیکھتا ہی۔ یہ مذہب فلاسفۂ بدیہیین کا ہی اور میں اسی مذہب کو مانتا ہوں۔ اس اخیر کے بیان سے میرا مطلب یہ ہی کہ افعال کا اچھا ہونا، یا بُرا ہونا دو صفتیں ہیں جو افعال میں ذاتی طور پر موجود ہیں۔ ہر انسان جب اُن کو اپنے ذہن کی تصویروں سے مقابلہ کرتا ہی، تو فوراً اُن کو پہچان جاتا ہی اور اُن کی امداد سے فتوے دیتا ہی کہ وہ افعال اچھے ہیں، یا بُرے ہیں۔ افعال کا حُسن و قبح کوئی نسبتی اور اضافی چیز نہیں ہی جو کانشنس کے موجود ہونے پر موجود ہوا اور اُسکے زائل ہونے پر دور ہو جائے۔

پہلا معترض- میں نہیں جانتا کہ آپ ہم کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں یا ہم سے ہنسی کر رہے ہیں میں نہیں جانتا کہ آپ کے نزدیک کانشنس سے کیا مراد ہی اور وہ کہاں سے آیا- اگر کانشنس فی الحقیقت انسان میں موجود ہوتا جسطرح کہ ہماری آنکھوں میں دیکھنے اور ہمارے کانوں میں سننے اور ہمارے دماغوں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت موجود ہی تو اسمیں ذرا بھی شک نہیں ہی کہ تمام انسانوں کے کانشنس ایک ہی راے دیتے جسطرح کہ تمام انسانوں کی آنکھیں مادی چیزوں کو یکساں دیکھتی ہیں اور اُن کے کان آوازوں کو یکساں سُنتے ہیں اور اُن کے دماغ ایک ہی طرح سے سوچتے اور سمجھتے ہیں- مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان کا کانشنس دوسرے کے کانشنس کے برخلاف فتوے دیتا ہی (اگر فی الواقع کوئی کانشنس موجود ہی)- بعض انسان چوری کو جائز سمجھتے ہیں- بعض اُسکو ناجائز ٹھہراتے ہیں- بعض انسان والدین یا اولاد کے قتل کو حلال جانتے ہیں اور بعض اسکو قطعی حرام سمجھتے ہیں- اسیطرح بعض کے نزدیک تعددِ ازواج کا مسئلہ درست ہی بعض کو اس سے مطلق انکار ہی- اسی پر قیاس کرو کہ اُن میں باہم کسقدر اختلافِ آرا ہی- پس اگر کانشنس موجود ہوتا جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہی تو یہ اختلاف ہرگز نہ ہوتا-

بدیہی- افسوس ہی آپ نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ جس دعوے پر آپنے شدّ و مد سے اعتراض کیا ہی اُسیکو آپ نے اپنے انکار سے ثابت کردیا- کیونکہ جب بعض آدمی اُن افعال کو اچھا سمجھتے ہیں جن کو بعض دوسرے بُرا جانتے ہیں تو گویا اُن سب کی راے یہ ہی کہ حُسن و قبح کی صفت افعال میں موجود ہی اور اُن کی یہ راے ظاہر ہی کہ اُسی کانشنس کے ذریعے پیدا ہوئی ہی جسکا آپنے انکار کیا تھا یہ کیسی تعجب کی بات ہی کہ اس انکار سے آپکا اقرار ثابت ہوگیا ؎

میں الزام اُسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

معترض- کیا آپ کی اصطلاح میں ہر ایک وہ قوت جسکی مدد سے ہم افعال کے حُسن و قبح کو پہچان سکیں کانشنس ہی- اگر یہ صحیح ہی تو اس سے لازم آتا ہی کہ ہر انسان کا کانشنس بُرے کاموں پر اُسکو ملامت کرے حالانکہ دنیا کی بہت سی وحشی قومیں ہیں جو قوانین اخلاقی سے تجاوز کرکے زنا- قتل- چوری اور غارتگری کی مرتکب ہوتی ہیں مگر اُن کا کانشنس اُنکو اِن افعالِ ذمیمہ پر کبھی ملامت نہیں کرتا-

بدیہی- ہاں یہ سچ ہی مگر آپ ضرور اس بات کو بھی تسلیم کرینگے کہ وہ تمام قوانین سے یکساں طور پر تجاوز نہیں کرتے اور تمام افعالِ ذمیمہ کو وہ اچھا نہیں جانتے- اُن کے نزدیک بعض افعالِ ذمیمہ اچھے اور بعض بُرے بھی ہیں- جو افعال بُرے ہیں اُن کے ارتکاب پر اُن کا کانشنس ضرور اُن کو ملامت کرتا ہی- یہ اس بات کی کافی دلیل ہی کہ اُن کے نفس میں کانشنس کی قوت موجود ہی مگر وہ راہِ راست پر چلنے سے اُسیطرح قاصر ہی جس طرح اُن کی عقلیں اُن کے تعلیم یافتہ نہ ہونے اور وحشی اور غیر مہذب ہونے کے سبب سے قاصر ہیں- جس طرح اُن کی عقلوں کے ناقص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن میں عقل کی قوت بالکل موجود نہ ہو اسیطرح کانشنس کے ناقص ہونے سے اُسکے وجود کا انکار نہیں ہوسکتا-

دوسرا معترض- اس میں کچھ شک نہیں کہ میرے معزز دوست نے جو اعتراض کیا ہی اس سے کانشنس کا وجود باطل نہیں ہوتا مگر آپ کے دعوے کا ایک حصہ ضرور باطل ہوجاتا ہی- آپ نے کہا ہی کہ حُسن و قبح دو موجود صفتیں ہیں، جو خود افعال کی ذات میں قائم ہیں- اور یہ صفتیں اضافی نہیں ہیں- عقلِ انسانی جب افعال پر نظر ڈالتی ہی تو فوراً ان صفات کو پہچان لیتی ہی

اور یہ بات اسکی فطرت میں ودیعت رکھی گئی ہے۔ اسکی توجیہ آپنے اسطرح کی کہ حُسن و قبح کی صورتیں ذہن انسانی میں منقوش ہیں۔ جب انسان افعال کو دیکھتا ہے تو ان صفتوں کو اُن میں موجود پاتا ہے اور پہلی ہی نظر میں بدیہی طور پر پہچان جاتا ہے کہ وہ افعال حَسَن ہیں، یا قبیح ہیں۔ آپ نے اس کہنے سے دو باتیں لازم آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حُسن و قبح افعال کی اضافی صفات نہیں ہیں بلکہ ذاتی صفات ہیں۔ اور عقلِ انسانی افعال انسانی کو دیکھکر اُن کی صفات کے پہچاننے پر مجبول ہے۔ دوسرے یہ کہ جب عقل انسانی حُسن و قبح کے پہچاننے پر مجبول ہے تو ہر ایک انسان کی عقل سلیم جسطرح بدیہی طور پر کُل کو جز سے بڑا جانتی ہے، اسیطرح افعال کو دیکھتے ہی فوراً اور یکساں طور پر جان جائیگی کہ اُن میں کونسے افعال اچھے ہیں اور کونسے بُرے ہیں۔ اور یہ آپ کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ کانشنس معصوم نہیں ہے اور خلاف واقع بھی ہے کیونکہ بعض انسان بعض افعال کو اچھا جانتے ہیں اور اُنھیں کو بعض دوسرے بُرا خیال کرتے ہیں۔ پس آپ کا مذہب آپ کے دعوے کے بھی خلاف ہے اور واقع کے بھی خلاف ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا مذہب صحیح نہیں ہے۔

بدیہی۔ میں پہلی بات کو تو بیشک تسلیم کرتا ہوں مگر دوسری بات کو تسلیم نہیں کرونگا کیونکہ میرے قول سے یہ سارا الزام مجھپر نہیں آتا۔ ایک حصہ اعتراض کا مجھپر لازم آتا ہے اور ایک حصہ نہیں آتا۔ اسلیئے میں اُسی حصہ اعتراض کو تسلیم کرونگا جو مجھپر لازم آتا ہے۔ میں یہ تو مانتا ہوں کہ آدمی اخلاقی افعال میں حُسن و قبح کے وجود کو اسیطرح پہچان جاتے ہیں جسطرح وہ یہ جان لیتے ہیں کہ کُل جز سے بڑا ہے مگر یہ بات نہیں مانتا کہ اس سے افعال کے حَسَن یا قبیح ٹھہرنے میں انسانوں کا معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ اخلاقی افعال میں حُسن و قبح کے وجود کو پہچان لینے کا ثبوت تو اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم روی زمین پر موجود ہے وہ بعض افعال کو اچھا جانتی ہے اور بعض کو بُرا سمجھتی ہے۔ اس سے قطع نظر کرو کہ کون سے افعال فی الحقیقت اچھے ہیں اور کونسے بُرے ہیں۔ پس اگر اخلاقی افعال میں حُسن و قبح کی ذاتی صفات موجود نہ ہوتیں اور اگر عقلِ انسانی اُن میں ان صفات کے پہچان لینے پر قادر نہ ہوتی تو بعض افعال کو وہ اچھا اور بعض کو بُرا نہ قرار دیتے۔ پس تمام نوعِ انسان کا افعال میں حُسن و قبح ٹھہرانا اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ جسطرح وہ اوّلیات اور بدیہیات کو فوراً جان جاتے ہیں اسیطرح افعال کے اچھے ہونے اور بُرے ہونے کو بھی پہچان لیتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسکا ثبوت نوعِ انسان کی تاریخ میں۔ اُن کی لٹریچر میں۔ اُن کے تمدن میں اور اُن کے اقوال و تصنیفات میں جابجا ملتا ہے۔

مگر عام طور پر اخلاقی افعال میں حُسن و قبح کے پہچان لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام انسان خاصکر ہر فعل کی بھلائی یا بُرائی کو اسطرح پہچان لیتے ہیں کہ اُسمیں غلطی کا احتمال نہیں رہتا، جبتک کہ یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ہر انسان اپنی عقلی قوتوں کو اچھی طرح استعمال کرتا ہے۔ خاص حالات کے سبب سے ایک انسان اپنی عقل کو دوسرے انسان کی عقل کے برخلاف استعمال کرتا ہے اسلیئے دونوں مختلف نتیجوں پر پہونچتے ہیں۔ مگر یہ رائے کا اختلاف اسبات پر کسیطرح دلیل نہیں ہوسکتا کہ عقلِ انسانی موجود نہیں ہے۔ اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیئے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً ہمکو معلوم ہے کہ جنگ بسوس عرب کے دو قبیلوں کلیب اور جساس میں برپا ہوئی تھی۔ اب اگر کوئی ایک شخص، یا چند اشخاص یہ رائے دیں کہ جنگ بسوس واقع نہیں ہوئی تو اُن کی یہ رائے ہماری رائے

کانشنس اور اخلاق پر ایک بحث مکالمہ

کے برخلاف تو ہو گی مگر اس سے اس جنگ کی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ پس جسطرح جنگ بسوس میں راے کے اختلاف سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنگ کبھی واقع نہ ہوئی ہو اسیطرح خاص خاص افعال کے اچھے ہونے، یا برے ہونے میں جو اختلاف انسانی گروہوں میں موجود ہی، اُس سے حُسن و قبح کی صفتوں کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ان تمام دلیلوں سے قطع نظر کرکے اصلی حقیقت پر مطلع ہونا چاہیں اور نوع انسان کے حالات کا مطالعہ کریں تو ہمکو معلوم ہوجائیگا کہ اکثر افعال کے حُسن و قبح پر تمام انسانوں کا اتفاق ہی اور مخالفوں کی تعداد بہت تھوڑی ہی۔ اب آپ کہینگے کہ جب کچھ آدمی خواہ اُن کی تعداد تھوڑی ہی ہو، اوروں کی راے سے افعال کے حُسن و قبح میں اختلاف کرتے ہیں، تو یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہی کہ فی الحقیقت افعال میں حُسن و قبح کی صفات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں صفتیں اضافی ہیں جو وقت اور جگہ اور حالات کے بدل جانے سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ میں اسکے جواب میں یہ کہونگا کہ جب اکثر آدمی اکثر افعال کے حُسن و قبح میں اتفاق کرتے ہیں اور اُن کو اچھا، یا برا جانتے ہیں تو یہ اسبات کی دلیل ہی کہ وہ افعال بذاتہ اچھے، یا برے ہیں۔ اُنکا اچھا یا برا ہونا اضافی نہیں ہی۔ پس کوئی فعل جو بذاتہ اچھا ہی وہ ہمیشہ اچھا رہیگا۔ اور جو برا ہی وہ ہمیشہ برا رہیگا اگرچہ آسمان اور زمین اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ پس آپ کی دلیل آپ کے دعوے کے ثبوت میں تھوڑے سے آدمیوں کا اختلاف ہی اور میری دلیل بہت سے آدمیوں کا اتفاق ہی۔ اگر آپ کی دلیل کچھ بھی قیمتی ہی تو میری دلیل نہایت بیش قیمت سمجھی جائیگی۔ اگر دس ہزار عقلمند آدمی کسی چیز کی نسبت یہ کہیں کہ یہ چیز سُرخ ہی اور تنہا ایک شخص یہ کہے کہ نہیں یہ تو سبز ہی۔ تو اس صورت میں وہ چیز آپ کے نزدیک سُرخ ہو گی، یا سبز؟ تھوڑے سے آدمی جو بہت سے آدمیوں سے اس مسئلے میں راے کا اختلاف رکھتے ہیں اگر اُن کے اختلاف پر آپ غور کرینگے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہ اختلاف ظاہری ہی۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہی۔ بعض آدمی جن افعال کو اس صورت میں جائز قرار دیتے ہیں کہ اُن کے مخالف اُنھیں کو ناجائز ٹھہراتے ہیں، تو اُن کے جائز اور ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہی کہ دونوں نے اُن کو مختلف نظر سے دیکھا ہی۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اسپارٹا کی باشندے چوری کو جائز سمجھتے تھے اور چوروں کی تعریف کرتے تھے لیکن اگر آپ اُن سے پوچھتے کہ کیا تمھارے نزدیک چوری کرنا بذاتہ اچھا فعل ہی، یا تم چوروں کی اسلیئے تعریف کرتے ہو کہ وہ چوری کرتے ہیں تو وہ فوراً جواب دیتے کہ حاشا و کلّا۔ ہمارے نزدیک ہر حال میں غیر کے مال میں دست اندازی کرنا برا ہی اور جو ایسا کرے وہ کبھی ہمارے نزدیک اچھا نہیں ہی۔ ہم جب چور کی تعریف کرتے ہیں تو ہماری نظر میں اس کی چالاکی اور ہوشیاری اور چوری کے لیئے اُسکا طرح طرح کی تدبیریں ایجاد کرنا ہوتا ہی۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہم چور کی تعریف اس خیال سے کریں کہ وہ دوسروں کے مال میں بغیر کسی حق کے دست اندازی کرتا ہی۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ وہ چور کی تعریف چوری کے سبب نہیں کرتے تھے بلکہ اسی خیال سے کرتے تھے جسکا ہم نے اشارہ کیا۔ اسکی دلیل یہ ہی کہ جب چور چوری کرتے ہوئے گرفتار ہو جاتا تو اُسکو ملامت کرتے تھے اور کافی سزا دیتے تھے۔ اسیطرح جو لوگ اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں وہ بذاتہ قتل کو کوئی عمدہ فعل تصور نہیں کرتے بلکہ اس خیال

سے کہ اس ذریعے سے اُن کی اولاد تکلیف اور مصیبت کی دنیا سے نکلکر سعادت اور راحت کی دنیا میں پہونچ جاتی ہے اس فعل کو اچھا جانتے ہیں۔ اسی لیئے آپ دیکھینگے کہ ایک ہی قسم کے افعال جنکو ایک گروہ انسانی جائز قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ اُن کو ناجائز ٹھہراتا ہے اُن کے حُسن و قبح میں اختلاف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے مختلف اعتبار اور مختلف حیثیت سے اُن کو دیکھا ہے

باوجود اسکے میرے اور آپکے اقوال میں سے خواہ کسی کا قول صحیح ہو اور کسی کا قول غلط ہو تاہم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ آدمی بعض افعال کو اچھا بتاتے اور اُن کے کرنے کو اچھا سمجھتے اور اُن کے کرنے والے کو اچھا خیال کرتے ہیں۔ اسیطرح بعض افعال ایسے ہیں جنکو وہ بُرا کہتے ہیں اور لوگوں کو اُن کے ارتکاب سے روکتے ہیں اور جو شخص انکا مرتکب ہو اُسکو بُرا جانتے ہیں۔ میں نے حُسن و قبح کے مسئلے کی جو توجیہ کی اگر آپکو اُس میں ابھی تک شک ہے تو آپ اپنی طرف سے کوئی جدید توجیہ بیان کریں اور بتائیں کہ انسان کو کیونکر اسبات کا علم ہوسکتا ہے کہ بعض افعال اچھے ہیں اور بعض بُرے ہیں۔ اور وہ کس بنا پر یہ فتویٰ دیسکتا ہے کہ بعض افعال کا کرنا واجب اور بعض کا کرنا ناواجب ہے اور اسکو کیا حق ہے کہ بعض افعال کے کرنے والے کو وہ بُرا جانے اور بعض کو اچھا بتائے۔ اور جب کوئی اچھا کام کرے تو کیوں اُسکے دل میں خوشی اور اطمینان کی حالت پیدا ہوتی ہے اور جب اُس سے کوئی بُرا کام سرزد ہو تو کیوں اُس کی طبیعت آپ ہی آپ غمگین اور منقبض ہوجاتی ہے۔

دہری دوسرا معترض۔ یہ سچ ہے کہ ہم دونوں اس بات میں متفق ہیں کہ سب آدمی اچھے اور بُرے افعال میں تمیز کرتے ہیں گو کہ وہ اس بات میں باہم مختلف ہیں کہ اُن میں سے خاصکر کونسا فعل اچھا ہے اور خاصکر کونسا فعل بُرا ہے مگر باوجود اسکے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اخلاقی افعال بذاتہ حَسَن اور قبیح ہوتے ہیں۔ میری راے تو یہ ہے کہ تمام افعال ابتدا میں حُسن و قبح سے خالی تھے۔ جھوٹ اور سچ دونوں یکساں تھے۔ مار ڈالنا اور نیکی کرنا دونوں فعل برابر تھے۔ زنا اور پاکدامنی دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ نہ کسی فعل کو فضائل میں شمار کرسکتے تھے۔ نہ کسی کو رذائل میں۔ عقلا اور حکما نے بعض افعال کو بعض سے جُدا کیا۔ بعض افعال کے تو کرنے کا حکم دیا اور بعض کے کرنے سے ممانعت کی۔ جو لوگ اُن کے قانون کی اطاعت کرتے تھے اُن کو انعام دیتے تھے اور جو اُس سے نافرمانی کرتے تھے اُن کو سزا دیتے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام آدمی اُن افعال کو جن کے کرنے کا حکم تھا اچھا سمجھنے لگے اور اُن کے کرنے والوں کو اچھا جاننے لگے۔ اسیطرح اُن افعال کو جنکے کرنے سے وہ ممانعت کرتے تھے بُرا جاننے لگے۔ اور اُن کے ارتکاب کرنیوالوں کو بُرا سمجھنے لگے۔ اُسی وقت سے افعال کے حُسن و قبح کا آغاز ہوا اور وہ قانونِ اخلاق کے موافق یا مخالف قرار دیے گئے۔ یہ مذہب انگلستان کے مشہور فلاسفر ہوبس کا ہے اور میں اسی مذہب کو صحیح سمجھتا ہوں۔

بدیہی۔ میرے معزز دوست کیا آپ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ دنیا کے عقلا اور حکما نے جو بعض افعال کو حَسَن اور بعض کو قبیح ٹھہرایا اُس کی وجہ یہ تھی کہ سب آدمی اُس وقت سے بہت پہلے بعض افعال کو اچھا جانتے تھے اور بعض کو بُرا سمجھتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن عقلا اور حکما کے ذہن میں کیا وجہ تھی جسکی بنیاد پر اُنھوں نے اخلاق کے حُسن و قبح کا قانون ایجاد کیا۔ کوئی قانون جسکو واضعانِ قانون نے بنایا ہو اور بنا کر اُسکو جاری کیا ہو اس صفت سے

خالی نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ یا تو منصفانہ قانون کہلائے، یا ظالمانہ قانون کے نام سے موسوم ہو، یا وہ نہ منصفانہ ہو، نہ ظالمانہ بلکہ اخلاق کے لحاظ سے اُس کی کوئی قیمت اور کوئی وقعت نہ ہو۔ پس اگر وہ قانون نہ منصفانہ تھا نہ ظالمانہ تو نوعِ انسان کے دل میں انصاف اور ظلم کا خیال کہاں سے پیدا ہوا۔ اور اگر وہ منصفانہ یا ظالمانہ قانون تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ انصاف یا ظلم کی تصویر پہلے ہی سے اُن کے ذہنوں میں موجود تھی۔

میں چند الفاظ اسپر اور بڑھاتا ہوں اور وہ یہ ہیں کہ اگر کسی فعل کی اخلاقی لحاظ سے کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تو لوگوں کے اتفاقِ رائے سے اُس فعل میں کوئی قدر و قیمت نہیں آسکتی۔ اسی طرح اگر کسی فعل میں اخلاقی قدر و قیمت موجود ہے تو لوگوں کے اختلاف سے اُس فعل کی وہ قدر و قیمت نہیں جا سکتی۔ فرض کرو کہ ایک قوم نے ایک ایسے فعل سے باز رہنے پر اتفاق کر لیا ہے جو اخلاق کے لحاظ سے کچھ بھی وزن نہیں رکھتا۔ نہ اُسکو کانشنس سے کوئی تعلق ہے تو لوگ اُس فعل کے کرنے سے اسلیئے باز رہینگے کہ اُن کو اُس قوم کیطرف سے سزا کا خوف ہے، نہ اسلیئے کہ وہ فعل بذاتہ بُرا ہے اور اُسکے کرنے سے خود اُنکا کانشنس منع کرتا ہے۔ پس اگر تمام دُنیا کے بادشاہ اور واضعانِ قانون کسی ذاتی غرض سے، یا کسی سبب سے مثلاً استبدا پر اتفاق کر لیں کہ سر کے بالوں کا مونڈنا ایک منصفانہ فعل ہے اور اُن کا نہ مونڈنا سراسر ظلم ہے، حالانکہ اِس فعل کو ظلم و انصاف سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو اُن کا اور ایک اپاہج اور کمزور آدمی کا حکم اصلیت کے لحاظ سے برابر ہوگا کیونکہ لوگ اُس حکم کو یہ سمجھکر کہ اُن کا کانشنس اُسکو اچھا بتاتا ہے نہیں مانینگے بلکہ سزا کے خوف سے اُسپر مجبوراً عمل کرینگے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ افعال کے حُسن و قبح کی جو توجیہ آپ نے کی وہ کافی نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض ۔ اچھا آپ میرے مذہب کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ میرا مذہب یہ ہے کہ اخلاقی افعال بذاتہ اچھے یا بُرے نہیں ہیں بلکہ اُنپر حُسن و قبح کے الفاظ اسلیئے بولے جاتے ہیں کہ بہت قدیم زمانے سے لوگوں نے اپنی اولاد کو بعض افعال کے اچھے ہونے اور بعض کے بُرے ہونے کی تعلیم دی ہے۔ اور اسی فیلنگ کے سایہ میں اُن کی پرورش اور تربیت کی گئی ہے۔ اسی سبب سے بعض افعال کو لوگ اچھا سمجھنے لگے اور بعض کو بُرا جاننے لگے ورنہ حقیقت میں کوئی فعل نہ اچھا ہے، نہ بُرا ہے۔ یہ مذہب لاک اور بیلی وغیرہ فلاسفروں کا ہے اور میں اسی مذہب کو مانتا ہوں۔

بدیہی ۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ تعلیم و تربیت سے انسان کے خیالات بدل سکتے ہیں اور اُسکے افعال و عادات میں تغیر ہو سکتا ہے مگر تعلیم و تربیت اُسکی ذات میں کوئی ایسی نئی چیز پیدا نہیں کر سکتی جو پہلے سے بالقوہ، یا بالفعل موجود نہو۔ میں نے اس سے پہلے جو اعتراض ہوبس کے مذہب پر کیا ہے، وہی آپکے مذہب کی تردید کے لیئے کافی ہے۔ کیونکہ والدین نے جو اولاد کو یہ سکھایا کہ بعض افعال اچھے ہیں، اُن کو کرنا چاہیئے۔ اور بعض افعال بُرے ہیں، اُن کے کرنے سے باز رہنا چاہیئے، اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے سے افعال میں اخلاقی صفت کے ہونے کا یقین کرتے تھے۔ اور اچھے اور بُرے افعال میں تمیز کر سکتے تھے۔ ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ بعض کو حَسَن اور بعض کو قبیح ٹھہراتے اور کیونکر اپنی اولاد کو بتا سکتے تھے کہ یہ افعال اچھے اور یہ بُرے ہیں۔ اُن کو کرنا چاہیئے اور اِن سے باز رہنا چاہیئے۔ اگر آپ کہیں کہ والدین کے ذہنوں میں افعال کے حُسن و قبح کا خیال پہلے سے بذاتہ موجود نہ تھا بلکہ اُن کے والدین نے اُن کو سکھایا تھا کہ

 کانشنس اور اخلاق پر ایک عجیب مکالمہ

وہ افعال اچھے ہیں اور یہ برے ہیں، تو میں پھر سوال کرونگا کہ اُن کو افعال کا حسن و قبح کس نے سکھایا تھا - اِس سے یا تو دَور لازم آئیگا، یا تسلسل - حالانکہ دَور بھی باطل ہے اور تسلسل بھی - ناچار آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اخلاقی افعال بذاتہ اچھے، یا برے ہوتے ہیں - اور انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ اُن کے حسن و قبح کو جانے اور پہچانے - اور یہی مذہب صحیح ہے -

چوتھا معترض - میں دیکھتا ہوں کہ آپنے اپنے دلائل کے زور سے میرے معزز دوست پر جادو کا سا اثر ڈالدیا ہے - مگر میں تو کبھی نہ مانونگا کہ جن مقدمات سے آپ نے کام لیا ہے اُن سے دَور و تسلسل لازم آتا ہے کیونکہ ابھی یہ کہنا ممکن ہے کہ ہمارے سب سے پہلے بزرگوں کو خدا نے افعال کا حسن و قبح بطور الہام کے بتایا - اُنھوں نے اپنی اولاد کو سکھایا - اولاد نے اپنی اولاد کو - اسیطرح سلسلہ بسلسلہ حسن و قبح کا خیال ہم تک آپہونچا - اس سے نہ دَور لازم آتا ہے، نہ تسلسل - پس تمام افعال اصل میں ایک ہی جیسے تھے مگر خدا نے اپنی مرضی سے بعض کو اچھا اور بعض کو برا ٹھہرادیا -

بدیہی - اِسمیں شک نہیں ہے کہ جن افعال کے کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے وہ افعال اچھے ہیں اور اُن کا کرنا واجب ہے اور جن افعال سے باز رہنے کا حکم دیا ہے وہ برے ہیں اور اُن سے باز رہنا ہم پر فرض ہے مگر میری یہ راے نہیں ہے کہ اصل میں تمام افعال ایک ہی جیسے تھے - خدا کے حکم دینے سے بعض افعال اچھے ہوگئے اور اُسکے منع کرنے سے بعض افعال برے ہوگئے - بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ہمکو اُنھیں افعال کے کرنے کا حکم دیتا ہے جو اصل میں اچھے ہیں اور اُنھیں افعال سے منع کرتا ہے جو اصل میں برے ہیں - ورنہ یہ ماننا پڑیگا کہ محض خدا کی مرضی سے بعض افعال اچھے ہوگئے اور بعض برے ٹھہر گئے - حقیقت میں جن افعال کو اُسنے اچھا بتایا ہے وہ برے ہیں اور جن کو اُسنے برا بتایا ہے وہ اصل میں اچھے ہیں - اگر خدا چاہے تو شیطان کے افعال کو اچھا اور فرشتوں کے افعال کو برا ٹھہرادے - اور یہ کہنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی کہے کہ اگر خدا چاہے تو دو اور دو کو پانچ کرسکتا ہے - اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا کہنا کسقدر بعید از عقل ہے -

پانچواں معترض - آپ اس ردّ و قدح کو چھوڑیں اور میری طرف متوجہ ہوں - میں اسبات کو مانتا ہوں کہ ہر انسان افعال کے حسن و قبح کے جاننے پر اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبول ہے - مگر افعال کا حسن و قبح ذاتی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے - خدا نے انسان میں ایک حاسّہ منجملہ حواس کے رکھا ہے جس سے وہ افعال کے حسن و قبح کو محسوس کرتا ہے - جسطرح آنکھوں کو بعض چیزیں اچھی دکھائی دیتی ہیں اور بعض بری نظر آتی ہیں - کانوں کو بعض آوازیں مکروہ معلوم ہوتی ہیں اور بعض آوازیں دلکش سنائی دیتی ہیں - زبان کو بعض چیزیں بدمزہ اور بعض چیزیں خوشگوار محسوس ہوتی ہیں - اسیطرح اُس حاسّے کو بعض افعال اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بعض برے - جنکو وہ اچھا بتاتا ہے اُنکو انسان اچھا جانتا ہے اور جنکو وہ برا بتاتا ہے اُنکو برا سمجھنے لگتا ہے - پس افعال کا اچھا، یا برا جاننا اُسی حاسّے کا کرشمہ ہے جسکو اخلاقی حاسّہ کہا جاتا ہے - یہ مذہب انگلستان کے مشہور فلاسفر ہیوم کا ہے اور میں اسی مذہب کا پیرو ہوں -

بدیہی - اگر اخلاقی حاسّے سے آپ کی مراد وہ قوت ہے جس کی مدد سے عقل انسانی بعض افعال کو بالواسطہ نہیں بلکہ بذاتہ اچھا اور بعض کو برا جانتی ہے

کانشنس اور اخلاق پر ایک دلچسپ مکالمہ

تو آپ کی راے صحیح ہی اور آپ کی اور میری توجیہ میں صرف الفاظ کا فرق ہی لیکن اگر آپ کی یہ مراد ہی جیسا کہ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ اخلاقی حاسہ باقی حواس کی طرح ہی تو آپ کی راے صحیح نہیں ہی۔ کیونکہ خاص خاص افعال کے حسن یا قبیح ٹھرانے میں جو اختلاف پایا جاتا ہی وہ اس بات پر دلیل بیّن ہی کہ جس حاسہ کا آپ نے ذکر کیا وہ موجود نہیں ہی، یا کم سے کم وہ باقی حواس سے بالکل مختلف ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دو آدمی بھی اگر اُن میں سے کسی کی بینائی میں فرق نہیں ہی سُرخ رنگ کو سفید رنگ سے تمیز کرنے میں ذرا بھی اختلاف نہیں کرتے۔ اسی طرح دو آدمی بھی اگر اُن میں سے کسی کی ذائقہ میں خلل نہیں آیا، مٹھاس اور کھٹھاس کے پہچاننے میں ایکدوسرے کے برخلاف راے نہیں رکھتے مگر کانشنس کا حال اسکے بالکل برعکس ہی۔ اگرچہ وہ عام طور پر اخلاقی افعال کی صفات کو جان لیتا ہی مگر خاص خاص افعال کے حُسن و قبح میں جگہ اور وقت اور حالات کی بدلنے سے کبھی کبھی ایک کانشنس دوسرے کانشنس سے برخلاف نتیجہ نکالتا ہی۔ جب آپ کہتے ہیں کہ کانشنس ایک حاسہ منجملہ حواس کے ہی تو آپ کو لازم تھا کہ آپ اُس میں اور حواس میں مشابہت کا ہونا بیان کرتے مگر میں ثابت کر چکا ہوں کہ دونوں میں کوئی مشابہت نہیں ہی۔ پس آپ کا دعویٰ سراسر باطل ہی۔ باوجود اسکے اگر ہم حواس اور کانشنس کے درمیان مشابہت ہونے یا نہ ہونے کا ذکر چھوڑ دیں اور یہ مان لیں کہ کانشنس منجملہ حواس کے ایک حاسہ ہی تو ہمکو بدیہیات اور اوّلیات کی دریافت کرنیوالی قوت کو بھی حواس میں شامل کرنے سے ذرا تامل نہ ہوگا کیونکہ جسطرح ہم بدون اسکے کہ کوئی ہم کو سکھاے، یہ جان لیتے ہیں کہ کُل جُزو سے بڑا ہی۔ اسیطرح افعال میں حُسن و قبح کا ہونا بغیر کسی تعلیم کے پہچان لیتے ہیں۔ پس اگر دوسری امر کی دریافت کرنیوالی قوت منجملہ حواس کے ایک حاسہ ہوسکتی ہی تو پہلے امر کی بتانیوالی قوت بھی ضرور حواس میں شامل کیجائیگی۔ اور اسپر سب کا اتفاق ہی کہ بدیہیات کے معلوم کرنے کے لیے کسی حاسے کی ضرورت نہیں ہی۔ پس یہ کہنا بھی کچھ بیجا نہیں ہی کہ کانشنس کو حواس کے زمرے میں داخل کرنا بھی ایک تکلیف لا طائل ہی اور اخلاقی حاسے کے وجود کو تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہی۔

چھٹا معترض۔۔ میری راے اُن سب سے جُدا ہی جن کے مذہب پر آپ اس سے پیشتر اعتراض کر چکے ہیں۔ میرے نزدیک تمدّنی حالات ہی انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بعض افعال کو اچھا اور بعض کو بُرا۔ بعض کو حَسَن اور بعض کو قبیح ٹھرائے۔ اسکو آپ بھی مانتے ہونگے کہ انسان ایک سوشیل حیوان ہی جو وحشت اور تنہائی سے بھاگتا اور میل جول اور محبت و ہمدردی کی طرف طبعی میلان رکھتا ہی۔ چونکہ میل جول اور محبت و ہمدردی اسیوقت میسر آسکتی ہی جبکہ ہر شخص اپنے افعال میں اُن مصلحتوں کا لحاظ رکھے جن پر تمام سوسائٹی کی بہبودی اور زندگی کا مدار ہی۔ اور اُن باتوں سے بچے جن سے ذاتی خوشی اور ذاتی فائدہ حاصل ہوتا ہی مگر اُن سے اوروں کو نقصان پہونچتا ہی۔ اسلیے نوع انسان نے شخصی اور قومی زندگی کے قائم رکھنے کے لیے اُن افعال کو جن سے سوسائٹی کو نفع پہونچتا ہی حَسَن قرار دیا اور اُن افعال کو جن سے اُسکے وجود کو ضرر پہونچتا ہی قبیح ٹھرایا۔ مفید افعال کے کرنے کا حکم دیا اور مضر افعال سے باز رہنے کی تاکید کی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ افعال حَسَنہ وہی ہیں جن سے سوسائٹی کے وجود کو فائدہ پہونچتا ہی اور افعال ذمیمہ وہی ہیں جن سے اُس کی بہبودی اور زندگی کو خطرہ ہی۔ یہ خیال باپوں سے بیٹوں کو اور بیٹوں سے پوتوں

کو پھونچا اور ہم تک سلسلہ بسلسلہ آیا۔ اب اسی بُنیاد پر ہم بعض اخلاقی افعال کو اچھا اور بعض کو بُرا جانتے ہیں۔

مذہبی۔۔ یہ مذہب فلاسفہ افادیین کا ہی جو مفید افعال کو حسَن اور مضر افعال کو قبیح جانتے ہیں۔ اور جن افعال سے نہ ضرر پھونچتا ہی، نہ نفع اُن کو اخلاق کے دائرے سے خارج کرتے ہیں۔ مگر اُن کے دو بڑے فرقے ہیں۔ ایک فرقہ وہ ہی جو کہتا ہی کہ نیک افعال وہ ہیں جنکا فائدہ سوسائٹی کے افراد کو پھونچے۔ دوسرا فرقہ وہ ہی جو اُن افعال کو نیک اور حسَن ٹھراتا ہی جن کا فائدہ من حیث المجموع سوسائٹی کو حاصل ہو۔ پہلے فرقے کے آدمی بہت تھوڑے ہیں مگر دوسرے فرقے کے لوگ بہت ہیں اور اُن کا مذہب عام طور پر شائع ہی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں فرقوں میں سے اپنے تئیں کس فرقے میں شمار کرتے ہیں۔

اِفادی۔۔ میرا مذہب یہ ہی کہ نیک افعال وہی ہیں جنکا فائدہ سوسائٹی کو پھونچے، نہ کہ افراد کو۔ میرے دعوے کے ثبوت کے لیئے بہت سے دلائل ہیں مگر میں ذیل کے چند دلائل کا بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

(اوّل) میرا دعوے نہایت مضبوط اور قوی ہی اسلیئے کہ میرے نزدیک کلیہ ہی کہ ہر نیک کام مفید ہی اور بُرا کام مضر ہی۔ کوئی فعل اچھا نہیں ہی جبتک کہ وہ مفید نہو۔ اور کوئی فعل بُرا نہیں ہی جبتک کہ وہ مضر نہ ہو۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ تمام افعال جن کو ہم اچھا سمجھتے ہیں مفید ہوتے ہیں تو ہم اُن کی افادہ یعنی نفع پھونچانے کی خاصیت کو اُن افعال کے اچھا ہونے کی وجہ کیوں نہ ٹھرائیں؟ اور یہ کیوں نہ کہیں کہ یہی خاصیت ہی جس نے اُن کو ہماری نظر میں اچھا ٹھرایا ہی؟ اور اس بات کے ماننے کی کیا حاجت ہی کہ وہ افعال بذاتہ اچھے ہیں۔

(دوم) جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فائدہ رسانی افعال کے عمدہ ہونے کی بنیاد ہی اور ضرر رسانی اُن کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ ہی تو ہمارا قول آسانی سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہی۔ مثلاً جب ہم کسی شخص سے کہیں کہ خونریزی نکرو اسلیئے کہ اس سے تمہارے ہم قوم آدمیوں کو ضرر پھونچتا ہی اور یہ فعل اُنکو زندگی کی لذّت سے ہمیشہ کے لیئے محروم کردیتا ہی تو وہ صاف طور پر اس فعل کی بُرائی کو سمجھ جائیگا اور اسکو بُرا جانیگا اور اُس سے اجتناب کریگا لیکن اگر ہم اُس سے کہیں کہ قتل سے بچو اسلیئے کہ قتل کرنا ایک ایسا فعل ہی جو بذاتہ قبیح ہی تمکو اپنے تئیں اس قبیح فعل کے ساتھ آلودہ کرنا نہیں چاہیئے تو وہ ہرگز اس فعل کی بُرائی کو نہ سمجھیگا۔ نہ اجتناب کرنے کیلیئے کوئی قوی وجہ اُسکو معلوم ہوگی۔

(سوم) ہمارے افعال سے جسقدر نفع عام آدمیوں کو پھونچ سکتا ہی وہی اُن افعال کی قدر و قیمت ہی چنانچہ لوگوں میں جب اس بات پر اختلاف ہوتا ہی کہ دو عمدہ اور نیک افعال میں سے کون فعل زیادہ اچھا ہی تو اُنکے نتائج کو دیکھتے ہیں۔ جسکو زیادہ مفید پاتے ہیں، اُسیکو زیادہ اچھا جانتے ہیں۔ پس اگر عمدہ افعال سے کوئی فائدہ ہمکو نہیں پھونچتا تو اُن کی کچھ بھی وقعت نہیں۔ اور اگر بُرے افعال سے ہمکو کوئی ضرر نہیں پھونچتا تو وہ افعال اور ایسے عمدہ افعال، جو مفید نہیں ہیں، برابر ہیں۔ اور سچ اور جھوٹ میں۔ ظلم اور عدل میں۔ بدی اور نیکی میں۔ حلال و حرام میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

(چہارم) اگر اچھے افعال مفید نہ ہوتے تو اُن کا کرنا ہمپر واجب نہ ہوتا اور اگر بُرے افعال سے ہمکو ضرر نہ پھونچتا تو اُن سے ہمکو باز رہنے کی تاکید نہ کی جاتی۔ پس اگر کوئی حاکم، یا ناصح ہمکو ایسا کام

کرنے کا حکم دے جس سے ہمکو اور ہماری قوم کو نہ کوئی فائدہ ہی، نہ نقصان، تو اُسکا حکم پادر ہوا سمجھا جائیگا

(پنجم) یہ بات ہماری فطرت میں داخل ہی کہ جب ہمارے ابنا جنس خوش ہوں تو ہم بھی انکی خوشی میں شریک ہوں اور جب وہ غمگین ہوں تو ہم بھی اُن کی غم میں حصہ لیں کیونکہ ہمارے اور اُن کے درمیان ہمدردی کا تعلق ہی۔ اسی بنا پر مفید کاموں کو ہم اسلیے اچھا جانتے ہیں کہ اُن سے ہمارے ابنا جنس کو خوشی حاصل ہوتی ہی اور اُن کے خوش ہونے سے ہمکو خوشی ہوتی ہی۔ اسیطرح ہم مضر کاموں کو اسلیے بُرا جانتے ہیں کہ اُنسے ہمارے ابنا جنس کو تکلیف پہونچتی ہی اور اُن کی تکلیف سے ہمکو تکلیف ہوتی ہی۔ ہم جو بعض افعال کو اچھا جانتے اور بعض کو بُرا جانتے ہیں اسکا اصلی بھید یہی ہی۔ اب میں اپنا مذہب تفصیل سے بیان کر چکا کہ فائدہ رسانی افعال کو ہماری نظر میں اچھا اور قابل تحسین کر دیتی ہی اور ضرر رسانی اُن کو بُرا اور لائق مذمت بنا دیتی ہی۔ اخلاقی افعال کی ذاتی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں ہی۔ اگر کچھ ہی تو وہ بلحاظ ان کی نفع رسانی اور ضرر رسانی کے ہی۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افعال کا حُسن و قبح ذاتی نہیں ہی جیسا کہ آپ نے خیال کیا بلکہ اضافی ہی۔

بدیہی — میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جو کچھ آپ نے ابتک بیان کیا اُسمیں صداقت اور راستی کی جھلک پائی جاتی ہی لیکن اُسی حالت میں جبکہ اُسپر دوسرے پہلو سے نظر ڈالی جائے۔ اس سے پیشتر کہ میں آپکے خیالات پر ریمارک کروں، یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جن باتوں کو میں تسلیم کرتا ہوں اور جنکو نہیں مانتا، اُنکو صاف صاف بیان کر دوں۔

(اوّل) میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہر اچھا فعل مفید ہوتا ہی اور ہر بُرا فعل مضر ہوتا ہی لیکن اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ اچھے فعل کا اچھا ہونا اس سبب سے ہی کہ وہ مفید ہی یعنی مفید ہونے کو میں کسی فعل کے اچھے ہونیکا سبب نہیں ٹھراتا کیونکہ اسکے خلاف بھی ہو سکتا ہی۔ مثلاً ممکن ہی کہ کوئی اچھا فعل اسلیے مفید ہو کہ مفید ہونا اُسکی ذات میں داخل ہی۔ اِس صورت میں برخلاف آپ کے دعوی کے وہ فعل علت ہی اور مفید ہونا معلول ہی۔

(دوم) میں مانتا ہوں کہ جب دو اچھے کاموں کی نسبت لوگوں میں اس بات پر اختلاف ہوتا ہی کہ اُن میں کونسا کام زیادہ اچھا ہی تو زیادہ مفید کو زیادہ اچھا قرار دیتے ہیں مگر مجھے اس بات سے قطعی انکار ہی کہ مفید ہونا اُس کام کے زیادہ اچھے ہونے کا سبب ہی۔ میرے نزدیک اس سے اتنا ہی لازم آتا ہی کہ مفید ہونے سے اُس کام کا عمدہ اور اعلیٰ ہونا ثابت ہوتا ہی۔ پس مفید ہونا منجملہ دیگر پیمانوں کے ایک پیمانہ ہی جس سے افعال کی اخلاقی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہی۔ مجھ میں اور آپ میں جو اختلاف ہی وہ اتنا ہی ہی کہ آپ افعال کے مفید او مضر ہونے کو اُن کے حُسن و قبح کی علت ٹھراتے ہیں اور میں فائدہ او نقصان کو بھلائی اور بُرائی کا معلول جانتا ہوں۔ وجدان کی شہادت بتاتی ہی کہ کسی چیز کا مفید ہونا ہمکو اچھا معلوم ہوتا ہی مگر یہ اچھا معلوم ہونا کوئی اخلاقی فیلنگ نہیں ہی کیونکہ اگر ایسا ہی ہو تو اسکی کیا وجہ ہی کہ ہم جسطرح اُن آدمیوں کے افعال کو اچھا جانتے ہیں جن سے ارادے اور شعور کے ساتھ وہ افعال صادر ہوتے ہیں، اُسطرح مجنوں اور بے شعور آدمیوں یا بے زبان جانوروں کے افعال کو اچھا نہیں جانتے اور دونوں قسم کے افعال سے ہمارے دل پر یکساں اثر نہیں ہوتا۔ نہ ویسا اثر بیجان چیزوں کے مفید ہونے سے ہمکو محسوس ہوتا ہی۔ مثلاً بھاپ کی کلوں۔ بجلی کی آلوں۔ چھاپہ کے اوزاروں نے جو بیشمار فائدے دُنیا کو پہونچائے اُن کا عُشر عشیر بھی کسی آدمی سے

نفع نہیں ہے۔ باوجود اسکے کوئی ذی عقل آدمی ان کلوں ۔ آلوں اور اوزاروں کو انسانوں کی طرح محسن نہیں جانتا نہ اُن کے مفید کاموں کو اُس دلچسپی اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہی جس سے وہ نیک آدمیوں کے عمدہ افعال کو دیکھتا ہی۔ پس اگر مفید ہونا افعال کی حُسن و قبح کی علت ہوتی تو انسان کے اخلاقی افعال اور مفید آلات سے یکساں اثر ہمارے دل پر ہوتا۔ چونکہ یہ اثر بعض پہلو سے مختلف ہوتا ہی اس لیئے مجبوراً ہمکو ماننا پڑیگا کہ مفید ہونا افعال کے حُسن و قبح کی علت نہیں ہی۔

افادی۔ نفع سے میری مراد وہ نفع ہے جو عاقل و بالغ اشخاص کے افعال سے حاصل ہوتا ہی۔ مفید آلات یا بے شعور اشخاص یا بے زبان حیوانات یا بیجان اشیا کے نفع سے میرے دعوے کو کوئی تعلق نہیں ہی۔

بدیہی۔ اگر آپکے نزدیک محض مفید ہونا اچھے ہونے کی اور مضر ہونا بُرے ہونے کی دلیل ہی تو آپ کو یہ قید لگانے کی ضرورت نہیں ہی کہ وہ فائدہ عاقل و بالغ اشخاص کے افعال سے حاصل ہوتا ہو۔ کیونکہ نفع اور ضرر جسطرح انسان کے افعال سے ہوتا ہی اسیطرح آلات و اشیا سے بھی ہوتا ہی۔ اسکے علاوہ آپکا یہ قید لگانا اسبات پر واضح دلیل ہی کہ اخلاقی افعال اور مفید افعال میں بڑا فرق ہی۔ کیونکہ اگر دونوں میں کوئی فرق نہوتا اور اخلاقی افعال وہی افعال ہوتے جو مفید ہیں تو جو اثر اخلاقی افعال سے دل پر ہوتا وہی اثر مفید افعال سے بھی ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہی کہ وہ مذہب جو نفع اور ضرر کو افعال کے حُسن و قبح کی علت قرار دیتا ہی صحیح نہیں ہی۔

آخری معترض۔ کانشنس اور اخلاق کے مسئلے پر اب بہت سی بحثیں ہو چکیں اور ہر شخص نے اپنے دل کا بخار اچھی طرح نکال لیا ہی اور اب کوئی حاجت زیادہ بولنے کی نہیں رہی مگر اس بحث کے خاتمے پر میں بھی چاہتا ہوں کہ چند الفاظ کہنے کی آپ سے اجازت لوں اور وہ یہ ہیں کہ جب بموجب آپ ہی کے قول کے کانشنس غلطی کرنے سے معصوم نہیں ہی اور وہ غلطی کر سکتا ہی تو ہمکو اس کے وجود سے کیا فائدہ ہی۔ اس صورت میں ہم اُسپر کیونکر بھروسا کر سکتے ہیں اور کسطرح اُسکے حکم پر گردن جھُکا سکتے ہیں۔

بدیہی۔ کانشنس کے غلطی کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اُسکے مفید ہونے سے انکار کریں کیونکہ تمام عقلی قوتیں بھی غلطی میں مبتلا ہو سکتی ہیں مثلاً ہمارا حافظہ غلطی کر سکتا ہی۔ متخیلہ غلطی کر سکتا ہی۔ بلکہ رائے دینے اور استدلال کرنیکی قوتیں بھی غلطی کر سکتی ہیں مگر کسی کی مجال نہیں ہی کہ ان قوتوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکے۔ یہی حال کانشنس کا ہی۔ آپکا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہی کہ جب کانشنس غلطی کر سکتا ہی تو ہم اُسپر بھروسا نہیں کر سکتے۔ نہ اُسکے حکم کو مان سکتے ہیں۔ اس لیئے کہ جہاں انسان کا یہ فرض ہی کہ کانشنس کے حکم کو مانے اُسپر یہ بھی واجب ہے کہ وہ کانشنس کے خطا، یا صواب پر ہونے کی نگرانی بھی کرتا رہے تاکہ وہ افعال کے اچھے ہونے، یا بُرے ہونے کی نسبت جو رائے دے وہ صحیح ہو اور دھوکا نہ کھائے اور گمراہ ہو۔ میں اپنی تقریر کے خاتمے پر پھر کہنا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کو اپنے کانشنس کی اطاعت کرنا واجب ہی کیونکہ اگر اسکی اطاعت نہ کریگا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی کہے کہ اس کام کا کرنا تو مجھپر واجب ہے مگر میں اُسکو کرونگا نہیں اسی بنا پر اُس سے مواخذہ ہو سکتا ہی کہ اُس نے اپنے کانشنس کی اطاعت کیوں نہیں کی۔

(رشید احمد سالم)

ملا نظام الدین علیہ الرحمۃ بانی درسِ نظامیہ

مُلّا نظام الدّین علیہ الرّحمۃ

بانیٔ درس نظامیہ

آج تمام ہندوستان میں عربی تعلیم کا جو نصاب ہے وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہی لیکن یہ سخت تعجب ہی کہ اکثر لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ نصاب کب بنا اور کسنے بنایا۔ حال کی ایک تصنیف میں اُسکو نظام الملک وزیر دولتِ سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہی۔ پُرانے تعلیم یافتہ اسقدر جانتے ہیں کہ اسکے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہیں لیکن اس سے زیادہ اُنکو بھی واقفیت نہیں۔

ملا نظام الدین صاحب جس رُتبے کے شخص تھے اور خصوصًا اس نصاب کے قائم کرنے سے اُنکو جو شہرت حاصل ہوئی اسکے لحاظ سے میں ایک مدت سے اس بات کا آرزومند تھا کہ انکے مفصل حالات دریافت کروں لیکن چونکہ ہمارے ملک میں بیوگرفی (سوانح عمری) لکھنے کا طریقہ بہت کم تھا اسلیئے اس آرزو کے پورے ہونیکی بہت کم امید ہوسکتی تھی۔ میر غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں مختصر طور پر انکا تذکرہ کیا ہی جو بالکل ناکافی ہی۔ بڑی تلاش سے ایک رسالہ ہاتھ آیا جو مولانا ولی اللہ صاحب فرنگی محلی (محشّی صدرا) کی تصنیف ہی اور خاص مُلّا صاحب مرحوم کے حالات میں ہی لیکن اسمیں اصلی حالات نہایت کم ہیں۔ البتہ انکی کرامتوں اور خرقِ عادات کا ایک بڑا دفتر ہی اور وہ اس زمانے کے کام کا نہیں۔

تاہم بمصداق ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ میں ایک مختصر سا خاکہ انکی سوانح عمری کا ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

[لکھنؤ کے اطراف میں جو مردم خیز بستیاں ہیں انمیں ایک مشہور قصبہ سہالی ہی جو لکھنؤ سے آٹھ میل ہے۔

خاندان کا حال ایہاں مسلمانوں کے دو مشہور خاندان آباد تھے۔ انصاری جو حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد سے تھے، عثمانی یعنی حضرت عثمان کی اولاد سے۔ مُلا صاحب اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ اور انصاری خاندان سے تھے۔ ان کے والد ملا قطب الدین بہت بڑے مستند عالم تھے اور انکا حلقۂ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا۔ عثمانیوں اور انصاریوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایکدن عثمانی۔ مُلا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے اور اُنکو قتل کر کے گھر میں آگ لگادی۔ یہ واقعہ ۱۱۰۳ھ میں پیش آیا۔ چونکہ وہ بے گناہ قتل کیئے گئے تھے قوم نے انکو شہید کا لقب دیا چنانچہ کتب علمیہ میں جہاں اُنکا نام آتا ہی اسی لقب کے ساتھ آتا ہی۔

مُلا قطب الدین صاحب کے چار فرزند تھے۔ بڑے صاحبزادے اُسوقت دلی میں عالمگیر بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد اسعد۔ شیخ محمد سعید، اور ملا نظام الدین مکان پر تھے، ملا قطب الدین صاحب کی شہادت کے بعد یہ لوگ بیکسی کی وجہ سے سہالی سے نکلکر لکھنؤ چلے آئے، لیکن یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سلطنتِ تیموریہ کے زمانے میں چونکہ واقعہ نگاری کا صیغہ نہایت وسعت کے ساتھ قائم تھا اور ملک کا ایک ایک جزئی واقعہ دربارِ شاہی تک پُہنچتا رہتا تھا، لکھنؤ کے واقعہ نگار نے فورًا دربار کو اطلاع دی اور وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ مُلا صاحب کے صاحبزادوں کو فرنگی محل کے محلّے میں ایک قطعہ مکان مع عماراتِ متعلقہ عنایت کیا جائے۔ اطلاع کی تاریخ ۱۴ شعبان ۳۷ جلوسِ والا مطابق ۱۱۰۵ھ اور فرمان کے صادر ہونے کی تاریخ ۱۱۔ شوال ۳۸ جلوس والا ہی۔ اس فرمان کی کچھ عبارت ہم آگے نقل کرینگے۔

لکھنؤ میں آباد ہونیکا سبب

ملا نظام الدین صاحب جنکا ہم تذکرہ لکھ رہے ہیں اسوقت پانزدہ سالہ تھے۔ اسلئے فرمان میں اُن کا نام نہیں ہے، بلکہ اُن کے دونوں بڑے بھائیوں کا ہے۔ یہ فرمان ابتک اس خاندان میں موجود ہے اور میں نے ایکدفعہ لکھنؤ میں اسکی زیارت کی تھی۔ چنانچہ ہم اسکے ضروری الفاظ اسموقع پر درج کرتے ہیں۔ پیشانی پر عالمگیر کی مہر ہے۔

عالمگیر کا فرمان

دامن میں یہ عبارت ہے۔ "دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یکمنزل حویلی فرنگی با متعلقہ آں واقع بلدہ لکھنؤ مضاف بہ صوبہ اودہ کہ از امکنہ نزولی است برای بودن شیخ محمد و محمد اسعد پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم۔ باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آنرا بنام مشارٌ الیہما معاف و مرفوع القلم داشتہ بوجہے من الوجوہ مزاحم و متعرض نشوند و اندریں باب سند مجدد نہ طلبند۔ مرقوم غرۂ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے، اُسکا پہلا فقرہ یہ ہے

شرح یادداشت واقع تاریخ روز پنجشنبہ ۱۶ شعبان المعظم سنہ ۳۷ جلوس والا موافق سنہ ۱۱۰۵ ہجری مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت و احسان صدر رفیع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی ہیگردد کہ بہ عرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود با قصبہ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکان

سکونت نہ دارند الخ

طالب علمی

جس وقت ملا قطب الدین صاحب کا خاندان لکھنؤ میں آکر آباد ہوا۔ ملا نظام الدین صاحب کی عمر پندرہ برس کی تھی اور شرح جامی پڑھتے تھے۔ اگرچہ اسوقت تک اطمینان کی معقول صورت نہیں پیدا ہوئی تھی تاہم ملا صاحب نے فراغ خاطر کا انتظار نہ کیا اور علوم کی تحصیل جاری رکھی۔ غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ "ملا صاحب نے پورب کا سفر کیا اور مختلف شہروں میں تحصیل کی۔ اخیر میں لکھنؤ واپس آکر شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور انہی سے سند فضیلت حاصل کی"۔ لیکن مولوی ولی اللہ صاحب نے جو مستقل رسالہ انکی سوانح عمری میں لکھا ہے اسمیں لکھا ہے کہ ابتدائی کتابیں دیوا میں اور اور قصبات میں جاکر پڑھیں لیکن انتہائی کتابیں بنارس جاکر حافظ امان اللہ بنارسی سے ختم کیں۔ فرنگی محل میں آج جو روایت مشہور ہے وہ بھی اسکی مؤید ہے۔

فراغ تحصیل کے ساتھ ہی ملا صاحب اپنے والد بزرگوار کی سند درس پر متمکن ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں انکا آستانہ تمام مشرقی ہندوستان کا مرجع بنگیا۔

تصوف

علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہوکر ملا صاحب نے علوم باطنی کی طرف توجہ کی۔ اُسوقت حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب بانسوی کے فیوض و برکت کا تمام ہندوستان میں غلغلہ تھا، ملا صاحب ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور ان کے ہات پر بیعت کی۔ شاہ صاحب موصوف علوم رسمیہ سے نا آشنا تھے اسلئے تمام لوگوں کو نہایت استعجاب ہوا، یہاں تک کہ علماء فرنگی محل نے علانیہ ملا صاحب سے شکایت کی، ملا صاحب کی تلامذہ میں سے ملا کمال علوم عقلیہ میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور چونکہ بے انتہا ذہین اور طباع تھے کسیکو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ملا صاحب کی بیعت پر وہ بدگمانی

عرض کیا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہات پر کیوں بیعت کی، اسپر بھی قناعت نہ کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچے اور فلسفے کے چند مشکل مسئلے سوچکر گئے کہ شاہ صاحب سے پوچھینگے اور اُن کو الزام دینگے مشہور ہو کہ شاہ صاحب نے خود اُن مسائل کو چھیڑا اور ملا کمال کی خاطر خواہ تسکین کر دی، چنانچہ اُسیوقت ملا کمال اور ان کے ساتھ اور بہت سے علما شاہ صاحب کے قدموں پر گرے اور اُن کے ہات پر بیعت کی۔

شاہ صاحب نے ۱۱۳۶ھ میں رحلت فرمائی۔ انکی وفات کے بعد ملا نظام الدین صاحب نے اُن کے خلیفہ سید اسمٰعیل بلگرامی سے باطنی فیوض حاصل کیے

بیماری اور وفات ملا صاحب کو ابتدا سے قرحہ کا مرض تھا لیکن کبھی معالجے کی طرف توجہ نہ کی اخیر عمر میں جبکہ سن شریف ۷۵ برس کو پہونچگیا نہایت ضعیف ہو کر صاحب فراش ہوگئے، اور زنانخانے میں رہنے لگے، لیکن چونکہ نہایت کثرت سے لوگ بیمار پرسی کو جاتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی تھی - ملا احمد عبد الحق صاحب نے عرض کیا کہ حضور اگر دیوانخانے میں تشریف رکھتے تو بہتر ہوتا - ملا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا - دوسرے دن شاہ عبد النبی صاحب عیادت کو آئے تو ملا صاحب نے یہ مصرع ؎ ہر روز بینم تنگ تر سوراخ این غربالہا پڑھ کر فرمایا کہ اچھا میاں عبد الحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چنانچہ دیوانخانے میں اُٹھ کر تشریف لائے اور وہیں وفات کی -

ملا صاحب کی دو بیویاں تھیں، دوسری شادی غالبًا اس غرض سے کی تھی کہ پہلی سے اولاد نہیں ہوتی تھی بیماری کو جب اشتداد ہوا تو زوجہ اولیٰ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو تقصیر ہوئی ہو، معاف فرمایئے - فرمایا کہ تم نے کوئی تقصیر نہیں کی البتہ مجھ سے یہ گناہ ہوا کہ تمھارے ہوتے دوسری شادی کی - اس جرم کو معاف کر دو، تھوڑی دیر کے بعد زوجہ ثانیہ آئیں اور کہا کہ آپ تو تشریف لیے جاتے ہیں، اولاد کو کسپر چھوڑے جاتے ہیں - ملا صاحب کو سخت رنج ہوا، حاضرین سے کہا کہ مجھکو اُٹھا کر بٹھا دو پھر فرمایا کہ "نظام الدین تو جاتا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہیگا"

تاریخ وفات آخر نویں تاریخ جمادی الاولیٰ روز چہارشنبہ ۱۱۶۱ھ دو پہر دن چڑھے انتقال فرمایا - تاریخ وفات یہ ہے ع ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد - عربی مادہ یہ ہے - مال العاشق الی المعشوق -

اخلاق و عادات ملا صاحب ابتدا ہی سے نہایت غنی النفس اور متوکل تھے، ان کی علمی شہرت ان کی زندگی ہی میں اس درجے تک پہونچگئی تھی کہ وہ ذرا سی خواہش ظاہر کرتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب حاصل ہو سکتا تھا لیکن اسطرف توجہ نہ کی، تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور نہایت استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے - اُمرا اور اہل دول سے بالکل نہیں ملتے تھے، بلکہ اس قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو بے التفاتی ظاہر کرتے - شیخ غلام مخدوم کا بیان ہے کہ میں ایکدفعہ ملا صاحب کیخدمت میں حاضر تھا اور بیماری کیوجہ سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا - اتفاقًا اُمرا میں سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے - مینے اُن کے لحاظ سے پلنگ سے اُترنا چاہا - ملا صاحب نے فرمایا کہ "سفید پوشوں کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو -

اُمرا شاہی میں سے ایک رئیس جو ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا، ملا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، ایکدفعہ جمعے کے دن عین نماز کیوقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ ذرا انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر حضور کی اقتدا کا شرف حاصل کر سکوں - ملا صاحب نے

ایک ذرا دیر انتظار کیا، پھر فرمایا کہ "نماز خدا کے لیئے ہی اہل دنیا کے لیئے نہیں" یہ کہکر نماز کے لیئے کھڑے ہوگئے

بے نفسی لیکن یہ بے نیازی اور بد دماغی اُمرا اور جاہ پرستوں کے لیئے مخصوص تھی ورنہ مزاج میں نہایت مسکینی اور تواضع تھی۔ ایک دن ایک ایرانی ابو المعالی نام ملا صاحب کا شہرہ سُنکر ملاقات کے لیئے آیا۔ ملا صاحب درسگاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے، اسنے ایرانی علما کا جاہ و جلال دیکھا تھا۔ ملا صاحب کی طرف اسکا خیال نہ جا سکا۔ لوگوں سے پوچھا کہ مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ اسنے چند فقہی مسائل پیش کیئے اور کہا کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب والوں) کے نزدیک ان کا کیا جواب ہے۔ ملا صاحب نے اسکا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایتوں کے موافق جواب دیا۔ نہایت پسند کیا اور کہا کہ انھی مسئلوں کو اہل ضلالت (سُنیوں) کے مذہب کے موافق بیان فرمائیے۔ ملا صاحب نے سُنیوں کی روایتیں بیان کیں۔ وہ عش عش کر گیا اور کہا کہ جسقدر سُنا تھا۔ اُس سے زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ اُنکو فخر اور امتیاز مقصود ہوتا ہے اور اسلیئے وہ کبھی حریف کے مقابلے میں سکوت اختیار نہیں کرتے لیکن ملا صاحب اس داغ سے بالکل پاک تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب اُن سے بحث کرنے کے لیئے آئے ملا صاحب نے مسئلے کی تحقیق بیان کی۔ اُنھوں نے اعتراض کیا۔ ملا صاحب چپ ہوگئے۔ اُنھوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کر دیا۔ ملا صاحب کے تلامذہ کو ناگوار گذرا اور ایک شاگرد نے جا کر اُن صاحب کو زور تقریر سے بالکل ساکت کر دیا۔ ملا صاحب کو خبر ہوئی تو اسقدر برہم ہوئے کہ اُس شاگرد کو حلقۂ درس سے الگ کر دیا اور کہا کہ میں ہرگز یہ نہیں پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

تصنیفات ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں مثلاً شرح مسلّم الثبوت۔ شرح منار مسمی بہ صبح صادق۔ حاشیۂ صدرا۔ حاشیۂ شمس بازغہ۔ حاشیہ بر حاشیۂ قدیمہ۔ یہ تمام کتابیں بڑے پایہ کی ہیں اور نہایت دقیق تحقیقات پر مشتمل ہیں۔

لیکن درحقیقت ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے طریقۂ درس کی بدولت ہے۔ ملا صاحب کے زمانے میں ہندوستان کی تمام اطراف میں بڑے بڑے علما موجود تھے اور ہر ایک کی الگ الگ درسگاہ قائم تھی۔ مثلاً ملا محب اللہ بہاری مصنف سُلّم و مُسلّم المتوفی ۱۱۱۹ھ ملا جیون مصنف نور الانوار المتوفی ۱۱۳۰ھ۔ سید عبد الجلیل بلگرامی استاد غلام علی آزاد المتوفی ۱۱۲۶ھ میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ۔ لیکن ملا صاحب کے حلقۂ درس سے جس رتبے کے فضلا پیدا ہوئے وہ خود ان بزرگوں کی ہمسری کا دعوی کر سکتے تھے۔ ملا صاحب کے فرزند مولانا عبد العلی کو تمام ملک نے بحر العلوم کا لقب دیا جو آج تک مشہور ہے اور درحقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک نہیں پیدا ہوا۔ ملا صاحب کے دوسرے شاگرد ملا کمال اس پایہ کے شخص تھے کہ مولوی حمد اللہ جنکی شرح سلم آج نصاب تعلیم میں داخل ہے، اُنھی کے دامن فیض میں پلے تھے۔ ملا حسن کو بھی ملا صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ملا صاحب کے درس نے اسقدر قبولیت حاصل

کہ ہندوستان میں ہر جگہ یہ سلسلہ انہی کے شاگرد نظر آتے تھے اور لکھنؤ کا فرنگی محل تو علم و فضل کا معدن بن گیا جہاں دو سو برس سے آج تک علمی سلسلہ منقطع نہیں ہوا، اور سینکڑوں اہل کمال پیدا ہو کر پیوند خاک ہو گئے۔ ملا مبین۔ مولانا ظہور اللہ۔ مولانا ولی اللہ۔ مفتی محمد یوسف۔ مولانا عبد الحلیم۔ مولانا عبد الحی صاحب مرحوم جو ہمارے زمانے میں موجود تھے، ان کی تصنیفیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آج جہاں جہاں علوم عربیہ کا نام و نشان باقی ہے، اسی خاندان کا پرتو فیض ہے۔ ہندوستان کے کسی گوشے سے جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رخ فرنگی محل ہی کی طرف ہوتا ہے۔ میں نے ۱۸۹۲ء میں جب ملا نظام الدین صاحبؒ کے آستانے کی زیارت کی اور ان کی درسگاہ کو جو ایک مختصر سا بالاخانہ تھا، دیکھا تو عجب عبرت ہوئی کہ اللہ اکبر! ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے یہی خاک ہے جس سے عبد العلی بحر العلوم و ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے۔ یادگار رفتگاں، صرف ایک مقدس بزرگ مولانا نعیم صاحب باقی ہیں، جو عبد العلی بحر العلوم کے پرپوتے ہیں اور جنکو ہماری سرکار نے شمس العلما کا لقب دیا ہے۔

درس نظامیہ کی خصوصیات

ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابل توجہ انکا مقرر کردہ نصاب ہے جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نصاب کی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علما کی متعدد کتابیں داخل ہیں، مثلاً نور الانوار۔ مسلم۔ سلم۔ رشیدیہ۔ شمس بازغہ۔ حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔

(۲) ہر فن کی وہ کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی۔

(۳) منطق و فلسفے کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زائد ہیں۔

(۴) حدیث کی صرف ایک کتاب ہے، یعنی مشکوٰۃ۔

(۵) ادب کا حصہ بہت کم ہے۔

اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کو پیش نظر تھی یہ تھی کہ قوت مطالعہ استعدادِ قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنیکے بعد، طالب العلم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ درس نظامیہ کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی، بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

اختصار کے لحاظ سے بھی اس نصاب کو نصاب قدیم پر ترجیح ہے۔ ایک متوسط الذہن طالب العلم سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہو سکتا ہے چنانچہ علمائے فرنگی محل اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ التحصیل ہو جاتے تھے۔

اس نصاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چونکہ اس میں فقہ کی کتابیں کم ہیں اور جو ہیں ان میں معقولی استدلال سے اکثر کام لیا گیا ہے۔ اسلیئے اس نصاب سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا جو سطحی فقہا کا خاصہ ہے۔ اسیکا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علما پیدا ہوئے۔ ان میں کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہیں لکھی، شیعہ و سنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنؤ میں پیدا ہو سکتا تھا، لیکن یہ صدا دلی سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامے میں مبتلا ہو گیا، اور تحفۂ اثنا عشریہ کے فقرے رجز کیطرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ

اس نصاب اور باتوں کے ساتھ، ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ علما میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے کہ اُن کو معاصرین کے فضل و کمال کا اقرار ہو، لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علما کی اسقدر عزت کی کہ اُن کی کتابیں درس میں داخل کر دیں۔ نور الانوار۔ سلّم۔ مُسلّم۔ سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں، ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے ثابت ہوگی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں داخل نہیں کی، حالانکہ انکا کوئی معاصر اُن کے رُتبے کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔

اسموقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ موجودہ درس، جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل درس نظامیہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی ایسی کتابیں اضافہ ہو گئی ہیں جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں، مثلاً ملا حسن۔ حمد اللہ۔ حاشیۂ غلام یحییٰ۔ قاضی مبارک۔ اگرچہ ہمارے نزدیک، ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی حاجت ہے لیکن اس مضمون میں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے۔ اور اسی تحریر پر بس کرتے ہیں۔

(شبلی نعمانی)

کیا دل کی کشش اور مادہ کی کشش دونوں ایک ہیں؟

چند روز ہوئے کہ مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" کے فاضل اڈیٹر جرجی زیدان ایم۔ آر۔ اے۔ ایس نے اپنے رسالے میں دو تین عجیب مضمون لکھے تھے، جن سے فاضل ممدوح نے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ قوانینِ اخلاق اُن قوانین پر منطبق ہو سکتے ہیں جو عالم فطرت میں جاری ہیں۔ اُن میں سے ایک مضمون عنوانِ بالا پر تھا۔ چونکہ یہ مضامین بالکل جدید اور عجیب قسم کے ہیں اور غالباً "الہلال" سے پہلے کسی رسالہ کے اڈیٹر نے اس قسم کے مضامین لکھکر شائع نہیں کیے اسلیئے ہم ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیئے بطور نمونے کے ایک مضمون کا ترجمہ اُردو زبان میں کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مضمون ناظرین کو دلچسپ معلوم ہوگا۔

قوانینِ اخلاق کو قوانینِ فطرت پر منطبق کرنے کے لیئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم طبیعیات کا وسیع علم رکھتے ہوں۔ مثلاً اُن قوانینِ فطرت سے کامل طور پر آگاہ ہوں جو کشش۔ حرارت۔ روشنی۔ بجلی۔ قوتِ مقناطیسی وغیرہ پر حاوی ہیں۔ نیز اُن اخلاقی جذبات کا مطالعہ موشگافی سے کر چکے ہوں جو مثل محبت۔ حسد۔ غیرت۔ ہمت۔ استقلال وغیرہ کے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیئے گئے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اخلاق کے جذبوں میں سے ہر ایک کے لیئے خاص قوانین ہیں۔ اُن کے مقابلے میں عالم مادی کی قوتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے لیئے ویسے ہی خاص قوانینِ فطرت ہیں۔ یعنی اخلاق کا کوئی جذبہ مادہ کی کسی قوت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور دونوں یکساں قوانین کے ماتحت ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً قوا فطرت میں سے کشش کو لو اور جذباتِ اخلاق میں سے محبت کو اختیار کرو۔ دونوں کے قوانین اسقدر ملتے جلتے ہیں کہ بادی النظر میں دونوں ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی کلی کی فردیں معلوم ہوتی ہیں

 کیا دل کی کشش اور مادہ کی کشش دونوں ایک ہیں

کشش کیا ہی؟ کشش مادہ کی ایک عجیب قوت ہی جو اُس سے کسیطرح جُدا نہیں ہوتی۔ اسی کشش کا یہ کرشمہ ہی کہ مادہ کا ہر ذرّہ اور مادی دُنیا کا ہر ایک جسم باوجود شکل اور قامت کے اختلاف کے دوسرے ذرّوں اور جسموں سے قریب ہونا اور ملنا چاہتا ہی۔ اسی کشش کی برکت ہی کہ وہ ستارے جو ثوابت کے نام سے موسوم ہیں، اپنے اپنے مرکزوں پر ساکن ہیں اور وہ ستارے جو سیارے کہلاتے ہیں اپنے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں۔ اسی کشش کا جلوہ ہی کہ مادّہ کے اجزا باہم ملتے اور ایکدوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اور اُن کے ملنے اور چمٹ جانے سے اجسام ارضی تیار ہوتے ہیں۔ پھر جسموں کے باہم ملنے اور چپکنے سے اجرام سماوی نمودار ہوتے ہیں۔ اسی کشش کا اثر ہی کہ جامد چیزیں سیّال چیزوں یا گیسوں سے ملکر ایکدوسرے کے اندر داخل ہوجاتی ہیں۔ اسی کشش کا طفیل ہی کہ عناصر گھُل مل کر ایک ہوجاتے ہیں اور اُن سے مختلف تاثیر اور خواص کے مرکبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے کشش ذیل کی سات شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہی:

(۱) **کشش سماوی**۔ اس کے سبب سے تمام اجرام سماوی باہم تلے رہتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ساکن یا متحرک رہتا ہی۔

(۲) **کشش اتصال**۔ اس سے یہ مراد ہی کہ ایک ہی مادّہ کے ذرّے باہم ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مثلاً لکڑی، یا پتھر، یا پانی کے ذرّے۔ اس کشش کی مدد سے ہر جسم اپنی شکل اور بناوٹ کو قائم رکھتا ہی۔

(۳) **کشش مواصلت**۔ اس سے یہ مراد ہی کہ مختلف مادّہ اور شکل کے اجسام باہم ایکدوسرے کی طرف کھنچتے اور ملجاتے ہیں۔ مثلاً سریش اور لکڑی، گیلی مٹی اور پتھر۔

(۴) **کشش شعری**۔ یہ وہ قوت ہی جس کی مدد سے جامد چیزیں سیّال چیزوں یا گیسوں کو اپنی طرف کھینچتی اور انکو اپنے اندر جذب کرلیتی ہیں۔ مثلاً اسفنج یا مسامدار لکڑی، یا بھُربھُرا پتھر پانی کو اور پانی ہوا کو جذب کرلیتا ہی۔

(۵) **کشش کیمیائی**۔ یہ وہ قوت ہی جس کے اثر سے مختلف مادّے گھُل مل کر نئے مرکب بن جاتے ہیں مثلاً چاندی اور شورے کا تیزاب باہم ملتے ہیں تو اس سے کاسٹک تیار ہوتا ہی۔

(۶) **کشش مقناطیسی، یا برقی**۔ یہ وہ طاقت ہی جو سنگ مقناطیس میں نمودار ہوتی ہی، یا بجلی کے تاروں میں ظہور کرتی ہی۔

(۷) **کشش ثقل**۔ یہ وہ قوت ہی جس سے باعتبار کشش زمین کے مادی اجسام کا وزن معلوم ہوتا ہی۔ یہ کشش کی مختلف شکلیں ہیں۔ اِن تمام شکلوں کی بنیاد اُس عام کشش پر ہی جو مادّہ کے ذرّوں میں پائی جاتی ہی۔ مادّہ کا ہر ذرّہ اپنے آس پاس کے ذرّوں کو کھینچتا ہی۔ اس لحاظ سے وہ بمنزلہ ایک مرکز کے ہوتا ہی اور تمام مادی دُنیا اُسکے گرد بمنزلہ ایک دائرہ کے۔ ذرّوں کی آپس کی کشش سے مختلف وزن اور مقدار کے اجسام تیار ہوتے ہیں۔ اجسام کے تیار ہونے کے بعد ہر جسم بجائے خود ایک مرکز ہوتا ہی جس کے گرد کے تمام اجسام اُسکی طرف کھنچے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اجسام کے باہم ملنے سے زمین، یا ستاروں جیسے بڑے بڑے اجسام، یا اجرام بن جاتے ہیں۔ ان اجسام یا اجرام میں سے بھی ہر ایک بجائے خود ایک مرکز ہوجاتا ہی اور دیگر اجسام، یا اجرام کو اپنی طرف کھینچتا ہی۔ اجرام کے باہم ملجانے سے نظام شمسی کیطرح ایک نظام مرتب ہوتا ہی۔ پھر ہر نظام دوسرے نظامات کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہی۔ وقس علی ہذا۔

 کیا دل کی کشش اور مادہ کی کشش دونوں ایک ہیں؟

محبت کیا ہے؟ علمانے محبت کی تعریف اور تقسیم میں اختلاف کیا ہے اور اسپر بڑے بڑے علمی مُباحثے اور طویل مناظرے برپا ہو چکے ہیں۔ مگر ہم بحث کا وہی پہلو اختیار کرینگے جو نہایت سادہ اور آسان ہو تاکہ ہمارے ناظرین کو بیفائدہ اُلجھن اور پریشانی نہ ہو۔ ہماری رائے میں محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس سے ایک دل دوسرے کی طرف کھنچتا ہے اور اس سے سوسائٹی کی بُنیاد پڑتی ہے۔ محبت غالباً ذیل کی سات شکلوں میں پائی جاتی ہے۔

(۱) **محبتِ ذات**۔ یہ ہر ایک محبت کی اصلی بُنیاد ہے۔ اِسی سے ہر محبت کا آغاز و انجام ہے۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوانات اور نباتات بھی اپنی ذات سے جو محبت کرتے ہیں وہ ہر چیز کی محبت سے بالاتر ہے۔ ہر جاندار مخلوق میں یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی ہی ذات کیلئے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور اسی کا نام محبت ذات ہے۔

(۲) **محبتِ اولاد و اقارب**۔ یہ جذبہ محبت ذاتی سے جُدا ہے مگر اپنے درجے کے لحاظ سے اسی کے قریب ہے کیونکہ انسان اوّل اپنی ذات سے، پھر اپنی اولاد سے، اسکے بعد اپنے اقارب سے محبت کرتا ہے۔

(۳) **محبتِ احباب**۔ ہمسایوں اور شناساؤں کی محبت بھی اسی ذیل میں داخل ہے۔

(۴) **محبتِ وطن**۔ قوم اور مذہب کی محبت بھی اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔

(۵) **محبتِ عام**۔ یہ انسان کا وہ طبعی میلان ہے جس سے وہ اوروں کے ساتھ مل جلکر رہنا چاہتا ہے

(۶) **محبتِ جنسی**۔ اِس سے مرد اور عورت کی الفت مراد ہے۔ یہ ایک جُدا شکل ہے جسکو محبت کی اور شکلوں پر قیاس نہیں کر سکتے۔

اگر ہم محبت کی ان شکلوں کو غور سے دیکھیں اور ہر ایک شکل کی نسبت موشگافی سے بحث کریں تو ان تمام شکلوں کی اصلی بُنیاد وہی ذاتی محبت معلوم ہو گی۔ کیونکہ انسان کا یہ قدرتی جذبہ کہ وہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، اُسکو ان جذبات پر اُبھارتا اور اُکساتا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے۔ اہل و عیال سے۔ دوستوں اور شناساؤں سے۔ وطن اور قوم سے۔ مذہب و ملت سے محبت کرے۔ یہی جذبے ہے جس پر تمدن کی بلند عمارت اُٹھتی ہے۔ اور یہی نوعِ انسان کی اُمنگوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔

انسان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اسلیئے سب سے پہلے وہ ہر ایک خوشی اور ہر ایک فائدہ اور ہر ایک لذت کو اپنی ہی طرف کھینچتا ہے۔ پھر اُن کے لیے جلبِ منفعت کرتا ہے، جو سب آدمیوں کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہیں۔ اِس سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ جسطرح چند افراد کے ملنے سے خاندان بنتا ہے اسیطرح چند خاندانوں کے ملنے سے ایک نیا مجموعہ تیار ہوتا ہے جو قوم، یا ملت، یا فرقہ کہلاتا ہے۔ ہر ایک قوم یا فرقے کے افراد ایک ہی جیسی اغراض اور ایک ہی جیسے مقاصد کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور شخصی، یا خاندانی فائدوں سے قطع نظر کرکے اُس قوم، یا فرقہ کی مجموعی ترقی اور بہبودی میں سرگرم رہتے ہیں قوموں یا ملکوں میں بھی ایک قسم کی دوستی یا محبت پائی جاتی ہے جو بظاہر محبت کی دیگر اقسام سے جدا ہے مگر حقیقت میں وہی ذات کی محبت ایک جڑ ہے جسکی یہ سب شاخیں ہیں۔

رہی جنسی محبت، یہ بھی محبت کی اور شکلوں سے جُدا نظر آتی ہے کیونکہ اگرچہ اوّل اوّل یہ اختیاری ہوتی ہے مگر آخیر میں قہری اور جبری یا غیر اختیاری ہو جاتی ہے مگر غور سے دیکھو تو اسکی بنیاد بھی وہی ذاتی محبت ہے

 کیا دل کی کشش اور مادّہ کی کشش دونوں ایک ہیں؟

کیونکہ مرد عورت کیساتھ محبت کرنے میں اپنی ہی ذاتی خوشی کا طالب ہوتا ہے اور جب وہ عورت سے محبت کرتا ہے تو گویا اپنی ہی غرض کا دیوانہ ہوتا ہے۔

محبت اور کشش کی تمام شکلیں بیان کرنے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی حالتوں اور کیفیتوں میں مقابلہ کریں۔ اوّل ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں میں عام طور پر کس بات میں مشابہت ہے۔ کشش کا ایک مشہور قاعدہ یہ ہے کہ "ایکدوسرے کو کشش کرنے والی اجسام جوں جوں قریب ہوتے ہیں، اُن میں کشش کرنے کی قوت بڑھتی جاتی ہے" محبت کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی سب سے قریب اشخاص میں زیادہ ہوتی ہے اور جسقدر رشتہ دُور کا ہوتا جاتا ہے، اُسی قدر محبت بھی گھٹتی جاتی ہے اجنبی اشخاص کے درمیان جبتک کہ وہ ایک مدت تک باہم ایک جگہ نہ رہیں، محبت نہیں ہوتی۔ کشش کا قاعدہ ہے کہ مادہ کا ہر ذرہ اپنے آس پاس کے ذرّوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ محبت کے سبب سے بھی ہر شخص اپنے قریب کے اشخاص کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ محبت کی کشش میں جو مفید اور مضر چیزوں کی تمیز پائی جاتی ہے اسکا باعث یہ ہے کہ انسان برخلاف دیگر مادّی اشیا کے ذوی عقل اور ذی شعور ہے اور یہ کام عقل کا ہے کہ مضر چیزوں کو اپنے پاس سے ہٹائے اور مفید چیزوں کو اپنی طرف کھینچے۔ اگر یہ قوت انسان میں موجود نہ ہوتی تو وہ ہر مضر اور مفید چیز کو جو اُس کے قریب ہوتی اپنی طرف کھینچ لیا کرتا۔ چنانچہ جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور عقل کی حکومت اُٹھ جاتی ہے تو انسان اپنے فائدہ اور نقصان میں چنداں تمیز نہیں کرسکتا۔ یہ مشابہت محبت اور کشش کی تمام شکلوں میں برابر متناسب طور پر پائی جاتی ہے۔ مثلاً اولاد کی محبت کشش اتصال کے مقابلے میں ہے۔ دوستوں اور ہمسایوں کی محبت کشش مواصلت کی مانند ہے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان جو دوستی اور محبت ہوتی ہے، وہ کشش سماوی سے پوری مشابہت رکھتی ہے، کیونکہ جسطرح قوموں اور ملکوں کی محبت سے تمدّن کا نظام قائم ہوتا ہے، اسیطرح اجرام سماوی کے ایکدوسرے کو اپنی طرف کھینچنے سے کائنات کا نظام پائدار اور مستحکم رہتا ہے۔

محبت جنسی کشش شعری اور کشش کیمیائی دونوں کے مقابلے میں ہے۔ کشش شعری اور اِس محبت میں عجیب مشابہت ہے۔ یہ کشش اُنھیں دو مادّوں میں پائی جاتی ہے، جن کی کثافت مختلف ہو۔ مثلاً ایک چیز جامد ہو دوسری سیّال ہو، جیسے شکر اور پانی۔ یا دونوں سیّال ہوں مگر دونوں کی کثافت یکساں نہو۔ جیسے خالص پانی اور معدنی پانی۔ یا ایک جامد اور ایک گیس ہو، یا ایک سیّال ہو اور ایک گیس۔ جب دو سیّال چیزوں کے درمیان ایک باریک جھلی، یا مسامدار کوری مٹی کا پرت ہو، تو اُن میں انڈ آسموسس اور اکس آسموسس کا عمل شروع ہوتا ہے یعنی جو سیّال لطیف ہے وہ جھلی، یا مسامدار مٹی کے پرت سے گذر کر کثیف سیّال کیطرف دوڑتا اور اُس سے جاملتا ہے۔ لطیف اور کثیف سیّالوں کی درمیان جو کشش پائی جاتی ہے، وہ کشش شعری ہے۔ یا مثلاً اگر ایک برتن درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور دونوں حصّوں کے درمیان ایک باریک جھلی، یا چرمی کاغذ لگا دیا جائے۔ پھر دونوں حصّوں میں سے ایک حصّے میں خالص پانی اور دوسرے حصّے میں اُسی کی برابر نمکین پانی ڈال دیا جائے تو دونوں سیّال جھلی یا کاغذ سے گذر نہ پا سکیں گے اور دونوں میں کشش شعری شروع ہوجائیگی۔ لیکن نمکین پانی والے حصّے میں جسقدر خالص پانی گذر کر آجائیگا وہ مقدار میں اُس نمکین پانی سے زیادہ ہوگا جو خالص پانی والے حصّے میں داخل ہوگا۔ یہی قدرتی قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر نمکین مسہلات انتوں پر اپنا عمل کرتے ہیں۔ جب کوئی دست آور

نمک، یا سعدنی پانی آنتوں میں جاتا ہی، تو اُس کے اور سیرم یعنی آبِ خون کے درمیان آنتوں کی جھلی حائل ہوتی ہی جو مسامدار ہی۔ اسی سبب سے نمکین مسہل عرق اور آبِ خون کے درمیان انڈاسموسس اور اکس آسموسز کا عمل شروع ہوجاتا ہی اور چونکہ نمکین مسہل عرق، یا سعدنی پانی بہ نسبت آبِ خون کے زیادہ کثیف ہوتا ہی، اسلئے آبِ خون زیادہ تراوش پاتا ہی اور اسکو اسہال کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوگیا کہ کشش شعری دو مادّوں کا جن میں سے ایک کثیف اور ایک لطیف ہو، آپس میں ایک دوسرے کو کھینچنا اور اسطرح دونوں کا گھل مل جانا ہی۔ جنسی محبت اور شعری کشش میں، جو مشابہت ہی وہ صاف طور پر ظاہر ہی کیونکہ یہ محبت بھی دو جنسوں کے درمیان ہوتی ہی، جن میں سے ایک لطیف ہی اور ایک کثیف۔ اس محبت سے دونوں کی روحوں میں اسقدر امتزاج ہوجاتا ہی کہ گویا وہ دونوں ملکر ایک جان اور دو قالب ہوجاتے ہیں۔ ایسا امتزاج محبت کی کسی شکل میں نہیں پایا جاتا۔ اور محبت کرنے والے تمام شکلوں سے زیادہ اسی شکل کی محبت میں عقل کی حکومت سے آزاد ہوتے ہیں۔

کشش شعری کی طرح کشش کیمیائی بھی جنسی محبت سے پوری مشابہت رکھتی ہی جب کشش کیمیائی دو عنصروں کے درمیان شروع ہوتی ہی تو دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اسکے بعد دونوں گھل مل جاتے ہیں اور دونوں کے ملنے سے ایک نیا مرکب پیدا ہوتا ہی جس میں دونوں عنصروں سے جدا خواص موجود ہوتے ہیں۔ یہی حال جنسی محبت کا ہی جب وہ کسی مرد اور کسی عورت کے درمیان شروع ہوتی ہی تو دونوں کا دل ایک دوسرے کی طرف کھنچتا ہی اور شادی کے بعد دونوں کی روحیں گھل مل کر ایک ہوجاتی ہیں۔ دونوں کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہوتی ہی وہ گویا ایک نیا مرکب ہی جسمیں دونوں سے علحدہ اور مستقل خواص موجود ہیں۔

مقناطیسی، یا برقی کشش جھوٹی محبت کی مانند ہی جو کسی خاص غرض سے شروع ہوتی ہی اور جب وہ غرض جاتی رہتی ہی تو اُس محبت کا وجود بھی نہیں رہتا۔ مقناطیسی، یا برقی کشش کا بھی یہی حال ہی کہ وہ خاص حالت میں ظہور کرتی ہی اور جب وہ حالت نہیں رہتی تو اس کشش کا ظہور بھی نہیں ہوتا۔ اس تمام بیان سے معلوم ہوا کہ دل کی کشش اور مادہ کی کشش دونوں میں ایسی مشابہت ہی کہ انکو اگر ایک ہی اصل کی دو شاخیں کہا جائے تو کچھ تعجب نہیں ہی۔ شاید زمانہ آئندہ میں اس مسئلے پر نئی روشنی پڑے۔

نفرت اور حرارت ایک معترض کہہ سکتا ہی کہ جسطرح اخلاقی جذبات میں محبت کے برخلاف ایک اور جذبہ نفرت یا بغض کا پایا جاتا ہی اسیطرح کشش کے برخلاف عالم مادّی میں کوئی اور قوت ہونی چاہیئے، جس کا عمل کشش کے عمل کے مخالف ہو۔ اسکا جواب یہ ہی کہ مادہ کے ذرّوں میں ایک اور قوت فی الحقیقت موجود ہی جس کو دافعہ، یا گریز کہا جاتا ہی۔ اور جو کشش کے برخلاف ہی۔ اور جس کے سبب سے ذرّوں کے درمیانی فاصلے قائم رہتے ہیں۔ اور اُن ذرّوں کا دبانا اور جھکانا مشکل ہوتا ہی حرارت سے یہ قوت بڑھتی ہی۔ مادّی چیزوں میں حرارت اور اخلاقی جذبات میں نفرت یہ دونوں آپس میں مشابہ ہیں۔ اگر ہم نفرت کو اور اُس کی مختلف شکلوں کو غور سے دیکھیں اور ہر شکل کے اجزا کو تحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہی کہ نفرت کا سبب حسد ہی۔ اور حسد کا سبب اُس بھلائی کے حاصل کرنے کی خواہش ہی، جو اوروں کو حاصل ہو۔ گویا حاسد خیال کرتا ہی کہ وہ بھلائی اُسکے لیئے مقدر ہوئی تھی محسود

سے اُس سے زبردستی چھین لی، یا وہ حاسد اُس بھلائی کے درمیان حائل ہوگیا تاکہ وہ دونوں ملنے نہ پائیں۔ کبھی نفرت کا سبب کسی بات پر لڑائی ہوتی ہے جس میں ہر شخص اپنا ہی بول بالا چاہتا ہے۔ غرضکہ نفرت کسی سبب سے ہو، سب کی بُنیاد اُس فیلنگ پر ہوتی ہے، جو ذاتی محبت کے اقتضا کی برخلاف ہے۔ کوئی انسان ہو اور وہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو، اگر اُس کی راہ میں کوئی رُکاوٹ ہوگی، تو نفرت کا جذبہ اُس کے دل میں موجزن ہوگا کشش کا بھی یہی حال ہے۔ اگر کوئی مادّی چیز ایک طرف سے دوسری طرف حرکت کر رہی ہو اور بیچ میں ایک اور مادّی چیز حائل ہو جائے جس سے پہلی مادّی چیز اپنی حرکت کو جاری نہ رکھ سکے تو دونوں کے ٹکرانے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے مادہ کے ذرّوں میں دافعہ یا گریز کی قوّت بڑھ جاتی ہے۔

اسکے علاوہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ روشنی۔ حرارت۔ بجلی اور کشش وغیرہ تمام مادّی قوّتیں درحقیقت ایک ہی قوّت کی مختلف شکلیں ہیں اور خاص حالتوں میں ایک قوّت دوسری قوّت کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور منجملہ اُن اشکال کے کشش اور گریز بھی دو شکلیں ہیں۔ یہی حال اخلاقی جذبات کا ہے۔ یہ بھی فی الواقع ایک ہی جذبہ کی مختلف شکلیں ہیں اور خاص حالتوں میں ایک جذبہ دوسرے جذبہ میں آسانی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ منجملہ اُن شکلوں کے محبت اور نفرت بھی دو شکلیں ہیں۔

اگر اس جدید اور دلچسپ موضوع پر وہ علما غور و فکر کی نظر ڈالیں جو علومِ اخلاقی اور علومِ مادّی میں کامل مہارت رکھتے ہیں، تو کچھ عجب نہیں ہے کہ ہم کو دونوں کی مطابقت سے نئی نئی باتیں معلوم ہو جائیں اور اُن جدید انکشافات کی مدد سے کسی نئے فلسفے کی بُنیاد ڈال سکیں۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ كَمَا هِيَ۔

(عبدالعلی خاں)

کیا محتاجوں کی مدد کرنا کوئی جرم ہے؟

اُس چھان بین اور تحقیقات کے ذریعے سے جو صدیوں سے جاری ہے، یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ کارخانۂ دنیا اتفاقات اور تصادفات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ مقررہ قوانین و قواعد کا تابع ہے اور اُن کی پوری پابندی کے ساتھ چل رہا ہے۔ جبتک کہ واقفیت بشری طفولیت اور بچپن کی حالت میں تھی، اُسوقت تک انسان کو قوانین طبیعت (لا آف نیچر) کے ہونے کا علم نہ تھا اور وہ تمام حادثات مثلاً سمندر کے طوفان۔ بادِ صرصر۔ آتش فشانی وغیرہ کو مافوق الطبیعت اور عالمِ بالا کا کام تصور کیا کرتا تھا اور بجد تعظیم کے ساتھ اُن کی پرستش کرنے لگا تھا لیکن علوم و فنون کی ترقی نے اِس طلسم کو توڑ دیا اور تمام خلاف عادت سمجھے ہوئے حادثات کی قوانین کو اُس نے ایک ایک کرکے بتانا شروع کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جو کچھ ہے وہ علل اور اسباب کے نتیجے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ایسی ناواقفیت کے زمانے میں انسان اپنے آپ کو ایک ایسی مستقل مخلوق خیال کرتا تھا کہ گویا اُس کی پیدایش تاثیراتِ عالم سے بالکل آزاد ہے اور اُسکا سلسلۂ پیدایش کسی سے نہیں ملتا مگر علمِ حیوانات کی ترقی نے یہ دکھا دیا کہ باوجودیکہ انسان ایک نہایت مکمل مخلوق ہے تاہم وہ منجملہ دیگر حیوانات کے ایک حیوان ہے اور ریڑھ والے پستان دار جانوروں کا ایک ترقی یافتہ ہم جنس ہے۔ اور قانونِ طبیعت (لا آف نیچر) کے اثر سے کلیۃً

بری نہیں ہے۔

اس قسم کے علمی دقائق پر دسترس ہو جانے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا ترقی تہذیب بھی قوانین طبیعت کی پابند ہے؟ یا واقعات تاریخی ردّ و قدح کے محتاج نہیں ہیں اور وہ صرف ایک انبار قضا و قدر کے احکام کے ہیں؟ - اسپر بہت سے عالموں اور فلاسفروں نے وقتاً فوقتاً غور کیا ہے اور مسئلہ تمدن و تہذیب کے متعلق تحقیق و تفتیش جاری رکھی ہے۔ ان میں سے بعض کا یہ خیال رہا ہے کہ سوسائٹی یا گروہ انسانی مثل ایک فرد جاندار کے ہے، یعنی جسطرح مختلف اعضا اور مختلف بناوٹوں کے ملنے سے ایک جسم یا بہت سے اجزا سے ملکر ایک کُل بنجاتا ہے اُسیطرح سب آدمی الگ الگ جز ہیں اور سوسائٹی یا گروہ انسانی من حیث المجموع ایک کُل ہے مگر بعض علما جنکی کثرت زمانہ حال میں زیادہ ہے اس نظریہ کی بالکل مخالفت کرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی رای جداگانہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں فریق ایک دوسرے سے کیسی ہی جداگانہ رائے رکھتے ہوں مگر اجتماع انسانی یعنی تمدن کی وجہ سے جو واقعات پیش آئے ہیں اور آتے ہیں انکی نسبت دونوں فریقوں کو ہمیشہ سے یہ جستجو رہی ہے کہ اُن کے اسباب اور علل کیا ہیں۔ چنانچہ فلسفے کا وہ حصہ جس میں اسپر بحث کی جاتی ہے ایک مستقل شعبہ ہو چلا ہے جسکا نام سوشیالوجی، یا علم تمدن ہے۔ اگرچہ ابھی تک اسکی تکمیل نہیں ہوئی لیکن اسکے اصول قائم ہو چلے ہیں اور امید کی جارہی ہے کہ ماہرین فن کی کوششوں سے ایکدن یہ علم بھی تکمیل کو پہونچ جائیگا۔ علم تمدن کے جاننے والے علما و حکما نے ۱۸۹۵ء میں بمقام پیرس ایک ابتدائی کانفرنس قائم کی تھی۔ اُسکے بعد دو جلسے اور بھی ہوئے۔ آخری جلسے میں اس مسئلے کو کہ "محتاجوں کو کیونکر اعانت پہونچانی چاہیے"، مانشر الفرڈ نے پیش کیا جسپر نہایت عمدگی سے مباحثہ ہوا چونکہ اُسکا بیان کرنا نہایت مفید ہے اسلیئے ہم بطور خلاصہ کے اُسکو اپنے مضمون میں درج کرینگے مگر قبل اسکے کہ وہ خلاصہ بیان کیا جائے ہم ناظرین سے یہ چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں کہ محتاجوں کو اعانت اور مدد دینے کا مسئلہ ہمارے یہاں دینداری کا ایک جز سمجھا جاتا ہے مگر افسوس کہ ہم بغیر اسکے کہ اُسکے اثر اور نتیجے پر غور کریں اس مسئلے پر عمل کر رہے ہیں برخلاف اُسکے یورپ میں روز بروز اسپر زیادہ خیال رجوع ہوتا جاتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک ایک سوشیل خطرہ کی صورت پیش آتی جاتی ہے۔ بلاد متمدنہ میں ایک طرف تو دولت حد سے زیادہ جمع ہوتی جاتی ہے دوسری طرف افلاس کی ویسی ہی شدت ہے یعنی خاص اور اعلیٰ درجے کے آدمی تو لاانتہا دولت کے مالک ہوتے جاتے ہیں اور ادنے درجے کے لوگ جو صبح سے شام تک صدہا جانکاہیوں کے ساتھ محنت کرتے ہیں بمشکل اسقدر کما سکتے ہیں کہ اُن کی او اُن کے خاندان کی پرورش کے لیئے کافی ہو۔ پھر بڑھاپے، اور بیماری کی حالت جو ہر انسان کے ساتھ ساتھ وابستہ ہے ان لوگوں کیواسطے ایسی دردناک ہے جسکا اندازہ ہم مشرقی باشندے کسیطرح نہیں کر سکتے۔ یہی سبب ہے کہ یورپ کے ارباب سیاست کی توجہ اسطرف مبذول ہوئی ہے اور وہ تقسیم دولت کے مسئلے پر غور کر رہے ہیں اور کوئی تدبیر ایسی نکالنی چاہتے ہیں کہ مزدوری پیشہ گروہ کی حالت سنبھل سکے۔ مانشر الفرڈ نے مذکورۂ بالا کانفرنس میں یہ تدبیر پیش کی تھی کہ محتاج اشخاص کی مدد کرنا لوگوں کے اختیار اور خوشی پر نہ چھوڑا جائے بلکہ اُس کو قانوناً لازم کر دیا جائے۔ مانشر الفرڈ نے اپنی اسپیچ میں بیان کیا تھا کہ اُن لوگوں کی جو محتاجوں کی اعانت کرنے کے مخالف ہیں، دلائل یہ ہیں:-

۱- مسٹر مالتھس، جو علم ثروت (پولٹیکل اکانومی)

مشہور عالم ہے، صدقہ دینے کی مضرت یوں بیان کرتا ہے (**اوّل**) اگر تم نے ایک فقیر کو آٹھ آنہ دیئے تو اُسکے معنی یہ ہوئے کہ تم نے بازار میں موجودہ اشیا کا ایک خریدار بڑھا دیا اور جب بازار کے مال کا ایک خریدار بڑھگیا تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس نسبت سے بوجہہ مانگ کے بڑھ جانے کے مال گراں ہوگیا اور جب مال گراں ہوگیا تو اُس درجے کے لوگوں کو نقصان پہنچا جو نہ دولت مند ہیں، نہ محتاج و فقیر ہیں اور اس درجے کے لوگوں کی آمدنی اُن کی ضروریات کیواسطے ناکافی ہوگی اور آخرکار یہ لوگ بھی محتاجوں اور فقیروں میں شامل ہوگئے۔ اگرچہ ایک فقیر کو خیرات دینے سے یہ نتیجہ بیّن طور پر ظاہر نہیں ہوجاتا۔ مگر جب اسکی کثرت ہوجاتی ہے تو یہ ضرر صاف محسوس ہونے لگتا ہے۔

(**دُوم**) باعتبار نسبت ترقی آبادی اور نسبت ترقی پیداوار زمین کے اس امر کی قطعی ضرورت ہے کہ آدمیوں کی بڑھوار کو روکا جائے اور اُن لوگوں کو جو قوم پر بار ہیں کم ہونے دیا جائے۔ انسانوں اور پیداوار کی تزاید کی نسبت از روے علم الاعداد کے اسطرح پر ہے کہ انسان مضاعف ہوکر بڑھ رہے ہیں یعنی ۲، ۴، ۸، ۱۶ الخ اور پیداوار زمین کی ترقی اسطرح پر ہے ۲، ۴، ۶، ۸، ۱۰ الخ پس اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پیداوار زمین کُل انسانوں کے واسطے ناکافی ہونے والی ہے۔ اس صورت میں ضعیفوں کے پالنے اور مرنے سے بچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس فعل کا نتیجہ مضر ہے۔

۲۔ ہربرٹ اسپنسر نے بھی مالتھس کی راے کی تائید کی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک ضروری نتیجہ طبعی قانون انتخاب (لا آف نیچرل سلکشن) کا ہے کہ ایسے لوگ محو اور تلف ہوجائیں جو شرائط زندگی کی مجبوریوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور یہ ایسا عمدہ لا آف نیچر ہے کہ اسکے ذریعے سے سوسائٹی برابر پاک و صاف ہوتی رہتی ہے۔ اب اگر اس قانون کی پابندی نہ کیجائے اور بغیر انجام بینی و عاقبت اندیشی کے احمقانہ طور پر خیرات و صدقات جاری رکھے جائیں تو کاہلوں اور نکمّوں کی اور اُن لوگوں کی جنکی پرورش کا بار کمانے والوں پر پڑتا ہے ایسی کثرت ہوجائیگی کہ اسکے سبب سے ایک عام تشویش اور بے دلی پیدا ہوسکتی ہے اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو گویا آیندہ نسلوں کیواسطے ایک خطرہ پر دوسرا خطرہ پیدا کرتے اور اُن خطروں کو جمع کرتے ہیں۔ اب اُن ناعاقبت اندیشوں میں جو موجودہ زمانے کے محتاجوں کے ذریعے سے آنیوالی حالت سے بے پروائی کرتے ہیں اور اُن متکبر مالداروں میں جو کسی محتاج کو کچھ دینا نہیں چاہتے فرق کیا رہا؟ کیونکہ دونوں کے دونوں یکساں بیرحمی یا رحم دلی کا کام کر رہے ہیں۔

۳۔ ان دونوں کے سوا اور لوگ بھی جبرًا امداد غربا کے انتظام کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

اگر کوئی حکومت فقرا کی امداد کیواسطے کوئی قانونی حق عطا کریگی تو (۱) اُسکے سامنے اعانت کی غرض سے اسقدر کثرت سے اشخاص جمع ہوجائینگے کہ اُن کے لیئے کوئی خاص ٹکس اغنیا پر لگانا پڑیگا (۲) کاہل مزاجی بڑھ جائیگی (۳) جو لوگ کمانے والے اور دولت پیدا کرنیوالے ہیں، اُنکو مزدور میسّر نہیں آئینگے۔ ۱۸۴۸ء میں حکومت فرانس نے محتاجوں کی امداد یعنی مزدوروں کو کام میسّر آنے کی غرض سے گورنمنٹ کے صرف سے چند کارخانے جاری کیئے لیکن اسکا نتیجہ ملک کیواسطے نہایت خطرناک ہوا۔

غرض کہ یہ وہ امور اہم ہیں جو محتاجوں کی مدد

کرنے کے مخالفوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ اب جو اُن کے جواب دیے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:-

۱- مالتھس کا یہ دعویٰ کہ محتاجوں کی اعانت سے غلہ کی قیمت گراں ہو جائیگی، اسوجہ سے صحیح نہیں ہے کہ فقرا کو خیرات دینا گویا ایک ٹیکس ہے، جو مالداروں پر لگایا گیا ہے اور ٹیکس کا قاعدہ یہ ہے کہ جسقدر وہ گراں دربھاری ہوتا جاتا ہے اُسی مناسبت سے اُسکے ادا کرنے والے اپنے مصارف میں کمی و کوتاہی کرتے جاتے ہیں پس گو کہ ایک طرف خریدار اشیا کے بڑھ جائینگے مگر دوسری طرف مالدار لوگوں کی طرف سے مانگ میں کمی ہو جائیگی۔ اور اس طریقے سے کوئی خوف گرانی قیمت کا نہیں رہیگا اور جو قاعدہ ترقی انسانی اور ترقی پیداوار کا از روے علم الاعداد اُس نے ظاہر کیا ہے وہ تجربے کی بنا پر اب تک ثابت نہیں ہوا ہے۔ علاوہ اسکے پولٹیکل نظر سے ہر ایک قوم و ملت کیواسطے کثرتِ آبادی کی ایسی قطعی ضرورت اور حاجت ہے کہ اس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔

۲- ہربرٹ اسپنسر کے اُصول پر اگرچہ صرف اُس جذبہ کی بنا پر بحث ہو سکتی ہے، جو نیچر نے انسان میں فطرتاً رکھا ہے لیکن اگر اُسکو ایک طرف رکھدیا جائے تو بھی اُسکا نظریہ سالم اور محفوظ نہیں ہے۔ اوّلاً یہ بات ثابت ہولی ہے کہ کسی شخص کی نسبت یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ محض کاہل اور ناقابل کار ہے۔ دُوم دولت اور ثروت میں کسی کا کم ہونا یعنی فقیر ہونا کسی طرح پر ایک ایسا جرم اور عیب قرار نہیں دیا جا سکتا جسکے سبب اُسکا تلف ہونے دیا جانا جائز ہو سکے۔ سوم تجربہ اسکی کثرت سے مثالیں بتاتا ہے کہ فقرا اور محتاجوں کو مدد میسر ہو جانے کی وجہ سے اُن کی حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا ہے اور اُنھوں نے مال و ثروت میں نمایاں ترقی کر لی ہے۔ پس اس بنا پر یہ قرار دینا چاہیئے کہ بیکار لوگوں کیواسطے کام مہیا کیے جائیں، نہ کہ اُن کو تلف ہونے دیا جائے

ہربرٹ اسپنسر کا یہ دعویٰ کہ ناکارہ لوگوں کو بچانے سے آیندہ کے لیے خطرناک نتائج پیدا ہونگے اسوجہ سے صحیح نہیں ہے کہ اب تک ثابت نہیں ہوا کہ کاہلی اور بے پروائی کوئی ایسا مرض ہے جو نسلوں میں برابر جاری رہتا ہو۔ پس جو لوگ آج کسی وجہ سے ناقابل ہیں اُن کی اولاد و احفاد کے بھی ناقابل ہونے کے تصوّر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ منجملہ امراض کے سل ایک ایسا مرض ہے جسکی نسبت حکما اور ڈاکٹروں کی راے ہے کہ وہ آیندہ نسلوں میں باقی رہتا ہے۔ مگر یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر مسلول نسلیں اچھی آب و ہوا میں رہیں اور اُنکی پرورش باقاعدہ ہو تو اِس موروثی بلا سے وہ اور اُنکی نسلیں نجات پا جاتی ہیں پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُنکی اعانت نکیجائے۔ اور ہربرٹ اسپنسر کے اصُول کی بنا پر اُنکو مرنے دیا جائے۔ اس تمام بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو علما خیرات و صدقات کے برخلاف راے رکھتے ہیں، اُن کی راے ایسی مضبوط نہیں ہے جسکی بنا پر ہم اس نیکی اور ہمدردی کے فعل سے باز رہیں، یا ہم کو باز رہنا چاہیے۔

(اسمٰعیل)

رفارم

ہم نے معارف میں بالالتزام وقتاً فوقتاً ایسے مضامین لکھے ہیں* جن کے پڑھنے اور غور کرنے سے ہمارے رسالے کے معزز ناظرین نے بھی ضرور وہی نتیجہ نکالا ہوگا جو ہمارا مقصود تھا یعنی یہ کہ تربیت (جس میں تعلیم بھی شامل ہے) ایک ایسی شے ہے کہ وہ اچھی ہو تو انسان اچھا ہے اور وہ بُری ہو تو انسان بُرا ہے۔ جب تربیت

* یعنی مضامین میلان تقلید۔ ملکات عقلیہ و حیوانیہ۔ رسم و رواج۔ اسراف۔ رفارم۔ وغیرہ۔

شخصی حد سے نکلکر قومی میدان میں آجاتی ہے تو وہ قوم اچھی ہوتی ہے جسکی تربیت اچھی ہوتی ہے اور وہ قوم بُری ہوتی ہے جسکی تربیت بُری ہوتی ہے۔

اگرچہ جن مضامین کیطرف ہم نے حاشیہ پر اشارہ کر دیا ہے اُن کے پڑھنے کے بعد مذکورہ بالا ہماری تھیوری سے کسیکو انکار نہیں رہا ہوگا لیکن شاید وہ مضامین اسوقت ذہن میں حاضر نہوں یا آنکھ دیکھے نہ ہوں لہٰذا سواسطے ہم چند مختصر مثالوں سے اپنے دعوے کو پھر ثابت کرنے کی کوشش کرینگے۔

یہ امر غور کرنے کے لائق ہے کہ مہاجن اور اس قسم کے تجارت پیشہ اشخاص کی اولاد علی العموم (الاماشاءاللہ) کمانے والی، کمائی کو انتظام سے خرچ کرنیوالی، بلکہ بعض اوقات ضرورت پر بھی اُس کی نہ خرچ کرنیوالی کیوں ہوتی ہے؟ صرف اسوجہ سے کہ بچپن سے زبانی اور عملی تعلیم و تربیت اُن کو یہی ہوتی ہے کہ پیسہ بڑی چیز ہے مشکل سے جمع ہوتا ہے اور آسانی سے نکل بھاگتا ہے۔ دُنیا میں عزت جسکا نام ہے وہ صرف پیسہ ہے۔ چار ٹکے پاس ہیں تو بڑا آدمی سلام کیواسطے حاضر ہے۔ اگر پیسہ نہیں ہے تو کوئی اپنا سلام بھی نہیں لینا چاہتا۔ چونکہ یہ تعلیم اباً عن جدٍّ ہوتی چلی آئی ہے تو ایسی تمام قومیں ممسک کفایت شعار اور پیسے پر جان دینے والی ہوتی ہیں۔

ایک اور سوال پیش کرو کہ یوروپین اقوام۔ دولتمند۔ سلیقہ شعار۔ اولوالعزم کیوں ہیں؟ جسکا جواب یہ ہے کہ اُس ملک کی آب و ہوا نگ میں یہ تربیت موجود ہے کہ دولت پیدا کرنیکیواسطے ہر ایک کام اور پیشہ کا کرنا نہ صرف جائز بلکہ فخر ہے۔ ملک چھوڑو۔ دیس چھوڑو۔ مگر چار پیسے کماؤ۔ اور پیدا کی ہوئی دولت میں سے کچھ کو آگے کے واسطے الگ رکھو اور باقی کو اپنے آرام اور لطف میں خرچ کرو۔ اُن کی تربیت میں یہ داخل ہے کہ خدا تعالٰی جل شانہ کی مخلوقات کا احصا اور انحصار نہیں ہے

یعنی جو باتیں اتبک معلوم ہوگئی ہیں اُن کی نسبت ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ بس جو کچھ حال تھا معلوم ہو چکا۔ جسکا اثر اور نتیجہ یورپین اقوام کے حق میں یہ ہوا ہے کہ سب کی سب دولتمند۔ خوش گذران۔ اولوالعزم اور فیلسوف یعنی حکیم ہوگئے ہیں (سبحان اللہ وبحمدہٖ)

تربیت کا موثر کامل ہونا نہ صرف ایسی چیز ہے جس کی طرف اس زمانے میں خیال گیا ہو بلکہ جناب خاتم الانبیاء و افضل الرسل احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اپنے ارشاداتِ حکمت غایات میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

(ماغل والدٌ ولدہٗ من نحل افضل من ادب حسن)

یعنی باپ کا عطیہ بیٹے کیواسطے اس سے بہتر نہیں ہے کہ اُسکو عمدہ اخلاق و عادات سکھائے۔ دوسری حدیث شریف ہے کہ (ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ) یعنی ہر ایک بچہ نیوٹرل پیدا ہوتا ہے لیکن والدین اُس کو یہودی، یا عیسائی کر لیتے ہیں، یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ ان دونوں احادیث طیبہ کے ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان تابع ہے تربیت کے اور والدین کو چاہیے کہ وہ اچھی تربیت اپنی اولاد کی کریں۔

الغرض یہ مختصر بیان اس امر کے ثابت کر دینے کے واسطے کافی ہے کہ قومی ترقی اور تنزل کے اصلی اسباب وہ عادات و خصائل ہیں جو اُس قوم میں اثر اور سرایت کئے ہوتے ہیں اور عادات و خصائل کا مبدا اور منبع وہ تربیت ہے جو اُس قوم میں ہوتی ہے۔

اگر ہمارے ناچیز رسالے کے پڑھنے والے اس قضیے اور دعوے کو تسلیم کرلیں تو ایک بڑی فتح حاصل ہو جائے۔ کیونکہ اسکے بعد صرف یہ کام ہر ایک کا باقی رہجاتا ہے کہ وہ قرار دے کہ ہماری قوم میں کون کون وہ عادتیں ہیں، جو موجب زوال ہیں اور جنکو ترک کرنا چاہیے

اور بجائے اُسکے کیا کیا عادات ایسے ہیں جنکو پکڑنا او اختیار کرنا چاہیے۔

اگرچہ یہ مرحلہ طے اُسیوقت ہوگا جب کہ ہر ایک فرد بجائے خود اُسپر غور کریگا اور اُسکی اصلاح پر آمادہ ہوجائیگا لیکن جو جو اُمور ہمارے ذہن میں ہیں اُن کے بیان کرنے سے ہم بھی دریغ نہیں کرینگے اور وقتاً فوقتاً بیان کرتے رہینگے۔ اور غالباً ہمارے خیالات ایک حد تک دلچسپی سے پڑھے جائینگے۔

(اسمٰعیل)

ایّامِ جاہلیت کی شاعری

حال میں قاہرہ دارالخلافہ مصر سے ایک کتاب دول العرب والاسلام عربی زبان میں شائع ہوئی ہے جسکے مصنف کا نام محمد طلعت حرب ہے اور جو انجمن جغرافی خدیوی کا ایک ممتاز ممبر ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ جو ہماری نظر سے گذرا ہے اس میں اول عرب کا جغرافیہ۔ عرب کے قبائل۔ باشندگانِ عرب کے اخلاق وعادات۔ طرزِ معاشرت۔ طریقِ حکومت اور لٹریچر کا ذکر ہے۔ پھر ایامِ جاہلیت سے آنحضرتؐ کے عہدِ رسالت تک کے تاریخی حالات ہیں۔ آخر میں قرآنِ مجید اور مذہبِ اسلام پر ایک بسیط مضمون ہے۔ ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں سے اُس مضمون کا انتخاب جسمیں ناظرینِ رسالہ کے لیئے درج کرتے ہیں جو مصنف نے ایامِ جاہلیت کی شاعری پر لکھا ہے۔

مصنف نے اس مضمون کی ابتدا میں قبائلِ عرب کی مختلف بولیوں پر بحث کر کے لکھا ہے کہ شعراء جاہلیت نے عام زبان کی اصلاح کی اور عرب کی مختلف بولیوں کو ایک کر دیا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جو عام طور پر مانوس اور مشہور تھے اور جنکو ہر قبیلے کے آدمی سمجھ سکتے تھے۔ اس سے ایک مشترک زبان پیدا ہوئی۔ شعرا کے سوا کوئی اِس مہم کو انجام نہیں دیسکتا تھا۔ کیونکہ اُس زمانے میں کتابیں و اخبار کہاں تھے اور آجکل کی اشاعت کے طریقے کون جانتا تھا۔ اُس زمانے کے لوگ بزرگوں کی روایتوں کو زبانی یاد کرتے تھے جن میں انساب کے سلسلے۔ بزرگوں کے فضائل۔ اُن کی لڑائیوں اور مصیبتوں و آس پاس کے لوگوں سے اُن کے تعلقات کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ روایتیں اشعار میں مذکور ہونے سے ہر شخص کو آسانی سے ازبر ہوجاتی تھیں۔

اگر عرب کی شاعری کو غور سے مطالعہ کرو تو اس سے تاریخی واقعات۔ اہلِ عرب کے اخلاق وعادات آئینہ کی طرح صاف معلوم ہوتے ہیں۔ اِسی شاعری کی برکت سے زبان کی اصلاح ہوئی اور وہ خالص و لطیف اور عام فہم ہوگئی۔ اس شاعری سے اور بھی فائدے ہوئے۔ کیونکہ وہ جوانمردی۔ عالی ہمتی۔ شجاعت اور بڑے بڑے کاموں میں پیشقدمی سکھاتی ہے۔ اُس زمانے میں شاعروں کا عام رسوخ تھا اور اُنکا کلام شہادت کے طور پر پیش ہوتا تھا اور وہ شہادت تسلیم کی جاتی تھی۔

شاعر ہی اُس زمانے کے مورخ اور نسّاب تھے۔ وہی تاریخی واقعات کو تمام عرب میں شائع کرتے تھے اُن کے اشعار میں واقعات۔ فضائل۔ مفاخر۔ مصائب اور تغیراتِ مکانی و زمانی کا بیان ہوتا تھا۔ وہی اُس زمانے کے اہلِ حل وعقد تھے۔ مدح وقدح کی باگ اُنھیں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ جسکو چاہتے ذلیل کرسکتے تھے اور جسکو چاہتے نیکنام مشہور کرسکتے تھے۔ قبائل کو پست وبلند کرنا اُنھیں کے اختیار میں تھا۔ سب اُن سے ڈرتے تھے اور اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ عرب کے باشندے اُن کے خیموں کے گرد جمع ہوتے تھے اور وہ اشعار سُناتے اور عربی گیت گاتے تھے سامعین اُنکی شعرخوانی اور خوش الحانی سے محو حیرت

ہو جاتے تھے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ عرب کا بدو فطرتاً شعر گوئی اور معنی آفرینی اور نازک خیالی کے لیئے پیدا ہوا ہے۔ عکاظ۔ مجنہ اور ذی المجاز وغیرہ شعر خوانی کے دنگل انھیں شاعروں نے قائم کیئے۔ اِن سب میں عکاظ مشاعرے کا بہت مشہور میدان تھا۔ یہ مکّہ اور طائف کے درمیان مکّہ سے تین منزل پر ایک گانوں تھا۔ یہیں ہر اتوار اور ہر بیسویں دن ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ سالانہ میلہ ماہ ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے بیس دن تک قائم رہتا تھا اس میں عرب کے قبائل جمع ہوتے اور فخریہ اشعار پڑھتے تھے۔ اس کی برکت سے سب ایکدوسرے کو پہچاننے لگے اور قبائل میں اتحاد پیدا ہوگیا۔ یہاں عرب کے جنگجو اور شہسوار لوگ نقاب پوش ہو کر آتے تھے تاکہ پہچانے نہ جائیں اور امن و امان میں کوئی خلل نہ پیدا ہو اگرچہ یہاں لین دین اور بیوپار بہت ہوتا تھا مگر اس میلے سے اصلی غرض یہ تھی کہ عرب کے نامور شعرا اور فصحا جمع ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور فصاحت کے جوہر دکھائیں۔ شاعروں اور تاجروں کے علاوہ اُمرا قبائل اور فوجی سردار بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ ذی المجاز کا میلہ جبل عرفات کے دامن میں ہوا کرتا تھا۔ یہ میلے ظاہری شان و شوکت اور زینت و آرایش سے خالی اور سادہ ہوتے تھے مگر اُن سے ایک عجیب ہیبت اور جلال ٹپکتا تھا۔ اِن میں ہر طرف سے جوق جوق شاعر آتے تھے۔ جب کسی شاعر کی باری آتی تو وہ وسطِ میدان میں کھڑا ہو جاتا اور اپنے اشعار خوش الحانی کے ساتھ پڑھکر حاضرین کو سُناتا تھا جو اُسکے گرد جمع ہوتے تھے اور اُسکے اشعار کو یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو قصیدے فصاحت اور بلاغت میں مقبول ہوتے وہ ریشمی پارچوں پر سُنہری حروف میں لکھے جاتے اور کعبے میں آویزاں کیئے جاتے تھے تاکہ قصیدہ کہنے والے شاعروں کا نام یادگار رہے۔

انھیں قصائد میں سے وہ سات قصیدے ہیں جو سبعہ معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔ چونکہ اُن میں اعلیٰ درجے کی فصاحت اور شاعری ہے، اسیلئے علما نے خاص طور پر اُن کی شرحیں لکھی ہیں اور اُن کا درس آج تک جاری ہے۔ ان میلوں میں دستور تھا کہ جب شعرا اور جنگجو لوگ اُن میں داخل ہونا چاہتے تو پہلے مجاورانِ حرم کے پاس اپنے ہتیار اُتار کر رکھدیتے تھے اور اگر کوئی ایسا نہ کرتا تو قتل کیا جاتا تھا جسطرح یہ میلے فصاحت کے اظہار کے لیئے ایک عمدہ جولانگاہ تھے، اسیطرح اُن میں بہت سے لوگوں کو حُسنِ اخلاق میں مقابلہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ عکاظ کے دنگل میں عامر بن طفیل جو نجد کا ایک سردار قبیلہ بنی عامر سے تھا، عام طور پر منادی کرا دیتا تھا کہ اگر یہاں کسی کے پاس سواری نہ ہو تو ہمارے پاس آئے ہم اُسکو سواری دینگے اور اگر کوئی بھوکا ہو تو بے تکلف ہمارے دسترخوان پر آکر ہمارا شریک ہو۔ اگر کسیکو اپنے دشمن کا خطرہ ہو تو ہم اُس کی حمایت کے لیئے تیار ہیں۔ بعض ملوکِ عرب اِن میلوں میں اپنے باجگذار قبائل سے سالانہ خراج بھی وصول کرتے تھے۔ ان میلوں کی تاریخیں اس ترتیب سے رکھی گئی تھیں کہ پہلے عرب کے باشندے عکاظ میں آتے تھے۔ یہاں سے مجنہ میں جاکر بیس دن تک ٹھہرتے تھے۔ اسکے بعد حج کے ایام تک ذی المجاز میں ٹھہرے رہتے تھے۔ چونکہ عکاظ میں قبائل کے ممتاز لوگ اپنے فضائل زور شور سے بیان کرتے تھے، اسیلئے کبھی کبھی اُن میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ فجار اوّل اور فجار ثانی کے معرکے اسی بنیاد پر برپا ہوئے۔ عکاظ کا سب سے مشہور خطیب قس بن ساعدہ تھا۔ جس نے سب سے اوّل اپنی تقریر کے آغاز میں امّا بعد کے الفاظ کہے۔ اُسنے عکاظ میں اپنے مذہب کا وعظ کیا۔ وہ حشرِ اجساد اور عذاب کا قائل تھا۔ اور خُدا کی توحید

 ایام جاہلیت کی شاعری

کو دل سے مانتا تھا۔ وہ سُرخ رنگ کے اونٹ پر سوار ہوکر یہاں آتا تھا اور سواری ہی کی حالت میں تقریر کرتا تھا۔ اسکے بعض فصیح و بلیغ اور نصیحت آمیز خطبے اور اشعار ادب کی کتابوں میں درج ہیں۔ اسکے خطبے کی عبارت مقفےٰ ہوتی تھی۔ عرب میں کچھ عکاظ۔ مجنہ اور ذی المجاز ہی ایسے مقام نہ تھے جو تجارت اور شاعری اور حُسنِ اخلاق کا مرکز ہوں بلکہ یمن میں بھی ایسے ہی کئی میلے ہوا کرتے تھے جو تجارت کی گرم بازاری۔ فصحا اور شعرا کی آتش بیانی میں مشہور تھے۔

تمام مؤرخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سبعہ معلقہ عرب جاہلیت کے اشعار میں سب سے عمدہ اور سب سے اعلیٰ ہیں۔ تذکرۃ الحکمۃ فی طبقات الامم کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان قصائد کی فصاحت اور بلاغت کے سبب ڈیڑھ سو برس تک عرب کے باشندے انکو سجدہ کرتے رہے۔ جب مذہب اسلام کا ظہور ہوا تو قرآن مجید کی بے نظیر فصاحت نے اُن کی قوت اور شوکت کو بالکل پست کر دیا۔ سبعہ معلقہ کے شعرا حسب ذیل ہیں۔

(۱) امرؤ القیس۔ قبیلۂ بنو کندہ میں سے ہے جس نے ہجرت سے (۸۲) سال پیشتر وفات پائی۔ اسکا قصیدہ جسکے شروع میں الفاظ ”قِفَا نَبْكِ“ آئے ہیں، اسقدر مشہور ہے کہ ”اَشْهَرُ مِنْ قِفَا نَبْكِ“ ایک مثل ہوگئی ہے۔

(۲) طرفہ۔ اس نے (۵۸) سال قبل ہجرت وفات پائی۔ یہ قبیلۂ بکر کی طرف منسوب ہے۔ اس نے اوائل عمر ہی میں شاعری کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جو اوروں کو بڑی عمر میں جاکر نصیب ہوا۔ ابھی اسکی عمر (۲۰) سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ یکایک مقتول ہوا۔ اسکے قتل کا قصہ مشہور ہے۔

(۳) عمرو بن کلثوم۔ یہ شاعر قبیلۂ بنی تغلب میں سے تھا۔ اس نے سنہ ہجری میں وفات پائی۔ شعر کم کہتا تھا مگر جو کچھ کہتا تھا، وہ نہایت اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا۔ اُسکا ایک شعر اور شاعروں کے سینکڑوں اشعار سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسکی عمر (۱۵۰) سال کی ہوئی۔

(۴) حرث بن حلزہ یشکری۔ یہ ہجرت سے (۳۲) سال پہلے پیدا ہوا۔ عراق کا باشندہ ہے۔ اسکو برص کی بیماری تھی۔

(۵) لبید۔ یہ بنی عامر میں سے ہے۔ اُسکی کنیت ابو عقیل ہے۔ اسکی ولادت ہجرت سے (۴۰) سال پہلے ہوئی۔ اُس نے اسلام کا زمانہ دیکھا تھا اور مسلمان ہوگیا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد کبھی شعر نہیں کہا۔ اسکا مقولہ تھا کہ مجھے قرآن کی فصاحت شاعری سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے فیاضی میں شہرت پائی اور عمر کی (۱۴۰) منزلیں طے کیں۔

(۶) زہیر مزنی۔ جاہلیت میں مشہور شاعر تھا۔ نجد کا باشندہ ہے۔ اُس نے بعثت سے ایک سال پہلے وفات پائی۔ اسکے بہت سے اشعار ضرب المثل ہیں۔ زہیر کا بیٹا بجیر مسلمان ہوگیا تھا۔ کعب بن زہیر جسکا قصیدہ بانت سعاد بہت مشہور ہے، اسی کا بھائی تھا جسنے مسلمان ہوکر آنحضرت کی خدمت میں یہ قصیدہ پیش کیا تھا۔ معلقہ کے سوا زہیر کے اور قصائد بھی ہیں، جو حولیات کہلاتے ہیں۔ ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان میں سے وہ ایک قصیدے کو چار مہینے میں تیار کرتا تھا۔ پھر چار مہینے اسکی کاٹ چھانٹ اور اصلاح کیا کرتا تھا۔ اسکے بعد چار مہینے تک اور شاعروں کو دکھاتا تھا اور پورے ایکسال کے بعد اُس کو عام پر شائع کرتا تھا۔

(۷) عنترہ عبسی۔ اسکی ولادت ۵۲۵ء اور وفات ۶۱۵ء میں ہوئی۔ اسکی ماں ایک حبشی

تھی جو لڑائی میں پکڑی گئی تھی۔ ماں کے لونڈی ہونیکے سبب سے عنترہ کا باپ اسکو اپنا بیٹا نہیں کہتا تھا مگر جب وہ جوان ہوا اور شہسوار اور بہادر مشہور ہوا تو اسکو اپنا بیٹا کہنے لگا۔ وہ شجاعت کے ساتھ حلیم اور خلیق بھی تھا۔ اشعار میں برخلاف دیگر شعرائے جاہلیت کے عام فہم الفاظ لاتا تھا۔ او رجنگ کے اشعار تو خوب ہی کہتا تھا اسکا نام عرب میں خاص و عام کی زبان پر ہے۔ وجہ یہ کہ اُسکا ایک قصہ مشہور ہے جسکو سب آدمی پڑھتے، یا سُنتے ہیں۔ یہ قصہ اوائل اسلام میں لکھا گیا۔ اس کا مصنف مشہور نہیں ہے مگر چونکہ اس قصے کا راوی اصمعی ہے اسلیئے وہی مصنف خیال کیا گیا ہے۔

سبعہ معلقہ کے سوا اور قصیدے بھی کعبے میں آویزاں کیئے گئے تھے جن میں سے ایک اعشیٰ کا قصیدہ ہے۔ سب سے قدیم لٹریچر عربی زبان کا امثالِ لقمان ہے جو ایک مقفے نثر ہے۔ اسکے بعد عامر بن خنیس اور مرقش اصغر کا منظوم کلام ہے۔ جاہلیت کے دیگر مشہور شعرا جو چھٹی صدی عیسوی میں ہوئے اونکے نام یہ ہیں (۱) عدی بن ربیعہ، یا (مہلہل) (۲) عدی بن زید۔ (۳) عدی بن ابرص (۴) امیۃ بن ابی الصلت ۔ یہ پہلا طبقہ شعرائے جاہلیت کا ہے۔ (۵) شنفری۔ (۶) ابو داؤد ایادی (۷) سلامہ بن جندل۔ (۸) مثقب عبدی (۹) براق بن رومان (۱۰) تابط شرا (۱۱) سموأل عادیا (۱۲) علقمۃ الفحل (۱۳) حارث بن عباد (۱۴) خداش بن زہیر (۱۵) عروہ بن الورد (۱۶) اسود بن یعفر (۱۷) حاتم طائی۔ (۱۸) اوس بن حجر۔ (۱۹) زید بن المہلہل یہ شعرائے جاہلیت کا دوسرا طبقہ ہے۔ (۲۰) لقیط بن زرارہ تیسرے طبقے کا جاہلی شاعر ہے۔ مردوں کے سوا بہت سی عورتیں بھی شاعر ہو چکی ہیں۔ عکاظ کے میلے میں جب خنساء نے اپنا کلام سُنایا، تو نابغہ نے کہا کہ اگر تجھ سے پہلے یہ اندھا (اعشیٰ) شعر نہ سُناتا تو اس مشاعرے کے تمام شاعروں پر میں تجھے ہی ترجیح دیتا۔ خنساء کے اکثر اشعار اس کے دو بھائیوں صخر اور معاویہ کے مرثیے میں ہیں۔ اُس نے مسلمان ہو کر ۲۴ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس بات پر تمام علما کا اتفاق ہے کہ خنساء سے پہلے اور اسکے بعد کوئی عورت اُس سے زیادہ شاعر نہیں ہوئی۔ یہ شاعرہ شجاعت اور حُسنِ اخلاق میں بھی ممتاز تھی۔

شعرائے جاہلیت میں سب سے بالاتر کون شاعر تھا؟ اسمیں علما کا اختلاف ہے۔ بعض امرء القیس کو بعض زہیر کو۔ بعض عنترہ کو اور بعض اور شاعروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر اصمعی کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے جس نے کہا ہے کہ عنترہ جنگ و شہسواری کا۔ زہیر ترغیب و تحریک کا۔ نابغہ عیش و نشاط کا۔ اور اعشیٰ خوف و بیم کا مضمون اپنے اشعار میں خصوصیت کے ساتھ خوب باندھتا ہے۔

عرب جاہلیت کے اشعار جو ہمارے زمانے میں موجود ہیں، وہ بہت سی کتابوں میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں جن میں سے مشہور کتابیں یہ ہیں۔ جمہرۃ العرب لابن درید۔ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی۔ العقد الفرید لابن عبدربہ کتاب الامثال للمیدانی۔ ادب الکاتب لابن اثیر۔ ادب الکاتب للنویری۔ دیوان الحماسہ لابی تمام۔ ابن اثیر اور نویری کی کتابوں اور حماسہ میں وہ اشعار بھی ہیں جن میں روم اور فارس کی وہ لڑائیاں مذکور ہیں جو نوشیرواں اور جسٹینین قیصر کے درمیان ہوئیں اور جن میں غسان اور حیرہ کے فرمانروا شامل تھے۔

(رشید احمد سالم)

جدید کتابیں

شباب لکھنؤ

منشی احمد علی صاحب بی اے نے حال میں اس نام کی ایک کتاب چھپوا کر شائع کی ہے جس میں شاہ نصیر الدین حیدر فرمانروائے اودھ کے دربار کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ یہ کتاب آج سے پہلے انگریزی زبان میں تھی۔ اسکو دربار اودھ کے ایک یورپین ملازم نے بطور چشم دید واقعات کے مرتب کیا تھا اور اگرچہ اس سے دربار اودھ کے بعض ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں جو قابل افسوس ہیں مگر اسمیں شک نہیں کہ اس سے تاریخ اودھ کا ایک ضروری حصہ تیار ہوتا ہے۔ ترجمہ نہایت قابلیت سے کیا گیا ہے جس سے یہ کتاب اوریجنل تصنیف معلوم ہوتی ہے اور اسکے پڑھنے سے ناول کا لطف آتا ہے۔ مترجم نے شروع میں ایک بسیط تاریخی مقدمہ شامل کیا ہے جس میں سلطنت اودھ کے حالات ابتدائی زمانہ سے شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت تک درج کیے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت عہ ہے اور منشی وجیہہ الحسن صاحب سے ذیل کے پتے پر درخواست کرنے سے مل سکتی ہے۔ کوٹھی منشی احتشام علی صاحب۔ امین آباد لکھنؤ۔

اردو لیٹر رائٹر

یہ رسالہ منشی رام جی داس بہار گو اڈیٹر رسالہ اودھ ریویو (لکھنؤ) نے زمانہ حال کے طریقہ خط و کتابت پر تصنیف کیا ہے۔ اس میں ہر قسم کے ضروری خطوط اور بکار آمد نوشتے درج کیے گئے ہیں اور شروع میں خط نویسی کے متعلق کچھ ہدایتیں بھی لکھی ہیں۔ یہ ضروری اور مفید اور بکار آمد رسالہ ۴ر قیمت پر مصنف سے مل سکتا ہے۔

رسالہ سل و دق

سل جو ایک مہلک و خطرناک مرض ہے اور جو آجکل عالمگیر ہے، اُس پر زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی صاحب اڈیٹر رسالہ حافظ صحت (موچی دروازہ۔ لاہور) نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور اسکے علامات۔ اسباب اور علاج پر قدیم اور جدید تحقیقات کو جمع کیا ہے۔ سب سے عجیب بات جو ابتک ہماری نظر سے نہیں گذری، وہ علاج بالحرکت کا طریقہ ہے جو اس رسالے کے آخر میں لکھا گیا ہے۔ اس علاج میں مسلول کے اعضا کو مختلف طریقوں سے حرکت دی جاتی ہے۔ ہر حرکت کے لیے ضروری تصویر بھی اس رسالے میں دی گئی ہے تاکہ حرکت دینے کا طریقہ آسانی سے سمجھا جائے۔ اس طریقے کا نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مریض کو رفتہ رفتہ کل علامات میں تبدیلی معلوم ہوتی ہے اور ایک محدود عرصہ میں اس مرض سے نجات ہو جاتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے یونانی طبیب اس طریقے کا امتحان کریں اور اسکے نتیجے سے پبلک کو مطلع کریں۔ اس رسالے کی قیمت ہمکو معلوم نہیں ہوسکی اور وہ مصنف سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے۔

عمدۃ البیان فی کیفیۃ الحافظۃ والنسیان

یہ رسالہ بھی حکیم صاحب ممدوح کی تصنیف سے ہے۔ اس میں حافظہ کو ترقی دینے کی تدبیریں اور ہدایتیں درج ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ اسکولوں کے نوجوان طالب العلم جنکو ایسے مختلف مضامین جن سے اُن کی طبیعت کو دلچسپی ہو، یا نہ ہو، امتحان میں شریک ہونیکے لیے یاد کرنے پڑتے ہیں، اس رسالے کو خرید کر پڑھیں۔ اسکی قیمت ۸ر ہے اور مصنف سے مل سکتا ہے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران | حاجی محمد اسمعیل خاں
| مولوی وحید الدین سلیم

نمبر ۹	یکم مارچ سنہ ۱۹ع	جلد ۲

قیمت فی پرچہ نمونہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ر		قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ للعہ

مقامِ اشاعت ۔ دفتر معارف علی گڑھ

مطبع فیض عام واقع علی گڑھ میں چھپا

مقاصد اور قواعد

۱- یہ دو جز کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علیگڈہ سے شائع ہوا کریگا

۲- اس رسالے کا مقصد یہ ہی کہ اس کے ذریعے سے اُردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اُس میں ہر قسم کے علمی فلسفی- اخلاقی- مذہبی- تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں- انگریزی- عربی اور تُرکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو-

۳- یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے- بلکہ اِن اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جاینگے-

۴- بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گیے ہیں-

ا- حاجی محمد اسمٰعیل خاں-

ب- مولوی وحید الدین سلیم-

۵- ملک کے مشہور اور اعلےٰ درجے کے انشا پرداز اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کی جاتی ہی کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں- جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں- اگر مہربانی سے وہ خود، یا اُن کے احباب اُن کے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُن کی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے اِمداد پہنچائیں- جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا-

۶- اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک (للعہ ر) ہی جو نقد قیمت بھیجے، یا ویلیو پے ایبل کی درخواست کرینگے خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا- ششماہی سے کم درخواست منظور نہ ہوگی- نمونے کے پرچے کے لیے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں- قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کی جائیگی- اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہو سکتی- رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت دفتر معارف علی گڈہ کے پتے سے مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیے اور اُن ہی کے نام قیمت آنی چاہیے- جواب طلب امور کے لئے آدھ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہی-

۷- جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں اُن سے اُمید کیجاتی ہی کہ وہ اپنا نام اور ٹائیٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے-

۸- حضرات خریداران معارف سے اُمید ہی کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً رسالے کی تاریخ اشاعت سے پہلے دفتر معارف کو مطلع فرمایا کرینگے-

۹- اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں-

۱۰- جو حضرات مضامین واسطے درج رسالہ مرحمت فرمائیں وہ خوشخط اور صاف لکھکر بھیجیں تاکہ چھپنے میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

نمبر ۹	یکم مارچ سنہ ۱۹۰۰ع	جلد ۲

انسان نے اوّل اوّل بولنا کیونکر شروع کیا؟

علمائے فلالوجی (علم اللّسان) نے جو نقشہ دُنیا کی زبانوں کی تقسیم کا مرتّب کیا ہی اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ ہر ایک برِّ اعظم کے زبانوں کی تعداد حسبِ ذیل ہی -

(۱) ایشیا ۹۸۷ (۲) یورپ ۳۵۸
(۳) افریقہ ۲۷۶ (۴) امریکا ۱۲۶۴
(۵) اُوشینیا ۷۹

یہ تقسیم باعتبار جغرافیہ کے ہی - زبانوں کی ترکیب اور بناوٹ کے لحاظ سے اُن کی بڑی بڑی قسمیں حسبِ ذیل ہیں -

(۱) آرین زبانیں (۲) سامی زبانیں
(۳) تورانی زبانیں

اوّل خاندان کی زبانوں میں سنسکرت - لاطینی - یونانی ژند زبانیں داخل ہیں جو مُردہ ہو چکی ہیں - اِس خاندان کی زندہ زبانوں میں انگریزی - جرمنی - فرانسیسی - ایطالی - اندلسی - ڈچ - ہندی - فارسی وغیرہ یورپ و ایشیا کی موجودہ زبانیں داخل ہیں - دوسرے خاندان میں سے عبرانی اور حمیری زبانیں مُردہ ہو چکی ہیں - عربی ایک زندہ زبان ہی جسکو دُنیا کے تیرہ آدمیوں میں سے ایک آدمی بولتا ہی - تیسرے خاندان کی زبانوں میں ترکی - چینی - جاپانی - برہمی وغیرہ زبانیں داخل ہیں -

اب سوال یہ ہی کہ اسقدر زبانیں کیونکر پیدا ہوئیں اور انسان نے اوّل اوّل بولنا کیونکر شروع کیا؟ ہر زبان کے بولنے والے یہ دعوے کرتے ہیں کہ انھیں کی زبان دُنیا میں سب سے پہلے بولی گئی - دُنیا کے اکثر مذہبی آدمی تو یہ کہکر خاموش ہو جاتے ہیں کہ انسان کو زبان خدا نے سکھائی اور بطور الہام کے الفاظ اُس کے دل میں القا کیے گئے مگر زمانۂ حال کے علما جو ہر بات کا پتہ پاتال تک لگاتے ہیں ان الفاظ کو سُنکر خاموش نہیں رہ سکتے -

اٹھارھویں صدی عیسوی کے فلاسفر - لاک - ایڈم سمتھ - ڈوگلڈ اسٹوارٹ وغیرہ یہ کہتے تھے کہ

انسان پہلے تو بالکل گونگا تھا۔ کوئی آواز بے معنی، یا بامعنی اُسکے مُنہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنے دل کی بات کہنی چاہتا، تو ہاتھ پاؤں سے اشارہ کرتا تھا۔ اور طرح طرح کی حرکتوں سے اپنا مطلب سمجھاتا تھا۔ جب اشاروں اور حرکتوں سے ہمیشہ کام نہ چلا تو وہ طبعًا بولنے پر مجبور ہوا۔ اُسکی زبان خود بخود کھُل گئی اور ہر مطلب کے لیئے الفاظ اُس کے مُنہ سے نکلنے لگے۔ ان الفاظ پر متکلم اور سامع دونوں کا اتفاق ہوتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ ایک وسیع زبان پیدا ہوگئی۔ یہاں تک تو یہ فلاسفہ متفق ہیں۔ آگے چلکر اس بات میں اختلاف ہو کہ الفاظ میں سے فعل پہلے پیدا ہوا، یا اسم۔ بعض تو کہتے ہیں کہ سب سے پہلے فعل پیدا ہوا کیونکہ اسم کا اشارے سے بتا دینا ممکن ہی مگر فعل میں جو معنی پوشیدہ ہیں، وہ اشارے سے سمجھے نہیں جا سکتے۔ اسلیئے مثلاً جب کبھی کوئی آدمی بھیڑیے کو آتا دیکھتا تو وہ "آیا" "وہ آیا" کہکر چلاتا اور دوسرے کو خبردار کرتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ فعل سے پہلے اسم پیدا ہوا کیونکہ اسم کے معلوم ہونے کے بعد فعل کا اُس کی طرف منسوب کر دینا آسان ہی۔ اُن کے نزدیک اُس زمانے کے آدمی بھیڑیے کو دیکھکر "وہ آیا" کہکر نہیں چلاتے تھے بلکہ "بھیڑیا وہ بھیڑیا" کہکر غل مچاتے تھے۔ اب اس بحث کو جانے دو کہ پہلے فعل پیدا ہوا، یا اسم۔ اصلی بحث تو یہ ہو کہ جب کوئی آدمی اُس وقت بولنا نہیں جانتا تھا تو الفاظ اُسکی زبان سے خود بخود کیونکر نکلنے شروع ہوئے اور ہر لفظ پر اُنکا اتفاق کیونکر ہوا؟

زمانۂ حال کے علماء نے اِس مسئلے کے حل کرنیکا نیا طریقہ ایجاد کیا ہی۔ اُنھوں نے دُنیا کی زبانوں کا باہم مقابلہ کیا ہی اور ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے ملانا شروع کیا ہی۔ اِس سے نتیجہ یہ نکلا ہی کہ دُنیا میں زبانوں کے تین بڑے خاندان ہیں (۱) آرین۔ (۲) سامی۔ (۳) تورانی۔ ہر خاندان میں جو زبانیں شامل ہیں اُن کے الفاظ ایکدوسرے سے مشابہ ہیں مگر ایک خاندان کے کسی زبان کے الفاظ کا دوسرے خاندان کے کسی زبان کے الفاظ سے مشابہ ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہوا۔ علمائے اَلسِنہ اب تک برابر کوشش کر رہے ہیں کہ جسطرح ہر خاندان کی زبانیں باہم متحد ثابت ہوئیں، اُسیطرح ان خاندانوں کو بھی ایک اصل کے ساتھ متحد ثابت کریں۔ ہر خاندان کی زبانوں کی جُدا جُدا تحقیقات بھی کیگئی ہی جس سے معلوم ہوا ہی کہ ہر زبان کیسی ہی وسیع ہو مگر اُس کی بُنیاد چند ابتدائی مادّوں سے شروع ہوئی ہی، جن کی تعداد ہزار تک کسی طرح نہیں پہونچ سکتی۔ مثلاً عبرانی زبان کی نسبت تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا ہی کہ وہ (۵۰۰) ابتدائی مادّوں سے تیار ہوئی ہی۔ یہ مقولہ پروفیسر رینان کا ہی، جو فرانس کا نہایت نامور عالم ہی۔ پروفیسر میکس مولر نے سنسکرت کی نسبت بھی یہی امر دریافت کیا ہی کہ اس وسیع زبان کے بھی ابتدائی مادّے (۵۰۰) سے زیادہ نہیں ہیں چینی زبان میں چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان الفاظ ہیں مگر ڈاکٹر جولین نے بتایا ہی کہ وہ اصلی مفرد مادّے جن سے اِس زبان کے کُل الفاظ تیار ہوئے ہیں (۴۵۰) سے زیادہ نہیں ہیں۔ تحقیقات کے اِس نئے طریقے سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر زبان میں اصلی مادّوں کی تعداد بہت تھوڑی ہی تو اب اتنا ہی دریافت کرنا باقی رہگیا کہ وہ کونسا طریقہ ہی، جس کے ذریعے سے انسان نے اِن ابتدائی مادّوں کو معلوم کیا اور اُن سے بولنا شروع کیا۔

علمائے اَلسِنہ نے اس باب میں تین نظریئے اختیار کیئے ہیں۔ پہلا نظریہ تو وہی اٹھارہویں صدی کے فلاسفہ کا ہی۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان اپنا مطلب اشاروں اور حرکتوں سے نکالتا تھا۔

جب اُس کے دل و دماغ پر خیالات کا ہجوم ہوا اور اشارات اور حرکات سے کام نہ چل سکا تو اُن آوازوں کی نقل اُتارنے لگا، جو اُسکو سُنائی دیتی تھیں۔ شلاً جب کُتّے کی طرف اشارہ کرتا تو "بھَوں بھَوں"، کہکر اُسکی آواز کی نقل اُتارتا تھا۔ کوّے کو "کائیں کائیں"، کی آواز سے بتاتا تھا۔ چڑیا کو "چوں چوں"، سے تعبیر کرتا تھا۔ اسیطرح ہوا کو "سائیں سائیں"، پتھر کو "کھٹ کھٹ"، کہکر بتاتا تھا۔ جب آوازوں کی نقل سے کام بخوبی چلنے لگا تو اُس نے یہی طریقہ ہر مطلب کے سمجھانے کے لیئے پسند کرلیا۔ اِس طریقے سے زبان کے اصلی اور ابتدائی مادّے تیار ہوگئے۔ پھر ترکیب۔ تبدیل۔ حذف وغیرہ طریقوں سے ایک ایک مادّے سے ہزاروں الفاظ نکل آئے اور زبان میں یہ قوّت پیدا ہوگئی کہ وہ ہر مطلب کو ادا کرسکے۔

دوسرا نظریہ جو کانڈی لاک وغیرہ علما نے اختیار کیا ہی، اس سے مختلف ہی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم آوازوں کی نقل اُتارنیکا نظریہ کیوں مانیں اور انسان کو انسان کے درجے سے گراکر اُسکو حیوانات کے زُمرے میں کیوں داخل کریں۔ کیا نیچر نے اُسکو ایسی آوازیں عطا نہیں کیں، جن سے وہ اپنے مطلب کو ظاہر کرسکے۔ اُسکو کیا حاجت ہی کہ وہ جانوروں کی آواز کے ساتھ آواز ملایا کرے۔ اور اُنکا مُنہ چڑایا کرے۔ کیا غم اور خوشی۔ غصّے اور تکلیف کے وقت اُس کے مُنہ سے مختلف آوازیں نہیں نکلتیں۔ یہ اُسکی طبعی آوازیں ہیں اور اِنھیں سے زبان کی بُنیاد ڈالی گئی ہی۔ یہی آوازیں وہ ابتدائی اور اصلی مادّے ہیں جن سے زبان کے تمام الفاظ پھوٹ کر نکلے ہیں۔

تیسرا نظریہ جو حال میں ہی ایجاد ہوا ہی اُس کے موجدوں میں دو نہایت نامور شخص پروفیسر میکس مولر اور پروفیسر رینان ہیں۔ پروفیسر میکس مولر نے اپنی ایک کتاب میں، جو اُسنے زبان کی اصلیت اور اُس کی نشو و نما پر لکھی ہی، بیان کیا ہی کہ آواز کی نقل اُتارنے سے کسی مطلب کا سمجھانا بیشک ممکن ہی۔ مثلاً ایک انگریز نے، جو چینی زبان سے ناواقف تھا، جب اُس کے سامنے ایک چینی ہوٹل میں کھانا چُنا گیا، خانساماں سے "کوک کوک"، کہکر یہ پوچھا کہ کیا یہ مُرغ کا گوشت ہے اُسنے "بھوَں بھوَں"، کہکر سمجھایا کہ نہیں مُرغ کا نہیں بلکہ کُتّے کا گوشت ہی مگر یہ آوازیں کسی زبان کے تیار کرنے کے لیئے کارآمد نہیں ہیں، نہ اُن سے کوئی زبان مرکّب ہوئی ہی۔ اگر کوئی زبان جانوروں کی آوازوں سے بن سکتی تو سب سے پہلے جانوروں کا نام اُنھیں آوازوں پر رکھا جاتا۔ حالانکہ بلّی کے نام کو اُسکی "میاؤں میاؤں"، سے اور کُتّے کے نام کو اُسکے "بھوَں بھوَں"، سے اور چڑیا کے نام کو اُسکی "چوں چوں"، سے کوئی مناسبت نہیں ہی۔ بیشک بعض جانوروں کے نام ایسے ہیں، جو اُن کی آوازوں سے ملتے جُلتے ہیں مگر وہ مصنوعی پھُول ہیں جن سے اصلی پھولوں کی بُو باس کا سُراغ لگانا ناممکن ہی۔ ان آوازوں سے الفاظ کا اشتقاق نہیں ہوا۔ جب ہم الفاظ کی مرکّب اور پیچیدہ صورتوں پر غور کرتے ہیں اور اُن سے وہ تمام ترکیبی زیادتیاں اور پیچیدگیاں دور کرکے اُن کو سادہ اور ابتدائی مادّوں کی شکل میں لے آتے ہیں تو ہمکو صاف معلوم ہوجاتا ہی کہ ان تمام ترکیبوں کو تحلیل کرتے کرتے کوئی آواز باقی نہیں رہی، یا کچھ آوازیں باقی رہیں مگر اُن کو باقی ابتدائی مادّوں سے شمار میں کچھ نسبت نہیں۔

یہ اعتراض تیسرے گروہ کا پہلے گروہ کے نظریے پر ہے۔ دوسرے گروہ کے نظریے پر اُن کا اعتراض یہ ہے کہ کوئی زبان ان آوازوں سے بھی مرکّب نہیں ہوئی جو انسان کی طبعی آوازیں

کہلاتی ہیں۔ نہ ایسا ہونا ممکن ہے کیونکہ جب انسان کی طبعی آواز ختم ہوتی ہے تو وہ بامعنی الفاظ کے ساتھ بولنا شروع کرتا ہے۔ ہوران تک کہتا ہے کہ جب طبعی آوازیں دور ہو جاتی ہیں، تب کوئی زبان بنتی ہے۔ انسان ان آوازوں کو جبھی استعمال کرتا ہے جبکہ اسکو کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جو اسکی طبیعت کو بدل دے اور وہ اصلی الفاظ کو بھول جائے یا موقع کے جاتے رہنے کا خوف دامنگیر ہو۔ اگر زبان کی بنیاد طبعی آوازیں ہوتیں تو زور کی ہنسی کو "قہ قہ قہ"، غمگین ہونے کو "ہائے ہائے"، نفرت کو "آخ تھو" رونے کو "ہو ہو" کے الفاظ سے تعبیر کرتے۔ ہنسنا۔ رونا۔ نفرت۔ غم وغیرہ الفاظ کیوں بولے جاتے حالانکہ ان آوازوں اور ان لفظوں میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ آوازیں اشاروں اور حرکتوں کی نسبت ادائے مطلب کے لیئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں۔ اسلیئے ممکن نہیں ہے کہ کسی زبان کی بنیاد ان آوازوں پر رکھی جائے۔

اسکے علاوہ ایک اور بات ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر زبان جانوروں کی آوازوں، یا طبعی آوازوں سے ملکر بنتی تو یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ بے زبان جانور کیوں بولنا شروع نہ کریں۔ حالانکہ جانوروں میں بعض جانور ایسے بھی ہیں، جو آوازوں کی نقل اُتار سکتے ہیں۔ مثلاً طوطا۔ ہنسراج وغیرہ اور بعض جانور خوشی۔ غم اور خوف کیوقت خاص قسم کی آوازیں بھی نکال سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر ایسا ہی ہوتا تو الفاظ سب سے پہلے محسوسات کی جزئی صورتوں کے لیئے جو ذہن میں آتے ہیں، ایجاد کیئے جاتے، پھر بتدریج کلّی صورتوں پر اُن کا اطلاق ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی کتّے کا نام بھوں بھوں رکھتا تو ضرور تھا کہ یہ کسی خاص کتّے کا نام ہو اور اُس سے پہلے پہل وہی کتّا مُراد لیا جائے۔ پھر بتدریج ہر کتّے پر یہ لفظ بولا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان نے پہلے پہل کلّی صورتوں کے لیئے الفاظ ایجاد کیئے کیونکہ جب ہم زبان کے الفاظ کو تحلیل کرتے ہیں اور اُن کو اُنکی منفرد مادّوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سب سے پہلے اشیا کی اُن صفات کیلیئے جو اُن کے ساتھ مخصوص ہیں، یا اُن کے افعال کے لیئے موضوع ہوئے تھے۔ مثلاً اگر کہف کے لفظ کا آرین زبانوں میں سُراغ لگایا جائی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے مادّے سے نکلا ہے جسکے معنی ہیں۔ سُوراخ کرنا۔ چھپانا۔ اسیطرح نہر کا لفظ ایسے مادّے سے مشتق ہوا ہے جسکے معنی جاری ہونے کے ہیں۔ دونوں معنی کلّی ہیں جو اوّل جزئی معنوں کے لیئے خاص کیئے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ کلّی پر بولے جانے لگے۔

میرے نزدیک بے زبان جانور کلّی معنوں کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ تمام جانداروں میں صرف انسان ہی اسکی قدرت رکھتا ہے۔ اسی سبب سے فکر اور نطق یہ دونوں صفات انسان ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ فکر اور نطق دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوسکتے۔ جو کلام بغیر فکر کے ہو وہ خالی آواز ہے اور جو فکر بغیر کلام کے ہو وہ لغو اور بیکار ہے۔ فکر اُس کلام کا نام ہے، جو پست ہو اور کلام اُس فکر کا نام ہے، جو بلند ہو۔ ہر کلمہ جو انسان کی زبان سے نکلتا ہے وہ ایک مجسّم فکر ہے۔ یہ سارا بیان عالمِ السنہ پروفیسر میکس مولر کی کتاب کا خلاصہ ہے۔

پروفیسر میکس مولر یہ بھی کہتا ہے کہ انسان نے اوّل اُس قوّت کی مدد سے، جو اُس کی فطرت میں ودیعت کیگئی تھی، وہ اصلی مادّے ایجاد کیئے جن پر زبان کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ قوّت قلّتِ استعمال سے کمزور ہوگئی اور مدّتِ دراز تک اُسکے کام میں نہ آنیکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معطّل ہو کر بالکل جاتی رہی۔ سونے اور لوہے کو بجا کر دیکھو دونوں کی آواز الگ ہے۔ اسیطرح لکڑی اور ٹھیکری کی آوازیں جُدا جُدا ہیں

انسان طبعی مخلوقات میں سب سے برتر اور سب سے کامل ہی- آخر صرف یہی قوت نہیں ہی کہ وہ اپنے گرد و پیش کی آوازوں کی نقل اُتارے، یا بہ زبان جانوروں کی طرح صرف طبعی آوازوں کی مدد سے اپنے مطالب کو ادا کرے بلکہ اُس میں ایک اور نئی قوت بھی رکھی گئی ہی، جسکا کام یہ ہی کہ اُس کی مدد سے انسان اپنے مافی الضمیر کو الفاظ سے تعبیر کر سکتا ہی- اوّل انسان کے دماغ میں کوئی خیال گردش کرتا تھا گویا کہ وہ قوت جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا دماغ پر اپنی ضربات پہونچاتی تھی- ضربات سے جو آوازیں پیدا ہوتی تھیں وہ الفاظ ہیں- یہی الفاظ زبان کے لیئے بمنزلہ ابتدائی مادّوں کے ہوگئے- اسکے بعد انسان نے ان الفاظ میں تغیر و تبدل کر کے ہزاروں نئے الفاظ نکال لیئے اور رفتہ رفتہ زبان کی ایک عالیشان عمارت ان بُنیادوں پر اُٹھائی گئی- اصلی مادّوں کے ایجاد کرنے کے بعد اُس قوت کو کام کرنیکا کوئی موقع نہیں رہا- اور جسطرح انسان کی ہر قوت قلّتِ استعمال سے رفتہ رفتہ مضمحل پھر معدوم ہوجاتی ہی اسیطرح یہ قوت بھی بتدریج بنی نوع انسان سے زائل ہوگئی- یہاں تک ہم نے میکس مولر کا نظریہ بیان کیا-

اس نظریے پر پروفیسر ہوٹنی نے جو امریکا کا مشہور عالم ہی، اعتراض کیا ہی، وہ کہتا ہی کہ پروفیسر میکس مولر کے بیان سے لازم آتا ہی کہ انسان نے اوّل اُس قوت کی مدد سے بولنا شروع کیا، جو اُسکی جبلّت میں موجود تھی- اُسکو بولنے کا یہ سبب نہیں تھا کہ اُسکو سوسائٹی کے ساتھ میل جول اور تبادلۂ خیالات کے لیئے مجبور ہونا پڑا- حالانکہ یہ واقعے کے بالکل خلاف ہی- میکس مولر کے نزدیک نطق اور فکر دونوں ایکدوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں حالانکہ فکر بدون نطق کے بھی پایا جاسکتا ہی- اگر میکس مولر کا خیال صحیح ہے کہ انسان نے ایک عجیب و غریب جبلّی قوت کی مدد سے الفاظ ایجاد کیئے تو اس سے لازم آتا ہی کہ وہ قوت اب بھی موجود ہو اور دنیا سے معدوم نہ ہوئی ہو- انسان کے ذہن میں اب بھی نئے نئے خیالات آتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں ہوتا کہ جب اُسکی ذہن میں خیالات کی لہریں آنے لگیں تو بے اختیار نئے نئے الفاظ بھی زبان سے نکلنے لگیں، جو اُن جدید خیالات کو تعبیر کرسکیں پس جس حالت میں کہ اب بھی اس قوت کی حاجت ہے اور باوجود حاجت کے اُسکا کوئی کرشمہ دیکھا نہیں جاتا تو یہ نتیجہ نکالنا کچھ عجیب نہیں ہی کہ یہ حیرت انگیز قوت پہلے بھی کبھی انسان کے حصّے میں نہیں آئی-

ہمارے نزدیک تیسرا نظریہ جس کے بانیوں میں پروفیسر میکس مولر اور پروفیسر رینان ہیں، صحیح نہیں ہی- ہم پہلے اور دوسرے نظریے کو صحیح سمجھتے ہیں اور دونوں کو ملا کر یہ یقین کرتے ہیں کہ انسان نے اشارات و حرکات کے بعد جن آوازوں سے بولنا شروع کیا وہ یا تو خود انسان کی طبعی آوازیں تھیں، یا گرد و پیش کی آوازوں کی نقل تھیں پھر اُسنے دونوں قسم کی آوازوں میں تغیر و تبدل کر کے زبان ایجاد کی-

دوسرے گروہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہی کہ اس نظریے کے تسلیم کرنے سے انسان اپنے درجے سے گر کر حیوانات میں شامل ہوجاتا ہی- اسلیئے کہ درحقیقت انسان بھی ایک ترقی یافتہ حیوان ہی- اسکی موجودہ لیاقتیں اور قابلیتیں یکدم سے نمودار نہیں ہوئیں- بلکہ رفتہ رفتہ اس کی ہر قوت کو نشو و نما ہوا ہی- تیسرے گروہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہی کہ اگر انسان نے جانوروں کی آوازوں کی نقل اُتار کر بولنا شروع کیا ہی تو سب سے پہلے جانوروں کے نام وہی رکھے جاتے، جو اُن کی آوازیں ہیں- ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ انسان نے ایسا ہی کیا ہی- جانوروں کے جو نام اُن کی آوازوں سے ملتے جلتے ہیں، اُن کی نسبت تو اُن کو بھی تامل نہیں ہی مگر وہ نام جو آوازوں سے ملتے جلتے نہیں ہیں اُن کو شک میں

ڈالتے ہیں۔ یہ نام یا تو درحقیقت آواز ہی پر رکھے گئے تھے، بگڑتے بگڑتے اُن ناموں کی یہ حالت ہو گئی کہ اب بمشکل ہم اُن کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں، یا وہ اُس زمانے میں مقرر ہوئے ہیں جبکہ انسان نے اِس سادہ طریقے کے علاوہ اور طریقے نام رکھنے کے ایجاد کر لئے تھے۔ الفاظ کو تحلیل کرتے کرتے جو اصلی مادے ہم نے دریافت کئے ہیں، اگر اُن میں سے کوئی مادہ ایسا ہے کہ ایک زبان میں وہ کسی آواز پر دلالت نہیں کرتا تو دوسری زبان میں اُسکو تلاش کرو، جو اُسی خاندان کی زبان ہے۔ اگر اُس میں بھی نہ ملے تو اُسی خاندان کی تیسری زبان میں ٹٹولو۔ اِس تحقیق سے یقیناً ہم اِس نتیجے پر پہونچ جائینگے کہ وہ مادہ اگرچہ ایک زبان میں آواز پر دلالت نہیں کرتا مگر دوسری زبان میں جو اُسی خاندان کی ہے، اُسکی آواز سُنائی دیتی ہے۔ چونکہ دونوں زبانیں ایک ہی خاندان کی ہیں اسلیئے یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ جب دونوں زبانوں کے بولنے والے ایک ہی جگہ آباد تھے اور ایک ہی مشترک زبان بولتے تھے تو اُس وقت وہ لفظ آواز کے لیئے وضع کیا گیا تھا۔ پھر ایک گروہ نے اُسکو دوسرے معنوں کے لیئے بولنا شروع کیا اور جب وہ اپنے مشترک گروہ سے جُدا ہو کر دوسری جگہ آباد ہوئے تو اُنھوں نے اُس کے اصلی مفہوم کو فراموش کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ ہم ہر مادے کی نسبت ایسی انتہائی اور کامل تحقیقات نہ کر سکیں کیونکہ کمپیریٹو فلالوجی (علم اللغات بالمقابلہ) ایسا علم ہے جسکی عمر بہ نسبت دیگر علوم کے بہت تھوڑی ہے اور اُس کی ترقی کے لیئے ابھی ہزاروں مشکلات پر غالب آنا ہے۔ اِسکے علاوہ دُنیا کی بہت سی زبانیں متروک اور مُردہ ہو چکی ہیں اور اُن کی مکمل ڈکشنریاں موجود نہیں ہیں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ طبعی آوازوں کے ساقط ہو جانے کے بعد کوئی زبان زبان بنتی ہے اور اسوقت طبعی آوازوں سے بہت کم کام لیا جاتا ہے اور وہ بہت زیادہ کار آمد بھی نہیں ہیں اسلیئے کہ جب ہم انسان کی اُس حالت کا سُراغ

لگاتے ہیں جبکہ وہ مثل دیگر حیوانوں کے موجودہ ترقی کے ہتھیاروں سے مسلح نہیں تھا تو اُسوقت کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اُس کی ہر قوت ایکدم سے معراج کمال کو پہونچ گئی تھی، محض غلط ہے۔ علمائے انتھروپالوجی (علم الانسان) کی نہایت دقیق اور عمیق تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جب انسان دُنیا میں نمودار ہوا تو وہ ہر لحاظ سے حیوانِ مطلق اور ہر قسم کی ترقیوں سے عاری تھا۔ اُس نے سکونت۔ پوشش۔ غذا۔ بولنے لکھنے۔ سوچنے اور سمجھنے میں بیشمار برسوں تک آہستہ آہستہ ترقی کی اور آخر کار وہ اس حالت پر پہونچ گیا کہ دیگر حیوانوں سے ممتاز ہو کر ایک نئی نوع کو وجود میں لایا۔ آوازوں کے نقل اُتارنے، یا طبعی آوازوں کی مدد سے اپنے مطالب کو تعبیر کرنے میں اب اسلیئے وہ مشغول نہیں ہوتا کہ ادائے مطالب کے لیئے اب اُسکے پاس مکمل طریقے ہیں۔ اُسکو اس بات پر مجبور کرنا کہ اب بھی وہ اُنھیں ناقص اور نامکمل طریقوں سے کام لے، جن کے ایجاد کرنے کی ضرورت اُسوقت اُسے پیش آئی تھی بعینہ یہ چاہنا ہے کہ دُنیا موجودہ ترقی سے ہزاروں کوس پیچھے ہٹ جائے۔ اب بیشک وہ آوازیں کار آمد نہیں رہیں مگر یہ کہنا کہ وہ کبھی کار آمد نہیں تھیں، غلط ہے۔ یہ اعتراض بھی حیرت انگیز ہے کہ اگر انسان نے طبعی آوازوں کی مدد سے، یا جانوروں کی آوازوں کی نقل سے بولنا سیکھا ہے تو جانور کیوں نہیں بولنا شروع کر دیتے حالانکہ اُن میں بعض جانور آوازوں کی نقل اُتار سکتے ہیں اور بعض جانور طبعی آوازیں بھی نکال سکتے ہیں۔ ہمارے معترض اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انسان نے جو بولنا شروع کیا ہے وہ بیشمار برسوں کے بعد اس قابل ہوا ہے کہ ادائے مطالب کے لیئے الفاظ کا استعمال کر سکے۔ طوطے اور بندر جو نہایت ادنےٰ درجے کے حیوان ہیں، اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ موجودہ حالت میں انسان کی طرح فصیح و بلیغ

کرسکیں، بالکل بے معنی ہی۔ اوولیوشن (ارتقار) کا نظریہ جسکو ڈارون نے نہایت عمدگی سے زندہ مخلوقات میں ثابت کیا ہی، ہمکو بتاتا ہی کہ کسطرح ایک بسیط مادۂ زندگی (پروٹوپلازم) نے ترقی کی اور اس سے مختلف حیوانات کی نسلیں کیونکر شروع ہوئیں اور حیوانات میں بتدریج ترقی ہو کر کیونکر اعلیٰ قسم کے حیوانات کی نسل پیدا ہوئی۔ اور اُن میں بیشمار برسوں کی تبدیلیوں کے بعد کیونکر انسان کی قابلیتیں نمودار ہوئیں۔ یہ نظریہ اب علم کے درجے پر پہونچ گیا ہی اور ڈارون کے بعد اسکو بہت سے علوم پر منطبق کیا گیا ہی۔ جو تبدیلیاں و ترقیاں حیوانات کے ایک گروہ میں بیشمار برسوں کے بعد ظہور میں آئی ہیں اُن کے لیے یہ توقع کرنا کہ وہ ایکدم سے ادنیٰ حیوانات میں ظہور پذیر ہوں اور وہ اعلیٰ حیوانات کے درجے پر یکلخت پہونچ جائیں، ایک مضحکہ آمیز خیال ہی۔ پروفیسر میکس مولر اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ انسان نے اوّل کُلّی صورتوں کے لیے الفاظ تراشنے شروع کیے مگر ہمکو اُن کے اس یقین پر تعجب آتا ہی۔ ناممکن ہی کہ ایک بچہ کُلّی تصوّرات ذہن میں لاسکے انسان کی ابتدائی حالت کو طفولیت سے تشبیہ دینا بیجا نہیں ہی اور اسلیئے یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ اُس حالت میں انسان محسوسات کی جُزئی صورتوں کا خیال کرسکتا تھا اور اُنھیں جُزئی صورتوں کے نام رکھتا تھا جب اُس کے دل و دماغ نے ترقی کی اور کُلّی تصوّرات اُسکے ذہن میں آنے لگے تو وہ اُنھیں جُزئی تصوّرات کے ناموں کو کُلّی تصوّرات پر بولنے لگا۔ بیشک ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بے زبان جانور کُلّی معنوں کا تصوّر نہیں کرسکتے، اور اُن میں سے صرف انسان ہی ایسا تصوّر ذہن میں لاسکتا ہی مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آیا انسان کو یہ قدرت ایکدم سے حاصل ہوئی؟ ہم کو ایک منٹ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آسکتا کہ وہ نطق اور فکر جسکو پروفیسر میکس مولر انسان کے ساتھ خاص بتاتے اور دونوں کو لازم ملزوم کہتے ہیں اُن پر انسان ایکدم سے قادر ہوگیا تھا۔ جسطرح ایک بچہ نہایت سادہ اور بسیط حالت سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے بلوغ کو پہونچتا ہی، یہی حال بالکل نوعِ انسان کا ہی اور انسان کی تمام قوتیں اور قابلیتیں بتدریج کمال کو پہونچی ہیں۔ اب ایک شخص یہ سوال کرسکتا ہی کہ اگر پروفیسر میکس مولر کے نظریے کو تسلیم کیا جاتا ہی تو اس سے یہ لازم آتا ہی کہ وہ قوّت جس کی مدد سے انسان نے نئے نئے الفاظ ایجاد کیئے، اب اِس کی حاجت نہیں ہی اور اسلیئے وہ دُنیا سے معدوم ہوگئی اور اگر تمھارے نظریے کو تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہی کہ آوازوں کے نقل اُتارنے، یا طبعی آوازوں کی مدد سے نام رکھنے کا طریقہ جس سے انسان نے بولنا سیکھا، اب اسکی حاجت نہیں ہی اور اسلیئے وہ طریقہ اب بیکار ہوگیا۔ جب دونوں صورتوں میں ایک ایسی قوّت یا طریقے کو تسلیم کرنا پڑتا ہی، جسکا وجود پہلے تھا اور اب وہ معدوم ہی۔ تو ان دونوں میں کیا فرق ہی اور ایک خیال کو دوسرے خیال پر ترجیح دینے کی کیا وجہ ہی؟ -

اسکے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ پروفیسر میکس مولر کے نظریے کو تسلیم کرنے سے ایسی قوّت کے اوّل وجود اور پھر بے سبب معدوم ہونے کو ماننا پڑتا ہی، جس کی حاجت اب بھی ہی مگر اُسکا کوئی ظہور نہیں ہوتا جیسا کہ پروفیسر ہوٹنی نے بیان کیا ہی۔ ہمارے نظریے سے ایک ایسے ناقص طریقے کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہی، جسکی حاجت ابتدا میں مکمل طریقے نہ ہونے کی سبب سے تھی مگر اب اس سبب کہ بہتر اور برتر اور کامل طریقے نئے نام رکھنے کے نکل آئے ہیں، اسکی کوئی ضرورت نہیں ہی۔ یہ کچھ اسی طریقے پر منحصر نہیں ہی بلکہ انسان ہمیشہ اُن ناقص چیزوں کو چھوڑتا رہا ہی جن کو اُسنے رفتہ رفتہ کمال کے درجے پر پہونچایا اور اب وہ ایک نئی حالت میں اگر زیادہ مفید ہوگئی ہیں۔

اس نظریے کے ثبوت کے لیے جسکو ہم نے اختیار کیا ہی بہت سی کتابیں یورپین زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔

اگر ہمارے ناظرین اُن کتابوں کو مطالعہ کرنا چاہیں تو ہم انکا نام و نشان بتا سکتے ہیں۔ عربی میں صرف دو کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں جن میں اس نظریے کو عربی زبان پر منطبق کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ ان میں سے ایک کتاب الفلسفۃ اللغویہ ہے، جو مصر کے رسالہ "الہلال" کے اڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ دوسری کتاب کا نام المقدمہ ہے، جو ہمارے مخدوم مولوی سید کرامت حسین بیرسٹرایٹ لا (الہ آباد) کی تصنیف ہے۔ دونوں کتابیں مصنفوں سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہیں۔ ہماری زبان میں اب تک کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ ہم اس مضمون پر آئندہ پھر کبھی قلم فرسائی کرینگے۔

(وحید الدین سلیم)

حالاتِ سسلی

(۱)

سسلی بنی الاغلب کی زیرِ حکومت

ملکی حالت ۔ فتوحات

ہم[1] اپنے سلسلۂ بیان میں اُس مقام تک پہونچے ہیں، جبکہ افریقہ اور اندلس کے متحدہ بیڑوں نے محصورین کو محاصرے سے نجات دلوائی۔ ہم کو اپنے گذشتہ بیان میں اسقدر اور اضافہ کردینا چاہیے کہ جو فوج افریقہ سے آئی تھی اسکا کمانڈر ابو فہر محمد[2] بن عبداللہ بن الاغلب تھا جس کا خاندان، دنیا خاندان کا بنی التمیم اور بنی عبد ربہ کے نام سے مشہور تھا گو وہ ایک زبردست، عالی دماغ مدبر نہ تھا تاہم اُس کے پرلے درجے کی دلیری اور جاں بازی میں کچھ شک نہیں ہوسکتا۔ اسنے اپنے تئیں ہر موقع پر بنی الاغلب کا پورا پورا وفادار اور سچا ہوا خواہ ثابت کیا تھا۔ جو معرکے بطور فوجی مشق و قواعد کے ہوا کرتے تھے اُن میں ایک دفعہ وہ سسلی میں پہلے بھی آچکا تھا۔ انہی تجربات کی بنا پر وہ ایسے نازک موقع میں ایسے اہم کام پر مامور کیا گیا، جو آجکل کے زمانہ ترقی میں بھی ایک اعلیٰ درجے کی جرأت و بہادری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ محاصرے سے رہائی پانے اور افواج اندلس کی واپسی کے بعد اب محمد کو اسبات میں غور کرنا تھا کہ آئندہ کے لیئے کیا پالیسی اختیار کی جائے۔ محمد بن عبداللہ کو کوئی صاف صاف احکام زیادۃ اللہ کے پاس سے نہیں ملے تھے، جنکے مطابق کام کیا جاتا۔ اسکے سوا محمد کی یہ مرضی بھی نہ تھی کہ ساری ذمہ داری اپنے سر لے۔ لہذا اسنے تمام حالات کی مفصل رپورٹ زیادۃ اللہ کے پاس بھیجیں اور آئندہ کارروائی کو اس کی رائے پر چھوڑ دیا۔ تاوقتیکہ نئے احکام نہ پہونچ جائیں، سسلی میں قیام کرنا ضروری تھا۔ اور اسکے لیئے ضرور تھا کہ سب سے پہلے کوئی عمدہ مقام، جہاں چھاؤنی قائم ہوسکے، فتح کیا جائے۔

جس قدر علاقہ قاضی اسد نے فتح کیا تھا وہ ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اور انتظامات جو ان کا ... سہ بات میں کیے گئے

[1] اس نمبر میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ البیان المغرب جلد اوّل۔ مختلف صفحات۔ تاریخ الکامل مطبوعۂ یورپ جلد سادس و جلد سابع مختلف مقامات۔ تاریخ ابوالفدا۔ المونس بحوالہ منتخب تواریخ صقلیہ۔ یہ کتابیں۔ حلۃ السیراء لابی بکر بن الابار۔ القضاعی البلنسی صفحہ ۳۲۷۔ نہایۃ الارب صفحہ ۴۳۰۔

[2] محمد بن عبداللہ بن الاغلب اور ابراہیم بن عبداللہ بن ابراہیم (آئندہ والی) کے حالات کو عموماً مؤرخین نے باہم گڈمڈ کردیا ہے اور ایک کے واقعات دوسرے کی نسبت لکھدیئے ہیں۔ کتاب حلۃ السیراء میں، جو خاص افریقہ کے رہنے والے ہی کی تصنیف ہے اور جسکی واقفیت خاندانی اور نسبی تحقیق میں دیگروں سے بہت زیادہ ہے، ان تمام غلطیوں کی اصلی حقیقت کھل جاتی ہے اور میں نے بھی اسی

تھے ان کا ڈھانچہ ہی بگڑ گیا تھا اور اب از سرِ نو بنیاد اُٹھانے کی ضرورت تھی۔ محمد نے حالاتِ موجودہ پر غور کرنے کے بعد پلرمو کی فتح آسان خیال کی۔ اور فوراً پلرمو کا رُخ کر دیا۔ محمد کی رائے بہت ہی درست نکلی۔ پلرمو نے خود بخود اپنے آپ کو محمد کے قبضے میں دیدیا۔ اور بہت خوشی کے ساتھ اپنے نئے فاتح کی اطاعت قبول کی۔ اس عرصے میں زیادۃ اللہ کے پاس سے احکام بھی آگئے۔ اسنے سوچا کہ جب تک سسلی کی حالت کا کافی تجربہ نہو جائے، آیندہ کے لیئے کسی مکمل اسکیم کا قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہوسکیگا۔ لہذا اُسنے حکم بھیجدیا کہ تا حکمِ ثانی فوج پلرمو ہی میں ٹھیری رہے۔ چنانچہ بموجب اُسکے حکم کے ۱۹ھ تک (دو سال) محمد مع اپنی فوج کے پلرمو ہی میں ٹھیرا رہا۔

دو سال کے تجربے کے بعد معلوم ہوگیا کہ جسقدر کامیابی ہوئی ہے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اگر کوئی بیدار مغز مدبر بھیجا جائے، تو بہت ہی آسانی کے ساتھ سسلی بنی الاغلب کی ایک کالونی بنجائیگا۔ اور ایسی آسانی کے ساتھ حاصل ہونے والے فائدے کو بیوجہ ترک کر دینا دیدہ و دانستہ ایک سخت غلطی سلطنت کی حالت کو بھاری نقصان پھونچانے والی ہوگی۔

ان سب باتوں پر غور کر لینے کے بعد ایک بیڑہ جہازات از سرِ نو مرتب کیا گیا اور ابو الاغلب براہیم بن عبد اللہ بن ابراہیم بن الاغلب اُس عظیم الشان عہدے پر مامور کیا گیا، جو سلطنتِ افریقہ کا سب سے اعلےٰ عہدہ تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ بنی الاغلب کی بُنیادِ سلطنت ایک حد تک اسی پر منحصر تھی یعنی ویسرائے سسلی و امیر البحر بیڑۂ جہازات متعینۂ بحرِ روم۔ آیندہ چلکر ناظرین اندازہ کرینگے کہ جسطرح قاضی اسد کا انتخاب نہایت ہی درست اور موزوں تھا، اسیطرح اسوقت کیلئے یہ انتخاب بھی کسی قدر برمحل تھا۔ اور بے شبہ جو ترقی سسلی کو ابراہیم کے زمانۂ ولایت میں نصیب ہوئی، اسکا فخر زیادۃ اللہ ہی کو ملنا چاہیئے، جس نے ایسے عالی دماغ مدبر، مستقل شخص کا انتخاب کیا۔ ابراہیم کو (جیسا کہ عربوں کے تمدن میں ہر جگہ نظر آتا ہے) پورے پورے اختیارات مُلک کی اصلاحِ حالت کے لیئے دیدیئے گئے اور تمام بندوبست اسی کی رائے پر چھوڑ دیا گیا اور جیسا کہ مان لیا گیا ہے، اُسوقت میں ایسا کرنا ہی نہایت مناسب تھا اور جو کچھ ترقی سسلی کو حاصل ہوئی، ہرگز اسکا آدھا حصّہ بھی اُسکو نصیب نہ ہوتا، اگر زمانۂ حال کا سا پیچیدہ طرزِ حکومت اسکے لیئے مقرر کیا جاتا۔

اب ہم اپنے مضمون کے دلچسپ حصّے میں پھونچتے ہیں اور بعض وجوہات سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بیان کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیں۔ سب سے پہلے ہم فتوحات کی رفتار کو بیان کرینگے۔ افریقہ کی حالت سے ہم کو اسقدر بحث ہوگی، جتنا کہ اسکو سسلی سے تعلق ہے اور حاشیے کے ذریعے سے ہر وقت اور ہر زمانے میں افریقہ کی جو حالت رہی ہوگی، اُسکو دکھلاتے جائینگے۔

ابراہیم کا زمانۂ ولایت فارن پالسی۔ فتوحات۔

ابراہیم کی نسبت مورخ متفق البیان ہیں کہ اس کا سا مدبر سسلی کو بہت ہی کم ملا ہوگا۔ چنانچہ قاضی ابن ابار مصنف کتاب حلۃ السیرا جو مغرب کے حالات سے گہری واقفیت رکھتا ہے، لکھتا ہے

"ضبطها واستقام له امرها طول عمره بها"

گو وہ خود عمر بھر اپنی دار الحکومت پلرمو ہی میں مقیم رہا، جہاں وہ ہر وقت اصلاحِ ملک و ترقی رعایا میں مشغول رہتا مگر اسکی دھاک تمام وسطی یورپ میں بیٹھی ہوئی تھی اور یہہ کہنا نہایت ہی درست ہے کہ یورپ بھر میں اُسوقت اس کا سا مدبر چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی مشکل مل سکتا تھا فوج سے ہر وقت کام لیتے رہنے کا اصول جو ابتدائی فاتحینِ اسلام نے قائم کیا تھا اور جسپر بنی الاغلب کی سلطنت بھی نہایت زور کے ساتھ عمل کر رہی تھی، سسلی میں

بھی ابراہیم کے زیرِ حکومت اُسی تیزی کے ساتھ جاری رہا اور اس اصول کے مطابق ہر وقت مہمیں بھجوائی جاتی تھیں جن کے مقاصد میں جزئی اختلاف کا ہونا ضروری تھا۔ کلیتہً جو رائے ان مہموں کی نسبت دی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ افواجِ افریقہ نے اکثر مقامات پر نہایت امن پسندی کے ساتھ کام لیا۔ اور عموماً وہ اسی اصول پر کاربند رہی مگر بعض مقامات میں خونریزی کی نوبت پہونچی، جس کا الزام زیادہ تر انھی کے خودغرض نالائق حکام پر آتا ہے، جو عمداً اپنی رعایا کو اس خونریزی کے لیے آمادہ بناتے تھے۔ ایسے مواقع میں عرب فاتحین بھی مجبور ہو جاتے تھے کہ وہ ہر طرح کی کوشش ان کے مغلوب کرنے میں صرف کریں۔

ایک قابلِ اعتراض بات جو ہو سکتی ہے وہ بردہ بنانے کے متعلق ہے۔ مگر اسکی حقیقت ایک مورخ کے بیان سے صاف کھل جاتی ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ اُسوقت یورپ میں غلاموں کا رواج بہت ہی کثرت کے ساتھ تھا اور شاید ہی کوئی ایسا شخص اُسوقت نظر آتا ہو، جو اس طریقے کو بُرا خیال کرتا ہو۔ (ملاحظہ ہو کتاب الرق فی الاسلام) جب صلح منعقد ہوتی تھی تو خود یہی لوگ مثل و مال کے غلاموں کو بھی تاوانِ جنگ میں دیدیا کرتے تھے۔ چنانچہ نہایت الارب کا مصنف نویری صاف صاف لکھتا ہے کہ "وہ صلح کا انعقاد اسی پر ہوا کرتا تھا کہ ہم اسقدر مال اور غلام دینگے"۔ اور غلاموں کے دیدینے میں ان کو کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی اور کسی قسم کا افسوسناک خیال اُن کے دل میں نہ پیدا ہوتا تھا۔ بنی الاغلب کی فوجی طاقت کے مقابلے میں باشندگانِ سسلی کی جو حالت تھی، وہ گذشتہ نمبر میں بیان ہو چکی ہے اور اسکا مقابلہ بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس زمانے میں یورپ کی کوئی مہذب طاقت اور وحشی قبائل۔

اس قدر بیان کے بعد ہم ایک نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے اُن مہموں کی جو زمانۂ ولایت ابراہیم میں بھیجی گئیں، حالت معلوم ہو سکتی ہے۔

سنہ	وہ مقام جہاں مہم بھیجی گئی	واقعات جو اس کو پیش آئے	نتیجہ
۲۱۹ھ	جبل لنارا اور وہ مقامات جو اسکے اطراف میں واقع ہیں۔	باشندوں نے مقابلہ کیا اور اسلیئے فاتحین بھی سختی کرنے پر مجبور ہوئے۔	لوٹ مار کے بعد فوج واپس چلی آئی
۲۲۰ھ	پھر اسی علاقہ میں	باشندوں سے خفیف سا مقابلہ کیا	
۲۲۰ھ (اسی سال میں)	قسطلیاسہ	باشندوں نے مقابلہ کیا۔	مسلمانوں کو شکست ملی
۲۲۰ھ (پھر اسی سال میں)	قصر یانہ (سسلی کا دار الحکومت)	مدت تک محاصرہ رہا۔ اتفاق سے ایک شخص کو اندر جانیکا رستہ ملگیا اور سب اندر پہونچ گئے۔	امن کی درخواست کی جسکو منظور کیا گیا اور تاوانِ جنگ لیکر واپس ہوئے۔
۲۲۱ھ و ۲۲۲ھ و ۲۲۳ھ	×	×	رومیوں سے مقابلہ رہا جسکی کیفیت آئندہ آئیگی اور اسکے بعد زیادۃ اللہ کا انتقال ہو گیا لہذا پیشقدمی رکی رہی۔ اور ملک میں انتظامات جاری کیئے گئے

سنہ	مقام	حالات	نتیجہ
سنہ ۲۲۵ھ	مختلف مقامات	ان مقامات کی وجہ سے اب باشندگان سسلی نے سمجھا لیا تھا کہ ہمکو مقابلہ کرنیمیں مطلق فائدہ نہیں ہے۔ لہذا مستامن بننا منظور کر لیا۔	بلوط۔ ابلاطنو۔ قرلون۔ مرو۔ نامی مقامات سب کے سب مستامن بن گئے۔
سنہ ۲۲۸ھ	علاقہ ستینا	یہ حملہ فضل بن جعفر کے زیر کمان ہوا تھا۔	ناپولی کے باشندوں نے مستامن بننا منظور کیا اور فوج اسلام میں شریک ہوگئے۔ دونوں نے ملکر ستینا پر حملہ کیا اور آخر دو سال کے بعد وہ مفتوح ہوا۔
سنہ ۲۲۹ھ	مشرہ	باشندوں نے مقابلہ کیا۔	فتح ہوا۔ دس ہزار مقابلہ کرنیوالے مقتول ہوئے اور اس کے مقابلے میں صرف تین مسلمان مارے گئے۔ گو بظاہر یہ نتیجہ تعجب خیز ہے مگر درحقیقت تعجب کی بات نہیں ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقوام متمدنہ کی قلیل تعداد کے باقاعدہ لشکر نے ہزاروں
			وحشیوں کو فنا کر دیا ہے
سنہ ۲۳۲ھ	لنتینی	محاصرہ کیا گیا۔ یہاں کے باشندوں نے سسلی کے بطریق سے مدد مانگی اور اس نے اپنے پہونچنے کی ایک علامت مقرر کی۔ مسلمانوں کو اسکا علم ہو گیا اور وہ علامت ظاہر کر دی جسکی وجہ سے محاصرین دھوکے میں آگئے۔ اور باہر نکل پڑے۔ یہی ایک واقعہ ہے جس میں دھوکے سے کام لیا گیا۔	شہر سپرد کر دینے کو منظور کیا۔ اس شرط سے کہ جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ شرطیں منظور کی گئیں اور شہر پر قبضہ کر لیا گیا
سنہ ۲۳۲ھ (اسی سال میں)	طارنت (ٹارنٹو)	یہاں کے لوگوں نے مقابلہ نہیں کیا	مسلمان اس میں جا کر بس رہے اور اسکو اپنی ایک نوآبادی قرار دیا۔
سنہ ۲۳۴ھ	رغوس	یہاں کے لوگوں نے خود بخود مصالحت منظور کی۔	شہر پر قبضہ ہو گیا۔ اور کسی قدر عمارات منہدم کر دی گئیں۔

یہ تو بری حالت تھی بحری کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہیں راستے میں افریقیہ سے آتے ہوئے ہی ابراہیم کی ایک بیڑہ جہازات سے مٹ بھیڑ ہوئی جس کے اس نے نہایت آسانی کے ساتھ پرخچے اڑا دیئے۔ اس کے

بعد یہ بیڑہ جہازات بیکار نہیں چھوڑا گیا بلکہ اوپر کے مقامات
جو ساحل پر واقع تھے، اُن کی فتح میں اس سے مدد لی گئی۔
ایک دفعہ جزیرہ قوصرہ پر یہ بیڑہ بھیجا گیا، جہاں سے ایک جہاز
گرفتار کیا اور اسکی ساری فوج قتل کر دی گئی۔
الجزائر پر بھی یہ بیڑہ بھیجا گیا اور وہاں سے بہت سا مال غنیمت
حاصل ہوا، کئی شہر اور قلعے فتح کیے۔
۲۲۵ھ میں۔ ملوریا پر بھی یہی بیڑہ جہازات بھیجا گیا۔ اور سلمانوں
کو فتح حاصل ہوئی۔
جبکہ مسلمانوں کی فوجیں ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل کر رہی
تھیں، تو سلطنتِ مشرقیہ بھی آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئی اور
اُسنے چند مرتبہ بیڑہ جہازات مرتب کرکے سسلی پر بھیجا، مگر ہر دفعہ
شکست قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔ آخری دفعہ ۲۲۸ھ میں بڑے
طمطراق کے ساتھ ایک بیڑہ اور بھیجا گیا جسکو مسلمانوں نے
نہایت آسانی کے ساتھ تتر بتر کر دیا۔ چند جہاز جو بچ رہے
وہ قسطنطنیہ میں بحالِ تباہ واپس آئے۔ اور وہ زبانِ حال
سے اُس سخت شکست کو یاد دلا رہے تھے، جو ان کی
جہازوں کو نصیب ہوئی تھی۔ اس فتح کی نسبت اپنی تاریخ
میں ابن اثیر لکھتا ہے "کان فتحاً عظیماً"۔ اسکے بعد پھر
سلطنتِ مشرقیہ نے کوئی بیڑہ نہیں بھیجا اور اپنے بینظیر
صبر وتحمل سے کام لیکر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی اور اس طرح
سسلی سلطنتِ مشرقی کی ذلت انگیز غلامی سے مسلمانوں
کی بدولت ہمیشہ کے لیے نجات پا گیا۔
ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ زیادۃ اللہ کے مرنے کے بعد
چند دنوں تک آیندہ حالت کے متعلق بے اطمینانی رہی
مگر جیسا کہ حاشیہ ذیل کے پڑھنے سے معلوم ہوگا زیادۃ اللہ
کے جانشینوں نے اسکے نظم ونسق کو بحال ہی نہیں رکھا
بلکہ اس میں ترقی دی۔ اسلیئے سسلی کی حالت پر زیادۃ اللہ کی
مرنے کا اثر ذرا بھی محسوس ہوا۔ اغلب نے ابراہیم کو اس کے
عہدے پر بحال رکھا اور اسیطرح اغلب کے مرنے کے
بعد اُس کے بیٹے محمد بن الاغلب نے آخر کار تین والیوں کا
زمانہ دیکھنے کے بعد ۲۳۶ھ میں۔ سترہ سال کی مستقل حکومت
کے بعد ابراہیم پلرمو کی اُس زمین میں ہمیشہ کے لیئے سو گیا
جسکی فلاح وبہبودی کے لیئے اُسنے اپنی عمر کے سب سے زیادہ
بیش قیمت اور آخری سال صرف کر دیئے تھے اور جسکو وہ
اپنی زندگی کا اہم مقصد سمجھتا رہا اور جسکا سا بیدار مغز مدبر
پلرمو کی زمین کو نہ اُس سے پہلے نصیب ہوا اور نہ اسکے
بعد۔ (محمد مرتضیٰ)

۲۲۸ھ میں جبکہ سسلی میں دن بدن نئی فتوحات ہو رہی تھیں
اور زیادۃ اللہ اپنی پالیسی کے ثمرے سے ایک حد تک متمتع نظر
آرہا تھا، موت کے زبردست اور نہ رکنے والے ہاتھ نے
۵۱ سال کی عمر اور ۱۲ سال کی سلطنت کے بعد ہمیشہ کے لیئے
اسکی پرجوش زندگی کے چراغ کو گل کر دیا۔ ہم اوپر بیان کر آئے
ہیں کہ یہ زمانہ اسلامی تمدن کے شباب کا زمانہ تھا، جس طرح
اندلس میں دن بدن تمدن کے نئے نئے جلوے نظر آتے تھے
اور لائق اخلاف اپنے اسلاف سے ایک قدم آگے ہی بڑھ
رہے تھے اور جسطرح بغداد میں مامون کے مرنے کے بعد
معتصم کا زمانہ بھی کچھ برا نہ تھا، اسیطرح افریقہ میں بھی زیادۃ اللہ
کے مرنے سے چنداں نقصان نہیں پہونچا۔ اس کا جانشین گو
عالی دماغی اور بیدار مغزی میں زیادۃ اللہ کے ہم رتبہ نہ تھا
مگر انصاف۔ سچائی اور رحم میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ زیادۃ اللہ
سے بڑھا ہوا تھا۔ اور اسکو زمانے میں بھی افریقہ کی رفتارِ ترقی
اسیطرح تیزی کیساتھ جاری رہی۔ یہ جانشین اسکا بھائی
ابو عقال اغلب بن ابراہیم بن الاغلب تھا۔ اسکے کارنامے
مختصر طور پر اسطرح بیان کیے جا سکتے ہیں کہ اُسنے فوج کے
بارے میں خاص توجہ مبذول کی۔ تحقیقات سے معلوم ہو گیا
کہ زیادۃ اللہ کے مرتب کردہ قوانین میں فوج پر سختی سے کام
لیا گیا ہے، جو اسکی رحمدل طبیعت کے خلاف تھا، اسلیئے
فوراً اُسنے قانونِ افواج میں ایسی ترمیمات کیں، جو اُسکی
رحمدلی کے مناسب تھیں۔ سختی اُسوقت مناسب تھی
جبکہ اُن کا سب سے اعلےٰ ہاتھ بھی سخت ہوا اور جب وہ نرم تھا

تجارت کی تاریخ

تجارت کا فن نہایت قدیم زمانے سے ہو اور کسیکو معلوم نہیں ہو کہ اُسکی ابتدا کس وقت سے ہوئی - بائبل سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں تجارت فروغ پر تھی حضرت یعقوب کے بیٹے بھی تجارت کرتے تھے حضرت یوسف جس قوم کے ہاتھ بیچے گئے، وہ مدیانیوں کی قوم تھی - اس قوم کے لوگ خوشبودار اور قیمتی چیزیں تجارت کی غرض سے مصر کو لیجاتے تھے اور وہاں غلے اور مصر کے بنے ہوئے کپڑوں سے اُن چیزوں کا تبادلہ کرتے تھے - مصر چالیس صدیوں سے تجارت کا مرکز تھا مگر اسکی بیرونی تجارت اجنبی لوگوں کے ہاتھ میں تھی - حضرت یوسف اور اُن کے بھائیوں کے قصے سے معلوم ہوتا ہو کہ مصر ایسا ملک تھا جس میں دُنیا کے دیگر ممالک سے قسم قسم کی تجارتی چیزیں آیا کرتی تھیں -

باوجود اسکے کہ تجارت کچھ نہ کچھ ہر قوم میں موجود تھی، تاہم بعض قومیں ایسی تھیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ اُس میں شہرت اور ناموری حاصل کی تھی - سب سے قدیم قوم جو تجارت پیشہ تھی، وہ فینیشیا والوں کی قوم تھی، جنکی تجارت مغرب اور مشرق میں جاری تھی - اُن کا ملک قدرتی طور پر تجارت کے لیئے نہایت موزوں تھا کیونکہ وہ اُن تمام قبائل کے ساتھ جو بحر روم کے کناروں پر، یا اُس کے جزیروں میں یا اُن بحیروں میں آباد تھیں، جو بحر روم سے پھوٹ نکلے تھے باسانی تجارت کر سکتے تھے - یہ دلیر قوم ہرکیولیز کے ستونوں تک پہونچگئی تھی - بائبل کی کتاب پیدائیش اور ہومر کی کتاب میں اُنکا ذکر موجود ہی - اُن کی نوآبادیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں - قادس جسکو زمانہ حال کے جغرافیہ نویس کیڈز لکھتے ہیں اُن کی تجارت کا مشہور بندرگاہ تھا - یہ بندرگاہ تجارت کے لیئے اسقدر موزوں ہو کہ اُسکی شہرت اِس باب میں آج تک قائم ہی حالانکہ اُسکو قائم ہوئے تین ہزار برس کا عرصہ ہوا - اُن کی تجارت مختلف قسم کی تھی اور اُسکا دائرہ ایسا وسیع تھا کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اُن کے تجارتی جہاز ایک طرف ہندوستان سے مشرقی افریقہ تک اور دوسری طرف شمالی افریقہ سے مغربی یورپ تک آمدورفت کرتے تھے - صور جو اہل فینیشیا کا مشہور شہر تھا اُس زمانے میں دُنیا کی تجارت

تو بیحرمتی کسی طرح مناسب تھی - اسنے اپنے احسانات کے اثر سے فوج کے دل کو گرویدہ بنالیا صیغۂ عدالت میں بھی اصلاح کیگئی - مختلف بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کا، جو ظلم کی حد تک پہونچی تھیں انسداد کر دیا گیا - ایک اور ترقی یہ کیگئی کہ عہدہ داروں اور ملازموں کی تنخواہ بڑھا دی گئی - اسنے سمجھ لیا تھا کہ کمی تنخواہ بہت کچھ نقصان پیدا کرتی ہی - چنانچہ اُسکے دفعیہ کے لیئے تنخواہوں میں معتدبہ اضافہ کر دیا گیا، جس سے رشوت اور طمع و ظلم کی بہت کچھ روک تھام ہوگئی - اغلب کی یہ تجویز اسکی عالی دماغی کو ثابت کر رہی ہی اور اس سے معلوم ہوتا ہی کہ انصاف - سچائی اور تجربے نے ملکر کہاں تک اسکے دماغ میں حقیقت کی روشنی پیدا کر دی تھی - دفع فسادات اور قیام امن کی غرض سے شراب و نبیذ کی تجارت قیروان میں موقوف کر دیگئی، جسکے لیئے موجودہ زمانے میں ٹمپرنس سوسائٹیاں بہت کچھ زور لگا رہی ہیں -

افسوس ہی کہ تین ہی سال کے عرصے تک افریقہ اسکی عمدہ اور پاکیزہ حکومت سے مستفید ہونے پایا تھا کہ اُسنے سنہ ۲۲۶ھ میں وفات پائی اور موت نے اُسکو اور زیادہ مہلت نہ دی - اغلب کا جانشین اسکا بیٹا محمد بن الاغلب ہوا - اور چونکہ ابھی ترقی کا زمانہ تھا، لہذا محمد بن الاغلب بھی اپنے باپ کا سچا جانشین کہلانے کا مستحق ہی - اسکے زمانہ میں بھی افریقہ میں بالکل امن و امان رہا -

ابن وادران اسکی نسبت لکھتا ہی "وکان فاضلاً ذکیاً عاقلاً فطناً یباشر الامور بنفسه"، سڑکوں اور رستوں کا انتظام بہت ہی درستی کے ساتھ کیا گیا چنانچہ یہی مؤرخ لکھتا ہی - "وامنت السُبُلُ فی ایامه" - ۱۲

کا مرکز تھا اور سمندر کی ملکہ کہلاتا تھا۔ کارتھج کے باشندے بھی فینیشیا والوں کی نسل سے ہیں۔ اُن کی تجارت بھی دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب صور کی ناموری اور شہرت کو تنزل ہوا، تو کارتھج والوں نے اپنی تجارت کا جھنڈا بلند کیا۔ وہ اوّل بربری قوموں کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ پھر اٹلی اور یونان میں غلاموں کی سوداگری کرنے لگے۔ جنوب میں اُن کے قافلے وسط افریقہ تک پہونچتے تھے۔ شمال میں اُن کے جہاز بحیرۂ جرمن میں جزیرہ سسلی تک اور بعض دفعہ سیلنڈی نیویا یعنی سویڈن اور ناروے تک جاتے تھے۔ فینیشیا کے باشندے اور کارتھج کے باشندے دونوں تجارت میں سربرآوردہ قومیں ہیں، جن کا ذکر تاریخ میں کیا جاتا ہے۔ دونوں قوموں کے باشندے اُن ملکوں اور شہروں کے نام جہاں وہ تجارت کی غرض سے جاتے تھے، اور قوموں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر اجنبی ملکوں کے باشندے اُن کے ملک میں آتے، تو وہ اُن کو قتل کر دیتے تھے، تاکہ وہ اُن کی تجارت کے منافع میں شریک ہو سکیں۔ شاید یہ بات مبالغے کی ہو اور ہم تک جو روایت اس باب میں پہونچی ہے وہ بالکل یکطرفہ ہے اور اعتماد کے قابل نہیں ہے۔

اہل فینیشیا اور اہل کارتھج کے بعد یونانیوں نے تجارت میں نام پیدا کیا۔ اُنھوں نے یہ نکتہ خوب سمجھ لیا تھا کہ جہازرانی، دولتمندی اور تونگری کا سرچشمہ ہے۔ اُنکی بہت سی نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ نیوم سیلیا کا بندرگاہ جو یونانیوں کی تجارت کا عظیم الشان مرکز تھا، چھٹی صدی قبل مسیح میں قائم ہو گیا تھا۔ اور وہ کئی صدیوں تک اس باب میں مشہور رہا۔ بحر اسود کے کناروں پر اُنھوں نے بہت سے شہر آباد کیے، جو تجارت کے مرکز تھے اور جن سے یونانیوں کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ جب یونانیوں کی تجارت کا دائرہ وسیع ہوا تو اہل فینیشیا سمٹنے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ اُسوقت آتھنز (دار الخلافہ یونان) جسطرح علوم و فنون میں مشہور تھا، اُسی طرح اُسنے تجارت کی ترقی میں نام پیدا کیا تھا۔ یہاں کے سوداگر باہر سے جو چیزیں فروخت کے لیے لاتے تھے، وہ حسب ذیل تھیں۔ لکڑی۔ شراب۔ چمڑا۔ اُون جہاز کا سامان۔ لوہا۔ تانبا۔ روغن۔ شہد۔ مچھلی۔ نمک موم وغیرہ۔ اِن کے سوا جسقدر غلہ یونان میں خرچ ہوتا تھا اُسکا نصف حصہ باہر سے آتا تھا۔ جزیرۂ برطانیہ سے خشکی کی راہ وسط فرانس اور مارسیلز سے گذر کر ٹین آتا تھا۔ تجارتی مال کی درآمد و برآمد یونان میں مساوی تھی۔ اور اُسمیں طرح طرح کی صنعت کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ زینوفن نے لکھا ہے کہ سسلی۔ اٹلی۔ لیڈیا سواحل بحیرۂ اسود اور قبرس کی نفیس اور نادر چیزیں آتھنز کے بازاروں میں آتی تھیں اور اُن کے بدلے میں یونانیو کی اعلیٰ دستکاری کی چیزیں اُن ملکوں کو جاتی تھیں۔ آتھنز کی تجارت بھی اُس زمانے میں جبکہ وہاں فلسفہ شاعری۔ تاریخ۔ فصاحت اور فنون لطیفہ اوج کمال پر پہونچ گئے تھے، نہایت اعلیٰ درجے پر تھی۔

اسی زمانے میں ایشیا کوچک میں ایک اور قوم تھی جو فوقیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ قوم بھی جہازرانی اور سوداگری میں کامل مہارت رکھتی تھی۔ اُن کے تجارتی جہاز طرسوس تک پہونچے تھے۔ مسیلیا کا بندرگاہ بھی اسی قوم نے قائم کیا تھا۔ کارنتھیا یونان قدیم کا سب سے اعلیٰ مرکز تجارت تھا۔ ولادت مسیح سے ایکہزار سال پہلے اِس ملک کی تجارت کمال کو پہونچ گئی تھی اِسی لیے ہومر نے اپنے اشعار میں کارنتھیا کے باشندو کو دولتمند اور صاحب ثروت قرار دیا ہے۔ یونانی اتحاد جس سے سیلیتوس اور افسس اور دیگر اضلاع یونان کا مجموعہ مراد ہے، تجارت میں خصوصیت کے ساتھ مشہور تھا۔ بیزنطیوم تو تجارت کے لیے ایسا موزوں ا

مناسب بندرگاہ تھا جو اس باب میں آج تک اپنی شہرت قائم رکھتا ہے۔ خشکی کی تجارت بھی جو بحر اسود کے سواحل کو شمالی یورپ سے ملاتی تھی، نہایت ترقی پر تھی۔ شمالی یورپ سے یونانیوں کی اِن دُور کی نوآبادیوں میں جو مال تجارت آتا تھا اُن میں عنبر بھی شامل تھا۔ بتھیاس نے جو سسلیا کا نامور عالم تھا، ولادتِ مسیح سے چار سو برس پہلے دو لمبے سفر کیے تھے اور وہ آئیلنڈ اور وسچولا تک پہونچ گیا تھا۔ جزیرہ رودس جو یونانیوں کے انتہائی اضلاع میں سے تھا، اُن یونانی اضلاع میں شمار کیا جاتا تھا جنکی تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ یونان کی بحری قوت بھی اُس زمانے میں بہت زبردست تھی اور بحری معاملات میں اُسکا حکم ناطق خیال کیا جاتا تھا۔

اتروریوں کی قوم کی تجارت اُن ملکوں میں محدود تھی جو کوہِ الپس کے پار واقع ہیں۔ تجارت کا سب سے قدیم معاہدہ جو ہم تک پہونچا ہے، وہ اتروریوں اور کارتھیج والوں کا معاہدہ ہے۔ کارتھیج اور روما کے درمیان ۵۰۹ سنہ قبلِ مسیح میں ایک تجارتی عہدنامہ قرار پایا تھا۔ اُن معاہدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کارتھیج والے رومیوں سے تمدن اور شائستگی کی تمام باتوں میں بالاتر تھے۔ رومیوں کی قوم کوئی تجارتی قوم نہیں تھی مگر اُن کے حوصلے ضرور بلند تھے۔ اُن کی ذہانت بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ اُن میں عملی کاموں کی قابلیت بہت زیادہ تھی۔ اسلیئے تجارتی معاملات میں اُن کو کامیابی ہوئی۔ مگر افسوس ہے کہ بہ نسبت محنت اور جانفشانی کے فریب دہی اور لوٹ مار کو وہ زیادہ پسند کرتے تھے۔ اسی سبب سے بحرِ روم جسکے سواحل پر اُن کی حکومت کا پھریرا لہراتا تھا، بحری قزاقوں کا مسکن ہوگیا۔ باوجود اِسکے رومن امپایر کے عہدِ حکومت میں تجارت کا دائرہ بہت فراخ تھا۔ اور اُس زمانے میں بحرِ روم کی سطح بارہ مہینے اُن جہازوں سے ڈھکی رہتی تھی جو قادس سے اسکندریہ تک آمد و رفت رکھتے تھے۔ سمندر میں بہ نسبت جمہوری حکومت کے زمانے کے بہت زیادہ امن و امان تھا۔ روما جو اِس عظیم الشان سلطنت کا دار الحکومت تھا، اُسمیں ہر قسم کا تجارتی اسباب آتا تھا۔ رومیوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری قوم اور حکومت کی بُنیاد محض غلّے کی تجارت پر ہے۔ یہ تجارت ممالک افریقہ۔ سسلی۔ سارڈینیا۔ فرانس اور اسپین سے اسکندریہ تک جاری تھی۔ اسکندریہ کی بُنیاد مقدونیہ کے فاتح سکندرِ اعظم نے ۳۳۲ سنہ قبلِ مسیح میں ڈالی تھی۔ اسکا ارادہ اس شہر کے آباد کرنے سے یہ تھا کہ اسکو دُنیا میں تجارت کا اوّل درجے کا شہر بنائے۔ اسی خیال سے اُس نے روما کو بھرے ہوئے غلّے کے جہاز بھیجے تھے اور اُسی کے عہدِ حکومت میں یہ شہر ایسا عالیشان بندرگاہ بنگیا تھا جہاں سے خوشبودار چیزیں۔ گوند۔ ریشمی کپڑے۔ موتی اور جواہرات اور مشرق کی دستکاری کی چیزیں مغرب کے ملکوں میں جاکر پھیلتی تھیں۔

ایشیا کی تجارت عموماً خشکی پر ہوتی تھی۔ مگر تاریخ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بحرِ قلزم کی بندرگاہوں میں تجارت کا تعلق بہت قدیم زمانے سے قائم تھا۔ خاندانِ بطالسہ کے زمانے میں جس کے سلاطین تدبیر و سیاست میں مشہور ہیں، مصر کا ملک مشرق اور مغرب کے درمیان مال و اسباب کے تبادلے کے لیئے واسطہ اور وسیلہ ہوگیا تھا۔ رومیوں نے اس رستے کو جاری رکھا۔ اسکندریہ جس غرض سے آباد ہوا تھا اُس نے وہ غرض پوری کی اور جب عرب کے باشندوں نے مصر کو فتح کیا تو اُس زمانے کے بعد بھی اُسنے اپنی تجارتی ناموری کو برقرار رکھا۔ ہندوستان کے ساتھ غیر ملکوں کی

تجارت بہت قدیم زمانے سے جاری رہی ہی اور بہت سی قوموں نے اُس کی تجارت سے دولتمندی اور تونگری حاصل کی ہی۔ سب سے زیادہ مشہور تجارتی مقام تدمر تھا جہاں فنیشیا کے باشندے تجارت کا مال لیکر آتے تھے۔ موّرخوں نے خیال کیا ہی کہ تدمر تجارت کے اُس سلسلے کی ایک کڑی تھا، جو صور اور بابل کو ملاتا تھا۔ بابل مدّتِ دراز تک تمام مغربی ایشیا کے لیئے مرکزِ تجارت رہا ہی۔ وہاں تمام دُنیا کی قومیں تجارت کی غرض سے آتی تھیں۔ مگر جب اہلِ فارس نے اسکو فتح کرلیا، تو وہ بالکل ویران اور برباد ہوگیا۔ سکندر نے چاہا تھا کہ اُسکو اپنی سلطنت کا دارالحکومت قرار دے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو عین جوانی کے دنوں میں اُسکو پیامِ اجل آپہونچا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو بابل کی تجارتی عظمت ضرور دُنیا میں تسلیم کی جاتی۔ کیونکہ سکندر کی برابر کسی بادشاہ کے خیالات تجارت کے باب میں وسیع نہ تھے۔ تدمر کو حضرت سلیمانؑ نے آباد کیا تھا۔ اُن کا ارادہ بھی یہی تھا کہ تجارت کو فروغ دیں۔ جب رومیوں نے کوہ طورس کے مشرق میں اپنی حکومت کا علم بلند کیا تو یہ شہر بہت دولتمند اور آسودہ حال تھا۔ اور لیانوس قیصر کے زمانے تک اسی اوج موج پر رہا۔ یہ شہر اس خیال سے مہتم بالشان سمجھا جاتا تھا کہ تجارت کے لحاظ سے بخطِ مستقیم وہ مشرق اور مغرب کے درمیان واقع تھا۔ سمرقند بھی اُن مقامات میں سے ہی جو اس لحاظ سے نہایت موزوں موقع پر تھا اور ہندوستان کی تجارت سے مالامال ہوگیا تھا۔ باختر کی بھی یہی حالت تھی۔ موّرخوں نے لکھا ہی کہ یہ دونوں شہر مشرقی ایشیا کی تجارت کے مرکز تھے۔ ہندوستان کے ساتھ اُن کی تجارت نہایت کامیابی کے ساتھ جاری تھی۔ بیرونی اور اندرونی تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ یہاں کے باشندے اس تجارت سے بے انتہا فائدہ اُٹھاتے تھے اور ہندوستان کے مال پر اکثر بہت دام لگائے جاتے تھے۔ چینی بھی ہندوستان اور دیگر دُور دراز شہروں سے تجارت کرتے تھے۔ مشرق کے تمام ملک محنتی۔ جفاکش۔ ذہین اور دستکار قوموں سے بھرے ہوئے تھے اُن کی محنت اور ذہانت سے بہت سی چیزیں تجارت کی تیار ہوتی تھیں۔ اسکندریہ پہلا شہر تھا جہاں مشرق کی تمام تجارتی چیزیں خرید کی جاتی تھیں۔ اور مغرب میں برطانیہ اور سکنڈی نیویا یعنی سویڈن اور ناروے تک جاکر فروخت ہوتی تھیں۔ غیر ملکوں کی تجارتی اشیا کی قیمت سونے اور چاندی میں ادا کی جاتی تھی جسکی مقدار پلینیوس قیصر کے عہدِ حکومت میں چار لین پونڈ تک پہونچگئی تھی۔ کاغذ ہمیشہ اور ملکوں میں مصر سے جاتا تھا۔ رومن ایمپائر کی تجارت اسلیئے محدود تھی کہ اُسکے ملکوں میں جو قدرتی اور مصنوعی اشیا پیدا ہوتی تھیں، وہ ایک ہی قسم کی ہوتی تھیں اور اُن میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ مثلاً جو شراب مختلف شہروں میں تیار کی جاتی تھی، اُسکی نوعیت میں کوئی ایسا بڑا فرق نہیں تھا جس کی بنا پر وہ تجارت کے لیئے استعمال میں آتی۔ مگر باوجود اسکے یونان اور ایشیا کی شراب روما کے امیروں کے کام میں آتی تھی۔ آجکل جو اشیا آمدنی کی سمجھی جاتی ہیں اور جو زمانۂ حال کی تجارت میں نہایت اہم خیال کی جاتی ہیں مثلاً شکر۔ قہوہ۔ چاء اور تمباکو وغیرہ، اُن کا رومیوں کو علم ہی نہیں تھا۔ اسیطرح مختلف قسم کے کپڑے جو ہمارے زمانے میں عام طور پر تجارت کے بازاروں میں آتے ہیں، اُس زمانے میں بالکل نامعلوم تھے اس زمانے کی بہت بڑی تجارت جنگلی جانوروں کی تھی جو ہزار ہا کشتیوں میں لاد کر لائے جاتے تھے تاکہ اُن سے تماشا گاہوں کی رونق ہو۔ ہزاروں

ملاح اُن کشتیوں کے لانے اور لیجانے کے لیئے تیار رہتے تھے۔ زمانۂ حال میں اس تجارت کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ اُس وقت سینکڑوں شہروں میں جانوروں کی تماشا گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ تنہا روما کی تماشا گاہوں سے بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ یہ جانور افریقہ سے لائے جاتے تھے۔ یونان اور ایشیا سے سنگ مرمر باہر جاتا تھا۔ ہزاروں کشتیاں یونان اور مشرق کی تصویروں۔ مورتوں۔ ستونوں۔ محرابوں اور نادر صنعت کی چیزوں سے لدی ہوئی اٹلی کو روانہ ہوتی تھیں۔ غلاموں کی تجارت بھی نہایت زور شور سے ہوتی تھی۔ غلاموں میں ہر ملک اور ہر قوم کے آدمی شامل ہوتے تھے اور اُن میں کوئی فرق رنگ یا نسل کا نہیں کیا جاتا تھا۔ افریقہ کے غلاموں کی تجارت البتہ خاص رونق پر تھی، جو بہت قدیم زمانے سے جاری تھی۔ ایک غلام کی قیمت (۲۰) سینٹ ہوتی تھی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہوری حکومت کی آخری دور میں یہ خوفناک تجارت کسقدر ترقی پکڑ گئی تھی۔

رومن امپائر کے زوال سے تجارت کو بہت نقصان نہیں پہونچا۔ حالانکہ جن مختلف اسباب سے اس سلطنت کو زوال ہوا تھا اُن کی بہت بڑی تاثیر خیال کی جاتی ہے۔ تجارت کی اب بھی وہی گرم بازاری تھی اور قسطنطنیہ بہت بڑی منڈی اجناس تجارت کی سمجھی جاتی تھی۔ عرب کی فتوحات نے تجارت پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اُن کی تجارت خشکی میں ہندوستان سے یورپ تک جاری ہوگئی۔ پھر ملک چین۔ تاتار اور روس سے وسط افریقہ تک پہونچ گئی۔ اگرچہ عرب کے باشندے اعلیٰ درجے کے جہازران نہیں تھے مگر تاہم وہ جزیرۂ مڈغاسکر میں جاکر آباد ہوئے اور جزائر کنارے دیقالدات تک پہونچ گئے تھے۔

اٹلی کی جمہوری حکومتوں نے رومن امپائر کا جوا کندھے سے ڈالکر تجارت کی دُنیا میں قدم رکھا اور اُسمیں نمایاں ترقی کی۔ وینس۔ جینوا۔ فلورنس اور پائیسا تجارتی کامیابی میں اوّل درجے پر تھے۔ ہندوستان کی تجارت اٹلی والوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ سمندر، یا خشکی کے رستے سے مصر، یا بحرِ قلزم سے عبور کرکے تجارتی اسباب بحرِ اسود کے کناروں تک لے جاتے تھے۔

پندرھویں صدی کے آخر میں وینس والوں کی تجارت تمام دُنیا میں پھیل گئی تھی۔ اور اُنھیں کے سکّے انگلینڈ تک جاری تھے۔ اُن کے جہاز باقاعدہ طور سے مصر سیریا۔ سواحلِ بحرِ اسود اور شمالی یورپ تک جاتے تھے۔ اور رستے میں مختلف اوقات پر مختلف بندرگاہوں سے گذرتے تھے۔ اُن کے جہازات کا آخری بیڑہ فلنڈرہ کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اُسکی آخری منزل انٹورپ کا بندرگاہ تھا، جو ملک فلنڈرس یعنی بلجیم کا ایک شہر ہے۔ یہ بیڑہ اسپین۔ فرانس اور انگلستان کی بندرگاہوں میں قیام کرتا تھا منجملہ ان بندرگاہوں کے ایک لندن بھی تھا۔ باوجود اسکے کہ فلورنس کی ریاست وسعت میں وینس کی برابر نہ تھی، نہ اُس کے پاس بہت سے جہاز تھے پھر بھی اسکے شہر عظیم الشّان تجارت کے مرکز تھے۔ فلورنس کا سوداگر، یا صراف ہر شہر میں پایا جاتا تھا۔ فرانس کی تجارت اُنھیں کے ہاتھ میں تھی۔ سولہویں صدی میں فلورنسیوں نے اپنی عظمت اور قوت کا سکہ جو فرانس میں بٹھایا تھا، اسکا سبب یہ تھا کہ اُن کی تاجرانہ قابلیت اور لیاقت نے اس ملک کے باشندوں کو پہلے سے مسخر کرلیا تھا۔ پانسو برس سے زیادہ عرصے تک فلورنس کی ریاست کی آمدنی تین ملین پونڈ تھی حالانکہ اسکی باشندوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ اس ریاست کے دو بنکوں نے انگلستان کی حکومت کو زرِ خطیر بطور قرض کے دیا تھا جینوا اور وینس کی ریاستوں میں کئی صدیوں تک جو

بحری لڑائیاں برپا رہیں، اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہی کہ دونوں کی تجارت کسقدر وسیع تھی اور دونوں کی آمدنی کسقدر زیادہ تھی۔ جنیوا اور وینس کے بنیک موجودہ تمدن اور شایستگی کی تاریخ میں بمنزلہ حدود کے ہیں، جہاں سے یورپ کی ترقی کی رفتار شروع ہوئی۔

کیٹلونیا کے باشندے بھی جہازرانی اور سمندری سفر میں مشہور ہیں۔ وہ تجارت کی دُنیا میں سربرآوردہ اور ممتاز تھے۔ اُن کا بڑا شہر بارسیلونا تھا، جو اپنی شہرت کے لحاظ سے اٹلی کے بڑے بڑے شہروں سے ٹکر کھاتا تھا۔ بارسیلونا کا بنیک ۱۴۰۱ء میں قائم ہوا اور اُسکا بحری قانون تمام موجودہ بحری قوانین سے (۱۵۰) برس پہلے وضع کیا گیا۔ اور اُس زمانے کے تمام یورپین قوانین تمدّنی کی بُنیاد اسی پر ڈالی گئی۔ اُن کی کوٹھیاں اور اُن کے اجنٹ دُنیائے تجارت کے ہر حصّے میں موجود تھے۔ اُن کے تجارتی معاملات اُس وسیع ملک کے تمام حصّوں میں جاری تھے، جو انگلستان اور مشرقی ملکوں کے درمیان واقع ہیں۔ یورپ کے مہذب ملکوں میں اٹلی والوں کے بعد ندرلنڈ والے تجارت میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اُن کی حکومت تجارتی کامیابی اور ترقی کا نتیجہ تھی۔ تجارت کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی عجیب بات نہیں ہی کہ ندرلنڈ والے اوّل تجارت کے ذریعے سے دولتمند ہوئے۔ پھر اُنھوں نے حکومت حاصل کرلی۔ ہالنڈ والے اسپین کی حکومت سے آزاد ہوکر جب تجارت میں مشغول ہوئے تو اُن کی تجارت کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا۔ اُنھوں نے دولت اور ثروت میں جو عظیم الشان ترقی حاصل کی، اُس کی ابتدا تیرہویں صدی میں ہوئی۔ اُن کا اور ندرلنڈ والوں کا اس سے پیشتر کہ اُنھوں نے قومیت کے سلسلے پر اپنی توجہ مبذول کی، ایک ہی تجارت پیشہ گروہ تھا۔ جرمن قوم کی تجارت بھی وسطی صدیوں میں نہایت مہتم بالشان تھی حالانکہ طامع اور خودغرض اُمرا اُن کی کامیابی پر سدِّراہ ہوتے رہے۔ اگرچہ فرانسیسی جہازراں اور سوداگر اہلِ پرتگال سے پہلے مغربی افریقہ کے کناروں پر پہونچ گئے تھے۔ مگر اس قوم کو ابتدا میں تجارت میں اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

پرتگیزوں کی بحری ترقیوں کی ابتدا ۱۴۱۲ء میں ڈون ہنری پنجم کے عہدِ حکومت میں ہوئی، جو ایک عاقل اور مدبّر فرمانروا تھا اور جس نے (۴۵) سال تک حکومت کی۔ اسنے نئے نئے ملکوں کے تلاش کرانے میں نہایت کوشش کی مگر وہ اُسوقت سے پہلے ہی انتقال کرگیا تھا، جبکہ پرتگیزوں کے جہاز افریقہ کے گرد پھر کر واپس آئے اور جبکہ اُن کی حکومت مشرق میں پھیل گئی۔ حالانکہ یہ اُسی کی محنت اور جفاکشی کا نتیجہ تھا۔ نئے نئے ملکوں کے دریافت ہونے سے اٹلی والوں کی حکومت کا زور ٹوٹ گیا۔ اور تجارت کا طریقہ بالکل بدل گیا۔ امریکا کے دریافت ہونے سے تجارت میں اور بھی انقلاب ہوا۔ اب اسپین والے ایک ممتاز تجارت پیشہ قوم بنگئے مگر اُن کی بے اعتدالیوں اور بدانتظامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہالنڈ اور پرتگال دونوں اُن کی حکومت کے بوجھ سے سبکدوش ہوگئے۔ اسی اثنا میں ہالنڈ کے باشندے تجارت کے پیشوا ہوگئے۔

انگریزوں کو جزیرے کی سکونت نے جہازرانی کے پیشے پر خودبخود مائل کیا اور اس ذریعے سے اُن کی تجارت کا سلسلہ غیر ملکوں سے جاری ہوگیا اور لندن تجارت کا بہت بڑا مرکز ہوگیا۔ انگریزوں کی صلح وجنگ کی تاریخ پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی قوم ایک تجارت پیشہ قوم ہی۔ جب سترہویں صدی عیسوی میں اُن کی پولیٹکل

قوت کو عروج ہوا تو بحرِ ظلمات میں انھیں کی تجارت او عظمت کا پرچم لہرانے لگا۔ انگلستان کی اندرونی صنعت وحرفت نے تجارت کے لیئے جو ذخیرہ مہیا کیا، اُسکی نظیر روے زمین پر کسی ملک میں نہیں پائی گئی۔ یہی صنعت وحرفت ہی، جس نے انگریزوں کی عظمت کا سکہ فتوحات سے بھی زیادہ لوگوں کے دلو نپر بٹھا دیا ہی۔ دُنیا میں اُن کی تجارت کی برابر کسی قوم کی تجارت نہیں ہی۔ اضلاعِ متحدۂ امریکا نے انگلستان کے قدم بقدم چلنا شروع کیا اور اُن کی تجارت بھی رفتہ رفتہ نہایت سرسبز وشاداب ہوگئی۔ بھاپ کی قوت سے تجارتی اسباب کی نقل وتحویل میں کام لینا۔ جہازوں کی ساخت میں اصلاح اور ترقی کرنا کیلیے فورنیا کی طلائی کانوں کا برآمد ہونا اور تمام شہروں کے مختلف الجنس باشندوں کو تجارت کی آزادی دینا یہی وہ اسباب ہیں، جن سے اضلاعِ متحدۂ امریکا کی بیرونی اور اندرونی تجارت کو ایسی ترقی ہو رہی ہی جسکا سان گمان بھی وہاں کے قدیم باشندوں کو نہ تھا۔ جب یہ مسلم ہی کہ جو قوم سمندر کی مالک ہی وہ دُنیا کی تجارت کی مالک ہی اور جو قوم دُنیا کی تجارت کی مالک ہی وہ دُنیا کی دولت وثروت کی مالک ہی تو اس میں کچھ بھی تعجب نہیں ہی کہ انگلستان۔ امریکا اور فرانس کو تجارت میں ترتیب وار عظمت کا جو درجہ حاصل ہی، وہ ترتیب وار اُن کی بحری قوت کے لحاظ سے ہی۔ روس چاہتا ہی کہ بحرِ ظلمات میں تجارت کا جھنڈا بلند کرے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہی کیونکہ اُسکی بحری قوت کمزور ہی جرمن کی تجارت میں ۱۸۱۵ء سے ترقی کا آغاز ہوا ہی۔ اسپین نے بھی پھر تنزل کی حالت سے کچھ کچھ اُبھرنا شروع کیا ہی مگر اُمید نہیں ہی کہ آیندہ کبھی اُسکی بحری قوت اوّل درجے کی ہوجائیگی۔ شمالی یورپ کی قدیم قومیں تجارت میں بہ نسبت زمانۂ قدیم کے کمزور ہوگئی ہیں۔ مگر ابھی اُن کی تجارتی ساکھ قائم ہی۔ کہتے ہیں کہ برازیل آیندہ زمانے میں تجارت کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی ترقی کریگا۔ اُس نے چین اور جاپان سے جو تجارتی معاہدے کیئے ہیں اُن سے ایشیا کے ساتھ اسکی تجارت کو ترقی ہوگی۔ یونان کے سوداگر بھی موجودہ تجارتی دُنیا میں قابلِ امتیاز ہیں کیونکہ مشرق کے اکثر ملکوں۔ بحرِ اسود اور دریاے انیوب کے ساحلی شہروں کی تجارت آجکل اُنھیں کے ہاتھ میں ہی۔ اور اُنھوں نے قسطنطنیہ۔ سمرنا۔ اسکندریہ۔ اوڈیسا۔ طہران اور مشرق کے بہت سے شہروں میں تجارت کی نہایت عمدہ کوٹھیاں قائم کرلی ہیں، جن کا حُسنِ انتظام اُن کے تجارتی سلیقے کو صاف ظاہر کرتا ہی۔ لندن۔ لیورپول۔ مانچسٹر۔ مارسیلز۔ ٹریسٹی۔ نیویارک۔ نیوآرلینز۔ رایوجنیرو۔ کلکتہ اور دیگر مقامات میں اُن کی ایجنسیاں جاری ہیں۔ لندن میں جرمن کے بہت سے تاجر موجود ہیں، جو اسبات میں مشہور ہیں کہ تجارتی معاملات میں وہ اعلےٰ درجے کے تجربہ کار ہیں اور اُن کی تجارت کا دائرہ بہت وسیع ہی۔ بحرِ روم میں جینوا۔ لیگارنو اور ٹریسٹی کے تاجروں کی عظمت غالبًا برابر قائم رہیگی۔ چنانچہ جینوا کے بعض جہازرانوں کی کوٹھیاں اِسوقت دُنیا کی بہت بڑی کوٹھیاں تصوّر کی جاتی ہیں مگر اسمیں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہی کہ زمانۂ موجودہ کے فنِ تجارت کے لحاظ سے جو عظمت اور شہرت لندن کو حاصل ہی، وہ کسی شہر کو حاصل نہیں ہی اور وہ اسوقت دُنیا کا سب سے بڑا بندرگاہ۔ سب سے بڑا تجارتی مرکز۔ سب سے بڑا بحری اسٹیشن اور سب سے بڑا دولتمند شہر مانا جاتا ہی۔

یہ تمام بیان علامہ بطرس بستانی مصنف دائرۃ المعارف کا ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ تجارت ایک بہت بڑی قوت ہی۔ اور جو قوم تجارت پیشہ ہی، وہ صاحبِ حکومت بھی ہوسکتی ہی۔ اور جو قوم صاحبِ حکومت ہی اُس کی

تجارت بہت جلد ترقی پا سکتی ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کو بتاؤ تو اُن قوموں پر نظر ڈالنی چاہیئے جو اسوقت تجارت میں سربرآوردہ اور ممتاز ہیں گو دُنیا میں اُن کی حکومت کہیں بھی نہیں ہے۔ مثلاً یہودی اور پارسی۔ یہودیوں کی تجارت کا یہ حال ہے کہ بہت سی سلطنتیں یہودی سوداگروں کی مقروض ہیں۔ کوئی ملک دُنیا میں ایسا نہیں ہے، جہاں یہودی سوداگروں کی دُکانیں اور کوٹھیاں نہ ہوں۔ دولت و ثروت اس قوم پر ٹوٹ پڑی ہے۔ پارسی ہندوستان میں مشہور تجارت پیشہ قوم ہے۔ اُن کی دُکانیں اور کوٹھیاں ہندوستان کے بہت سے شہروں اور دُنیا کے بہت سے ملکوں میں موجود ہیں۔ دونوں قوموں کے آدمیوں کی تعداد اگرچہ بہت تھوڑی ہے مگر اُن کی دولت اور ثروت کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان قوموں سے سبق لینے کی ضرورت ہے اُن تمام نوجوان مسلمانوں کو جو کالجوں سے تعلیم پاکر نکلتے ہیں، نوکریوں پر جُھک پڑنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اگر بہت سے تعلیم یافتہ طلبا تجارت کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کریں تو بہ نسبت غیر تعلیم یافتہ اور جاہل کانداروں کے زیادہ کامیابی اور زیادہ ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اسطرح اپنی قوم کے بہت بڑے حصے کو دولتمند کے لقب سے ممتاز کر سکتے ہیں۔ ملازمت پیشہ قوم کبھی دولتمند نہیں ہو سکتی۔ نہ اُن کی فیاضیوں سے قوم کو زیادہ نفع کی امید ہے۔ تجارت کا میدان اسقدر وسیع ہے کہ اُس میں ہر قوم کی دوڑ دھوپ کرنے کی گنجائش ہے۔ برخلاف اسکے ملازمت کا میدان نہایت محدود ہے۔ اگر ہماری قوم کا تعلیم یافتہ گروہ آج تجارت پیشہ ہوتا تو اسکی فیاضیوں سے بہت سی تعلیم گاہیں بن جاتیں اور بہت سے کارخانے صنعت کے قائم ہو جاتے۔ جن سے جہالت اور افلاس دونوں کی بُنیاد اُکھڑ جاتی کاش ہماری قوم کے مدعیانِ اصلاح اسطرف توجہ کریں جس سے ترقی کی اصلی داغ بیل پڑنے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ محض سطحی تعلیم دینے سے جس سے عملی دُنیا میں داخل ہونیکا سبق حاصل نہ ہو، کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ یہ توقع ہے کہ کسی وقت ملازمت پیشہ نوجوانوں کا قلیل گروہ اس تعلیم کی برکت سے ہماری قوم کے اقبال کا علم بردار ہوگا حالانکہ وہ اپنی ہی معاش کی فکر میں رات دن غلطاں پیچاں ہیں اور نہیں جانتے کہ عملی دُنیا میں کیونکر کامیاب ہوں۔

(وحید الدین سلیم)

حاتم طائی

حاتم کے نام سے مسلمانوں کی تاریخ میں کئی شخص ہوئے ہیں۔ جن میں سے دو تو مصر کے گورنر تھے ایک مسلمان بزرگ حاتم اصم کے نام سے مشہور ہیں، جو نہایت عابد و زاہد تھے۔ مگر جو شہرت حاتم طائی کو حاصل ہوئی ہے وہ کسیکو نہیں ہوئی حالانکہ وہ مسلمان نہ تھا بلکہ اُسکا زمانہ ظہورِ اسلام سے پہلے ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں اُسکا نام پیر و جواں کی زبان پر جاری ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک کتاب قصۂ حاتم طائی کے نام سے عام طور پر لوگوں میں متداول ہے۔ اسکا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے اور اُسکو ہر آدمی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ اس کتاب میں حاتم کے جو حالات بیان ہوئے ہیں، وہ محض افسانہ ہیں۔ اُنکو حاتم کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسکی زندگی کے تاریخی حالات سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں عام طور پر اُس کی زندگی کا تاریخی واقعہ جو لوگوں کو معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ حاتم سخی تھا اور اسکی سخاوت ہی ضرب المثل ہے۔ اسکے سوا کوئی بات حاتم کے متعلق لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ اگر اُسکے تاریخی

حالات بیان کیے جائیں تو غالباً ناظرین معارف اُن کو دلچسپ سمجھکر ضرور پڑھینگے۔

حاتم عرب کے قبیلہ طے سے تھا۔ اسی لیئے وہ طائی کے لقب سے مشہور ہی۔ اسکے باپ کا نام عبداللہ تھا۔ دادا کا نام سعد اور پردادا کا نام حشرج تھا۔ کہتے ہیں کہ اُسکی ماں نے جو عتبہ کے نام سے مشہور تھی، ایامِ حمل میں ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک شخص نے خواب میں اُس سے کہا کہ تو ایک بچہ لینا پسند کرتی ہی، جو سخی اور فیاض ہوگا اور جو حاتم کہلائیگا یا ایسے دس بچے لینا چاہتی ہی جو شیر نر کیطرح بہادر ہونگے اور جنگ کے وقت کار نمایاں کرینگے۔ عتبہ نے کہا کہ میں تو اُسی ایک بچے کو لینا پسند کرتی ہوں جو سخی اور فیاض کہلائیگا۔ اور جسکا نام حاتم ہوگا۔ میں اُس کو دس بہادر اور شیر دل بچوں پر ترجیح دیتی ہوں۔ یہ حکایت اگرچہ محض افسانہ ہی مگر اسکے مشہور ہونے کی ایک وجہ ضرور ہی اور وہ یہ ہی کہ حاتم کی ماں عتبہ حاتم ہی کی طرح سخاوت اور فیاضی میں بےمثل تھی۔ وہ جہاں تک ممکن تھا کسی سائل کے سوال کو رد نہیں کرتی تھی۔ نہ خوراک کا کوئی ذخیرہ دوسرے دن کے لیئے گھر میں رکھ چھوڑتی تھی۔ عتبہ کے بھائی تنگدل اور حریص تھے۔ انکو اپنی بہن کی فیاضی پر نہایت غصہ آتا تھا جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ کسیطرح نہیں مانتی اور گھر کا جمع کیا ہوا سرمایہ تلف ہو رہا ہی تو کچھ دن کے لیئے اُنھوں نے اپنی بہن کو اُس روپیئے سے محروم کر دیا۔ اگر وہ کبھی مانگتی بھی تو کوئی چیز اُسکو نہیں دیتے تھے جب اُنھوں نے خیال کیا کہ اب عتبہ کو تکلیف محسوس ہونے لگی ہی اور وہ شاید اپنی عادت پر پشیمان ہوگی تو اُسکو چند اونٹ دیدیے کہ اُن کے دودھ پر گذر کرے۔ عتبہ کے پاس ہر سال قبیلۂ ہوازن کی ایک عورت سوال کرنے آیا کرتی تھی۔ جب وہ آئی تو فوراً اُسکو وہ اونٹ دیدیے اور کہا کہ میں نے بھوک کی ایسی تکلیف اُٹھائی ہی کہ آج کے بعد کسی محتاج کے سوال کو رد نہیں کرونگی۔ جس ادمی نے عتبہ کا خواب ایجاد کیا ہی اُسکو غالباً اس پیرایے میں یہ بات بیان کرنی منظور ہی کہ وہ طبیعت کی فیاض تھی اور اپنی اولاد کا بھی فیاض ہی ہونا پسند کرتی تھی۔

حاتم ابھی ماں کی گود ہی میں تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ اسلیئے دادا اسکی پرورش کا کفیل ہوا۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اس کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ گھر میں سے کھانا لیکر نکل جاتا تھا۔ اگر کوئی آدمی اسکو مل جاتا تو اُسکے ساتھ بیٹھکر کھاتا اور اُس کو کھلاتا تھا۔ ورنہ کھانا پھینک کر گھر میں چلا آتا تھا۔ دادا کو اسکی یہ حرکت ناگوار تھی۔ ایکدن اُسنے کہا کہ بیٹا! جاؤ۔ اب میرے اونٹوں کی نگرانی کرو گھر میں زیادہ رہنا اچھا نہیں ہی۔ وہ اونٹوں کو لیکر جنگل میں نکل گیا وہاں بھی آدمیوں کو تلاش کرنے لگا کہ اگر کوئی ملے تو اُسکو اپنی سخاوت سے فائدہ پہونچاؤں۔ مگر کوئی آدمی نہیں ملا۔ ایک دفعہ وہ ایک سڑک کے کنارے پر کھڑا تھا۔ سامنے میدان میں اونٹ چر رہے تھے اُسنے دور سے دیکھا کہ چند آدمی اُسی کی طرف چلے آتے ہیں۔ حاتم کے پاس پہونچکر اُنھوں نے پوچھا کہ کیا تم اس جنگل میں ہمارے میزبان بن سکتے ہو؟ اور کیا تمھارے پاس مہمانی کے لیئے کوئی چیز موجود ہی؟ حاتم نے کہا۔ تعجب کی بات ہی کہ تم اتنے اونٹوں کو چرتے دیکھ رہے ہو اور پھر یہ سوال کرتے ہو کہ مہمانی کے لیئے کوئی چیز تمھارے پاس موجود ہی یا نہیں۔ آؤ۔ اپنی سواریوں سے اتر پڑو۔ آج تم میرے مہمان ہو۔ یہ مہمان عرب کے مشہور شاعر عُبید بن ابرص -

بشر بن ابی حازم اور نابغہ ذبیانی تھے، جو نعمان بن منذر کے دربار میں جا رہے تھے اور اُسکی مدح میں قصیدے لکھکر اس خیال سے لیچلے تھے کہ انعام سے مالا مال ہوکر آئینگے۔ حاتم نے اُن کے لیئے تین اونٹ ذبح کیئے عُبید نے کہا کہ تم نے اپنے اُونٹوں کو ناحق تلف کیا ہم تو اُن کے دُودھ ہی پر قناعت کر سکتے تھے۔ حاتم نے کہا۔ تمھارے رنگ جُدا جُدا ہیں اور تمھارے خط و خال مختلف ہیں۔ میرا خیال ہی کہ تمھارا وطن بھی ایک نہیں ہی۔ میں نے دعوت میں ذرا سا تکلف اسلیئے کیا کہ تم میں سے ہر ایک آدمی جب اپنے وطن کو جائیگا تو اس دعوت کا ذکر بھی کریگا۔ تینوں شاعروں نے حاتم کی مدح میں اشعار کہے جنکو سُنکر اُسنے کہا کہ میں نے تو چاہا تھا کہ تم پر کوئی احسان کروں مگر تم نے اشعار کہکر مجھے ممنونِ احسان بنا لیا۔ اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یا تو ان اُونٹوں کو تم آپس میں تقسیم کرلو۔ ورنہ میں سب کو ذبح کر ڈالونگا۔ مجبور ہوکر سبنے اُن اُونٹوں کو بانٹ لیا۔ ہر شاعر کے حصّے میں ننانوے ۹۹ اونٹ آئے۔ حاتم کے دادا نے جب یہ حال سُنا تو خفا ہوکر اُس سے پوچھا کہ اے تم نے میرے اُونٹ کیا کیئے؟ حاتم نے کہا۔ دادا جان میں نے وہ اُونٹ تین مہمانوں کو دیدیئے، جو شاعر تھے۔ وہ تمھارا نام اپنے اشعار میں داخل کرینگے اور تمھاری فیاضی کے ذکر کو قیامت تک زندہ رکھینگے مجھے تو ایک شعر بھی جس سے میرا یا میرے خاندان کا نام ہمیشہ زندہ رہے، اُن تمام اُونٹوں سے بدرجہا زیادہ پسند ہی جنکی نگرانی مجھے سپرد ہوئی تھی۔ دادا نے حیرت سے اُسکی طرف دیکھکر کہا کہ تم نے میرے سب اُونٹ کیا فی الحقیقت دے ڈالے؟ حاتم نے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا وہ بالکل سچ ہی۔ دادا نے غصّے سے پیچ و تاب کھا کر کہا کہ میں اب کبھی تمھارے ساتھ نہیں ہونگا۔ یہ کہکر وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں سے اُٹھکر چلدیا۔ اور حاتم کے پاس ایک کنیز۔ ایک گھوڑی اور ایک بچھیرا چھوڑ گیا جو اُسنے اونٹوں کی نگرانی کے زمانے میں اُسکو دیا تھا۔ حاتم نے اس واقعہ پر جو اشعار کہے اُن کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"میں افلاس کو پسند کرتا ہوں اور اگر دولت ہو تو اُس میں سب کو شریک کرلیتا ہوں۔ میں ایسے دوستوں کو خیرباد کہتا ہوں جن کی طبیعت میری طبیعت سے نہیں ملتی۔ میری جیسی طبیعت قدرت اُنھیں کو عطا کرتی ہی جو میری طرح فیاض ہوں میں دولت کو اپنی عزت کی سپر بناتا ہوں اور فیاضی کے سوا کوئی فضیلت اپنے لیئے پسند نہیں کرتا۔ اگر سعد اپنے گھر کے آدمیوں کو لیکر چلا گیا اور مجھے گھر میں تنہا چھوڑ گیا تو کچھ پروا نہیں ہی۔ میں نے سعد کے لیئے جو بلند عمارت شہرت اور ناموری کی تیار کی ہی وہ اُس کے لیئے کافی معاوضہ اُن اونٹوں کا ہی جن کو میں نے دے ڈالا۔ فیاضی کے ساتھ مجھ میں دلیری بھی ہی اور اُسکے اظہار کا موقع میدانِ جنگ ہے۔"

فیاضی حاتم کو ماں کی طرف سے ورثہ میں ملی تھی اور اس سے صاف ظاہر ہی کہ ماں باپ کی بعض خصلتیں اولاد کو ورثہ میں پہونچ جاتی ہیں اور انکا روکنا اولاد کے اختیار سے باہر ہوتا ہی۔ اس کے ثبوت میں ہم سفانہ کا واقعہ بیان کرینگے جو حاتم کی بیٹی تھی۔ سفانہ بھی اپنے باپ کی طرح سخاوت میں بے مثل تھی۔ باپ اُسکو اونٹ پر اونٹ دیتا تھا اور وہ سب لوگوں کو دے ڈالتی تھی۔ ایکدن حاتم نے اُس سے کہا کہ اگر دو آدمی مال کو تلف کرنے

لگیں تو اس میں شک نہیں ہی کہ سارا مال بہت جلد ضائع ہو جائیگا - اسلیئے میری رائے یہ ہی کہ یا تو میں سخاوت سے ہاتھ روک لوں اور تم دل کھولکر فیاضی کرو - یا تم کو اپنی مٹھی بند کر لینی چاہیئے - سفانہ پر باپ کی اس نصیحت کا مطلق اثر نہیں ہوا اور اُسکو باپ کی طرف سے جو عادت ورثہ میں ملی تھی وہ برابر جاری رہی -

اونٹوں کے واقعہ کے بعد ایک روز قیس اور اسد کے قبیلے کے چند آدمی اُس کے پاس آئے جو نعمان کے پاس جا رہے تھے - اُنھوں نے کہا کہ ہم اپنی قوم کو تمھاری تعریف کرتے چھوڑ آئے ہیں اور اُنھوں نے ایک پیغام تمھارے پاس بھیجا ہی - حاتم نے پوچھا کہ وہ پیغام کیا ہی ؟ قبیلہ اسد کے لوگوں نے نابغہ کے چند شعر اس کی مدح میں پڑھکر کہا کہ ہم کو ایک ضرورت پیش آئی ہی مگر تم سے سوال کرتے شرم آتی ہی - حاتم نے کہا کہ وہ کیا ضرورت ہی ؟ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے ایک رفیق کی سواری کا جانور گم ہو گیا ہی - حاتم نے کہا کہ میری گھوڑی لیجاؤ اور اپنے رفیق کو اُسپر سوار کرو - اُنھوں نے گھوڑی لیلی - اب اسکا بچھیرا رہگیا جسکی گردن میں حاتم کی کنیز نے اپنی چادر ڈال دی - اور چاہا کہ اُسکو ماں کے ساتھ نہ جانے دے مگر بچھیرا اُچھل کود کرنے لگا اور اپنی ماں کے ساتھ ہو لیا - اور کنیز کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹکر لیچلا - حاتم نے پکار کر کہا کہ تمھارے پیچھے خود بخود جو چیز آتی ہی وہ بھی تمھارے ہی لیئے ہی - خبردار اس بچھیرے اور کنیز کو واپس نہ کرنا -

عرب جاہلیت میں مہینوں کے نام اسلامی ناموں سے مختلف تھے - ایک مہینے کا نام اصم تھا جس کی قریش بہت تعظیم کرتے تھے - جب اس مہینے کا چاند دکھائی دیتا تو حاتم ہر روز دس اونٹ ذبح کرتا اور بہت سے لوگوں کو دعوت میں بلاتا تھا - اُس کے مہمانوں میں حطیئہ اور بشر بن ابی حازم بھی ہوتے تھے ، جو ایام جاہلیت کے مشہور شاعر تھے -

حاتم نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد ماویہ بنت عفزر سے نکاح کر لیا تھا - اسکا سبب مؤرخوں نے یہ بیان کیا ہی کہ ماویہ عرب کے ایک امیر کی بیٹی تھی - اُسنے شادی کا ارادہ کیا تو اپنے غلاموں سے کہا کہ حیرہ میں جو آدمی سب سے زیادہ حسین ہو اُسکو میرے پاس لے آؤ - غلام حاتم کو اُس کے پاس لیگئے - اُسوقت نابغہ اور انصار میں سے قبیلہ بنی نبیت کا ایک شخص وہاں موجود تھا - ماویہ نے اُن سے کہا کہ تم سب اپنے خیموں کو لوٹ جاؤ اور اشعار لکھکر میرے پاس لاؤ جس میں تمھارے کارہائے نمایاں کا ذکر ہو - میں اُس آدمی سے شادی کرونگی جو تم میں سب سے زیادہ فیاض اور شاعر ہو - جب وہ اپنے خیموں کو واپس آئے تو اُن میں سے ہر ایک نے اُونٹ ذبح کیئے اور لوگوں کو دعوت میں بُلایا - ماویہ باندی کا لباس پہنکر ہر ایک کے خیمے میں گئی - جب قبیلہ بنی نبیت کے شاعر کے پاس گئی اور اُس سے کھانے کو مانگا تو اُسنے اُونٹ کے پنجے کی ایک ہڈی اُسکو دی - ماویہ نے اُس ہڈی کو اپنے پاس رکھ لیا - پھر نابغہ کے پاس گئی اور اُس سے بھی کھانے کا سوال کیا تو اُس نے اونٹ کی دُم پیش کی - اُس نے دُم کو بھی اپنے پاس رکھ لیا - جب حاتم کے پاس آئی تو اُسنے چولھے پر دیگ چڑھا رکھی تھی - حاتم نے اُس سے کہا کہ ذرا توقف کرو - میں ابھی کھانا تیار کرکے لاتا ہوں - ماویہ نے تھوڑی دیر انتظار کیا - حاتم نے اُسکو اونٹ کی ران اور کوہان کا عمدہ گوشت دیا - یہاں سے واپس ہو کر ماویہ اپنے مکان پر چلی آئی - صبح کو جب تینوں اُس کے پاس جمع ہوئے تو ماویہ نے اشعار پڑھنے کا حکم دیا - نبیتی اور نابغہ نے اپنے اشعار نہایت جوش کے لہجے میں جھوم جھوم کر سُنائے - جب حاتم کی باری آئی تو اُسنے چند اشعار پڑھے جنکا مضمون

پیہ تھا۔

"اے ماویہ دولت تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہو اُسکا ذکر ہی لوگوں کی زبان پر باقی رہ جاتا ہی۔ اے ماویہ جب کوئی سائل میرے دروازے پر آتا ہی تو میں اُس سے یہ نہیں کہتا کہ ہمارا مال ختم ہو چکا۔ اب دینے کو کچھ نہیں رہا۔ اے ماویہ جو بخیل ہیں وہ ذلیل ہیں اور جو داد و دہش کرتے ہیں اُن کو کوئی چیز نہیں روکتی۔ اے ماویہ موت کے وقت جب آدمی کا سکا ڈوب جاتا ہی اور گلے میں سانس اٹکنے لگتا ہی تو اُسکا مالدار ہونا کچھ کام نہیں آتا۔ اے ماویہ اگر میں ایسے چٹیل میدانوں میں جا نکلوں اور مر جاؤں جہاں پینے کو نہ شراب مل سکتی ہو نہ پانی تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ میں نے جو روپیہ فیاضی میں لُٹا دیا ہی اُسنے مجھے ذرا بھی نقصان نہیں پہونچایا۔ دُنیا جانتی ہی کہ اگر حاتم دولت جمع کرنی چاہتا تو اُسکے پاس آج خزانے کے خزانے ہوتے۔"

جب حاتم شعر خوانی سے فارغ ہو لیا تو ماویہ نے کھانا طلب کیا۔ اُسنے اپنی لونڈیوں کو پہلے سے سمجھا رکھا تھا کہ جب اُن کے سامنے کھانا چُنا جائے تو ہر ایک کے آگے گوشت کے وہ ٹکڑے بھی رکھے جائیں جو اُنھوں نے دعوت میں دیے تھے۔ چنانچہ نبیتی کے سامنے اونٹ کے پیچھے کی ہڈی۔ نابغہ کے سامنے اونٹ کی دُم اور حاتم کے آگے اونٹ کے کوہان اور ران کا گوشت رکھا گیا۔ نبیتی اور نابغہ نے مارے شرم کے سر جھکا لیا۔ حاتم نے اپنے ساتھیوں کے چہرے پر شرم و افسوس کے آثار دیکھکر اپنا حصّہ اُنکی طرف سرکا دیا۔ ماویہ نے کہا کہ اب خوب ثابت ہو گیا کہ حاتم سب سے زیادہ فیاض اور شاعر ہی۔ یہ سُنکر نابغہ اور نبیتی تو چلے گئے مگر حاتم بیٹھا رہا۔ ماویہ نے حاتم سے کہا کہ اگر تم اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیدو تو میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ حاتم نے اِس بات سے انکار کیا۔ ماویہ نے اُسکو زادِ راہ دیکر رخصت کیا۔ مگر چند روز کے بعد اسکی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور حاتم نے ماویہ سے شادی کر لی۔ اِس شادی سے عدی پیدا ہوا جو حاتم کا مشہور بیٹا اور عرب کا مشہور شاعر تھا۔

ماویہ ایک مدت تک تو حاتم کے گھر میں رہی مگر ایک روز حاتم کے چچا زاد بھائی مالک نے اُس سے کہا کہ تم حاتم کے پیچھے میں کب تک اسیر رہو گی۔ وہ تو جو کچھ پاتا ہی لُٹا دیتا ہی اور نہیں پاتا تو تم کو ستاتا ہی۔ اگر وہ مر گیا تو تمھاری اولاد کے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑیگا۔ ماویہ کے دل پر مالک کی بات نقش ہو گئی اور اُسنے کہا تم سچ کہتے ہو۔ حاتم کی یہی حالت ہی۔ مالک نے کہا۔ تو اُس کو تم فوراً طلاق دیدو اور اسکے بعد اگر تم پسند کرو تو میں تمھارے لیے عمدہ شوہر ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس بہت سا مال بھی ہی اور میں تمھاری حفاظت اور تمھاری اولاد کی پرورش بھی بخوبی کر سکتا ہوں۔ ماویہ نے طلاق دینے کی ٹھان لی۔ ایامِ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کوئی عورت اپنے شوہر کو طلاق دینی چاہتی تو خیمے کے دروازے کو دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ شوہر دروازے کی طرف آتا تو اس طرف خیمے کی پشت دیکھکر سمجھ لیتا تھا کہ عورت نے قطع تعلق کر دیا۔ ماویہ نے بھی یہی کیا کہ اپنے خیمے کے دروازے کو پشت کی طرف پھیر دیا۔ جب حاتم آیا اور اُسنے یہ حال دیکھا تو اپنے بیٹے کو آواز دیکر بلا لیا اور اُسکو اپنے ساتھ لیکر اور جگہ جا ٹھہرا۔ اتفاق سے اُسی روز پچاس مہمان حاتم کے خیمے میں آ گئے ماویہ اُن کو دیکھکر گھبرائی اور لونڈی کے ہاتھ مالک کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔ مالک نے دعوت کے لیئے کچھ دینے سے انکار کیا۔ ماویہ نے لونڈی کو حاتم کے پاس بھیجا اُس نے فوراً دو اونٹنیاں لاکر ذبح

گیں اور مہمانوں کو کھانا کھلایا۔ ماویہ نے کہا یہی تو سبب ہے جس نے میری طرف سے تمکو طلاق دلوائی۔ اب مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ مرتے وقت تم اپنی اولاد کو صرف محتاج اور مفلس چھوڑ جاؤ گے۔ حاتم نے اس موقع پر چند اشعار موزوں کیئے جنکا مضمون یہ تھا۔

"زمانہ کیا ہے؟ آج کا دن جو موجود ہے، یا کل کا دن جو گذر گیا، یا کل کا دن جو آنیوالا ہے۔ اسی طرح ایک دن آتا ہے اور ایک دن جاتا ہے ہمیشہ دن کے بعد رات ہوتی رہیگی اور زمانہ کبھی ختم نہیں ہوگا کہ موت ہم کو فنا کر دیگی۔ ہماری زندگی کی مدت محدود ہے جسکی رفتار آگے کو جاری ہے اور ہم اُس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ مال و دولت پرستوں کے لیئے معبود ہوتا ہے مگر میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرا کوئی ایسا معبود نہیں ہے بخیل اپنی آگ کو بجھا دیتا ہے مگر میں اپنے غلاموں سے کہتا ہوں کہ خوب تیز آگ روشن کرو۔"

حاتم کی عادت تھی کہ جب اندھیری رات ہوتی تو اپنے غلام سے کہتا کہ کسی اونچے ٹیلے پر آگ جلائے تاکہ مسافر دور سے اُسکو دیکھکر وہاں آئیں اور اُس کے مہمان ہوں۔ جب آگ تیزی کے ساتھ بھڑکتی تو اپنے غلام کو مخاطب کرکے چند اشعار پڑھتا جس کے معنی یہ ہیں۔

"آگ روشن کرو۔ آگ روشن کرو کیونکہ رات تاریک اور سرد ہے۔ شاید اُسکے شعلوں پر کسی مسافر کی نظر پڑ جائے۔ اگر تم نے کسی مہمان کو یہاں کھینچ بلایا تو تم آزاد ہو۔"

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حاتم کسی کام کے لیئے سفر کو نکلا۔ جب وہ قبیلہ عنزہ کی بستی میں پہونچا تو ایک قیدی نے بلند آواز سے کہا کہ او سفانہ کے باپ قید کی سختی نے مجھے مار ڈالا۔ حاتم نے اُسکے پاس جاکر کہا کہ افسوس تو نے پردیس میں میرا نام لیا اور مجھکو شرمندہ کیا۔ اسکے بعد وہ قبیلہ عنزہ کے پاس گیا اور کہا کہ اس قیدی کو چھوڑ دو۔ اور مجھے اسکی جگہ قید کر لو۔ اور جبتک میں فدیے کا روپیہ ادا کروں مجھے قید ہی میں رکھو۔ کچھ دنوں قید میں رہکر اُسنے فدیہ ادا کر دیا اور چھوٹ گیا۔

ابن اثیر نے اسکے قید ہونے کا سبب یہ لکھا ہے کہ اُسنے بکر بن وائل کے قبیلے پر اپنے قبیلے کی فوج لیکر حملہ کیا تھا۔ اُسکے قبیلے کے بہت سے آدمی اس لڑائی میں مارے گئے۔ اور کچھ قید ہوگئے۔ قیدیوں کے زمرے میں حاتم بھی تھا جسپر عنزہ کے قبیلے کا ایک آدمی پہرہ دیتا تھا۔ علامہ ابو الفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ وہ ایک عورت کی مدد سے اس قید سے چھوٹا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملحان نے جو ماویہ کا بھتیجا تھا ماویہ سے پوچھا کہ چچی جان حاتم کی کوئی عجیب بات بیان کرو۔ ماویہ نے کہا اُسکی تو ہر بات عجیب تھی۔ ایک سال ہمارے ملک میں قحط پڑا۔ اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ چارے کے نہ ملنے سے اونٹ اور بکریاں ہلاک ہونے لگیں۔ ایک رات ہم بہت بھوکے تھے۔ حاتم نے عدی کو ادھر اُدھر کی دلچسپ باتوں میں لگائے رکھا اور تھوڑی دیر بعد اُسکو سُلا دیا میں سفانہ کو کہانیاں سُنانے لگی اور کہانیاں سُنتے سُنتے اُس کو بھی نیند آگئی۔ اب حاتم میری طرف متوجہ ہوا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُسکے مطلب کو سمجھکر آنکھیں بند کرلیں اور اُسکی خاطر سے جان بوجھکر اونگھنے لگی۔ اتنے میں خیمے کے دروازے پر کسی آدمی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ پردہ اُٹھایا گیا۔ حاتم نے کہا کون ہے؟ کسی نے آگے بڑھکر کہا کہ میں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں اور کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھوک سے تڑپتا چھوڑ آئی ہوں۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟ کیونکہ اسوقت میرے بچوں کی حالت نازک ہے۔ حاتم نے کہا کمبخت بی بی تم اپنے

بچوں کو میرے پاس لے آو۔ میں اُن کی مدد کروں گا اور اُن کو بھوک کے عذاب سے بچاؤنگا۔ میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ میں نے جلدی سے اُٹھکر اُس سے کہا کہ اس عورت کے بچوں کو تم کیا کھلاؤگی تمھارے بچے تو ابھی جیلے بہانے سے سُلائے گئے ہیں۔ حاتم نے کہا کہ میں اُس کے بچوں کے ساتھ تمھارے بچوں کا بھی خیال رکھونگا۔ جب وہ عورت اپنے بچوں کو لیکر آگئی تو حاتم نے خیمے سے نکلکر اپنے گھوڑے کو ذبح کیا۔ پھر آگ جلائی اور گوشت بھوننے لگا۔ جب گوشت اچھی طرح بھُن گیا تو اپنے بچوں کو جگا دیا اور وہ لپک کر آگ کے پاس ہو بیٹھے۔ حاتم نے عورت کے ہاتھ میں ایک چھُری دیدی تاکہ وہ گوشت کاٹکر آپ بھی کھائے اور اپنے بچوں کو بھی کھلائے۔ پھر کہنے لگا کہ تم تو کھاؤ اور قبیلے کے اور آدمی بھوک سے جانکنی کی حالت میں ہوں۔ یہ مجھسے نہ دیکھا جائیگا۔ یہ کہکر وہ اُٹھا اور گھر گھر لوگوں کو جگاتا پھرا۔ اب بہت سے آدمی جمع ہو گئے اور گھوڑے کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھانے لگے جب تک وہ کھاتے رہے، حاتم اپنی چادر اوڑھے کھڑا رہا اور اُن کو دیکھتا رہا۔ گوشت سارا ختم ہو گیا اور اُسنے ذرا سا بھی نہیں چکھا۔

حاتم کی سخاوت خود عرب میں اسقدر مشہور ہو گئی تھی کہ اُسکے بیان کیلیے معمولی اسلوب بیان کافی نہیں سمجھے گئے۔ اور اسکے مرتے ہی طرح طرح کی عجیب حکایتیں ایجاد ہونے لگیں۔ اُن میں سے ایک حکایت جو لطیفے کی برابر دلچسپ ہے، ہم اس مقام پر بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ معاویہ رضؓ کے دربار میں حاتم کی فیاضیوں اور مہمان نوازیوں کا ذکر بہت شدّ و مدّ سے ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا حاتم تمام زندوں اور مُردوں سے بڑھکر سخی اور مہمان نواز تھا۔ معاویہ رضؓ نے کہا یہ بات تعجب کی ہے۔ آج قریش کا ایک آدمی ایک دفعہ کی سخاوت میں اتنا مال لُٹا سکتا ہے کہ نہ اُس کی برابر حاتم کے پاس مال تھا نہ اُس کے تمام قبیلے کو اتنی دولت کبھی نصیب ہوئی۔ اس نے کہا کہ ایک دفعہ قبیلۂ بنی اسد کے کچھ لوگ حاتم کی قبر پر جا نکلے۔ اور آپس میں کہنے لگے کہ آؤ ہم حاتم کو بخیل ٹھرائیں۔ اور عرب کے لوگوں میں مشہور کریں کہ ہم حاتم کے پاس مہمان ہو کر گئے تھے۔ اُس نے بات بھی نہ پوچھی۔ یہ کہکر سب وہاں اُتر پڑے اور پکار پکار کر کہنے لگے۔ حاتم! حاتم!! کیا تم اپنے مہمانوں کو بھوکا رہنے دوگے اور اُن کی دعوت نہیں کروگے؟ —

ابو الخیبری نے جو اُن کا سردار تھا، ہنسکر کہا۔ واہ وا تم نے حاتم کو بخیل ٹھرانے کی خوب حکمت نکالی۔ حاتم کے قبیلے کے سب لوگ آج تک یہی خیال کرتے ہیں کہ کوئی مہمان اُس کے دروازے سے محروم نہیں پھرا۔ رات کا وقت تھا۔ سب آپس میں ہنس بول کر سو رہے۔ صبح کو جب سو کر اُٹھے تو ابو الخیبری چلّانے لگا۔ افسوس میں لُٹ گیا۔ میری سواری کا جانور مارا گیا۔ لوگوں نے تعجب سے کہا ایں یہ کیا کہتے ہو؟ ابو الخیبری نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حاتم تلوار لیئے اپنی قبر سے باہر نکلا اور اُسنے میری اونٹنی کو ذبح کر ڈالا۔ لوگوں نے کہا کیوں جھُوٹ بولتے ہو۔ ابو الخیبری نے کہا میں اور جھُوٹ بولتا ہوں!! وہ دیکھو میری اونٹنی ذبح ہوئی پڑی ہے۔ کیا میں آپ اُسکو ذبح کرتا۔ میرے پاس تو سواری کا کوئی اور جانور بھی نہیں ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ فی الحقیقت اُس کی اونٹنی ذبح کیگئی ہے۔ تعجب کرنے لگے اور ہنس ہنس کر کہنے لگے کہ آخر حاتم حاتم تھا اپنے مہمانوں کو محروم کیوں رکھتا۔ اُسنے یہ ہماری دعوت کی ہے۔ سب نے اونٹنی کا گوشت بھُون بھُون کر کھایا۔ اور جب چلنے لگے تو اپنے سردار کو ایک شخص کے ساتھ اونٹ پر سوار کر دیا۔ اثنائے راہ میں عدی ابن حاتم جو ایک سیاہ اونٹ پر سوار تھا، دوسرے

دکھائی دیا جب اُن کے پاس آگیا تو اُسنے پوچھا کہ ابوالخیبری تم میں سے کون شخص ہے؟ لوگوں نے اپنے سردار کیطرف اشارہ کیا۔ عدی نے کہا میں نے آج خواب میں اپنے باپ حاتم کو دیکھا۔ اُس نے مجھسے بیان کیا کہ ابوالخیبری مجھے دیر تک بُرا کہتا رہا اور میں نے اُسکی اونٹنی کو ذبح کر کے اُسکے ساتھیوں کے لیئے دعوت کا سامان کیا۔ میں نے چند اشعار اس واقعہ پر کہے ہیں۔ وہ اشعار بار بار میرے باپ نے پڑھے اور مجھے یاد ہو گئے جنکا مطلب یہ تھا۔

"اے ابوالخیبری تم اپنے قبیلے کے ظالم شخص ہو اور خیر سے بدزبان بھی ہو۔ تم نے ایک مٹی کی ڈھیر سے کیا توقع کی تھی جسکے نیچے میری ہڈیاں بوسیدہ ہو گئی ہیں۔ تم نے ایک بیجان لاش کو میزبانی کی تکلیف دی۔ حالانکہ تمھارے گرد بہت سے جانور دعوت کے سامان کے لیئے موجود تھے۔ ناچار ہم اپنے مہمانوں کی خاطر سے اپنی چمکتی تلوار نیام سے نکالتے ہیں اور تمھاری ہی اونٹنی کو ذبح کرتے ہیں۔"

میرے باپ نے یہ اشعار پڑھکر مجھے حکم دیا کہ میں اپنی سواری کا جانور تمھارے لیئے لے جاؤں۔ اب یہ سیاہ اونٹ تمھارا ہے۔ یہ کہکر عدی نے اونٹ کی مہار ابوالخیبری کے ہاتھ میں دی اور خود ایک طرف چلا گیا۔ سب کو اس واقعہ پر تعجب ہوا اور ابوالخیبری اُس سیاہ اونٹ پر سوار ہو کر اپنے رفیقوں کے ساتھ چل دیا۔

حاتم ایشیا میں سخاوت کے لحاظ سے مشہور ہے حالانکہ وہ شاعر بھی تھا اور اُس میں اور بہت سے اعلے درجے کی صفات موجود تھیں۔ اسکے اشعار عرب جاہلیت کے مشہور شاعروں کے کلام سے ٹکر کھاتے ہیں۔ ایک موقع پر اُسنے فیاضی پر جو اشعار کہے اُن کا مضمون یہ ہے۔

"او فیاضی پر ملامت کرنے والے! دولت تو ناپائدار ہے اور دولتمندی ایک مستعار چیز ہے۔ اگر ممکن ہو تو آئندہ زندگی کے سفر کے لیئے کچھ توشہ اپنی ہمراہ لے چل۔ بہت سے سخی ایسے بھی ہیں جنکو سخاوت کرنے کے بعد افلاس کا خیال آتا ہے اور وہ اپنی فیاضیوں پر پچھتاتے ہیں اور اسطرح نیکی کرنے کے بعد اُس نیکی کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ میرے باپ دادا کو لوگوں نے سخاوت کرنے پر کسقدر ملامت کی مگر اُنکی سخاوت ملامت سے ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ کیا میرے ہاتھ اُنھیں رگوں کے ہاتھوں سے نہیں پیدا ہوئے ہیں؟"

اب ہم حاتم سے رخصت ہوتے ہیں اور اُس کے حالات کو ابن اعرابی کے الفاظ پر تمام کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "حاتم عرب کے نامور شعرا میں سے تھا۔ اُس کی شاعری ویسی ہی اعلے درجے کی تھی جیسی اُس کی سخاوت تھی۔ اسکا قول اور فعل دونوں مطابق تھے۔ وہ جب کوئی وعدہ کرتا تو ممکن نہ تھا کہ اُسکو پورا نکرے۔ سب لوگ اُسکی تعظیم کرتے تھے اور جہاں کہیں وہ جاتا اُس کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ وہ شاعری اور سخاوت کے علاوہ بہادر بھی تھا۔ اکثر لڑائیوں میں اپنے دشمنوں پر غالب آتا تھا۔ اُس نے مال غنیمت کو کبھی اپنے لیئے نہیں رکھا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر لٹایا۔ وہ عرب جاہلیت کی رسم و رواج کے موافق کبھی جوا کھیلتا تھا اور اُس میں کامیاب ہوتا تھا۔ کبھی گھڑ دوڑ میں شریک ہوتا تھا اور اُسکا گھوڑا سب سے آگے نکل جاتا تھا۔ لڑائی میں اگر کسی دشمن کو قید کر لیتا تو لڑائی ختم ہونے کے بعد فوراً اُسکو چھوڑ دیتا تھا۔ اور فدیے کا روپیہ نہیں لیتا تھا۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ میں لڑائی میں کبھی اُس آدمی کو قتل نہیں کرونگا جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہو۔ غرض کہ وہ ایک طرف شاعر تھا۔ تو ایک طرف سخی بھی تھا۔ جہاں اُس کی شاعری بے نظیر تھی وہاں اُسکی سخاوت بھی ضرب المثل تھی۔ مہمان نوازی تو اُسی کے لیئے پیدا ہوئی تھی اور وہ مہمان نوازی کے لیئے پیدا ہوا تھا۔ راستبازی اور راستگوئی اُسکا شیوہ تھا۔

وہ اگر شہسوار اور بہادر تھا، تو جوان اور بیکس نواز بھی تھا۔ ادب اور تاریخ کی کتابیں حاتم کے جود و کرم کی داستانوں سے لبریز ہیں جن کو اگر کوئی جمع کرنا چاہے تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ اُسکی ولادت اور وفات کا ٹھیک زمانہ ہم متعین نہیں کر سکتے۔ اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ اُسکی وفات ظہورِ اسلام سے پہلے ہوئی اور وہ زمانۂ جاہلیت کے مشاہیر میں سے تھا۔ اِس زمانے کے بعض علمائے تاریخ اُسکو ایک فرضی شخص بتاتے ہیں اور اُسکے وجود سے انکار کرتے ہیں مگر ہم ایک منٹ کے لیئے بھی اُن کے قول کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ اسکا ذکر اُسکے معاصر شعرا کے کلام میں موجود ہے اور خود اُسکا کلام بھی اس کثرت سے ہے[1] اور اُسکی زندگی کے واقعات اسقدر بیان ہوئے ہیں کہ شک کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اُس کی اولاد عہدِ نبوت میں موجود تھی۔

(عبد العلی خاں)

بچوں کی تربیت

تربیت سے وہ طریقہ مراد ہے جس سے بچوں کی طبعی اور عقلی اور اخلاقی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اس میں ہر قسم کی تعلیم اور تہذیب داخل ہے جس سے عقل منور ہوتی ہے طبیعت راستی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ عادات و خصائل اصلاح پر آتی ہیں۔ اور بچے اپنی اور اپنے عزیزوں کی آیندہ نفع رسانی کی قابلیت پیدا کرتے ہیں۔ بچوں کی سرپرستوں اور مربیوں کو تربیت کی طرف بچپن میں توجہ کرنی لازم ہے کیونکہ اس زمانے میں بچے اپنی آیندہ حالت سے بالکل بیخبر ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کیا ہونگے اور اُنکو کیسا ہونا چاہیئے۔ بچوں کی مثال ترو تازہ ٹہنی کی ہے جسکو ہر طرف موڑنے کا اختیار ہے اور خشک ہونیکے بعد اس میں یہ قابلیت نہیں رہتی۔ اسی سبب سے بچپن کی حالت میں اُنکی تہذیب اصلاح کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ بیزبان جانور نیچرل طور پر صرف خوراک کے محتاج ہیں مگر انسان مادی غذا کے علاوہ جس سے جسمانی تقویت حاصل ہوتی ہے روحانی اور اخلاقی غذا کا بھی محتاج ہے۔ اور اسی لحاظ سے اُسکو جانوروں پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ ایک اخلاقی حیوان ہے جسکی اخلاقی امداد کے لیئے اُن مادی وسائل سے علیحدہ دیگر وسائل کی ضرورت ہے، جن سے اُسکی جسمانی ترکیب تیار ہوتی ہے۔ انسان کی عقلی اور دماغی قوتیں آہستہ آہستہ ترقی پاتی ہیں اور اس کے لیئے اُسکی اندرونی اور ذاتی کوشش کافی نہیں ہے بلکہ خارجی امداد کی ضرورت ہے۔ بچے جسطرح عمر کی منزلیں بتدریج طے کرتے ہیں اور اُن کے جسم عرض و طول اور قوت میں بڑھ جاتے ہیں اسیطرح آہستہ آہستہ اُن کی عقلی اور دماغی قابلیتیں نشو و نما پاسکتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ انسان اپنی جسمانی ترکیب کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اگر تربیت یافتہ ہو تو گو وہ جسم کے لحاظ سے کمزور ہوگا مگر عقل اور دماغ کے لحاظ سے طاقتور ہوگا اور دیگر مخلوقاتِ عالم کو مسخر کرنے کی قابلیت اُس میں موجود ہوگی۔ تربیت ہی وہ چیز ہے جس سے انسان کامل انسان ہوتا ہے۔ ورنہ اُس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تربیت کے جو اصول اور قواعد ہیں اُن سے بذات خود کوئی آدمی مستفید نہیں ہوسکتا۔ ایک آدمی تربیت کے لیئے دوسرے آدمی کا محتاج ہے۔ اسلیئے جبتک سوسائٹی نہو تربیت ہونی ناممکن ہے۔ سوسائٹی جسقدر عمدہ ہوگی اُسیقدر تربیت بھی عمدہ ہوگی۔ سوسائٹی سے علیحدہ ہوکر تربیت کا خیال کرنا محض وہم و خیال ہے۔ اگرچہ ایسی تربیت انسانی تمدن کے بالکل برخلاف ہے مگر اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ کے بہت سے باشندے اپنی اولاد کو سوسائٹی سے علیحدہ رکھکر تربیت دیتے تھے

[1] حاتم کا دیوان ۱۸۷۲ء میں لندن میں اور ۱۸۸۸ء میں بیروت میں چھپکر شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر روسو جو فرانس کا نامور عالم ہی، اپنے شاگردوں کو سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ رکھتا تھا اور اُن کو تاکید کرتا تھا کہ وہ لوگوں سے میل جول بالکل ترک کردیں۔ ہمارے زمانے میں یورپ کے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہی کہ انسان کی عقل اور دماغ کو بالکل آزادی دی جائے تاکہ وہ دُنیا کی تمام باتوں میں مستقل رائے قائم کرسکے۔ اِس بنا پر بعض علما نے یہ قرار دیا ہی کہ بچوں کی تربیت بالکل آزادانہ ہونی چاہیے۔ کسی خاص مذہب، یا عقیدہ، یا رسم ورواج کو اسمیں داخل کرنا اصلی تربیت کے بالکل برخلاف ہے۔ بچوں کو آزادانہ تربیت دیکر اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی رائے سے جس مذہب، یا عقیدہ، یا رسم ورواج کو چاہیں منظور کریں اور جسکو اپنی اخلاقی طبیعت کے برخلاف سمجھیں، رد کریں۔ مگر علمائے یورپ کا بہت بڑا گروہ اس طرح کی تربیت کا بالکل مخالف ہی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہی کہ بچوں کے دماغ میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ گمراہی اور بداخلاقی کی بھنور میں ڈوب جاتے ہیں اور کسی مذہب کے قائل نہیں رہتے۔ اصلی تربیت وہی ہی جسکی بُنیاد مذہب پر ہو۔ مذہب کے بغیر کوئی اصلی اور سچی تربیت نہیں ہوسکتی۔ وہ لامذہبی کی تربیت کو بڑے پُرزور دلائل سے رد کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی تربیت کو ماننے والا گروہ کہتا ہی کہ مذہب کو بچوں کی تربیت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہی۔ اُن کی تربیت میں صرف تمدن کو دخل دینا چاہیئے تاکہ وہ سوسائٹی میں داخل ہونیکے قابل ہوں۔ دوسری قسم کی تربیت کو ماننے والا گروہ مذہبی تربیت پر زور دیتا ہی اور کہتا ہی کہ مذہب ہی سے انسان کامل انسان ہوتا ہی۔ یہ بات صاف ظاہر ہی کہ دونوں رایوں میں کسقدر کمی اور غلطی ہی۔ کیونکہ جب بچوں کو ہم اسلیئے تیار کرتے ہیں کہ وہ جوان ہوکر سوسائٹی کے روشن خیال اور چست و چالاک ممبر ہوں تو اُن کی تربیت میں مذہب اور تمدن دونوں کا داخل کرنا نہایت ضروری ہی۔ مگر تربیت کے دونوں اجزا ایسے معتدل ہوں اور حالات زندگی کے ایسے موافق ہوں کہ بچے جوان ہوکر اخلاقی اور تمدنی قابلیتوں کے لحاظ سے کامل ہوجائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن مہذب قوموں نے مدرسوں میں بچوں کو تربیت دینا حکومت کا حق ٹھیرایا ہی اور مذہبی علما کے ہاتھ سے یہ اختیار نکال لیا ہی، اُنہوں نے بھی مدرسوں کے انتظام کو ایسی ہیئت مجموعی پر بنانا لازم قرار دیا ہی کہ بچے اپنے والدین کی مرضی کے موافق تمدنی تربیت کے ساتھ مذہبی تربیت حاصل کرسکتے ہیں۔

اِس طریقے سے وہ اُس تعصب سے بچے رہتے ہیں جو اُن بچوں کے دماغوں میں سما جاتا ہی جن کو خالص مذہبی مدارس میں تعلیم دی گئی ہی اور جنکو تعصب اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ جوان ہوکر دُنیا میں کوئی کام کرسکیں یا اپنے تئیں سوسائٹی کے حالات کے موافق بنا سکیں۔ اور اُس گمراہی اور الحاد اور بداخلاقی کی بھنور میں غرق ہونے سے بھی بچ نکلتے ہیں جن میں وہ طلبا اکثر پھنس جاتے ہیں جن کو خالص تمدنی مدرسوں میں تعلیم دیگئی ہی اور جنکو لامذہبی سوسائٹی کے قوانین کی پابندی سے الگ رکھتی ہی اور اُن کو قوم اور ملک کے لیے ایک خطرناک عنصر بنادیتی ہی۔

بچوں کی تربیت ماں باپ کے گھر سے شروع ہوتی ہی جہاں نہ کسی حکومت کو تصرف کرنے کا اختیار ہی۔ نہ حکما کی فلسفیانہ رائیں کچھ کرسکتی ہیں۔ گھر میں ماں باپ ہی کو تربیت کا اختیار ہوتا ہی۔ یہ اختیار کسی جبری قوت پر مبنی نہیں ہی۔ بلکہ اسکی بُنیاد محبت کے اُصولوں پر ہی جو والدین کو بچوں کے ساتھ قدرتی طور پر ہوتی ہی۔

بچہ سب سے پہلے والدین ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پاتا ہی۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اگر والدین بچے کی طبیعت کو آزاد حالت پر چھوڑ دیں تو وہ خود بخود شائستہ ہوجائیگا۔ نہ یہ وہم دل میں لانا چاہیئے کہ بچوں کی طبیعت قدرتی طور سے نیک ہوتی ہی کہ کچھ تجربہ

اسکے برخلاف شہادت پیش کرتا ہی اور ہر شخص جانتا ہی کہ بچے بچپن کی کمزور حالت میں تربیت کے لحاظ سے دوسروں کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش میں کسقدر تکلیفیں جھیلتے ہیں اور انکی تربیت میں کسطرح نرمی اور گرمی سے کام لیتے ہیں تاکہ وہ جوان ہوکر جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے بے عیب ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ جبتک بچوں کو تربیت نہ دیجائے، خود بخود اُن میں عمدہ اوصاف پیدا نہیں ہوسکتے۔ بچّوں کو مذہبی تعلیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ماں باپ کے اخلاق کیسے ہی عمدہ ہوں اور انکی تربیت کے طریقے کیسے ہی پاکیزہ ہوں یہ ممکن نہیں ہی کہ بچّوں کے اخلاق پر اُس سے زیادہ اثر ڈال سکیں جسقدر کہ ماں باپ کا ہوسکتا ہی۔ اگر مذہبی عقائد کی بچّے کو تعلیم دی جائے تو وہ ذرا ہوش سنبھالنے کے بعد یہ سمجھنے لگتا ہی کہ والدین سی بھی زیادہ زبردست قوت اُسپر حکومت کرتی ہی۔ اس سے تربیت کا زور بڑھ جاتا ہی اور وہ ناپاک خیالات اور ناپاک جذبات کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہوجاتا ہی۔ اُسکی طبیعت کی کجی نکل جاتی ہی اور وہ اپنے فرائض کو بخوبی انجام دینے لگتا ہی اور نیکیوں کو ہر وقت اپنے دل کے اندر موجزن پاتا ہی۔ اکثر علما اور حکما اس بات پر متفق ہیں کہ مذہب ہی سب سے قوی ذریعہ تربیت کا ہی۔ جب بچہ گہوارے میں سوتا ہی تو مذہب ہی اُسکو لوری دیتا ہی اور جب وہ جوان ہوکر زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہی تو مذہب ہی اُسکو مبارکباد کہتا ہی۔ پھر ہر قدم پر اُس کے ساتھ رہتا ہی۔ اگر وہ بزدل ہو تو اُسکے دل میں دلیری اور شجاعت کی روح پھونکتا ہی۔ اگر وہ بخیل ہو تو فیاضی کا جوش اُسکی طبیعت میں پیدا کرتا ہی۔ اگر وہ ظالم ہو تو اُسکو انصاف پر مجبور کرتا ہی۔ اگر وہ سنگدل ہو تو اُسکو رحم کرنا سکھاتا ہی۔ وہی اُسکی عقل کو روشن کرتا ہی۔ وہی اُس کے دماغ میں بلند خیالات بھرتا ہی۔ بچّوں کی تربیت میں جن باتوں کا ہونا ضروری ہی اُن میں سے مذہب کسیکو نقصان نہیں پہونچاتا بلکہ ہر حالت میں اُنکی امداد اور اصلاح پر کمربستہ رہتا ہی۔ مذہب کا بڑا مقصد یہی ہی کہ جو شخص اُس کے احکام پر گردن جھکاتا ہی اُسکو دین اور دُنیا میں ترقی کرنے کی قابلیت عطا کرے۔

تعلیم اور تربیت میں یہ فرق ہی کہ جو تعلیم یافتہ ہو وہ ہمیشہ تربیت یافتہ نہیں ہوتا اور جو تربیت یافتہ ہو وہ ہمیشہ تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ تربیت کا کمال یہ ہی کہ اخلاق کے ساتھ علم بھی حاصل کیا جائے اور تعلیم کا کمال یہ ہی کہ علم کے ساتھ اخلاق کی اصلاح کا خیال کیا جائے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہی کہ جو لوگ بچّوں کی تعلیم پر متقرر کئے جائیں وہ عمدہ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوں کیونکہ جسطرح بچّوں کو علوم و فنون کا سکھانا ضروری ہی اسیطرح اُنکی طبیعت میں عمدہ اخلاق کا بیج بونا بھی ضروری ہی۔ مذہبی تربیت ایسی ضروری چیز ہی کہ اگر اس سے بچّوں کے والدین غفلت کریں اور اُن کے سرپرست اُسکو سرسری نظر سے دیکھیں تو اُن سے قومی مواخذہ ہوسکتا ہی۔ اس مسئلے پر بہت دنوں تک مباحثہ ہوتا رہا ہی کہ بچّوں کو گھر میں تربیت دینا اچھا ہی یا مدرسوں میں۔ مگر اصلی حقیقت یہ ہی کہ اگر گھر پر کامل طور سے بچّوں کی تربیت ہوسکتی ہو تو مدرسے کی تربیت سے کہیں افضل ہی لیکن ہر گھر میں عمدہ تربیت کا سامان مہیّا نہیں ہی اسلیئے ضرور ہی کہ بچّوں کو مدرسوں میں بھیجا جائے تاکہ وہ ایسی تربیت حاصل کریں جو اُن کے لیئے مفید ہو اور جو اُن کے والدین کے مذہب اور مشرب کے موافق ہو۔ مدرسوں کے طریقۂ تعلیم و تربیت میں اسقدر اختلاف ہی کہ والدین اپنی اولاد کو جب تعلیم و تربیت دینے پر آمادہ ہوتے ہیں تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس غرض کے لیئے کس مدرسے کو انتخاب کریں جس میں تعلیم پاکر وہ دُنیا کمانے میں

بھی کامیاب ہوں اور سوسائٹی میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور جو فرائض خاندان اور قوم اور ملک کے اُن کے ذمہ ہیں اُن کو پورا کریں۔ عمدہ اور اعلیٰ مدارس وہ ہیں جو بچوں کو عمدہ تربیت دے سکیں۔ اُن کے دماغوں کو معلومات کی روشنی سے منوّر کر سکیں اُن کی عادات وخصائل کو پاکیزہ اور شایستہ بنا سکیں۔ اور اُن میں ایسی قابلیت پیدا کر سکیں کہ جب جوان ہو کر وہ سوسائٹی میں داخل ہوں تو اُن خرابیوں۔ تباہیوں بداخلاقیوں اور گمراہیوں کے دور کرنے کی طاقت رکھتے ہوں جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بداخلاقیوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہمیشہ انسان کی بُری خلقت نہیں ہوتی بلکہ اکثر وہ بُری تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پس جہاں کہیں تربیت عمدہ ہوگی اور علم واخلاق پر برابر توجہ مبذول ہوگی وہاں امن وامان پھیل جائے گا۔ اور ہر قسم کی ترقی کے دروازے کُھل جائینگے۔ اور جہاں کہیں تربیت ناقص اور خراب ہوگی اور بدیوں اور گناہوں کے دفعیہ کی کوشش نہیں کی جائیگی وہاں فتنہ وفساد برپا ہوگا اور جہالت اور تباہی کا طوفان چھا جائیگا۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ قوموں کی پستی اور بلندی تربیت کے ناقص، یا کامل ہونے پر موقوف ہی اور ملکوں کی خوش قسمتی، یا بدبختی اس بات میں منحصر ہی کہ اُن کے باشندوں کے اخلاق شایستہ ہیں، یا نامہذب اور خراب ہیں۔ خاندانوں کا بھی یہی حال ہی جس خاندان کا تنزّل ہوتا ہی اور جسپر مصیبت اور افلاس کا ابر گھِر آتا ہی اُسکی اخلاقی اور مالی تباہی کا باعث غالبًا یہی ہوتا ہی کہ اُسمیں بچوں کی تربیت سے بے پروائی کیگئی ہی۔ جب بچے سُستی اور کاہلی کی حالت میں پرورش پاتے ہیں تو وہ گویا بدقسمتی کے لیئے تیار کیئے جاتے ہیں کیونکہ عیش پرستی اور ناتربیت یافتگی کا اثر ہمیشہ یہ ہوتا ہی کہ جوانمردی اور غیرت کی خاصیت اُڑجاتی ہی جب ایسے بچے جوان ہوتے ہیں اور اُن کے روزی کمانے اور دنیوی کاروبار میں قدم رکھنے کا وقت آتا ہی تو سُستی اور کاہلی اور عیش پسندی کے سبب سے اُن میں جرأت اور دلیری نام کو نہیں ہوتی اور وہ دُنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ نہ اُن میں چُستی اور پھُرتی اور جفاکشی ہوتی ہی جو دُنیا میں کام کرنے کے لیئے ضروریات سے ہے۔ وہ اکثر باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت کو برباد کردیتے ہیں اور افلاس اور ذلت کے گڑھے میں ڈھکیل دیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اپنے بچوں کی تندرستی کا رات دن خیال رکھتے ہیں اور اُنکی خوشیوں اور اُمنگوں کے پورا کرنے میں فیاضی سے کام لیتے ہیں مگر اُنکی طبیعت کو عمدہ اخلاق سے آراستہ نہیں کرتے اور ایسے وسائل اختیار نہیں کرتے جن سے آئیندہ زمانے میں اُنکی حالت درست ہو اور وہ سچّی خوشی حاصل کرسکیں۔ تربیت پانے کا کام اُنھیں پر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اسکا نتیجہ نہایت خطرناک ہی اور وہ بغیر عمدہ تربیت کے کبھی خوشحال اور فارغ البال نہیں رہ سکتے۔

عمدہ تربیت وہ چیز ہی جو ہمیشہ دُنیا کی قوموں اور ملکوں میں انسانی ترقی اور کامیابی کا اعلیٰ ذریعہ رہی ہی۔ تربیت یافتہ انسان نیکیوں کو پسند کرتا ہی۔ کام کرنے سے جی نہیں چُراتا۔ اعتدال کا خوگر ہوتا ہی۔ اُس کے دماغ پر اوہام کی حکومت نہیں ہوتی۔ اُس کے دل میں ناپاک جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ حسد اور بغض سے دُور بھاگتا ہی جوانمردی اور غیرت کا عادی ہوتا ہی۔ اُسکا شیوہ راستبازی اور راست گوئی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُسکا جسم پرہیزگاری کی روح سے بھر جاتا ہی۔ وہ اپنے خاندان کے لیئے سرمایۂ ناز اور اپنی قوم کے لیئے باعث افتخار ہوتا ہی۔ وہ تربیت جسکا ہم نے ذکر کیا، لڑکوں کے لیئے مخصوص نہیں ہی۔ بلکہ اسمیں لڑکیاں بھی شامل

ہیں اور بالآخر کل قوم کے لیئے ضروری ہی۔ اسی تربیت پر ملکوں کی تہذیب اور قوموں کی ترقی کی بنیاد ہی اور اگر یہ نہو تو نہایت بدبختی اور تنزل کی علامت ہی۔ ہندوستان کے سرکاری مدارس میں جو ہندو اور مسلمان بچوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہی اگر اُسکے اجزا تحلیل کیئے جائیں تو معلوم ہوتا ہی کہ اس میں ایک حصہ جسمانی ورزش کا ہی اور ایک حصہ عقلی تعلیم کا ہی۔ مذہب اور اخلاق کی تعلیم ہندو، یا مسلمانوں کے طریقے پر کسی مدرسے میں نہیں دی جاتی۔ اسلیئے سخت ضرورت اس بات کی ہی کہ ہر قوم اپنے طریقے پر مذہب و اخلاق کی تعلیم دینے کے لیئے قومی مدارس قائم کرے۔ ہندو مدارس کا حال ہمکو معلوم نہیں ہی مگر اسلامی مدارس جو اسوقت قائم ہیں اُن کی حالت دیکھنے کے بعد ہمکو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہی کہ اُن میں تہذیب اخلاق اور تربیت کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور مذہبی تعلیم کیطرف سے بے پروائی کی جاتی ہی۔ بچوں کے والدین کو یہ توقع ہونی چاہیئے اور ہی کہ اُن کے بچے قومی مدارس میں تعلیم پاکر انسان بھی بن جاینگے اور مسلمان بھی۔ مگر افسوس ہی کہ نہ اُن میں انسان بنانے کا سامان ہی، نہ مسلمان بنانے کا۔ کاش ہماری قوم کے وہ لوگ جو ریفارمر کے لقب سے پکارے جاتے ہیں، اس خطرناک کمی کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کریں اور محض نمایشی تقریروں اور رنگ آمیز تحریروں سے کام نہ لیں۔ اخلاقی اور مذہبی تربیت کی نگرانی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہی جبتک پوری توجہ اُسپر نہ کی جائیگی ممکن نہیں ہی کہ کوئی عمدہ نتیجہ برآمد ہو۔ ہم چند اُمور کو اس موقع پر لکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جن کی طرف اگر توجہ کی جائے گی تو ہمارے قومی مدارس کی تعلیم و تربیت سے فی الحقیقت مسلمان بچوں کی حالت نہایت عمدہ اور شایستہ ہو جائیگی۔ اور وہ جوان ہوکر قومی ترقی کے عَلَم بردار ہونگے۔ وہ امور حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسلمان بچوں کی تعلیم ایسے معلموں کے ہاتھ میں دی جائے جن کا چال چلن خراب نہ ہو۔

(۲) مسلمان بچوں کے اخلاق کی نگرانی ایسے اُستادوں کو سپرد کی جائے جن کا چال چلن نہایت پاکیزہ اور عمدہ ہو۔

(۳) مسلمان بچوں کی مذہبی تربیت پر ایسے عالم مقرر کیئے جائیں جو دل سے مذہب کو مانتے ہوں اور جو مذہبی زندگی کا نمونہ ہوں اور جن کی نصیحت دلنشین ہو۔

(۴) مسلمان بچوں کو بعض اوقات جمع کرکے ایسے مسلمانوں سے مذہب اور اخلاق پر لکچر دلوائے جائیں جو مذہب و اخلاق کے صرف عالم ہی نہ ہوں بلکہ عامل بھی ہوں۔ اور جن کی تقریر مؤثر ہو۔

(۵) مسلمان بچوں کی مذہبی اور اخلاقی درستی اور اُسکی ترقی پر انعام مقرر کیئے جائیں تاکہ عمدہ نظیر کے دیکھنے سے اور بچوں کو مذہب اور اخلاق میں ترقی کرنے کی ترغیب ہو۔

(۶) مسلمان بچوں کو بداخلاقی اور ناشایستگی سے محفوظ رکھنے کے لیئے ایسے بچوں کو جنکے فاسد اخلاق اصلاح پذیر نہ ہوں اور ایسے معلموں کو جنکا چال چلن خراب ہو، قومی مدارس سے فی الفور خارج کیا جائے

(۷) مسلمان بچوں کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیئے ایسی کتابیں تصنیف کرائی جائیں جن میں خالص مذہبی عقائد اور مذہبی اخلاق پر بہت سے مضامین درج ہوں۔ ان کتابوں کی زبان سلیس اور دلکش ہو اور طرز بیان ایسا دلچسپ ہو کہ اُن کی پڑھنے سے بچوں کی طبیعت نہ گھبرائے اور اُن کی نصیحتیں دلوں پر خود بخود منقش ہو جائیں۔

(ایک لبرل مسلمان)

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران | حاجی محمد اسمعیل خاں
| مولوی وحید الدین سلیم

جلد ۲	یکم اپریل سن۹ع	نمبر ۱
قیمت سالانہ مع محصولڈاک للعہ	قیمت فی پرچہ نمونہ مع محصولڈاک ۵	

جدید کتابیں

(۱) رسالہ تعلیم و تربیت (۲) [illegible] الاسلام فی مطابقۃ [illegible] الاحکام

مقامِ اشاعت۔ دفتر معارف۔ علی گڈہ

مطبعِ فیضِ عام واقع علی گڈہ میں چھپا

مقاصد و قواعد

۱ - یہ دو جزو کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علی گڈہ سے شائع ہوا کریگا۔

۲ - اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اسکے ذریعہ سے اُردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اسمیں ہر قسم کے علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی۔ عربی اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کئے جائیں تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳ - یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچہ میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کریںگے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کئے جائینگے۔

۴ - بالفعل اس رسالہ کے دو اڈیٹر قرار دیئے گئے ہیں۔

ا - حاجی محمد اسمٰعیل خان

ب - مولوی وحید الدین سلیم

۵ - ہمارے ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشاپردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے گرانبہا مضامین سے ہماری مدد کریں جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں۔ اگر مہربانی سے وہ خود یا اُنکے احباب اُن کے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُنکی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس فرض رسالہ کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہنچائیں جو صاحب ہمارے کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام بلا اجازت ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

ہو جا

۶ - اس رسالہ کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپے ہے جو نقد قیمت بھیجیں یا ویلیو پے ایبل کی درخواست کریں رسالہ خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ ششماہی یا کم کی درخواست منظور نہ ہوگی۔ نمونے کے پرچے کے لیئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کیجائیگی۔ اور قیمت رسالہ کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی۔ رسالہ کے متعلق تمام خط و کتابت دفتر معارف علیگڈہ کے پتے سے مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیے اور اُن ہی کے نام قیمت آنی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لیئے آدہ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷ - جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں اُنسے اُمید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور نشان اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸ - حضرات خریداران معارف سے اُمید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً رسالے کی تاریخ اشاعت سے پہلے دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہینگے۔

۹ - اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہوجائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا۔ ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰ - جو حضرات معارف کے لیے مضامین مرحمت فرمائیں وہ خوشخط اور صاف لکھکر بھیجیں تاکہ چھپنے میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

نمبر ۱۰	یکم اپریل سنہ ۱۹۰۶ء	جلد ۲

چین اور چینی

چین کی سلطنت منجملہ اون سلطنتوں کے ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ سب سے زیادہ پُرانی ہے اور مردم شماری میں بھی سب سے زیادہ ہے۔ اہل چین اپنے ملک کو "سلطنت متوسط" بایں گمان کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ یہ ملک جنوبی مشرقی حصہ ایشیا میں ہے اور ہندوستان وسط میں اور ملک عرب جنوب مغرب ایشیا میں ہے۔ اگر ہندوستان میں شمال کی طرف ہم مُنہ کر کے کھڑے ہوں تو چین بجانب راست اور عرب بجانب پچھم رہیگا۔ چین کا قدیم نام سینیم معلوم ہوتا ہے اور انجیل میں اسطرح آیا ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دو سو پچاس برس قبل حضرت عیسیٰ کے چن ([illegible]) نامی ایک سردار تھا جو سب [illegible] ب آگیا تھا۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ نام چین سلطنت [illegible] یلیز کے اُسی سردار کے نام سے مشتق ہوا ہے کیونکہ اہل [illegible] حروف ([illegible]) کی ۔ ایس کوشل ([illegible]) تی ایچ یعنی (چ) کے استعمال کرتے ہیں۔ اہل چین خود لفظ چین کا استعمال نہیں کرتے ۔

وسعت چین کی سلطنت سے چند مرتبہ زیادہ ہندوستان سے ہے۔ اس میں چین خاص۔ تبت اور بڑے قطعات تاتار کے شامل ہیں۔ خاص ملک چین ہندوستان کے برابر ہے اور اوس کی وسعت پندرہ لاکھ میل مربع ہے۔ چین کی مردم شماری ٹھیک معلوم نہیں مگر ۴۰ کروڑ خیال کیجاتی ہے۔ ہندوستان کی ۲۵ کروڑ ہے۔ باقی حصہ سلطنت میں قریب چھ کروڑ کے باشندے ہیں۔ چین کی آبادی کل دنیا کی آبادی کی چہارم ہے

قدرتی حصہ ہائے ملک ایک کثیر حصہ ملک چین کا دریاؤں کی گھاٹیوں اور بلند زمینوں سے گھرا ہوا ہے۔ ملک کا ڈھال تبت کے پہاڑوں کی طرف سے بحر الکاہل کی طرف ہے۔ دو بڑے بڑے دریا جو گنگا سے دو چند طوالت رکھتے ہیں تبت کے پہاڑوں سے نکل کر بحر الکاہل میں گرتے ہیں۔ اُن کا بہاؤ مشرق کی طرف ہے جو دریا ان میں سے بجانب شمال ہے اُس کا نام ہونگ ہو یعنی دریائے اصفر ہے اور اس کا نام غم چین بھی لیتے ہیں کیونکہ

بوجہ بدل جانے دھار کے ایک مرتبہ اِس دریا سے بڑا نقصان مال اور جان کا ہوا تھا اور یہ پایاب ہی۔ جنوبی دریا کا نام ٹیسی ہی وہ عمیق اور صدہا میل تک قابل جہاز رانی ہے۔ پی ہو شمال میں اور چوکنگ جنوب میں واقع ہیں اور آخرالذکر کے دہانہ پر شہر کینٹن (ایک آباد قصبہ) واقع ہے ◆

آب و ہوا | کُل ملک چین بہ استثنا ایک تھوڑے سے حصّہ جنوب کے منطقہ معتدلہ شمالی میں واقع ہی۔ گرمی بڑی شدت کی پڑتی ہے اور کبھی سخت طوفان اور آندھیاں بھی آتی ہیں۔ شمال میں سردی زیادہ ہوتی ہی اور دریائے پی ہو ہر سال قریباً تین مہینے تک جما ہوا رہتا ہے ◆

معدنیات | تمام معمولی فلزات چین میں ملتے ہیں چین بالخصوص اُس سفید مٹی کے واسطے مشہور ہے جس سے چینی برتن بنائے جاتے ہیں۔ کوئلہ کی کانیں بھی چین میں ہیں مگر اُن سے کوئلہ نہیں نکالا جاتا تھا کیونکہ چینیوں کا خیال ہی کہ زمین کھودنے سے مُردوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اب کوئلہ نکالنا شروع ہو گیا ہے ◆

غلہ وغیرہ | دریائے ٹیسی کے جنوب میں چانول زیادہ ہوتا ہی۔ اور شمال میں گیہوں اور دیگر ہندوستانی اجناس ہوتی ہیں۔ چاء کا درخت سب سے زیادہ مشہور پیداوار چین کی ہی۔ ریشمی کیڑوں کی پرورش کے واسطے شہتوت کے درخت بکثرت بوئے جاتے ہیں چین کے بانس بہ نسبت اُس کی معدنیات کے زیادہ تر فائدہ بخش ہیں اور بعد چانول و ریشم کے سب سے زیادہ آمدنی بانس کی ہوتی ہے۔ ٹالو دچربی کا درخت ۔ وارنش اور کاغذ کے درخت بھی قیمتی ہوتے ہیں۔ ناریل اور کھجور کے درخت بھی جنوب میں ہوتے ہیں ◆

جانور | چین کی آبادی اِس قدر گنجان ہی کہ باستثنائے مغربی حصّہ کے وہاں درندے بہت کم ہیں۔ مویشی اور گھوڑے پستہ قد اور بہ نسبت دیگر ملکوں کے کم ہیں۔ بھینسا جس کو چینی دریائی بیل کہتے ہیں مثل ہندوستان کے بڑا نہیں ہوتا۔ اہل چین بطیں (بطخیں) بکثرت پالتے ہیں بعض جھیلوں اور تالابوں میں چار چار ہزار بطیں پلی ہوتی ہیں۔ ایک چھوٹی کشتی میں لڑکے بیٹھے ہوئے نگہبانی کیا کرتے ہیں۔ گرم ریت صندوقوں میں بھر کر بطوں کی انڈے اون میں رکھدیا کرتے ہیں۔ اور ایک خاص مدت کے بعد بچے نکل آتے ہیں۔ اِن بچوں کو اوّلاً چانول وغیرہ کھلاتے ہیں۔ اور یہ بچے اور دیگر بطیں جھیل میں پڑے رہتے ہیں اور شام کے وقت مالک آنکھ سیٹی بجاتا ہی اور یہ شام کا کھانا کھانے کے واسطے فوراً باہر نکل آتے ہیں بطوں کی تجارت کثیر ہوتی ہے اور سُکھا کر دو تختوں کے بیچ میں دباکر یہ دور دور حصّہ ملک میں بغرض فروخت کے بھیجی جاتی ہیں۔ مچھلیاں بھی بکثرت پالی جاتی ہیں۔ اور اِس قسم کی مچھلیوں سے تالاب اکثر بھرے رہتے ہیں۔ اور اِن کی آمدنی غلہ کی آمدنی سے کم نہیں ہے۔ ایک خاص قسم کی مچھلی چین میں ہوتی ہے اور اُس کی پیداوار حیرت انگیز افراط سے ہوتی ہی۔ ہر مہینے میں دو مچھول بچوں کے اُس سے نکلتے ہیں اور اُن کی قیمت ایک آنہ فی سیر سے لیکر ۹ر فی سیر تک ہوتی ہے۔ سنہری اور روپہلی مچھلیاں بھی ابتداً چین سے لائی گئی تھیں۔ مور اور مُرغیاں بھی بکثرت پالتے ہیں اور عام غذا ملک میں سور کا گوشت بھی ہی۔ ایک خاص قسم کے کتّوں کا گوشت بھی سُکھایا جاتا ہی اور غربا کی خوراک میں کام آتا ہی۔ بھیڑ بکریاں بھی خوراک میں اکثر کام آتی ہیں۔ خوبصورت مرغ زریں بھی جنگل میں ملتا ہی

تاریخ | چین میں صرف تین قسم کے لوگ آباد ہیں ۱ قدیم واصلی باشندگان ملک ۲ ابار جینیز یعنی چینی۔ اور ۳ منچو تاتاری۔ اہل چین اپنی ملکی تاریخ کی بنا ایک شخص مسمی فین کو کے زمانہ سے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فینکو مذکور کے زمانہ میں آسمان اور زمین اوّلاً جدا ہوئے اور اُس کے تین نسلیں پچاس ہزار برس تک حکمران رہیں مگر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ چینی جنوبی حصّہ بحر کا سپین

۷۵۰ برس قبل حضرت عیسیٰ کے آئے اور اپنے ساتھ علم تحریر و نجوم جو غالباً اونہوں نے اہل بابل سے حاصل کیا تھا لائے۔ سب سے پہلے تاریخی اور معتبر شہادت جو چینیوں کی آمد اور شمال مشرقی صوبجات چین میں آباد ہونیکے اور اصلی باشندگان ملک پر غالب آنے کی پائی جاتی ہے وہ ۷۲۱ برس قبل سن عیسوی کی ہے۔ ابتدائی آمد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ڈھائی ہزار برس قبل سن عیسوی ہوئی ہے۔ حکومت کی ابتدائی صورت طوائف الملوکی تھی۔ ۲۵۵ برس قبل سن عیسوی خاندان چن سب پر غالب آیا اور ہانگٹی ([illegible]) جو ۲۴۶ برس قبل سن عیسوی تخت نشین ہوا۔ اولین شہنشاہ ملک چین خیال کیا جاتا ہے۔ اوس کی بعض تجاویز اور تبدیلیاں عوام نے پسند نہیں کیں۔ اور اُس نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ سوائے اون کتابوں کے جو متعلق زراعت، طب اور مذہب کے ہوں جملہ موجودہ کتب ہر قسم کی جلادی جائیں۔ چونکہ اہل تاتار ملک پر اکثر حملہ آور ہوتے تھے لہذا ایک بہت بڑی دیوار سرحد پر اوس نے بنوائی شروع کی۔ سنہ ۱۲۰۹ء میں اِس نے مغربی تاتاریوں (قوم منگول) کو اپنی مدد کے واسطے بُلایا تاکہ وہ شمالی تاتاریوں یعنی منچوز کو ملک سے خارج کریں لیکن مدد کرنے کے بجائے منگول خود بادشاہ ہو گئے اور یہ اولین غیر قوم تھی جس نے چین میں سلطنت پائی۔ لیکن سنہ ۱۳۶۸ء میں چینیوں نے اون کو نکالدیا اور ایک نسل مسمّیٰ مینگ اُسی ملک کی حکمران ہو گئی جس نے ۲۷۶ برس تک حکومت کی اسکے بعد ایک غاصب کو نکالنے کی غرض سے قوم منچوز کی مدد کی ضرورت ہوئی اور منچوؤں نے اوس غاصب کو نکالکر پیکن پر خود قبضہ کر لیا۔ پھر کل ملک پر بادشاہت ہو گئی فی الحال خاندان منچو حکمران ہے۔ اور گذشتہ چار ہزار برس میں مختلف اٹھائیس خاندان چین میں حکمران ہوچکے ہیں۔ اہل چین ایک شاخ زرد نسل کے ہیں اور اسی شاخ میں منجملہ تمام زرد نسل کے تہذیب و شائستگی سب سے

اوّل پھیلی تھی اِس شاخ کی علامات حسب ذیل ہیں:۔ اِن کے چہرہ کا وہ حصہ جو آنکھوں کے نیچے ہوتا ہے علی العموم چوڑا اور پھیلا ہوتا ہے اور اون کے رخساروں کی ہڈی اوٹھی ہوئی ہوتی ہے اور اون کی آنکھوں کی نشست و بناوٹ خمدار ہے۔ علی العموم اون کی علامات مثل نسل منگول کے ہوتی ہیں۔ یعنی اون کا چہرہ چوڑا اور گُڈول رخساروں کی ہڈی اُبھری ہوئی۔ بھاری کلا۔ بانسا ناک کا چپٹا۔ فراخ نتھنے۔ ترچھی آنکھیں۔ سیدھے اور گنجان بال جنکا رنگ سیاہ مائل بہ خاکی گونہ سرخی لئے ہوئے۔ موٹے ابرو کچّی ڈاڑھی۔ رنگ بدن سرخ مائل بہ زردی۔ یہ شاخ خاصکر اوس وسیع سلطنت میں آباد ہے جس کو چین کہتے ہیں۔ بلکہ چین کے اوس طرف بھی آباد ہے۔ بہت لوگ اِن میں سے جزیرہ فیلپاین اور جزائر اسٹریٹس میں آباد ہیں سنہ ۱۶۴۴ء تک اہل چین اپنے سر کے سب بال بڑھے ہوئے رکھتے تھے اور اون کا جُوڑا بناکر سر پر باندھ لیتے تھے۔ منچوؤں نے اون کے مُنڈانے کا حکم دیا اور صرف تھوڑے سے بال بطور چُٹیا کے رہنے دیئے۔ عرصہ تک اہل چین اِس حکم کی تعمیل پر راضی نہ ہوئے مگر بالآخر سب مطیع ہوگئے۔ یہ چوٹی بڑی ہوشیاری سے گوندھی جاتی ہے اور پیٹ کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اور اوسکو پگ ٹیل۔ (سُور کی دُم) کہتے ہیں۔ بڑی دُم کا بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ اگر بال کم ہوں تو ریشم یا دوسری چیز ملاکر چوٹی کو بڑھاتے ہیں۔ وہاں کی عام گالی یہ ہے کہ کسی سے چھوٹی دُم والا کہا جائے۔ شریر لڑکے ایک دوسرے کی چُٹیا باخود باندھ دیا کرتے ہیں۔ جب کوئی مزدور کام کرتا ہے تو چوٹی کو سر سے لپیٹ لیتا ہے۔ اہل چین بہت جاہل اور شگونی ہوتے ہیں۔ اون کا اعتقاد ہے کہ کاغذ کے آدمی جو اِدھر اودھر اُڑتے ہیں چوٹی کاٹ لیجاتے ہیں۔ اِس واسطے اہل چین شب کو اکٹھے ہوکر نکلتے ہیں اور [illegible] بجاتے جاتے ہیں تاکہ یہ کاغذی آدمی بھاگ

جائیں۔ اہل چین کا عقیدہ ہی کہ عیسائی مچھلی والے یہ کاغذی آدمی بھیجا کرتے ہیں، چنانچہ اسی خیال سے اُنھوں نے اُن مچھلی والوں کو قتل کر ڈالا۔ اِسی قسم کا الزام عیسائی مشنریوں پر بھی لگایا جاتا ہی۔ مگر علمائے چین ایک قسم کا سفوف بیچتے ہیں اور یہ سفوف چوٹی میں اِسی غرض سے رکھا جاتا ہے کہ کاغذی آدمی بھاگ جائیں *

عورتوں کے پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں کسی اہل چین کی شادی میں یہ سوال نہیں ہوتا کہ دولھن نیک ہوشیار یا خوبصورت ہی بلکہ اوس کے پاؤں کی درازی پوچھی جاتی ہے۔ سب سے بڑا حُسن یہ ہے کہ پاؤں کی درازی ۔ تین انچ ہو۔ ایسے پاؤں کو اہل چین طلائی گل سوسن کہتے ہیں۔ جو عورت اوسط درجہ کی معزز ہو اگر اوس کے پاؤں چھوٹے نہ کئے جائیں تو وہ اپنے آپ کو ذلیل خیال کرے گی اور اوسکو شوہر ملنے میں بھی دشواری ہوگی۔ پاؤں اِس غرض سے چھوٹے کئے جاتے ہیں کہ وہ خوشنما ہو جائیں۔ ایک پانچ چھ برس والی لڑکی کے پاؤں کے انگوٹھے کو جھکا کر چاروں اونگلیوں کے نیچے کر دیتے ہیں اور پھر ان انگلیوں کو معہ اوس انگوٹھے کے مڑور کر تلوے کے نیچے کر دیتے ہیں اور کپڑے کی پٹیاں خوب کھینچکر باندھتے ہیں اور ایڑی کیطرف سِلائی کر دیتے ہیں۔ یہ بند ماہ بماہ کھینچے اور کسے جاتے ہیں۔ ایک سال تک بچے کو بڑی تکلیف رہتی ہے۔ گرمیوں میں وہ بیقرار اور مبتلائے بخار رہتا ہے۔ جاڑے میں وہ پاؤں پر کپڑا نہیں ڈال سکتا۔ مبادا پاؤں میں گرمی پہنچنے سے تکلیف زیادہ ہو جائے۔ بعض اوقات کسی کسی لڑکی کی اِس مصیبت میں ایک دو انگلیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مگر اِس کمی سے اوسکی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کوئی ماں خود کیسی ہی تکلیف میں بوقت پاؤں چھوٹے کئے جانے کے مبتلا کیوں نہوئی ہو مگر وہ اپنے بچے کو اِس تکلیف سے نہ بچائے گی۔ کیونکہ جب کبھی کسی لڑکی کے پاؤں چھوٹے رکھتے ہیں تو اوس کی ماں کے حسن لیاقت کی تعریف کرتے ہیں جب لڑکی بڑھجاتی ہے تو اوس کے پاؤں کی شکل بند مٹھی کی مانند ہو جاتی ہے۔ اور اون سے بمشکل چلا جاتا ہے۔ جب وہ چاہتی ہے تو کود کود کر چلتی ہے اور چلتے وقت بغرض قایم و مساوی رکھنے اپنے بوجھ کے دونوں ہاتھ پھیلا لیتی ہے۔ مگر اہل تاتار اور چین کی لیڈیاں جو ملکۂ چین کی خدمت میں رہتی ہیں۔ اور نیز اون افسرونکی بیویاں جو دار السلطنت میں رہتی ہیں، اپنے پاؤں کو مڑورنے اور چھوٹا کرنے کی غرض سے اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتی ہیں کہ ایک قسم کی جوتیاں استعمال کریں جنکی وجہ سے چلنا از حد دشوار ہو جائے۔

دوسری بات جو علی الاتفاق عورتوں میں باعث خوبصورتی خیال کیجاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھ کی اُنگلیوں کے ناخن بہت بڑے بڑے رکھتی ہیں اور بایں خوف کہ وہ ٹوٹ نہ جائیں، اون پر چاندی کے خول چڑھا لیتی ہیں۔ اور یہ خول کان کھجانے کا بھی کام دیتے ہیں چینی مثل ہنود کے مطابق رسم و رواج کے کام کرتے ہیں۔ گو وہ کسی طرح کا بُرا اور خلاف عقل کیوں نہ ہو۔

پوشش چینیوں کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہی۔ گرمیوں میں مزدور لوگ ایک سوتی ڈھیلا پائجامہ اور ایک ڈھیلی مرزائی پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں اون میں روئی بھر لیتے ہیں۔ شمال میں بھیڑ کی کھال کے کپڑے بناتے ہیں۔ اُمرا موسم گرما میں ریشم کے کپڑے اور جاڑوں میں اون یا سمور کے کپڑے پہنتے ہیں۔ یہ لوگ بعض اوقات ایک لمبا چغہ پہنتے ہیں، جو اوپر سے ٹخنوں تک آتا ہے اور کمر پر کسا ہوا ہوتا ہے۔ اِس کی آستینیں ڈھیلی ہوتی ہیں اور اُن میں ہاتھ چھپانیکا آرام ملتا ہے اور بطور جیب کے بھی کام آتی ہیں۔ امتحانات میں بعض چینی طلبا چھوٹی چھوٹی کتابیں چھپا کر اِن آستینوں میں رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ چینی کے افسر کو اہل یورپ منڈرین کہتے ہیں لفظ منڈرین ایک لفظ سنسکرت سے مشتق خیال کیا جاتا ہے

جس کے معنے شیر کے ہیں۔ افسروں کے دو فرقے ہیں ایک مالی۔ دوسرے جنگی اور مختلف تمغوں سے اون کی شناخت ہوتی ہے۔ مالی حکام کی شناخت یہ ہے کہ سینہ اور پشت پہ اون کے لباس کی پرندکی تصویر ہوتی ہے اور جنگی افسروں کی تصویر درندوں کی ہوتی ہے اور بغرض تمیز زائد خاص قسم کے بٹن ٹوپیوں میں لگائے جاتے ہیں اور اسی طرح بوٹ یعنی جوتے استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ٹوپی میں ایک موتی لگا ہوتا ہے اور اوس کا لباس بالکل سادہ ہوتا ہے۔ گورنمنٹ یہ حکم جاری کیا کرتی ہے کہ فلاں تاریخ گرمی یا جاڑوں کے کپڑے پہننے شروع ہوں۔ جن مزدوروں کو بارش میں کام کرنا پڑتا ہے اون کا برساتی لباس جدا ہے اور وہ ایک قسم کی لمبی گھاس کا بنایا جاتا ہے۔ افسروں کی بیویاں بھی اپنے لباس میں وہ نشانی لگاتی ہیں جو اون کے شوہر لگاتے ہیں اور عورتوں کا لباس مشابہ مردوں کے ہے۔ سر گوندھنے کی ترکیب قریباً ہر صوبہ میں جداگانہ ہے۔ اکثر حصوں میں اصلی یا مصنوعی پھول بغرض آرائش سر میں لگائے جاتے ہیں اس خیال سے کہ بال خراب نہ ہو جائیں، بغرض پابندی وضع عورتیں بوقت سونے کے ایک بانس کا تکیہ اپنی گردن کے نیچے رکھتی ہیں اور بال کسی چیز سے لگنے نہیں پاتے۔ چین کی عورتیں مختلف قسم کے سفید و سرخ رنگوں سے اپنے چہرونکو آلودہ کر لیتی ہیں مگر یہ عورتیں اپنی اصلی حالت میں نہایت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں +

غذا چانول عام طور پر کھایا جاتا ہے مگر شمالی غربا کو میسر نہیں آتا۔ وہاں جوار رائج ہے۔ چانول کو ترکاری پھل یا گوشت کے ساتھ حسب حالت خاندان کے کھاتے ہیں۔ اور جو لوگ تناسخ کے معتقد ہیں وہ گوشت اس وجہ سے نہیں کھاتے کہ مبادا کسی رشتہ دار کی روح کسی جانور کے قالب میں آگئی ہو۔ لیکن عام وجہ ترجیح ترکاری یا پھل کی یہ ہے کہ یہ دونوں ارزاں ہیں۔ میز کے بیچ میں ایک بڑا برتن گرم خشکہ کا رکھا رہتا ہے اور اُس کے ہر چہار طرف چھوٹے برتنوں میں گوشت پھل یا ترکاری رکھی جاتی ہے۔ ہر کھانیوالا اپنا برتن اُٹھاتا ہے اور بقدر ضرورت اولاً چانول اور بعدہٗ دیگر چیزیں لیکر برتن کو اپنی ٹھوڑی کے قریب لیجاتا ہے اور بذریعہ دو لکڑیوں کے کھانے کو اپنے منہ میں جلد جلد ڈھکیل دیتا ہے اور اوپر سے گرم پانی یا چا پی جاتا ہے۔ چینی ٹھنڈا پانی اس خوف سے نہیں پیتے کہ اوس کے پینے سے بخار آجاتا ہے۔ اگر صاف ہو تو ٹھنڈا پانی بھی صحت کو مضر نہیں۔ چینیوں کو بخار بہت کم آتا ہے اور اوس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف چا یا اوبلا ہوا پانی پیتے ہیں۔ اگر یہ تجویز ہندوستان کے اون اضلاع میں جنمیں بخار بکثرت رہتا ہے جاری ہو جائے تو موتیں کم واقع ہوں۔ سیاہ کتے اور سیاہ بلی کا گوشت بہتر سمجھا جاتا ہے اور ہر سال آغاز گرما میں ایک خاص دن جنوبی چین میں کتے کا گوشت بطور شگون کھایا جاتا ہے، تاکہ بیماری نہ آئے۔ مینڈک اور ٹڈیاں بھی کھائی جاتی ہیں۔ گائے کا دودھ نہیں پیتے ہیں مگر بعض بعض بیماریوں میں عورتوں کا دودھ دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی کھانا ایک قسم کا شوربا ہوتا ہے جو اُس جانور کے گھونسلے کا بناتے ہیں جو بشکل ابابیل کے ہوتا ہے۔ یہ گھونسلے سونے کے ہم وزن فروخت ہوتے ہیں۔ چا کا رواج بکثرت ہے اور بغیر دودھ یا شکر کے پی جاتی ہے۔ چا کی چند پتیاں پیالی میں ڈال دی جاتی ہیں اور اوپر سے گرم پانی بھر دیتے ہیں اور اوس کے مُنہ کو تھوڑی دیر ڈھکنے کے بعد پی جاتے ہیں۔ چا کی دوکانات چین میں اوس کثرت سے ہیں جس طرح یورپ میں قہوہ خانے ہیں۔ جس وقت تم کسی کے گھر جاؤ وہ فوراً چا پیش کرے گا اور جب تک کہ تم متعدد

پیالیاں نہ پی جاؤ وہ کوئی مطلب کی بات نہ پوچھے گا اور یہ بات مہمان نوازی میں داخل ہے۔ بہت عمدہ اور آراستہ چاء کی دوکانات اُمرا کے واسطے ہیں جہاں ہر قسم کا سامان آرایش رہتا ہے۔ بعض چاء خانے شراب بھی بیچتے ہیں۔ شراب خواری جیسی کہ یورپ میں ہے اُس کا تو چین میں خیال ہی نہیں مگر یہاں ایک قسم کی شراب چانول یا جوار سے بنائی جاتی ہے اور وہ مثل برانڈی کے سخت اور تُند ہوتی ہے۔ فرانس کی لڑائی کے زمانے میں اِس شراب سے فرانسیسی سپاہیوں کو مہلک دست آنے لگے تھے۔ اِس شراب کا نام شمشو ہے اور یہ سہ آتشہ بھی کیجاتی ہے۔ افیون جو بکثرت رائج ہے اوس کا ذکر بعد ازیں آئیگا۔

شہر و مکانات

باستثنا بعض بُدھ کے مندروں کے چین میں قدیم عمارات یا پُرانے کھنڈر بہت کم ہیں۔ کسی بادشاہ نے اِس بات کا خیال نہیں کیا کہ اپنا نام بذریعہ کسی بڑی عمارت کے قایم رکھے۔ اہل چین ابتدا خیموں میں رہا کرتے تھے اور اون کے مکانات کی ساخت اُسی طرز کی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی مکان دومنزلہ نہیں ہوتا۔ اور چھت بجاے دیواروں کے صرف چوبی ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ امرا اپنے مکانات کے گرد ایک دیوار کھچوا لیتے ہیں۔ بازار کی طرف کوئی کھڑکی نہیں ہوتی اور جو کوئی دروازہ مکان کا ہوتا بھی ہے تو علی العموم بند رہتا ہے۔ اِس سے وہاں کا بازار بڑا اُجڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کھڑکیوں پر کاغذ یا کپڑا چسپاں کر دیتے ہیں۔ مہمان کے کمرے میں کپڑے کی منڈھی ہوئی کرسیاں ایک ایک جوڑ علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں اور ہر جوڑی کے بیچ میں چاء رکھنے کی ایک میز ہوتی ہے اور آرایش کی مختلف چیزیں اِدھر اودھر رکھتے ہیں اور بڑی بڑی روشن قندیلیں کاغذ کی بنی ہوئی دیوار میں لٹکاتے ہیں اور ان ہانڈیوں پر چینی لٹریچر منتخب شدہ لکھا رہتا ہے۔ جاڑے میں صرف ایک رضائی اوڑھنے اور بچھونے دونو کا کام دیتی ہے اور بانس کا تکیہ لگاتے ہیں۔ چینی لال ٹینیں سب سے عمدہ بناتے ہیں۔ کاغذ۔ ریشم سینگ۔ شیشہ اور ہر قسم کی بناتے ہیں اور اُن کی قیمت ایک آنہ سے لیکر چھ سو روپے تک فی لال ٹین ہوتی ہے۔ بڑی لال ٹین کا دَور ۶ ۔ ۴ فٹ ہوتا ہے اور اوس کے اندر متعدد لیمپ رکھتے ہیں۔ لال ٹینوں پر اکثر خوشنما نقاشی اور رنگ سازی بھی کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو گرم رکھنے کی غرض سے موسم سرما میں ایک کپڑا دوسرے پر پہنتے ہیں اور ہاتھ پاؤں گرم کرنے کے واسطے چھوٹی قسم کی انگیٹھیاں کام میں لاتے ہیں۔ کانگ ایک قسم کا مونڈھا ہوتا ہے جو پلنگ اور کوچ کا بھی کام دیتا ہے۔ بڑے مکانات کے اندر باغیچے بھی ہوتے ہیں جن میں سنہری اور روپہلی مچھلیاں پالتے ہیں۔ درختوں کو بڑھنے نہیں دیتے بلکہ تار سے باندھکر جھکا دیتے ہیں۔ کوئی درخت جھاڑی سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ اُن میں نارنگی اور انار کے درخت بہت ہوتے ہیں اور اُن کی خوشبو باغیچے کو نہایت خوشگوار رکھتی ہے۔ جنوبی چین میں بازار علی العموم پتلے ہوتے اور اِس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص درمیان میں کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ پھیلائے تو دونوں طرف کی دیواریں چھوئے۔

عورتوں کی حالت

ہر جگہ زور آور کمزوروں پر ظلم کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ جس طرح کہ دیگر جملہ غیر عیسائی ملکوں میں دستور ہے اِس طرح چین میں بھی عورتوں کی حالت ذلیل ہے۔ مرد سے عورت کا درجہ کمتر خیال کیا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدایش میں بدبختی سمجھی جاتی ہے۔ جوان لڑکی اپنے باپ کے

لہر بندر ہا کرتی ہے اور اس کو کھانا سب سے الگ
یا جاتا ہے وہ مثل نوکر کے کام کرتی ہے اور بجنسہ
مثل نوکر کے سمجھی جاتی ہے اور اوس کا کام
صرف یہ ہے کہ وہ سوئی سے کچھ کام کرے اور کھانا پکاوے
وان عمر لڑکی کی شادی بغیر اوس سے پوچھے اور
با واقفیت اوس کے آئندہ شوہر کے اور اکثر سہالت
علی نام اوس کے شوہر کے کر دی جاتی ہے۔
ین میں شادی کا دستور مثل ہندوستان کے ہر
ایک مذہبی رسم ہے اور بیس برس کی عمر سے پہلے
ثر لڑکوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔ چینیوں کا
بال ہے کہ اگر بعد وفات کوئی بیٹا (کیونکہ دختر کا
رم وجود یکساں ہے) کریا کرم کے واسطے موجود نہو
نجات نہ ہوگی اور اس واسطے جلد شادی کر لیتے
بالاکثر ایک بیوی رکھتے ہیں۔ ایک مورخ لکھتا
ہے کہ متعدد بیوی رکھنے کا رواج بھی چین میں ہے
س کے واسطے کوئی سزا نہیں۔ کوئی ذی رتبہ
ص متعدد بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن سب سے
ں بیوی زوجۂ جائز قرار پاتی ہے بیواؤں کو بار دیگر
ادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ قبل اس کے
لڑکا یا لڑکی سن بلوغ کو پہونچیں اون کی نسبتیں
ہی جاتی ہیں جس لڑکی کا منسوبہ شوہر مر جائے وہ
شادی کرنے نہیں پاتی۔ شادی بواسطہ دیگر
ناص کے ہوتی ہے اور تبنّی کرنا بھی جائز ہے
لہا دولہن کی شکل شادی کی رات سے پہلے کبھی
ں دیکھنے پاتا۔ اگر لڑکی کا باپ راضی ہو جائے
دولہا کی طرف سے کچھ تحفے بھیجے جاتے ہیں۔ دونو
زائچے ملائے جاتے ہیں اگر مطابق ہوں تو تاریخ
دی مقرر کر دی جاتی ہے مگر یہ تقرر بھی منسوخ
سکتا ہے مثلاً تقرر تاریخ شادی سے تین دن
اندر اگر کوئی قیمتی شے ٹوٹ جائے یا چوری

ہو جائے تو معاہدہ فوراً فسخ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ تقرر
شادی سے آخر دن شادی تک لڑکی از حد پردہ
میں رہتی ہے اور جبکہ اوس کے باپ کے دوست
یا رشتہ دار ملنے آتے ہیں تو وہ گھر میں سب سے
اندر کے حصہ میں چلی جاتی ہے۔ لڑکی کا باپ دولہا
کے باپ سے کچھ زر نقد مطابق اوس کی حیثیت
کے پاتا ہے اور منجّمی جو تاریخ مقرر کر دیتے ہیں اوس
روز آخر جلسہ شادی کا ہوتا ہے۔ جس طرح ہندوستان
میں ہے چین میں بھی دونوں کے والدین حیثیت سے
زیادہ شادی میں خرچ کرتے ہیں۔ مہمان اولاً دولہا
کے گھر جمع ہوتے ہیں اور دولہن کو بڑی شان و
شوکت سے دولہا کے گھر لاتے ہیں۔ دولہن کا
لباس نقرئی و طلائی کارچوبی کا ہوتا ہے۔ اوس کے
دراز سیاہ بالوں میں جواہرات اور مصنوعی پھول
بکثرت لگاتے ہیں اوس کے چہرہ کو رنگتے ہیں اوس
کے ہونٹوں کو سرخ اوس کی ابرو کو سیاہ اوس کے
لباس کو مشک آلودہ کرتے ہیں۔ چین کی عورتوں
کا رنگ دل فریب اون کی نگاہ شیریں اون کے
ناک خوش قطع اور چھوٹے دانت خوبصورت بال سیاہ
بدن نازک و نرم اور آنکھیں ترچھی (جنکی تیزی و چمک
اون کو زیادہ تر دلربا اور دلکش بنا دیتی ہے) ہوتی
ہیں۔ ظاہری نقص اون میں یہ ہے کہ رنگ کا استعمال
زیادہ کرتی ہیں۔ جب دولہن کو لاتے ہیں تو جلوس
کے آگے آگے سؤر کا گوشت پھینکتے ہیں تاکہ شیطان
وغیرہ اُسے کھائیں اور کوئی نقصان نہ پہنچائیں جب
دولہن دولہا کے دروازہ پر پہنچتی ہے تو اوسے اوس
زریں ڈھکی ہوئی کرسی سے باہر نکالتے ہیں جس میں
وہ وہاں آئی ہے اور دروازہ کی چوکھٹ پر ایک انگیٹھی
رکھتے ہیں۔ دولہن اوس کو پھلانگ کر اندر جاتی ہے
یہ دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی اپنی خوش نصیب

وہ عورت لاکر رکھتی ہے جسکی اولاد اور شوہر زندہ ہوں ایک کمرہ جو استقبال کا کمرہ کہا جاتا ہے دولہا کے واسطے رہتا ہے - دولہن وہاں جاتی ہے - دولہا ایک فرش پر جو کسی قدر اونچا ہوتا ہے بیٹھا رہتا ہے اور دولہن لب فرش پہنچکر سربسجود ہوکر قدم بوسی کرتی ہے اور دولہا آگے بڑھکر اوس کو اُٹھاتا ہے اور اُسکا سہرا اوٹھاکر پہلے مرتبہ اوس کا مُنہ دیکھتا ہے - بغیر کچھ بولے بالے دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کے کپڑوں پر بیٹھنا چاہتا ہے کیونکہ اہل چین کا خیال ہے کہ اوس وقت جو دوسرے کے کپڑے پر بیٹھ جائے گا آیندہ خانگی معاملات میں کبھی حکمران رہیگا - پھر دونوں بڑے کمرے میں جاتے ہیں اور خاندانی عبادت گاہ میں زمین آسمان اور مورتوں کی عبادت کرتے ہیں - پھر وہ کھانا کھانیکے کمرہ میں جاتے ہیں اور اس کمرہ کے کھُلے ہوئے دروازوں سے مہمان جھانک کر دیکھتے ہیں - اور دولہن کی صورت اور چال چلن پر رائے زنی کرتے ہیں - پھر خادم ہر ایک کو پیالۂ شراب دیتا ہے اور وہ باہم معاہدہ کرتے ہیں اور جلسۂ شادی ختم ہوتا ہے - خاوند اپنی بیوی کو منجملہ ان سات قصوروں کے کسی وجہ سے طلاق دے سکتا ہے - (۱) سسر یا ساس کی نافرمانی - (۲) بانجھ ہونا - (۳) زنا - (۴) جذام - (۵) رشک - (۶) زبان درازی - (۷) چوری - بخلاف اِس کے مرد کچھ ہی قصور کیوں نہ کرے عورت طلاق حاصل نہیں کرسکتی اور کسی حالت میں عورت اپنے شوہر کی بدچلنی کی شکایت اس سے زیادہ نہیں کرسکتی کہ مؤدبانہ عرض کرے اور خیال رکھے کہ وہ رنجیدہ نہ ہوجائے - منکوحہ عورات کی تکلیف اِس درجہ بڑھی ہوئی ہیں کہ بعض عورتیں جوگن (راہبہ) ہوجانا بمقابلہ شادی کرنے کے پسند کرتی ہیں -

بلکہ خودکشی بھی کرلیتی ہیں - عوام اِس فعل کی بڑی تعریف کرتے ہیں عموماً خودکشی بذریعہ پھانسی لگانیکے ہوتی ہے اور اُس عورت کی یادگار قایم کیجاتی ہے ٭

اولاد بعد شادی کے اولاد کی بڑی خواہش ہوتی ہے - ایک طریقہ حصول اولاد کا یہ ہے کہ اولاد کے دیوتا کا ایک جوتا لاتے ہیں - جو اوس نے پہنا ہوا ہو اور گھر میں رکھکر اُس کی پرستش کرتے ہیں - اگر خواہش پوری ہوجائے تو ایک جوڑہ اُسی قسم کے جوتے کا بنواکر مندر میں رکھ آتے ہیں - اور اِس بات کا اطمینان ہوجانے کی غرض سے کہ بچہ ضرور لڑکا ہوگا عورت کسی دن بہت سویرے اُٹھتی ہے اور اپنے شوہر کا لباس پہنکر سب سے قریب کے کوئیں پر چلی جاتی ہے اور اوس کے گرد بائیں طرف کو تین مرتبہ گھومتی ہے اور گھر کو واپس آتی ہے اگر اِس آمد و رفت میں کوئی شخص اُس کو نہ دیکھے تو سمجھ لینا چاہئے کہ دلی مراد ضرور برآوے گی - بچوں کی کلائی میں سُرخ ڈورا اِس غرض سے باندھ دیتے ہیں کہ بچہ فرمانبردار رہوگا اور بھوت پلید اوسکو نالائق نہ ہونے دیں گے اِس کا یقین اِس درجہ ہے کہ جب کبھی کوئی بچہ نافرمانی یا شرارت کرتا ہوا پھرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ والدین سُرخ ڈورا باندھنا بھول گئے بھوت پلید کے اثر سے بچنے کے واسطے بچے کی گردن میں ایک سُرخ ڈورا اور متعدد تعویذ لٹکائے جاتے ہیں - ایک شیرخوار بچہ (بشرطیکہ بیٹا ہو) کا سب سے پہلا جلسہ اوس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ ایک ماہ کا ہوجاتا ہے - احباب و اقربا تحفے لیکر آتے ہیں اور اوس کا مونڈن ہوتا ہے اور دودھ کا نام رکھا جاتا ہے جس طرح کہ ایک بنگالی ماں اپنے بچے کا نام تنکوڑی رکھتی ہے اِس طرح چینی ماں بھی اپنے بچے کا نام کیچڑ - کتا - میلا - پتنو وغیرہ اِس واسطے رکھتی

بدروحوں کا اثر اُن پر نہ ہو یعنی بُرا نام سمجھ کر
وت پلید بچے کے پاس آنیکی پروا نہ کریں گ
ب بچے کو اولا کپڑے پہناتے ہیں تو کسی ستر
نی سال والے بوڑھے کے کپڑوں سے تراش کر
تے ہیں تاکہ اوس کی عمر بھی اُسی قدر دراز ہوجائے
تدار و اختیار چینی باپ کا اپنی اولاد پر صرف اوس کی
ات پر ختم ہوتا ہے - بچے عموماً فروخت ہوتے ہیں
چہ قانوناً منع ہے علی ہذا دخترکشی کا بھی رواج خلاف
نون ہی - جنوبی مشرقی حصہ چین کے ایک شہر
ں کچھ فاصلہ پر ایک تالاب ہی اور اوس پر یہ عبارت
دہ ہے کہ لڑکیاں اِس میں نہ ڈبوئی جائیں کسی
دل چینی نے ایک اسپتال بنا دیا ہے جس میں
ورث بچوں کی پرورش ہوتی ہے - بچے کے مرجانے
اہل چین کو کچھ رنج نہیں ہوتا بلکہ اون کا عقیدہ ہی
وئی بُری روح اوس کے ساتھ تھی اور اگر وہ زندہ
تا تو والدین پر کچھ مصیبت نازل ہوتی - بچے جس
ت کھیلنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو اون کو ایک
س کے ہنڈولے میں بٹھاتے ہیں - اور موسم سرما
ں ایک گنجان ٹوکرے میں رکھدیتے ہیں - دونوں
ف اوس کا منہ کھلا ہوتا ہے پاؤں کے نیچے ایک
ہنی توا اور اوس کے اندر کوئلے سلگا کر رکھدیتے
ں تاکہ اوس کے پاؤں گرم رہیں اور اوس کے
تھ میں چرخی دیدیتے ہیں تاکہ وہ بجاتا رہے - بچے کا
ودھ اوس وقت تک نہیں چھُڑاتے جب تک کہ دا
ں نہ نکلے اوس زمانہ میں اوس کو خوب نرم چانول
بال کردیتے ہیں ملوس کا سر اکثر مونڈا جاتا ہے
ر جب بال دو ایک انچ لمبے ہوجاتے ہیں تو چوٹی
ندھ دیتے ہیں بعض دفعہ دونوں طرف سر کے
ض وقت صرف بیچ میں سرخ ڈورا باندھ کر لٹکا
یتے ہیں بعض دفعہ چوٹی کو ٹوپی کے باہر بیچ ٹوپی

میں سے نکال دیتے ہیں - بچوں کے گیت جداگانہ ہیں اور اُن کو سُلانے یا کھلانیکے وقت گائے جاتے ہیں - بچے مختلف قسم کے کھیل کھیلتے ہیں مگر کرکٹ گیند وغیرہ کچھ نہیں ہوتا - کٹ پتلیوں کے تماشے بڑے شوق سے ہوتے ہیں آنکھ مچول دو طرح سے کھیلتے ہیں - اوّلاً ایک لڑکا اپنی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہے اور دوسروں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے - دوسرے سب لڑکے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو پکڑتے ہیں - پتنگ بازی بڈھے اور جوانوں کا مرغوب شغل ہی بعض قسم کے پتنگ بڑے خوبصورت بنائے جاتے ہیں بعض اوقات ایک چھوٹی کاغذی لال ٹین پتنگ میں لٹکا دیتے ہیں بعض اوقات متعدد کاغذی پرند چھوٹی چھوٹی ڈوروں میں باندھکر ایک ڈور میں لٹکا دیتے ہیں اور ہوا میں یہ ایسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں کہ گویا مختلف قسم کے پرند ہوا کو پھاڑ کر جا رہے ہیں یا ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں - سب سے بڑا دن آغاز پتنگ بازی کا نویں تاریخ نویں ماہ میں ہر سال ہوتا ہے اور اِس دن کی تخصیص اِس وجہ سے ہی کہ روایتاً معلوم ہوا ہے کہ زمانۂ سابق میں کسی شخص کو اِس دن خبر ملی تھی کہ سخت مصیبت نازل ہونے والی ہے چنانچہ وہ شہر چھوڑ کر باہر چلا گیا اوس وقت سے اہل چین ہمیشہ اوسی فعل کی تقلید اوس تاریخ پر کیا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی غرض سے پتنگ اوڑاتے ہیں - مُرغ اور بٹیر لڑانیکا رواج بھی چین میں ہی اور بجائے جوا کھیلنے کے اِن جانوروں پر بڑی بڑی بازی لگاتے ہیں

تعلیم جب کسی چینی کا لڑکا چھ برس کا ہوجاتا ہے تو یہ وقت اوس کے مدرسہ بھیجنے کا خیال کیا جاتا ہے جوتشی یا نجومی جو روزنجیا تک خیال کرتا

اوس روز اوس بچے کو صاف کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور سامنے کے سر کے بال منڈاتے ہیں اور باقی کو گوندھ کر بطور چٹیا کے پیچھے لٹکا دیتے ہیں اور ایک چھوٹی سی ٹوپی سیاہ یا نیلی ریشم کی اوس کو پہناتے ہیں اور اوس کے جوتے میں ایک بڑا بھاری سفید تلا لگاتے ہیں - جب وہ مدرسہ کو روانہ ہوتا ہے تو احباب اوس کے والدین کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ستارہ قسمت موافق ہے اور وہ بچہ کسی روز بڑا حاکم ہوگا - بچے کے ساتھ کچھ ہدیہ واسطے اوستاد کے جاتا ہے اور دو ایک موم بتیاں اور کچھ خوشبو اور کاغذی روپے بھی ہوتے ہیں جنکو کنفوشیس کے قبر پر لیجا کر جلاتے ہیں اور بچہ قبر کے سامنے تین بار سجدہ کرتا ہے اور پھر اوسی ادب کے ساتھ وہ اوستاد کو سلام کرتا ہے - اسکول میں چھوٹی چھوٹی ڈیسک یا میزیں اور اونچے اونچے اسٹول رکھے ہوتے ہیں - ہر ایک میز پر قلم دوات نہیں ہوتا بلکہ ایک پتھر کا ٹکڑا اور اوس پر سوکھی سیاہی اور برش رکھا ہوتا ہے - اس برش کو بالکل کھڑا کرکے رکھتے ہیں اور ذرا سا پانی اوس پتھر پر ڈالکر سیاہی گھول لیتے ہیں - اُستاد کی میز پر کتابیں اور کاغذ ہی نہیں ہوتا بلکہ اوس کے پینے کا پائپ (حقہ) بھی رکھا رہتا ہے چینیوں کی زبان میں الف - بے - تے نہیں ہے بلکہ صرف ۲۱۴ اصلی الفاظ ہیں اور وہی بایکدگر ملنے سے مختلف قسم کے الفاظ ہو جاتے ہیں - جو الفاظ اہل چین اولاً تحریر میں استعمال کرتے تھے وہ مختلف اشیاء کی بھدی شکلیں ہوتی تھیں مثلاً ∧∧∧ سے پہاڑیاں اور ☼ سے آفتاب ظاہر کرتے تھے چونکہ یہ شکلیں کافی نہ معلوم ہوئیں لہذا اُنہوں نے ان شکلوں کو باخود با ترکیب دیکر ہر ایک مطلب کو اظہار کیا چینی حروف تحریری کی شکل اون پیکانی حروف سے زیادہ ملتی ہے جو اہل شام (اسریا) استعمال کرتے تھے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل چین اوسی نواح سے آئے

چینی الفاظ علی العموم صرف ایک سلیبل کے ہوتے ہیں - اگرچہ بعض اوقات مرکب بھی ہوتے ہیں چینی الفاظ میں تثنیہ جمع یا جنس ظاہر کرنے کے واسطے تصریف نہیں ہوتی ترتیب عبارت سے یہ باتیں شناخت کی جاتی ہیں - چینی تحریر میں سطریں کھڑی لکھی جاتی ہیں - چینی حروف بہ نسبت کان کے زیادہ تر آنکھ کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں - ممکن ہے کہ حرف واحد کے پچاس مختلف معنی ہوں اور بایں ہمہ تلفظ اوس کا یکساں رہے - مثلاً لفظ شی (she) کے اٹھارہ مختلف معنی ہیں حالانکہ تلفظ میں اُسکا لہجہ یکساں رہتا ہے اور اگر تلفظ اور لہجہ میں فرق کیا جائے تو اسی لفظ کے دس معنے اور پیدا ہوتے ہیں - بیان کیا جاتا ہے کہ صرف پانسو مختلف حرکات تلفظ میں ہیں - لڑکے کو اولاً سادہ الفاظ مثلاً لتا - میز وغیرہ سکھاتے ہیں - اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ تصویر شئے کی بناکر اوس کے نیچے وہ لفظ لکھ دیتے ہیں بعد ازاں بچہ سہ حرفی تختی شروع کرتا ہے اُستاد اولاً دو ایک لفظ پڑھتا ہے اور شاگرد وہ الفاظ دوہراتا چلا جاتا ہے اور کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے آگے پیچھے ہلتا جاتا ہے - پھر لڑکا اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے اور سبق یاد کرتا ہے - بایں غرض کہ یہ معلوم ہو کہ ہر ایک لڑکا اپنا اپنا سبق یاد کر رہا ہے لڑکے بلند آواز سے سبق یاد کرتے ہیں جب اوستاد سبق سُنتا ہے تو لڑکا اُستاد کی طرف پیٹھ کرکے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ وہ کتاب کو (جو اُستاد کے ہاتھ میں ہوتی ہے) جھانک کر نہ دیکھ سکے - جب لڑکا فقرات سیکھتا ہے تو سب سے پہلے اوس کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ "آدمی فطرتاً نیک ہوتے ہیں" جو اُستاد بغیر سختی (مارپیٹ) سکھائے وہ کاہل ہے" - اور جو بانس کا سوٹا اُستاد کے پاس رکھا رہتا ہے اوس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخر الذکر اُصول سے غفلت نہیں کیجاتی - چینی زبان میں تقریباً چالیس ہزار الفاظ ہیں منجملہ اُنکے کم و بیش چھ ہزار الفاظ عام استعمال میں ہیں - اُستاد اولاً الفاظ کے معنے مطلب کچھ نہیں بتاتا اور نہ کوئی سوال کرتا ہے شاگرد

الفاظ کو حفظ کرلیتا ہی اور اون کے معنے سے بیخبر ہوتا ہے۔ دوسرے درجے میں ایک آدھ لفظ کبھی کبھی اُستاد معہ معنے کے بتاتا ہے۔ دو ایک برس بعد معنی بتانے شروع ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے میں انشا اور املا شروع ہوتی ہے مثلاً اُستاد کہتا ہی "سونا بھاری ہوتا ہے" شاگرد جواب دیتا ہی "پر ہلکے ہوتے ہیں" رفتہ رفتہ فقرات بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ ترتیب اسم فعل صفت اور حروف کی یکساں رہتی ہے۔ بعدہٗ فقرات میں طوالت ہوتی ہی۔ فرضی اشخاص کے نام خطوط لکھواتے ہیں مضامین اور شعر لکھنے کی بھی کوشش کیجاتی ہے۔ ایک ہی قسم کی کتابیں تمام چین میں پڑھائی جاتی ہیں۔ صرف پانچ یا چھ کتابیں ہیں جنمیں تمام علم ختم ہو جاتا ہی۔ اگر یہ کتابیں معہ شرحوں کے اسطرح یاد ہو جائیں کہ ہر طرح کام میں آسکیں تو ہر اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان کے واسطے کافی ہوتی ہیں۔ یہی اُصول تمام سلطنت میں جاری ہی اور اِس کا اثر جو ہوا ہے اس کا حال بعد ازیں معلوم ہوگا۔

پڑھنے میں محنت سخت کرنیکے واسطے گذشتہ اکابر اور علمائے چین کے نظیر لڑکے کے سامنے پیش کیجاتی ہے اور سکا اثر عمدہ ہوتا ہی مثلاً ایک طالب علم نے بخوف اونگھ جانے کے اپنی چوٹی بذریعہ ایک رسّی کے چھت سے باندھ دی۔ دوسرے نے جس کا خاندان غریب تہا کچھ چمکدار کیڑے جمع کر لیئے تہے اور اون کی روشنی میں پڑھتا تہا۔ ایک اور طالب علم چاندنی کی مدد سے پڑھتا تہا۔ ایک نے اپنی پیٹھ پر بوجھ رکھ لیا تہا اور جُھکا ہوا سبق یاد کرتا تھا ایک نے اپنی کتاب ایک گائے کے سینگوں سے باندھ دی تہی اور سبق بھی یاد کرتا تہا اور اوس کو چراتا بھی تہا۔ مگر اُمرا میں تعلیم کی حالت دوسری طرح ہے۔ اہل چین کی کتاب رسم و رواج میں یہ ہدایت ہے کہ امرا کے بچوں کی تعلیم وقت پیدائش سے ضرور شروع ہونی چاہیئے اور ماں کو ہدایت ہی کہ دایہ کے انتخاب میں

ازحد ہوشیاری کرے۔ جب بچہ اپنا ہاتھ اپنے منہ تک لیجا سکے تو اوس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ اور چھ برس کی عمر میں ابتدائی اُصول حساب اور جغرافیہ کے اوسکو سکھا دیتے ہیں۔ ساتویں برس بچے کو ماں اور بہنوں سے بالکل جُدا کر لیتے ہیں اور اون کیساتھ پھر کھانا نہیں کھانے دیتے۔ آٹھویں برس ادب اخلاق و معاشرت اوس کو سکھائے جاتے ہیں۔ نویں برس جوتش بتاتے ہیں اور دسویں برس سرکاری مدرسہ میں بھیجدیتے ہیں تا بین ۱۳ و ۱۵ برس کے اخلاقی گیت اور علم موسیقی اوس کو سکھاتے ہیں۔ پندرھویں برس ورزش جسمانی ہتیاروں کا استعمال کرنا گھوڑے پر چڑھنا بتاتے ہیں۔ بیسویں برس اگر وہ قابل سمجھا جائے تو اوس کو سند (ٹوپی) دیجاتی ہی اور اُسی وقت اوس کے لباس میں بھی تبدیلی ہوتی ہے یعنی بجائے سوتی کپڑوں کے وہ ریشمی اور سموری کپڑے پہننے شروع کرتا ہے اور اسی عمر میں علی العموم اوس کی شادی ہوتی ہے۔ چینی مدرس علی العموم وہ لوگ ہوتے ہیں جو عمدہ ہائے عالی کے امتحانات میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ خطاوار لڑکوں کو کئی طرح سے سزا دی جاتی ہے ڈنڈے یا کوڑے سے۔ ایک ڈھری میں تو تسمے لگے ہوتے ہیں۔ سے لڑکے کے ہاتھ اور پیٹھ پر مارے جاتے ہیں بعض اوقات ایک تحریر لکھکر لڑکے کی پیٹھ میں باندھ دیتے ہیں اور دیکھنے والے عوام اُسے لعنت ملامت کرتے ہیں۔ غربا کی تعلیم مفت میں ہوتی ہی۔ اہل چین لکھنے پڑھنے صرف نحو اور علما م دقیقت اپنی زبان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اون کا حاصل ہونا ایک چینی کے واسطے بھی اوسی قدر مشکل ہے جیسا کہ ایک اجنبی آدمی کے واسطے کیونکہ جو زبان پڑھائی جاتی ہی وہ اوس زبان سے بالکل جدا ہے جو بولی جاتی ہی۔ جو زبان کہ اہل چین بولتے ہیں وہ تحریری زبان سے بہت کم مشکل ہے اور اس کی ترکیب الفاظ اس قدر وسیع ہی کہ کم ہیں

ہر ایک خیال کا جو ممکن ہو بخوبی اظہار ہوسکتا ہی جنوب کی زبان شمال کی زبان سے بہت مختلف ہی اور ہر صوبہ کی بول چال کچھ نہ کچھ جداگانہ ہے ۔ باوجود مشکلات نوشت خواند چینی الفاظ کے چین بلاشبہ وہ ملک ہی جسمیں ابتدائی تعلیم سب ملکوں سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے ۔ ذرا ذرا سے گاؤں میں بھی مدرسہ ہوتا ہے ۔ یہ شاذ ہی کہ آپ کسی چینی سے ملیں اور وہ بالکل جاہل ہو ۔ مزدوروں میں اور نیز کسانوں میں یہ قابلیت ہوتی ہی کہ اپنے حسابات اور گورنمنٹ کے اشتہارات پڑھ لیا کرتے ہیں اور اپنے کام کی یادداشت لکھ لیا کرتے ہیں ۔ ابتدائی تعلیم کے واسطے صرف ایک کتاب مسمی سین ہی کنگ مصنفہ کسی شاگرد کنفوشیس کی ہی اِس میں صرف ایک سو اڑسٹھ سطریں ہیں اور کل ضروری علوم و فنون ابتدائی اوس میں ختم ہوجاتے ہیں ۔ جو کوئی اِس کتاب کو اُستاد سے سمجھکر پڑھ لیتا ہے اوس کو معمولی مذاق علم کا آجاتا ہی اور آئندہ پڑھنے کا شوق ہوجاتا ہے ۔ بڑے شہروں میں کالج بھی ہیں ۔ خود پیکین میں ایک شاہی کالج ہے اور اوس میں متعدد طلبا اور افسروں کے لڑکے پڑھتے ہیں ۔ اہل چین کو آزادی پریس کی بالکل حاصل ہی مگر ہر کاتب اپنی تحریر کا ذمہ وار ہوتا ہے ۔ گورنمنٹ کسی تحریر کے شائع ہونے کو منع نہیں کرسکتی مگر حیلہ حوالہ سے بعض دفعہ اون اشخاص کی خبر لیتی ہے جو گورنمنٹ پر الزام لگاتے ہیں اور اس قسم کی تحریرات روزانہ شائع ہوتی ہیں ۔ پرائیویٹ طور پر لوگوں کے پاس اکثر ہلکے سفری چھاپہ خانے ہیں اور اون کا استعمال بُری بھلی دونوں طرح کرتے ہیں ۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جسکے دیواریں اشتہارات سے ایسی پُر ہوں جیسی چین میں ہوتی ہیں ۔ یہ بیان کیا جاتا ہی کہ یہاں چھاپہ کو ایجاد ہوئے قریب نو سو برس کے ہوئے ۔ چھاپنے کا طریقہ چین میں یہ ہے کہ ایک باریک کاغذ پر اول عبارت لکھتے ہیں ۔ اوس کو اوٹھا کر کسی تختہ لکڑی پر چسپاں کردیتے ہیں پھر کاغذ کو تر کرکے نکال ڈالتے ہیں حروف کا نقش تختہ پر رہجاتا ہی ۔ پھر جس قدر جگہ اوس تختہ پر اون حروف سے بچ جاتی ہے اوس کو کھود ڈالتے ہیں اور اسکے بعد اوس تختہ سے چھاپنا شروع کرتے ہیں ۔ ہر کتاب کے شروع میں بطور تمہید کے کنارہ پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ جس تختہ سے یہ کتاب چھاپی گئی وہ تختہ فلاں جگہ رکھدیا گیا ہے ۔ چونکہ چین کی تحریری زبان میں چالیس ہزار الفاظ ہیں لہذا وہ ٹائپ نہیں بناتے مگر اہل امریکہ نے اونکی زبان کا ٹائپ بنا لیا ہی اور معمولی طرز پر چھاپتے ہیں ۔ پیکین میں متعدد اخبارات روزانہ نکلتے ہیں ۔ منجملہ اون کے پیکین گزٹ ایک سرکاری اخبار ہے اِس میں کل احکامات سرکاری مثلاً ڈگریاں سزائیں ۔ عرائض ۔ احکام ۔ صوبہ کے گورنروں کے معاملات ۔ معافی خطاؤں کے خطوط ۔ مبارک یا منحوس واقعات ۔ حالات جنگ و صلح بلاکم و کاست درج ہوتے ہیں ۔ شاہی افواج کی شکست کا اعلان و اقبال کیا جاتا ہے اور یہ حصہ آزادبیانی کا ایسا ہی جس کا سرکاری اخبارات ممالک یورپ و امریکہ میں وجود بھی نہیں ہی ۔ اہل چین میں پشت ہاپشت سے ایک نیم مذہبی تعظیم محفوظ رکھنی ہر مطبوعہ یا لکھے ہوئے کاغذ کی جاری ہی ۔ اِس قسم کے کاغذات نہایت ہوشیاری سے جمع کئے جاتے ہیں اور بعد پڑھنے کے جلا دئے جاتے ہیں تاکہ وہ نجاست سے محفوظ رہیں ۔ اِس کام کے واسطے سوسائٹیاں قائم ہیں جو مزدور (کہار) نوکر رکھتے ہیں تاکہ بازار میں سے ردّی کاغذ اوٹھا لائیں ۔ بازار کے کناروں پر اِس قسم کے خانے بنے ہوئے ہیں جنمیں ردّی کاغذ ڈالدیا جاتا ہے ۔ جب کاغذ کو جلاتے ہیں تو اوس کی راکھ جہاز والے لیجاتے ہیں ۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ حالتِ طوفان میں کاغذ کی راکھ ڈالنے سے شدّتِ طوفان کم ہوجاتی ہے ۔ جو روپیہ کاغذ کے جمع کرنے و جلانے میں اِس طرح صرف کیا جاتا ہے وہ خدا لئے (دیوتا) علم کی نذر سمجھا جاتا ہے ۔ کاغذ کی تعظیم کے واسطے دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار

لگاتے ہیں اور حسب ذیل جزا اور سزا کا اعلان کرتے ہیں:
(۱) "جو شخص کوشش کرکے چھپے ہوئے کاغذ کو جمع کرےگا دھوئیگا اور جلائیگا اوس میں پانچ ہزار اوصاف پیدا ہونگے بارہ برس اوس کی عمر میں زیادہ ہوجائیں گے۔ وہ معزز اور امیر ہوگا اور اوس کے پوتے اور پرپوتے ممدوح اور فرمانبردار ہوں گے" ✦
(۲) "جو شخص لکھے ہوئے کاغذ کی حفاظت کیواسطے رسالہ لکھے اور عوام میں اوسے تقسیم کرے اوس میں پانسو اوصاف ہیں زندگی بھر کوئی الزام اوس پر نہ آئے گا اور بکثرت معزز اولاد ہوگی" ✦
(۳) "جو شخص لکھے ہوئے کاغذ کو کسی نجس جگہ میں پھینکے گا یا ناپاک جگہ میں جلائیگا اوس میں بیس برائیاں پیدا ہونگی۔ اوس کی آنکھ میں اکثر درد ہوگا اور اندھا ہوجائیگا" ✦

گورنمنٹ | بادشاہ اس ملک کا محض ایک آرائشی و نمائشی پتیہ اوس کل کا ہے جو بغرض انتظام ملک بنائی گئی ہے۔ اہل کونسل دراصل اختیار حکومت کا ہوتا ہے۔ گورنمنٹ چین میں سٹریلائی زیشن (مختلف و متعدد گورنمنٹوں کو واحد کرنا) کا بڑا اثر ہے بادشاہی حکومت کی بنا صرف دنیوی اور مربیانہ تعظیم قرار دی گئی ہے۔ اور اوس کا بے انتہا اثر ہے۔ سن رسیدہ اشخاص کی تعظیم کرنا گویا شاہی قانون ہے ضعیف اور سن رسیدہ اشخاص جو بوجہ مفلسی لٹرز (چینی گاڑی) کرایہ نہیں کرسکتے اکثر پیکن (دارالسلطنت) کے بازاروں میں بایں حالت نظر آتے ہیں کہ اون کے پوتے چھوٹی ہاتھ گاڑیوں میں اون کو بٹھلا کرلئے پھرتے ہیں اور جب وہ بازاروں میں ہوکر گذرتے ہیں تو جوان عمر اشخاص جو قریب اون کے ہوتے ہیں اون کی تعظیم کرتے ہیں اور برائے چندے اپنا کھیل یا کام موقوف کردیتے ہیں۔ گورنمنٹ ان خیالات کو اور بھی تقویت دیتی ہے یعنی بوڑھے آدمیوں کو زرد پوشاک عطا کرتی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین اعزاز ہے جو کسی پرائیویٹ شخص کو ملسکتا ہے کیونکہ زرد وہ رنگ ہے جو صرف خاندان شاہی کے واسطے مخصوص ہے۔ شاہی نشان ایک فرضی جانور ہے جو متعدد جانوروں سے مرکب ہے مثلاً اوس کا سر اونٹ کا سینگ ہرن کے۔ آنکھیں خرگوش کی۔ کان گائے کے اور گردن سانپ کی ہے۔ اوس کا دُم کبھی تک کبھی پانی ہے اور اوس کی آواز مثل جھنجھناہٹ تانبے کے پتروں کی ہے۔ چین کا دارالسلطنت پکین (یا پیکنگ) ہے اس لفظ کے معنے شمالی دارالسلطنت ہیں۔ اگرچہ یہ خود بہت پُرانا شہر ہے مگر دارالسلطنت اس میں ۱۴۲۱ء میں آیا ہے۔ یہ دریائے پی ہو سے بفاصلہ ۱۲ میل اور سمندر سے بفاصلہ سو میل ہے۔ شہر کے دو حصے ہیں۔ شمالی یعنی تاتاریوں کا شہر۔ جنوبی یعنی چینیوں کا شہر۔ دیوار کا گھیرا قریباً بیس میل کے ہے۔ دیواریں مٹی کی بنی ہیں اور اون میں باہر کی تہ اینٹ کی ہے۔ تاتاریوں کے شہر کی دیوار بحساب اوسط پچاس فٹ اونچی اور ۴۰ فٹ چوڑی ہے۔ اور چینیوں کی دیوار ۳۰ فٹ بلند اور ۲۰ فٹ عریض ہے۔ ہر ساٹھ گز کے فاصلہ پر ایک بلند مگر مربع مینار سا ہے کُل دیواروں میں ۱۶ دروازے ہیں۔ ہر دروازہ پر مینار پاسبانی کی غرض سے بنا ہوا ہے تاتاریوں کے شہر کے وسط میں ایک احاطہ تخمیناً دو میل گھیر کا ہے۔ اس میں محلات شاہی مندر اور پائیں باغ ہیں یہ باغ عمدہ روشوں چشموں نہروں گلکاریوں جھیلوں اور مصنوعی پہاڑیوں سے آراستہ ہیں۔ سرکاری دفاتر اور غیر ملکوں کے سفیروں کے مکانات شہر سے باہر ہیں۔ خاص خاص بازار تو وسیع ہیں مگر کھڑنجہ پانچ کہیں نہیں۔ گرمیوں میں وہاں خاک اور برسات میں کیچڑ ہوجاتی ہے اور بدبو رہتی ہے۔ بعض بازاروں کے نام بھی دلکش نہیں ہیں۔ مثلاً کتے کے دانت کا بازار کتے کی دُم کا بازار قزاقوں کا بازار۔ بعض سرکاری مکانات بھی بڑے ہیں۔ اور اون کی مرمت نہیں ہوتی۔ ہر دو حصہ شہر میں باغات کی زمین بکثرت ہے۔ مردم شماری تخمیناً پانچ لاکھ ہے ✦

عہدہ داران سرکاری | بادشاہ کو مدد دینے کے واسطے پانچ ممبروں کی

ایک کونسل ہے یہ ممبر حضور بادشاہ چار بجے صبح سے چھ بجے صبح تک کام کیا کرتے ہیں - اس کے بعد سکریٹری ہائے اعلیٰ ہیں مثلاً صیغہ ملک غیر (اجنبیہ) - اس کے بعد چھ بورڈ ہیں جنکی تفصیل یہ ہے (۱) دفتر ملکی (۲) محکمۂ مال (۳) محکمۂ جلوس شاہی (۴) صیغہ جنگ (۵) صیغہ تعزیرات (۶) صیغہ تعمیرات - منجملہ اٹھارہ صوبوں کے پندرہ بماتحتی آٹھ ویسراؤں کے ہیں اور باقی تین بماتحتی تین گورنروں کے ہیں - ہر صوبہ درحقیقت خودمختار ہے - بشرطیکہ وہ قواعد کا پابند رہے - ویسراؤں کی ماتحت ہر صوبہ میں گورنر ہیں - پھر گورنروں کے ماتحت دیگر عہدہ دار مثلاً کمشنر مجسٹریٹ وغیرہ ہیں - ہر ویسرائے کو اپنی بری اور بحری فوج خود رکھنی پڑتی ہے اور اوس کو اختیار ہے کہ محاصل صوبہ سے اون کو تنخواہ دے - خواہ نہ دے - ہر عہدہ صرف تین برس کے واسطے ہوتا ہے - کسی عہدہ دار کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اوس صوبہ میں نوکری کرے جہاں کہ اوس کا گھر ہے یا آنکہ اپنا کوئی رشتہ دار یا نیز متوسل بماتحتی اپنے نوکر رکھے - عہدوں کی تنخواہیں قلیل ہیں - عہدہ دار اس کمی کو اون لوگوں کی جیبوں سے پورا کرتے ہیں جن پر وہ حکمران ہیں - سپرنٹنڈنٹ محکمۂ سرحد کینٹن میں تھا آٹھ ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ پاتا تھا لیکن اوس کے اخراجات قیام بوجہ عہدہ قریب ۲۶ ہزار روپیہ ماہواری کے تھے باایں ہمہ جب وہ عہدہ سے جدا ہوا تو اوس کی پاس اثاثہ قریب دس لاکھ روپے کے تھا - علاوہ رشوت خواری کے روپیہ دیگر وسائل سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور اگرچہ حصول عہدوں کا امتحان بھی ہوتا ہے تاہم اکثر عہدے رشوت سے ملجاتے ہیں -

امتحان عہدہائے سرکاری

چین میں عہدہ سرکاری کا ملنا اون کتابوں میں امتحان پاس کرنے پر موقوف ہے جن کا ذکر اوّلاً ہو چکا ہے - جب کوئی شخص اپنے آپکو اوس امتحان کے لائق سمجھتا ہے تو اوّلاً اوس درجہ امتحان کا وہ امیدوار ہوتا ہے جس کو ہم کھلنے والی عقل یا پھولنے والی فراست یا اوٹھتی ہوئی طبیعت یا ابھرتا ہوا ذہن کہہ سکتے ہیں - تقریباً دو ہزار امیدوار ضلع میں جمع ہوتے ہیں اور ہر ایک ایک پتھر کی کوٹھری میں جو ۶ فٹ لمبی اور ۴ فٹ چوڑی ہوتی ہے پوری ایک شب اور ایک دن بند رکھا جاتا ہے تاکہ وہ کوئی نظم اور دو ایک مضمون کسی خاص بحث پر لکھے - ان امیدواروں کی عمر ۱۳ برس سے لیکر ساٹھ برس تک ہوتی ہے - بعد امتحان یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور بڑے انتشار کے ساتھ نتیجہ امتحان کے منتظر رہتے ہیں - امتحان میں صرف ایک فیصدی کامیاب ہوتے ہیں - پاس شدہ امیدوار کو خطاب نورہ بالا ملتا ہے اور اس کو ادنیٰ ترین تمغہ افسری کا ملتا ہے دوسرا امتحان جس کا نام ترقی یافتہ عالم ہو سکتا ہے ہر تیسرے برس بعد امتحان اوّل کے ہوتا ہے - بعض اوقات اس میں دس ہزار امیدوار جمع ہوتے ہیں یہ امتحان بہ نسبت اوّل کے بہت زیادہ سخت ہے اور نو روز تک متواتر رہتا ہے - اس میں بھی صرف ایک فیصدی کامیاب ہوتے ہیں مگر پاس شدہ امیدوار جب اپنے گھروں کو واپس آتے ہیں تو اون کی بڑی عزت ہوتی ہے - ترقی یافتہ عالم کا تیسرا امتحان دارالسلطنت میں ہوتا ہے جہاں تقریباً چھ ہزار امیدوار جمع ہوتے ہیں اون میں سے صرف ۳۰۰ منتخب کئے جاتے ہیں اور اس وقت یہ منتخب شدہ لوگ قابل نوکری سمجھے جاتے ہیں - اور جو عہدے خالی ہوتے ہیں وہ اون کو دئے جاتے ہیں - سب سے بڑا رتبہ کسی عالم کا یہ ہے کہ وہ شاہی جماعت علما کا ممبر ہو جائے اس مجلس کا نام اردو میں نیستان علم ہو سکتا ہے -

نامی گرامی عالمون کی یادگار قائم کیجاتی ہے۔
عہدہ ہائے جنگی کا امتحان بھی قریب قریب اسی طرح ہوتا ہے علمی درجہ اس قدر اعلیٰ نہیں ہوتا مگر اوس کی جگہ تیراندازی و دیگر اسلحہ جنگی کا علم ضروری ہے امتحان اوّل جو ضلع کا مجسٹریٹ لیتا ہے اوس میں امیدوار کو قابلیت تیراندازی پیادہ پا ثابت کرنی پڑتی ہے اور جو اِس امتحان کو پاس کر لیتے ہیں اون کو تیراندازی میں پھر امتحان دینا ہوتا ہے - اِس امتحان میں یہ قید ہوتی ہے کہ پورے تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سے تیر نشانہ پر مارتا ہے تیسرے امتحان میں اون کی قابلیت کا اندازہ اِس طرح ہوتا ہے کہ بڑی بھاری تلوار چلانے کو دیتے ہیں اور اون کی طاقت اور قابلیت کا امتحان بھاری بوجھ اُٹھوانے اور کڑی کمان کے کھینچنے سے بھی کرتے ہیں اگر طاقت اور قابلیت اِن اسلحہ کے استعمال میں ثابت ہو تو کمیشن ملجاتا ہے - زمانہ حال کی لڑائیوں میں یہ قدیمی اسلحہ استعمال نہیں کئے جاتے - لہذا چینی افسران محکمہ جنگ یورپین سے لڑتے وقت بڑے ٹوٹے میں رہتے ہیں - اہل چین جنگی معاملات پر بہت کم توجہ کرتے ہیں - جنگی قوت اعزاز کی یہ قوم معتقد نہیں ہے - لہذا ہم اِس بحث کو ختم کرتے ہیں - مگر یہ لکھنا ضرور ہے کہ اصلی فوج اہل چین کی وہ بڑھا ہوا درجہ احتیاط ہے جس کے ذریعہ سے اہل چین باشندگانِ ملک غیر سے جدا رہتے ہیں اور نیز وہ طریقہ عمل ہے جس کی وجہ سے وہ ہر ایک اجنبی کو اپنے ملک میں گھسنے سے روکتے ہیں ✦

عدالت و قانون

عدالت چین سے کے مجموعہ تعزیرات اور خاندانی نظم و نسق پر تعلق بلاواسطہ ہے - اگر بادشاہ اپنی کُل رعایا کا مائی باپ سمجھا جاتا ہے تو مجسٹریٹ جو بادشاہ کا جانشین ضلع میں ہوتا ہے بھی اون لوگوں کا مائی باپ متصور ہوتا ہے جنپر وہ حکمران ہو - ہر فعل مخالف قانون نظم خاندان کے مخالف سمجھا جاتا ہے - بیدینی یا کفر جو منجملہ سب سے بڑے جرموں کے ہے قانون نے اوس کی بندش اور سزا کا بہت بڑا لحاظ رکھا ہے اور یہ جرم دراصل والدین کی عزت ظاہر کرتا ہے - اس جرم (کفر) کی تعریف مجموعہ تعزیرات چین میں اِس طرح کی گئی ہے جو شخص اپنے قریب ترین رشتہ داروں کی مذمت کرے یا اون کے اوپر نالش کرے یا اون کے مرنیکا ماتم نہ کرے یا اون کی یادگار کی تعظیم و عزت نہ کرے یا اون اشخاص کا ادب نہ کرے جنہوں نے اوس کی پرورش کی ہو یا جنہوں نے اوسے تعلیم دی ہو یا جنہوں نے اوس کی حفاظت و مدد کی ہو وہ کافر (نعمت) یا بیدین ہے - جو سزائیں اِس جرم کی پاداش میں عائد کیجاتی ہیں وہ خوفناک ہیں اور اون کا ذکر ہم آیندہ کرینگے واضعان آئین و قوانین ملک چین اون خیالات کو جو خاندانی تعلقات کیوجہ سے ہوتے ہیں پولیٹیکل حدود میں لے گئے ہیں اور اِس وجہ سے اونہوں نے حکمرانی کی ایسی کَل پیدا کی ہے جس میں قوت عظیم ہے اور جو کئی صدی سے قائم ہے اور باوجود اون کثیر بغاوتوں اور خاندان شاہی کی تبدیلیوں کے اور باوجود مخالفت شمالی اور جنوبی نسلوں کے اور باوجود نہایت وسیع ہونے سلطنت کے اور باوجود قایم ہونے اوس خود غرض فرقے کے جو روح کا منکر ہے اور جس کا نشو و نما درجہ اعتدال سے بڑھگیا ہے اور بالآخر باوجود بیدینی کے زائل نہیں ہوئے بلکہ اوس میں کوئی فتور عظیم بھی نہیں ہوا منجملہ اون عدالت ہائے عالیہ کے جن کا اجلاس پیکن میں ہوتا ہے ایک عدالت اپیل ہے اوس سے کمتر درجہ کی عدالتیں ہیں جو ہر صوبہ کے دارالحکومت میں قائم ہیں اور جن کا افسر اعلیٰ ایک اسپیشل مجسٹریٹ ہوتا ہے جس کا خطاب کمشنر عدالت فوجداری ہے - اِن عدالتوں میں ایک ایک مجسٹریٹ کم درجہ کا بطور

وکیل سرکار کے کام کرتا ہے - ادنیٰ درجہ کے ضلعوں اور شہروں میں کمتر درجہ کے اہلکار متقرر ہیں اور اون میں ایک جج ہوتا ہے - ایسے جج صرف خاص قسم مقدمات فیصل کرتے ہیں اور نوعیت سزا کی (جو یہ جج نافذ کریں) محدود ہے - اگر جرم کی سزا زیادہ ہو تو قیدی دار الحکومت کو بھیجا جاتا ہے - اگر دار الحکومت کا مجسٹریٹ حکم سزائے موت صادر کرے تو مسل مقدمہ عدالت عالیہ پیکن کو ضرور بھیجی جاتی ہے اور وہاں سے حکم اخیر زمانہ خزاں کے اجلاس میں صادر ہوتا ہی - لہٰذا کسی حاکم صوبہ کو اختیار صادر کرنے حکم موت کا نہیں ہی - اگرچہ حالات مختص مثلاً مسلم بغاوت میں کسی کسی گورنر کو اختیارات قطعی اوس قسم کے دیئے جاتے ہیں جو یورپ میں مارشل لا (جنگی قانون) سے متعلق ہیں ◆

ان کے علاوہ ہر حصہ سلطنت میں عدالت ہاے خبر رسانی قایم ہیں جہاں کہ حکام ماتحت ہر سہ ماہی میں دورہ کرتے ہیں، واقعات کو سنتے ہیں - تنازعات کا فیصلہ کرتے ہیں اور عوام کے سامنے خلاقی لکچر دیتے ہیں - لیکن بوجہ گورنمنٹ کی کم توجہی اور نیز افسروں کی غفلت کے عمدہ ترین محکمہ سے فائدہ نہیں اوٹھایا جاتا نتیجہ اس انتظام عدالتی کا یہ ہی کہ ہر حاکم ماتحت کو نسبت اصلاح معاملات دیوانی کی اپنی حکومت کی حدود ارضی میں اختیارات قطعی ہوتے ہیں اور یہ صورت حالات کی ایسی ناقص ہے جو بہت سی برائیوں کا باعث ہوئی ہے - چین میں کلا نہیں ہیں اور جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا جج بھی بہت کم ہیں - پس طریقہ انفصال مقدمات بھی نہایت سرسری ہے اور انصاف کی وہ ضمانت جس سے کوئی مجرم متمتع ہو سکے بالکل معدوم ہے - ہی یہ سچ ہے کہ مجرم کے احباب و اقربا اوس کی طرف سے وکالت کر سکتے ہیں مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا تا وقتیکہ یہ فعل حاکم عدالت کے مزاج کے موافق نہ ہو - بموجب قانون ملک کے کسی مجرم کو سزا نہیں دیجا سکتی ہے تا وقتیکہ وہ جرم کا اقبال نہ کرے - اس واسطے اقبال کرانے کی غرض سے مجرم کو ایذا پہنچاتے ہیں اور گواہوں کی شہادت ناپسند ہو تو اون کے بھی کوڑے لگائے جاتے ہیں - جو گواہ اپنے بیانات میں طوالت کرتے ہیں اون کو حاکم عدالت ازبس برا جانتا ہے کیونکہ اوس حاکم کے پاس دیگر مقدمات بغرض فیصلہ بکثرت ہوتے ہیں اور بوجہ عدیم الفرصتی وہ واقعات کو بتفصیل نہیں سن سکتا - امر واقعی یہ ہے کہ مجرم کی رہائی یا سزا اون اہلکاران عدالت پر منحصر ہی جو کارروائی مقدمہ کی ترتیب مفید حق مجرم یا برخلاف اوس کے بہ مقتضائی کمی بیشی اوس روپیہ کی کرتے ہیں جو مجرم کی طرف سے اون کو دیا جاتا ہی - اگر اہل چین کے قانون میں کوئی چیز قابل تعریف ہے تو برعکس اوس کے طریقہ نافذ کرنے سزاؤں کا ہولناک ہی - چینی واضعان قانون نے یہ فرض کر لیا ہی کہ انسان صرف جسمانی تکالیف اور موت کو محسوس کرتا ہے پس عزت خودداری اور ذاتی فائدوں سے روکنے کی تجویز نہیں کی - لہٰذا مجموعہ تعزیرات میں سوائے موٹے ڈنڈے یا بانس کے اور کچھ نہیں ہی جس کی ضربیں بلحاظ خفیف یا سنگین ہونے جرم کے یا کم و بیش ہونے مالیت شئے مسروقہ کے دس سے لیکر دو سو تک کسی مجرم پر لگائی جاتی ہیں - یہ لاٹھی کی مار فوراً بموجودگی حاکم عدالت تعمیل پاتی ہے - اس سزا کے علاوہ دو اور سزائیں ہیں جو عام ہیں (۱) گردن میں لکڑی کا طوق پہنانا (۲) قید مع جلا وطنی دوام بملک تاتار، اون حکام کے لئے جو پولٹیکل جرموں کے مرتکب ہوں ◆

یہ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ صرف عدالت العالیہ اپیل حکم موت کا فیصلہ قطعی کرتی ہے الّا جو سزائیں کہ حسب ایما حاکم ماتحت نافذ کیجاتی ہیں وہ ازبس خوفناک ہوتی ہیں اور جلاد ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ موت کے واقع ہونے تک ایذائیں بدلتے رہتے ہیں - جیلخانوں کا

انتظام ہی نفرت خیز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی گردن میں کاٹ پہنایا جاتا ہے یا جو پنجرے میں بند کیا جاتا ہے اوس کو اس درجہ جان کنی اور ہولناک تکالیف ہوتی ہیں کہ جب حکم موت پیکن سے آتا ہے تو یہ بدنصیب مجرم اس خوشی سے پھانسی پر جاتا ہے کہ گویا اوس کی موت کا دن فی الحقیقت اوس کی نجات کا دن ہوتا ہے ✦

سزائے موت جو گذشتہ زمانے میں متعدد ہولناک طریقوں سے عاید کیجاتی تھی اب صرف بذریعہ تین طریقوں کے دیجاتی ہے (۱) پھانسی دینا (۲) سر کاٹ ڈالنا (۳) چھریوں سے رفتہ رفتہ مار ڈالنا ✦

پھانسی بذریعہ ایک ریشمی رسی کے لگائی جاتی ہے دو جلاد دونوں کناروں کو کھینچتے ہیں۔ یا بذریعہ ایک آہنی طوق کے دیجاتی ہے جو پیچ سے کسا جاتا ہے۔ اور وہ بہت کچھ مشابہ گیروتی کے ہے جو فی الحال اسپین میں رائج ہے۔ اول قسم شہزادگان خاندان شاہی کے واسطے مخصوص ہے۔ دوسری قسم اوس وقت استعمال ہوتی ہے جب موت کا اخفا منظور ہوتا ہے ✦

سر کاٹ ڈالنا سزائے عوام ہے جو جملہ جرائم عامہ کی پاداش میں دیجاتی ہے۔ سر کاٹنے کی ترکیب بہت آسان ہے اور بوجہ تیزی اور وزن تلوار کے اور نیز ہوشیاری جلادوں کی' بڑی جلدی سے کام تمام ہوتا ہے۔ چھریاں بھونک کر رفتہ رفتہ مار ڈالنے ... ذیل جرموں کے واسطے دیجاتی ہے کی سزا مندرجہ ... پدرکشی (۴) رشتہ دار کے ساتھ زنا (۱) بغاوت (۲) ... سزا نافذ کیجاتی ہے اوس سے کرنا۔ جس ترکیب سے یہ ... مجرم کو ایک مجرم کی تکالیف دوچند ہوجاتی ہیں ... کے ہاتھ ستون سے مضبوط باندھتے ہیں اور اس کا سر بالوں رسیوں سے جکڑتے ہیں اور ...

ایک تختہ چوبی پر رکھ دیتے ہیں مجسٹریٹ تعمیل حکم پر مامور ہوتا ہے ایک ڈھکی ہوئی ٹوکری میں سے ایک چھری نکالکر دیتا ہے۔ اس چھری کی دستہ پر اوس حصہ بدن کا نام لکھا ہوتا ہے جس میں وہ جاتی ہے۔ یہ ہولناک اذیت جاری رہتی ہے تاوقتیکہ اتفاقیہ وہ چھری نہ نکل آئے جس پر دل یا اور کوئی اسی قسم کا عضو لکھا ہو۔ مجرم کے احباب عموماً ... ہیں کہ مجسٹریٹ کو کچھ دیکر اول ہی مرتبہ اوس عضو کو نکلوا لیتے ہیں جس سے جان نکلجائے۔ ایک ... لکھتا ہے کہ اس قسم کی موت میں مجرم کے ... ہڈی اور دیگر گوشت دار حصہ جسم پر آٹھ سے لیکر ... ان زخم کئے جاتے ہیں' بعدہ دل زخمی کیا جاتا ہے ... مجرم اس طرح مرجائے تو اوس کا جوڑ جوڑ علیحدہ کر کیا جاتا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں دس واقعے اس قسم کی ... کے ہوئے تھے اور ان کا اعلان سرکاری ... میں ہوا تھا ✦

سر کاٹے جانے سے چینی بہت ڈرتے ہیں۔ یہ عقیدہ ہے کہ جو اس دنیا سے بے سر یا بغیر کسی عضو کے جائیگا وہ آخرت میں بھی اوسی طرح رہیگا لہٰذا لاش کے ساتھ سر کو بھی دفن کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ ایک فرانسیسی افسر لکھتا ہے کہ پیکن کی عدالت میں آخری اجلاس کے دن حسب استدعا ... ایک ایسی جگہ میرے واسطے مخصوص کر دی گئی تھی کہ جہاں سے میں سب کو دیکھ سکتا تھا اور مجھے کوئی نہ دیکھتا تھا۔ اجلاس کے کمرے میں بلحاظ عمارت کے کوئی بات عجیب نہ تھی اوس کے دروازہ پر باہر کی طرف ایک دہلیز بنی ہوئی تھی جس پر اسی زمانے کی نقاشی والے چمکدار رنگوں سے منقش کی گئی تھیں۔ ابتدائی حصہ عدالت کا اون عمارات سے ... جو بطور حوالات کے استعمال ہوتی ہیں ...

ٹہے بڑے موٹے بانسوں کے بنے ہوئے
ہوزے تھوڑے فاصلے پر لگے تھے اور مجرم بوقتِ
شب اُن میں بند کر دئے جاتے تھے - اِسی حصّہ
عمارت میں ایک گروہ تباہ حال مخلوقات کا تھا جنکی
مناڈ بلے اور چہرے کالے تھے اور چند میلے
بیلے چیتھڑوں سے ڈھکے ہوئے دھوپ میں پڑے
تھے بعض کے پاؤں بذریعہ زنجیر آہنی کے ایک
ایسے بھاری بوجھ سے باندھ دئے گئے تھے کہ وہ اوس
مطلقاً نہیں سرکا سکتے تھے اور جس کے گرد وہ اِس
گھومتے تھے جس طرح کوئی جنگلی جانور کٹہرے
ں بند ہوا اور صرف چند فٹ جگہ میں متواتر پھرتا ہو
ہوں کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے ایسے جکڑے
ئے تھے کہ وہ صرف کود کود کر چل سکتے تھے اور
ن کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت
میں تھے - ایک قیدی کا بایاں ہاتھ اور
یدھا پاؤں چند انچ موٹے تختے سے باندھ گیا
تھا - اوس کی گردن میں ایک بھاری طوق تھا جس
ں ایک زنجیر آہنی لگی ہوئی تھی - ایک سپاہی اِس
زنجیر کو پکڑے ہوئے آگے کھینچتا تھا دوسرا پیچھے سے
ہوڑے مار کر اوس مجرم کو چلا رہا تھا - یہ مصیبت زدہ
م بمشکل اپنی دوسری ٹانگ کے (جو کھلی ہوئی تھی)
ی مشکل سے رینگ رینگ کر چلتا تھا - اوسکا
جسم دوہرا ہو گیا تھا اور یہ صورت سخت تکلیف دہ
تھی •

ایک چور کو نکراسکی کٹھرے میں بند کر دیا تھا - ذرا اِس
حال پر غور کیجئے کہ ایک بھاری پیپا اوندھا کر دیا گیا
اوس میں ایک انسان دبکا کر بٹھایا گیا - تین گول
سوراخوں میں سے اوس کا سر اور دونوں ہاتھ باہر
نکالدئے گئے - یہ سوراخ اِس شدت سے تنگ
ہیں کہ وہ اُن اعضا کو حرکت نہیں دے سکتے - پیپے کے

بوجھ سے اوس کے کندھے
اور جب وہ حرکت کرتا ہے تو پیپا
چلتا ہے - اگر وہ آرام چاہتا ہے
بل جھک کر ایک بڑی تھکانیوالی
اور اگر وہ چلنا چاہتا ہے تو اِس پیپے پہ
مشکل سنبھالا جاتا ہے - اِس حالت سے
کرنے سے کہ اِس قسم کی ایک مہینے کی قید کو
کیونکر کاٹے گا انسان کی طبیعت گھبراتی ہی •
یہ کمبخت مجرم ازخود کھا پی بھی نہیں سکتا تھا - اوس کی
بیوی نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی تھی - خیال کرو کہ
ایک عورت پیپے کے پاس کھڑی ہوئی بذریعہ پتلی
لکڑیوں کے اُبلے ہوئے چانول اپنے شوہر کے
منہ میں ڈھکیل رہی ہے اور لمحہ بہ لمحہ ایک پرانے
چیتھڑے سے اُس کے چہرہ کا پسینہ پونچھ دیتی
ہے اور اوس کا شیر خوار بچہ جو اوس کی پیٹھ سے
بندھا ہوا ہے مصیبت سے ناواقف ہنستا جاتا
ہے اور اپنی ماں کے بالوں سے کھیلتا ہی •
تھوڑی دیر میں اجلاس کے کمرے کے کواڑ بڑی
چرچراہٹ سے کھلے - مجرم اندر لائے گئے - ایک
جانب اونچے چبوترے پر افسر اعلےٰ اپنا عدالتی
لباس پہنے ہوئے نظر پڑا - اوس کے سامنے
تھی - میز پر سُرخ چادر پڑی تھی - اوس کے اوپر
اور تشتریاں سیاہی گھولنے کی رکھی تھیں - ایک
الماری میں کتب قانون جنکے دیکھنے کی مع جلد
مقدمات میں ہو قطار در قطار لگی ہوئی تھیں جو
بڑی الماری میں لکڑی کے ... تھیں - ایک
اور اون پر ہندسے ... کہ صرف عزت
کے گرد اوس ... کر رہے ہوئے تھے - افسر اعلےٰ
پیچھے اوس ... نے مشیر اور حکام ماتحت
دو لڑکے ... کا پنکھا بردار کھڑا تھا - دو نو
... تکلف لباس پہنے ہوئے اف

نشان عہدہ لئے کہڑے تھے - اوس چبوترہ کی
بارہ سیڑھیاں تہیں - اوّل سیڑھی پر جلاد کہڑا تہا
ہوا اپنی آہنی تار کی ٹوپی اور سُرخ لباس سے خود
بخود نمایاں تہا - اوس کے دائیں ہاتھ میں ایک
بھاری ڈنڈا اور بائیں ہاتھ میں تلوار تہی - اوسکے
پیچھے اوس کے ماتحت افسر اور داروغۂ زندان
تھے - اُن کے ہاتہوں میں مختلف قسم کے آلات
ایذا رسانی تہے جو زور سے باخود ہلا کرتے تہے
اور معینہ توقف کے بعد بُری طرح سے کہانستے اور
کھارتے جاتے تہے تاکہ مجرموں پر خوف طاری
ہو -

باقی کمرہ پولیس کے سپاہیوں سے گہرا ہوا تہا
ان کے پاس ایک ایک چھوٹی برچھی تہی اور میان
واحد میں دو دو تلواریں ڈالی ہوئی تہیں - کمرہ میں
سرخ پردے دیواروں پر آویزاں تہے اور اون پر
مختلف فقرات لکھے تھے +

چند لوؤں کے مقدمہ کی کیفیت میں نے دیکھی
ہ ایذا رسانی کا حال لکھنے کی کوشش نہ کرونگا
مجرموں کو جرم کے انکار کرنے پر ہر بار دیجاتی
تہی - جب کوئی مجرم اپنی بیگناہی پر اصرار کرتا تہا
تو جج اوس بڑی الماری میں سے ایک ٹکڑا لکڑی
کا نکالکر جلاد کے پاس پہینکدیتا تہا - اِس لکڑی پر
نوعیت ایذا رسانی یا تعداد ضرب لاٹھی درج
ہوتی ہیں اور جلاد روبرو جج اور رجسٹرار کے فوراً اُس
کی تعمیل کردیتا تہا - جج اور رجسٹرار اون ادھورے
...کی یادداشت لکھتے جاتے تھے جو دورانِ
سزایابی اُس حالت جان کندنی میں مجرم کے منہ سے
... - ایک مورخ لکھتا ہے کہ چین میں خفیف
... ایک بہاری لکڑی کا طوق مجرم کو پہنا
... اِس طوق پر نوعیت جرم اوس قیدی کی
لکھدیتے ہیں اور ایک زنجیر میں باندھکر یا تو بازار میں
پہرایا کرتے ہیں یا ایک چوبی ستون میں اوس
جگہ باندھ دیتے ہیں جہاں اوس سے جرم سرزد ہوا تہا -

جیلروں کے ظلم - جیلخانوں کی غلاظت اور غذا
کی خرابی مجرموں کی تکلیفوں کو بہت زیادہ کردیتی
ہے علاوہ بریں ایک چھوٹی قسم کا کیڑا ہر چینی
جیلخانوں میں بکثرت ہوتا ہے - یہ کیڑے ذراسی
زمین کھودنے سے سیکڑوں نکل پڑتے ہیں - کوئی قیدی
جیلخانے میں ایسا نہیں جاتا جسکے بدن پر کچھ نہ کچھ زخم دوران
مقدمہ میں بوجہ لکڑی کی ضربوں یا زنجیروں سے بندھنے
کے نہ پڑ جاتے ہوں - اِس کیڑے کو ایسا ملکہ ہے کہ
سیدھا زخموں پر پہنچتا ہے - قیدی چونکہ زنجیروں سے
جکڑا ہوا اور مجبور ہوتا ہے وہ اِس کیڑے کو دفع نہیں
کرسکتا - حالانکہ اوس کو علم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ جب
یہ کیڑے چڑھ آتے ہیں تو سوائے تڑپ کر جان دینے
کے اور کچھہ نہیں ہوتا - ۱۸۳۹ء میں جب گورنمنٹ انگریزی
نے کینٹن پر قبضہ کیا تو اِسی قسم کے چند نیم مردہ اشخاص
ایک جیلخانہ میں ملے تھے +

نتیجہ غرضکہ چینیوں کیحالت بلحاظ عام شائستگی اور
طرزِ حکومت کے نہایت پست اور ادنی درجہ کی ہے
اور امید نہیں ہے کہ اون کے ملک میں ترقی کی روشنی
ظاہر ہو اور تہذیب کا بول بالا ہو - یہی باعث ہے کہ اونہوں
نے ایک چھوٹے سے ملک جاپان کے مقابلہ میں شکست
کہائی اور ذلت اوٹھائی اور یہی وجہ آیندہ اِس بات کی
ہوگی کہ اون کے ملک میں روس کو اقتدار حاصل
ہوجائے - آجکل چین کا پولیٹکل مطلع دھندلا ہے اور
کچھہ عجب نہیں ہو کہ بہت جلد وسکی آیندہ قسمت کا فیصلہ
ہوجائے اور اُس پر ہمیشہ کے لئے کسی یورپین گورنمنٹ
کا قبضہ ہوجائے +

(عبدالمجید خان)

آثار العجم

(۴)

تخت جمشید

یا

پرسی پولیس

صوبۂ فارس کے آثار قدیمہ میں "جمشید پیشدادی"[۱] کا قلعہ اور ایوان جسکا نام "تخت جمشید" ہے بلحاظ قدامت اور علم العمارات کی صنعتوں کے آثار العجم میں خاص کر قابل ذکر ہے - یہ عمارت اِس درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے کہ پارسیوں میں آج بھی اکثر عقیدتمند اطراف عالم سے جاکر تخت جمشید کا طواف کرتے ہیں - اور اپنی مردہ سلطنت کے گذشتہ جاہ وجلال کا مرثیہ پڑھکر دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں - چونکہ جغرافی اور تاریخی حیثیت سے تخت جمشید کے حالات اردو میں قلمبند نہیں ہوئے ہیں لہذا یہ مختصر مضمون ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے زمانہ حال کی تحقیقات میں تخت جمشید کا دوسرا نام پرسی پولیس ہے - اور اوس کو ایک جداگانہ شہر تسلیم کیا ہے - لیکن فارسی و عربی جغرافیہ کی کتابوں میں (جہانتک ہماری نظر سے گذریں) یہ دوسرا نام نہیں ہے - بلکہ اصطخر کے ذیل میں تخت جمشید کے حالات لکھے ہیں ❖

---

[۱] طبقۂ پیشدادیان میں جمشید چوتھا تاجدار ہے - یہ طہمورث کا بھتیجا تھا - چونکہ طہمورث لاولد فوت ہوا اسلئے ارکان سلطنت نے جمشید کو تخت نشین کیا - اُس کا عہد حکومت عدل وانصاف اور تمدن ومعاشرت کی اعلیٰ ترقیوں کی وجہ سے ضرب المثل ہے - حکمرانی میں جمشید کا طرز عمل طہمورث اور ہوشنگ کے آئین (ہوشنگ کے عہد کا قانون سلطنت حال میں صفہان سے چھپکر شائع ہوا ہی) پر تھا - تخت نشینی سے بعد سب سے پہلے دار السلطنۂ اصطخر کو وسیع کیا اور اُس میں نہایت وسیع الشان عمارتیں تیار کرائیں خاص کر قصر شاہی جس کا نام "تخت جمشید" ہے - جب یہ محل بنکر تیار ہوگیا اور آفتاب عالمتاب نقطۂ اعتدال ربیعی میں پہنچا اُسوقت اِس محل کا افتتاحی جشن کیا گیا - اور اُسدن کا نام "نوروز" قرار پایا - چنانچہ پارسیوں میں ہنوز یہ یادگار مانی جاتی ہے اور مثل عید کے عام جشن کیا جاتا ہے - جمشید کی ایجادات حسب ذیل ہیں (۱) انگور سے شراب بنائی اور اوس کا نام شاہ دارو رکھا (۲) لوہا گلاکر خود، زرہ، جوشن، خفتان، برگستوان، تلوار اور نیزہ تیار کیا (۳) روئی اور ریشم سے کپڑے بنوائے (۴) خیاطی اور شناوری ایجاد ہوئی (۵) غوطہ لگاکر سمندر سے موتی نکالے گئے (۶) پانی اور مٹی سے اینٹ بنائی (۷) کانوں سے جواہرات نکالے - (۸) عطر و دواؤں سے مرکبات تیار ہوئے (۹) عطر اور خوشبو کا استعمال کیا گیا (۱۰) حمام تیار ہوا - (۱۱) جنگل کے اندر سے شہروں کے جانیکو سڑکیں نکالی گئیں (۱۲) تمام ملک کی آبادی کو مثل اربع عناصر کے چار حصوں پر تقسیم کیا - (۱) ارباب دانش (علما وحکما وغیرہ) (۲) ارباب فوج (۳) ارباب زراعت (۴) ارباب صنعت وحرفت - حکیم فیثاغورث یونانی اُس کے اساتذہ میں تھا جسنے جمشید کیواسطے علم موسیقی ایجاد کیا اور کئی قسم کے باجے تیار کئے جب جمشید کی سلطنت عروج پر پہنچگئی اور ہر قسم کے سامان راحت مہیا ہوگئے اس وقت اسکی عقل جاتی رہی اور مغرور ہوکر انا ربکم الاعلیٰ کا دعوی کرنے لگا - سب سے پہلے خروج پر اپنی خدائی کا اظہار کیا بعدہٗ عام حکم جاری کیا کہ میری پرستش کرو اور اِس مقصد کے لئے تمام ممالک میں اپنے مجسمات (اسٹیچو) بھیجدیئے - جب اِس شرک اور کفر میں سولہ برس گذر گئے اور رعایا جمشید کے جور وستم سے پریشان ہوگئی - اُسوقت شداد بن عاد نے اپنے بھتیجے ضحاک ابن علوان (عجمی علوان کو مرداس کہتے ہیں) کو بہ راہ بابل ایک جرار فوج کے ساتھ اصطخر کو روانہ کیا جمشید تاب مقابلہ نہ لاکر بھاگ گیا لیکن آخر کو گرفتار ہوکر قتل ہوا (یا یہ کہ کسی پہاڑ کے غار میں چھپ رہا اور پھر پتا نہ چلا) پارسی جمشید کے دعوے خدائی سے منکر ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ "جمشید پیغمبر تھا" - بلکہ بعضوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جمشید بتایا ہے - اور زوال سلطنت کی نسبت انکا یہ بیان ہے کہ جب لوگوں نے جمشید کے عہد پیمان کو بھلا دیا تو خدا نے بجائے اُس کے ضحاک جیسے ظالم کو بادشاہ بنایا" حضرت جمشید ابتدائی عہد میں تھے (انتخاب ناسخ التواریخ جلد اول)

پرسی پولیس یورپ کے مشہور جغرافیہ نویسوں کے قول کے مطابق اول ہم پرسی پولیس کا مختصر بیان کرتے ہیں بعدہٗ اوس عمارت کا ذکر کریں گے جسکو اہل عجم تخت جمشید کہتے ہیں عجم کے مورخ اور جغرافیہ نویس لکھتے ہیں کہ اصطخر[1] میں جو آثار قدیمہ باقی ہیں وہ جمشید کی یادگار ہیں اور چونکہ اصطخر اُسکا دار سلطنت تہا لہذا اس یادگار کا نام تخت جمشید قرار پایا ♦

موجودہ[2] اصطخر لب دریائے مرغاب نقشہ میں ۳۰ درجہ دقیقہ پر واقع ہی (عرض بلد مطابق طول بلد کے ہے) اور اندازاً ایک ڈگری یعنی اصطخر سے ۶۹ میل کے فاصلہ پر جانب شمال پرسی پولیس واقع ہے۔ چنانچہ رصد گرینج[3] سے طول اور عرض بلد پرسی پولیس کا حسب ذیل ہے۔

طول بلد ۲۹ درجہ ۵۵ دقیقہ۔

عرض بلد ۵۲ درجہ ۴۵ دقیقہ۔

لیکن یہ شہر اُن علامتوں میں دکھلایا گیا ہے جن میں زمانہ قدیم کے تباہ و برباد شدہ شہر دکھلائے جاتے ہیں۔ فانڈیک[4] امریکانی مشہور مصنف اپنے جغرافیہ "مرآۃ الوضیہ فی الکرۃ الارضیہ" میں لکھتا ہی کہ شیراز کے شمال مشرق میں بمسافت ۴۴ میل ایک حصہ شہر فرسی پولیس (پرسی پولیس) کا واقع ہے سکندر نے ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے اِس جگہ قیام کیا تہا ♦

مذکورہ بالا شہادتوں سے یقین ہوتا ہے کہ اصطخر کے متصل ایک دوسرا شہر واقع تہا جس کا نام پرسی پولیس تہا اور چونکہ تخت جمشید مذکورہ بالا شہروں کے بین بین واقع ہوا تہا لہذا کتب جغرافیہ اور تاریخ میں مشترک طور پر اسکے حالات قلمبند ہوئے ہیں ♦

انگریزی مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے چونکہ زمانۂ حال میں تخت جمشید کے حالات لکھے ہیں اور انقلاب روزگار سے آج یہ دونوں شہر برباد ہو چکے ہیں۔ اور زیادہ حصہ تخت جمشید کا پرسی پولیس سے تعلق ہے۔ لہذا اونہوں نے اوس کو پرسی پولیس سے تعبیر کیا ہے۔ اور چونکہ اصطخر فتوحات اسلام سے آل ہے۔ اور عہد اسلام میں اکثر حصے اِس عمارت کے بجا خود قائم تھے، لہذا اسلامی مورخوں نے اصطخر کے واقعات میں تفصیل سے اِس عمارت کا ذکر کیا ہے زمانہ حال کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہی کہ پرسی پولیس اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کے ممتاز شہروں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸)

[1] اصطخر صوبہ فارس کا مشہور و معروف شہر ہی جس کا بانی کیومرث پیشدادی ہے۔ کیومرث کے بعد ہوشنگ نے اصطخر کو خاص طور پر آباد کیا تہا۔ لیکن عہد جمشید میں بلحاظ آبادی اور ترقی عمارت یہ شہر بہت کچھ ترقی کر گیا تہا۔ کیونکہ حد خفرک سے اخیر رامجرد تک ۴۴ میل طول اور ۳۰ میل عرض میں آبادی تہی۔ اصطخر کے تین پہاڑی قلعے ضرب المثل تھے (۱) قلعہ اصطخر۔ (۲) قلعہ شکستہ (۳) قلعہ شکوان (سرگندان) (دارا ن بی کہتے ہیں) لیکن اب صرف نمبر۱ باقی ہی اور قریب تنوخاندان کے ایک آباد ہیں اور یہی آبادی ہی جو اصطخر کا نام زندہ کئے ہوئے ہی۔ شاہان عجم بعہد قدیم دار السلطنت یہی ہی اور بعض خلفا نے ہمیشہ یہیں رہا کرتے تھے ناحیہ اصطخر کے مشہور شہر یہ تہی (۱) بیضا، میبذ، نیریز، ابرقوہ، ہیرد [illegible] ہما دختر بہمن ملکۂ ایران نے اس شہر میں ایک عظیم الشان آتشکدہ بنایا تہا پھر نہیں معلوم کس خیال سے اسکو خود ہی برباد کر دیا۔ علامہ مسعودی نے اپنے سفرنامہ میں اِس آتشکدہ کا ذکر کیا ہی۔ ۲۳ھ میں یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اِس عہد تک زوال کے آثار بہت کم نمایاں تھے۔ الپ ارسلان سلجوقی نے جب اُسکو فتح کیا تو خزانہ میں فیروزہ کا ایک پیالہ برآمد ہوا جس پر جمشید کا نام کندہ کیا ہوا تہا۔ (انتخاب از گنج دانش صفحہ ۳۰ و جغرافیہ خواجہ حمد اللہ مستوفی صفحہ ۲۸۵) ♦

[2] جغرافیہ جام جم مطبوعہ اصفہان صفحہ ۵۷ و تاریخ ایران نواب ملکم صاحب باب صفحہ ۱۰ مطبوعہ بمبئی۔

[3] نقشہ نمبر ۱۹ صوبہ فارس اٹلس جان بارتھولومیو۔

[4] نقشہ نمبر ۹ فتوحات سکندر اعظم ہسٹوریکل اٹلس بزبان جرمن (اپنی طرز اور تحقیقات میں یہ اٹلس بے نظیر ہے) ♦

کہ جاتا تھا - اور چونکہ قدرتی طور پر اس کی آبادی صحرائے مرودشت کے اندر تھی اس لئے آب وہوا بھی نہایت عمدہ تھی اور چشمۂ بندہ امیر (بندہ تیمور) اور ویلور کی فیاضیوں سے یہاں کی زمین ہمیشہ سرسبز رہتی تھی - چنانچہ پرسی پولیس سے بندہ امیر کا یہ فیاضانہ سلوک ہنوز قایم ہے - اور تین جانب سے بلند دیواریں مثل شہرپناہ کے پرسی پلیس کو محاصرہ کئے ہوئے ہیں +

دایوڈورس یونانی مورخ لکھتا ہے کہ پہلی دیوار ۱۶ مربع فیٹ بلند تھی - اور دوسری دیوار بھی طول وعرض میں مثل اوّل کے تھی - لیکن اسکا ارتفاع دوچند تھا - تیسری دیوار پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھی اور ساٹھ فیٹ بلند تھی +

بانی پرسی پولیس نے یہ عظیم الشان دیواریں ملک کی حفاظت اور اپنی شان وشوکت دکھلانیکی غرض سے بنائی تھیں - اور ان دیواروں کو موجودہ عمارت تخت جمشید سے خاص تعلق ہے +

تخت جمشید تخت جمشید کو اصطخر اور پرسی پولیس سے جو تعلق ہے وہ مذکورہ بالا تمہید سے واضح ہوچکا ہے - اب ہمیں ایک قصر رفیع الشان کی حیثیت سے اُس کا مختصر حال لکھا جاتا ہے +

جس قدر ٹوٹی پھوٹی عمارت تخت جمشید کی اس وقت باقی ہے اُس کا طول شمالاً جنوباً پانسو فیٹ اور عرض شرقاً غرباً نوسو فیٹ ہے - کل عمارت تین چھتوں (سہ بام) پر تقسیم ہے - اور یہ تقسیم اسطرح پر ہے کہ ہرایک چھت دوسری کے مقابلہ میں درجہ بدرجہ پست ہوتی گئی ہے -

چھتیں کم سے کم ایک سو اسی فیٹ اور زیادہ سے زیادہ پانسو پچاس فیٹ عریض ہیں - لیکن سطح پر زمین سے ان چھتوں کی بلندی ۲۲ فیٹ سے ۳۵ فیٹ تک ہے - اور ان پر جانے کے لئے دوسمتوں سے طولانی سلسلہ پتھر کی سیڑھیوں کا قائم ہے (ایک میں ۵۸ اور دوسرے میں ۴۸ سیڑھیاں ہیں) اور ہرایک سیڑھی اسقدر چوڑی ہے کہ سوار بلاتکلف آمدورفت کرسکتا ہے -

ان سیڑھیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات ہے کہ کوٹھے پر چڑھنے والا مسافر ہر ہر قدم پر اپنے چہرہ کے خط وخال ان پتھروں میں دیکھتا جاتا ہے گویا ہر سیڑھی کا پتھر حلب کا آئینہ ہے - جن میں بعینہ صورت نظر آتی ہے - نواب محمد تقی خاں بہادر تاریخ ایران میں تحریر فرماتے ہیں کہ "یونانیوں نے انہی پتھروں کو دیکھکر فلزات کا آئینہ بنایا تھا جسکا نام آئینہ سکندری رکھا گیا" +

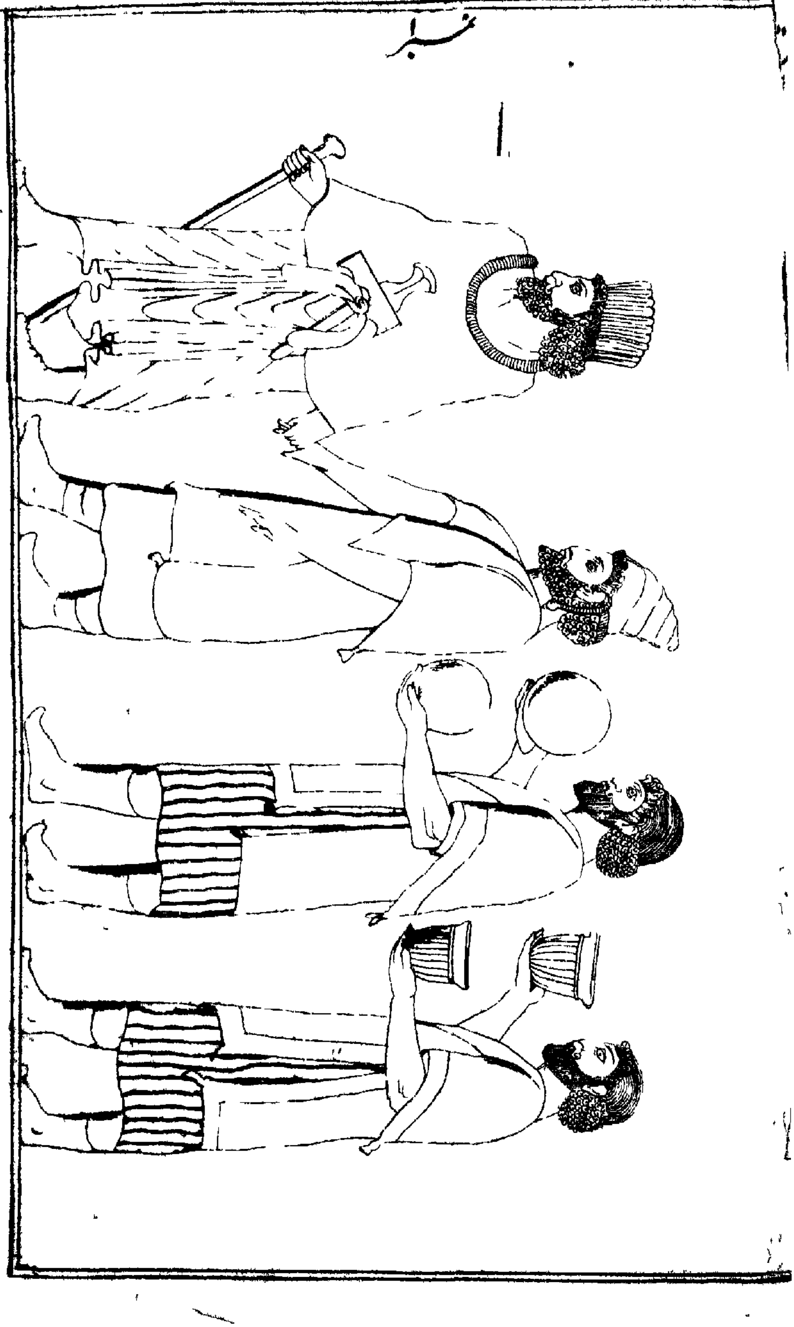
بالاخانہ پر پہونچکر جو چیز سب سے عجیب اور دقیق الصنعت سیاح کو نظر آتی ہے وہ دو ستون ہیں جن کے سروں پر عظیم الجثہ اور ہولناک شیروںکے مجسمے ہیں - بقیہ ستون میں مختلف ملک ودیار کے باشندوں کی تصویریں ہیں جو شکل وصورت اور وضع لباس میں ایک دوسرے سے الگ ہیں +

چونکہ اس عجائب خانے سے بطور نمونہ کے ہم نے صرف چار شخصوں کے فوٹو لئے ہیں لہذا ہم اون کی اجمالی حالت پر نظر ڈالتے ہیں +

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۹)

دیکھو صفحہ ۵ - احالات بلاد فارس اصطخر مطبوعہ بمبئی +

لہ - صفحہ ۳۰ - عجائبات اصطخر مطبوعہ اصفہان ۱۳۱۲



مورخین نے بعد تحقیقات کامل ان تصاویر کی نسبت یہ قیاس کیا ہے کہ یہ ممالک ایران کی باجگزار رعایا ہے جو جشن نوروز کے موقع پر اپنے شاہنشاہ کو سلام کرنے آئی تھی۔ اور چونکہ رعایا اپنے تئیں ایک وفادار اور فرمانبردار قوم ثابت کرنا چاہتی ہے لہذا حسب حیثیت تحائف نذر کے واسطے لئے جاتی ہے۔

ان جماعتوں میں سب سے پہلے سرداران قوم پر نظر پڑتی ہے جن کے ہاتھ میں معمولی عصا اور کمر میں پرانی وضع کی تلوار یا کٹاری ہے۔ اُن کے پیچھے عام رعایا ہے۔ جن کے ہاتھوں میں گلدستے، پیالے، رکابیاں، سنان، خنجر اور آلات کشاورزی ہیں۔ پیالوں میں مصری اور رقاب و رکابیوں میں میوہ و مٹھائی ہے۔ ایک جماعت اُن کے بعد اور نظر آتی ہے جن میں کچھ لوگ اونٹ، گائے، بیل، گھوڑے اور بھیڑ کو ہانکے لئے چلے آتے ہیں اور کچھ گاڑی یا چھکڑے ہانک رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ بعینہٖ مثل کہاروں کے کاندھے پر بہنگی رکھے ہوئے اوڑے چلے جاتے ہیں۔ اور سب کی نظریں قصر معلے کی جانب لگی ہوئی ہیں گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو حضور میں پہونچ کر باریاب ہوں۔ آگے سرو کے درختوں کی قطار ہے جن سے یکایک دو شیر نکلکر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ (یہ شیر علاوہ ستون کے ہیں جو سیڑھیوں کے ایک جانب ہیں) سنگ تراش نے یہ مرقع اس طرح پر سجایا ہے کہ شیروں نے بارہ سنگوں ا
ہرنوں کو پشت کی جانب سے جا دبایا ہے
غرضکہ شیر کی دوڑ اور ہرن وغیرہ کی اضطرار
حالت قابل دید ہے یعنی یہ صحرائی جانور تڑ
تڑپ کر موذی کے پنجے سے نکلنا چاہتے ہ
اور نہیں نکل سکتے۔

علاوہ تصاویر کے ستون مذکورۂ بالا میں تی
لوحیں بنی ہیں۔ ہر لوح میں بیس سطریں ہیں لیکن
رسم خط ہر لوح کا جداگانہ ہے۔ مبصرین فن
بابل اور نینوا کے کھنڈرات کی اینٹ و پتھر
نوشتوں سے ملا ملاکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تح
قدیم کردستان، خراسان اور آذربائجان لوگ
کی ہے۔ اس قیاس کی تائید یوں بھی ہو
ہے کہ ہر تصویر اپنے ملک کا ایک خاص
مارکہ (نشان و علامت) رکھتی ہے۔ مثلاً گا
کا ہانکنے والا بتا رہا ہے کہ جنوبی ایران کا گوالا
اونٹ کی سجاوٹ سے پایا جاتا ہے کہ
عراق عرب کا باشندہ ہے۔ اور صبا رفتار
گھوڑا یہ جتلا رہا ہے کہ وہ خراسان سے آیا
انہی چیزوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باجگزار
میں بدوی اور شہری دونوں قسم کی رعایا شامل
ہے۔ غرضکہ متفرق طور پر انیس جماعتیں ہیں
جن کا ایک ادنیٰ نمونہ مندرجہ بالا تصویر ہے

حضرات ناظرین معارف یہ ہرگز نہ خیال کریں کہ
مرقع میں تمام جماعتوں کی تصویریں کھینچی ہیں یہ تو صرف ا
جماعت کی تصویر ہے جن سے ہمارے مضمون
مندرجۂ بالا بیان کا ایک ہلکا سا خاکا ذہن میں آسکے
اور بس۔ مگر جو بیان ہم نے تصویروں اور لوحوں کا کیا
وہ پورے مرقع کا بیان ہے۔

(عبدالرزاق)

۱؎ یہاں انیس جماعتوں میں سے صرف ایک جماعت کی تصویر دی گئی ✦

[پولیٹ]یکل اکانومی کا علم کیا سکھاتا ہے؟

عربی زبان میں متقدمین نے اس علم کا نام تدبیر المدن
[ن]ظام المدن وسیاست المدن رکھا تھا اور متاخرین نے
[ا]قتصاد سیاسی وعلم ثروت نام رکھا ہے۔ مگر میں انگریزی نام کو
[ان] ناموں پر اس وجہ سے ترجیح دیتا ہوں کہ پُرانے ناموں کا
[لباس] اس نئے علم کے بدن کے لئے بالکل چھوٹا ہوگیا ہے اور نئے
[نامو]ں کا لباس اُسکے جسم کے لئے ٹھیک کترا نہیں گیا۔
[علا]وہ اس کے ہماری زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ
[کا] اختلاط روز بروز اس قدر بڑھتا جاتا ہے کہ اب انگریزی الفاظ
کا استعمال ہماری زبان میں مکروہ اور معیوب نہیں معلوم ہوتا
یہی ایک علم ہے کہ سب لوگ بغیر سیکھے اور پڑھے لپنے
[تئ]یں اس کا عالم جانتے ہیں۔ اُس کا موضوع دولت ہے اس
[م]یں سارے مسائل دولت کی پیدائش اور مقاسمت ومبادلے
[ک]ے بیان کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ دولت
[کے] متعلق کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کو میں نہ جانتا ہوں
[مگر] اس مشکل علم میں ایسے عقدے لاینحل ہیں کہ فضلا اپنی
[س]اری عمریں اس علم کی تحصیل وتکمیل وتحقیق وتدقیق میں
[صرف کرت]ی ہیں ان کو کماحقہٗ نہیں حل کر سکے ۔
اس علم کی طرف بہت کم لوگ توجہ کرتے ہیں۔ دیسی
[زبانو]ں کے مدارس میں اُس کے درس وتدریس کا نام نہیں
[اس سب]ب میں بتاتا ہوں کہ یہ علم جن جن باتوں کو بتاتا ہے اُن کا جاننا
[ملک ک]ی حالت کے بہتر کرنے کے لئے اور صاحب ثروت و دولتمند
[ہو]نے کے لئے کیسا ضروری ہے۔ اس علم کے جاننے والے مضامین
[ذی]ل پر بحث کرتے ہیں ۔

(۱) دولت کے معنے لوگوں کے دلوں میں یہ بیٹھے ہوئے ہیں کہ وہ سیم وزر وجواہر اور روپے پیسے کا نام ہے۔ یہ علم اس مغالطہ کو دلوں سے نکالتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اس غلط فہمی سے کیا کیا نقصان ہوتے ہیں ۔

(۲) دولت کے پیدا کرنے کے تین ذریعے ہیں - زمین محنت، سرمایہ ۔

(۳) محنت جو ذریعۂ دولت ہے اس کے اقسام کیا کیا ہیں اور اُنسے اشیا میں کون کونسی قابلیتیں فائدہ رسانی کی پیدا ہوتی ہیں -

(۴) سرمایہ کے مغالطات کو بیان کرتا ہے -

(۵) یہ ذرائع دولت کیا کیا تدابیر کرتے ہیں جنکے سبب سے کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے -

(۶) دولت کے زیادہ اور کم پیدا کرنے کے پیمانے کیا کیا ہیں؟

(۷) وہ کونسے قوانین ہیں جنسے دولت کی افزایش کی تشخیص ہوتی ہے -

(۸) سرمایہ کیونکر بڑھتا ہے -

(۹) دولت کیونکر تقسیم ہوتی ہے -

(۱۰) کن جماعتوں میں دولت تقسیم ہوتی ہے -

(۱۱) زمین کے لگان کیونکر مشخص ہوتے ہیں -

(۱۲) محنتیوں کو مزدوری کیونکر ملتی ہے -

(۱۳) نفعے کیونکر ہوتے ہیں -

(۱۴) کاشتکار مالک زمین ہوں تو کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔

(۱۵) زمین کی مالگذاری کے بندوبست کس کس طرح سے ہوتے ہیں اور اون کے نفعے ونقصان کیا ہوتے ہیں

(۱۶) قومی تعلیم اور دیگر علاج کثرت اُجرتوں کے لئے -

(۱۷) ٹریڈس یونین یعنی ایسی جماعتیں جو محنتیوں کی اجرتوں کے بڑھانے میں کوشش کرتی ہیں - محنتیوں کا کام بند کرنا کارخانہ داروں کا محنتیوں کو یک لخت موقوف کرنا -

(۱۸) نئی زمینوں کا آباد ہونا -

(۱۹) غلاموں کی محنتوں کا انتظام -

(۲۰) مالیت اور مول اجناس و اشیا کا -

(۲۱) قوانین جنکے موافق اسباب کی قیمت مشخص ہوتی

(۲۲) نباتات و معدنیات کی قیمتوں کا بیان -
(۲۳) صناعت کی چیزونکی قیمتوں کا بیان -
(۲۴) اشیا مسکوکہ -
(۲۵) اشیا مسکوکہ کی قیمت -
(۲۶) قومونکی باہم تجارت -
(۲۷) قیمتی دھاتوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا -
(۲۸) ایکسچینج یعنی مبادلہ جو غیر ملکوں سے ہوتا ہے -
(۲۹) ساکھ یا اعتماد جو منڈیں کرتے ہیں -
(۳۰) اعتماد کا اثر جو قیمتوں پر ہوتا ہے -
(۳۱) سود کی شرح -
(۳۲) قومی ترقی کیحالت میں نفعوں کا میلان کمی کی طرف ہوتا ہے -
(۳۳) رسد کی زیادتی -
(۳۴) زمانہ حال میں جو سونے چاندی کی کانیں نئی نکلی ہیں اُن کا اثر -
(۳۵) چاندی کی قیمت کا گھٹنا جیسے کہ ہمارے ملک کا روپیہ قیمت میں بہت گھٹ گیا ہے -
(۳۶) ٹیکسوں کا لگنا -
(۳۷) انکم ٹیکس -
(۳۸) اجناس و اشیا پر ٹیکسوں کا لگنا اور بعید ٹیکس -
(۳۹) زمین پر ٹیکسوں کا لگنا -
(۴۰) محتاجوں اور قحطوں کے لیے ٹیکس کا لگنا -
(۴۱) خیرات کا اثر محتاجی پر -
(۴۲) مختص المقام ٹیکس اور اون کے اغراض و اغراض -

اب کوئی تبلائے کہ ہم نے اِن مضامین میں سے کون سے مضامین اپنی زبان میں تحصیل کئے ہیں - کل ماحصل اِس علم کا یہ ہے کہ آدمی وہ قوانین و اُصول جانے جنسے قوموں کی دولت کم و بیش ہوتی ہے کیونکہ انگلستان ساری دنیا میں زیادہ دولتمند ہے اور کیا ہندوستان اُس کی نسبت نہایت مفلس ہے؟ حالانکہ دونوں میں ایک ہی برٹش گورنمنٹ ہے - زمانہ کے انقلابات دیکھئے کہ پہلے لوگ صناعت و تجارت کو پسند نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ رذیل قوموں سے متعلق ہیں اور اہل سیف و اہل قلم ہونے کو عزت سمجھتے تھے - یا اب یہ حال ہے کہ تجارت سے بڑھ کر کوئی قومی ترقی کے لئے نہیں ہے - تاجروں کے سامنے اہل قلم اور صاحب شمشیر دونوں سر جھکاتے ہیں اور یہ دو گروہ بلحاظ دولتمندی اور تونگری کے تجارت پیشہ گروہ کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے - جو قومیں ساری دنیا میں تجارت کر رہی ہیں وہی ہر ملک کی دولت میں ساجھی ہیں - ان سب باتوں کو میں نے مفصل میری کتابوں میں بیان کیا ہے جو بالفعل چھپ رہی ہیں اگر لوگ اُن کو سمجھ کر پڑھیں گے تو اپنی لاعلمی سے آگاہ ہونگے اور شاید کچھ فائدہ اُن پر عمل کرکے اوٹھائیں گے +

(ذکاء اللہ)

ریاضتِ جسمانی سے کیا فائدہ ہے؟

جو لوگ ریاضت جسمانی کے عادی ہیں اُن کے بدن طاقتور اور تندرست رہتے ہیں - اُن کے اعضا مضبوط ہوتے ہیں - اون کے قوا میں ترقی ہوتی ہے وہ ہر کام کو نہایت سہولت سے انجام دیتے ہیں محنت کے کاموں سے جی نہیں چُراتے - اون کی رگ رگ میں چستی اور چالاکی دوڑ جاتی ہے - قدیم زمانہ کے لوگ ریاضت کی طرف بہت مائل تھے - یونانی ایک مدت دراز تک اولمپین کھیلوں میں نام پیدا کرتے رہے - اِن کھیلوں میں جو شخص سب سے

...زیادہ چست و چالاک ہوتا تھا اوس کو قوم کی طرف سے انعام دیا جاتا تھا۔ یونان کے واضعان قوانین کا ان جلسوں سے مقصد یہ تھا کہ یونانی عام طور سے تندرست طاقتور ہوں اور ملک کی بہبودی اور حفاظت کے لیے فوجی خدمات انجام دے سکیں۔ رومیوں کا مقصد ریاضت جسمانی سے یہ نہیں تھا۔ وہ وحشیانہ پہلوانی اور جنگجوئی کے افعال سے محض تفریح حاصل کرتے تھے اور بس ✦

ریاضت کا سب سے مقدم فائدہ یہ ہے کہ اُس سے حرکت کے اعضا کی طرف وہ سیال مادّے کھنچکر آتے ہیں جن پر انسانی زندگی کا مدار ہے۔ حرکت سے اعصاب میں ہیجان ہوتا ہے۔ خون کا دورہ تیز ہوجاتا ہے اور تمام بدن میں حرارت پھیل جاتی ہے۔ ریاضت میں جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے وہ بہت جلد بڑھنے لگتا ہے۔ اوس کا حجم پہلے سے زیادہ ہوجاتا ہے۔ وہ آسانی سے ہر طرف حرکت کرتا ہے۔ اُس کی طاقت بدرجہا بڑھ جاتی ہے۔ اُس سے ایسے ایسے کام ظہور میں آتے ہیں جنکا ظہور میں آنا ریاضت سے پہلے محال نظر آتا تھا۔ تمام اعصاب اور دوران خون کے تمام اعضا کا یہی حال ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک حرکت سے اعصاب کا فعل بڑھ جاتا اور خون کا دورہ تیز ہوجاتا ہے۔ اِس کے علاوہ ہاضمہ کا فعل جلد جلد ہونے لگتا ہے اور جسم میں یہ قابلیت پیدا ہوجاتی ہے کہ جو اجزا کام کرنے سے فرسودہ ہوجائیں اُن کی کمی کو آسانی کے ساتھ پورا کرلے۔ اِس حالت میں جب کھانا کھایا جاتا ہے تو غذا بدن کے ہر حصے کی پرورش کرنے کے لئے بدن کے تمام اطراف میں پھیل جاتی ہے۔ ریاضت کا فائدہ یہ نہیں ہے کہ بدن فربہ ہوجائے کیونکہ جو لوگ اکثر ریاضت کرتے رہتے ہیں وہ عموماً دُبلے ہوتے ہیں بلکہ اوس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بدن کے بیکار اجزا جلد جلد فنا ہونے لگتے ہیں اور اونکی جگہ نئے اور عمدہ اجزا پیدا ہوجاتے ہیں۔ ریاضت کرنے والوں کے وہ اعضا جن سے حرکت کا کام لیا جاتا ہے اون کی قوت اِس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

جو لوگ کسی طرح کی ریاضت نہیں کرتے اُن کے جسم کا بڑا حصہ بیکار رہتا ہے۔ اُس میں خون کا دورہ مکزور ہوجاتا ہے۔ عصبانی قوت بہی سست پڑجاتی ہے۔ ہاضمہ کا فعل بہی بگڑجاتا ہے۔ اعضا کا حجم گھٹنے لگتا ہے۔ عضلات ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔ جلد کی رنگت زرد پڑجاتی ہے۔ خون کی حرارت کم ہوجاتی ہے۔ آخرکار اوس حصہ بدن کو حرکت کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ جب عام طور سے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دی جائے تو دماغ اور دل کے افعال میں صریح کمزوری نظر آتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اعصاب۔ عضلات۔ اورده اور شرائین تنفس۔ ہاضمہ اور ادرار کے تمام نظام کمزور ہوجاتے ہیں حواس کے نظام میں بہی فرق آجاتا ہے۔ بیماریاں قبول کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ پہلا درجہ عصبی بیماریوں کا ہے جس میں بڑے بڑے شہروں کی رہنے والی عورتیں اکثر مبتلا ہوتی ہیں۔ اِس وجہ میں خاصکر وہ امرا بہی داخل ہیں جن کی زندگی عموماً سستی۔ بیکاری اور بیفکری میں گذرتی ہے۔ بدن کا حرکت سے بیکار رہنا سل کی بیماری کے مقدم اسباب میں سے ہے۔ اِس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ صاف ہوا میں ریاضت کرنا اِس بیماری کا نہایت مفید علاج ہے۔ صاف اور پاکیزہ ہوا میں ریاضت کرنے سے بدن کی ساخت کو بیحد تقویت ہوتی ہے اور طفاوی اور خنازیری بیماریوں کی قابلیت دور ہوجاتی ہے۔

مگر جب ریاضت حدِ اعتدال سے زیادہ کیجائے تو بجائے نفع کے اُس سے نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ

اُس کے بعد بجید تکان محسوس ہوتا ہو اور کام کرنیکا سکت باقی نہیں رہتا۔ دماغ پریشان ہو جاتا ہو اور صحیح طور پر کام نہیں دیسکتا۔ خون کا دورہ اِس قدر بڑھ جاتا ہو کہ اُس سے بخار کے پیدا ہونیکا اندیشہ رہتا ہو۔ ہاضمہ کا فعل بھی یا تو بالکل بند ہو جاتا ہو یا کمزور ہو جاتا ہو۔ بغرضکہ شدت سے ریاضت کرنا ہمیشہ مضر اور خطرناک ہوتا ہو۔ اُس سے بڑا نقصان سینہ کے اعضا کو پہونچتا ہے۔ پس تندرستی قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہو کہ ہر ریاضت کے بعد وقفہ کیا جائے تاکہ بدن کو راحت حاصل ہو اور حرکت اور سکون میں موازنہ قائم رہے تاکہ بدن کے جو اجزا کم ہو گئے ہیں، اون کی کمی پوری ہو سکے اور اِس کمی کو پورا کرنے کے لئے اعضا کو کافی وقت مل سکے۔

باوجود ان فوائد کے جو بیان کئے گئے، بعض بیماریوں کی حالت میں ریاضت کرنی بالکل ممنوع ہو مثلاً وہ بیماریاں جن میں خون کا دورہ تیز ہوتا ہو۔ بخار کے اقسام۔ سوزشی بیماریاں۔ وہ بیماریاں جن میں بدن سے خون نکلتا ہے۔ مزمن بیماریوں میں ریاضت کرنے سے البتہ فائدہ کی توقع ہو۔ مرگی اختناق وغیرہ عصبی اور دماغی بیماریوں میں بھی ریاضت کرنی نہایت مفید ہو، خاص کر ایسی ریاضت جس کے بعد آدمی تھک جائے۔

رومیوں اور یونانیوں کو ریاضت جسمانی کیطرف خاص توجہ تھی۔ اِن ملکوں میں ریاضت کے لئے جو اکھاڑا بنایا جاتا تھا، اوس کو جمناسٹیم کہتے تھے۔ جمناسٹیم کا لفظ جس مادہ سے مشتق ہوا ہے اوس کے معنے ننگے ہو سکتے ہیں۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اِن اکھاڑوں میں ریاضت کرنے والے بدن سے کپڑے اوتار دیتے تھے اور ایک چھوٹا سا قمیص پہن لیتے تھے۔ چونکہ اِس وقت کوئی اکھاڑا اُس زمانہ کا بنا ہوا موجود نہیں ہو اِس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس شکل کے ہوتے تھے۔ بعض مصنفوں نے اُن کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہو وہ یہ ہو کہ جمناسٹیم کے چار وسیع درجے ہوتے تھے۔ تین درجوں میں بہت سی کرسیاں بچھی رہتی تھیں اُن میں علما اور طلبا جمع ہو کر علمی مباحثے کرتے تھے اور اپنی تصنیفات لوگوں کو سناتے اور شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ چوتھے درجہ میں جو بارش اور آندھی سے محفوظ رہتا تھا، ذیل کے کمرے شامل ہوتے تھے۔ اوّل بیچ کا کمرہ جو وسیع ہوتا تھا۔ اُس میں بھی بہت سی کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ نوجوان یونانی اِس میں مختلف قسم کی ریاضتیں کرتے تھے۔ یہ ریاضتیں دو دو ملکر نہیں کرتے تھے بلکہ یہاں ہر ایک کو تنہا ریاضت کرنی پڑتی تھی۔ اِس کمرے کے دائیں طرف جو کمرہ ہوتا تھا اُس میں نہانے یا کشتی کرنے یا ریاضت کرنے سے پہلے کپڑے اوتار کر رکھدیتے تھے۔ اِسی کے قریب ایک حمام ہوتا تھا۔ ایک کمرہ اِس غرض سے بنایا جاتا تھا کہ اوس میں کشتی یا ریاضت کرنے سے پہلے بدن پر تیل کی مالش کیجائے۔ اُس کے ساتھ گرم پانی کا حمام بھی بنایا جاتا تھا۔ ایک کمرہ میں اکھاڑہ کھود لیا جاتا تھا اور اوس میں پہلوان کشتی لڑتے تھے۔ اِن کمروں کے آس پاس ٹہلنے کے لئے رستہ بنایا جاتا تھا۔ صحن میں پھولوں کے درخت لگائے جاتے تھے۔ اُس کے گرد بھی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔

یونانی اِن مکانوں کو اندر باہر سے خوب آراستہ کرتے تھے۔ اون میں دیوتاؤں۔ بہادروں۔ کشتی اور ریاضت میں نام پیدا کرنے والوں اور ہر پیشہ اور ہر کام میں ممتاز اور مشہور ہونے والے لوگوں کی مجسم مورتیں رکھی جاتی تھیں۔ دیواروں پر طرح طرح کے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے اور اون کو تصویروں سے بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ یونانیوں میں ریاضت

مشہور تا ہر شخص تہا اُس کی سنگین مورت بلند مقام پر نصب کیجاتی تہی - یونانیوں کے تین بڑے ریاضت گاہ تہے جن میں جوانوں کو ریاضت کی تعلیم دیجاتی تہی - انمیں سے ایک ریاضت گاہ کم درجہ کے لوگوں کے لئے تہا جنکے باپ یونانی اور ماں غیر ملک کی ہوتی تہی - تمام بڑے شہروں میں ریاضت کے مکان بنائے جاتے تہے - زمانۂ حال میں افسس و ہیرالوپس وغیرہ مقامات میں چند ریاضت گاہ کھود کر نکالے گئے ہیں مگر اونکی عمارت ناقص ہے - یونان میں عام طور پر لڑکیوں کو ریاضت گاہ میں جانے کی ممانعت تہی - مگر اسپارٹا میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بہی ریاضت میں شریک ہوتی تہیں - بعض کہتے ہیں کہ اسپارٹا میں لڑکیوں کے لئے خاص ریاضت گاہ تہی -

رومیوں میں جب ریاضت کا فن آیا تو اون کی جمہوری سلطنت کا اخیر زمانہ تہا - سب سے پہلے جس بادشاہ نے ریاضت کا مکان تعمیر کیا وہ نیرون قیصر تہا - کومودیوس نے بہی ایک ریاضت گاہ تعمیر کیا تھا مگر بمقابلہ اون رزمگاہوں کے جن میں رومی طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے تہے اِن ریاضت گاہوں کو کچھ بہی فروغ نہیں ہوا -

یونان کے مشہور مقنن سولن نے سب سے پہلے ریاضت گاہوں کا قانون بنایا - اِس قانون کی رو سے غلاموں کو ریاضت کرنے کی اجازت نہ تہی - اِس قانون کے ایک دفعہ کا مضمون یہ تہا کہ ریاضت گاہ کے دروازے طلوعِ آفتاب سے پہلے نہ کھولے جائیں - نہ غروبِ آفتاب کے بعد کُھلے رہنے پائیں - ایک دفعہ کا یہ مطلب تہا کہ اگر کسی ریاضت گاہ میں نابالغ لڑکے ریاضت میں مشغول ہوں تو اُس میں ریاضت کرنیکے لئے وہ اشخاص نہ جانے پائیں جو بالغ ہوں - ظاہر ہے کہ سولن کے قانون کی تعمیل صحیح طور پر نہیں ہوتی کیونکہ اکثر نابالغوں کے ساتھ بالغ اشخاص بہی ریاضت گاہوں میں اُتر پڑتے تہے - عام طور سے ریاضت گاہ کے مختلف درجے مختلف عمر کے اشخاص کے لئے خاص کر دئے جاتے تہے یعنی بچوں - لڑکوں اور جوانوں کے لئے جدا جدا درجے تہے جن میں ہر گروہ دن کو خاص اوقات میں داخل ہوتا اور ریاضت کرتا تھا - ریاضت گاہوں کی نگرانی کے لئے ایک افسر مقرر کیا جاتا تہا جس کو سال بہر کے لئے یونانی انتخاب کرتے تہے - جو لوگ ریاضت گاہوں میں آمد و رفت رکھتے تہے اُن پر اِس افسر کو حکومت کرنیکا پورا اختیار تہا - بچوں کی تربیت کے خلاف اگر کوئی حرکت کسی خادم یا اُستاد سے بہی سرزد ہوتی تو یہ افسر اوس کو ریاضت گاہ سے باہر نکال سکتا تہا - کوئی شخص اُس کے حکم میں چون و چرا نہیں کرسکتا تہا - اِس افسر کی ارغوانی قبا ہوتی تہی اور ایک عصا اُس کے ہاتھ میں یا اوس کے خادم کے ہاتھ میں ہوتا تہا - اِس افسر کا رعب داب اِس قدر تہا کہ اوس کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تہا - اُس کا عہدہ اسقدر اعلیٰ تہا کہ بادشاہ اور بڑے بڑے آدمی اُس کے حاصل ہونے کی تمنا کرتے تہے اور بعض دفعہ اُس کے لئے رشوت بہی دیجاتی تہی - اِس افسر کے ماتحت بہت سے لوگ مختلف خدمات انجام دیتے تہے -

آجکل یورپ کے ملکوں میں جو مدارس ہیں انمیں تعلیم کیساتھ ریاضت جسمانی کو بہی لازم کر دیا گیا ہے - جو لوگ مدارس میں تعلیم نہیں پاتے وہ بہی ایسے کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں جن سے ریاضت کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے - یورپ کے جس ملک میں جاؤ ہر شخص کو ہشاش بشاش - طاقتور اور تندرست پاؤ گے - کیونکہ وہ کیسے ہی سخت دماغی یا جسمانی کام کرتے ہوں تفریح اور ریاضت کو کبہی فراموش نہیں کرتے - ایک عالم کا مقولہ

کہ جس بدن میں خون اچھی طرح گردش نہیں کرتا اُس میں کبھی تندرست عقل نہیں رہ سکتی۔ ہمارے ملک کیلئے سخت افسوس کی بات ہے کہ عام طور پر یہاں کے باشندے ریاضت جسمانی کے خوگر نہیں ہیں۔ مدارس میں ریاضت جسمانی یہاں بھی داخل ہے مگر جو طلباء ریاضت کرنی نہیں چاہتے اون کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب کے کیڑے ہو جاتے ہیں اور محنت کرتے کرتے اون کے دماغ پریشان ہو جاتے ہیں۔ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ دنیا میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ ڈگری تو بی۔اے یا ایم۔اے کی حاصل ہو جاتی ہے مگر ڈگری سے کام لینے کی قابلیت کافور ہو جاتی ہے اِن کے علاوہ جو طلباء مدرسوں میں ریاضت کرتے ہیں اون کا بھی مدارس سے نکلنے کے بعد یہ حال ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھولکر بھی اِس عمدہ اور مفید شغل کیطرف مائل نہیں ہوتے۔ رفتہ رفتہ وہ قوت اور تندرستی جو مدرسوں میں ریاضت کرنے سے اون کو حاصل ہوئی تھی جاتی رہتی ہے اور سرکاری یا ذاتی کاموں میں منہمک ہو جانے سے اون کی صحت خطرناک درجہ کو پہنچ جاتی ہے کاش ہمارے ملک کے طلباء اور عام آدمی اِس مفید اور عمدہ شغل کی طرف توجہ کریں۔ تاکہ اون سے ذاتی یا قومی کاموں کے اچھی طرح پورا ہونے کی توقع ہو سکے ایک حکیم کا کیا ہی سچا مقولہ ہے جس نے کہا ہے کہ "جو لوگ اپنے بدن کو بیماریوں کے حملہ سے نہیں بچا سکتے وہ اپنی قوم کو بھی مصائب و آفات سے نہیں بچا سکتے" یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کے افراد جسمانی کمزور۔ ناتوان اور مردہ دل ہوتے ہیں وہ نہ جسمانی محنت کے کام کر سکتے ہیں نہ دماغی محنت کے۔ اُنکو نہ ملازمت میں کامیابی ہوتی ہے نہ تجارت میں نہ وہ صنعت میں ترقی کر سکتے ہیں نہ زراعت میں۔ ایسی قوم بدبختی کے تاریک غار میں جلد گر کر فنا ہو جاتی ہے۔

(عبد العزیز۔ بی۔اے)

نظمِ دلفروز یا نظمِ دلگداز

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

وہ زمانہ جبکہ دلی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کیلئے سنبھالا لیا تھا اگرچہ اوس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لئے بالکل بند ہو گئی تھیں مگر اگلے زمانہ کے بچے کھچے اہلِ کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے لیکن مرغانِ خوش الحان خزاں کی آمد سے بیخبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے۔ دِلی کا یہ آخیر جھمکڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اوس کے پس ماندہ قافلے کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دنیا سے رخصت کیا ہے اب محو ہوئے محل پہ ہو اک بلِ خریں۔ ہمکو حسن سے یاد ہے جانا بہار کا اسی قافلے میں ایک جوان صاحبِ کمال سید شجاع الدین حسین انور عرف اُمراؤ مرزا خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خان سید جلال الدین حیدر رضوی اُستاد بہادر شاہ پادشاہ سے تھے جو ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کے ہنگامہ سے دِلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی بعمر ہژدہ سالگی اپنے والدِ بزرگوار اور برادرِ بزرگ سید ظہیر الدین حسین ظہیر کے ہمراہ پانی پت میں آ کر کئی برس تک یہاں مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ اِس یوسفِ خانمان آوارہ او رخاک میں ملے ہوئے موتی نے راقم کو اپنا خریدار بنا لیا۔ بیگانگی ایک ہی نگاہ میں آشنائی کیساتھ بدلگئی اور آشنائی نے جلد جلد محبت یکجہتی کی سرحد میں قدم رکھنا شروع کیا۔ مگر زمانہ تا آشنا کا رنگ بدل رہا تھا اور انقلاب پر انقلاب ہو رہا تھا۔ وہ صحبت بہت جلد برہم ہو گئی اور بھولے ہوئے خواب کی طرح اُس صحبت کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا لیکن کچھ بہت زمانہ نگذرا تھا کہ شاہجہان آباد ہمیشہ کیلئے [illegible]

اتفاق یہ کہ مرحوم نے جس قیدخانہ میں جا کر مقید کیا سید انور بھی اوسی قیدخانہ کے اسیر نکلے مخدومی محمد کرم اللہ خان شیدا کا دیوانخانہ جو دوستی اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کا ملجا و ماویٰ اور زندہ دلی کا مجمع تھا برسوں سالہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں۔ ان صحبتوں میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک اکثر شریک ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے دست بردار ہو کر ہر شخص بزبانِ حال اس شعر کا مضمون ادا کرتا تھا ــ بزم مَی بھی ہو گو دنیا ہی ہیچ در ہیچ یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یا ہیچ۔ لیکن آخر کار معلوم نہیں کس کی نحوست سے یا اس سبب سے کہ زمانہ تفرقہ کی بنیاد ہمیشہ کیلئے سوسائٹی میں ڈال چکا تھا، اکثر اصحاب دلی چھوڑ کر ادھر اودھر منتشر و پراگندہ ہوگئے۔ اگرچہ ایک مدت کے بعد راقم لاہور سے اور سید انور بھوپال سے دلی میں پھر آگئے۔ مگر چونکہ دفترِ قضا سے فراقِ دائمی کا فرمان جاری ہو چکا تھا، ابھی گذشتہ مفارقت کا زخم بھرنے نہ پایا تھا کہ اوس مرحوم نے عالمِ آخرت کی راہ لی اور جو زخم بھرتا آتا تھا وہ ہمیشہ کیلئے ناسور بنگیا۔ سید انور مرحوم میں کمالِ شاعری کے علاوہ متعدد کمالات جمع تھے۔ خطِ نسخ میں وہ بلا مبالغہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ یہ کمال اُنکے جدِ بزرگوار نے قاضی عصمت اللہ دہلوی سے حاصل کیا۔ سید انور پر گویا اوس کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ باوجود اسکے نستعلیق میں بھی وہ شہر کے عام خوشنویسوں سے کم نہ تھے اور یہ جامعیت انکی خاندانی خصوصیات میں سے تھی۔ وہ صرف شاعر اور خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ علومِ متعارفہ میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ لکھکر ایک کتاب جاہل کی غلط ثابت کر دیا تھا۔ خصائل و عادات کے لحاظ سے میں اُنکو مستثنیٰ لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ سادگی و پرہیزگاری آزادہ روی و خودداری ہر حال میں خوش رہنا اور اوس اشراف گردی کے زمانہ میں پاسِ وضع کو ہاتھ سے نہ دینا اونکی خاص صفتیں تھیں۔ انہوں نے اوس وقت جبکہ خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا اپنے دست و بازو پر بھروسہ کیا اور جس جان نے بیکاری اور فارغ البالی کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا، اُسکو فوراً محنت و مشقت میں ڈالدیا اور جسطرح اہل و عیال کیلئے دوڑ دھوپ و تگ و دو میں سرگرمی [illegible] اگلے زمانہ میں تمام وضعداری و غیرت اور شرافت کے

نو بیچ خیال سے گئے جاتے تھے جب وقت پڑا تو اون کو بے تکلف ذریعہ معاش گردانا اور جواہر گراں بہا کو جبکہ بازار میں کوئی جوہری نظر نہ آیا تو غیب سے گنجان نفقہ پر قربان کر دیا۔ الغرض اوس مرحوم جامعِ اوصافِ کمال کی تصویر آج پندرہ برس بعد پھر آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔ ہمارے عزیز دوست لالہ سری رام ایم اے خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا رئیس دہلی نے سید انور مرحوم کا دیوان چھپوا کر از راہِ محبت ہمارے پاس بھیجا ہے گویا مدت کے بچھڑے ہوئے دوست کو دوست سے ملایا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اپنے عزیز دوست لالہ سری رام کی اس مہربانی اور یادآوری کا شکریہ ادا کریں یا اون کی سعی و کوشش و توجہ کی داد دیں جو انہوں نے اپنے وطن کے ایک صاحبِ کمال کی یادگار قائم کرنے اور اوس کا نام زندہ کرنے میں فرمائی ہے یا اوس احسان کا ذکر کریں جو عزیز موصوف نے اس دیوان کی اشاعت سے سید انور کے دوستوں اور عزیزوں پر کیا ہے، یا اوس کیفیت کو بیان کریں جو اس دیوان کو دیکھکر ہمارے دل پر گذری ہے۔ اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانہ کی زبردستی سے اوس کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس میں بہت سی غزلیں اون مشاعروں کی ہیں جنپر دلی کی شاعری کا خاتمہ ہونیوالا تھا اور جن میں بارہا سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کی ساتھ شریک ہوکر ہم نے اون کی ہمطرحی کی عزت حاصل کی تھی۔ کبھی کبھی نواب مرزا خان داغ بھی رامپور سے آکر ان مشاعروں میں شائقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے اور شہر کے اکثر شریف زادے اور امیرزادے جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں طرح کی زمینوں میں زورِ طبع دکھاتے تھے۔ مرزا غالب مرحوم و مغفور کا آخر زمانہ تھا۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر اون کی لکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں بارہا آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں۔ گو اب خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا ہے اور پہلی حالت کے تصور سے

شرم آنے لگی ہے۔ مگر گذرا ہوا زمانہ خواہ بچپن کی نادانی کا زمانہ ہو یا جوانی کی بدمستی کا اوس کی یاد میں عجیب لذت رکھی گئی ہے کہ کوئی چیز اوس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ پچھلا زمانہ جیسا کہ کہا گیا ہے بعینہٖ نمایش سراب کا حکم رکھتا ہے کہ جب پاس تھے تو ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر دور سے وہی ٹیلے دریائے متلاطم کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں۔ وہی شاعر ہے جو اٹھتے بچوں کا تحصیل علوم ہوتے ہیں اگر اون کا پھر ہاتھ آنا ممکن ہو تو کون ایسا بے عقل اور طوطا چشم ہو گا جو نئی روشنی کو اوس قدیم تاریکی سے بدلنے پر فی الفور آمادہ نہو جائیگا۔ سچ ہے سے لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں + بڑھاپے کی دانائی لیکر کوئی + بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں + یہ دیوان جس کا نام معزز اشاعت کنندہ نے نظم دلفروز رکھا ہے اور ہم اوس کو اس لحاظ سے کہ وہ صاحب دیوان کی جدائی کا داغ تازہ کرنیوالا ہے نظم دلگداز کہتے ہیں شاید نئے پڑھے ہوئے شاعر اوس کی جیسی کہ چاہئے قدر نکریں اور ایک نئے مسلمان کی طرح جس کا قصائی کی دوکان کے سوا کہیں جی نہیں لگتا اس دیوان کے ساتھ شاید کچھ دلچسپی ظاہر نکریں۔ مگر جو لوگ پرانے مذاق کے متوالے ہیں اور اب تک دنہیں پر ملک کی شاعری کا دارو مدار ہے اون کیلئے یہ دیوان ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو ہمارے معزز دوست کی بدولت ملک میں عام طور پر شائع ہوا ہے اور مطبع رفاہ عام لاہور سے بہت ارزاں قیمت یعنی بحساب ۱۲ فی جلد ملسکتا ہے۔

(الطاف حسین حالی)

جدید کتابیں

رسالہ تعلیم و تربیت

مولوی عبد الرؤف صاحب صدیقی رئیس سوانہ ضلع الہ آباد نے تعلیم و تربیت کے ضروری مضمون پر قرآن مجید۔ احادیث اور علما اور حکما کے اقوال سے استدلال کرکے ایک مفصل رسالہ لکھا ہے جسمیں تعلیم و تربیت کی حقیقت۔ اصول اور فوائد پر نہایت خوبی سے بحث کی ہے۔ اور اُس میں بہت سی مفید اور کارآمد باتیں درج کی ہیں۔ اُنہوں نے یہ مضمون پانچ حصوں میں لکھا ہے اور یہ رسالہ اُن میں سے حصہ سوم ہے جو اور حصوں سے پہلے چھپوایا گیا ہے۔ اُس کی قیمت ۱۰ ہے اور مصنف ممدوح سے درخواست کرنے پر ملسکتا ہے۔

دلائل فضائل الاسلام فی مطابقۃ الحکم بالاحکام

رسالہ تعلیم و تربیت مذکورہ کے مصنف نے ایک کتاب کے تین حصے جس کا نام عنوان میں لکھا گیا ہے، ریویو کیلئے اور بھیجے ہیں۔ جن میں مذہب اسلام کو علوم جدیدہ سے مطابق کرنے کی غرض سے بہت سے مضامین درج کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین سر سید مرحوم کی تصانیف اور زمانہ حال کی دیگر کتب سے ماخوذ ہیں۔ مصنف نے ان مضامین کو اچھے طریقہ سے جمع کر کے ترتیب دیا ہے۔ اگرچہ یہ مضامین اون لوگوں کے لئے جو سر سید مرحوم کی تصنیفات اور دیگر مصنفین کی کتابوں میں اُن کو پڑھ چکے ہیں نئے نہیں ہیں مگر تاہم اور بہت سے لوگ ہیں جو اُن کتابونکو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے انکو اس سلسلہ کے پڑھنے سے ضرور فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ ہم اس بات پر تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کتاب کے ان تین حصوں میں سے ایک حصہ پر صرف حصہ اول لکھا ہے ایک پر حصہ چہارم جلد اول اور ایک حصہ چہارم جلد دوم جس سے اس سلسلہ کی ترتیب بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حصوں کی تقطیع اور ہر ایک حصہ کی تقطیع اور ہے اسکا سبب بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔ تینوں حصوں میں سے کسی حصہ کی قیمت بھی ہم معلوم نہیں کر سکے جو صاحب انکو خریدنا چاہیں وہ تمام امور ضروری مصنف سے دریافت کر سکتے ہیں۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران | حاجی محمد اسمٰعیل خاں | مولوی وحید الدین سلیم

جلد ۲ | یکم مئی سنہ ۱۹۱۷ ع | نمبر ۱۱

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ | قیمت فی پرچہ نمونہ مع محصول ڈاک ۵ر

مقام اشاعت - دفتر معارف - علی گڑھ

مطبع فیض عام واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

مقاصد اور قواعد

۱— یہ دو جزو کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہوگا، ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علی گڈھ سے شائع ہوا کریگا۔

۲— اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اسمیں قسم کے علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی۔ عربی اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کئے جائیں، تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳— یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچے میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کریں گے۔ بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کئے جائیں گے۔

— بالفعل اس رسالے کے دو اڈیٹر قرار دیے گئے ہیں۔

ا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں

ب۔ مولوی وحید الدین سلیم

— ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجے کے انشا پردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں۔ جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں۔ اگر مہربانی سے وہ خود یا اُنکے احباب اون کے نام و نشان سے ہم کو مطلع کرینگے، تو ہم اونکی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالہ کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہنچائیں۔ جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے اون کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶— اس رسالے کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک [illegible] جو نقد قیمت بھیجینگے یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرینگے خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہوگی۔ نمونے کے پرچے کیلئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد یا بطور ویلیو کے وصول کیجائیگی۔ اور قیمت رسالے کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی۔ رسالے کے متعلق تمام خط و کتابت دفتر معارف علی گڈھ کے پتے سے مولوی وحید الدین سلیم کے نام ہونی چاہیئے اور انہی کے نام قیمت آنی چاہیئے۔ جواب طلب امور کیلئے آدھ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷— جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں، اُنسے امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸— حضرات خریداران معارف سے امید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً رسالے کی تاریخ اشاعت سے پہلے دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہیں گے۔

۹— اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا۔ ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰— جو حضرات معارف کے لئے مضامین مرحمت فرمائیں، وہ خوشخط اور صاف لکھکر بھیجیں تاکہ چھپنے میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲ | یکم مئی سنہ ۱۹۰۰ء | نمبر ۱۱

یونین جیک

ہاں اے نشانِ لشکرِ انگلش قدم بڑھا
قوموں کے سر پہ سایۂ پروردگار ہو
سایے میں تیرے پاتی ہے تہذیب پرورش
ملکوں کے حق میں جلوۂ ابرِ بہار ہو
وکٹوریا کی فوج پہ لہرا رہا ہے تو
وہ پرچم پہ تیرے فتح نہ کیونکر نثار ہو
کھلتے ہی تیرے خاک میں ملتا ہے ٹوٹ پھوٹ
مضبوط مورچہ ہو کہ سنگین حصار ہو
جاتا ہے آفتاب پہنچتا جہاں ہے تو
روشن تیری جھلک سے نہ کیوں ہر دیار ہو

جس ملک میں پڑا تیری آمد سے زلزلہ
کیا تاب واں جہالت و وحشت ہو حکمراں
تیرے قدم سے امن واں سے کیا ظہور
دوڑے ہر ایک طرف ہو تجارت کے کارواں
ہر شہر سے عیاں ہوئے صنعت کے معجزے
ہر کور دہ سے علم کا دریا ہوا رواں
دامن جدھر اڑا تیرے پرچم کا یکدم
آیا نظر ترقی و تہذیب کا سماں
سایے میں تیرے جہل سے جس نے نہ لی پناہ
چھوڑا نہ تو نے نام کو اُس قوم کا نشاں

ہاں اے نشانِ فتح و ظفر تیری شکل سے
برطانیہ کی شوکت و سطوت ہے جلوہ گر
تیری ہوا نے پھونک دیے دشمنوں کے دل
تیرے قدم نے کر دیے پامال بحر و بر
چلکر ٹرنسوال پہ اڑ صورتِ عقاب
بوروں کی فوج ہے ترے پنجے میں مشتِ پر
ہے بیکسوں کو تیری ہوا گر نسیمِ خلد
تو ظالموں کے حق میں ہے وہ شعلۂ سقر
ہاں اے نشانِ عدل و ترحم قدم بڑھا
ظالم پہ قہر بار ہو بیکس پہ رحم کر

(ع.ع)

حالاتِ سسلی

(۱۲)

اندرونی فتوحات

اور اٹلی پر چڑھائی

ابراہیم کا جانشین مقرر کرنا محمد بن الاغلب کا کام تھا مگر خوش قسمتی سے اس کو اس بارہ میں زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت نہ پڑی خود رعایائے سسلی نے درخواست پیش کی کہ عباس بن فضل سپہ سالار افواج جو ابراہیم سے اثر و درجہ رکھتا تھا ہمارا والی مقرر ہو۔ عالی دماغ محمد بن الاغلب کیلئے اس سے زیادہ مناسب بات کیا تھی کہ وہ پبلک اوپنین کا لحاظ کرے اور عباس کے تقرر کی منظوری صادر ہو۔

عباس بن فضل قدرت سے عباس بن فضل کو ایک جنگی طبیعت عطا ہوئی تھی اور اوس کا ہاتھ اپنی تلوار کی روانی ابراہیم کے زمانہ میں ہی دکھلا چکا تھا۔ اور اب جبکہ سسلی کی عنان حکومت اُسی کے پُرزور ہاتھوں میں دی گئی تھی تو اس سے بہتر اور کون موقع اپنے فطرتی جذبات کو پورا کرنے کا مل سکتا تھا۔ اُس نے مختلف مہمیں بھجوائیں جن میں اکثر وہ خود بذاتہ فوج کا سپہ سالار ہوا کرتا تھا۔

فتح قصریانہ سنہ ۲۴۴ھ میں قصریانہ (کسریانی) پر بنی الاغلب کا جھنڈا لہرانے لگا جسکو رومیوں نے عربوں کی حکومت پلرمو میں قائم ہو جانیکے بعد سرقوسا (سراگوسا) کی عوض اپنا صدر مقام قرار دیا تھا۔

اِس فتح کے حالات مختصر طور پر اس طرح لکھے جاسکتے ہیں کہ متواتر یورشوں نے شہر والوں کی حالت تباہ اور شہر کے استحکامات اور فصیل کی حالت بالکل شکستہ بنا دی تھی۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ چند سسلی والے عربوں سے آکر مل گئے۔

اِن لوگوں نے ایک شکستہ مقام کی نشاندہی کی جس پر صرف دو ہزار فوج جس کا کمانڈر عباس کا چچا رباح نامی تھا اِس مقام پر پہنچ گئی۔ سیڑھیاں لگا دی گئیں۔ اور بہت ہی تھوڑے عرصہ میں عربی فوجوں کی صفیں اوس پہاڑی پر چڑھتی ہوئی نظر آئیں جسکے دامن میں قصریانہ کی آبادی تھی۔ پہاڑی پر سے شہر میں داخل ہونا بہت ہی آسان تھا شہر میں داخل ہو کر رباح نے وہی کیا جو تمام عالم کے نئے اور پُرانے فاتحین یکساں طور پر کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر ایک سپاہی کے ہاتھ میں خون آشام تلوار کسی کے سینہ پر بجلی کی سی تڑپ کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھی تو دوسرے کے ہاتھ میں سامان غنیمت کا انبار اپنی تابانی دکھلا رہا تھا۔ فاتحین نے اپنے مذہبی تخیل کو اس طرح پر پورا کیا کہ قصریانہ کا سب سے بڑا گرجا اسلامی مسجد بنا اور جمعہ کی نماز اس میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کی گئی۔

عربوں کی اس فتح پر تمام مسیحی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور قیصر روم نے بھی اپنی شہنشاہی کا رعب قائم رکھنے کیلئے تین سو جہاز کا بیڑہ سسلی پر بھیجا جنکو عربوں نے بہت ہی آسانی کے ساتھ سطح خاک کے برابر کر دیا۔ رومیوں کے اس سخت نقصان کے مقابلہ میں صرف تین ہی مسلمان کام آئے تھے جس سے اُنکی بینظیر واقفیت فنون جنگ میں معلوم ہوتی ہے۔

اِدھر تو بنی الاغلب کا عظیم الشان بیڑہ رومی بیڑے کو تباہ کر رہا تھا۔ اور اُدھر قصریانہ عباس کے احکام کے مطابق اسلامی رنگ میں رنگا جا رہا تھا۔ تمدن و تہذیب کی شعاعیں اس سرد و سنسان شہر میں نورانی بارش برسا رہی تھیں۔ ایک گیریزن ہمیشہ کیلئے قصریانہ میں متعین کر دیا گیا تاکہ باشندگان سسلی کے دل پر سلطنت کی سطوت چھائی رہے اور کسی بغاوت کے برپا کرنے کی جرأت نہ ہو۔

عربوں کی یورشیں اٹلی پر بنی الاغلب کے فتوحات کا سیلاب سسلی میں ہی رُک نہیں گیا بلکہ اُس سے آگے بڑھ کر اٹلی میں بھی اس سیلاب سے قیامت برپا ہو گئی۔ ان فتوحات کے ذکر سے پہلے اٹلی کے تاریخی حالات کا مختصر بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ہم نے اپنے مضمون کے نمبر (۴) میں بیان کیا ہے کہ رومی سلطنت کے برباد ہو جانے کے بعد اٹلی میں دو حکومتیں قائم ہوئیں کچھ حصہ تو لمبارڈیوں کے ہاتھ میں تھا اور کچھ حصہ مشرقی سلطنت کے زیر حکم۔ مگر مشرقی شہنشاہی کی قسمت میں نہ تھا کہ زیادہ دنوں تک اٹلی میں اپنا حکم جاری رکھ سکے۔ اور اس کی وجہ وہی بدبخت خفیف مذہبی مناقشات تھے جن کیلئے ہم نے بیان کیا ہے کہ مشرقی سلطنت اور مذہبی نزاعوں کو لازم ملزوم خیال کرنا چاہیے۔ ان مناقشات کی بدولت روما کے چرچ اور قسطنطنیہ کے بیٹرہی آرک میں مخالفت پیدا ہو گئی جس پر کلیسا روما کلیسا قسطنطنیہ سے علیحدہ ہو گیا اور روما میں پوپ کے زیر نگرانی ایک خود مختار مذہبی گورنمنٹ کی بنیاد پڑی۔ اور اس طرح پر اب اٹلی کے اندر مشرقی سلطنت کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔

یہ حالت اُس وقت تک قائم رہی جبکہ فرانس میں یورپ کا مشہور شخص شارلی مین پیدا ہوا اور اس مشہور شخص نے از سر نو مغربی شہنشاہی کے تن بیجان میں روح پھونکنی چاہی۔ پے در پے فتوحات کی بدولت اٹلی میں ہر طرف اُسی کا ڈنکا بجگیا۔ اور خود پوپ نے رومن امپائر کا تاج اُس کے سر پر رکھا۔

مگر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے یہ تمام طاقت اُسی وقت تک مجتمع رہی جب تک شارلی مین کا عصا اپنے کام میں مستعد رہا اور جونہی اُس کی لاش گرتی ہوئی نظر آئی فوراً ہر ایک صوبہ دار بجائے خود فرمان روا بنگیا اور سب کے سب دفعتہً اس نیا طاقت سے آزاد نظر آئے۔ سلطنت کے پرزے پرزے ہو گئے۔ اٹلی میں بھی یہی حالت ہوئی۔ اور اب اُس میں سات خود مختار ریاستیں بن گئیں۔

۱ نیپلز۔ ۲ فلسکنی۔ ۳ پارما۔ ۴ جنیوا۔ ۵ لومبارڈی۔ ۶ روما۔ ۷ وینس۔

یہ طوائف الملوکی تھی جبکہ عربوں نے سسلی کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ یہ چھوٹی ریاستیں آئے دن کے تنازعات میں مبتلا تھیں اور اُس پر طرہ یہ تھا کہ ہنگرین قوم نے شمالی حصہ میں ایک اودھم مچا رکھی تھی۔

جبکہ اٹلی کی یہ تباہ حالت تھی اور تمام اسباب کافی طور پر مہیا تھے تو پھر کیونکر فاتحین اسلام کا قدم اٹلی میں آگے نہ بڑھتا۔ اغالبہ کے زمانہ میں ہی ان حملوں کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اب عباسیوں نے اس رفتارِ ترقی کو برابر مسلسل جاری رکھا۔

بنی الاغلب کی بحری طاقت

چونکہ اٹلی کا علاقہ ساحل ہی سے متصل واقع ہوا ہے اس لئے نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک زبردست بیڑہ جہازات اٹلی کے زیر و زبر کر دینے کو کافی تھا۔ بنی الاغلب کے پاس جیسا مضبوط زبردست بیڑہ جہازات موجود تھا اُس کی کیفیت گذشتہ نمبروں میں بیان ہو چکی ہے۔ اور قابلِ افسوس حالت ہوتی اگر وہ ایسے بیڑے سے کام نہ لیتے۔

جو کام بنی الاغلب نے اپنے جرار بیڑوں سے بحرِ متوسط میں لیا وہ اُس وقت تک دنیا کو یاد رہے گا جب تک کہ بحرِ متوسط کی صاف و شفاف سطحِ آب پر جہازوں کے بیڑے رواں ہیں۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔

> بحیرۂ روم پر مسلمان اپنے دور دورہ میں بالکل قابض ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی عظمت و صولت اِس سمندر میں بالکل مانی ہوئی تھی۔ اُن کے زبردست بیڑوں کے سامنے عیسائی اقوام ذرا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں مسلمانوں نے بحیرۂ روم کو مثل اپنے گھر کے بنا لیا تھا۔ اور جس قدر بے شمار فتوحات اور غنائم اُن کو حاصل ہوئیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ مسلمان اس سمندر کے تمام جزیروں کے مالک تھے اور اپنے جہازوں کے ذریعے سے وہ فرنگستان کے اندر گھستے اور خوب مال غنیمت حاصل کرتے تھے سسلی کے مقابل شمالی جانب جو خشکی واقع ہے (اٹلی مراد ہے) اس کے اندر جاتے اور فرنگستانی بادشاہوں کے سر پر آفت لاتے اور اُن کی ریاستوں کو تباہ کرتے تھے۔

ابن خلدون کا یہ بیان خلاصہ ہے اُن فتوحات کا جو والیانِ سسلی نے اٹلی اور بحیرۂ روم میں حاصل کیں۔

موسیو سیدیو اسی بیان کو اس طرح تفصیلاً لکھتے ہیں اور جس پر بے اختیار ہماری زبان سے یہ شعر نکل جاتا ہے۔

اٹلی کے دمومیں اڑادیے تھے ——— روما کو کوئیں جھکا دیے تھے
(شبلی)

جبکہ عربوں نے سسلی کو اپنی نوآبادی بنایا تو اب اونکے قدم اور آگے بڑھے۔ پنزا اور الیشیا نامی دو چھوٹے چھوٹے جزیروں کو اونھوں نے لے لیا۔ اور اس کے بعد اٹلی کے سواحل ان کی آماج گاہ بنے۔

عربوں کا پہلا حملہ اٹلی پر — سب سے پہلے ۲۲۳ ہجری (۸۳۸ عیسوی) میں عربوں کی یورش ہوئی کالبریا (جس کو مورخینِ عرب قلوریا کہتے ہیں) ۔ اُسکے سواحل اُنکے سامنے تھے جس میں لوٹ مار مچی۔ دہانۂ دریائے ٹائبر پر حملہ کیا اور اس کے بعد ملک کے اندرونی حصہ میں بڑھے جہاں اُس وقت شارلیمن کے جانشینوں کی حکومت تھی۔ عربوں نے اُنکا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ اب اور اندر بڑھے اور ڈیوکی فانٹو (جو اب صوبۂ کمبانیا کا ایک جزو ہے) کے لومبارڈی اُمرا سے اُن کی مٹ بھیڑ ہوئی اور عربوں نے انکو نیچا دکھایا۔ اور اس طرح پوری پوری فتح و ظفر کے ساتھ یہ مہم واپس آئی۔

دوسرا حملہ — گزشتہ حملہ میں عربوں نے اٹلی کے مغربی ساحل کو تاراج کیا تھا۔ اب ۲۲۵ھ (۸۳۹ء) میں دوسرا حملہ ہوا۔ اور عربی جہازات اٹلی کے مشرقی ساحل کو کھوندنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ برنڈزی کو بالکل اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اور اُس سے آگے بڑھکر بندرگاہ باری کو بھی لے لیا۔ ان تمام سواحل میں رومیوں سے ان کا مقابلہ ہوا اور آخر رومیوں کو بھاگ جانا پڑا۔ اس حملہ میں صوبۂ اپولیا ان کا نشانہ بنا۔ بحیرۂ ایڈریاٹک کے پھاٹک پر جو بندرگاہ واقع ہے اُس کو بھی عربوں نے لے لیا۔ ان بندرگاہوں پر قبضہ کرلینے سے اٹلی کے مشرقی صوبجات اسکے ہاتھ میں آگئے۔ اس حملہ میں عربوں کی تاخت و تاراج اٹلی ہی پر محدود نہ رہی بلکہ ڈلماشیا (آسٹریا کا ساحل) میں بھی اُن کا نقارہ بجنے لگا۔ چلیسی اور دیگر جزائر بحر یونان کو بھی عربوں نے فتح کی دھمکی دی جنکو مشرقی شنشاہی نے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا ایسی عظیم الشان فتح مندیوں کے بعد یہ حملہ ختم ہوا۔

تیسرا حملہ — ۲۲۶ھ (۸۴۰ء) میں تیسرا حملہ ہوا۔ اس وقت اٹلی میں خانہ جنگی برپا تھی۔ ٹارنٹو (جس کو عرب مورخین طارنت کہتے ہیں) کو عربوں نے لے لیا۔ یہ حملہ زیادہ تر خشکی کے رستہ سے ہوا۔ ٹارنٹو کی فتح کے بعد ڈیوک بونی فانٹو کی ریاست سامنے تھی۔ کوہ کسین کے گرجے کو جو سچی دنیا میں نہایت مشہور گرجا تھا اور جس میں دولت کا انبار لگ رہا تھا لوٹ لیا۔ جس وقت خشکی کے رستہ سے فوج اندر جارہی تھی جہازی بیڑہ بھی اپنے کام سے خاموش نہ تھا۔ گائیٹا اور اطفی پر چڑھائی کی جہاں کے باشندوں نے جان توڑکر مقابلہ کیا۔ سرلنو۔ نیپلز (نابولی) عربوں کے رحم و کرم پر تھے۔ دہانہ دریائے جارلیون پر عربوں نے ایک قلعہ تیار کیا۔ اور دریائے ٹائبر کے رستہ سے اوسط ملک میں داخل ہوگئے۔ جہازی اور بری افواج کی متحدہ طاقت اب مرکوز

لہ (دیکھو صفحہ گزشتہ کی آخری سطر لفظ اٹلی کا نوٹ)۔

سلہ۔ ناظرین سے التماس ہے کہ اٹلی کا نقشہ اپنے سامنے رکھیں جس کے بغیر فتوحات عرب کا پورا پورا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اٹلی اس وقت چند صوبوں پر منقسم ہے۔ جنکی تفصیل طوالت کے لحاظ سے ہم نے قلم انداز کردی ہے۔ ناظرین اٹلی کے نقشے کو دیکھیں۔

مسیحیت کی طرف بڑھی۔ اور کوئی روک اُن کے رستہ میں نظر نہ آئی۔ پوپ بر وما نے اس کے سوا اور کوئی راہِ مدافعت نہ دیکھی کہ اُستیا کی فصیلوں کو اور بلند کرادے۔ مگر رعب فاتحین کی قدم کسی طرح رُک نہ سکے اور یہ ما یا مرکز مسیحیت کے اطراف وجوانب میں کراس (صلیب) کی صورت مفقود ہوگئی (اور گو ہلال تو نہیں مگر کسی در طرز کا) بنی الاغلب کا جھنڈا مسیحوں کو دکھائی دینے لگا۔ اور سینٹ پال (پولوس) سینٹ پٹیر (پطرس) کے مشہور عالم گرجے اُسی حالت کو پہنچے جس حالت کو اس زمانہ کے ایک مدت بعد محمود غزنوی کے ہاتھوں سے سومنات اور قنوج کے مندر پہنچے۔

ایک مدت تک مرکز مسیحیت کے قرب وجوار میں اللہ اکبر کی صدائیں لگاتے ہوئے فاتحین اپنے دار السلطنت میں واپس آئے اور واپس آتے ہوئے سوٹیا کے مستحکم مقامات کو منہدم کیا۔

چوتھا حملہ ۲۳۴ھ (۸۴۸ء) میں چوتھا حملہ ہوا۔ حملہ آور اِس جذبہ سے مدہوش تھے کہ کلیسائے اعظم روما کو مسجد بنائیں گے اور تثلیث کی عوض توحید کی صدا روما کی [illegible] م پرست آبادی میں قائم کریں گے مگر [illegible] اور ان کے سارے ارادے خاک میں مل گئے جبکہ انہوں نے دیکھا کہ اب نقشہ ہی اور ہے۔ خدام تثلیث کے جوش دلانے والے واعظوں نے مسیحیوں کے دل میں ایک ایسا پُر جوش جنگ کی آرزو مشتعل کردی تھی اور اب تمام مسیحی متفقہ طاقت کیساتھ موحدین اسلام کے سیلاب فتوحات کو روکنے کیلئے ڈٹے ہوئے کھڑے تھے۔ دریائے ٹائبر میں جاتے ہی معلوم ہوگیا کہ دریا میں لوہے کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور دور بین آنکھوں کو دکھائی دینے لگا کہ پوپ لیون رابع کے زیر حکم تمام ملک کا ملک اُمڈا چلا آتا ہے۔ ان وجوہات سے حملہ آوروں نے اپنا رخ بدل دیا اور کسی اور اجل کی طرف چلے گئے۔

اب ہم اٹلی کی حالت کو چھوڑتے ہیں اور سلی عباس بن فضل کے حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

فتح قصریانہ کے بعد جو بطارق (افسر) بچے کھچے باقی تھے وہ اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے اور انہوں نے رعایا کو بغاوت پر اُکسانا شروع کیا چنانچہ کئی مقامات میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی جس کے فرو کرنے کے بعد آخر کار عباس نے ایک زبردست مہم تیار کی۔

۲۴۷ھ میں پوری تیاری کے ساتھ یہ مہم روانہ ہوئی اور عباس نے بذات خاص اُس کی کمان ہاتھ میں لی۔ ارادہ تھا کہ سرقوسا (سراگوسا) پر بنی الاغلب کا جھنڈا لہرایا جائے جس سے پھر بغاوت کا کوئی سرچشمہ باقی نہ رہے۔

عباس کی موت مگر افسوس ہو کہ مقام قرقنہ میں جہاں عباس اپنا کیمپ ڈالے ہوئے پڑا تھا اُس زبردست ہاتھ نے جس نے بڑے بڑے باسطوت فاتحوں کو عین اُس وقت میں جبکہ وہ نشۂ کامیابی میں مدہوش تھے ہمیشہ کیلئے خاموش کردیا ہے اور جس کی بدولت ایک دفعہ قاضی اسد بھی اسی سرقوسا کی تمنا دل ہی دل میں لئے ہوئے آغوش لحد میں جا سوئے تھے عباس کو بھی گیارہ سال تک تمام مسیحی دنیا میں ایک خوفناک ہلچل مچا دینے کے بعد سرقوسا کا ارمان جی ہی جی میں رکھکر ہمیشہ کیلئے خواب عدم میں سُلا دیا۔

عباس بن فضل کے پورے زمانہ میں جنگی روح یکساں طور پر کام کر رہی تھی۔ اور اُس کے جذبات

وہی سمجھے جو عموماً فاتحین عالم کے یکساں طور پر سمجھتے چلے آئے ہیں۔ عباس کے واقعات زندگی سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف سسلی بلکہ اٹلی کو بھی ایک اسلامی نوآبادی بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ عربی مورخین کے قول کے مطابق اٹلی کے صوبہ جات۔ کالبریا (قلوریا) اور انگونا مسلمانوں کی مستعمرات بن گئیں۔ اور ان میں عربی حکومت بھی قائم ہو گئی تھی جسکا ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

عباس کے دشمنوں کو اس سے جیسی سخت نفرت تھی اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب اُس کے مرنیکے بعد فوج اسی مقام میں اُس کو دفن کر کے چلی آئی تو حریفوں نے اُس کی لاش کو قبر سے نکال کر جلا دیا اور اِس طرح پر اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

عباس بن فضل کا جانشین مقرر کرنا احمد[1] کا کام تھا جو اُس وقت فرمان روائے افریقیہ تھا۔

تاوقتیکہ نیا ویسرائے مامور ہو کر نہ آجائے عباس کے لائق فرزند عبداللہ نے باشندگان سسلی کے عام رائے کے موافق کام انجام دیا اور اپنے باپ کی تجاویز پوری کرنیکی کوشش کی۔ اور اپنی کوشش میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا چنانچہ چند نئے قلعے فتح کئے۔

اگرچہ عبداللہ بذاتہٖ اِس اہم کام کے قابل تھا مگر زیادۃ اللہ فرمانروائے افریقیہ نے باپ کی خدمت پہ بیٹے کو مامور کرنا خلاف مصلحت سمجھا اور سینیئر اشخاص کی اِس میں حق تلفی خیال کی۔ اُس نے ایک نیا شخص افریقیہ سے انتخاب کیا۔ یہ انتخاب اور پیشتر فرمان رواؤں کے انتخاب کی طرح ہر طور سے موزوں اور مناسب تھا۔ نیا والی خفاجہ بن سفیان تھا جس کا خاندان دربار بنی الاغلب میں وقتاً فوقتاً کارہائے نمایاں سے سربلند ہو چکا تھا۔ اور خود خفاجہ کی تمام عمر اسی دربار کی خدمت میں گذر چکی تھی اور بہت سی اہم معاملات اُس کی ذات سے سرانجام پا چکے تھے۔ حلقہ امیر امیں اُس کی نسبت رائے وہی ہے کہ "كَانَ اَجَلَّ رِجَالَاتِ الْاَغْلَبِيَّة"

خفّاجہ بن سفیان

۲۴۸ھ میں خفاجہ مستقر پلرمو میں داخل ہو گیا۔ اور اپنے عہدہ کا جائزہ لے لیا۔

خفّاجہ کی پالیسی کو نہایت عمدہ پالسی کہا جا سکتا ہے اُس کی رائے تھی کہ جس قدر علاقہ ہمارے پاس ہے اوس کا نظم و نسق مکمل طور پر کرنا چاہیئے جس کی دیکھا دیکھی باقی علاقہ جات خود بخود ہمارے مطیع ہو جائیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خفّاجہ کے دانشمندانہ طرز حکومت نے بہت جلد آس پاس کے علاقہ جات کو منقاد بنا لیا۔

۲۴۸ھ میں رغوس درجیو اٹلی کا آخری حصہ جو بالکل سسلی کے متصل ہی ہے سامن بنگیا۔ ۲۵۰ھ میں نوطس قائم تھا۔ چنانچہ ابن اثیر لکھتا ہے۔ لم یکن فی ایامہ ثائر یزعجہ۔

مصنف البیان المغرب جو عموماً تاجداران افریقیہ کے کیریکٹر پر سخت ریمارک کرتا ہے احمد کی نسبت لکھتا ہے "نیک سیرت تھا۔ اُس کے اخلاق و اعمال کریمانہ تھے۔ نہایت سخی اور سہل گیر تھا۔ رعایا کیساتھ نہایت نرمی کرتا تھا۔ ساتھ ہی دیندار بھی تھا۔ اور ظلم و ستم سے اُس کو سخت نفرت تھی۔ باوجود ان سب فضائل کے نوعمر اور کم سن تھا" جس سے اُس کی قدر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اُس کی سخاوت کی ایک دلیل یہ ہے کہ ماہ مبارک رمضان اور شعبان کی راتوں میں

[1] جس زمانہ میں عباس بن فضل سسلی میں نائب السلطنت کی اہم خدمت انجام دے رہا تھا۔ امیر افریقیہ محمد بن الاغلب تھا جس کے حالات ہم نے گذشتہ نمبر میں بیان کر دیے ہیں۔ پندرہ سال تک ایک باقاعدہ اور منتظم سلطنت کرنیکے بعد ۲۴۲ھ میں مرگیا جسکے بعد اس کا بیٹا ابو ابراہیم احمد اکیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اسکی لائف مختصراً اِس طرح پر لکھی جا سکتی ہے۔

رعایا کے ساتھ نہایت عمدہ روش اختیار کی۔ فوج کو عطیات زیادہ دیئے گئے۔ افریقیہ میں اکثر مقامات پر حصار اور قلعے بنائے گئے۔ غلاموں کو خرید اُس کے زمانہ میں امن و امان کامل طور

(نوٹو جزیرۂ سسلی کا جنوب مشرقی علاقہ) مفتوح ہوا ۲۵۲ھ میں طبرمن (ٹڑومانی) کے باشندوں نے دھوکے سے صلح کی درخواست کی، جس پر خفاجہ نے اپنے لڑکے اور بی بی کو اس علاقہ میں بھیجدیا۔ مگر افسوس ہے کہ انہی باشندوں نے دغابازی کی جس پر مجبوراً خفاجہ کو اُن کی گوشمالی کیلئے فوج بھیجنی پڑی۔ اور اِس وقت انصافاً انکی لوٹ مار پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ غیران کے علاقہ نے بھی مصالحت کرلی۔

اب جزیرۂ سسلی کا تمام مغربی اور شمالی اور جنوبی حصّے کا ایک بڑا علاقہ بنی الاغلب کے زیرِ حکم تھا جس میں اُنکی باقاعدہ حکومت جاری تھی۔ صرف مشرقی حصّہ باقی تھا جس کا صدر مقام مشہور سرقوسا تھا۔

۲۵۵ھ میں قاضی اسد اور عباس بن فضل کیطرح خفاجہ نے بھی سرقوسہ کی فتح کی غرض سے ایک مہم تیار کی مگر افسوس ہے کہ اُس کے ارادے بھی دل ہی دل میں رہے۔ وادی الظین نامی مقام میں وہ اپنا کیمپ ڈالے ہوئے تھا کہ اُس کی فوج کے ایک سپاہی نے (جس کو غالباً سسلی کی ہوا جس میں غدر کا بڑا جزو شریک ہے اور اس کے نمونے ناظرین کو ہمارے مضمون میں جابجا ملیں گے لگ گئی تھی) موقعہ پاکر دفعۃً خفاجہ کو سات سال کی ولایت کے بعد شہید کردیا۔ اور خود بھاگ کر سرقوسا میں چلاگیا۔ خفاجہ کی لاش دشمن کے خوف سے پلرمو میں لاکر دفن کیگئی۔ اور رواج کے مطابق اُس کے بیٹے محمد نے موافق عام رائے سسلی کی منصرمانہ کام دیکھنا شروع کیا اور دربارِ بنی الاغلب کو اِس واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ اِس وقت فرمان روائے افریقہ[1] محمد بن احمد بن الاغلب تھا۔

محمد بن احمد بن الاغلب کی بیدار مغزی میں تو کوئی شبہ نہیں مگر افسوس اِس امر کا ہے کہ یا تو اوس نے عمدہ انتخاب نہیں کیا یا اُس کو اپنے ملازمین میں کوئی ایسا شخص نہ ملا جو ابراہیم۔ عباس۔ خفاجہ کی پوری پوری جانشینی کرنے کی قابلیت رکھتا ہوا اور اِس قابل ہوکہ اپنے عظیم الشان اقتدار کو کام میں لاسکے۔ جیساکہ اُس سے پہلے فرمان رواؤں نے کیا تھا اور جس کی بدولت اِس قدر باشان وشوکت نتائج پیدا ہوئے۔ بہرحال اُس نے خفاجہ کے فرزند محمد ہی کو مستقلاً مامور کردیا۔ محمد کے زمانہ میں جزیرۂ مالٹا پر قبضہ کیا گیا مگر ابھی ایک سال ہی پورا گذرنے نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے خواجہ سراؤں کے ہاتھ سے مارا گیا جن کو گرفتاری کے بعد جرم کی سزا دی گئی۔

محمد بن خفاجہ کے مارے جانیکے بعد محمد بن احمد نے جب دیکھا کہ کوئی لائق عالی دماغ مدبر نہیں ملتا تو اوس نے ایک نئی تجویز جاری کی جس کی رو سے ملک مقبوضہ تین حصّوں میں منقسم کردیا گیا۔

[بقیہ] حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ... [illegible] ... سے اُنکی سواری نکلتی۔ اسکے آگے آگے شعلیں روشن ہوتیں۔ ... قدیم ... نکلکر پیدل باب ابو الربیع پر سے ہوتے ہوئے مسجد جامع تک جایا کرتا۔ ساتھ ساتھ روپیہ اشرفی کی تھیلیاں ہوتیں جنکو چار پانچ پیادے لیکر چلتے۔ تمام مسکین و ضعیف اشخاص کو عطیے تقسیم کرتا۔ اور جب جامع مسجد میں پہنچ جاتا تو تمام رعایا جو مسجد میں جمع ہوتی تھی نہایت جوش و خروش سے اپنے محبوب بادشاہ کے استقبال کیلئے باہر آتی اور دعاؤں کے شور سے کان بہرے ہوجاتے۔ ۱۲

[1] احمد کے فوت ہوجانیکے بعد اُس کی جگہ زیادۃ اللہ ثانی تخت نشین ہوا جو ایک معمولی دماغ کا شخص تھا۔ ایک ہی سال کی سلطنت کی اور اسلئے اُس کا زمانہ کسی قسم کی یادگار اپنی ساتھ نہیں رکھتا۔ زیادۃ اللہ کے بعد محمد بن احمد بن الاغلب جانشین ہوا جو کہ فرمان رواؤں کی طرح نہایت ادیب و عاقل تھا۔ اُس نے بہت جلد وقتاً فوقتاً پیدا ہوجانیوالے نقائص کی اصلاح میں حتی المقدور کوشش کی۔ سواحل افریقہ پر بہت سے قلعے تیار کروائے۔ البیان المغرب کا مصنف اُس کی کیرکٹر کی نسبت رائے دیتا ہے۔ (بقیہ نوٹ دیکھو صفحہ آئندہ)

ایک صوبہ سسلی بلو سرے صوبہ انگبردہ (اٹلی کا مشرقی ساحل) اور تیسرے صوبہ کالبریا (قلوریا) اور ہر حصہ پر ایک والی مقرر کیا گیا۔

گو بادی النظر میں یہ رائے درست دکھلائی دیتی ہے اور موجودہ زمانہ کے طرزِ حکومت کے لحاظ سے غالباً اِس انتظام کو پسند کیا جائیگا مگر جیسا کہ ہم نے اپنے گذشتہ نمبر میں لکھا ہے اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے ایک ہی شخص کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہونی ضروری تھی اور بغیر اسکے کوئی منتظم گورنمنٹ باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

بداہۃً جو سخت نقصان اِس تفریق سے پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ فوجی طاقت کی بھی تفریق ہوگئی اور بر وقت پیش قدمی کئے جانے کی دوراندیشی اور مصلحت پر مبنی پالسی نظر انداز کردینی پڑی)۔ اِس پالسی کے ترک کردینے سے جو سخت نقائص پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے نزدیک مسلّم ہوچکے ہیں۔

پیش قدمی کیا رُکی کہ مسیحی دنیا میں انتقام کی روح نہایت زور شور کے ساتھ حلول کر آئی۔ موسیو سید یو لکھتے ہیں "(روما) مسلمانوں کے متواتر حملوں سے جس سخت خطرے میں پڑ گیا تھا اُس سے آخر شاہ اٹلی لوئیس ثانی کی رگِ حمیت جوش میں آئی۔ اور اُس نے دینِ عیسوی کی حمایت کا بیڑا اوٹھایا۔ بے شمار انبوہ کے ساتھ وہ صوبہ اپولیا میں آیا اور عربوں کے ساتھ لڑائی کی تین سال تک لوئیس شہر لوسیرہ کے اطراف میں محاصرہ کئے پڑا رہا اور آخر مجبور ہوکر ۲۵۳ھ (۸۶۷ء) میں شہر والوں نے اطاعت کرلی (اِس عرصہ میں محمد بن خفاجہ نے کوئی پُھرتی کے ساتھ کام نہ کیا اور اِس کے بعد آخر ملک کی تقسیم ہی کردی گئی) ۲۵۵ھ (۸۶۹ء) میں باری اُس کے قبضہ میں آگیا۔ غرضکہ تھوڑی ہی مدت کے بعد اٹلی کے مشرقی سواحل سے اسلامی حکومت جاتی رہی اور سوائے ٹارنٹو کے اور کوئی شہر اُن کے علاقہ میں نہ رہا"۔ یہی منحوس تقسیم تھی جس نے بنی الاغلب کی طاقت کو پارہ پارہ کردیا۔ اور تمام جمائی ہوئی بنیاد آن کی آن میں فنا ہوگئی۔ چنانچہ ابن اثیر صاف صاف الفاظ میں تسلیم کرتا ہے "اِنَّ جَزِیْرَۃَ صِقِلِّیَّۃَ تَغَلَّبَ الرُّوْمُ عَلیٰ مَوَاضِعَ مِنْهَا"

(جزیرہ سے ابن اثیر کی مراد تمام مقبوضہ علاقہ ہے)

اوس وقت صاف نظر آرہا تھا کہ چندے اگر یہی حالت رہی تو بنی الاغلب کی طاقت کا نام ہی نام رہجائیگا۔ مگر محمد بن احمد کے انتقال کے بعد ایک عارضی تغیر پیدا ہوا جس کیلئے ہم کو پیرا افریقہ کی حالت پر متوجہ ہونا پڑتا ہے

(۱۳)

بنی الاغلب کی سلطنت کا کامل عروج

جب محمد بن احمد کی موت کا وقت قریب آگیا تو اوس نے اپنے کمسن لڑکے ابوعقال کو اپنا جانشین اور (تاوقتیکہ وہ سلطنت کا بار اوٹھانیکے قابل نہو جائے) اپنے بھائی ابراہیم کو ریجنٹ قرار دیا۔ جس کی کارگذاری کا محمد کو بخوبی تجربہ حاصل ہوچکا تھا۔ اور اُس سے اپنے سامنے اِس پر حلف لی۔

مگر محمد کی موت کے بعد تمام اراکینِ دولت نے یک زبان ہوکر عرض کیا کہ ابوعقال لائق فرمانروائی

بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ۔

شکار کا عاشق تھا۔ فیاضی میں اوّل درجہ کا مسرف۔ مال جمع کرنیکی خواہش نام کو بھی نہ تھی۔ رعایا کے ساتھ نیک روش جاری رکھی اور اچھا سلوک کیا۔ آخر زمانہ میں اُس پر نفسانی خواہشات کا زیادہ غلبہ ہوگیا تھا۔ دس سال کی سلطنت کے بعد ۲۶۱ھ میں مرگیا۔

ہیں۔ لہذا ہماری استدعا ہے کہ حضور اپنے قدوم میمنت لزوم سے تخت کو افتخار بخشیں۔ اِس درخواست پر اوّل اوّل تو ابراہیم نے جیسا کہ عموماً عالی دماغ شہریاروں سے دیکھا گیا ہے انکار کیا مگر جب اُنکا الحاح حد سے بڑھگیا تو اوس بارِ عظیم کو اپنے کندھے پر لے لیا۔ اور اپنی مدبرانہ سلطنت سے ثابت کر دکھلایا کہ وہ اوس سے زیادہ رتبہ کا مستحق تھا جتنا کہ پبلک نے خیال کیا تھا۔ اور بے شبہ اوس کا نام اُن فرمان رواؤں کی فہرست میں ثبت ہو گیا جنکی بدولت بنی نوعِ انسان کی سرگذشت موجودہ ترقی کی حد تک پہنچ سکی ہے۔ تمام تاجداران بنی الاغلب میں وہ گل سرسبد تھا۔ اور وہ سلطنت جس کی بنیاد اغلب نے ڈالی تھی اور جس کو زیادۃ اللہ نے کیا تھا ابراہیم کے زمانہ میں اپنے کمال عروج کو پہنچگئی۔ ابر کی بیدار مغزی و مدبری سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ابن اثیر لکھتا ہے ابراہیم عادل اور صاحب حزم تھا۔ اوس نے اُمورِ سلطنت کو بذاتِ خود انجام دیا۔ اور پسندیدہ طور سے انجام دیا۔ اوس وقت ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ باغیوں اور فسادیوں کی جڑ کٹ گئی تھی۔ انصاف عدالت کے لحاظ سے وہ ہر پنجشنبہ اور دوشنبہ کو قیروان کی جامع مسجد میں نشست کرتا۔ دادخواہوں کا بیان بذات خود سنتا اور اُن کی نادانستگی کی حرکات پر مطلق رنجیدہ نہ ہوتا تھا۔ قافلے اور تجار اوس کے زمانہ میں بے فکر میں گذرا کرتے تھے۔ سڑکوں کا انتظام درست حالت میں تھا۔ اوس نے سمندر کے کنارے قلعے اور چوکیاں قائم کیں۔ بندرگاہ سبتہ (جو اوس زمانہ میں افریقہ کا مشہور بندرگاہ تھا) میں آگ روشن کیجاتی تھی تو ایک ہی رات میں اس کی خبر اسکندریہ میں پہنچ جاتی تھی۔ اوسکے زمانہ میں بندرگاہ سوسہ کے اطراف میں فصیل تیار ہو گئی۔

ایک دوسرا مورخ (ابن دادران) لکھتا ہے "ابراہیم میں عظیم الشان نیکی پائی جاتی تھی۔ اوس نے بہت سی رفاہِ عام کے کام انجام دیے۔ احسان کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ اُس کے بہت سے آثار باقی ہیں۔ وہ اکثر تونس میں رہا کرتا تھا جہاں اُس نے ایک جامع مسجد تیار کروائی۔ اوس نے شہر رقادہ کو بسایا۔ اور اُس کو اپنا دار الملک قرار دیا۔ اُس نے اپنی تمام دولت زندگی میں ہی خیرات کر دی تھی۔

مصنف "البیان المغرب" نے اُس کے کیرکٹر پر کسی قدر اعتراضات کئے ہیں۔ مگر وہ اعتراضات ایسے نہیں ہیں جن پر کچھ لحاظ کیا جائے۔

جب ایسا بیدار مغز امیر افریقہ میں تخت نشین تھا تو سسلی کی حالت میں بھی ایک عمدہ تغیر پیدا ہونا ضروری تھا اور ایسا ہی ہوا۔

اُس کے عہد کا پہلا والی جعفر بن محمد ہے۔ جس کو فاتح سرقوسہ کہنا چاہیے۔

فتحِ سرقوسہ

سرقوسہ جس کے لینے کا ارمان قاضی اسد عباس۔ خفاجہ قبر میں ساتھ لے گئے تھے آخر جعفر کے زمانہ ٢٦٤ھ (٨٧٨ء) میں فتح کر لیا گیا۔ جعفر نے اپنے تمام گذشتہ فاتحین کی تمنا پوری کرنیکا کامل سامان کیا۔ خشکی اور تری دونوں جانب سے محاصرہ کیا گیا اور کوئی بیرونی تائید نہ پہونچنے دی اور فراہمی سامان رسد کی غرض سے ایک حصہ فوج الگ متعین کیا گیا۔ آخر نو مہینے کے محاصرے کے بعد سرقوسہ کے دروازے عربی فاتحین کے سامنے کھولدیے گئے۔ وہی معمولی جنگی روح یہاں بھی اپنے کام میں مستعد تھی۔ چار ہزار مقتولین کا شمار کیا گیا۔ اور مال غنیمت اِس قدر حاصل ہوا کہ اتنا کبھی نہ ملا تھا۔ دو مہینے تک عربی فوج سرقوسہ میں اپنا کیمپ ڈالے پڑی رہی اِس کے بعد جنگی اور ملکی مصلحتوں کے لحاظ سے فصیل اور قلعہ منہدم کر دیا گیا۔

افسوس کہ جعفر اپنی اس بڑی فتح سے پوری لذت اوٹھانے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کے خواجہ سراؤں نے اسی

سال ایک سازش کے ذریعہ سے اُس کی جان لے ڈالی اور اوس کو بہت سی آرزوں کے ساتھ دنیا سے رخصت کر دیا

وسیع النظر ابراہیم اس تنزل سے بخوبی واقف تہا جو خفاجہ کے مرنیکے بعد سسلی میں واقع ہوا - مگر چونکہ اس خرابی کا دفعیہ ایک دم سے نہیں ہو سکتا تہا لہذا اُس نے آہستہ آہستہ کوشش شروع کی -

سب سے پہلے یہ اُصول قرار دیا کہ جس قدر علاقہ اب ہمارے پاس ہے اُسی سے ہم کو منتفع ہونا چاہیے اور اس لیے اُس نے جلد جلد والیوں کو تبدیل کرنا شروع کیا - چنانچہ ۲۶۵ھ سے ۲۸۱ھ تک پانچ والی متواتر مامور کئے گئے جن کے نام یہ ہیں -

حسن بن عباس - محمد بن فضل حسین بن احمد - سوادہ بن محمد بن خفاجہ - ابو مالک احمد بن عمر -

ان والیوں کے زمانہ میں کوئی اہم کام واقع نہیں ہوا اس عرصہ کی نسبت یہی خیال کرنا چاہیے کہ اُس میں انتظام مکمل کیا جا رہا تہا - جب اپنے علاقہ کا انتظام ٹھیک کر لیا تو اب اوس نے اپنی تجویز میں ایک اور اضافہ کیا - ۲۸۷ھ میں خود اپنے لڑکے ابو العباس کو والی بنا کر بہیجا جس کی عمدہ طور پر تعلیم دی گئی تہی - اور ساتھ ہی ایک نیا بیڑہ بہی اُس کے ہمراہ کر دیا گیا جس میں ایک سو بیس مرکب اور چالیس جنگی جہاز تہے -

بنی الاغلب کا اٹلی پر آخری حملہ

ابو العباس کو سب سے پہلے مختلف سازشی پارٹیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جس کو آخر کار اوس نے پراگندہ کر دیا - اِس کے بعد وہ اپنے باپ کے خیالات کو پورا کرنے میں مصروف ہوا نیپلز - الفی یسلرنو کی ریاستوں سے معاہدے مرتب کئے گئے - اس کے بعد وہ اٹلی پر حملہ کرنیکے لیے تیار ہو گیا -

چنانچہ ۲۸۸ھ میں وہ اپنے جرار بیڑے کیساتھ پوپ کے علاقہ کی طرف روانہ ہوا - ریونامی شہر کو جہاں مسیحیوں کا بے شمار انبوہ مدافعت کیلئے کہڑا ہوا تہا بزور شمشیر فتح کر لیا - مال غنیمت سونے چاندی کی انتہا نہ تہی - تجارتی جہازات میں جو ساتھ تھے آٹا اور دوسرا سامان بہر اگیا -

پوپ کا جزیہ قبول کرنا

وسیع النظر محقق سیدیو اس بیان میں اس قدر اور اضافہ کرتا ہے کہ " اس حملہ آور فوج نے پوپ ژین ہشتم کو دہمکی دی اور اوس کے علاقہ پر غالب آ گئے یہانتک کہ خود روما اور راوینا پر مجبوراً پوپ کو اسکے سوا بن نہ آیا کہ پچیس ہزار رطل چاندی (ہر رطل = ۸ اوقیہ) کے جزیہ میں دینے کا وعدہ کیا اور اس وقت فاتحین واپس آئے -

سادہ مزاج ابراہیم کا شاندار سفر

۲۸۹ھ میں ابراہیم کو امارت کو تقریباً تیس سال کا عرصہ گذر گیا ہے اوس عرصہ میں اُس کی سلطنت اپنے کامل عروج کو پہونچگئی ہے - تمام فرمان سوایان روئے زمین میں اس کا نام مشہور ہو گیا ہے - سسلی میں اُس کا بیٹا ابو العباس والی ہے جس نے پہر دوبارہ بہاری فتوحات کا سلسلہ جاری کر دیا ہے - ایسے وقت میں دفعتہً ابراہیم کے دل میں ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو نہایت حیرت و تعجب کے قابل ہے - ابراہیم نے دفعتہً حج بیت اللہ کا ارادہ ظاہر کیا - گو اُس کا خاندان مدتوں سے افریقہ میں بس گیا تہا مگر وہ اپنے وطن کی یاد کو بہولتا نہ تہا - جوش مذہب سے یہ خیال تو پیدا ہو گیا ساتھ ہی یہ بہی خیال آیا کہ اگر میں مصر سے گذرتا ہوا جاؤں تو ابن طولون[1] کے ولیں

[1] یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بنی عباس کی سلطنت کے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے اور احمد بن طولون نے مصر میں ایک خود مختار سلطنت کی بنا ڈالی تہی -

جو مستقل فرمان روائے مصر تھا مجھے ناموربادشاہ کے نیک ارادوں کی نسبت بھی بیہودہ خیالات گذریں گے - اِس لحاظ سے اوس نے بحری سفر پسند کیا - یہ پہلا وقت تھا کہ فرمان روائے افریقہ نے بحری سفر کرنا چاہا اور بذات خود فوج کا کمانیر بننے کی خواہش کی۔

ابراہیم کا ارادہ جس وقت مشتہر کیا گیا تو فوراً اوسکی تیاری شروع کیگئی - اورجب ابراہیم کی سواری نکلی ہے تو اُس وقت کا جلوس اپنی شان وشوکت کے لحاظ سے بے نظیر تھا - سلح خانہ اورخزانۂ عامرہ بھی ساتھ تھا - جس وقت یہ جلوس بندرگاہِ سوسہ میں پہونچا تو اُس وقت ابراہیم کا لباس اُس کی اندرونی جذبات کو بخوبی ظاہر کررہا تھا — ایک پیوندزدہ پوستین اُس کے جسم پر تھی - جو بہ نسبت بادشاہ کے کسی زاہد کے جذبات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے - سوسہ سے خاص شاہی جہاز پر سواری روانہ ہوئی -

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جس وقت اِس حج کا ارادہ ظاہر کیا گیا اوس کا بیٹا ابوالعباس سسلی کا والی تھا ابراہیم نے اُس کو اطلاع دی کہ افریقہ میں واپس آجائے ابوالعباس حسب الحکم فوج اور جہازات کو اپنے دولڑکوں کی زیرنگرانی چھوڑکر افریقہ میں واپس آگیا جہاں ابراہیم نے اُس کو اپنا جانشین بنادیا۔

جس وقت ابراہیم پلرمو میں پہنچا اُس کے پوتوں نے فوج کو ابراہیم کے سامنے پیش کیا - ابراہیم نے اُن کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی - اورآیندہ کیلئے نقشۂ جنگ سوچنے لگا -

سب سے پہلے بیرطینوا فتح کیا گیا - بیرطینوا میں دوسرے گذشتہ فاتحین سے کہ خود بنی الاغلب کے فاتحین تھے برخلاف اُس نے نہایت عدالت اور انصاف کا برتاؤ کیا - اور مفتوحین کے ساتھ نہایت نرمی اور ملاطفت برتی جس سے خلافتِ راشدہ کے پاک زمانہ کی ایک تصویر اگو غیر مکمل ہی سہی ، نظر آگئی -

یہاں سے طبرمین پر بیڑہ جہازات حملہ آور ہوا - اور ایک سخت لڑائی کے بعد وہ بھی فتح کیا گیا اور وہی معمولی جنگی روح یہاں بھی اپنے کام میں سرگرم نظر آئی -

طبرمین کی فتح سے تمام مسیحی دنیا میں سخت کھلبلی مچگئی دربارِ قسطنطنیہ کی بھی آنکھیں کھلیں - ہرطرف ماتم برپا ہوگیا - خود قیصر نے ماتم میں سات دن تک تاج نہ پہنا -

نامور اور عالی دماغ ابراہیم کا بذاتِ خاص مستعد ہونا ایسا نہ تھا کہ مسیحی دنیا کو بیدار نہ کرتا -

قیصرِ روم نے بھی ایک بیڑہ مرتب کیا - مگر ابراہیم اُس سے زیادہ ہوشیار تھا - اُس نے سچ مچ دیا دھمکی دینے کیلئے) مشہور کردیا کہ میں خود قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلوں گا - بہرحال یہ دھمکی کارگر ہوگئی اور رومی اپنی مدافعت کے سامان میں مشغول ہوگئے -

ادھر ابراہیم نے فتح طبرمین کے بعد تمام آس پاس کے علاقہ میں مہیں بھجوائیں جنہوں نے ہر مقام پر کامیابی حاصل کی - اِس کے بعد وہ کسنتہ دکسنٹ کی فتح کیلئے آگے بڑھا -

محاصرہ جاری تھا اور فتح کی قوی امید تھی - مگر افسوس وہی تقدیر و قسمت جس کی کارروائیاں تاریخ میں ہرجگہ نظر آتی ہیں - ابراہیم کو بھی نامراد دنیا سے رخصت کرنیوالی تھی - ذرب کی بیماری اُس کو لاحق ہوگئی اور دیگر عظیم الشان فاتحین کیطرح ابراہیم بجائے اِس کے کہ مکہ معظمہ میں پہنچکر خدائے واحد ذوالجلال کی عبادت میں مشغول ہوتا کسنتہ کی دیواروں کے نیچے ہمیشہ کیلئے خوابِ عدم میں سوگیا -

یہ وقت نہایت مشکل کا تھا مگر عہدہ داران سلطنت نے نہایت دانائی سے کام لیا اور جیسا کہ ایسے مواقع پر اکثر دیکھا گیا ہے اُنہی کی دانائی نے کام بگڑنے نہ دیا -

اب پیش قدمی کا خیال بیکار تھا - وہ شخص ہی نہ رہا جس کی وجہ سے یہ ہل چل تھی - سب افسروں نے ملکر

مشورہ کیا کہ کس طرح پر واپسی کی کارروائی ہونی چاہیے اور آخر کار ابراہیم کا پوتا ابو مضر اسی تمام مال اسباب اور خزانہ کو اپنے باپ ابو العباس کے پاس افریقہ میں پہنچانے کیلئے منتظم قرار دیا گیا۔

اسی طرح یہ قافلہ بے نیل مرام قیروان کو واپس گیا جس کے ساتھ مدبّر اور فاتح ابراہیم کی لاش بھی قیروان میں لاکر دفن کی گئی۔

قبل اس کے کہ ہم اس نمبر کو ختم کریں ایک آخری بیان بنی الاغلب کی وسعتِ سلطنت کے بارے میں کر دینا چاہتے ہیں۔

بنی الاغلب کی سلطنت ابراہیم کے آخری ایام میں جبکہ وہ اپنے پورے عروج کو پہنچ گئی تھی ان قدر علاقوں پر مشتمل تھی۔

تقریباً سارا شمالی افریقہ انہی کے قبضہ میں تھا۔ جس کو انہوں نے گلزار بنا دیا تھا۔ صرف ایک بنی ادریس کی مستقل حکومت شمالی افریقہ کے کونے میں اُن کی سلطنت سے جدا تھی۔ مصری سرحد تک اُن کا ڈنکا بجتا تھا۔ سمندر میں اُن کی جیسی طاقت تھی وہ بیان ہو چکی ہے۔ مگر ہمارا مضمون ناتمام ہوگا اگر ہم اس مقام پر موسیو سیدیو کی تحریر کا باقی حصہ بیان نہ کر دیں گے۔ موسیو سیدیو لکھتے ہیں۔

اٹلی کے سوا فرانس کے سواحل بھی عربوں کے آماج گاہ بنے تھے۔ (اگرچہ یہ حملے زیادہ تر اندلس کے بیڑہ جہازات نے کئے تو جس کا مختصر حال ذکر ہم نے کسی گذشتہ نمبر میں کر دیا ہے۔ لہذا اس کی تفصیل ہمارے مضمون سے خارج ہے — مترجم سسلی) کے سوا مالٹا۔ گازو۔ کامینوا۔ پنتلاری۔ سارڈینیا کورسکا۔ بلی آری وغیرہ تمام جزیرے عربوں ہی کے قبضہ میں تھے۔ سینٹ تدویز کے قریب جو مشہور اسٹیشن گسینٹ (کستنہ) نامی ہے اس کو بھی عربوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا جس کی بدولت یورپ کے مشہور کوہ آلپس کی راہ بغیر کسی منازع کے اُن کے لئے کھل گئی تھی۔ عروس البلاد وینس کی ریاست نے بھی عربوں کے ہاتھ سے بہت کچھ مشقتیں اوٹھائیں۔ کراٹ نامی شہر پر عرب قابض ہو گئے تھے۔ عربوں نے بحیرۂ روم کے سواحل پر بہت سے اسٹیشن بنائے تھے جو پولیٹیکل اور تجارتی دونوں لحاظ سے اہم درجہ رکھتے تھے۔

موسیو سیدیو کا بیان اس موجز فقرہ پر تمام ہوتا ہے۔

ہمارے اس گذشتہ بیان سے معلوم ہو گیا کہ بحر متوسط میں جو فتوحات عربوں نے حاصل کیں وہ اعراب افریقہ اور اعراب اندلس کی فتوحات سے بہت زیادہ ہیں۔

(محمد مرتضیٰ)

ہندو مسلمانوں کا میل جول

روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جن مقامات میں ا دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھتی جاتی ہے وہاں پریشان اور مبتذل ہیں۔ برخلاف اس کے جہا دور اندیش لوگ مل جل کر رہتے ہیں وہاں فلاح آسودگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لہذا صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر دلوں میں ارتباط اور مودت زیادہ بڑھے تو دونوں قومیں خوش و خورم ا مرفہ الحال ہو سکتی ہیں۔ یعنی ہندوستان ترقی ہے کیونکہ اس وقت تک ہم لوگ نہ صرف یہ لوگوں کے نزدیک بلکہ خود اپنے اور سیاح

نظروں میں بہی جو مہذب ملکوں کا سفر کر چکے نیم وحشی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔

اِسس مضمون میں ہمارا ارادہ تاریخ پر بغور نظر ڈالکر اوّل تو یہ دکہلانا ہی کہ اِن دونوں قوموں میں سی ایک ہی یہاں کا اصلی باشندہ نہیں ہے ۔ دوسرے یہ کہ اور ملکوں میں بہی اِسی قسم کی عداوت و دشمنی رہی ہے مگر جب اوس کی انتہا ہوگئی اور بیحد تکلیفیں اوٹہانی پڑیں تو یگانگت اور اتفاق کو ترقی ہوئی اور ملک کا ملک ترقی کر گیا ۔

محققانِ یورپ نے اِس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں جس کو ہزارہا برس کا زمانہ گذرا کوہ ہندوکش کے قریب آریہ نسل کے لوگ آباد تھے ۔ اُن کے شمال و مشرق میں مغل اور مغرب یعنی روم و شام میں ایک تیسری نسل کے لوگ رہتے تھے ۔ مغلوں کی اولاد میں باشندگان چین و ترکستان وغیرہ ہیں ۔ شامیوں کی (یا سیمیٹک) نسل میں عرب و شام وغیرہ کے لوگ ہیں ۔ یہی تین اصلی نسلیں مانی گئی ہیں اور انہیں پر تمام دنیا کی قومیں متفرع ہیں گو کہ جزائر ملایا اور حبش کے باشندے بعضوں کے نزدیک جداگانہ نسلیں ہیں ۔ جہاں تک دریافت ہو سکا ہے اوّل کی تینوں نسلوں کے خط و خال، زبان، مذہب سب الگ تہلگ تھے ۔ اِسی وجہ سے ہر نسل جدا مانی گئی ہے ۔

زمانہ کی ضرورتوں نے جب مجبور کیا تو آریا نسل کے لوگ اپنے اصلی وطن کو خیرباد کہکر جس طرف کو جس کا منہ اوٹہا چلدیے ۔ کچہہ مغرب کو روانہ ہوئے اور چلتے چلتے سمندر ہی کے کنارے دم لیا ۔ یورپین قوموں کے یہی مورث اعلی تھے کچہہ کوہ قاف کے گرد و نواح میں رہ پڑے ۔ باشندگان ایران انہیں کی نسل سے ہیں ۔ ایران اور آریا ایک ہی لفظ آر سے جسکے معنے ہل کے ہیں مشتق ہوئے ہیں ۔ ایک تیسرا گروہ پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گذر کر پنجاب کے میدانوں میں آبسا اور یہاں بقول مورخ ہرپرشاد صاحب شاستری اونہیں سیاہ فام لوگوں سے گھمسان کی لڑائیاں لڑنی پڑیں ۔ جو دعائیں اپنی فتوحات کیلیے اوسوقت اونہوں نے مانگیں وہ رِگ وید میں موجود ہیں ۔ جب یہاں کے اصلی باشندے پہاڑوں کی کہوؤں اور جنگلوں میں جا چھپے تو فتحمند آریوں نے تمام ملک میں اپنا قبضہ و دخل کر لیا اور اپنی خوبیاں ہر طرف پہیلائیں جابجا کاشت ہونے لگی ۔ ریاستیں قائم ہوکر راجدہانیاں بن گئیں ۔ مفتوحہ لوگ شودروں کے نام سی خدمتگاری اور بہنگی چماروں کے پیشے اختیار کرکے اپنی گذران کرنے لگے ۔ فوجی خدمات، تجارت اور حصول علم کی اجازت سوائے آریوں کے اور کسی کو نہ ملی ۔ اِسی طرح برہمن ۔ چہتری ۔ ویشوں کو یہاں صدیاں گذر گئیں ۔ حتے کہ سن عیسوی پیدا ہوا اور اوس کے بہی ۱۲ ، برس گذر گئے ۔ اب شامی نسل کے لوگ جو مسلمانوں کے نام سے مشہور تھے خلیفہ ولید کے ہمراہ ملک سندھ تک آئے مگر چند روز رہکر واپس چلے گئے ۔ نویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے شمال و مغرب کے دروں سے مغلی نسل کے آدمی یہاں کی پہوٹ اور نااتفاقی دیکہکر آنے شروع ہوئے بارھویں صدی کے آغاز میں شہاب الدین غوری پنجاب کے گکہڑوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور اوسکا غلام قطب الدین ایبک ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا بانی ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا ۔ اوس وقت سے غدر ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں ہی کی سلطنت کہلائی گو کہ انگریزی پھریرا ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی لڑائی کے بعد سے قریبًا تمام حصۂ ملک پر اُڑنے لگا تہا اور وہ ہی درحقیقت ملک کے

حکمران تھے ۔

مذکورۂ بالا تاریخی شہادت سے ناظرین کو بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ نہ ہندو یہاں کے اصلی باشندے ہیں اور نہ مسلمان ۔ مگر اِس بارہ سو برس کے زمانہ میں جیسے دونوں ایک ہی ملک میں رہتے ہیں دونوں میں مختلف رسم و رواج ایک ہی سے ہو گئے ہیں ۔ وضع قطع ملتی جلتی ہے ۔ شادی بیاہ وغیرہ کے سبب سے بہت سے مسلمانوں میں آریا خون کا میل ہے اور مسلمان راجپوت وغیرہ بعض ایسے مسلمان ہیں جو خالص آریا ہیں پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے ۔ بقول جسٹس راناڈے " زیادہ مستقل فائدے اِس میل جول سے یہ حاصل ہوئے کہ لوگوں کے مذہبی خیالات اعلیٰ ہو گئے اور ہندو اور مسلمان دونوں کو فائدہ ہوا ۔ محرم کا تہوار اور پیروں کی پرستش صاف طور سے اوس طریقہ کو ظاہر کرتے ہیں جس سے کہ مسلمانوں پر ہندوؤں کا اثر ہوا ۔ مسلمانوں کا تعصب کم ہو گیا اور ہندو زیادہ پرہیزگار اور ایک خدا کی پرستش کرنیوالے بن گئے " ۔

مگر پورا میل نہونے پایا تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت ہی ختم ہو گئی اور اِس مخلوط مگر ناکمل شائستگی نے دونوں میں غرور و نخوت پیدا کر دی اور انگریزی حکومت کی بیحد آزادی نے جو بعضوں کے خیال میں قبل از وقت تھی دونوں کو کوتاہ اندیش اور ہٹ دھرم بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کی ہر چیز دوسرے کو قطعاً خراب اور مضر معلوم ہونے لگی یہاں تک کہ نام اور صورت سے بھی نفرت ہو گئی اور خانہ جنگیوں اور مقدمہ بازیوں نے نادار اور کم ہمت بنا دیا ۔ وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر ۔

یہی حالت جو اِس وقت زیادہ حصہ ہندوستان کی ہے گیارھویں صدی عیسوی میں انگلستان کی تھی ۔ اِس صدی کے وسط میں نارمن لوگوں نے ہیرلڈ شاہ انگلستان کو شکست دیکر وہاں کی حکومت اپنے قبضہ میں لی تھی فاتح ولیم اُن کا اولوالعزم سردار تھا ۔ لارڈ میکالے رقمطراز ہیں کہ اِس زمانہ کی تاریخ اون زیادتیوں اور جبر و تعدی کی کہانی ہے جو مختلف قومیں ایک دوسرے پر جو اِس زمانہ انگلستان پر رہتی تھیں چڑھایا کرتی تھیں ۔ مگر اِس درجہ کی باہمی نفرت تھی جو کسی ایسی قوموں میں بھی نہیں پائی جاتی جنکے درمیان پہاڑ وغیرہ حائل ہوتے ہیں جن ملکوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے اون میں بھی ایسی عداوت قلبی نہیں پائی جاتی جیسی اِن قوموں میں تھی ۔ اُن کا وطن و مسکن ایک تھا مگر اُن کے اخلاق میں زمین و آسمان کا فرق تھا نہ کسی ملک میں انگلستان سے بڑھکر قومی نفرت پیدا ہوئی ہوگی اور نہ وہاں کی طرح وہ قطعاً مفقود ہی ہو گئی ہو گی ۔ یہ تو ٹھیک معلوم نہیں کہ اون میں کیونکر نفرت گھٹی اور میل جول بڑھا مگر اِس میں مطلق شک نہیں کہ شاہ جان کے عہد میں سیکسن اور نارمن لوگوں میں انتہا درجہ کی مغائرت تھی اور اُس کے پوتے کا زمانہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اِس قومی جھگڑے کا نام و نشان تک بھی نہ رہا ۔ رچرڈ کے زمانہ میں نارمن لوگ بددعا کے طور پر کہتے تھے کہ اگر ایسا نہو تو میں انگریز ہو جاؤں اور اگر اون کی بات کے ماننے میں کسی کو تکلف ہوتا تو کہتے کہ کیا تم نے مجھے انگریز سمجھا ہے اُنہی کی اولاد سو برس بعد انگریز کہلاتے پر فخر کرنے لگی اور وہ موجودہ شائستگی اور ہر قسم کی ترقی کے بانی ہوئے " ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں کب تک ایک دوسرے کو ملعون و مردود سمجھے جائیں گی ۔

دوسرے یہ کہ ان میں میل جول ہو بھی سکتا ہے یا نہیں ۔

اوّل سوال کا جواب تو یہ ہے کہ شاہ رچرڈ کے زمانہ میں انگلستان کیطرح فی زمانہ ہندوستان میں بھی باہمی نفرت انتہا کو پہونچ گئی ہے ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون ہو جاتا ہے ۔ عدالت میں پہونچکر صرف و ...

نفع میں لوٹہائی پڑتی ہو۔ اسی وجہ سے بعض مقامات کے باشندوں نے تنگ آکر اتحاد و محبت کے رستے میں قدم رکھا ہے مگر مخالف ہواؤں اور تکلیف دہ نشیب و فراز کے سبب سے ابھی رستہ کم طے ہوا ہے لیکن اتنا ضرور ہو گیا ہو کہ دونوں میں اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ مجبوراً زمانہ انہیں آکسیجن و نائٹروجن کیطرح ملا کر رہیگا کیونکہ دونوں ایک ہی ہوا کھاتے ایک ہی حکومت میں رہتے ایک ہی ناؤ کے سوار ہیں سہ

اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے۔ لہذا جس وقت قومی جھگڑا لیکا پیا چکر کھاتے کھاتے زمین پر آئیگا تو اوپر ہی کو اوٹھے گا۔ "ہر کمالے را زوالے" سائنس کا مسلہ مسلہ ہے۔ جب باہمی نااتفاقی کی انتہا ہو جاوے گی تو ضرور میل ہو کر رہیگا اور جب تک من حیث القوم ہم اتنے تعلیم یافتہ نہو جائیں کہ اپنا نفع و نقصان پہچان سکیں اوس وقت تک یہی حال رہیگا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہو کہ فرد بشر کے تعلقات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک انسان کا انسان کے ساتھ دوسرا انسان کا خدا کے ساتھ۔ اسی کو مذہب کہتے ہیں۔ یہ دوسرا تعلق دل سے واسطہ رکھتا ہو۔ لہذا ضرور نہیں کہ ہمارے اصل عقائد سے کوئی شخص واقف ہو۔ دلیل اور مباحثہ سے مخالف کو ہم ساکت کر سکتے ہیں مگر کسی کا دل نہیں پھیر سکتے۔ بہت سے مسلمان دھوتی باندھتے اور ہندوؤں کی طرح شادی میں منڈھا کھڑا کرتے اور بعض چوکا لگا کر کھانا کھاتے ہیں۔ بہت سے برہمن علانیہ گوشت کھاتے۔ بعض ہندو تعزیئے بناتے اور مسلمان پیروں کو پوجتے ہیں۔ جب ہم اُن سے مزاحمت نہیں کرتے تو اس سے ہی کیوں غرض رکھیں کہ فلاں آریہ ہو یا دھرم سماجی۔ یہ شیعہ ہو یا سنی۔ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ ضرورت ہو تو اپنے طریقے کی خوبی بیان کرو نہ یہ کہ دوسرے کی توہین کرو۔

انگلستان میں باوجود مذہب عیسوی ہونے کے بہت سو صدا ورد دہریے ہیں مگر جس کا جی چاہتا ہے وہ گرجے کو جاتا ہے بلکہ میاں بی بی میں ایک اگر کیتھلک ہوتا ہے تو دوسرا پروٹسٹنٹ۔ دونوں ایک سواری میں اتوار کے دن گرجے کو جاتے ہیں اور اپنی اپنی عبادتگاہ پر اوتر جاتے اور واپسی پر ساتھ چلے آتے ہیں اور گھر پر آکر ہنسی خوشی سے بولتے چالتے ہیں اور بخوشی و خرمی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح ہم لوگ کسی کے مذہب سے سروکار نہ رکھیں اور دنیا اور دین کا فرق سمجھکر دنیاوی تعلقات میں مذہب کو نہ ٹھونسیں اور ذاتی اغراض اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر اسیات پر متوجہ ہوں کہ ہمارا فرض کیا ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ اب اور آئندہ دلکو سرور اور روح کو فرحت حاصل ہو تو بیشک ہم ترقی کریں گے۔ غرضکہ مختلف مذہب والوں میں ارتباط و محبت ہو سکتی ہے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ پروردگار عالم نے اپنی کسی حکمت سے مختلف مذہب پیدا کیے ہیں ورنہ وہ قادر مطلق سب کو ایک طریقہ پر رکھہ سکتا تھا۔ ہر مذہب واللا مانت خدا ہی کا حکم ہے۔ مختلف رستوں سے ایک ہی جگہ سب لوگ پہونچنا چاہتے ہیں لہذا ہم کیوں بیفائدہ کوشش کریں اور زبردستی اپنا سچا خیال دوسروں کے دلوں میں جاگزیں کریں۔ وہی جو چاہے گا سو کرے گا بلکہ ہمارا فرض ہے کہ دیگر مذاہب کے بزرگان دین کی تعظیم کریں اور اون کا عزت سے نام لیں ورنہ دوسروں کے شاکی نہوں۔

سر سید احمد خاں مرحوم اسی بحث کے بارہ میں لکھتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ "لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (سورہ انعام آیت ۱۰۸) یعنی مت برا کہو اُن کو جو خدا کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے ہیں پہر وہ بڑھکر نادانستگی سے خدا کو برا کہیں گے۔ پس حقیقت میں

غیرمذہب والوں کے پیشواؤں کو بُرا کہنا خود اپنے مذہب کو اون سے بُرا کہلوانا ہے۔ جس کا گناہ نہیں پر ہوتا ہے جنہوں نے غیر مذہب کے پیشواؤں کو بُرا کہا ہو۔ علاوہ اِس کے اخلاق اور متانت سے نہایت بعید ہے کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا کا ذکر بے ادبی سے کریں واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کے رسالہ "تھیاسوفسٹ" میں ایک پُرمغز مضمون "مآلِ زندگی" پر نکلا ہے اوس کا وہ حصّہ جو ہمارے مضمون سے متعلق ہے بطور خاتمہ یہاں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"ہم روزانہ اپنی غلطیوں کا خمیازہ اُٹھاتے اور مصیبتیں جھیل کر سیکتے ہیں کہ جسمانی آرام دیانت۔ صداقت اور نیکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ہم کو ہمیشہ مخلوق کو فائدہ پہنچانے کا خیال مدنظر رکھنا چاہیے۔ سب میں اچھی زندگی اوس شخص کی ہے جو حتی الامکان اپنے ابنائے جنس کو نفع پہنچاتا ہو۔ اپنے قوائے شہوانی کو قابو میں رکھکر بہتر سے بہتر خیال کو پورا کرتا اور اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح میں شب و روز لگا رہتا ہے اور نمایاں ترقی کرتا جاتا ہے۔

عمدہ زندگی کا دوسرا بڑا اصول یہ ہے کہ جو خدا نے محبت ہم کو فطرتاً عطا کی ہے اوسے ترقی دیں اور اُس کا بہتر سے بہتر اظہار باہمی محبت سے کریں۔ اگر ہم کو انسانوں سے محبت ہوگی تو ہم اونہیں فائدہ پہنچا دیں گے یعنی نفس کُشی اختیار کر کے ہر طرح بلا اُمید تعریف یا صلہ کے ہم خلق خدا کے ساتھ نیکی کریں گے۔ اپنے افعال و حرکات کو اپنے عقیدے کی مجسم تصویر بناؤ۔ دو فصل بات چھوڑ دو اپنے دل میں کبھی بُرا خیال مت آنے دو۔"

اگر تم وحشی کج فہم۔ اور ذلیل رہنا چاہتے ہو تو یوں لڑتے جھگڑتے رہو ورنہ انسان بنو خود بھی خوش و خورم رہو اور دوسروں سے بھی ہمدردی کرو ہمارے مصلحانِ ملک اور اخبار نویس امید ہے کہ اِس بات کو مختلف طریقہ سے لوگوں کو سمجھا دیں گے۔ وما علینا الا البلاغ

(ایک بہی خواہ نوع انسان)

"الہارون" پر ریویو۔

جب سے شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی نے مشاہیر اسلام کی سوانح عمریوں کا "النامہ" شروع کیا ہے اوس وقت سے اِس ڈھنگ کی کئی کتابیں نہ صرف باعتبار نام بلکہ عمدگی مضامین کے خیال سے بھی پبلک کے سامنے آچکی ہیں۔ چنانچہ البرامکہ اور الہارون (جو حال میں شائع ہوئی ہے) اِس جنس کے عمدہ نمونے ہیں۔ اگرچہ لفظ ہارون پر الف لام عربی زبان میں کبھی داخل نہیں ہوتا اور زیادہ مناسب ہوتا اگر اُس کا نام "ہارون اعظم" یا "ہارون الرشید" رکھا جاتا مگر شاید مترجم کو "النامہ" کی تقلید نے مجبور کیا ہو۔ خیر یہ بات کچھ زیادہ نکتہ چینی کے قابل نہیں ہے۔

قدیم تصنیفات اور جدید تالیفات میں ایک مابہ الامتیاز بات یہ ہے کہ اُن میں حال کے مذاق تاریخ و سوانح عمری کے مسلمہ اُصول کی بہت کچھ پابندی کی گئی ہے۔ اُن میں "مشتبہ گریہ" کم ہے اور موقع پر ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے ہر شک بآسانی دور ہوسکتا ہے اور ترتیب و فہرست مضامین ایسی واضح ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کو خاص مقامات کے تلاش کرنے میں کم دقت پیش آتی ہے۔ مگر ترجموں میں اِن اُصولوں کی پابندی کم کیگئی ہے۔

تاریخ نویسی مسلمانوں کا شعار مانا گیا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ انگریزی تعلیم نے مسلمانوں کے اِس مُردہ شوق کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے بلکہ بیوگرفی واقعی طور پر لکھنے کا اگر نیا طریقہ نہیں پیدا کیا تو پچھلی پیچیدہ

چھوڑا کر راہ راست پر ضرور ڈالدیا ہے جس سے ایک تدبہ فائدہ پڑھنے والوں کو پہونچا اور پہنچ رہا ہے۔

بیوگریفی ایک یونانی لفظ ہے اور انگریزی زبان میں ۔ کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی انگریزی خواں ہمری کی جگہ اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ مگر اُردو میں حقول الفاظ مل سکیں تو غیر زبان کے الفاظ سے ہونے فائدہ ہیں۔ اِس وقت اُردو میں سوانح عمری۔ کر۔ حیات۔ سیرت وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں۔ مگر ں جلسہ ایسا نہیں ہے جو ہر فن کیلئے اصطلاحات مرر کرے۔ لہذا بحث چھوڑکر یہاں صرف اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ ہمارے مصنف اگر لفظ سیرت کو زیادہ رواج دیں تو کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اِس سے انسان کے افعال اور ارادات کی پوری کیفیت معلوم ہوسکتی ہے اور یہی ایسی تصنیف کا مقصود ہونا چاہیئے یعنی واقعی حالت کی لفظی تصویر کھینچی جاوے۔ لہذا لفظ سیرت۔ بیوگریفی۔ لائف بلکہ اسٹڈی (studies) کا پورا پورا بدل ہے۔

الہارون نہ تصنیف ہے نہ تالیف بلکہ مسٹر پامر ایک انگریز عالم کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس کو منشی محمد مصباح الدین احمد صاحب رہتکی مترجم "محاربۂ فرانس و پرشیا" نے بعض نہایت ضروری نوٹوں وغیرہ کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۱۸۸۳ء میں جبکہ مولوی شبلی صاحب اوّل اوّل مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں پروفیسر مقرر ہوکر آئے تھے اور اونہیں تصانیف کے شوق نے گدگدایا تھا تو اُس وقت مسٹر پامر کی اِس کتاب کا ترجمہ اونہوں نے بعض طلبائے مدرسۃ العلوم سے اوس کے مختلف حصّے تقسیم کرکے کرایا تھا اور اون کا ارادہ اوسے اسی حیثیت سے چھاپنے کا تھا جیسا کہ منشی مصباح الدین احمد صاحب نے اس وقت شائع کیا ہے مگر کسی وجہ سے وہ اپنے اِس ارادے کو پورا نہ کرسکے۔

ہارون الرشید کا عہد تاریخ اسلام میں ایک مہتم بالشان زمانہ ہے۔ کیا باعتبار وسعتِ سلطنت اور کیا بلحاظ اشاعتِ علوم اُس کی نظیر دنیائے اسلام میں کم ملتی ہے ہمارے نوجوان بالخصوص انگریزی خوان مسلمان اِس کتاب کو ضرور پڑھیں تاکہ اونہیں اچھی طرح ثابت ہوجاوے کہ مسلمانوں نے کس فراخ دلی اور بے تعصبی سے غیر زبانوں کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں اور اونہوں نے غیر مذہب والوں کو کس توقیر اور وقعت سے بیش قرار تنخواہیں مقرر کرکے نوکر رکھا اور فضلائے ہند و یونان کے ساتھ کیسا عمدہ برتاؤ کیا اور خلیفہ باایں ہمہ جبروت و اولوالعزمی کیسا سادہ مزاج اور منصف واقع ہوا تھا کہ ادنیٰ بڑھیا کی فریاد بھی خندہ پیشانی سے سُنتا اور اپنی ذات خاص کی نسبت لوگوں کے اعتراض سنکر چین بجبین نہوتا بلکہ جواب باصواب دیتا اور کبھی حق سے مُنہ نہ موڑتا۔

اِس وقت تک دو کتابیں جعفر و عباسہ و البرامکہ اور بعض مضامین اردو میں نکلے ہیں جنمیں سے پہلی کتاب ناول ہے جس کی بنیاد ایک غلط اور نا فواہی قصہ پر رکھی گئی ہے اور جس کے مصنف ایڈیٹر مرقع عالم ہیں اور دوسری تاریخ ہے جو مسلمانوں کی اور بجنل تصانیف سے نہایت تحقیق اور وسعتِ نظر کے ساتھ ترتیب دیگئی ہے اور جس کے مصنف مولوی محمد عبد الرزاق صاحب رئیس کانپور ہیں۔ اِن سے ہارون الرشید کی خلافت کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے مگر الہارون میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس میں ایک مہذب قوم کے سربرآوردہ عالم نے اوس کے اُصولِ سلطنت۔ اخلاق۔ آداب غرضکہ ہر پہلو سے بحث کی ہے اور قابل مترجم نے مسٹر پامر کی فروگذاشتوں اور اون اعتراضوں کو تاریخی انتخابات سے دفع کیا ہے جو عدم واقفیت یا ہٹ دہرمی سے

مؤلف کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اصل کتاب کے علاوہ تمہید۔ نوٹوں اور ضمیموں کے سبب سے ابتدائے اسلام سے آخر زمانہ ہارون الرشید تک کی ایک مسلسل تاریخ مرتب ہو گئی ہے اور عظیم الشان وقعات اور اہم معاملات کی ہوبہو لفظی تصویر ناظرین کے لئے کھینچدی گئی ہے اور ترجمہ اس صفائی اور عمدگی سے کیا گیا ہے کہ طبعزاد تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اس کتاب کا وہ رنگین اور پُر شوکت اسٹائل نہیں ہے جو المامون اور البرامکہ کا ہے۔ جیسا کہ ایک نوٹ سے جو ہم آگے چل کر نقل کریں گے ناظرین اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

نوٹ بعض اوقات بہت طویل ہیں مگر چونکہ حشو و زوائد سے پاک ہیں اور نفس مضمون سے اون میں بحث کی گئی ہے لہذا اون کے پڑھنے سے جی نہیں اُکتاتا۔ اکثر نوٹ زمانۂ حال کی تصنیف شدہ اُردو کتابوں یا فارسی تاریخوں سے لئے گئے ہیں۔ ایک نوٹ بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ صفحہ (۴۷۱ کا نوٹ)۔

" مسٹر پامر نے ہارون کے کثیر التعداد خزانہ سے بڑا تعجب کیا ہے کہ اس قدر خزانہ واجبی طور پر اور دیانت داری سے نہیں آتا ہوگا اور پہر اس خزانہ کا یونانی (بزنطائن) بادشاہوں کے خزانہ سے مقابلہ کیا ہے اور پہر تعجب کیا ہے کہ کبھی بادشاہ یونانی اس قدر خزانہ جمع نکر سکے جتنا ہارون الرشید نے مرنیکے بعد چھوڑا۔ اس کا صاف جواب ہے کہ یہ کوئی تعجب اور خیال دوڑانے کی بات نہیں ہے سلطنت بزنطائن کی نسبت ہارون الرشید کی سلطنت آٹھ گنی زیادہ تھی۔ اس نسبت سے آٹھ یونانی بادشاہ جتنا خزانہ جمع کر سکتے تھے اُتنا ہارون الرشید اکیلا ہی کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہارون الرشید کی سلطنت میں نہایت درجہ کا امن و امان و فارغ البالی تھی جیسا کہ خود پامر صاحب نے اس کتاب میں درج کیا ہے اور بزنطائن کی سلطنت میں بڑی ابتری اور فتنہ و فساد رہے جیسا کہ مسٹر سینڈرسن صاحب مورخ سلطنت بزنطائن کا حال لکھتے ہیں کہ اس سلطنت کی وسعت تو یہ تھی کہ بحر روم کے کنارے کے ممالک اس سلطنت میں شامل تھے۔ مثلاً یونان۔ اٹلی کا کچھ حصہ۔ اسپین اور کچھ افریقہ کا ملک۔ اور انتظام کا یہ حال تھا کہ یہ سلطنت اندرونی و بیرونی حملوں کے مقابلہ کے لئے بالکل کمزور تھی۔ لوٹ مار اور خواہشات نفسانی اور کوئی ایسی بُرائی نہتی جو وہاں کے اُمراء اور رعایا میں موجود نہو۔ جنرلان فوج باغی ہوجاتے تھے۔ پادشاہ اکثر معزول کردیے جاتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ پادشاہ کی بیٹی اور بی بی خود ہی پادشاہوں کو زہر دیتی تہیں یا دیگر طور سے مار ڈالتی تھیں۔ علم و اخلاق کچھ بہی نہ تہا جس سلطنت کا یہ حال ہو پہر وہاں خاک خزانہ جمع ہو سکتا ہے۔ جو شخص قوت پکڑ جاتا ہوگا وہی خزانہ خوب صرف کرتا ہوگا تاکہ اپنے قیام کیلئے مضبوطی کرے اور ہارون الرشید کی سلطنت بڑی ہی وسیع تھی اور دوسرے بزنطائن سلطنت کا بادشاہ اس کو شاہی خراج دیا کرتا تھا جیسا کہ اسی کتاب میں پامر صاحب تحریر کر چکے ہیں۔ اور سلطنت عباسیہ میں منصور کے زمانہ سے خزانہ جمع ہوتا چلا آتا تھا اور جب سے اس سلطنت کا کوئی بادشاہ معزول یا مقتول نہیں ہوا تھا۔ پہر خلیفہ ہارون رشید کے پاس خزانہ اس قدر جمع ہوا تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ مسٹر پامر کی عبارت میں نقیض بہت پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ اس کتاب میں یہ لکھا ہے

کہ وہ بڑا طامع تھا اور دو چار جگہ لکھ دیا ہے کہ ہارون رشید بڑا سخی تھا۔ اگر کثرتِ بیان مسٹر پامر پر خیال کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا سخی تھا طامع اور لالچی ہرگز نہ تھا مگر طامع کے لفظ سے اتنا اور خیال ہوتا ہے کہ وہ مسرف اور مبذّر نہ ہوگا۔ غرضکہ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ خیر الامور اوسطہا پر اُس کا عمل تھا۔ گورنروں وغیرہ سے بعض مرتبہ روپیہ وہ بطور جرمانہ کے لیا کرتا تھا۔ جب کہ اوس کو پوری شہادت اِس بات کی ملجاتی تھی کہ اونہوں نے رعایا سے روپیہ جبر و ظلم سے لیا ہے۔ بلکہ اکثر ایسے گورنروں کو موقوف ومقید کر دیتا تھا جیسا کہ علی ابن عیسیٰ کا حال اسی کتاب میں تحریر ہوا ہے۔ بلکہ یہ بات ثابت ہونے پر کہ رعایا سے جبریہ روپیہ لیا گیا اوس کا معاوضہ خزانہ سے دلایا جاتا تھا۔ اگر ایسا نکرتا تو رعایا میں فارغ البالی اور امن و امان کیسے ہوسکتا تھا اور یہ بات اوس کے کمال انصاف پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مرو کے تمام باشندوں کو جنہوں نے حسب ضابطہ اپنا ثبوت ملکیت بہم پہنچایا تھا تمام روپیہ اون کا دلایا گیا رعایا کی فارغ البالی اور خوشحالی اور امن و امان کا اِس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے"

مندرجہ بالا نوٹ سے بخوبی واضح ہے کہ ذی ہوش مترجم نے زمانہ حال کی موجودہ اردو تصنیفات و نیز فارسی اور انگریزی کی تاریخی کتابیں امورِ متنازعہ فیہ کی تلاش میں بغور پڑھی ہیں اور اپنے مطالعہ اور تحقیقات کا لُب لُباب نوٹوں وغیرہ کی صورت میں بڑھا کر الہارون کو مفید اور دلچسپ بنانے میں ہرگز کمی نہیں کی ہے۔ مگر آخر میں ہم اِس بات کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ جن قصّوں یا تاریخی باتوں کا ذکر اِس کتاب میں مسٹر پامر نے بغیر حوالہ عربی تاریخوں [illegible]ب کی کتابوں کے کیا ہے اگر لائق مترجم کوشش کر کے اون کو ادب اور تاریخ کی کتابوں سے تلاش کر کے نوٹوں میں اون کا حوالہ دیتے تو یہ کتاب تاریخی حیثیت سے اوسی پایہ کی سمجھی جاتی جس پایہ کی البرامکہ اور المامون ہیں۔ غرضکہ یہ نہایت ضروری کتاب عمدہ کاغذ پر خوشخط چھاپی گئی ہے اور عین اوس وقت جبکہ اوس کی ضرورت تھی شائع ہوئی ہے۔

دولت آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایک مستقل سلسلہ علمی تراجم و تصنیفات کا موسوم بہ سلسلۂ آصفیہ قائم ہے جس کے سرپرست حضور سر وقار الامرا بہادر وزیر اعظم ہیں تمدن عرب شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی اور الفاروق شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی اِس سلسلہ میں داخل ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ الہارون نے بھی نکتہ سنجان حیدرآباد کی نظر میں اتنی وقعت حاصل کرلی ہے کہ وہ بھی اوسی سلسلہ میں منسلک ہوگئی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہاں الہارون اعلیٰ طبقہ کی کتاب مان لی گئی ہے۔ یقین ہے کہ اہل ملک اُس کی قدر کریں گے۔ اُس کی قیمت عہ ہے اور مصنف سے (ضلع رہتک) کے پتہ پر درخواست کرنے سے ملسکتی ہے۔

(سخاوت حسین)

خیال یا تصویر ذہنی کی تعریف

عام آدمیوں کی رائے ہے کہ کوئی شے اتنی وسیع نہیں ہے جتنی کہ انسانی قوتِ متخیلہ۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اون کی یہ رائے بالکل غلط اُصول پر مبنی ہے۔ اوس کے برخلاف میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی خیال کی برابر کوئی شے مقید نہیں۔ اِس کا ثبوت گو نہایت مختصر ہے مگر اوس کی استواری میں بھی کوئی شک نہیں۔

ہم کو غور کرنا چاہیے کہ خیال کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اگر اوپری نظر سے دیکھا جائے تو اس طرح خیال کو مقید کرنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کیونکہ خیال تو ایسی شے ہے کہ نہ زمین پر رُک سکتا ہے، نہ آسمانوں میں بند رہ سکتا ہے۔ وہ تو ایسی بلائے بے درمان ہے کہ اوس کو محصور اور محدود کرنا محالات سے ہے۔ مگر نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خیال اون اشیا کے احاطہ سے جنکو ہم دیکھتے ہیں، سُنتے ہیں یا یوں کہو کہ محسوس کرتے ہیں باہر نہیں ہے۔ آپ چاہے جیسے مطلق سے مطلق خیال کو سامنے لاکر اوس کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ کریں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خیال ہمارا صرف انہیں اشیا پر موقوف و منحصر ہے جنکو ہم حواس خمسہ یا دلی کیفیت کے ذریعہ سے محسوس کرتے ہیں۔ بیان مذکورہ بالا کے صحیح ثابت کرنیکے لئے میں دو ثبوت ذیل میں درج کرتا ہوں۔

۱۔ میں خیال کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ غیر اضافی خیال خدا کا ہے۔ خدا کیا ہے؟ جب ہم اس تصویر ذہنی کے اجزا الگ الگ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ خدا بیحد طاقتور ہے۔ بیحد رحیم ہے۔ بیحد کریم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کہاں تک طول دیا جائے۔ غرض یہ کہ خدا کی جو تصویر ذہنی ہمارے دماغ میں ہے، وہ یہ ہے کہ صفات کو ایک لاانتہا حد تک بڑھا دیا گیا ہے۔ یہ صفات ایسی نہیں ہیں جو تجربہ اور علم سے باہر ہوں بلکہ وہی ہیں جنکو ہم حواس خمسہ یا دلی کیفیت کے ذریعہ سے محسوس کرتے ہیں یعنی رحم۔ کرم وغیرہ وغیرہ۔ اِس مثال سے معلوم ہو گیا کہ ہم جس خیال یا تصویر ذہنی کو تحلیل کریں گے اوس کو اپنے تجربہ پر مبنی پائیں گے اور اگر نہ پائیں گے تو وہ خیال باطل ہوگا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کو ہم نے محسوس نہیں کیا اوس کی کوئی تصویر ہمارے ذہن میں سما سکتی ہو اور جب اوس شے کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں سما سکتا تو اوس کی کوئی ہستی نہیں۔

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہمارے ذہن میں بعض تصورات موجود ہیں اور ہم آنکھیں بند کر کے اپنی خاص تصویر پیش کر سکتے ہیں اور فی الواقع اون کی کوئی ہستی نہیں۔ مثلاً پری کا خیال۔ تو ہمارے قول کے موافق پری کی ہستی ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس کا جواب بہت آسان ہے۔ ہم کو اول ہی اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو خیال ہمارے ذہن میں ہے اوس کے اجزا ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ خیال کس طرح بنا ہے۔ پری کی مثال لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پری کے خیال کے اجزا ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ حُسن۔ پر پرواز جسم وغیرہ۔ ہم اِس تصویر میں کوئی ایسی چیز زائد نہیں پاتے جس کو ہم نے کسی طرح محسوس نہ کیا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تصویر ذہنی کس طرح۔ یہ فعل قوت واہمہ کا ہے جو قوت متخیلہ سے ایک علیحدہ قوت مانی گئی ہے۔ اُس کا کام یہ ہے کہ جو خیالات ہمارے ذہن میں حواس خمسہ یا کیفیت دلی کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں اون کو ایک عجیب اور نئی طرز سے ترکیب دیکر یعنی بڑھا گھٹا کر ایک نئی تصویر پیدا کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ قوت واہمہ پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور تصورات کی ہستی اوس پر کچھ ہی منحصر نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم پری کو غیر موجود جانتے ہیں۔ پری کی تصویر جو قوت واہمہ کا ایک فعل ہے خیال کے ذیل میں نہیں ہے۔ یعنی ہم اُس کو خیال نہیں کہہ سکتے بلکہ صرف وہم۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ ہم کو کس طرح معلوم ہو کہ وہ شے جس کی تصویر ہمارے ذہن میں ہے موجود ہے یا نہیں۔ اِس کا حل اِس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمیں اوس تصویر ذہنی کو سامنے رکھکر یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم اوس کو تحلیل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تحلیل کرنیکے یہاں یہ معنی ہیں کہ آیا وہ کسی صورت میں ہمارے محسوسات پر مبنی ہے یا نہیں۔ اگر وہ ہمارے محسوسات پر مبنی نہیں ہے تو جاننا چاہیے کہ اوس شے کی کوئی ہستی نہیں ہے بلکہ سر سے

یہی ناممکن ہے کہ اوس کی کوئی تصویر ہی ہمارے ذہن میں بن سکے - اور اگر وہ ہمارے محسوسات پر مبنی ہو تو پھر اس پر غور کرنا چاہیے کہ کہیں اس تصویر پر قوت واہمہ کا عمل تو نہیں ہوا ہے - اگر اس سے نجات پائی تو سمجھ لینا چاہیے کہ اوس شے کی ہستی میں کوئی شک نہیں -

۲- دوسرا ثبوت اس بات کا کہ خیالات ہمارے محسوسات پر مبنی ہیں، یہ ہے کہ ایک اندھا آدمی کسی رنگ کا جو اوس نے دیکھا نہ ہو اپنے ذہن میں تصور باندھ نہیں سکتا - یعنی چونکہ اوس نے اوس رنگ کو محسوس نہیں کیا ہے اس لئے وہ اوس کی کوئی تصویر اپنے ذہن میں پیدا نہیں کر سکتا -

بیان مذکورۂ بالا سے ہمکو اب اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ جتنی تصاویر ذہنی ہیں وہ سب ہمارے محسوسات پر مبنی ہیں - اس نظر سے میں خیال کی تعریف بیان کرنا چاہتا ہوں - خیال کمزور اور پژمردہ نقل ہے اون اشیا کی جنکو ہم محسوس کرتے ہیں خواس خمسہ یا کیفیت دلی کے ذریعہ سے - یہ تعریف جو مذکورۂ بالا دو ثبوتوں سے استوار و مستحکم بنائی گئی ہے ہر حالت اور ہر کیفیت میں عام طور پر حاوی ہے - صرف ایک مثال مستثنی ہے - وہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی نے ایک رنگ کے مختلف سایہ گل دیکھے ہوں، اور صرف ایک ہی نہ دیکھا ہو تو اوس کو درجہ بدرجہ پتہ دینے سے وہ اوس سایۂ گل کا جو اوس نے نہیں دیکھا ہے تصور باندھ سکتا ہے - صرف یہی ایک مثال ہے جو اس عام تعریف میں شامل نہیں ہے - اس کو علیحدہ کر کے جو تعریف ہم نے خیال کی بیان کی ہے ہر کیفیت اور حالت میں حاوی ہے -

ہم دیکھتے ہیں کہ صدہا مباحثے اس قسم کے ہوتے رہتے ہیں جن میں سوائے لفظی ایچ پیچ کے کچھ نہیں ہوتا - ایک فریق کچھ معنے لیتا ہے دوسرا کچھ - ایسے بیہودہ لفظی مباحثوں کو دور کرنیکے لئے یہ بہت عمدہ نسخہ ہے کہ اوس لفظ کے حقیقی معنے پیدا کرنے کی کوشش کیجائے اور کوشش صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اوس لفظ کو تحلیل کیا جائے (جیسا کہ ہم نے اس مضمون میں بتایا ہے) پھر اس امتحان کے بموجب اوس لفظ کے معنے (تصویر ذہنی) باطل یا غیر باطل فوراً ثابت ہو سکتے ہیں - ہم امید کرتے ہیں کہ اس عمل سے فائدہ اوٹھایا جائیگا -

(ایک فلسفہ دان)

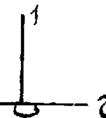
اُقلیدس کا زاویۂ قائمہ

آجکل مسلمان ریاضیات کے دشمن خیال کیے گئے ہیں - کسی زمانہ میں یہ قوم اس علم کی دوست مانی گئی تھی - افلاطون کے حکم کی مبنی کوئی شخص اوس کے بیت العلوم میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا جبتک کہ وہ علوم ریاضیہ کا ماہر نہو - عملی تعمیل مسلمان علما ہی نے کی تھی - مگر اب تو یہ حال ہے - ؎

آں قدح بشکست واں ساقی نماند

علامہ شیخ نصیر الدین طوسی مسلمان متاخرین میں بڑے پایہ کے ریاضی دان گذرے ہیں - ریاضیات کے فاضل تو اور بھی تھے اور اب بھی ہیں مگر اس شخص کی طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ کچھ ایسا بلا کا تھا کہ متاخرین انھیں ابو الہندسین کہتے ہیں - شیخ موصوف نے علاوہ شرح اشارات کے جس میں ضمناً ریاضیات کا بھی ذکر ہے ایک مستقل کتاب شرح اقلیدس بھی لکھی ہے - اس کتاب میں اونھوں نے اُقلیدس کے ایک بڑے بھاری

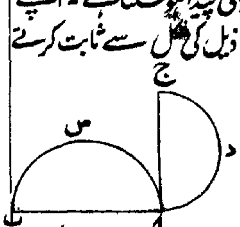
دعوے اور ایک بڑی کارآمد شے کی تعریف کی تکذیب کی ہے۔ اقلیدس نے اپنی ابتدائی تعریفات میں زاویۂ قائمہ کی جو تمام اقلیدس میں بڑی کارآمد بلکہ کل ریاضیات و فلکیات میں مفید شے ہے یہ تعریف کی ہے کہ اگر ایک خط مستقیم دوسرے خط مستقیم پر اس طرح کھڑا ہو کہ پہلو کے ہر دو زاویے برابر ہوں تو اُن میں سے ہر ایک زاویے کو زاویۂ قائمہ کہتے ہیں۔



خط مستقیم کو عام اصطلاح میں ایک سیدھی لکیر کہنا چاہیے

مثلاً اگر د ج ایک سیدھی لکیر ہو اور اس سیدھی لکیر پر ایک اور سیدھی لکیر ا ب کھڑی کر دیجائے تو اگر ا ب کی بغل کے ہر دو زاویے آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہوں تو ان ہر دو زاویوں میں سے ہر ایک کو زاویۂ قائمہ کہتے ہیں۔

یہ تعریف تو اقلیدس کی ہے۔ اب ہمارے شیخ طوسی صاحب فرماتے ہیں کہ زاویۂ قائمہ کیلئے ضروری نہیں ہے کہ خط مستقیم ہی ہوں۔ بلکہ زاویۂ قائمہ خطوط منحنی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اپنے اِس دعوے کو وہ ذیل کی شکل سے ثابت کرتے ہیں۔



فرض کرو کہ ا ب ایک خط مستقیم ہے اُس پر نقطہ ا سے ایک خط مستقیم ا ج زاویۂ قائمہ پیدا کرتا ہوا کھینچو بموجب شکل (۱۱) مقالۂ اوّل کے۔

ا ج کو ا ب کے برابر بنا لو۔

ا ب پر ا س ب ایک نصف دائرہ بنا لو۔

اسی طرح ا ج پر ا د ج ایک نصف دائرہ بنا لو۔

اب مقالۂ اوّل و سوم سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ چونکہ خطوط مستقیم ا ج۔ اور ا ب باہم برابر ہیں اس لئے نصف دائرہ ا د ج برابر ہے نصف دائرہ ا س ب کے۔ اور اگر نصف دائرہ ا د ج نصف دائرہ ا س ب پر رکھا جائے تو زاویہ ج ا د برابر ہو گا زاویہ ب ا س کے اور زاویہ ا ب س برابر ہو گا زاویہ ا ج د کے کیونکہ انکے قطر اور محیط آپس میں برابر ہیں۔ اور دونوں نصف دائرے برابر ہونیکے سبب سے ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں۔

اب اگر زاویہ س ا ج کو علیحدہ علیحدہ زاویہ ج ا د پر اور زاویہ ب ا س پر زیادہ کرو تو زاویہ ب ا ج برابر ہو گا زاویہ س ا د کے کیونکہ جب برابر چیزوں پر برابر چیزیں زیادہ کیجائیں تو کل چیزیں بھی برابر ہوتی ہیں۔ چونکہ زاویہ ب ا ج قائمہ ہے اس لئے زاویہ س ا د بھی قائمہ ہوا۔ پس زاویہ س ا د جو دو منحنی خطوط یعنی ا س اور ا د سے پیدا ہوا ہے قائمہ ہے۔ اور یہ امر ثابت ہو گیا کہ دو منحنی خطوط کے درمیان میں بھی زاویۂ قائمہ ہوتا ہے اور اقلیدس کا یہ دعویٰ کہ زاویۂ قائمہ کیلئے ضرور خط مستقیم ہی ہونے چاہئیں کلّی نہیں رہا۔

علامہ طوسی کا یہ خیال تھا کہ اقلیدس کی اس جزوی تعریف نے مہندسین کو اس امر پر مجبور کیا تھا کہ ایک نئے علم یعنی فصول مخروطی (کانک سیکشن) کو ایجاد کریں کیونکہ فلکیات اور ریاضی مخلوط (مکسڈ میتھمیٹکس) میں خطوط منحنی سے ہی زیادہ کام پڑتا ہے اس لئے اونھوں نے زاویۂ قائمہ کو مختلف حالتوں میں پیدا کرنیکے واسطے بیضوی و قریب البیضوی اشکال کے خواص دریافت کیے۔ ورنہ ان شکلوں کے وضع کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی

میں نہیں کہہ سکتا کہ علامہ موصوف کا یہ خیال کہاں تک درست ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اونہوں نے اپنے اعتراض کو بہت اچھی طرح نبھا دیا ہے۔ ریاضی دان اِس کی قدر کریں یا نہ کریں ایک دفعہ تسلی تو ضرور ہو جاتی ہے۔

(امین الدین)

جنرل ہنی بال

یونانی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۸۰۰ (قبل مسیح) کے قریب سلطنت فنیشیا افریقہ کے شمال میں اپنی تجارت اور دولت کیلئے مشہور تھی۔ اور معلوم نہیں کہ اوس سے کتنے دن پہلے وہ ایک زبردست قوم ہو گئی تھی۔ اب سے تقریباً تین ہزار برس پہلے وہ دنیا کی سب قوموں سے تجارت کرنے میں موجودہ زمانے کے انگریزوں کے برابر تھے۔ اونہوں نے انگریزوں کی طرح نوآبادیاں بھی قائم کیں جن میں سے نہایت مفید اور مشہور کارتھیج افریقہ کے شمال میں سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ کارتھیج نے چند سال میں ایسی ترقی کی کہ وہ دنیا کی تجارت اور تہذیب کا مرکز بن گیا۔ پرانی دنیا کی کسی قوم نے اُن سے زیادہ اشاعت تہذیب نہ کی۔ وہ جہاں جاتے تھے وہاں کے لوگوں کو بہت سی نئی چیزیں بتاتے اور سکھاتے تھے۔ حروف کا استعمال بھی اونہوں نے ہی سنہ عیسوی سے ۱۲۰۰ برس پہلے یورپ کے لوگوں کو سکھایا۔

ہنی بال اس سلطنت کا نہایت جلیل القدر اور مشہور سپہ سالار تھا۔ یہ اون چار اُولوالعزم جنرلوں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے تمام دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا اور صرف ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ اوس کو ایک حد تک پورا بھی کر دکھایا گو کئی پشتوں سے اُس کا خاندان شجاعت کیلئے مشہور تھا لیکن سچ یہ ہے کہ ہنی بال ایک عجیب پیکر بشر مظہر قدرت آفریدگار تھا ہمت و دلیری اِس درجہ کمال پر تھی کہ ابتدائے عمر سے آخر تک کسی جگہ اور کسی حالت میں خوف و ہراس اُسکے پاس تک نہ آیا۔ اس شخص نے جو جو کام کیے وہ تاقیام دُنیا نظرِ وقعت سے دیکھے جائیں گے۔ اور ہنی بال کا نام صفحاتِ تاریخ میں ہمیشہ نمایاں جگہ پر لکھا جاویگا۔

ہنی بال کا باپ ہملکار ہی کارتھیج کا مشہور جنرل تھا۔ جب وہ رومۃ الکبریٰ کے برخلاف اسپین (اسپانیہ) کے فتح کرنے کو اپنے وطن سے رخصت ہونے لگا تو اوس نے ہنی بال کو اپنے پاس بُلایا جو اوس وقت صرف نو برس کا تھا اور دریافت کیا کہ کیا تم بھی لڑائی میں چلنا چاہتے ہو؟ ہنی بال یہ سنتے ہی نہایت خوشی کیساتھ راضی ہو گیا۔ تب ہملکار نے اوس سے عہد لیا کہ وہ کسی حالت اور کسی وقت میں رومۃ الکبریٰ کی طرفداری نکریگا۔ یہ اقرار کر کے ہنی بال اپنے باپ کیساتھ دلی مسرت سے اسپین کو روانہ ہوا۔ اوس کی تاریخ سے معلوم ہو گا کہ ہنی بال اخیر وقت تک کس استحکام کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہا۔

ہملکار کو پھر وطن لوٹنا نصیب نہوا اور اوس نے دریائے ٹیگس تک اسپین کو فتح کر کے وہیں اپنی جان اپنے عزیز ملک پر قربان کر دی۔ اوس کی وفات کے بعد ہسڈروبال اوس کا داماد اوس کا جانشین ہوا لیکن زیادہ عرصہ تک نہ جینے پایا تھا کہ سنہ ۲۲۱ (قبل مسیح) میں ایک دشمن کے ہاتھ سے قتل ہوا اسی سال ۲۶ برس کی عمر میں ہمارا مشہور بہادر ہنی بال سپہ سالاری افواجِ کارتھیج کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہوا۔ دو سال تک تو وہ کارتھیج میں اپنی فوجی قوت جمع کرتا رہا مگر جب اوس کو اپنی قوت کا اندازہ ہو گیا کہ رومۃ الکبریٰ کے برخلاف وہ کچھ کر سکے گا تو اوس نے سنہ ۲۱۹ (قبل مسیح) میں لڑائی شروع کر دی۔ یہ وہ زبردست لڑائی تھی جو سترہ برس میں اختتام کو پہونچی۔

ہنی بال کا منشا بحری لڑائی کا نہ تھا بلکہ اوس کا یہ مطلب تھا کہ وہ اپنی جرار فوج براہِ خشکی اطالیہ کو لیجا سکے

اور رومیوں پر اونہیں کے خاص ملک میں حملہ کرے۔ ناظرین خیال فرما سکتے ہیں کہ کارتھیج (شمالی افریقہ) سے روم دارالسلطنت اطالیہ تک براہ خشکی فوج لیجانا ہنی بال ہی کی ہمت مردانہ کا کام تھا۔ رستے میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ اوسی نے دریائے روڈینس کو عبور کیا۔ کوہستان الپس پہنچنے تک اوس کو کئی مقامات پر قوم گالس (Gauls) سے لڑنا پڑا۔ ہنی بال کا یہ حملہ اور کوچ اون مشکلات ہی کیوجہ سے جو اوس کو پیش آئیں تاریخ میں نہایت مشہور ہے۔ اور تمام نامور مورخ متفق ہیں کہ یہ سخت رستہ طے کرنا ہنی بال ہی کا حصہ تھا۔ آخر کار ہنی بال اپنے ارادے میں کامیاب ہوا اور خاص اطالیہ میں مختلف مقامات پر معرکۂ کارزار گرم ہوا جن میں دونوں قوموں کا کثیر التعداد روپیہ صرف ہوا اور بڑے بڑے جواہر بیش بہا جو معلوم نہیں اون ملکوں کو کس قدر عرصہ کے بعد نصیب ہوئے تھے میدان جنگ میں کام آئے۔

پہلا مقابلہ اوس کا روم (Rome) سے ۲۱۸ (قبل مسیح) میں دریائے ٹائی سی نس پر ہوا اور مخالفین کو شکست ہوئی۔ ہنی بال نے پیڈس کو بھی پار کیا۔ اسی اثنا میں روم کی دوسری فوج آگئی اور اوس کی سپہ سالار لانگس نامی نے فوراً ہی لڑنا چاہا۔ دریائے ٹریبیا فریقین کی فوجوں میں حد فاصل تھا۔ ایک رومی جنرل نے اچانک حملہ کر دیا۔ لیکن ہنی بال ایسی آسانی سے مغلوب ہو جانیوالا نہیں تھا۔ وہ فوراً تیار ہوگیا اور اُس نے سخت لڑائی کے بعد لانگس کو شکست فاش دی۔ اس طرح اطالیہ کا تمام شمالی حصہ ہنی بال کا مطیع ہوگیا۔ دوسرے سال ۲۱۷ (قبل مسیح) میں ہنی بال داخل ایٹروریا ہوگیا۔ پھر وہ لوٹ مار کرتا ہوا روم کی طرف بڑھا کانسل نیپوس اوس کے مقابلہ کیواسطے بھیجا گیا خلیج ٹراسی مینس کے کنارے پر دونوں میں صف بصف لڑائی ہوئی۔ اِس میں بھی قدرت نے ہنی بال ہی کو فتح دی اور نیپوس لڑائی میں کام آیا۔ اس شکست کے بعد رومی بہت پریشان ہوئے اور تجویز ہوئی کہ نہایت خطرہ کی حالت میں جو کارروائی کیجایا کرتی ہے وہ کیجاوے یعنی ایک ڈکٹیٹر جو بعہد سلطنت جمہوری قائمقام فرمانروا ہوتا ہے مقرر کیا جاوے۔ چنانچہ انتخاب کر کے فیبیس نامی ایک بڑا جنرل ڈکٹیٹر مقرر ہوا۔ اوس نے ہنی بال سے فوج آراستہ کر کے دوبدو کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ وہ صرف ہنی بال کا تعاقب کرتا رہتا تھا اور ہنی بال اور اوسکی فوج جرّار کے لوٹنے کیواسطے سارا ملک چھوڑ دیا تھا۔ گو یہ عمل واقعی اون کیلئے مفید تھا لیکن رومیوں نے اِس وتیرہ کو ناپسند کیا۔ اور اونہوں نے ہنی بال کی فوج سے دوچند فوج جمع کی۔ کینی میں دونوں فوجوں کے درمیان ایک بہت بڑی لڑائی ہوئی۔ اِس معرکۂ جنگ میں ہنی بال کے صرف دو تین ہزار آدمی کام آئے اور دشمن کے ستر ہزار۔ اب روم والے فتح سے بالکل نا امید ہوگئے۔ لیکن یہ کہاں ممکن ہے کہ ایک آدمی اور صرف ایک ہی کی قوت بازو سے ایک بڑی قوم مغلوب ہو۔ کینی کی جنگ کے بعد ہنی بال نے خیال کیا تھا کہ روم والے یعنی رعایا اوس کے مطیع اور طرفدار ہو جاویں گے اور فی الحقیقت چند نے ایسا کیا بھی لیکن اطالیہ کے شہر اور تمام نوآبادیاں روم کی مدد و معاون رہیں۔ بھلا ایسی حالت میں روم کس طرح فتح کیا جا سکتا تھا۔ ہر خاص شہر کے محاصرہ اور فتح کرنے کیلئے اوس کو بہت سا وقت اور کثیر التعداد فوج کی ضرورت تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی طرف سے بھی ہنی بال کو کمک نہیں پہونچی۔ اوس کا حقیقی بھائی اسڈروبال نامی اسپین میں روم کے برخلاف لڑائی میں مصروف تھا اور اسی وجہ سے وہ ہنی بال کو کچھ مدد نہیں پہنچا سکا کارتھیج سے بھی اوس کی مدد کے واسطے کچھ فوج نہ آئی کیونکہ ہنی بال کی روزافزوں ترقی سے ہوم گورنمنٹ کو

بہت خوف تھا کہ کہیں وہ بادشاہ نہو جائے۔ دوسرے
اون کو یہی علم نہ تھا کہ ہنی بال کی ٹھیک کیا حالت ہے
اور وہ کیا کر رہا ہے کیونکہ اوس زمانہ میں ایسے ذرائع
آمدورفت وخبر رسانی بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھے
جو آج ہم ہندوستانیوں کو برٹش گورنمنٹ کی عنایت
سے حاصل ہیں۔ ہنی بال نے جو خطوط بدرخواست کمک
وہاں بھیجے اون کا یہی جواب ملتا رہا کہ جب تم ایسے بڑے
بڑے معرکوں میں فتحیاب ہوے ہو تو تم کو زیادہ فوج کی
ضرورت نہیں ہے۔

ہنی بال نے اپنی ساری قوت جنگ کینی ہی میں صرف
کردی۔ اس کے بعد وہ روم کے برخلاف کچھ نہ کرسکا۔
اب روز بروز ہنی بال کی قوت کم ہوتی جاتی تھی اور روم
قوی ہوتا جاتا تھا۔ خاص شہر جو ہنی بال کا مطیع ہوکر اوسکا
مددگار ہو گیا تھا کیپوا تھا۔ لیکن ۲۱۱ء (قبل مسیح) میں روم نے
اوس پر پھر اپنا تسلط کرلیا اور ہنی بال میں اب اتنی
طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اون کو روک سکے۔
یہ واقعہ ایسا عبرت انگیز ہوا کہ تمام بڑے بڑے شہروں نے
جو اوس کی طرف ہو گئے تھے پھر روم کی اطاعت
قبول کرلی۔

۲۰۷ء (قبل مسیح) میں اسڈروبال برادر ہنی بال اسپین
سے اپنے پیارے بھائی کو مدد دینے کیلئے روانہ ہوا اور
اطالیہ کی حدود کے اندر داخل بھی ہو گیا لیکن دریائے
مٹارس کے کنارے پر فوج روم نے اوس کو
شکست دی اور اوس کا سر کاٹکر ہنی بال کے لشکر میں
ڈالدیا۔ جب ہنی بال نے اتفاقیہ وہ سر دیکھا تو اوس کو
معلوم ہوا کہ اوس کا بھائی بھی اطالیہ میں اوس کی
مدد کے واسطے آگیا تھا اور صرف یہی وحشت اثر خبر تھی
جو اوس کو اپنے بھائی کے آنے کی ملی۔ ہنی بال
کو اپنے بھائی کا سر دیکھکر جس قدر صدمہ ہوا ہو تھوڑا
ہے۔ اوس جانکاہ واقعہ کے بعد اوس کی ہمت
بہت ہی پست ہو گئی ہوگی۔ پھر کیا خاک وہ لڑسکتا تھا
اب اوس کو مدد کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی
لیکن تاہم ہنی بال نے اطالیہ کو بالکل چھوڑ نہیں دیا بلکہ
وہ مختلف مقامات میں لوٹتا ہوا پھرتا رہا مگر رومیوں کی
بھی یہ ہمت نہوئی کہ باوجود اس قدر کمزوری کے وہ اوس
اور اوس کی فوج کو کوئی زبردست شکست دیں یا اوسکو
اپنے ملک سے نکالدیں۔

اِس وقت ایک رومن جنرل لیپو نامی نے
ایک اور تدبیر کی جس میں وہ کامیاب ہوا۔ اوس نے
براہ راست کارتھیج پر یورش کردی اور جب کارتھیج کو
شکست ہوئی تو اونہوں نے ہنی بال کو اطالیہ سے واپس
بلالیا۔ یہاں آکر ہنی بال نے پھر لڑائی شروع کردی۔
۲۰۲ء (قبل مسیح) میں ہنی بال نے زاما کی لڑائی میں زک
اوٹھائی اور اوس کی ساری فوج تہ تیغ بیدریغ ہو گئی۔
آخر کار کارتھیج کو کچھ نقصان کیساتھ صلح کرنی پڑی لیکن ہنی بال
کی ہمت کو دیکھنا چاہیئے کہ اوس نے ایسی شکستہ
حالت میں بھی ملک کو مدد دینے کیلئے آمادگی ظاہر کی اور
پھر کچھ فوج جمع کرنی شروع کی۔ رومیوں کے دل پر تو ہنی بال کا
رعب صد درجہ طاری تھا اِس لئے اونہوں نے کارتھیج
کو مجبور کیا کہ وہ ہنی بال کو نہ رکھے۔ اور کمزوری کیوجہ سے
کارتھیج کو یہ بات منظور کرنی پڑی۔ آخر کار ہنی بال جو اپنے
ملک کا شیدائی تھا حدود کارتھیج سے نکلکر گردونواح کے
بادشاہوں کے پاس پھرتا رہا لیکن کسی نے اوس کے
رکھنے پر رضامندی ظاہر نہ کی۔ کیونکہ سلطنت روم اوس وقت
نہایت قوی تھی اور سب جانتے تھے کہ ہنی بال کا رکھنا
اوس کے خلاف مرضی ہوگا۔ آخر کار ۱۸۳ء قبل مسیح
میں ہنی بال نے خودکشی کرلی کہ وہ روم کے پنجہ میں گرفتار
ہوجاوے۔ اور اِس طرح اوس نے اپنے ایام طفولیت
کے وعدے پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے کا
ثبوت دیدیا۔

ہم اِس مشہور اور نامور جنرل کے حالات کو ایک مؤرخ کے اون الفاظ پر تمام کرتے ہیں جو اُس کے حالات اور سیرت کا لُب لُباب ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہنی بال ۲۴۷ قبل مسیح اسپین میں پیدا ہوا۔ جب وہ جوان ہوا تو فن جنگ کے علاوہ اوس کو سیاست و انتظام میں بھی کامل مہارت ہو گئی تھی۔ جنگ و سیاست کا سبق اوس نے اپنے باپ کیساتھ اسپین میں رہکر سیکھا تھا۔ اوس کی ذات میں جوانی کا جوش۔ پیری کی احتیاط۔ بہادروں کی جراُت۔ جنرلوں کا تجربہ۔ یونانیوں کے معلومات زبان پر قدرت۔ گفتگو میں فصاحت۔ دماغ میں ہوشمندی دل میں چستی اور استقلال یہ سب عمدہ صفات جمع تھیں وہ نہایت محنتی اور جفاکش تھا۔ سختیوں اور مصیبتوں کے وقت صابر اور متحمل مزاج تھا۔ نشہ کی چیزوں سے اُسکو طبعًا نفرت تھی۔ اوس کو اِس بات پر پوری قدرت تھی کہ بزور شمشیر دشمن کی فوج کو مغلوب کرے اور اُنکے دلوں میں ہیبت سے زلزلہ ڈالدے۔ جب وہ اٹلی پر حملہ آور ہونیکے لئے اپنے وطن سے چلا تو اوس کے ساتھ (۹۰) ہزار پیدل۔ ۱۲ ہزار سوار اور ۳۷ ہاتھی تھے۔ اوس نے دریائے ابرو کو پار کیا۔ سلسلۂ کوہ پرنیز کو عبور کیا جو فرانس اور اسپین کے درمیان حائل ہے۔ دریائے رون سے گذرا۔ اسپین کی بلند اور خطرناک گھاٹیوں سے ہو کر اٹلی میں جا پہنچا۔ اِس دشوار گذار اور ہولناک اور پیچیدہ رستہ سے حملہ کرنا قدرت نے اوسی کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ کسی جنرل۔ کسی فاتح اور کسی سپہ سالار کو وہ صعوبتیں اور دقتیں پیش نہیں آئیں جو اوس کے رستہ میں مُنہ کھولے کھڑی تھیں۔ پرنیز سے گذر کر اوس نے دریائے رون کے کنارے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ اب ہم ضرور اسپین کی چوٹیوں سے پار ہو جائیں گے۔ جب اوس خوفناک پہاڑ کی بلندی پر پہونچگیا تو اوس نے بلند آواز سے پُکار اکر لو اب روم کا قلعہ فتح ہو چکا۔ شہر میں داخل ہونا باقی ہے۔ کار تھیج سے چلنے اور کینی کی لڑائی میں مشغول ہونیکے وقت تک نہ اُسکو شکست ہوئی نہ کوئی اوس کا سدراہ ہوا۔ جھیلیں اور دریا دلدلیں اور پہاڑ اوس کے رستہ میں اسلئے حائل ہوئے تھے کہ قدرت کی یہی مرضی اور یہی خواہش تھی کہ اِن سختیوں کا مقابلہ کرنے سے اوس کی قوت اور شہرت میں ترقی ہو۔ ہر مشکل جسپر وہ کامیاب ہوتا تھا دوسری مشکل کے طے کرنیکے لئے زینہ بنجاتی تھی اوس نے جن تنگ و تاریک گھاٹیوں۔ گہری اور خوفناک دلدلوں۔ اونچی اور نوکدار چٹانوں۔ برفانی اور سر بفلک پہاڑوں سے عبور کیا اون سے گذرنا تو کیا اون پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور بدن میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ جس طرح اوس نے نیچر پر فتح پائی اور دشمنوں کو مغلوب کیا اِسی طرح اوس کو اپنے سپاہیوں پر بھی عجیب قابو حاصل تھا۔ اُس میں وہ جادو تھا جس نے ایسے مختلف گروہوں کو جنکا ملکر رہنا ناممکن تھا شیر و شکر کر دیا تھا شورہ پُشت لیبین اور میڈین۔ وحشی اور سست اہل اسپین۔ تندخو اور بیوفا گال اِن سب قوموں کو اوس نے اِس طرح ملا دیا تھا کہ وہ اوس کی تلوار کے سایہ میں مشین کی طرح کام کرتے تھے۔ اوس کی فوج میں کبھی بغاوت یا سرکشی کی صدا بلند نہیں ہوئی اٹلی والے تو ہزاروں اوس سے آملے تھے مگر اوسکی فوج کا کوئی سپاہی اوس وقت میں بھی جو اوسکے ستارہ کے زوال کا وقت تھا رومیوں سے نہیں ملا۔ وہ جیسا بہادر تھا ویسا ہی دور اندیش تھا۔ جیسا فیاض تھا ویسا ہی مدبر تھا۔ اِس سلئے کل لوگ جو اوسکے عَلم کے نیچے جمع تھے اوس پر عاشق بھی تھے اور اوس سے خائف بھی رہتے تھے۔ وہ سپاہیوں میں طمانیت

اور جوش دونوں باتیں پیدا کردیتا تھا۔ ایک بڑے آدمی کا قول ہے کہ بڑا جنرل وہ ہے جو سب سے کم غلطی کرے مگر کون بتا سکتا ہے کہ پہلے تین سالوں میں اُس سے کوئی غلطی ہوئی حالانکہ وہ ایسا نازک وقت تھا کہ اگر اُسکی جگہ کوئی دوسرا جنرل ہوتا تو اوس کی شہرت غارت ہوجاتی اور اوس کی لیاقت پر پانی پھر جاتا۔ بدبختی سے ہم کو اوس کے حالات رومیوں سے جو اوس کے دشمن تھے معلوم ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اوس کے چال چلن کو بُرا کہنے میں کوئی دقیقہ اوٹھا نہیں رکھا اونہوں نے اوس کو ظالم کہا ہے مگر ظلم کا جو ثبوت دیا ہے اوس سے خود اون کے دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ وہ پیمان شکن بتاتے ہیں مگر کون شہر یا قصبہ تھا جس کی حمایت کا اوس نے وعدہ کیا ہو اور اُسکو اپنے آپ چھوڑ دیا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ نیچر نے اوسکی مدد کی۔ لڑائی کے میدانوں میں کہیں برف باری ہوئی۔ کہیں کہر چھایا۔ کہیں آندھی کا طوفان آیا۔ انہی حادثات کی مدد سے وہ ہم پر غالب ہوا۔ وہ اُسکو مکار بتاتے ہیں اور اوس کی فتوحات کو اوس نامور کی دلیری اور قابلیت کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اون کو کل قوم فینیشین کی مکاری پر محمول کرتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ کینی کی لڑائی کے بعد اوس کی ترقی کی رفتار سست پڑگئی تھی مگر رومی پھر بھی اُس سے دُور دُور رہتے تھے۔ اور خوف کے مارے پاس نہ پھٹکتے تھے۔ جب اہل وطن نے اوس کو کمک نہ بھیجی جس کے وہ انتظار میں تھا تو اوس نے لڑائی کا طریقہ بدل دیا اور دوسری تدبیروں سے کام لیا۔ اوس کو نیومیڈین سپاہیوں پر کامل بھروسا تھا مگر جب وہ مارے گئے تو اوس نے گال کو بھرتی کیا۔ اسی طرح جب لیبیا اور اسپین کے تجربہ کار سپاہی مرچکے تو اوس نے اپنی فوج میں

سیمنائٹ اور لوکینین بھرتی کرلئے جو روم کے گرد آ
تھے۔ اوس نے پادشاہوں کو سفیر بھیجے کارتھ
خط لکھے۔ مگر کمک نہ ملی۔ وہ ادھر سے اودھر
کرتا پھرتا تھا اور دل برداشتہ لڑائیوں میں مشغو
تھا۔ اوس وقت بارہ رومی جنرل اوس کے گر
منڈلاتے تھے مگر ڈر کے مارے اوسکے پاس
نہ آتے تھے۔ وہ جدھر رُخ کرتا تھا اوسی طرف بھر
پڑجاتی تھی۔ وہ اٹیلا تیمور اور چنگیز کی طرح ہر چیز
جو اوس کے سامنے آتی تھی تیزی کے ساتھ غار
کرڈالتا تھا۔ تین سال تک تو اوس کا یہ حال
پھر بارہ برس تک دشمن کے ملک کے اندر بیٹھا
اپنی مدافعت کرتا رہا اور نہایت کامیابی کیساتھ اپنی
فوج کو دشمنوں کی زد سے ہٹاتا رہا۔ حالانکہ اوس
وقت اوسکی فوج کم تھی اور دشمنوں کی فوج سیل کی طر
بڑھتی جاتی تھی۔ یہ متضاد خواص صرف اُسی میں
اور کسی فینیشین میں نہیں ہوسکتے تھے۔ چاہے وہ کیس
اعلیٰ درجہ کا جنرل یا مدبّر ہو۔ اوس کی اعلیٰ فوجی
جنگی قابلیت اِس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کینی کی
لڑائی میں اُس کی (۳۰) ہزار فوج تھی۔ اور اوس
مقابلہ میں دشمنوں کی تعداد (۸۰) ہزار تھی۔ اِس
بھی اوسی نے فتح پائی۔ ایک فوجی طالب علم اوس
حالات کو پڑھکر سوال کرسکتا ہے کہ اوس نے اسپین
اور فرانس ہوکر اٹلی پر حملہ کیوں کیا حالانکہ وہ سمندر کی
راہ سے بآسانی حملہ کرسکتا تھا فینیشین قوم نہایت
عمدہ جہازران قوم تھی اور وہ اِس لڑائی کے
اعلیٰ درجہ کا جنگی بیڑہ جہازات مہیا کرسکتے تھے۔ پھر کی
سبب تھا کہ اوس نے قریب کا آسان رستہ چھوڑ کر
پیچیدہ اور دشوار گذار رستہ سے حملہ کیا جس میں
اوس کی بیشمار فوج ضائع ہوئی؟۔ اِس کا جواب
یہ ہے کہ اوّل تو اوس کو اِس مہم کیلئے جہازوں کی

نک نہیں ملی - دوسرے اوس نے کارتھیج سے
لی تک مسافت کا اندازہ غلط کیا - تیسرے اوس سے
ال اور شمالی اطالیہ کے باشندوں نے امداد کا وعدہ
یا تھا - یہی اسباب تھے جن سے اوس نے اپنے تئیں
ن خطرات میں ڈالدیا تھا "۔

(نیاز احمد)

قدیم اور جدید خیالات

خدا نے انسان کی فطرت ہی میں یہ بات رکھی ہے
، وہ جن چیزوں کو دیکھتا ہے اون کی کیفیت اور لم دریافت
رنی چاہتا ہے - اس دنیا کا کیسا ہی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ
یوں نہ ہو جب وہ ظہور میں آتا ہے تو پہلے تو انسان اُسکو
یکھکر جاننا چاہتا ہے کہ یہ کیا ہے ؟ پھر آپ ہی آپ سوال
رتا ہے کہ یہ کیوں ہے ؟ انسان کی کیا اور کیوں کا جواب
جو کچھہ ملتا ہے اُسی کا نام فلسفہ ہے - یا یوں کہو کہ فلسفہ
وجودات کے حالات اور اون کے اسباب جاننے کو
کہتے ہیں - کوئی انسان کیوں نہ ہو راز جوئی کا لپکا ضرور اوس
ی فطرت میں داخل ہوگا - نوع انسان کی تاریخ پڑھنے سے
علوم ہوتا ہے کہ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی قومیں
جنکی باتوں پر آج ہم قہقہے مار کر ہنستے ہیں، عالم فطرت کی
چیزوں کو غور سے دیکھتی رہی ہیں اور اون کی حالت کے
ساتھہ اون کے اسباب کا بھی سراغ لگاتی رہی ہیں
یہ دوسری بات ہے کہ اونہوں نے جو کچھہ جانا ہو وہ تھوڑا
ہو یا جو کچھہ اس کا سبب سمجھے ہوں غلط ہو - اگر یہ قومیں
راز جوئی نہ کرتیں اور غلط سلط قیاس ہر چیز پر دوڑاتیں اور
الکل پچو اسباب و نتائج موجوداتِ عالم کے نہ بیان کرتیں
تو نا ممکن تھا کہ اون سے آگے ہم ایک قدم بھی چل سکتے
اور فلسفہ کی وہ عالیشان عمارت کھڑی کر سکتے جس پر آج

فخر ہے - انسان کا علم اور اوس کا تجربہ رفتہ رفتہ بڑھا ہے
اسکی طفولیت کی باتیں کیسی ہی مہمل اور بے سر و پا کیوں ہوں
مگر اون کے جاننے سے آج بھی ایک عجیب دلچسپی پیدا ہوتی
ہے - اون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی باتیں جنکا نام
طبیعیات اور فلسفہ ہے اون کا تخم بچپن ہی میں بویا گیا تھا -
اگرچہ اب اوس تخم میں اور اُس گھنے اور سایہ دار درخت میں
جس کے سایہ میں ہماری معلومات نشو و نما پا رہی ہیں،
کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی مگر حقیقت میں وہی حقیر اور بدنما
بیج تھے جن سے یہ عالیشان درخت پیدا ہوئے اور پھل پھولکر
ہم پر سایہ کرنے لگے - ہم اس موقع پر زمانۂ حال کے فلسفیانہ
خیالات کے ساتھہ اوس زمانہ کے ابتدائی خیالات کا مقابلہ
کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ رازجوئی نے انسان کے علم کو
کہاں سے کہاں پہنچا دیا -

یونانیوں اور عربوں کا خیال تھا کہ ہماری زمین کے گرد
بہت سے کُرے تو بر تو ہیں جو بلور کی طرح شفاف ہیں - یہ
شفاف کُرے آسمان ہیں اور ہر آسمان میں ایک ستارا جڑا
ہوا ہے - ایک آسمان میں سورج اور ایک میں چاند ہے
آسمان زمین کے گرد گھومتے ہیں اور اون کے ساتھہ ستارے
بھی زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں - ناروے کے باشندے
خیال کرتے تھے کہ رات اور دن دو گاڑیوں پر سوار ہیں
اور دونوں ایک دوسرے کے پیچھے اپنی گاڑی دوڑاتے ہیں
رات جس گاڑی پر سوار ہے اوس کے گھوڑے کا نام
زلفِ شبنم ہے - جب رات کی دوڑ تمام ہوتی ہے اور
دن کی سواری آپہنچتی ہے تو زمین پر زلفِ شبنم کے
منہ کے جھاگ پھیل جاتے ہیں اور ہر جگہ اوس ہی اوس
نظر آتی ہے - دن کی گاڑی میں جو گھوڑا ہے اوس کا نام
زلف تاباں ہے - اوس کی ایال اسقدر چمکتی ہے کہ اُسکے
پرتو سے زمین اور آسمان میں روشنی پھیل جاتی ہے -
انہیں میں سے بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک جادوگرنی
کے بطن سے دو بھیڑیے پیدا ہوئے - ایک کا نام

 قدیم اور جدید خیالات

سکول اور دوسرے کا نام ہات ہے۔ سکول سورج کے
پیچھے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ اوس کو شکار کرے۔
سورج اون کے نزدیک ایک حسین اور نوجوان لڑکی
ہے۔ اسی طرح ہات چاند کے پیچھے لپکتا ہے کہ اوس کو
کھا جائے۔ سورج اور چاند دونوں ان بھیڑیوں کی
سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ امریکہ کے انڈین
سورج کی نسبت ایک عجیب کہانی بیان کرتے ہیں۔ وہ
کہتے ہیں کہ پہلے پہل سورج کا فرشتہ زمین پر جہاں چاہتا
گشت لگاتا تھا۔ کبھی زمین والوں سے اتنا نزدیک ہوتا کہ
اوسکے گرمی کے سب کے چہرے جھلس جاتے کبھی زمین کے
نیچے ایک غار میں جا چھپتا اور ساری زمین پر اندھیرا چھا
جاتا اور آدمی سردی سے کانپ اُٹھتے۔ ایک دن سورج
معمول کے موافق زمین پر سیر کرتا پھر رہا تھا کہ اوس نے
دور سے خرگوشوں کے پادشاہ تاؤتس کو دیکھا۔ اوس
وقت تاؤتس اپنے اہل و عیال کے ساتھ جنگل میں بیٹھا
آگ سے ہاتھ پاؤں سینک رہا تھا۔ یکایک اسے نیند آگئی
اور وہ سوگیا۔ سورج اوس کے پاس ہوکر گذرا تو اوسکی
گرمی سے تاؤتس کے شانے جھلس گئے۔ پھر جو کچھ
خیال آیا تو ڈر کر وہاں سے بھاگا اور اپنے غار میں جا چھپا
جب تاؤتس جاگا اور اوس نے اپنے شانوں کو
جھلسا ہوا پایا تو اوس کو بہت غصہ آیا۔ فوراً سورج کے
پیچھے لپکا مگر وہ اوس کی زد سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ آخر
زمین کے انتہائی کنارے پر گھات لگا کر بیٹھا۔ جب سورج
اپنے غار سے نکلکر اُس رستے سے گذرا تو اوسے بالکل
خبر نہ تھی کہ تاؤتس اوس کے گھات میں لگا ہوا ہے۔
تاؤتس نے فوراً اپنی کمان سے ایک تیر پھینکا مگر وہ سورج
کے پاس پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ جلکر گر پڑا۔ دوسرا تیر چلایا وہ بھی
جلکر خاک ہوگیا۔ تیسرا تیر مارا وہ بھی بیکار گیا۔ یہانتک کہ
اوس کا ترکش تیروں سے خالی ہوگیا۔ اب ایک جادو کا
باقی تھا جو نشانے پر پہنچنے میں کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ تاؤتس
اوس کو ہاتھ میں لیکر رونے لگا اور وہ اوس کے
آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ یہ تیر جب پھینکا گیا تو سورج کے
چہرے میں پیوست ہوگیا۔ اوس سے سورج کے
بہت سے ٹکڑے جدا ہوکر زمین پر گرے اور زمین جل اُٹھی
تاؤتس بھی گرمی کے مارے تڑپنے لگا اور وہاں سے
بھاگ نکلا۔ مگر اوس کے ہاتھ پاؤں اور سارا بدن جل
چکا تھا اور سر ہی سر باقی رہگیا تھا۔ اب اُس کا سر زمین پر
لوٹتا پھرتا تھا۔ گرمی کے سبب سے اُس کے رخسارے
سوج گئے اور آنکھیں نکل پڑیں۔ اور آنکھوں سے آنسو
سمندر کی طرح اُبل پڑے۔ اُنہیں آنسوؤں نے زمین کی
آگ بجھائی اور زمین پہلے کی طرح ٹھنڈی ہوگئی۔ دیوتاؤں
نے تاؤتس اور سورج کی اِس لڑائی کو دیکھا اور سمجھ لیا کہ
اگر دونوں لڑتے رہے تو زمین کے رہنے والے پریشان
ہوجائیں گے۔ اونہوں نے ایک مجلس کرکے دن رات
بنائے اور سورج کو حکم دیا کہ مشرق سے مغرب کو جایا کرے
اور کسی طرف نہ جائے۔ اسی سبب سے سورج کی یہ مجال
نہیں ہے کہ دیوتاؤں کا حکم نہ مانے اور کسی اور رستے
پر چل نکلے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سب دیوتاؤں نے جمع ہوکر
جب چاند کے بنانے کا مشورہ کیا تو اوس کا بنانا رات
کے ایک دیوتا کو سپرد ہوا۔ رات کے دیوتا نے بھری
مجلس میں پوچھا کہ اِس کار خیر کے لئے کون اپنے تئیں
پیش کرتا ہے۔ ایک مینڈک نے آگے بڑھکر کہا کہ میں
اپنے آپ کو اِس کار خیر پر قربان کرتا ہوں۔ رات کے
دیوتا نے جادو کرکے اوس کو چاند بنادیا۔ اب مینڈک
چاند پر جو سوار نکلتا ہے (اون کے عقیدہ میں) اِس کا
سبب یہی ہے اور چونکہ چاند کی اصلیت مینڈک سے ہی
اِس لئے وہ مینڈک کی طرح سرد ہے اور اوس کی
روشنی میں خنکی معلوم ہوتی ہے۔

امریکا کے قدیم باشندوں کا ایک گیان)

ت زمینیں اوپر تلے ہیں - ایک تو ہماری زمین کے نیچے
- اور پانچ ہماری زمین کے اوپر ہیں - آدمی نیچے کی زمین
اوپر چڑھ آئے ہیں - اوپر چڑھکر اونہوں نے دیکھا کہ
ت (آسمان) اون کے سروں پر بہت جھکی ہوئی
یشتیو دیوتا سے فریاد کی تو اوس نے کندھا دیکر
ت کو اونچا کر دیا - اوس وقت آسمان پر نہ سورج تھا
اند نہ کوئی ستارہ چمکتا تھا - ساری زمین پر اندھیرا ہی اندھیرا
یا ہوا تھا - جب آدمیوں نے اندھیرے سے گھبرا کر
یتو سے شکایت کی تو اوس نے روئی کے سات
ھے منگائے - یہ روئی کے گٹھے سات کنواری لڑکیاں
پنے سروں پر اوٹھا کر لائیں یشتیو نے اون کو کاتنا
بننا سکھایا - اور اونہوں نے اوس روئی سے
جادو کی چادر بنکر تیار کی - یشتیو نے اپنے ہاتھ
اوس چادر کو اونچا کیا - ایک تند اور تیز ہوا آئی اور اوس
ر کو آسمان پر اوڑا کر لے گئی - وہ چادر آسمان پر جاکر چاند
- روئی کے گالے جو باقی رہگئے تھے وہ بھی ہوا نے
کر آسمان پر پہنچا دیے اور اون کے ستارے بنگئے -
روشنی تو ہوگئی اور اندھیرا نہ رہا مگر سردی کے مارے
کے بدن کانپتے تھے اور ساری زمین پر برف کے
سے پھیلے ہوئے تھے - زمین پر رہنے والوں کی یہ
ت دیکھکر یشتیو کو رحم آیا اور اوس نے سات
منگائے جنکے بدن پر لمبے لمبے بال تھے - اون کے
ں سے ایک کملی بنکر تیار کی - ہوا آئی اور اوس کو
ان پر اڑا کر لے گئی - وہ کملی سورج ہو کر چمکی - اسی یشتیو نا
اوس کے چلنے کا رستہ ٹھیرایا اور دن رات بنائے
ی سردی کی فصلیں بنائیں -
زمانۂ حال کے علما اور حکما کہتے ہیں کہ سورج اون
ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے جو اس نیلگوں
یں گردش کر رہے ہیں - تمام ستارے ایک
ورسیال مادّے سے پھٹ پھٹ کر جدا ہوئے

ہیں اور حرکت اور کشش کے قاعدے سے ایکدوسرے کے
گرد گھومنے لگے ہیں - زمین سورج سے اور چاند زمین سے
جدا ہوا ہے - اس لیے زمین سورج کے اور چاند زمین کی
گرد گردش کرتا ہے - زمین اپنے محور پر گھومتی ہے اور
اس سے رات دن پیدا ہوتے ہیں - آفتاب کے گرد بھی
زمین ایک دورہ کرتی ہے اور اس سے موسم کے
تغیرات پیدا ہوا کرتے ہیں -
امریکا کے انڈین کہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے
ستاروں پر جو دیوتا مسلط ہیں شہاب ثاقب اونہیں کا
چمکتا ہوا فضلہ ہے - ہمارے ملک کے بعض لوگوں کا
خیال ہے کہ بڑے آدمیوں کی موت پر ستارے
ٹوٹتے ہیں - بعض کہتے ہیں کہ شہاب وہ ستارے ہیں
جو اپنے اپنے مقام کو جا رہے ہیں تاکہ وہاں جاکر غروب
ہوں - بعض کا خیال یہ ہے کہ تمام ستارے آپس میں
محبت اور دوستی رکھتے ہیں - جب بعض ستارے
اپنے دوستوں سے ملنے جایا کرتے ہیں تو ہم اون کو
جاتے دیکھکر کہتے ہیں کہ یہ شہاب ثاقب ہیں بعض لوگ
سمجھتے ہیں کہ شیطان جب آسمان پر چڑھتے ہیں تو فرشتے
پتھر آگ میں دہکا کر اون کی طرف پھینکتے ہیں تاکہ وہ
اسرارِ فلکی سے آگاہ نہوں - زمانۂ حال کا سائنس
بتاتا ہے کہ شہاب ثاقب اصل میں چھوٹے چھوٹے کرے
ہیں جو سورج کے گرد گھومتے ہیں جب وہ زمین کے
پاس گردش کرتے ہوئے آتے ہیں تو زمین اون کو
اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور وہ ہوا میں رگڑ کے سبب سے
روشن ہو جاتے ہیں - جو اچھی طرح مشتعل نہیں ہوتے
وہ زمین پر گر پڑتے ہیں -
امریکا کے اصلی باشندے ہوا کی نسبت خیال کرتے
ہیں کہ زمین کے چاروں طرف جو جانور رہتے ہیں
اُن کے سانس لینے سے مختلف سمتوں میں ہوا چلتی
ہے - یورپ کی ایک بُت پرست قوم کا زمانۂ قدیم میں

یہ خیال تھا کہ اُن کا سب سے بڑا دیوتا پرندوں کی طرح اُڑا کرتا ہے اور اُسکے دو لمبے لمبے بازو ہیں۔ جب وہ اپنے بازو پھڑپھڑاتا ہے تو اُن کی حرکت سے ہوا چلا کرتی ہے۔ قدیم یونانی کہتے تھے کہ ہوائیں آسمان اور زمین کے بیچ میں ہیں۔ ایولس دیوتا اونکو ایک غار میں بند رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے غار کا منہ کھول دیتا ہے۔ اسی بنا پر جب ہوا چلتی تو یونانی کہا کرتے تھے کہ غار کا منہ کھل گیا۔ اس زمانے کے علما کہتے ہیں ہوا ایک لطیف اور شفاف جسم ہے جو کرۂ زمین کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ خط استوا پر گرم ہوتی ہے اور قطبوں کے پاس سرد رہتی ہے تو اسے قطبین کیطرف اور قطبین سے خط استوا کیطرف چلتی ہے۔ وہ جن جن مقامات سے گذرتی ہے اُن کی سردی اور گرمی سے اُس کے رخ بدل جاتے ہیں۔

مصر والوں نے آندھی کو جنوں کا سردار ٹھہرایا۔ وہ جب غضبناک ہوتا ہے تو اوس کے نتھنوں سے تند ہوا نکلتی ہے اور زمین سے غبار اُڑ کر آسمان تک پہونچتا ہے اور بگولے چکر کھانے لگتے ہیں۔ اس زمانے کے علما کہتے ہیں کہ جب مخالف سمتوں کی ہوائیں ملتی ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے گرد گھومتی ہیں اور زمین سے غبار اور سمندر سے جھاگ اُٹھاتی ہیں۔

عرب کے لوگ کہتے تھے کہ بادل سمندر سے پانی پیکر زمین اور خشکی پر چھڑکا کرتے ہیں۔ چنانچہ جاہلیت کے شعرا نے اس خیال کو اپنے اشعار میں بارہا ظاہر کیا ہے۔ ایک بت پرست قوم خیال کرتی تھی کہ آسمان کا نیلگوں خیمہ برف سے بنا ہے اور اوس میں آسمان کا بادشاہ جو ایک لنک اژدہا ہے رہتا ہے۔ جب وہ اپنی پشت کو خم کرکے آسمانی چھت سے رگڑتا ہے تو اوس کی پشت سے بیشمار فلس جھڑتے ہیں۔ یہ فلس جاڑے میں اولوں اور برف کی شکل میں اور گرمی میں بارش کی شکل میں زمین پر گرتے ہیں۔ غالباً اژدہے سے اون کی مراد قوس قزح ہے۔ امریکا کے انڈین کہتے ہیں کہ بارش کا دیوتا مونگلو ہون پانچ زمینوں میں سے جو ہمارے سر پر ہیں ایک زمین پر جو ہم سے قریب ہے رہتا ہے۔ اوس کے پاس ایک بڑا پنکھا پرندوں کے پروں کا ہے۔ وہ اس پنکھے کو آسمان کے سمندر میں غوطہ دیکر نکال لیتا ہے اور اریزونا کے میدانوں پر جہاں امریکا کے اصلی باشندے اقامت کرتے ہیں پانی برساتا ہے۔ جاڑے کے موسم میں وہ آسمانی سمندر کے یخ کو بھی ڈالتا ہے اور اسکو زمین پر برف کی شکل میں گراتا ہے۔ سائنس بتاتا ہے کہ بادل سمندر کے بخارات ہیں جو سورج کی گرمی سے اُٹھتے ہیں اور ہوائے محیط کی بلندی پر جاکر سرد ہو جاتے ہیں۔ پھر پانی کی شکل میں زمین پر گرتے ہیں اور پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے آسمان پر گئے تھے۔

عرب جاہلیت کے نزدیک قزح ایک فرشتے کا نام ہے جو بادلوں پر حکمران ہے اُسکے پاس ایک کمان ہے جس میں طرح طرح کے خوشنما رنگ دیے گئے ہیں اسلیے اس کمان کا نام قوس قزح ہے۔ رعد ایک فرشتہ ہے جو بادلوں کو اپنی آواز سے ہانکتا ہے جسطرح کہ اونٹ کو ساربان حُدی کی آواز سے چلاتے ہیں۔ اُسکے ہاتھ میں جو تازیانہ ہے اوس کا نام صاعقہ ہے۔ یونانیوں اور عربوں کا خیال تھا کہ جب ہوائی اجسام باہم رگڑ کھاتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ ناروے کے باشندے کہتے تھے کہ قوس قزح آسمان اور زمین کے درمیان ایک پل ہے۔ زمانۂ حال کا سائنس کہتا ہے کہ بارش کے قطروں میں جب سورج کی روشنی منحرف ہوتی ہے اور اپنے سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے تو قوس قزح دکھائی دیتی ہے۔ بجلی بادلوں کی برقی قوت ہے جو ایک بادل سے دوسرے بادل میں منتقل ہوتی ہے۔ صاعقہ وہ برقی قوت ہے جو بادلوں سے زمین میں منتقل ہوتی ہے۔ ہوا میں برقی قوت کے گذرنے اور اوس میں خلا پیدا ہونیکے بعد جب ہوا اوس خلا کی طرف جاتی ہے تاکہ اوس خالی جگہ کو بھرے تو اس طرح جو آواز پیدا ہوتی ہے اوس کا نام رعد ہے۔

انہیں چند قدیم و جدید خیالات کے مقابلہ سے اس بات کا بھی ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالم فطرت کے حوادث اور واقعات کو دیکھکر قدیم زمانہ کے لوگ جنہیں ان چیزوں کا مادہ کُریدنے کا بہت کم موقع تھا کیسے عجیب عجیب قیاس پیدا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اون قیاسات کی غلطیاں ظاہر ہوتی گئیں اور تجربہ اور مشاہدہ نے ہمکو آخر کار سائنس کے اون مسائل محققہ تک پہنچا دیا جن پر آج ہمارے علم کا دارومدار ہے۔ مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمام قیاسات جنکو آج ہم محقق اور صحیح اور مطابق حقیقت خیال کرتے ہیں ہمیشہ اسیطرح محقق اور صحیح اور مطابق حقیقت تسلیم کیے جائینگے۔ کیا عجب ہے کہ جسطرح ہم سلف کے خیالات کی بیہودگی پر ہنستے ہیں اسی طرح ہمارے اخلاف بھی ہمارے ان قیاسات کا خاکہ اڑائیں اور جدید تحقیق و جدید قیاسات قائم کریں جو ہمارے قیاسات سے زیادہ صحیح اور مضبوط ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(عبد العلی خان)

جدید کتابیں

سفرنامۂ باتما — یہ ایک چھوٹا سا سفرنامہ منشی حسام الدین صاحب ایڈیٹر شفیق الحقائق بمبئی کا ہو جنہوں نے باتما کے سفر کے عجیب حالات لکھے ہیں۔ اسکے آخر میں ایک ضمیمہ مسکور نجات بھی ہر۔ یہ ایک نہایت ہی مباحثہ ہو جو منشی صاحب اور مذہب عیسوی کے عالم ہیں اور ایک مسلمان عالم کے درمیان ہوا تھا۔ اُس کی قیمت ۱ر ہے۔

بابو پیارے لال صاحب زمیندار بروٹھا و مالک ودیا ساگر پریس علیگڈھ نے اپنی چند وہ کتابیں مختلف مضامین کی چھاپ کر ریویو کیلئے بھیجی ہیں۔ ان کتابوں کے مضامین اور قیمتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہندوستان قدیم — اسمیں فلالوجی یعنی علم زبان کے اور ایتھیالوجی یعنی علم انواع انسان کی رو سے ثابت کیا گیا ہو کہ مصر والے راجپوت رجی کی نسل سے تھے۔ یونانی اور جرمنی کے باشندے عیسائی ہونے سے پہلے بودھ مذہب کے تھے۔ امریکا ہندوؤں کو لاکھوں برس سے معلوم تھا۔ وہاں سورج بنسی راج کرتے تھے۔ ہندوؤں نے مصر، روم اور یونان کی قدیم سلطنتوں کی بنیاد ڈالی۔ ہندوؤں کی نو آبادیاں سائبیریا، روس، جرمنی اور انگلستان تک پھیل گئی تھیں۔ ہندوؤں نے ڈنگا سکر، جاوا اور آسٹریلیا وغیرہ تک حملے کئے تھے۔ قدیم ہندوؤں کے حالات یونانی اور چینی سیاحوں کے سفرناموں سے لکھے ہیں۔ وہاں آجتک اُنکے نشانات موجود ہیں۔ اُنکے آدمیوں، دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کے نام ٹھیک وہی ہیں جو ہندوستان میں تھے۔ ہندو ہر فن کے اُستاد، ہر علم کے موجد اور ہر ایک خوبی میں شہرۂ آفاق تھے۔ اسکی قیمت عہ ر ہے۔

۲۔ ملک عدم — اسمیں خدا، روح، مرنے کے بعد کی حالت، قیامت، فرشتوں، تناسخ، تقدیر، نیکی و بدی، دنیا کی پیدایش وغیرہ اہم مضامین پر عقلی اور علمی دلائل سے بحث کی گئی ہو۔ ایک فرانسیسی عالم کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور اُس پر مترجم نے اپنے خیالات کا اضافہ کیا ہو۔ اسکی قیمت عہ ر ہے۔

۳۔ جوہر حکمت — اسمیں طبی اصطلاحات، اعضائے انسانی، امراض اور ادویہ کے نام اردو، فارسی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں میں درج کئے گئے ہیں۔ پھر بیماریوں کی شناخت، اسباب، اقسام، علاج اور پرہیز وغیرہ یونانی، ویدک اور ڈاکٹری کتابوں سے لکھا ہو۔ حفظان صحت کے اصول، بچوں کی پرورش کے قاعدے اور حاملہ عورتوں کیلئے ہدایات بھی بیان کی ہیں۔ زہروں، کشتوں اور انگریزی کی پیٹنٹ دواؤں کا حال بھی لکھا گیا ہو۔ اس کی قیمت ۵ ر ہے۔

۴۔ جوہر نباتات — اسمیں باغ لگانے کی ترکیبیں بلحاظ موسم و زمین کے درختوں کی پرورش کرنے کے قاعدے ہیں۔ ہر قسم کے دیسی اور ولایتی پھل، پھول، ترکاری، خوشبودار اور میوہ دار درختوں کے انگریزی اور دیسی نام مع تصاویر اور اُنکے تخم وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ اسکی قیمت عہ ر ہے۔

۵۔ جوہر قانون — اسمیں قوانین لگان و مالگذاری، اسٹامپ، کورٹ فیس، میعاد سماعت، رجسٹری، آبکاری، شہادت، تعزیرات ہند، ضابطۂ فوجداری، ضابطۂ دیوانی، عدالت خفیفہ وغیرہ کے تمام ضروری دفعات کا مطلب اور خلاصہ عام فہم اور مختصر عبارت میں ہو۔ یہ کتاب زمینداروں، ساہوکاروں، کارندوں، مختاروں اور عام کاروباری آدمیوں کے فائدے کیلئے لکھی گئی ہو جس کے مطالعہ سے ہر شخص قانون کی تمام ضروری باتوں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی قیمت عہ ر ہے۔

۶۔ جوہر تفریح — اس میں شطرنج، تاش، گنجفہ، چوسر اور بہت سے جدید کھیلوں کا بیان ہے جو یورپ میں کھیلے جاتے ہیں۔ ہر کھیل کی ضروری اصطلاحیں، اُس کے کھیلنے کے قاعدے اور اسکے متعلق تمام داؤ پیچ کھولکر بتائے گئے ہیں۔ بعض کھیلوں کے کھیلنے کے قاعدے انگریزی اور ہندوستانی دونوں طریقوں سے بیان کئے ہیں۔ اس کی قیمت عہ ر ہے۔

۷۔ دلائل قدرت — اس میں انسانوں، جانوروں، درختوں وغیرہ کی نسبت اِس قسم کے سوالات لکھے گئے ہیں۔ مثلاً آدمی کے ہاتھ پاؤں میں پانچوں انگلیاں برابر کیوں نہیں ہیں۔ خوف سے آدمیوں کے رخسارے زرد اور غصہ سے سرخ کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہاتھی کے سونڈ کیوں ہوتی ہے۔ سانپ کے پاؤں کیوں نہیں ہوتے۔ درختوں کے بیج سخت چھلکوں کے اندر کیوں ہوتے ہیں۔ درختوں کے پتے سبز کیوں ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تین سو سوالات درج کئے گئے ہیں۔ اور اُنکے جوابات علم افعال الاعضا (فزیالوجی) کی رو سے عام فہم اور سلیس عبارت میں دئے گئے ہیں۔ اس کی قیمت ۸ر ہے۔

یہ ساتوں کتابیں جنکے دلچسپ یا کارآمد مضامین کا خلاصہ اوپر لکھا گیا ہے اور جن کی قیمتیں بھی ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں بابو پیارے لال زمیندار بروٹھا مالک ودیا ساگر پریس علیگڈھ کے پتہ پر درخواست کرنے سے ملسکتی ہیں۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

اڈیٹران { حاجی محمد اسمٰعیل خاں
مولوی وحید الدین سلیم }

یکم جون سنہ ۱۹[illegible]ء | نمبر ۲

... مع محصولڈاک للعہ/ | قیمت فی پرچہ نمونہ مع محصولڈاک ۔/۱۰

مقام اشاعت۔ دفتر معارف علی گڈہ

مطبع فیض عام واقع علی گڈہ میں طبع ہوا

مقاصد اور قواعد

۱- یہ دو جزو کا ماہوار علمی رسالہ جو "معارف" کے نام سے موسوم ہے ہر مہینے کی یکم تاریخ کو علی گڈہ سے شائع ہوتا ہے۔

۲- اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اسکے ذریعہ سے اُردو زبان کے علم ادب کا دائرہ وسیع ہو اور اُس میں ہر قسم کے علمی فلسفی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ تمدنی اور تاریخی مضامین لکھے جائیں۔ انگریزی عربی اور ترکی زبانوں کی نایاب کتابوں اور اخباروں اور رسالوں سے ہر قسم کے مفید اور دلچسپ اور پاکیزہ مضامین ترجمہ کئے جائیں، تاکہ مسلمانوں میں روشن ضمیری، عمدہ تربیت اور تہذیب کی اشاعت ہو۔

۳- یہ ضرور نہیں کہ ہر پرچہ میں ہر قسم کے مضامین شامل ہوا کرینگے بلکہ ان اقسام کے مضامین یکے بعد دیگرے شائع کئے جائیں گے

۴- بالفعل اس رسالہ کے دو اڈیٹر قرار دیئے گئے ہیں۔

ا- حاجی محمد اسمٰعیل خاں

ب- مولوی وحید الدین سلیم

۵- ملک کے مشہور اور اعلیٰ درجہ کے انشا پردازوں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے بیش بہا مضامین سے ہماری مدد کریں۔ جن بزرگوں کے نام ہمکو معلوم نہیں ہیں، اگر مہربانی سے وہ خود یا اُن کے احباب اُنکے نام و نشان سے ہمکو مطلع کرینگے تو ہم اُنکی خدمت میں بھی درخواست کرینگے کہ وہ بھی اس رسالے کو اپنی قیمتی تحریروں سے امداد پہونچائیں۔ جو حضرات کسی مضمون میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہینگے اُن کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

۶- اس رسالہ کی قیمت سالانہ مع محصولڈاک (للعہ) ہے جو نقد قیمت بھیجنے، یا ویلیو پی ایبل کی درخواست کرنے خریداروں کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔ ششماہی سے کم کی درخواست منظور نہوگی۔ نمونہ کے پرچہ کیلئے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے ضرور ہیں۔ قیمت ہر حال میں پیشگی نقد، یا بطور ویلیو کے وصول کیجائیگی اور قیمت رسالہ کی کسی حال میں کم نہیں ہوسکتی۔ رسالہ کے متعلق تمام خط کتابت **دفتر معارف علی گڈہ** کے پتہ سے **مولوی وحید الدین سلیم** کے نام ہونی چاہیئے اور انھیں کے نام قیمت آنی چاہیئے۔ جواب طلب اُمور کے لیئے آدہ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۷- جو بزرگ اس رسالے کی خریداری منظور فرمائیں اُنسے امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنا نام اور ٹائٹل اور پتہ صاف لفظوں میں تحریر فرمائینگے۔

۸- حضرات خریداران معارف سے اُمید ہے کہ اپنے پتے کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً رسالے کی تاریخ اشاعت سے پہلے دفتر معارف کو مطلع فرماتے رہیں گے۔

۹- اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہوجائے تو تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر اطلاع دینے پر مل سکیگا، ورنہ قیمت بھیجکر طلب فرمائیں۔

۱۰- جو حضرات معارف کے لیئے مضامین مرحمت فرمائیں، وہ خوشخط اور صاف لکھکر بھیجیں تاکہ چھپنے میں آسانی ہو اور کوئی غلطی نہ رہجائے۔

معارف

ایک ماہوار علمی رسالہ

جلد ۲ | یکم جون سنہ ۱۹۰ع | نمبر ۱۲

ہماری زمین اور تمام ستارے کیونکر پیدا ہوئے؟

زمین اور تمام اجرام سماوی کی پیدائش کی نسبت علما اور حکما نے بہت سے نظریے قایم کئے ہیں مگر جو نظریہ آجکل بہت زیادہ مسلم مانا جاتا ہے وہ نظریہ سدیمیہ ہے جس کو بطور اجمال کے ہم اس آرٹکل میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

نظریہ سدیمیہ یا نبولر تھیوری (Nebular theory) کے بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم لفظ سدیم یا نبولا (Nebula) کے معنے بیان کریں۔ سدیم عربی زبان میں کُہر کو کہتے ہیں۔ مگر سدیم سے علم ہیئت کی اصطلاح میں آسمان کا وہ روشن قطعہ مراد ہے جو کُہر کی مانند دکھائی دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بہت سے ستارے مل جُلکر ایک ہوگئے ہیں۔ بعض سدیم تو آنکھ ہی سے نظر آجاتے ہیں جیسے کہکشاں بعض بڑی بڑی قوی دوربینوں کے سوا اور کسی طرح نظر نہیں آتے۔ بعض ایسے ہیں جنکو اگر طاقتور دوربینوں سے دیکھا جائے تو اون کا چھوٹے چھوٹے ستاروں سے مرکب ہونا پایا جاتا ہے۔ یہ اصلی سدیم نہیں ہیں بلکہ ان کو علمائے ہیئت عنقود (خوشے) کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصلی سدیم وہی ہیں جنکی نسبت اسپکٹرس کوپ (منظر طیفی) سے معلوم ہوگیا ہے کہ وہ مشتعل گیس کی حالت میں ہیں یا ابھی تک اُن میں اسقدر حرارت باقی ہے کہ آگ کی طرح روشن دکھائی دیتے ہیں۔

سدیم کی پانچ قسمیں ہیں (۱) سدیم حلقی (۲) سدیم اہلیجی (۳) سدیم حلزونی (۴) سدیم سیاری (۵) نجوم مستدمہ یا سدیمیہ۔

(۱) سدیم حلقی وہ سدیم ہیں جو گول اور روشن حلقہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس قسم کا ایک سدیم ستاروں کے اوس مجموعہ کے درمیان واقع ہے جو نسر واقع کے نام سے مشہور ہے ڈاکٹر ہگنس نے اِس سدیم کا منظر طیفی سے امتحان کیا ہے اور معلوم کیا ہے کہ وہ ایک روشن گیس کا بادل ہے۔ بعض دلائل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں نیٹروجن گیس شعلہ زن ہے مگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس اِس بات کے دریافت کرنے کا نہیں ہے کہ وہ زمین سے کسقدر فاصلہ پر ہے۔ ستاروں کے اوس مجموعہ میں جو عقرب کہلاتا ہے دو حلقی سدیم دکھائی

دیتے ہیں۔ اسی طرح دجاجہ میں ایک حلقی سدیم ہے۔

(۲) سدیم اہلیجی وہ سدیم ہیں جو بیضوی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس قسم کا ایک بڑا اور مشہور سدیم مرأۃ مسلسلہ میں واقع ہے۔ جس شخص کی نظر تیز اور دوربین ہو وہ اوس کو محض آنکھ سے نظر آسکتا ہے۔ ڈاکٹر ہگنس نے منظر طیفی سے امتحان کرکے بتایا ہے کہ وہ گیس کی صورت میں مشتعل ہے۔ اس قسم کے تین سدیم اور ہیں اور وہ ستاروں کے اون مجموعوں کے درمیان واقع ہیں جو راعی۔ قیطس اور قنطورس کے نام سے مشہور ہیں۔

(۳) سدیم حلزونی وہ سدیم ہیں جو گھونگے کی شکل کے دکھائی دیتے ہیں اس قسم کا ایک سدیم سلاقی میں ہے جو ستاروں کا ایک مجموعہ ہے یہ بھی نہایت طاقتور دوربینوں سے نظر آتا ہے ڈاکٹر ہگنس نے اُس کے گیس ہونے سے انکار کیا ہے۔ ستاروں کے اون مجموعوں میں جو جوتین۔ اسد۔ سنبلہ اور فرس کے نام سے موسوم ہیں چار سدیم اسی شکل کے دکھائی دیتے ہیں۔

(۴) سدیم سیّاری وہ سدیم ہیں جو ستاروں کی طرح روشن دکھائی دیتے ہیں مگر اون کی روشنی ستاروں کی نسبت دُھندلی اور کمزور ہے۔ وہ یا تو گول اور مدوّر شکل کے ہیں یا ایک طرف سے کسیقدر لمبوترے ہیں۔ اس قسم کے بعض سدیموں کے کنارے صاف دکھائی دیتے ہیں یا بادل کی طرح رفتہ رفتہ دُھندلا گئے ہیں۔ ان سدیموں میں ہر طرف روشنی ہے۔ مگر محیط کی نسبت مرکز پر زیادہ روشن نہیں ہے۔ اس قسم کا ایک سدیم دُبّ اکبر میں ہے جو ستاروں کا ایک مشہور مجموعہ ہے۔ منظر طیفی سے اُس کا گیس ہونا ثابت ہو گیا ہے۔ اس قسم کے سدیم بیشمار ہیں جن کا اس موقع پر بیان کرنا مشکل ہے۔

(۵) نجوم سدیمیہ یا سدیمیہ وہ ستارے ہیں جنکے گرد بادل کی شکل کا ایک نورانی حلقہ ہے۔ یہ حلقہ بعض ستاروں کے گرد صاف نظر آتا ہے مگر بعض کے گرد دُھندلا ہے۔ اس قسم کے ستارے سلاقی میں ایک۔ جوزا میں ایک اور جبار میں دو ہیں۔

مذکورۂ بالا سدیموں کے علاوہ برج ثور میں ایک مشہور سدیم ہے جو سدیم سرطانی کہلاتا ہے۔ وہ بغیر مدد طاقتور دوربین کے دکھائی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں کہ یہ سدیم گیس کی حالت میں نہیں ہے مگر دوربینوں سے ابتک یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ چھوٹے چھوٹے ستاروں سے مرکب ہے۔ ایک بہت بڑا سدیم سیف الجبار میں ہے جو ستاروں کا مشہور مجموعہ ہے۔ اگر کسی کی نظر تیز ہو تو آنکھ ہی سے دیکھ سکتا ہے۔ اُس کی ہر طرف روشنی کی دھاریں پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ منظر طیفی سے ثابت ہوتا ہے کہ اسمیں ہیڈروجن۔ نیٹروجن اور بہت سی غیر مشہور گیسیں مشتعل ہیں۔ اسکے درمیان جیتن نما شکل کے چار ستارے ہیں اور یہ سدیم نظریۂ سدیمیہ کے صحیح ہونے پر قوی دلالت کرتا ہے جسکو ہم عنقریب بیان کریں گے۔ ایک سدیم شیشۂ ساعت کی شکل کا ہے جس کا ڈاکٹر ہگنس نے منظر طیفی سے امتحان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اوس میں نیٹروجن گیس مشتعل ہے۔ ایک سدیم سحاب مجلانی کے نام سے مشہور ہے۔

نظریۂ سدیمیہ وہ نظریہ ہے جس کو علمائے ہیئت نے ان سدیموں کو رصد کرنے کے بعد قائم کیا ہے اور اوس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اجرام سماوی جو اس لا انتہا نیلگوں فضا میں ایک دوسرے کے گرد گردش کر رہے ہیں کسطرح رفتہ رفتہ پیدا ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے زمین کے تمام اجسام عضویہ کو جن میں حیوانات اور نباتات شامل ہیں ایکدم سے کامل حالت میں پیدا نہیں کیا بلکہ اون کو ایسی حالت میں رکھا ہے کہ وہ خاص قوانین قدرت کے موافق رفتہ رفتہ بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں اور بہت سی حالتوں سے عبور کرنیکے بعد کمال کے درجہ پر پہونچتے ہیں۔ اجسام عضویہ میں سے ہر ایک کی پچھلی حالت بہ نسبت اگلی حالت کے ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ یہی قوانین قدرت اجسام غیر عضویہ پر بھی طاری ہیں۔ مثلاً وہ مٹی جس سے نباتات کو غذا ملتی ہے موجودہ حالت میں پیدا نہیں کیگئی بلکہ وہ مدتوں

...ت بجلی اور ہوا کے صدیوں تک اثر کرنیکے بعد پہاڑوں ...چٹانوں کے گھِسنے پسنے سے تیار ہوئی ہے - اسی قیاس پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اجرام سماوی کے پیدا کرنے میں بھی ایسے ہی قوانین قدرت کو ملحوظ رکھا ہے اور اونکو بھی ایکدم سے پیدا نہیں کیا - سورج - چاند اور تمام ستارے موجودہ حالت تک بہت سے زمانے طے کرنیکے بعد پہنچے انہیں وہ خاص خاص قوانین قدرت کے محکوم رہے موجودہ نظام شمسی میں وہ دلائل موجود ہیں جنسے اِس تقویت ہوتی ہے اور وہ دلائل حسب ذیل ہیں *

...رج ستارے اور اون کے چاند سب اپنے ...ب ہی طرف سے ایک ہی طرف کو گردش ...تے ہیں یعنی سب کی گردش مغرب سے مشرق کیطرف ہے - ستارے سورج کے گرد اور ستاروں کے چاند اون ستاروں کے گرد ہی مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہیں - اگر کوئی ستارہ اِس حالت سے مستثنیٰ ہے تو اُس سے قاعدۂ کلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا -

(۲) نظام شمسی کے ستاروں میں سب سے بڑا ستارہ سورج ہے اور وہ مشتعل حالت میں ہے - اور حرارت اور روشنی کا بہت بڑا سرچشمہ ہے - زمین بھی پہلے ایک مشتعل کُرہ کی صورت میں تھی - اور اُس کے اندر اب بھی سخت حرارت موجود ہے جیسا کہ آتش فشاں پہاڑوں سے ثابت ہوتا ہے - چاند بھی اِسی حالت میں رہ چکا ہے کیونکہ اوس کی سطح پر بھی آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے دوربینوں سے نظر آتے ہیں جو اب بالکل خاموش اور افسردہ حالت میں ہیں -

وجوہات مذکورۂ بالا سے یہ نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے پیدا ہونے سے پہلے نیپچون ستارہ سے آگے بہت دور تک اِس وسیع اور غیر محدود فضا میں ایک مادہ مشتعل گیس کی حالت میں پھیلا ہوا تھا - جو نہایت لطیف تھا اور جس میں نہایت شدید حرارت تھی - یہ مادہ اپنے محور پر اوس سمت میں گھومنے لگا جس کو ہم آجکل مغرب سے مشرق کیطرف کہا کرتے ہیں - وہ قوانین قدرت جو مادہ پر حکمران ہیں اون کے بموجب اوس مشتعل مادہ میں تغیر و تبدل ہوتا رہا اور اوس پر مختلف دورے گذرتے رہے - اِن دوروں میں جو تغیرات پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں -

قوت جاذبہ جس کا میلان مرکز کیطرف ہوتا ہے اور قوت دافعہ جس کا میلان محیط کی طرف ہوا کرتا ہے اِن دونوں قوتوں کے اثر سے اوس مادہ نے کُرہ کے مشابہ شکل اختیار کی - اِس کُرہ کی حرارت اوس لاانتہا فضا میں پھیلتی رہی جو اوس کے گرد تھا - حرارت کے کم ہونے سے رفتہ رفتہ وہ کُرہ سکڑنے لگا اور سکڑنے کے سبب اوس کے وہ حصے جو محیط پر تھے رفتہ رفتہ تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگے اور اِسطرح قوت دافعہ اور جاذبہ دونوں میں موازنہ قائم ہوگیا - اِس موازنہ کے قائم ہونیکے بعد کُرہ کے بیرونی حصے جو اوس کُرہ کے خط استوا پر واقع تھے بہ نسبت اوس کے اندرونی حصوں کے جو ہمیشہ سکڑتے اور سمٹتے رہتے تھے مستقل طور پر حرکت کرنے لگے - یہاں تک کہ اوس کُرہ سے بالکل جدا ہوکر حلقہ کی شکل میں اپنا مستقل دورہ تمام کرنے لگے اندرونی حصے جب بہت زیادہ سکڑے تو اون سے ایک حلقہ اور جدا ہوا اور وہ بھی علیحدہ ہوکر گردش کرنے لگا - اسی طرح حلقہ پر حلقہ جدا ہوتا رہا - اب اِن تمام حلقوں کا ایک مرکز ہوگیا اور مرکز پر جو مادہ باقی رہا وہ اِس سارے نظام کا آفتاب بنگیا حلقے بھی ٹھنڈے ہوتے اور سکڑتے رہے - اگر کسی حلقہ کے ہر حصے میں مادہ مساوی طور پر تھا تو وہ اِسی حالت اور اِسی شکل میں گھومتا رہا - لیکن اگر کسی حصہ میں مادہ کی زیادتی ہوگئی تو وہ سارا حلقہ اوس بھاری حصہ کی طرف کھنچ آیا اور اوس سے کُرہ کی مشابہ شکل پیدا ہوگئی جو اپنے محور پر بھی گھومنے لگا اور مرکزی مادہ کے گرد بھی چکر لگاتا تھا - اِس طریقہ سے وہ تمام ستارے پیدا ہوئے جو آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں -

ستارے بھی ٹھنڈے ہوتے اور سکڑتے رہے اور اون کی محوری گردش تیز ہوتی رہی اور اِس طرح

اُنسے بھی حلقے جُدا ہوتے رہے جو اون سے علیحدہ ہو کر اپنے محور پر اور اون ستاروں کے گرد گردش کرنے لگے۔ اِس تغیر سے ستاروں کے چاند پیدا ہوئے جیساکہ ہماری زمین کے گرد ایک چاند ہے اور مشتری کے گرد چار چاند ہیں ؛

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اگر کسی حلقہ کے تمام حصوں میں مادّہ کے اجزا برابر رہے تو وہ حلقہ اپنی اوسی شکل میں گھومتا رہا۔ اِس کی مثال زحل کے حلقے ہیں جو اُسکے گرد دکھائی دیتے ہیں۔

اگر بجائے ایک دبیز اور موٹے حلقہ کے مرکزی مادّہ سے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مادّہ کے جدا ہوئے تو اون سے نجیمات یعنی چھوٹے چھوٹے ستارے پیدا ہوئے۔

ستارے اور اون کے چاند عام طور پر ٹھنڈے ہو کر بالکل تاریک ہوجاتے ہیں اور مشتعل گیس کی شکل سے سیال حالت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ پھر سیال حالت سے منجمد ہونے کی حالت قبول کرتے ہیں۔ اُن کے بیرونی حصے جامد اور ٹھوس ہوجاتے ہیں۔ اور اندر کے تمام حصے یا بعض حصے سیال رہتے ہیں یا سطح کے جامد اجزا کے دباؤ سے رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھوس ہوجاتے ہیں۔

تمام ستاروں کے مدار ایک سطح میں نہیں ہیں۔ اسکا باعث یہ ہے کہ مادّۂ اولی سے حلقوں اور ستاروں کے جدا ہونیکے زمانہ سے آج تک بیشمار دورے تغیر و تبدل کے اون پر گذرے ہیں اور ایک ستارہ دوسرے ستارہ پر اپنی قوت جاذبہ کا اثر ڈالتا رہا ہے۔ اِسی باعث سے اون کی حرکت بدل گئی ہے۔ اور سب ایک سطح میں گردش کرتے نظر نہیں آتے۔

جو سدیم باقاعدہ شکل کے ہیں وہ ستاروں سے مرکب نہیں ہیں اور عموماً مشتعل گیس کی حالت میں ہیں جسطرح کہ مرکزی مادّہ حلقوں اور ستاروں کے جدا ہونیسے پہلے تھا۔

مشہور فلاسفر کانٹ اِس بات کا مستحق ہے کہ اوس کو نظریۂ سدیمیہ کا موجد قرار دیا جائے۔ اوس نے اپنی رائے کی بنیاد نیوٹن کے مسئلۂ کشش پر رکھی ہے مگر اوس کی رائے میں ایک نقص ہے کیونکہ اگر اوس کی رائے کو تسلیم کیا جائے تو اوس سے لازم آتا ہے کہ تمام ستارے ایک مشترک مرکز کی طرف کھنچ آئیں اور اُن سب کے ملنے سے ایک آفتاب پیدا ہو۔ نہ کہ الگ الگ بہت سے ستارے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔

مگر ہرشل نے اپنی رائے کی بنیاد سدیموں کے مشاہدے پر رکھی ہے۔ اوس نے دیکھا کہ اُن میں سے بعض تو لطیف گیس کی حالت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا مادّہ مرکز کے پاس جمع ہو رہا ہے۔ اور اگر وہ جمع ہوگیا تو اُس سے نئے ستارے اور چاند اور حلقے پیدا ہونگے۔ چنانچہ اسپکٹراس کوپ (منظر طیفی) سے مشاہدہ کرنیکے بعد یہ معلوم ہوگیا ہے کہ بعض سدیم بالکل گیس کی حالت میں ہیں اور اِس سے ہرشل کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

مگر لاپلاس جس کی طرف نظریۂ سدیمیہ کو عام طور پر منسوب کیا جاتا ہے، اِس بات کا قائل نہیں تھا کہ پہلے اِس تمام نیلگوں اور لاانتہا فضا میں جس میں نظام شمسی کے ستارے پھیلے ہوئے ہیں، کوئی مادّہ سدیمی حالت میں بھرا ہوا تھا بلکہ وہ اِس بات کا قائل تھا کہ اِس فضا میں پہلے صرف آفتاب تھا جو اپنے محور پر گھومتا تھا۔ جوں جوں وہ ٹھنڈا ہوتا گیا، اوس سے ستارے۔ چاند اور حلقے جدا ہوتے ہے۔

لاپلاس کی رائے کو مسلّم مانا جائے یا ہرشل کی رائے کو تسلیم کیا جائے، ہر دو حالت میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ نظام شمسی کے مرتب ہونے سے پہلے مادّہ مجتمع حالت میں تھا، خواہ وہ آفتاب کی شکل میں ہو یا سدیم کی شکل میں، موجودہ نظام کے تمام ستارے اِسی مادّہ کے ٹکڑے ہیں جو مختلف اوقات میں اوس سے جدا ہوئے ہیں۔ اِس میں ہماری زمین اور تمام ستارے سب شامل ہیں۔ نظریۂ سدیمیہ

...ر کے حصے بیشک اس قابل ہیں کہ اوس کو تسلیم کیا جاسے ... اس کا ثبوت علمی طریقہ ہی سے نہیں ہوتا بلکہ مذہب کے ... میں بھی اس کی طرف صریح اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ... انبیا میں ہے۔ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔ یعنی پہلے آسمان (اجرام سماوی) اور زمین سب ...ں کی طرح بندھی ہوئے تھی۔ ہم نے اوس گٹھری کو ...ر سب کو جدا جدا کر دیا۔

(ایک لبرل مسلمان)

تعلیم کے قدیم اور جدید طریقے دنیا کی گذشتہ اور موجودہ اقوام میں

تعلیم سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا جواب زمانۂ حال میں دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر یہ بتانا البتہ ایک تعجب انگیز بات ہے کہ جو مراد آج کل اس لفظ سے لیجاتی ہے، وہی صدہا سال پہلے ہماری قوم کے حکما اور علما نے بیان کی تھی۔ وہ اور آجکل کے علماء دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم سے انسان کی اخلاقی عقلی اور طبعی قوتوں کو ترقی دینا اور اون کو شائستہ کرنا مقصود ہے۔ وہ تمام طریقے اور ذریعے جن سے ایک بچہ جوان ہوکر اس درجہ تک پہنچتا ہے، تعلیم کے معنوں میں شامل ہیں۔ زمانۂ قدیم سے آجتک جو تعلیم کی حالت رہی اور دنیا کے مختلف ملکوں میں تعلیم کے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں، اون کا بیان کرنا اس آرٹیکل میں ہمکو مقصود ہے۔

بہت قدیم زمانہ میں لوگوں کو تعلیم دینا قوم کی اصلاح کرنا اور اون کو تربیت کے زیور سے آراستہ کرنا یہ سب کام مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد ڈالی۔ یہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے حکمت اور فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ یہی سب سے پہلے عدالت کی کرسی پر لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہی سب سے پہلے طبیب تھے، جو بیماروں کی نبض دیکھتے تھے اور اون کو جسمانی تندرستی قائم رکھنے کی تدبیریں بتلاتے تھے۔ انہیں نے سب سے پہلے فن عمارت کو ترقی دی اور آج دنیا میں جو عالیشان اور خوشنما عمارتیں موجود ہیں، اون کی بنیاد اونہیں کے ہاتھوں سے اٹھائی گئی ہے۔ اوس زمانہ میں علم اور مذہب ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے۔ مذہب تعلیم کو مدد دیتا تھا۔ اور تعلیم مذہب کے سایہ میں پرورش پاتی تھی۔ نہ دونوں میں کوئی اختلاف تھا، نہ مخالفت۔ زمانۂ حال میں جو تعلیم کا صیغہ مذہب سے بالکل جدا ہوگیا ہے۔ یہ صدیوں کے بعد ایسا ہوا ہے۔ اور اونہیں قوموں میں یہ واقعہ ظہور میں آیا ہے، جو تمدن اور شائستگی کے لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں پر سبقت لیگئی ہیں۔ ایسی قومیں ابھی موجود ہیں اور مدت دراز تک موجود رہی ہیں جنمیں مدرسوں کا انتظام اور تعلیم و تربیت کا اہتمام، مذہبی انجمنوں کی سرپرستی اور حمایت میں تھا۔ اس کا باعث یہ ہے کہ دنیا کی تمام قوموں نے مذہب کو سوسائٹی کیلئے سب سے ضروری خیال کیا تھا۔ ہندوستان کے باشندے قدیم زمانہ میں مشرق کی تمام قوموں سے علم و فن میں ممتاز تھے مگر ہندوستان کے تمام علوم اور اون کی تعلیم برہمنوں کے ہاتھ میں تھی، جو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ویدوں کی آواز اون کے سوا دوسروں کے کانوں تک پہونچے۔ مصر میں بھی قبطیوں کی قوم اس قدر تعلیم یافتہ تھی اور اون کی تعلیم کا طریقہ اس قدر مشہور اور مسلّم تھا کہ یونان کے حکما نے فلسفہ کی ابتدائی تعلیم انہیں لوگوں سے حاصل کی تھی۔ اور بنی اسرائیل نے بھی جبکہ وہ مصر میں رہتے تھے انہیں قبطیوں سے علم مساحت اور زمین کی پیمائش کا فن سیکھا تھا۔ اون میں بھی تعلیم کاہنوں اور فوجی آدمیوں کے سوا اور کسی گروہ کو نہیں دیجاتی تھی۔ مگر جب اہل فارس اور اہل یونان کی سلطنتیں قائم ہوگئیں، تو اون میں عام طور پر

تعلیم پہیل گئی تہی لیکن عام لوگ صرف دستکاریوں اور پیشیوں کی تعلیم پاتے تہے اور بہت کم لوگ ایسے تہے جو ریاضی' ادب اور مذہب کی تعلیم حاصل کریں - عبرانیوں کی قوم میں سیاست اور اخلاق کی بنیاد مذہب پر تہی - اس سبب سے اون کی عقلی اور دماغی حالت بہ نسبت دیگر مشرقی اقوام کے بالکل جدا تہی' تاریخ کے صفحات میں اون کے مدارس قائم کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا - مگر یہ کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیا نے جو مدارس قائم کئے تہے' اون میں مذہبی تعلیم دیجاتی تہی - عام طور پر عبرانی لوگ اپنے بچوں کو شریعت موسوی اور قومی تاریخ کی تعلیم دیتے تہے اور لڑکیوں کو گانے بجانے اور محفلوں میں ناچنے کا فن سکہایا جاتا تہا - مگر باوجود اس کے یہودیوں کی قدیم تاریخ میں بہت سی شاعرہ اور عالمہ عورتوں کے حالات بہی پائے جاتے ہیں - یہودیوں کے بیت المقدس میں قید ہونیکے بعد اون کے عالموں نے جو ربّی کہلاتے تہے' اپنی قوم کے بچوں کی تعلیم دینے کیلئے بہت سے مدرسے قائم کرلئے تہے' جن میں پانچ چھہ برس کی عمر کے بچّے داخل ہوتے تہے - اِن مدارس میں کتب مقدسہ اور اون کی تفسیروں اور حدیث کی کتابوں اور مشنہ اور جبارہ وغیرہ کتابوں کی تعلیم دیجاتی تہی - بچّے اِن کتابوں کو حفظ یاد کرتے تہے - کتاب سامنے رکہکر اون کو تعلیم نہیں دیجاتی تہی - نہ کوئی شاگرد کاغذ پر کچہہ لکہتا تہا - مشنہ اس سے پیشتر کہ کتاب کی شکل میں تحریر کیجائے صدیوں تک ایک زبان سے دوسری زبان پر منتقل ہوتی رہی - ربّیوں نے جو مدرسے مختلف شہروں میں قائم کئے تہے' اونمیں سب سے مشہور مدرسے حسب ذیل تہے - (۱) یمنیا کی مدرسے جو ایک مدت تک ربّی غمالائیل کی نگرانی میں جاری رہے - پولوس مقدس انہیں مدارس کے تعلیم یافتوں میں سے تہے - (۲) طبریہ کے مدرسے (۳) اسکندریہ کے مدرسے (۴) بابل کے مدرسے - (۵) اورشلیم یا بیت المقدس کے مدرسے - وسطی صدیوں میں زمانۂ

دراز تک علم ہیئت - طب اور فلسفہ کے علما اور شعرا یہودیوں ہی کی قوم میں سے تہے' جو افریقہ کے شمالی ملکوں - ایشیا کے مغربی ملکوں اور یورپ میں اسپین - اٹلی اور فرانس کے ملکوں میں پہیلے ہوئے تہے - اون کے نہایت عالیشان مدرسے بابل - مصر - فارس (مراکو) اور اسپین میں قائم تہے -

قدیم زمانے کے ایرانیوں میں تعلیم کا چرچا صرف مجوسیوں میں تہا - جو میڈیا کے باشندوں کی نسل سے تہے اور جن کا مذہبی تقدس تمام آتش پرستوں میں مانا جاتا تہا - یہی لوگ اوس ملک کے حکیم اور فلاسفر تہے - یہی قانون بنانیوالے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے والے تہے - یہی لوگوں کے خوابوں کی تعبیر بیان کرتے تہے یہی نجومی کہلاتے تہے اور پادشاہوں کے دربار میں سب سے زیادہ انہیں کا رسوخ تہا - ایرانیوں میں اوس وقت عام تعلیم کا کوئی ایک سلسلہ نہ تہا' بلکہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ادنیٰ قسم کی تعلیم دیجاتی تہی - مجوسیونکو مذہبی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل ہوتی تہی اور سپاہ کو فوجی اور ملکی تعلیم دیجاتی تہی - یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے لکہا ہے کہ ایران میں تمام لوگ اپنے بچوں کو پانچ برس کی عمر سے بیس برس کی عمر تک راست بازی - تیراندازی اور گہوڑے کی سواری' بس انہیں تین چیزوں کی تعلیم دیتے تہے

یونان کے باشندے چھہ برس کی عمر تک اپنے بچوں کو گہر میں تعلیم دیتے تہے - لڑکے اور لڑکیاں اس وقت تک اپنی ماؤں سے تعلیم پاتی تہیں - اس کے بعد اون کو ایک اوستاد کی سرپرستی اور نگرانی میں کیا جاتا تہا' جو ہمیشہ اپنے ساتہہ اون کو مدرسے میں لیجاتا تہا اور گہر پر لے آتا تہا - مدرسوں کی نگرانی کرنا گورنمنٹ کا کام تہا - مگر نگرانی کے سوا گورنمنٹ کو اون سے کچہہ تعلق نہ تہا - اُستادوں کی تنخواہیں لڑکوں کی فیس سے

ادا کیجاتی تہیں۔ تعلیم علی الصباح شروع ہوتی تہی۔ تعلیم کے تین درجے تہے پہلے درجہ میں لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا۔ دوسرے درجہ میں موسیقی ادب اور دستکاری کی تعلیم ہوتی تہی۔ تیسرے درجہ میں ریاضت جسمانی کی مشق کرائی جاتی تہی، جب بچہ حرف شناس ہوجاتا اور عبارت پڑھنے لگتا تھا تو اوس کو یونانی شاعروں کے عمدہ اشعار زبانی یاد کراتے تھے۔ مدرسہ کی تعلیم سولہ یا اٹھارہ برس ختم ہوجاتی تہی۔ اِس کے بعد طلبا اگر اعلیٰ تعلیم رنا چاہتے تو یونان کے مشہور حکما فصحا اور ں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور رفلسفہ اور فن بلاغت اور بحث مباحثہ کا طریقہ سیکھتے۔ لڑکیوں کی تعلیم کیلئے نہ یونان میں کوئی مدرسہ تھا۔ نہ اس کے لئے خاص اوستاد تھے۔ اون کی تعلیم لڑکوں کے ساتھ ساتھ ہوتی تہی۔ یونان کا دارالحکومت ایتھنز سولن کے قانون کے بموجب ہمیشہ آزادانہ تعلیم کا مرکز رہا۔ باوجودیکہ تعلیم مذہب کی طرح نظام حکومت کا جزو خیال کیجاتی تہی، تاہم گورنمنٹ نے بچوں کو تعلیم دینے کا معاملہ والدین کی رائے پر چھوڑ رکھا تھا۔ اور چند معمولی قانون پاس کردیئے تھے، جن سے اخلاق کی درستی مقصود تہی۔ اِن قوانین کی رو سے یونان کا ہر باشندہ اس بات پر مجبور تھا کہ اپنی اولاد کو لکنا پڑھنا اور پانی میں تیرنا سکھائے۔ اگر کوئی باپ ایسا نہ کرتا تو اوس کو سزا دیجاتی تہی۔ ہر باپ فرض تھا کہ وہ اپنے بچے کو گورنمنٹ کے کسی صیغہ کے لئے تیار کرے۔ اگر وہ ایسا نکرتا، تو اولاد اِس بات پر مجبور نہیں کیجاتی تہی کہ وہ بڑھاپے میں والدین کی کچھ بہی مدد کرے۔ علوم عقلی اور فنون لطیفہ کی ابتدائی تعلیم ایتھنز میں دی جاتی تہی۔ ریاضت جسمانی کی تعلیم پر بہی یونانیوں کو خاص شغف تھا، کیونکہ خوبصورتی اور توانائی اسی ذریعہ سے حاصل ہوسکتی تہی۔

تعلیم کے جو طریقے یونانیوں میں رائج تہے، وہی اوائل رومیوں نے بہی اختیار کئے تہے۔ مگر اون کی توجہ پہلے پہل ریاضت جسمانی اور قومی ہمدردی کی روح پھونکنے کی طرف بہت زیادہ تہی۔ قدیم زمانہ میں رومی اسکول کا اُستاد کھیلوں کا اُستاد کہلاتا تھا۔ کیونکہ اوس زمانہ میں دلیرانہ کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کے سکھانے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا جاتا تھا۔ پادشاہت قائم ہونیکے قریب زمانہ تک تعلیم حکومت کے سایہ میں نہیں تہی۔ مگر جب پادشاہت کا زمانہ آیا، تو امیر لوگ اپنی اولاد کو لاطینی زبان کی طرح یونانی زبان اور اوس کے علوم نہایت توجہ سے سکھانے لگے۔ کونٹلیانوس کے زمانہ میں جو رومن امپائر کا بادشاہ تھا، اعلےٰ تعلیم اون لوگوں کے ہاتھ میں تہی، جو فصاحت اور بلاغت کے فن میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ اور کبہی کبہی اُنکی تنخواہ پادشاہ کے خزانہ سے ادا کیجاتی تہی۔ رومۃ الکبریٰ کے بہت سے نوجوان لڑکے تعلیم پانے کیلئے ایتھنز کے مدرسہ میں آکر داخل ہوتے تھے۔ جہاں دس مدرس مختلف علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ قسطنطین نے جو شہر قسطنطنیہ کا بانی تھا، اِس شہر میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی تہی، جس کو اوس زمانہ میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اِس کے بعد تھیوڈوشیس صغیر نے اوس مدرسہ کو دوبارہ رونق دی۔ پادشاہت کے اخیر زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم نہایت عمدگی سے جاری تہی اور اون کے پڑھانے لکھانے پر بہت توجہ کیجاتی تہی۔ بعد ازاں جبکہ سلطنت جمہوری کو زوال آیا۔ تو لڑکیوں کی تعلیم کیلئے خاص مدرسے قائم ہوگئے۔ لڑکیوں کے باپ اِن مدرسوں میں بہت کم جاتے اور اثنائے تعلیم میں اون سے بہت کم ملتے تھے۔ وہ لوگ جو سب سے پہلے اِس ملک میں عیسائی ہوئے۔ اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے علیحدہ مدرسے قائم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ وہ یا تو اون کو گہر پر تعلیم دیتے تھے یا عام

نگی مدارس میں تعلیم کیلئے بھیجدیتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں سب سے زیادہ پُر رونق اور عالیشان مدرسہ اسکندریہ میں تھا۔ جہاں بت پرستوں یہودیوں اور عیسائیوں کے بچے جوق جوق تعلیم پاتے تھے ۱۸۱ء میں اِسی مدرسہ کے قریب ایک مدرسہ عیسائی مذہب کی تعلیم کیلئے قائم کیا گیا، جس کا بانی پنتینوس تھا۔ اس میں علمی طریقہ سے مذہب عیسوی کی باقاعدہ تعلیم دیجاتی تھی۔ قیساریہ۔ انطاکیہ وغیرہ میں جو مدرسے اِس کے بعد قائم ہوئے، وہ اِسی مدرسہ کے نمونہ پر جاری کئے گئے تھے۔ مغرب میں رومی طریقہ کے مدرسے کارتھیج۔ روما۔ میلان۔ مارسیلز اور لیون میں جو اوس زمانہ کے بڑے بڑے شہر تھے، پانچویں صدی تک نہایت زور شور سے جاری تھے۔ چونکہ اُس زمانہ میں عیسائیوں کے مذہبی مدرسے بہت کم تھے، اِسلئے چرچ کے بڑے بڑے مشہور عالم اون نوجوانوں کو جو مشنری بننا چاہتے تھے، بذات خود وقت کے مناسب تعلیم دیا کرتے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی کے ابتدا میں مشرق کی اون خانقاہوں میں جو عیسائیوں نے تنہائی اور عبادت اور غور و فکر کے لئے قائم کی تھیں اور مغرب کی اون خانقاہوں میں جو ملکی شورشوں اور ہنگاموں سے محفوظ اور مطمئن رہنے کیلئے بنائی گئی تھیں، تعلیم نے آکر پناہ لی تھی اور انہیں مقامات میں علم کا چراغ روشن تھا۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں مذہب عیسوی کی اشاعت کے لئے مختلف درجہ کے پادری عیسائیوں میں موجود تھے۔ اعلےٰ درجہ کے پادری کو جتنے علاقہ پر مذہبی اختیار حاصل ہوتا تھا اوس کو ابرشیہ کہتے تھے۔ اور یہ پادری مطران کہلاتے تھے۔ مطرانوں کے ماتحت جو پادری ہوتے تھے اون کے دائرۂ حکومت کو استقفیہ کہتے تھے اور یہ پادری استقف کہلاتے تھے اوس زمانہ میں تین قسم کے مدرسے جاری تھے۔ ایک تو وہ مدرسے جو مطرانوں کے صدر مقام میں قائم تھے۔ دوسرے وہ

جو استقفوں کے رہنے کی جگہ جاری کئے گئے تھے۔ تیسرے وہ مدرسے جو خانقاہوں کے مدرسے کہلاتے تھے۔ آئرلینڈ کے مدرسے اوس وقت علم و فضل کے لحاظ سے تمام مدرسوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ ساتویں صدی میں یورپ کی عقلی اور دماغی حالت ادنیٰ درجہ میں تھی۔ اِس کے بعد آٹھویں صدی کے اختتام پر جبکہ فرانس میں مامون رشید کا ہمعصر شارلین حکومت کر رہا تھا، رفتہ رفتہ یورپ نے علمی ترقی شروع کی۔ اِس بادشاہ نے انگلینڈ، آئرلینڈ اور جرمنی سے بڑے بڑے عالموں کو بُلا کر اپنے دربار میں معزز اور ممتاز کیا تھا۔ وہ شاہی مدرسہ جس میں اوس کے بچوں کے ساتھ بعض امیروں کے بچے بھی تعلیم پاتے تھے، اوس کے عہدِ حکومت میں دوبارہ رونق پذیر ہوا۔ جہاں کہیں یہ شہنشاہ سفر کرتا تھا، یہ مدرسہ بھی اوس کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اِس مدرسہ کے سوا دو مدرسے اور تھے جن میں اوس زمانہ کے تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اِنکے علاوہ شارلین نے ہر ایک خانقاہ اور ہر ایک استقفیہ میں مدرسہ قائم کرنے کا حکم دیا تھا، جن میں لکھنا پڑھنا، حساب، صرف و نحو سکھائی اور زبور حفظ کرائی جاتی تھی۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گذری تھی کہ انگلستان میں وہاں کے بادشاہ الفرڈ نے علوم و فنون کو زندہ کیا اور اپنے ملک میں مدرسوں کی بنیاد ڈالی مگر ڈنمارک کے باشندوں نے انگلستان پر جو متواتر حملے کئے تھے اونسے تعلیم کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور خانقاہوں اور گرجاؤں کے لٹنے سے بہت سے کتب خانے غارت ہو گئے جب ونکس نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ تو سارے ملک میں ایک آدمی بھی اِس قابل نہیں تھا کہ لاطینی زبان کی کسی کتاب کا ترجمہ کر سکے۔ اِس بادشاہ نے بڑے بڑے نامور علما کو اپنے دربار میں بُلایا اور اپنی سلطنت کے مختلف مقامات میں مدرسے جاری کئے اور ایک قانون

 تعلیم کے قدیم اور جدید طریقے دنیا کی گذشتہ اور موجودہ اقوام میں

پاس کیا، جسکا مطلب یہ تھا کہ ہر شریف آدمی اپنی اولاد کو لکھنا پڑھنا سکھائے (اگر اوس کے حالات اس بات کے مقتضی ہوں اور وہ بچوں کو تعلیم دینے کی استطاعت رکھتا ہو) اور جو لوگ ملکی یا مذہبی عہدوں کیلئے تیار کئے جائیں، اون کو لاطینی زبان کا پڑھنا ضروری ہے - مگر افسوس ہے کہ اس بادشاہ کے مرنیکے بعد اُس کی تمام کوششیں اوسی طرح غارت گئیں، جس طرح فرانس میں شارلمین کا روشن کیا ہوا چراغ اوس کے مرنیکے بعد بجھ گیا تھا - دسویں صدی عیسوی میں یورپ کے اکثر باشندوں کے دماغوں پر عام طور سے جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اون میں علم کیطرف راغب ہونیکا دلی ولولہ ظاہر نہیں ہوتا تھا - چونکہ اوس زمانہ میں یورپ کے تمام ملکوں میں اکثر مُردہ زبانوں کی تعلیم دیجاتی تھی اِس لئے تمام لوگ علم کی روشنی سے بالکل محروم تھے لکھنا عام لوگ بالکل نہیں جانتے تھے، بلکہ اون میں جو لوگ اعلیٰ درجہ کے تھے، اون کو بھی لکھنا نہ آتا تھا اسی لئے وہ پادریوں کا فن کہلاتا تھا - ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں جو عیسائیوں میں علم کے لحاظ سے عہدِ ظلمت مشہور ہے مسلمانوں کے بڑے بڑے عالیشان مدرسے بغداد سے قرطبہ تک جاری تھے اور اون کی سترہ یونیورسٹیاں تھیں، جنمیں سب سے مشہور قرطبہ کی یونیورسٹی تھی - تاریخوں میں لکھا ہے کہ قرطبہ میں جو عظیم الشان کتب خانہ اوس وقت موجود تھا، اوس میں چھ لاکھ کتابیں عربی زبان کی ترتیب دی گئی تھیں - مسلمانوں کے مدرسوں میں جن علوم کی تعلیم دیجاتی تھی وہ حسب ذیل ہیں - (۱) صرف و نحو (۲) شاعری (۳) تاریخ و جغرافیہ (۴) علم ہیئت و نجوم (۵) علم کیمیا (۶) علم ریاضی (۷) علم طب - ریاضی اور طب میں مسلمانوں نے یونانیوں سے بہت زیادہ اپنی طبیعت سے اضافے کئے - اُن کے ابتدائی

مدرسے مسجدوں کے پہلو میں قائم ہوتے تھے، یہاں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور بہت سے اشعار حفظ کرلئے جاتے تھے - یونیورسٹی کے مدرسوں میں عموماً الہیات، فقہ اور فلسفہ نظری کی تعلیم دیجاتی تھی - علوم طبعیات کیلئے بالکل جدا مدرسے تھے - طب کا فن شفاخانوں میں پڑھایا اور سکھایا جاتا تھا - یورپ میں گیارھویں صدی عیسوی اور اوس کے بعد فلسفہ، شاعری کی طرف بہت توجہ مائل تھی اور یونیورسٹیاں قائم کرنے اور لاطینی اور یونانی زبان کی علمی کتابوں کے غور سے مطالعہ کرنے کی طرف بھی وہ بہت سرگرمی سے متوجہ تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں علمی روح یورپ میں اِس سرے سے اوس سرے تک متحرک نظر آتی تھی -

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں بیس یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جن میں سے ذیل کی یونیورسٹیاں بہت مشہور تھیں (۱) پیرس (۲) کیمبرج (۳) اکسفورڈ (۴) روم (۵) بلونیا (۶) مونپلیہ (۷) باڈوا (۸) سالامنکا (۹) لزبن - بلونیا کی یونیورسٹی قانون کی تعلیم کو زندہ کرنے میں تمام یونیورسٹیوں سے سبقت لیگئی - اِس یونیورسٹی میں یورپ کے تمام ملکوں سے قانون کی تعلیم پانے کے لئے جوق جوق طلبا، آتے تھے پیرس کی یونیورسٹی الہیات کی تعلیم میں سب سے اعلیٰ درجہ پر تھی - مونپلیا کی یونیورسٹی میں خصوصیت کے ساتھ علوم طبیہ پڑھائے جاتے تھے - زمانۂ سابق میں عورتوں کی تعلیم سخت تنزل کیحالت میں تھی - بڑے بڑے شہروں کے سوا جنمیں چند مدرسے اون کو لکھنا پڑھنا سکھانے کیلئے قائم تھے، یورپ کے اور شہروں میں کوئی مدرسہ ایسا نہیں تھا جسمیں عورتوں کی تعلیم ہوتی ہو - عیسائی عورتیں جو راہب ہونے کیلئے تیار کیجاتی تھیں وعظ کے سوا اور کوئی چیز پڑھنا نہیں جانتی تھیں - کارچوب کا کام البتہ اون کو سکھایا جاتا تھا - مشق [illegible]

تعلیم کے قدیم اور جدید طریقے دنیا کی گذشتہ اور موجودہ اقوا

جب زوال ہونے لگا تو یونان کے علما نے جو علوم قدیمہ کا چراغ روشن رکھتے تھے، اٹلی میں پناہ لی، جہاں کے باشندے ڈانٹے اور بکیشیو کی تحریک و ترغیب کے سبب سے علم کے قدرشناس ہو چلے تھے - یہاں کے امرا ز جو فیاضی اور علم پروری کا ثبوت دیا، اس کے باعث سے بہت سے علما، قدیم قلمی کتابوں کی نقل لینے اور فلسفہ زبان کے زندہ رکھنے میں مشغول ہو گئے - اٹلی سے علم کے حاصل کرنے کا شوق یورپ کے اور ملکوں میں بھی پھیل گیا اور ارسطو کے مقلدوں (جن میں مذہبی علما شامل تھے) اور افلاطون کے مقلدوں (جنہیں فنون لطیفہ کے جاننے والے داخل تھے) میں بحث و تکرار شروع ہو گئی جرمنی میں اگریکولا اور اٹلی میں والاَ نے ارسطو کے طریقۂ تعلیم کے برخلاف کتابیں لکھیں - فرانس میں راموس اس طریقہ کا سب سے زیادہ مخالف تھا - اصلاح پسند لوگ ارسطو کی فلسفہ پر اعتراض کرتے تھے اور عیسائی اوس کی حمایت کرتے تھے - اسپین کی بعض یونیورسٹیوں میں آجتک بھی اسی فلسفہ کا درس جاری ہے - بر باخ - رجیومونتانوس نیقولاؤس اور کوسانوس نے اہلِ یورپ کو علوم عالیہ ریاضی کی طرف مائل کیا - نیقولاس و کلینجس اور رغیفوریوس تیغرناس نے فرانس میں - لبرکسا نے اسپین میں اور رخلین نے جرمنی میں اپنے ملک کے لوگوں میں تحصیل علم کی روح پھونکی - چودھویں صدی کے وسط میں عیسائی علمائے الٰہیات کی ایک انجمن قائم ہوئی جن سب سے پہلا مدرسہ ١٣٧٦ء میں قائم ہوا - اس انجمن نے علم کی اشاعت میں نہایت سرگرمی کا اظہار کیا - اس انجمن کے مدرسے ہالنڈ اور جرمنی میں پھیلے ہوئے تھے - ان مدرسوں میں خصوصیت یہ تھی کہ اون کے طلبا مذہبی اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوتے تھے - اٹلی اور اسکے سوا مختلف ملکوں کے طلبا جوق جوق ان مدرسوں میں آکر تعلیم پاتے تھے - برانپت کی یونیورسٹی میں علوم

عقلیہ کا درس نہایت وسعت کے ساتھ جاری تھا - اس کی شہرت ١٥٧٠ء تک قائم رہی، جبکہ اوس کے طلبا کی (٨٠٠٠) تک پہونچگئی تھی سترھویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں جبکہ البرٹ اور ایزابلا کا دورِ حکومت تھا، ہالنڈ میں جہاں اوس وقت اسپین کی حکمرانی تھی، علوم کی اشاعت اس درجہ تک پہونچگئی تھی کہ یہ زمانہ طلائی زمانہ کے نام سے مشہور ہے - سترھویں صدی عیسوی کے اخیر زمانہ سے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر زمانہ تک تعلیم کے چار طریقے قائم ہو گئے تھے - ان طریقوں کی حمایت کرنے والے اہلِ تقویٰ - اہلِ شفقت - اہلِ محبت اہلِ انتخاب کے نام سے مشہور تھے - اسپنر نے پہلے طریقہ کے حامیوں میں سے تھا، ایک مدرسہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ایک مدرسہ معلموں کی تعلیم کے لئے اس اصول پر قائم کیا تھا کہ اون میں بہ نسبت عقلی علوم کے مذہبی اور اخلاقی علوم کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور خداشناسی اور خالص مذہبِ عیسوی کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ مائل کی جاتی تھی - اس مدرسہ کے اصول پر یورپ کے دیگر شہروں میں بہت سے اور مدرسے قائم کئے گئے - ان میں انجیل کے سوا کوئی کتاب یونانی زبان میں نہیں پڑھائی جاتی تھی - مگر عبرانی زبان میں تعلیم پانا لازمی تھا اور تعلیم کی کامیابی اور عمدگی کے لئے طالب علموں کے اخلاق کو شائستہ کرنا اور اون کی روح کو تہذیب کی روشنی سے منور کرنا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا - اہلِ شفقت کے نزدیک تعلیم کی بنیاد السنۂ قدیمہ خصوصاً لاطینی اور یونانی زبان پر تھی - اور یونیورسٹی کے درجہ تک پہونچنے سے پہلے انہیں زبانوں کی تعلیم دیجاتی تھی - اہلِ محبت کے گروہ میں سے باسیڈو - کیمپی اور سلزمان بہت مشہور رہے، جن کا اصول یہ تھا کہ ہر قسم کی تعلیم سے اصلی غرض محبت اور ہمدردی ہونی چاہیے اور تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو طبیعت کے عین موافق ہو

ـاب کی توجہ عام لوگوں کی تعلیم کی طرف مائل تھی،
ـں سے اکثر تعلیم سے محروم رہتے ہیں - اون کی اِس
ـک کی بنیاد خالص انسانی ہمدردی پر تھی - اِس اصول کے
ـل کرنے سے بہت سے مختلف قسم کے مدرسے جاری
ہوگئے مثلاً گونگوں، بہروں اور اندھوں کے مدرسے -
اتوار کے مدرسے - تجارت - زراعت - معدنیات اور
مصوری کے مدرسے وغیرہ -

گذشتہ صدی کے اخیر حصہ میں جرمن میں تعلیم کے اصولوں پر
بہت سے مباحثے ہوئے - اخیر سو برس کے عرصہ میں جس
ـس کی رایوں نے طریقۂ تعلیم میں عظیم الشان انقلاب
ـدا کیا، وہ ملک سویڈن کا باشندہ بستلوتسی تھا - اُسکے
ـول کے بموجب بچوں کی تعلیم سب سے پہلے گھر پر
ـوا اون کی زیر نگرانی ہونی چاہیے اور یہ تعلیم آہستہ آہستہ
اور بغیر کسی فصل کے نیچرل طریقہ سے ہونی لازم ہے -
اس کے نزدیک اِس زمانہ کی تعلیم میں اُستاد کو واجب
ہے کہ وہ شاگرد کو خود محنت کرنے پر آمادہ کرے اور وہ اپنی
طرف سے اوس کو بہت کم مدد اور سہارا پہونچائے - عقلیات
کی تعلیم اِس زمانہ میں سخت مضر ہے - ابتدائی تعلیم کی بنیاد
محسوسات پر ہونی چاہیے تاکہ بچے رفتہ رفتہ جوان ہوکر
اِس بات کی عادت ڈالیں کہ بدون ذاتی تجربہ اور مشاہدہ
کے کسی چیز کی نسبت رائے قائم نہ کریں - اِسی سبب سے
اس طریقۂ تعلیم میں زباندانی کی طرح زبانی حساب - ہندسہ
نقشہ کشی اور تصویر کشی کی تعلیم نہایت ضروری سمجھکر داخل کی
گئی تھی - بستلوتسی کہتا ہے کہ مدرسہ چہل پہل کی جگہ ہونی چاہیے
اور بچوں کو اپنی قُویٰ کے استعمال میں آزادی دینی چاہیے -
تاکہ وہ ہنسی خوشی سب کچھ سیکھ جائیں - پروشیا کے مدرسوں
میں تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ یہی اصول جاری
کئے گئے ہیں - انگلستان - امریکا اور شمالی یورپ میں
یہ طریقہ مدرسوں اور سکولوں پر بہ نسبت اور طریقوں کے
زیادہ موثر ثابت ہوا ہے - اگرچہ پروشیا میں مدرسوں

کے متعلق سرکاری قانون زمانۂ قدیم سے جاری تھے مگر
موجودہ طریقۂ تعلیم کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی ابتدا
۱۷۹۴ء میں ہوئی جبکہ فریڈرک اعظم کے زمانہ میں تعلیم کا عام
قانون بنایا گیا اور جو اُس کے جانشین کے زمانہ میں
جاری ہوا - اِس قانون کی رو سے عام اسکول اور
درس گاہیں گورنمنٹ کی زیر نگرانی رہنے لگیں - مدرسوں
کے اخراجات - اون کے انتظام - پروفیسروں اور
ٹیچروں کے تقرر اور طالب علموں کے داخلہ کی
نسبت اِس قانون میں ہدایتیں کی گئی ہیں - فریڈرک
اعظم نے ایک حکم یہ بھی جاری کیا تھا کہ مدارس عالیہ کے
پروفیسر بمنزلہ سرکاری ملازموں کے تصور کئے جائیں -
۱۸۱۰ء میں جو قانون جاری ہوا اوس کا منشا یہ تھا کہ
تمام خاص اور عام مدرسے ایسے افسروں کی نگرانی
میں رہیں گے جن کو گورنمنٹ خود نامزد کرے گی -

فرانس میں عام تعلیم کی ابتدا ۱۸۲۲ء سے ہوئی - اِس
سے پیشتر مدرسوں کا قیام خاص خاص لوگوں کی فیاضی
یا چندوں پر تھا - باشندگانِ فرانس کی اولاد کو عام
طور پر تعلیم دینے کا کوئی بندوبست نہ تھا - ۱۸۳۱ء میں
گیزو نے جو اوس زمانہ میں فرانس کا وزیر علوم تھا،
وکٹر گوزین کو پروشیا میں بھیجا تاکہ وہاں کے طریقۂ
تعلیم سے واقف ہوکر ایک مفصل رپورٹ پیش کرے
اُسکی واپسی پر ۱۸۳۳ء میں فرانس میں تعلیمات کے متعلق
ایک نیا قانون نافذ ہوا جس کی بہت سی نشانیاں
اب بھی اوس ملک کے طریقۂ تعلیم میں پائی جاتی ہیں -

انگلستان میں مدرسوں کے اخراجات و انتظامات
کی باگ مدت تک عام لوگوں کے ہاتھ میں رہی -
۱۸۳۳ء میں گورنمنٹ نے اوّل اوّل مدرسوں کو امداد
دینی شروع کی - ۱۸۷۰ء میں ابتدائی مدرسوں کے قیام
و انتظام کے لئے ملک کی آمدنی کا ایک حصہ مخصوص کیا گیا
آج کل تمام مہذب ملکوں کی گورنمنٹیں تعلیم کو اعلیٰ درجہ

کی قوت تصور کرتی ہیں - فقط اس سبب سے نہیں کہ اوس سے علم کی عام طور پر اشاعت ہوتی ہے، پاکیزہ اخلاق کی طرف قوم مائل ہوئی ہے، قومی ہمدردی اِس سرے سے اُس سرے تک پھیل جاتی ہے، بلکہ اِس سبب سے بھی کہ اُس سے نوعِ انسان کی تمام طبعی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور ہر قوم کی دولت کو اوسی قدر ترقی ہوتی ہے جسقدر کہ اوس کے افراد تعلیم یافتہ ہوتے ہیں - زراعت تجارت صنعت وحرفت کے لحاظ سے جو ترقیاں مہذب ملکوں میں ہوئی ہیں، وہ اِس بات پر دلیل بیّن ہیں کہ تعلیم سے کسقدر فائدے حاصل ہوسکتے ہیں - ان ملکوں میں زراعت - تجارت صنعت وحرفت اور خاص خاص فنون کے مدارس نہایت اعلیٰ درجہ کے قائم ہوئے ہیں - پروشیا کی فوج کو جو فرانس اور دیگر ممالک کی فوجوں پر فوقیت حاصل ہے، وہ اِسی سبب سے نہیں کہ فوجی انتظامات اعلیٰ درجہ کے ہیں اور فنون حرب میں اوس نے تمام قوموں سے سبقت حاصل کی ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ عام تعلیم جس قدر وسعت اور لزوم کے ساتھہ پروشیا میں جاری ہے، اوس قدر وسعت اور لزوم کے ساتھہ کسی ملک میں نہیں ہے - ضلاع متحدہ امریکا کے صوبوں کے مالی اور تعلیمی نقشے جو اوس ملک میں سرکاری طور پر تیار کئے گئے ہیں، اون کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں جہالت کم ہے، دولت مندی زیادہ ہے اور جہاں تعلیم یافتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، وہاں کے لوگ دولت مندی میں بھی کمتر درجہ کے ہیں -

بڑے بڑے مدبروں اور علما کی رائے یہ ہے کہ تعلیم سب سے عمدہ ذریعہ جرائم اور افلاس کی کمی کا ہے - ڈاکٹر ... نے سنہ ۱۸۹۶ء میں تحقیقات کرکے معلوم کیا تھا کہ فرانس میں ۹۵ فیصدی مجرم اَن پڑھ اور جاہل ہیں - بلجیم میں ۴۹ فیصدی - سوئٹزرلنڈ میں ۸۳ فیصدی - اٹلی میں ۴۰ فیصدی - ہالنڈ میں ۳۵ یا ۳۸ فیصدی - اضلاع متحدہ میں ۲۲ فیصدی - مگر ۵۰ فی صدی مجرم تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں، ایسی نسبت سے اِن ملکوں میں جرائم ہوا کرتے ہیں - پروفیسر نیسفیلڈ نے مجرموں اور تعلیم یافتوں میں جو نسبت دریافت کی، اوس کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی مجرم جاہل مطلق ہیں - ⅔ مجرم لکھنا پڑھنا جانتے ہیں مگر بہت کم - پس مجرموں کی تعداد اون لوگوں میں جو جاہل مطلق ہیں، بہ نسبت اون لوگوں کے جو کچھہ کچھہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں، بہت زیادہ ہے - اضلاع متحدہ امریکا میں ۶۰ فیصدی مفلس جاہل مطلق ہیں اور ۳۱ فیصدی مفلس کچھہ کچھہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں - اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ مفلسوں کی تعداد اون لوگوں میں جو جاہل مطلق ہیں، بہ نسبت اون لوگوں کے جو کچھہ کچھہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں بہت زیادہ ہے - ڈاکٹر جرفس نے بیان کیا ہے کہ تعلیم اور تندرستی جسمانی میں بھی بہت بڑا تعلق ہے - انگلستان میں جاہل عورتوں کی تعداد ۲۰ سے ۳۰ فیصدی تک اور تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد ۶۰ سے ۷۰ فیصدی تک ہے - جاہل عورتوں سے شادی کے بعد جو اولاد ہوتی ہے، انہیں ۱۴ فیصدی بچے ایک سال کی عمر کو بھی نہیں پہنچتے اور مرجاتے ہیں - ۲۴ فیصدی بچے عمر کے دوسرے سال میں ہلاک ہوجاتے ہیں -

انہیں وجوہ سے زمانۂ حال میں ہر گورنمنٹ کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ ملک میں عام تعلیم کو پھیلائے اور ایسے وسائل اختیار کرے جن سے ملک میں تعلیم کا دائرہ وسیع ہو - اِسی بنیاد پر فرانس - روس - اٹلی گریٹ برٹن اور اضلاع متحدۂ امریکا کی حکومتوں نے تعلیم کے طریقہ میں اصلاح کی ہے اور اپنے اپنے

 تعلیم کے قدیم اور جدید طریقے دنیا کی گزشتہ اور موجودہ اقوام میں

…عام طور سے اُس کی اشاعت کی ہے۔ جبری …یال بھی ان ملکوں میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ …ل فریڈرک اعظم نے [illegible]ء میں ایک قانون …تھا، جس کی رو سے والدین اس بات پر …کہ جب بچوں کی عمر لکھنے پڑھنے کے قابل …ہے تو فوراً اون کو مدرسوں میں داخل کریں۔ …ن اس قانون کی تعمیل میں ذرا کوتاہی اور …کرتے ہیں اون کو حکومت کی طرف سے …ائی ہے۔ آسٹریا۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ ڈنمارک …اور ناروے وغیرہ ملکوں نے بھی پروشیا …ں قدم پر چلنا شروع کیا ہے۔ انگلستان میں …ی تعلیم کا حال میں جاری ہوا ہے، اوس کی رو سے تعلیمی کمیٹیاں والدین کو مجبور کرسکتی ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو جن کی عمر ۵ اور ۱۴ سال کے درمیان ہو، مدرسوں میں داخل کریں۔ فرانس میں جبری تعلیم حال ہی میں داخل کی گئی ہے۔ اضلاع متحدۂ امریکا میں جبری تعلیم بعض صوبوں میں جاری ہے۔ مگر بعض صوبوں میں جاری نہیں ہے۔ عام تعلیم کے تین درجے رکھے گئے ہیں۔ ابتدائی۔ متوسط اور اعلیٰ۔ تمام ملکوں کی تعلیم اسی طریقہ پر درجہ بدرجہ رکھی گئی ہے، مگر جو فرق ان درجات تعلیم میں ہے وہ مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔

پروشیا کا طریقۂ تعلیم جو تمام ممالک جرمنی میں عام طور پر شائع ہے، سب سے کامل طریقہ خیال کیا گیا ہے۔ اس طریقہ کی رو سے گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اون بچوں کے لیے جن کی عمر لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے، کافی تعداد کے ابتدائی مدرسے قائم کرے۔ ہر بچہ پر جس کی عمر ۷ اور ۱۴ برس کے درمیان ہے واجب ہے کہ کسی عام یا خاص مدرسہ میں تعلیم کیلئے داخل ہو۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر قسم کے مدارس کے لئے مدرسوں اور معلموں کی کافی تعداد مہیا کرے۔ اون کو فن تعلیم میں ترقی کرنے کے لئے حوصلہ دلائے اگر وہ بیمار ہوں یا کمزور ہوں یا بوڑھے ہو جائیں تو اون کی امداد کرے اور اگر وہ مرجائیں تو اون کی اولاد کی مالی اعانت کرے۔ ہر قسم کے عام اور خاص مدارس کے انتظام کی نگرانی بھی گورنمنٹ کے فرائض میں داخل ہے۔ متوسط درجہ کے مدرسوں کی نگرانی پہلے مذہبی علما کے سپرد تھی مگر ۱۸۷۲ء میں جدید قانون تعلیمات کے بموجب اون کی نگرانی بھی گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب چرچ کو اونسے کچھ تعلق نہیں رہا۔ ملک پروشیا بلحاظ پولیٹیکل انتظام کے ۱۱ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر صوبہ میں ۳۵ اضلاع ہیں۔ ہر ضلع میں بہت سی تحصیلیں اور پرگنے ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی یہی تقسیم ہے۔ سب سے بالاتر افسر تعلیم وزیر علوم ہے، جس کو ملک کے تمام مدارس عام و خاص پر حکمرانی کرنے کا اختیار ہے۔ وزیر علوم بادشاہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔ ہر صوبہ کی تعلیم کی نگرانی اوس صوبہ کے گورنر کے ذمہ ہے۔ ہر صوبہ میں ایک کمیٹی ہے جس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کو متعلق امور مذہبی کی نگرانی ہے۔ دوسری شاخ تعلیم کی سرپرستی کرتی ہے۔ دوسری شاخ کے ممبروں کو گورنمنٹ نامزد کرتی ہے۔ اور اون کی تنخواہ بھی گورنمنٹ کے خزانہ سے ادا کیجاتی ہے۔ مدارس ابتدائی کے اخراجات اور اون کا انتظام صوبوں کے گورنروں کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ مگر مدارس عالیہ کی نگرانی، اونکے طریقہ تعلیم کا مقرر کرنا، تعلیم کی کتابوں کا تجویز کرنا، اون کے مدرسوں اور پروفیسروں کا انتخاب کرنا اور اون طالب علموں کی تحقیقات کرنا جو مدارس ابتدائی سے نکلکر مدارس عالیہ میں داخل ہوتے ہیں، یہ سب کمیٹی تعلیم والی شاخ کے فرائض میں داخل ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں جو مدرسے ہیں، اون میں ہر مدرسہ کے

تعلیم کے قدیم اور جدید طریقے دنیا کی گذشتہ اور موجودہ اقوام میں

نظام کیلئے ایک لوکل کمیٹی ہوتی ہے جسمیں اوس قصبہ کا پادری اور جیپ جے کے دو یا چار ممبر اور حکومت کے دو ممبر شریک ہوتے ہیں۔ اکثر اس کمیٹی کا میر مجلس قصبہ کا پادری ہوتا ہے مگر بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں پبلک اسکولوں کا انتظام اور اون کی نگرانی ایک کمیٹی کرتی ہے جس میں حاکم شہر۔ ممبران میونسپل کمیٹی اور مدارس عالیہ کے بعض افسر شریک ہوتے ہیں۔ پھر ہر مدرسہ کیلئے ایک جدا کمیٹی اوسکی نگرانی اور انتظام کے لئے اس بڑی کمیٹی کے ماتحت ہوتی ہے۔ پھر کل انتظام جو تمام مدارس کا بیان کیا گیا براہ راست گورنمنٹ کے عام پولٹیکل انتظام کے ماتحت ہے۔ اوقاف یا چندوں کی آمدنی اگر مصارف تعلیم کے لئے کافی نہو تو اوس کے پورا کرنیکے لئے مقامی ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ معلموں کی تنخواہیں عام طور پر قلیل ہیں جو فیس وغیرہ آمدنیوں سے ادا کیجاتی ہیں۔ جو طالب علم مدرسہ کی فیس پوری ادا نہیں کرسکتے اون سے کم فیس لیجاتی ہے یا بالکل نہیں لیجاتی۔ ہر تحصیل یا پرگنہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے مدارس کا خرچ ادا کرے۔ اگر کافی خرچ ادا نہیں کرسکتا تو ضلع یا صوبہ یا گورنمنٹ کیطرف سے امداد دیجاتی ہے۔ جن بچوں کی عمر ۶ اور ۱۴ برس کے درمیان ہے اون کو جبراً مدارس میں داخل کیا جاتا ہے۔ اور اگر اون کے والدین غفلت کریں تو اون کو چشم نمائی کیجاتی ہے یا اون پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ کیطرف سے اون معلموں اور مدرسوں کی (جنکی تنخواہ وہ ادا کرتی ہے) علمی اور اخلاقی حالت اچھی طرح تحقیق کیجاتی ہے۔ اور جب تک یہ ثابت نہ ہوجاسے کہ چال چلن پاکیزہ اور عمدہ ہے تعلیم دینے کے لئے کافی لیاقت ہے کوئی معلم مقرر نہیں کیا جاتا۔ ملک کے باشندے اپنے چندے سے خاص تعلیم کیلئے مدرسے جاری کرسکتے ہیں مگر اس قسم کے مدارس کی نگرانی بھی گورنمنٹ بذات خود کرتی ہے۔ گورنمنٹ ہی کا فرض ہے کہ ان مدارس کے مدرسوں اور معلموں کا انتخاب کرے اور اون کو تعلیم دینے کی اجازت عطا کرے۔ ابتدائی اسکولوں سے یونیورسٹی کے درجہ تک جو مدارس پروشیا میں جاری ہیں اون کی تقسیم پانچ طبقوں میں کی گئی ہے۔ گورنمنٹ اون میں طریقۂ تعلیم مقرر کرتی ہے۔ تعلیم کی مدت نو برس ہے۔ لسلئے عام طور پر جو بچے نو یا دس برس کی عمر میں ان مدارس میں داخل ہوتے ہیں وہ ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں تعلیم پاکر نکلتے ہیں۔

پروشیا میں دس یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے اکثر بادشاہوں کی قائم کی ہوئی ہیں۔ اور اونہیں کیطرف سے جائدادیں وقف کی گئی ہیں تاکہ عمدہ طریقہ سے اونکا انتظام ہو۔ موجودہ گورنمنٹ کو ان تمام یونیورسٹیوں پر اختیار مطلق حاصل ہے۔ وہی پروفیسروں کو مقرر کرتی ہے۔ اور اسی کا کام ہے کہ اگر پروفیسروں کی تنخواہیں اوقاف کی آمدنی سے پوری نہو سکیں تو خزانہ سرکاری سے اُنکو پورا کرے۔ ہر یونیورسٹی کے ماتحت چار کالج ہوتے ہیں ایک کالج مذہبی تعلیم کا۔ ایک کالج قانون کی تعلیم کا۔ ایک کالج طب کی تعلیم کا اور ایک فلسفہ کی تعلیم کا۔ فلسفہ کے کالج میں زبان و علم ادب۔ علوم ریاضیہ۔ علوم طبیعیہ۔ علوم فلسفیہ اور ان تمام علوم کی تعلیم دیجاتی ہے جنکو پیشوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کالجوں میں تعلیم کی مدت عموماً چار سال ہوتی ہے اور اکثر لکچروں کے طریقہ سے تعلیم دیجاتی ہے۔ جو شخص مدارس عالیہ میں پروفیسر ہونا چاہتے اوس کے لئے ضروری ہے کہ کسی یونیورسٹی کی پوری تعلیم حاصل کرچکا ہو اور اوس کی سند اپنے پاس رکھتا ہو۔ ۱۸۷۶ء میں ممالک جرمنی میں کل اکیس یونیورسٹیاں تھیں اور اُن کے کالجوں میں تعلیم پانیوالوں کی تعداد ۱۶۸۵۸ اور پروفیسروں کی تعداد ۱۷۳۴ تھی۔ مگر ہمارے زمانہ میں طلبا کی تعداد میں بے انتہا ترقی ہوگئی ہے۔ غرضکہ جرمنی میں

گورنمنٹ نہا[illegible] کے ساتھ تعلیم کی نگرانی کرتی ہو اور ایسو وسائل ا[illegible] ہے جن سے شائستہ اور لائق مدرس مل سکی[illegible] [illegible]ں قسم کے مدرس ملجاتے ہیں تو اون کو مقر[illegible] [illegible] کے چال چلن کی نگرانی رکھنا، اون کی کا[illegible] [illegible]ں بازپرس کرنا، اون کی تنخواہیں ادا کرنا، انکو [illegible] ملازموں کی طرح پنشن دینا، فوجی خدمت سے [illegible]ن کو آزاد رکھنا یہ سب کام گورنمنٹ کے ہیں۔ مگر [illegible]ئی مدرس مقرر نہیں کیا جاتا جب تک کہ وہ لوتھرین چرچ یا کیتھولک چرچ یا یہودیوں کے مذہب کو نہ مانتا ہو۔

آسٹریا کا نظام تعلیم پروشیا کے نظام تعلیم کے مشابہ ہے مگر اوس میں ملکی حالات کے لحاظ سے بعض تبدیلیاں کرلی گئی ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جدا جدا مدرسے قائم ہیں۔ جو مدرسے مدرسوں اور معلموں کی تعلیم کے لئے ہیں اُن میں سے کسی مدرسہ میں ۷۰ سے زیادہ طالب علم نہیں لئے جاتے۔ اور وہ پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد مدرسہ میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اِن مدرسوں میں وہی طالب علم داخل کئے جاتے ہیں جن کی عمر گیارہ سال کی ہو مگر بعض صوبوں میں ۱۸ سال کی عمر کے طلبا بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے صحت جسمانی اور طبعی اور اخلاقی حالت کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اور اِس بات کا عہد لے لیا جاتا ہے کہ وہ مدرسہ سے نکلکر کم سے کم تین سال تک مدرسی کا پیشہ کریں گے۔ اگر وہ اِس معاہدہ پر دستخط نہ کریں تو اون کو تعلیم کی پوری فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ تعلیم کی مدت معمولاً ۴ سال ہے جس میں طالب علموں کو مذہبی عقلی اور صناعی علموں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ موسیقی تصویر اور ریاضت جسمانی کی تعلیم اور ملکوں کی نسبت جرمنی اور آسٹریا میں اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔

فرانس میں جرمنی کی طرح تمام مدرسے گورنمنٹ کی نگرانی میں ہیں۔ تعلیمات کا افسر اعلیٰ وزیر علوم ہے۔ وزیر علوم اوس کمیٹی کا میر مجلس ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں تمام مدارس کے انتظام کی باگ ہے۔ مدرسے عموماً تین قسم کے ہیں۔ اول ابتدائی مدرسے۔ دوم متوسط مدرسے سوم مدارس عالیہ جن میں اکاڈمی کی قسم کے مدرسے بھی شامل ہیں۔ ہر قصبہ کا فرض ہے کہ ابتدائی تعلیم کے مدرسے قائم کرے اور اون کے اخراجات ادا کرے۔ ضرورت کے وقت اون کو گورنمنٹ بھی مالی امداد دیتی ہے۔ مذہبی تعلیم تمام مدرسوں میں ہوتی ہے مگر کوئی طالب علم اپنے والدین کی مرضی کے خلاف کسی مذہب کی تعلیم نہیں پاسکتا۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ عام اور خاص مدرسوں کے لئے تعلیم کے درجے اور نصاب مقرر کرے۔ اعلیٰ درجہ کے علوم اکاڈمی کی قسم کے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اِس قسم کے مدرسے فرانس میں ۱۵ ہیں۔ یہ مدارس دیگر ممالک کے یونیورسٹی کالجوں کے مقابلہ میں ہیں۔ مگر ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو جرمنی کی یونیورسٹی کالجوں سے درجہ میں کم ہیں۔ اِس قسم کے مدرسوں کے سوا اور مدرسے بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہیں اور یہ سب مدرسے وزیر علوم کی نگرانی میں ہیں۔ مگر خاص خاص فنون کے مدرسے خاص خاص وزرا کے ماتحت ہیں۔ مثلاً زراعت کے مدرسے وزیر زراعت کی نگرانی میں ہیں۔ تجارت اور صنعت و حرفت کے مدرسے وزیر تجارت و صنعت کے ماتحت ہیں۔ حال میں فرانس کے نظام تعلیم میں بہت سا تغیر و تبدل ہوا ہے۔

انگلستان میں مدت دراز تک عام تعلیم کا انتظام مستقل تھا اور اُس میں حکومت کو کچھ دخل نہ تھا نہ تمام مدرسوں کا کوئی عام نظام تھا۔ حکومت نے کوئی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا۔ نہ کسی مدرسہ کی نگرانی اور انتظام

میں وہ دخل دیسکتی تھی۔ مگر مفلسوں کے مدرسے بجز ایسے مدرسے۔ فوجی مدرسے اور جیلخانوں کے مدرسے اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض وقت بعض مدرسوں کو خاص شرائط پر گورنمنٹ کی طرف سے سالانہ یا فوری امداد دیگئی ہے۔ ایسے مدرسوں میں طالب علموں کی حاضری۔ اون کی لیاقت علمی۔ مدرسوں اور معلموں کی لیاقت اور اخلاق کی جانچ کیجاتی تھی اور ہر سال گورنمنٹ کی طرف سے چند افسر مقرر کئے جاتے تھے جو اِن مدرسوں کی حالت کی رپورٹ کرتے تھے۔ [illegible] میں ایک نیا قانون پاس ہوا جس کی رو سے گورنمنٹ نے ایک سالانہ رقم بجٹ میں مقرر کی اور اس سے اون مدرسوں کو مدد دیجاتی تھی جو قصبات میں ابتدائی تعلیم کیلئے قائم ہوتے تھے اور جن کے قیام و انتظام کے لئے کافی روپیہ اون مدرسوں کے قائم کرنے والوں کے پاس نہ ہوتا تھا اس امداد کے لئے خاص خاص شرطیں قائم کی گئیں۔ انگلستان میں اکسفورڈ کیمبرج۔ ڈرہم اور لنڈن کے نام سے چار یونیورسٹیاں ہیں۔ اسکاٹلنڈ میں گلاسکو اور ابرڈین کے نام سے دو یونیورسٹیاں۔ آئرلنڈ میں ایک یونیورسٹی ہے جو ڈبلن یونیورسٹی کہلاتی ہے انگلستان میں [illegible] میں جو روپیہ تعلیم کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے خرچ کیا گیا اوس کی مقدار ۳۰۳۴۰ پونڈ تھی مگر اس کے بعد اس مقدار میں بہت اضافہ ہوگیا۔

اضلاع متحدۂ امریکا میں ہر صوبہ کا نظام تعلیم بلحاظ مقامی حالات کے جدا ہے مگر عام طور پر ایک ہی مشترک طریقہ اون کے انتظامات کا ہے مجمل طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ امریکا میں بہ نسبت دیگر ممالک کے تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور بلحاظ حالت کے اُس کا درجہ بھی بہت اعلیٰ ہے۔ آئندہ بشرط فرصت ہم ہندوستان کے نظام تعلیم

پر بحث کریں گے اور دکھائیں گے کہ اوس میں اور مہذب ملکوں کے نظام تعلیم میں کیا فرق ہے اور جو نقص اِس نظام میں ہیں اون کو ظاہر کرنیکے بعد ہم اون کی اصلاح کی تدبیریں بھی بتائیں گے۔ واللہ الموفق والمعین۔

(عبدالعلی خاں)

کیا بچانا اور خرچ کرنا ایک ہی بات ہے؟

کوئی باپ ایسا نہ ہوگا جو اپنے اوپر یہ فرض نہ جانتا ہوگا کہ میں اپنے بچوں کو میانہ روی اور خوش نظمی نہ سکھاؤں اور حزم اور احتیاط کی عادت نہ ڈلواؤں اور روپیہ کے خرچ کرنے میں اعتدال نہ بتلاؤں۔ نہ کوئی مذہب ایسا ہوگا جو بیجا نمود و نمایش اور تعیش و تنعم پر گرج کڑک کر اپنی بجلی نہ گراتا ہو۔ باوجود اِس کے اگر عوام کی باتیں سنیئے تو وہ یہ کہتے ہیں۔

(ا) تھیلیوں میں روپیہ جمع کرنا خلقت کی رگوں میں خون خشک کرنا ہے۔

(ب) بڑے آدمیوں کے تعیش سے چھوٹے آدمیوں کو فارغ البالی حاصل ہوتی ہے۔

(ج) مُسرف اپنے تئیں تباہ کرتے ہیں مگر گورنمنٹ کو نہال کرتے ہیں۔

(د) دولتمندوں کی فضول خرچی سے غریبوں کو روٹیاں ملتی ہیں۔

پس محاسنِ اخلاق و معاشرت کے خیالات میں یہ عجیب تناقض ہے۔ جب نوع بشری میں متضاد میلان نمایاں ہوتے ہیں تو اون کی کشمکش میں عاقلوں کی عقل چکر میں آجاتی ہے۔ اگر کفایت شعاری کی افراط ہو تو بخل پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر اسراف کی افراط ہوا تو اخلاق ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہیں۔ خیر یہ ہر کسی کو اپنے کے متعلق

کفایت شعاری اور فضول خرچی کی صورتوں کو بگاڑ کے دکھلاتے ہیں۔ اون کے قریب کے نتیجے جو دکھائی دیتے ہیں انکی بعید کے نتیجوں کو جو نظر سے چھپے رہتے ہیں کسوف کرتے ہیں۔ ہم اس کسوف سے اون کو نکال کر دکھاتے ہیں ✦

دو سگے بھائی شمس الدین اور بدرالدین تھے جن میں ہر ایک کو باپ سے ورثہ میں پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ملی۔ شمس الدین نے روپیہ اوڑانا شروع کیا۔ ہر سال میں چند دفعہ اسباب بدل کر نیا بنایا۔ ہر مہینے میں لباس میں تراش خراش، سواری میں وضع جدید پیدا کی۔ اہل وطن پر شفقت و مکرمت کی۔ آدمیوں نے بھی اوس کی تعریف شروع کی کہ وہ دوسرا حاتم پیدا ہوا ہے۔ سوائے سخاوت کے اوس میں ایجاد کی بڑی قوت و استعداد ہے۔ دیکھو وہ کیا کیا باتیں آسایش وآرایش کی اختراع کرتا ہے۔ غرضکہ ہر شخص اوس کی تعریف کے گیت گاتا ہے اور دعائیں دیتا ہے کہ خدا اوس کو ہمیشہ شاد آباد رکھے۔ وہ بندگان خدا کے حق میں رحمت الٰہی ہے اور کاریگروں کیلئے فضل خدا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ عیش و نشاط میں گلچھرے اوڑاتا ہے اور پاس کے بیٹھنے والونکا دامن آلودہ کرتا ہے، جس کے سبب سے اوس کی قدر ومنزلت وانسانیت میں کچھ تھوڑا سا فرق آتا ہے مگر اوس کی خیر رسانی کے مقابلے میں وہ کچھ نہیں ہے اس لئے کہ وہ گو اپنے ساتھ بھلائی نہ کرتا ہو مگر اپنی دولت سے اوروں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ روپیہ گول اس لئے بنایا گیا ہے کہ ہمیشہ لڑھکتا رہے اس لئے وہ ہمیشہ روپیہ کو چکر اور گردش میں رکھتا ہے۔ کوئی تاجر، سوداگر، پیشہ ور اور اہل حرفہ اوس کے پاس نہیں آتا جس کو وہ روپیہ دیکر خوش و خرم نہ کرتا ہو

اب بدرالدین کا حال سنیئے کہ اوس نے اپنے بھائی سے جداگانہ ہی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ گو وہ خود فروش نہ تھا مگر ایک شخصیت ضرور رکھتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے خرچ پر خیال رکھتا تھا اور اوس کو حد اعتدال سے آگے بڑھنے نہ دیتا تھا۔ معقول و معتدل احظاظ سے محظوظ ہوتا تھا۔ اپنے بچوں کی ثروت و تونگری کا بھی دھیان رکھتا تھا۔ غرضکہ ہر طرح سے وہ اپنے روپیہ کا نیک منتظم تھا۔ اب سنیئے کہ لوگ اوس کو کیا کہتے تھے لوگوں میں اوس کی نسبت یہی چرچا تھا کہ وہ بڑا کنجوس منحوس اور مکھی چوس ہے۔ ایسے مالدار کا جس سے کسی کو فائدہ نہ پہونچے، معدوم و موجود ہونا برابر ہے نہ اوس کے مکان میں رونق ہے۔ نہ گہما گہمی ہے۔ اوس کی سادہ وضعی وانسانیت۔ سخاوت و فیاضی اگر کچھ ہو تو لوگوں کو بڑا دھوکا دیتی ہے۔ وہ تو ساری کام حساب کرکے کرتا ہے۔ وہ اپنی آمدنی کو خرچ نہیں کرتا ہے۔ اوس سے نہ کسی گاڑی بنانیوالیکو، نہ گھوڑے بیچنے والے کو، نہ حلوائی اور مٹھائی بیچنے والیکو نہ مکانوں کی آرایش وزیبایش دینے والے کو فائدہ ہوتا ہے۔

یہ رائیں جو حسن اخلاق کے حق میں زہر قاتل ہیں یوں پیدا ہوتی ہیں کہ مسرف کے خرچ تو ظاہرا آنکھوں کو دکھائی دیتے ہیں اور منتظم کفایت شعار کے خرچ نگاہ کے روبرو نہیں ہوتے۔ گو کہ وہ مسرف کے خرچ سے برابر کیا بلکہ زیادہ تر بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ معاشرت انسانی کا موجد حقیقی ہے۔ اوس نے چیزوں کو ایسی خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے کہ ہر بات میں پولیٹکل اکانومی (نظام ملک) اور حسن اخلاق میں اختلاف نہیں ہے بلکہ اتفاق تمام ہے۔ بدرالدین کی دانائی صرف شان ہی بلند نہیں رکھتی بلکہ وہ بہت زیادہ نافع و مفید بہ نسبت شمس الدین

کی حماقت سے ہی۔ میرا مفید و نافع کہنا اِس معنی کو نہیں ہے کہ بدرالدین یا اوس کی سوسائٹی کے حق میں نافع و مفید ہی بلکہ اِس سے مُراد میری یہ ہی کہ وہ زیادہ تر کاریگروں سوداگروں اور پیشہ وروں کے لئے نافع و مفید ہی۔

اب میں اس بات کے ثابت کرنیکے لئے افعال انسانی کے مخفی نتایج پر نظر کرتا ہوں جو اِن جسمانی آنکھوں سے نظر نہیں آتے بلکہ وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آتی ہیں۔

شمس الدین کی اسراف کے آثار اپنے تئیں آپ دکھاتے ہیں۔ اس کے لنڈو فٹن۔ چرٹ۔ مکان کی آرایش و زیبایش۔ اُس کی ساری چیزوں کا زرق برق ہونا ہر شخص دیکھتا ہی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ اوس کے گھوڑے گھڑ دوڑ میں خوب دوڑتے ہیں۔ ضیافتیں پُر تکلف اور دعوتیں دھوم دھام کی کرتا ہی۔ فیاضی میں مشہور ہے۔ اپنی آمدنی میں سے کوڑی نہیں بچاتا۔ شاید اصل سرمایہ میں سے بھی کچھ خرچ کر ڈالتا ہی۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو آنکھوں سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر اس بات کا دریافت کرنا آسان نہیں کہ بدرالدین کی آمدنی میں سے کاریگروں، مزدوروں اور پیشہ وروں کو کس قدر فایدہ حاصل ہوتا ہی۔ اگر ہم زیادہ توجہ کرکے اوس کا سُراغ لگائیں، تو یہ معلوم ہوگا کہ اوس کی آمدنی کا ایک حبہ بھی ایسا نہیں، جو محنتیوں، مزدوروں کے کام میں ایسا ہی یقینی کام میں نہ آتا ہو جیسا کہ شمس الدین کی دولت کا۔ مگر اِس میں فرق اتنا ہی کہ شمس الدین کی بیہودہ فضول خرچیاں ہمیشہ گھٹتی رہتی ہیں اور آخر کو یقینی اون کا خاتمہ ہو جاتا ہی، مگر بدرالدین کا خرچ دانشمندانہ سال بسال بڑھتا رہتا ہی جس سے عام نفع رسانی ہوتی ہی اور جو عین حسن اخلاق ہی۔

بدرالدین اپنے گھر کے خرچ میں بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتا ہی۔ اگر وہ اِسقدر خرچ پر قناعت نہ کرے، تو پھر اوس کو دانشمند کہنا نادانی ہی۔ وہ غربا و مساکین کے گروہوں کی مصائب دیکھکر کڑھتا ہی اور اون کے ساتھ سلوک کرنیکو اپنا ایمان جانتا ہی۔ دس ہزار روپیہ اون کو خیرات دیتا ہے۔ یہ اوس کی فیاضی ہی۔ اہلِ تجارت۔ اہلِ صناعت اور اہلِ زراعت جن میں بہت سے اوس کے دوست ہیں، جب اون میں سے کوئی چندروزہ مشکلات کے سبب سے کسی بلا میں مبتلا ہوتا ہی، تو وہ اون کی امداد باحتیاط ایسی کرتا ہی کہ وہ موثر ہوتی ہی۔ اِس کام میں بھی وہ دس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتا ہی۔ وہ اپنی اولاد کو بھی بھولتا نہیں۔ اون کے لئے اپنے بعد سرمایہ چھوڑنا اپنا فرض سمجھتا ہی اور اِس فرض کے ادا کرنے کیواسطے ہر سال دس ہزار روپیہ سود پہ چلاتا ہی۔ غرض کہ اوس کے سالانہ خرچ کی مدات بہ تفصیل ذیل ہیں۔

(اوّل) ذاتی اخراجات بیس ہزار روپیہ۔

(دوم) خیرات کا خرچ۔ دس ہزار روپیہ۔

(سوم) احباب کیساتھ دوستانہ سلوک۔ دس ہزار روپیہ

(چہارم) بچت۔ دس ہزار روپیہ۔

اب اِن مدات میں سے ہر ایک مد کا ہم امتحان کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ اوس کی آمدنی کا ایک آنہ بھی ایسا نہیں، جو قومی محنت کیلئے نہ صرف ہوتا ہو۔

(اوّل) ذاتی اخراجات۔ اِس مد کو جہاں تک تاجروں اور پیشہ وروں سے تعلق ہی اُس کا اثر بعینہٖ وہی ہی جو شمس الدین کی رقم مساوی بیس ہزار روپیہ کے خرچ کرنے کا۔ یہ امر ایسا بدیہی ہی کہ اوس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(دوم) خیرات کا خرچ۔ خیرات میں بدرالدین جو دس ہزار روپیہ دیتا ہی، وہ اوس سے سوداگروں، پیشہ وروں اور اہلِ حرفہ کو فائدہ پہنچاتا ہی۔ یہ روپیہ بدھئیوں، نانبائیوں، درزیوں وغیرہ پیشہ وروں کے ہاتھ میں جاتا ہی لیکن اِتنی یہ بات ہی کہ روٹی، گوشت، کپڑا وغیرہ بدرالدین کے خود کام میں نہیں آتا بلکہ اون آدمیوں کے کام میں آتا ہی، جن کو اوسنے خیرات دیکر اپنا قائم مقام بنایا ہی۔ اِس بات سے

تجارت میں کچھ فرق نہیں آتا کہ وہ اپنا قائم مقام دوسرے آدمی کو بناتا ہے۔ یہ ایک ہی بات ہے کہ بدرالدین خواہ اپنے ہاتھ سے ایک اشرفی خرچ کرے یا اوس کو دیکر دوسرے کے ہاتھ سے خرچ کرائے۔

(سوم) احباب کیساتھ دوستانہ سلوک۔ بدرالدین نے دوست کو دس ہزار روپیہ قرض حسنہ دیا یا بالکل تو یہ دوست اوس روپیہ کو لیکر زمین میں تو دفن کرنے کا لئے کہ اوس نے تو اپنی مصیبت کے رفع کرنے کیلئے احسان اوٹھایا ہے۔ وہ یا تو اِس روپیہ کو اسباب کی قیمت میں کام میں لائیگا۔ یا اوس سے اپنا قرض چکائے گا صورت میں اسباب کی قیمت دینے سے تجارت اور پیشوں کی ہوگی۔ کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ شمس الدین جو ایک نجیب اور اصیل گھوڑے کی خریدنے میں دس ہزار روپیہ خرچ کرتا ہے' اوس میں زیادہ فائدہ ہے' بہ نسبت اس کے کہ بدرالدین روپے کا مال خرید کر یا کسی اپنے دوست سے خرید کرائے۔ صورت میں ایک تیسرے شخص قرضخواہ کا قدم درمیان میں آتا ہے' جو اس روپے کو لیکر اپنے پیشہ میں یا گھر کے خرچ میں یا زراعت وغیرہ میں خرچ کرتا ہے اور وہ اس طرح بدرالدین اور کاریگروں کے درمیان متوسط بنتا ہے۔ صرف نام بدل جانے سے کچھ فرق نہیں آتا خرچ وہی رہتے جن سے تجارت و صنعت کو بہر حال مدد ہوتی ہے۔

(چہارم) بچت۔ دس ہزار روپے کے پس انداز کرنے سے بدرالدین کا درجہ بہ نسبت شمس الدین کے تجارت محنت صنعت اور کاریگروں کی امداد کے لحاظ سے البتہ پست پست معلوم ہوتا ہے گو کہ وہ اخلاق کے اعتبار سے شمس الدین پر کسی قدر فوقیت رکھتا ہے۔ جب میرے سامنے ایسی صورتیں پیش ہوتی ہیں جن میں فطرت کے قوانین نظم میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تو میرا دل بے چین ہوجاتا ہے ایک فریق تو فائدوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ دوسرا فریق نیز کا شمس کو گزند دیتا سو اوہان دونوں فریقوں میں ایک فریق کے پسند کرنے میں آدمی مجبور ہو تو آئندہ کیلئے کوئی امید صلاح و فلاح کی نہیں رہتی' مگر یہ بات خوشی کی ہے کہ یہاں ایسی کیفیت نہیں ہے۔ یہاں مقولہ بالکل سچا ثابت ہوتا ہے "کہ بچانا خرچ کرنا ہے" گو کہ وہ بظاہر بعید القیاس معلوم ہوتا ہے۔

اب سنو کہ اس دس ہزار روپے کے بچانے سے بدرالدین کا مقصود کیا تھا۔ اوس کا یہ مطلب تو تھا نہیں کہ وہ اِس روپیہ کو بچا کر اپنے باغ میں زمین کھود کر دفن کردے۔ اور "برای نہادن چہ سنگ و چہ زر" کا مصداق بنے بلکہ یقینی اوس کی یہ غرض تھی کہ اپنے سرمایہ اور آمدنی کو بڑھائے پس بجائے اس کے کہ وہ اپنی خواہش ہائے نفسانی کی خوشیوں میں خرچ کرتا' اوس کو مکان یا زمین کی خرید میں خرچ کرتا ہے' یا کسی سوداگر یا بنکر (مہاجن) کو دیتا ہے۔ اِن صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں روپیہ کی پیش روی کی پیروی کرو' تو تم کو یقین ہوجائیگا کہ جیسے اوس کے بھائی شمس الدین نے اسباب خانہ اور جواہر اور گھوڑوں کے خرید کرنے سے محنت اور صنعت کی امداد کی تھی' ویسے ہی بدرالدین نے بیچنے والوں اور قرض دینے والوں کی معرفت محنت اور صنعت کی امداد کی۔ جب بدرالدین اراضی یا مکانات دس ہزار روپے کو خریدتا ہے' تو اپنے نزدیک خوب سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اس روپے کے خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سبب ہے کہ تم اوس پر الزام لگاتے ہو مگر تم کو اوس کے ساتھ ہی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص اراضی یا مکان اوس کے ہاتھ بیچتا ہے' وہ اپنا یہ ارادہ مصمم کرلیتا ہے کہ وہ اِس دس ہزار روپے کو کسی نہ کسی اپنے مصرف میں لائیگا پس بہر نہج یہ روپیہ خرچ میں آتا ہے۔ خواہ اوسکو بدرالدین خرچ کرے یا بجائے اوس کے اور اشخاص خرچ کریں مگر کاریگروں کی محنت کی امداد کے لحاظ سے بدرالدین اور شمس الدین کے طریقوں میں یہ فرق ہے کہ شمس الدین تو روپے کو اپنے اس پاس اور ارد گرد خرچ کرتا ہے۔ اس لئے اوس کا اثر دیکھنے

میں آتا ہے۔ بدرالدین اپنی دولت کا ایک حصہ غیروں کو توسط بناکر اپنے سے فاصلہ پر خرچ کرتا ہے اس لئے وہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ حقیقت شناس جو علتوں اور معلولوں کو یا سببوں اور اثروں کو صحیح صحیح جانتے ہیں، وہ ان دونوں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کو ایک ہی تصور کرتے ہیں۔ نفس الامر میں یہ ثابت ہوا ہے کہ دونوں صورتوں میں روپیہ کا دوران ہوتا ہے دانشمند کے روپیہ کے صندوق میں بہ نسبت مسرف کے صندوق کے روپیہ زیادہ دیر تک مقید نہیں رہتا پس یہ کہنا جھوٹ ہے کہ کفایت شعاری واقتصاد سے تجارت اور پیشہ کو نقصان پہنچتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ میانہ روی تو ایسی چیز ہے کہ اگر تنعم و تعیش بھی اوس کے ساتھ ہو تو تجارت اور پیشہ کو نفع پہنچتا ہے۔

اب دس سال گذرنے دیجئے، پھر دیکھیے کہ شمس الدین کی دولت کہاں اڑ جاتی ہے۔ اوس کے ہر دلعزیز ہونے کی کیا نوبت ہوتی ہے۔ وہ پچاس ہزار روپیہ جس سوسائٹی میں خرچ کرتا تھا، اب وہی سوسائٹی کا بار خاطر ہو جاتا ہے۔ نہ آپ اوس سے دوکاندار خوش ہوتے ہیں۔ نہ اب وہ ہنر اور پیشہ صنعت اور حرفہ کا مربی سمجھا جاتا ہے۔ نہ کاریگروں کو اوس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ کوئی اوس کا قائم مقام ہوتا ہے جو اہل صنعت و حرفت کو اوس کی طرح امداد دے کیونکہ اوس نے تو اون کو خود فقیر و محتاج بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف ان دس سال میں بدرالدین کی حالت کو دیکھیے کہ وہ صرف اپنی آمدنی ہی کو دوران میں نہیں رکھتا بلکہ اوس کو جمع کر کے سال بسال اپنے خرچوں کو بھی بڑھاتا ہے۔ وہ قومی سرمایہ یعنی اجرتوں کے فنڈ کو زیادہ کرتا ہے جس کی افزائش پر بہت سے محنتیوں اور مزدوروں کے ہاتھوں کی مانگ منحصر ہوتی ہے۔ وہ کاریگروں کی مزدوریوں کو برابر بڑھاتا جاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو اپنی اولاد ایسی چھوڑ جاتا ہے جو اوس کے طریقہ پر چلکر شائستگی اور تہذیب کو بڑھاتی ہے اور قومی دولت کے دائرہ کو وسیع کرتی ہے۔ پس علم اخلاق کے اعتبار سے اسراف اور فضول خرچی پر کفایت شعاری اور میانہ روی کو اوسی طرح فوقیت ہے جس طرح کہ پولیٹکل اکانومی کے اعتبار سے۔

(ذکاء اللہ)

گھر کے اندر ہم کیونکر خوش رہ سکتے ہیں؟

ایک دفعہ سبیل تذکرہ ہمارے مخدوم جناب مولوی حمید اللہ خان صاحب سلیم نے ایک انگریزی کتاب کا جو علم اخلاق میں بہت مقبول خیال کیجاتی ہے، نام لیا اور فرمایا کہ اگر اوس کے بعض مقامات ترجمہ اردو میں شائع کیا جاوے تو از بس مفید ہوگا۔ اون کا یہ خیال نہایت صحیح ہے کہ جن مضامین سے صرف ہماری معلومات کو وسعت ہوتی ہے وہ اس قدر مفید نہیں ہیں جتنے کہ اخلاقی مضامین جن سے غرض کرنیوالوں کو یورپ اور ایشیا کے اصول اخلاق یکساں یا بہت کچھ ملتے جلتے نظر آئیں سکے"۔ اس علم کا ہماری یہاں کافی ذخیرہ موجود ہے مگر یہ یورپین تحفہ ہمارے انگریزی دان احباب کو زیادہ پسند ہوگا لہذا ذیل کا مضمون اس امید پر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم کو واقعی خلیق بننے کا شوق پیدا ہو، نہ یہ کہ فرضی اور نمائشی مہذب بنکر نہ سچے ہندوستانی رہیں اور نہ اصلی یورپین قرار دیے جاسکیں +

گھر میں اوسی وقت خوشی اور خرمی نظر آسکتی ہے جبکہ ہر متنفس ضابط اور متحمل ہو۔ اگر ہر ایک شخص یہی چاہے کہ میرا ہی کہنا ہو، میرا ہی سب خیال کریں تو ممکن نہیں کہ ایسے گھر میں امن چین ہو۔ ایک دفعہ غصہ کرنے سے سب کام درہم برہم ہو جاتے ہیں اور سب گھر والے افسردہ اور پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ جس گھر کے لڑکے بردبار ہوتے ہیں، بلا سوچے سمجھے بول نہیں اٹھتے نہ چین بچین رہتے ہیں، نہ سخت بات کا سخت جواب دیتے ہیں وہاں سب مطمئن رہتے ہیں اور ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے۔ گھر میں اگر ایک ہی میٹھی زبان بولتا ہے تو اوس کے سبب کر کام نہیں بگڑتا جیسے کہ جلسے کا ایک عمدہ گویا اور وں کو بے سرا نہیں ہونے دیتا۔ گھر سے باہر کوئی وجہ بھی آزردگی اور دل شکنی کی پیدا ہوئی ہو مگر گھر میں گھستے ہی سب کی ہنسی خوشی کو

ملنا چاہیے۔ لوگوں کو اصول اخلاق کی ایسی پابندی چاہیے کہ نظر نیچا نہ اوٹھے اور زبان پر مُہر سکوت ہو۔ چڑھی ہوئی تیوری اور بے لگام زبان سے خدا محفوظ رکھے! جوانوں کا عموماً شیوہ ہوتا ہے کہ وہ "شیخی اور "منم" کے خیال سے دوسروں پر آوازے کستے اور پھبتیاں اوڑاتے ہیں۔ یہ بڑا نقص ہے جس کا دور کرنا مشکل کام ہے۔ یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ زبان کا زخم بہت دیر میں مندمل ہوتا ہے۔

اگر زبان سے کوئی ایسی بات نکلا چاہتی ہو جو دوسرے کے دل کو دُکھائے تو اوّل یہ بات سوچ لینی ضرور ہے کہ اوس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ایک دانشمند کا مقولہ ہے کہ "ایسی بات کہنے سے چپ رہنا بہتر ہے۔ نہ یہ کہ غصہ میں تلخ بات کہکر بنی بنائی بات کو بگاڑ دو اور عمدہ کھانے کی قاب پر بڑا مسالہ چھڑک کر ساری قاب کو بدمزہ کر دو"۔ بعض گھروں میں یہ بُرا رویہ دیکھنے میں آتا ہے کہ سب ایک دوسرے کی نکتہ چینی اور عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ایک کی زبان سے اتفاقیہ کوئی سخت بات نکلجاوے تو دوسرا اوس سے بڑھکر ترش جواب دیتا ہے اور غیر اور اجنبی لوگوں کے سامنے بھی ہرگز زبان کو لگام نہیں دیجاتی۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس بُری عادت سے خانہ داری کی خوشیاں مفقود ہو جاتی ہیں۔ کارلائل صاحب فرماتے ہیں کہ "طنز آمیز کسی کو بات کہنا شیطان کا خاصہ ہے لہذا میں نے بہت عرصہ سے ترک کر دیا ہے"۔ علامہ جانسن اسی بات کو اپنے طرز میں یوں ادا کرتے ہیں کہ "ہر شخص کو نازیبا بات کہنے کا اوتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ اوس کے کرنے کا اور بیہودہ بکنا ایسا ہے جیسا کہ دوسرے کو گرا دینا"۔ ترش روئی بھی ایسی ہی ضرر رساں ہے جیسی کہ بدمزاجی اور سخت کلامی۔ نہ صرف زبان ہی کو اپنے قابو میں رکھنا چاہیے بلکہ غصہ اور جوش کو روکنا بھی ضروری ہے۔ خود بینی۔ حسد۔ بغض اور تنگ مزاجی کی بھی روک تھام چاہیے کیونکہ بدمزاجی انہیں کا عکس ہے غرضکہ اپنی طبیعت کو قابو میں رکھنے کا نام تحمل ہے۔ اصلی نیک مزاجی جو فطرتی نیک نیتی سے ایک جدا شے ہے فراخ حوصلگی اور بے لوث طبیعت

نتیجہ ہے۔ چیس ہل صاحب فرماتے ہیں کہ "میں منصف مزاج سچا صاف دل اور ہمدرد انسان بننے کی کوشش کرتا ہوں اور جن سے خدا نے مجھے قرابت قریبہ عطا کی ہے اون سے شفقت سے پیش آتا ہوں"۔ اسی کام کا نام ضبط اور تحمل ہے۔ ہر عقلمند کے مزاج کے عناصر انصاف۔ صداقت اور خلوص ہوتے ہیں اور اگر عزیزوں کی محبت بھی اُس میں اضافہ کر دیجاوے تو گھر میں چین ہی چین نظر آتا ہے۔ ہم کو مصیبت بھی برداشت کرنی چاہیے دوسرے کے اعتراض بھی جھیلنے چاہئیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی دلجوئی اور انصاف اور حق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ نرم دل ہونا بھی لازمی ہے۔ جان ہیپ ڈن کی طرح ہمارے ولولے اور جذبات بالکل ہمارے قابو میں ہوں۔ ولنگٹن کی فتح کا گر اوس کا حیرت انگیز تحمل تھا اور نپولین کی شکست کی بین وجہ اوس کا مغلوب الغضب ہونا۔ خانگی برتاؤ میں مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان بھائی اور بہن کے درمیان تحمل کا ہونا لابدی ہے اور اسی سے ہر مشکل حل ہوتی ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جس سے مختلف المزاج اشیا خلط ملط ہو کر ایک مفید اور دلپسند شے بن جاتی ہیں"۔ اسپنسر کا قول ہے کہ تحمل انسانیت کا کمال ہے۔ تعلیم اور بالخصوص اخلاقی تعلیم کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان ذرا ذرا سی بات میں بھڑک نہ اوٹھے اور نہ کسی خواہش کے پیدا ہونے پر گھبرایا ہوا پھرے بلکہ طبیعت کو اعتدال پر رکھکر اپنے کل جذبات کے حسن و قبح پر نظر کرکے صحیح رائے قائم کرے"۔

سر والٹر اسکاٹ سے بڑھکر ان خوبیوں کا کوئی دوسرا پابند نہ تھا اور نہ کسی دوسرے کو اوس سے بڑھکر خانگی مسرت نصیب ہوئی۔ اپنے دوستوں۔ اولاد۔ اور بی بی کے ساتھ اُسکا یکساں برتاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ انصاف کرتا۔ دوسروں کا خیال رکھتا۔ سب سے محبت اور نرمی سے پیش آتا۔ اوسے کیسا ہی رنج اور تردد کیوں نہو تاہم گھر میں قدم رکھتے ہی وہ سب کو بھول جاتا۔ اوس کے گھر والوں کو اوس کے رنج اور فکر کا خمیازہ اوٹھانا نہ پڑتا اور وہ اون کی دلبستگی مقدم جانتا اوسے بیٹے یا بہائی! ..... یہ ... بنا ..... باپ

ہونیکے خیال سے اوس پر تقلرڈالو وہ ہر حالت میں فردِ کامل تھا۔ لاک ہارٹ جس نے اوس کی لائف لکھی ہو بیان کرتا ہے کہ اوس کے دفن کرنیکے بعد شام کو جب اوس کی میز کھولی گئی تو بہت سی چھوٹی چھوٹی نشانیاں اِس ترتیب سے رکھی ہوئی ملیں کہ روزانہ میز کھلتے ہی اوس کی نظر اوّل اونہیں پر پڑا کرے۔ پُرانی وضع کی ڈبیاں جو اسکاٹ کی بیماری کے زمانہ میں جبکہ وہ اپنی ماں کے سنگار کے کمرہ میں سویا کرتا تھا رکھی رہتی تھیں۔ چاندی کا وہ شمعدان جو اوّل محنتانہ کی آمدنی سے اسکاٹ نے اپنی ماں کیلئے خریدا تھا۔ چند پیکٹ جن میں اوسکی ماں نے اپنے مُردہ بچوں کے بال بطور نشانی رکھ چھوڑے تھے اور ہر ایک کے اوپر اپنے قلم سے کچھ لکھدیا تھا۔ اوس کے باپ کی گلاس رکھنے کی ڈبیا وغیرہ وغیرہ چیزیں تھیں۔ اوسکے حالات میں بہت سے ایسے پُراثر واقعات ہیں جنسے اُسکی محبت کی وسعت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اُن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیسا ضابط شخص تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے اوس کی محبت، امن اور خانہ داری کی ترتیب میں کوئی فرق پڑے۔

(سخاوت حسین)

آثار العجم

(۵)

بقیۂ تخت جمشید

دروازۂ زرکسیس ان مرقع جات کی سیر کے بعد ایک شکستہ دروازہ نظر پڑتا ہے جو دروازۂ زرکسیس کے نام سے مشہور ہے۔ اوس کے بعض حصے قائم ہیں اور بڑا حصہ تلف ہو چکا ہے۔ یہ صدر دروازہ قلعہ کا تھا جس کے محاذی کئی عمارتیں تھیں، لیکن اب دو ایک مدوّر ستون اور دو دیواریں باقی ہیں جنپر یہ دروازہ قائم تھا۔ اور نقشہ ان دیواروں کا یہ ہے کہ ابتدائی حصہ میں ایک تصویر ہے جسمیں صرف چہرہ انسان کا ہے اور باقی ڈھڑ بیل کا ہے، جس کو اپنی اصطلاح میں عجم "فیل کرگدن" کہتے ہیں۔ اِس تصویر کے دونوں جزو اعلیٰ درجہ کی صنعت ظاہر کرتے ہیں، یعنی چہرہ سے شاہانہ جاہ و جلال برستا ہے، سر پر مرصع تاج ہے، داڑھی کے بال موتیوں سے گوندھے ہوئے ہیں۔ اِسی طرح بیل کی دُم سجائی گئی ہے اور وہ نہایت شان سے دوڑتا چلا جا رہا ہے۔

بانی پرسی پولیس نے جو کُتابہ لگایا ہے اوس میں یہ نہیں لکھا کہ کس وجہ سے اِس قسم کی دیواریں بنائی گئی ہیں، لیکن سیاحوں کا خیال ہے کہ محض خوبصورتی کیلئے یہ فیشن اختیار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ ایک خاص مذہبی علامت ہے۔ چنانچہ مختلف رایوں کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مصر۔ شام۔ ہندوستان میں گائے کی پرستش کیجاتی ہے۔ شاید ایران میں بھی اوس وقت یہ جانور مقدس مانا جاتا ہو۔

(۲) زردشت کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے گائے نے جنم لیا ہے اور پھر ساری مخلوق اُس سے پیدا ہوئی ہے۔

(۳) یہ علامت حضرت نوح علیہ السلام کی ہے جو آدم ثانی ہیں اور جن کی ذات سے نظام عالم از سرِ نو مرتب ہوا ہے۔

(۴) یہ نشان گیومرث یا گیومرد (مرکب از لفظ گاؤ و مرد) کا ہے۔ جو سب سے پہلا پادشاہ طبقۂ پیشدادیان کا ہے۔

(۵) بغیر کسی خاص خیال کے اہل عجم نے اسیریا والوں کی عمارت کی نقل کی ہے۔

ف زرکسیس کا زمانہ ۴۶۵ برس قبل سنہ عیسوی کا تھا۔ یہ گشتاسپ کا بیٹا تھا اسکی ماں کا نام عطوسہ شاہ خسرو کی بیٹی تھی۔ اسکے عہد سلطنت میں یونانیوں سے مقام تھرموپلی

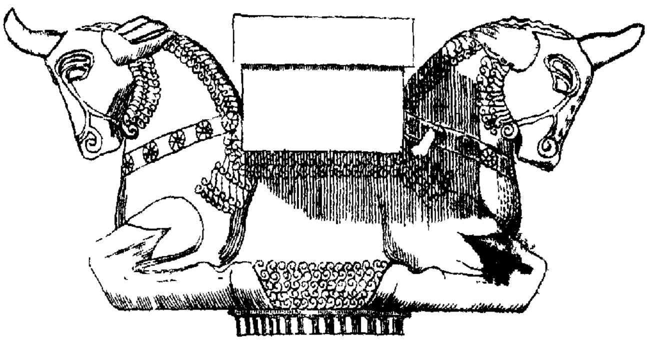
ئی ہے۔ ناظرین اس شعر کے مطابق فیصلہ کرلیں۔ ؎

سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنا اپنے طور پر سامع
اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

کی مینار مذکورۂ بالا عجائبات کی سیر کے بعد سیاح کی نظر محل مینار کے کھنڈرات پر پڑتی ہے۔ جس کی خوبصورتی شرقی ممالک میں مشہور تھی۔ لیکن آج تخمینی کے تیرہ[۱۳] میناروں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ مینار سے مختلف وضع اور طرز کے ہیں۔ جنکی باریکیوں کو صرف ماہرین فن سمجھ سکتے ہیں۔ بعض مینار کئی کئی ٹکڑے کے ہیں اور اون کی درز بندی اس صنعت سے کیگئی ہے کہ کسی مقام سے بال برابر جوڑ نظر نہیں آتا ہے چنانچہ بطور نمونہ ایک مینار کا بالائی حصہ ذیل کی تصویر میں بغرض ملاحظہ پیش کیا جاتا ہے۔

نام سیاح	سنہ	تعداد مینار	بلندی
ڈلی لاوالی	۱۶۲۱	۲۵	۶۰ فیٹ
ہربرٹ / اولی اریس	۱۶۲۷ / ۱۶۳۰	۱۹	″
کمفر / نیبر	۱۶۹۶ / ۱۷۶۵	۱۷	″
سر کر پورٹر	۱۸۲۱	۱۵	″
لفٹنٹ الگزنڈر / کاؤس جی ونشاجی	۱۸۲۶ / ۱۸۶۸	۱۳	″

۱۸۶۸ء کے بعد کا کوئی سفرنامہ ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن یقین ہے کہ یہ ۱۳ مینارے قائم ہوں گے اور اللہ کرے کہ



شاہان عجم کی یہ یادگار زمانۂ دراز تک قائم رہے۔

فہرست مذکورۂ بالا میں بجز یورپین سیاحوں یا ایک اولوالعزم پارسی کے افسوس ہے کہ دوسری قوم کے سیاح کا نام نہیں ہے اور سب سے بڑھکر یہ افسوس ہے کہ سفرنامجات میں ہندوستان کے کسی مسلمان سیاح کا نام نہیں ملتا جس نے سیاحت ایران کے ضمن میں تخت جمشید کی سیر سے حظ اوٹھایا ہو۔

ہمارے قومی تنزل کے اسباب میں یہ بھی ایک اہم باعث اور سبب ہے کہ مسلمانوں نے سیر و سیاحت کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ جس کی اون کو مذہب نے اجازت دی تھی۔ سفر کا منشاء صرف تجارت ہی نہ تھا بلکہ ملک گیری، علمی تحقیقات،

ان میناروں کی درز بندی میں اگرچہ سنگ موسیٰ سے زیادہ کام لیا ہے لیکن بعض بعض میں زرد رنگ کا مصالحہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ باوجودیکہ دو ہزار برس سے زیادہ اون کی عمر ہوگئی ہے مگر آجتک کسی گردش سے کوئی فرق سنگ میں نہیں آیا ہے۔ زمانۂ حال کے انجینیر سنگ کی ماہیت کو جانچیں اور غور کریں۔

چونکہ ان میناروں کی تعداد گردش لیل و نہار سے روز بروز کم ہوتی جاتی ہے لہذا مختلف اوقات میں جو تعداد سیاحوں نے ملاحظہ کی ہے وہ بنظر فائدہ درج کیجاتی ہے۔

ف۔ یہ تفصیل مسٹر جے۔ بی۔ فریزر کی کتاب "ہسٹوریکل اینڈ ڈسکرپٹو" کے صفحہ ۱۴۹ سے درج کی گئی ہے۔

اور مقامات مقدسہ کی زیارت، سب کچھ اسی سفر سے حاصل ہوجاتا تھا۔ اگر ہم غور و تامل سے ابن بطوطہ[1]، ابن حوقل، علامہ بشاری، ابن جُبیر، مسعودی، البیرونی، ادریسی، ابو اسحاق اصطخری، یاقوت حموی، ابن سعید مغربی اور ناصر خسرو[2] وغیرہ کے سفرنامے پڑھیں تو معلوم ہوجائے کہ سیر و سیاحت کے صدقہ میں ہماری قوم کو کس قدر نفع پہنچا تھا۔ نفح الطیب تاریخ اندلس اندنوں میرے مطالعہ میں ہے اُس کا نامور مصنف بطور نمونہ ایسے ہشتاد (جنمیں ہم عورتیں ہیں) سیاحوں کا ذکر لکھتا ہے جنہوں نے مشرق سے اندلس (ہسپانیہ) کا سفر اختیار کیا تھا اور جن نامور سیاحوں نے اندلس سے ممالک مشرق کا سفر کیا اون کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ناظرین اب پھر قصر چہل منار کیطرف متوجہ ہوں۔ یہ مشہور عمارت طول میں ۳۰۳ فیٹ و عرض میں ۵۰ ۳ فیٹ ہے۔ مگر کلیتہً ویران ہوچکی ہے اور صرف میناروں سے اُس کی حدود کا پتہ چلتا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ قصر چہل منار (چہل ستون بھی کہتے ہیں) دیوان خانہ تھا اور شاہنشاہ عجم کا تخت اسی جگہ تھا۔

مصنف گنج دانش حالات اصطخر میں لکھتا ہے کہ "یہ عجیب و غریب عمارت حقیقت میں پادشاہوں ہی کے واسطے بنائی گئی تھی، کیونکہ اُس کے تین جانب چھوٹے بڑے پہاڑ بطور کمربند کے واقع ہیں اور ایک طرف صحرائے مرودشت کا پُر فضا منظر سامنے ہے۔ جب پادشاہ تخت پر بیٹھتا ہوگا تو اوسکے پیش نظر ملک کا بڑا حصہ ہوجاتا ہوگا۔ جنوب میں جبال اِستان اور اُس کے محاذی فارس کے پہاڑ۔ شمال میں قلعہ اصطخر اور نقش رستم (مقبرۂ سلاطین عجم) کا نظارہ عجیب لطف دیتا ہوگا۔ یہی محل تھا جو جشن نوبہار میں آراستہ ہوا کرتا تھا، یہی عدالت کا کمرہ تھا، فصل بہار کا پورا زمانہ بھی اسی محل میں ختم کیا جاتا تھا (موسم سرما سوسا و بابلیوں میں بسر ہوتا تھا)۔

بہرحال جبتک اقبال یاور رہا یہ محل شاہانِ عجم کا مسکن و مامن رہا اور جب ادبار کا زمانہ آیا تو چشم زدن میں برباد ہوگیا اُس کی بربادی کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ سکندر نے اصطخر کی فتح کے بعد ایک بڑا جشن قصر چہل منار میں کیا۔ (یہ آخری جشن تھا جو اس محل میں ہوا) انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک رات بادہ ناب کے غلبہ سے سکندر مست ہو رہا تھا۔ اُسکے ارکان سلطنت بھی نشہ میں چور ہو رہے تھے، کہ ایک قاصہ نے جس کا نام طاؤس تھا ایرانیوں کی فتح اور یونانیوں کی شکست کے حال میں ایک ترانہ گایا۔ اگرچہ سکندر کی روح پر اُس راگنی کا خاتمہ ہوا تھا لیکن اپنی شکست اور قومی ذلت کا افسانہ سنکر سکندر برہم ہوگیا اور مصاحبوں سے بھڑکانے سے جب شعلۂ غضب ترقی کرگیا تو تخت سے اوتر کھڑا ہوا اور ایک مشعل اپنے ہاتھ میں لیکر چلا۔ یہی عجیب و غریب نظارہ تھا کہ ایک نامور شاہنشاہ جو علمی دنیا میں حکیم کا درجہ رکھتا ہے ایک قاصہ کے دام فریب میں آگیا ہے اور شاہانِ عجم کے عدیم النظیر مرقع کو خاک سیاہ کرنے جاتا ہے۔ اوس نے اوّل ایک پردہ میں خود ہی آگ لگائی پھر عام حکم جاری کردیا۔ حکم ہونے کی دیر تھی کہ آن کی آن میں سارا محل کُرۂ نار بن گیا۔ بلکہ ایک حصہ شہر اصطخر کا بھی جلکر خاکستر ہوگیا ؎

پیرایش ہر کہ را مشکر بود ✦ امروزیش کرانہ بستر بود

یہ واقعہ یونانی اور انگریزی تاریخوں میں بھی بالتفصیل موجود ہے مگر افسوس ہے کہ بعض متعصب پارسیوں نے تخت جمشید کی بربادی کا الزام مسلمانوں پر لگایا ہے۔ حالانکہ تحقیق یہ ہے

---

[1] مولوی محمد حسین خان بہادر دلیل جج فرز بورڈ نے ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ نہایت اعلیٰ قابلیت سے کیا ہے اور مطبع رفاہ عام پریس لاہور سے مولوی ممتاز علی صاحب نے چھاپکر شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ حد سے زیادہ دلچسپ، مفید اور کارآمد ہے۔ قوم کو چاہئے کہ اُس کو پڑھے اور مترجم کی شکرگذار رہے اور بقیہ سفرنامے بھی یورپ نے چھاپکر شائع کردیے ہیں۔

[2] ناصر خسرو کا سفرنامہ اُردو میں بڑے اہتمام سے میں خود تیار کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ یہ سفرنامہ مع رنگین نقشہ جات اور تصاویر کے منشی محمد رحمت اللہ رعد منیجر نامی پریس کانپور کے اہتمام سے شائع کیا جاویگا جس میں علاوہ تاریخی واقعات کے بڑا سرمایہ علم جغرافیہ کا ہوگا۔

...وں کی فتوحات سے پہلے ہی وہ بہت کچھ تباہ و برباد ... تھا۔

کچھ عجائبات

قصر چہل منار کے پہلو میں کچھ چیزیں بنے ہوئے ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ حصے آتشکدہ کے تھے، لیکن اب صرف تین مرقعے اسجگہ موجود ہیں۔

(۱) شاہنشاہ عجم سادہ لباس میں پیدل جا رہا ہے۔ ہاتھ میں شاہی عصا ہے اور دو خدمتگار پیچھے جا رہے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چتر ہے۔ دوسرا مورچھل ہلا رہا ہے اور ہاتھ میں ایک رومال بھی لئے ہوئے ہے۔ چتر کے اوپر ایک فرشتہ سایہ کئے ہوئے ہے۔ جلد اول معارف صفحہ ۳۶۹ میں تصویر ملاحظہ طلب ہے۔

(۲) شاہنشاہ عجم ایک سادہ کرسی پر جلوہ افروز ہے ہاتھ میں عصا ہے۔ تین خدمتگار پیچھے کھڑے ہیں۔ سامنے دو آتشدان رکھے ہوئے ہیں جنمیں آگ جل رہی ہے۔ سولہ سپاہی مودب کھڑے ہوئے ہیں اور سب کے ہاتھوں میں برچھے ہیں۔

(۳) ایک تخت پر خوبصورت چوکی بچھی ہوئی ہے اُس پر شاہنشاہ عجم اِس انداز سے بیٹھا ہوا ہے کہ پشت چوکی سے لگی ہوئی ہے۔ ہاتھ میں عصا ہے اور ایک چھوٹی سی صندلی پر دونوں پاؤں رکھے ہوئے ہے دو آتشدان سامنے ہیں۔ تخت کو دس خدمتگار اپنے سروں پر لیے ہوئے ہیں، جو وضع و لباس کی حیثیت سے مختلف ملک و دیار کے معلوم ہوتے ہیں اور حسب معمول کے موافق ایک خدمتگار پیچھے کھڑا ہے، جو مورچھل ہلا رہا ہے۔

ان مجسمات میں نمبر ایک تو معمولی ہے اور پادشاہ کا سادہ لباس اور اوس کا پیادہ چلنا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ ایک محل سے نکل کر دوسرے محل کو جا رہا ہے اور نمبر ۲ و ۳ بیشک عبادت خانہ سے متعلق ہیں اور پادشاہ دین زردشت کے مطابق عبادت میں مشغول ہے البتہ فوجی سپاہیوں کی موجودگی بحالت عبادت بیجوڑ ہے اور اِس شان کی عبادت سے ایک قسم کا غرور اور تکبر پایا جاتا ہے۔

اِن مجسمات کے بعد تین مجسمے اور ہیں اور اون کی صورت یہ ہے کہ ایک پادشاہ کسی عجیب الخلقت حیوان سے لڑ رہا ہے۔ پادشاہ کی صورت سب جگہ یکساں ہے۔ صرف ایک مقام میں بجائے تاج کے ایرانی عمامہ ہے اور دو حیوان قریب ایک صورت کے ہیں۔ البتہ تیسرا شیر ببر ہے۔

ہم اِس مقام پر جو تصویر ایک مجسمے کی دیتے ہیں وہ انہیں تین مجسمات میں سے ایک مجسمہ کی ہے۔ شہنشاہ عجم جس عجیب الخلقت حیوان سے دست بدست لڑ رہا ہے اوس کی صورت دنیا کے کسی اصلی جانور سے نہیں ملتی۔ اُس کا جسم شیر کے جسم سے ملتا جلتا ہے۔ چار ہاتھ پاؤں ہیں۔ بازو پر پرندوں جیسے پر ہیں۔ دُم زمین پر لٹکی ہوئی ہے۔ اِس جسم پر شیر کی صورت کا چہرہ نہیں ہے، بلکہ اوس کا چہرہ پرندوں کے چہرہ سے مشابہ ہے چونچ کھلی ہوئی ہے۔ گردن پر بجائے ایال کے پر اُٹھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سر پر دو سینگ بھی ہیں۔ پنجے درندوں کے پنجوں کی طرح خوفناک ہیں۔ یہ عجیب الخلقت جانور شہنشاہ عجم کے سامنے غصہ کی حالت میں تنکر کھڑا ہوا ہے۔ اوس کا ایک پنجہ پادشاہ کے بائیں ہاتھ کے بازو پر جما ہوا ہے۔ دوسرا پنجہ پادشاہ کے سینہ پر ہے۔ پادشاہ کے دہنے ہاتھ میں آبدار خنجر ہے، جو اُس نے پوری قوت سے اُس جانور کے پیٹ میں بھونک دیا ہے۔ خنجر کا قبضہ اور تھوڑا سا حصہ باہر رہ گیا ہے۔ پادشاہ بائیں ہاتھ سے اُس ایک سینگ یا چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے، یا شاید کوئی ہتیار ہے، جو اوس جانور کے سر میں پورے ... ساتھ داخل کر دیا ہے۔ پادشاہ کے چہرہ ... ہراس کی کوئی علامت نہیں پائی ... کے آثار نمایاں ہیں۔



متقدمین سے کوئی رائے ظاہر نہیں کی کہ ان مجسمات میں کونسا راز سربستہ ہے' لیکن متاخرین کا خیال ہے کہ جب شاہ دراییس نے سلطنت سیتھیا پر فتح پائی ہے' یہ اوس کی یادگار ہے۔ یوں سمجھو کہ شاہانِ عجم نے اپنی بہادری اور دلیری کا اِس طریقہ پر اظہار کیا ہے۔

اِن مجسمات کے بعد دراییس وزرکسیس کے ویران محلوں کا نظارہ سامنے آتا ہے۔ سیاحوں نے اُس کے اندرونی و بیرونی حصوں کے تفصیلی حالات لکھے ہیں اور ایک ایک ستون و دریچے کا فوٹو الگ الگ دیا ہے' لیکن بجز عمارت کے حالات کے کوئی تاریخی معاملہ نہیں ہوتا ہے' لہذا نقش و نگار کے حالات سے قصداً اعراض کیا جاتا ہے۔ اور تاریخی حصہ جو مفید و کارآمد ہے' تحریر کیا جاتا ہے۔

ترجمہ خط پہلوی جو قصر دراییس کے دروازہ پر ہے

(۱) دراییس بڑا بادشاہ بلکہ شاہوں کا شاہنشاہ ہے وشتاسپس (گشتاسپ) کیانی کا بیٹا ہے وہی ہے جس نے یہ نقش و نگار بنائے ہیں۔

(۲) خداوندِ اعظم جو فرشتوں سے بزرگ تر ہے اوس نے دراییس کو پادشاہ بنایا ہے۔

(۳) مجھے ہرمزد نے ایران کی سلطنت بخشی ہے اور یہ وہ خطہ ہے جہاں عمدہ گھوڑے اور شریف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اور میں وہ پادشاہ ہوں جو دشمن سے نہیں ڈرتا۔

(۴) ہرمزد فرشتوں کے ذریعہ سے میری مدد کرے گا اور یہ فرشتے میرے گھر کی پاسبانی کرتے ہیں۔

(۵) ہرمزد اِس ملک کو غلامی' کمزوری اور دروغ گوئی سے بچائے۔

(۶) سلطنت ایران میں حسب ذیل ممالک میرے تابع فرمان ہیں اور مجھ کو خراج ادا کرتے ہیں۔

(۱) سوسیانا	SUSIANA
(۲) میڈیا	MEDIA
(۳) بابیلونیا	BABYLONIA
(۴) عربستان	ARABIA
(۵) اسیریا	ASYRIA
(۶) مصر	EGYPT
(۷) آرمینیا	ARMENIA
(۸) کیپیڈوشیا	CAPPADOCIA
(۹) اسپارٹا	SPARTA

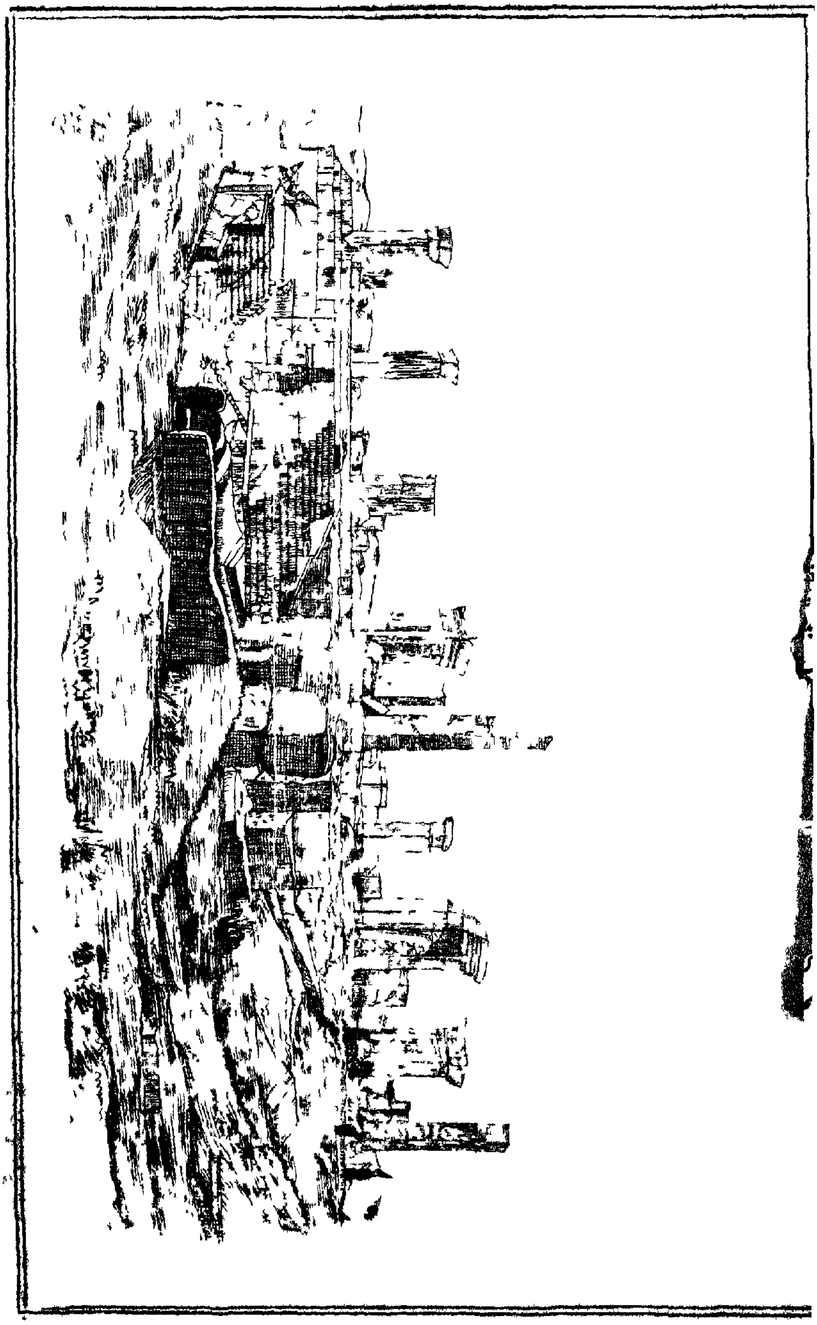
(۱۰)	آئی اونیا	IONIA
(۱۱)	ساگارسیا	SAGARTIA
(۱۲)	پارتھیا	PARTHIA
(۱۳)	زرنجیا	ZARANGIA
(۱۴)	ایشیا	ASIA
(۱۵)	بلخ	BACTRIA
(۱۶)	سغد	SOGDIANA
(۱۷)	خراسان	CHORASINIA
(۱۸)	ستاگیدیا	SATTAGYDIA
(۱۹)	ارکوسیا	ARACHOTIA
(۲۰)	ہندوستان	INDIA
(۲۱)	گندرا (قندھار)	GANDARA
(۲۲)	سیسیا	SACIA
(۲۳)	میسیا	MECIA

زرکسیس کے دروازہ اور دریچہ پر بھی خط
ں چند لوحیں نصب ہیں مگر اون میں کوئی خا
ـہ نہیں ہے' لہٰذا اوس کا ترجمہ
لیا ہے۔

ستودان تخت جمشید کی تمام عمارتوں کا اس جگہ
ہو جاتا ہے اور اخیر عمارت سے ۴۰۰ فیٹ
ے فاصلہ پر کوہ پادشاہی میں دو منزل استودان
مکان یا مقبرہ جہاں پارسی اپنے مُردوں کے
صندوق بغرض حفاظت استخوان رکھا کرتے ہیں
ا پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ ہر دالان میں
ن کئی حجرے ہیں جن میں بالترتیب تین صندوق
رکھے ہیں۔

پرسی پولیس کی ابتدائی تاریخ ہم لکھ چکے ہیں
کوئی ضروری واقعہ ایسا نہیں رہا جو فروگذاشت
ہوا ہو۔ تاہم یہ ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ بانی اوّل
تخت جمشید کا پشدادی ہے' لیکن بمشکل کہا جا سکتا
ہے کہ جو محل سب سے اوّل اُس نے تعمیر
کیا تھا وہ آج بھی موجود ہے یا نہیں' مگر اس میں
کچھ شک و شبہ نہیں ہے کہ موجودہ عمارتیں قدیم
رقبہ میں بنائی گئی ہیں اور سب سے بڑا حصہ
اوس دارائیں' اور زرکسیس کے محلات کا ہے۔
جنکی تصدیق کتابوں سے ہر ہر قدم پر ہوتی ہے۔

اب ہم ایک اجمالی نقشہ تخت جمشید کا ذیل
میں درج کرتے ہیں (جس کے ملاحظہ سے اکثر
مطالب اِس مضمون کے ذہن نشین ہو جائیں گے
اور متفرق طور پر جو تصویریں اِس مضمون میں
دی گئی ہیں' وہ سب اِس عمارت کے اندرونی
یا بیرونی اجزا ہیں)۔



اب ہم اصطخر اور تخت جمشید سے رخصت ہوتے ہیں۔ ناظرینِ معارف معلوم نہیں کہ اس مضمون سے کیا نتائج اخذ کریں مگر پژمردہ دل مضمون نگار یہ سمجھتا ہے کہ "دنیا کی ہر ترقی کی اخیر حد فنا ہے"۔ اگرچہ تخت جمشید نے اپنی عمر کی ہزارہا منزلیں طے کر ڈالیں، مگر اخیر منزل ہنوز باقی ہے۔ اور ایک دن وہ آنیوالا ہے جبکہ اس کے کنگروں پر بیٹھکر چڑیاں یہ نوحہ پڑھتی ہونگی ؛

آں قصر کہ بر چرخ ہمیزد پہلو
شاہاں بدرش ہمی نہادندی رو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختہ
بنشستہ ہمے گفت کہ کوکو کوکو

(عبد الرزاق)

آثارِ قدیمہ

لفظ آثار کے کئی معنے لئے جاتے ہیں۔ اُنہیں سے ایک معنے قدیم چیزوں کے ہیں۔ یہ لفظ اِن معنوں میں لاطینی زبان کے لفظ انٹی کیوٹیز (Antiquities) کے مقابلہ میں ہے۔ اصطلاحاً جو معنے اس لفظ کے لئے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ ہر قسم کی قدیم چیزیں جو ناقص یا کامل حالت میں آجتک روئے زمین پر باقی اور محفوظ ہیں مثلاً (۱) عالیشان عمارتیں جیسے مصر کے مینار جو اہرام کے نام سے مشہور ہیں۔ بعلبک کا قلعہ (۲) یا پُرانے سکے جیسے رومیوں اور یونانیوں کے سکے (۳) یا مورتیں جیسی مصر میں ابوالہول۔ جزیرہ روڈس کا بُت (۴) یا نوشتے جیسے شفیس کی لاٹ کا نوشتہ جو مصر سے پیرس (دار الحکومت فرانس) کو لیگئے ہیں مصر کے مخروطی میناروں کے نوشتے اور شام کے کھنڈرات کی قدیم تحریریں (۵) یا قدیم تاریخیں جیسے چینیوں۔ مصریوں اور نینوا والوں کی تاریخیں (۶) یا فصیح و بلیغ اور مفید تحریریں۔ جیسے فلاسفۂ یونان کے خطبے۔ شعرائے یونان کے اشعار بطلیموس کا جغرافیہ (۷) یا قدیم زمانہ کے لباس۔ ہتیار۔ برتن وغیرہ جو شخص قدیم چیزوں کو جمع کرتا اور اونکے حالات دریافت کرکے قدیم زمانہ کی قوموں کی تاریخ لکھتا ہے اوسکو آثاری کہتے ہیں۔ چونکہ زمانۂ حال کی نسلوں کیلئے قدیم لوگوں کے حالات معلوم کرنا اور انکی ایجادوں اور اختراعوں سے آگاہی حاصل کرنا اور اونکے تجربوں سے مستفید ہونا نہایت ضروری ہے اس لئے اہلِ یورپ نے خواب غفلت سے بیدار ہوکر اس علم کی طرف پوری توجہ مبذول کی ہے اور اپنے ملکوں اور غیر ملکوں میں قدیم یادگاروں کو تلاش کرکے اون کو جمع کیا ہے۔ اونہوں نے آثار قدیمہ کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے اوس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ بیشمار تاریخی باتیں قدیم زمانہ کی حل کرلی ہیں جنکا حل کرنا بغیر اس علم کی مدد کے ناممکن تھا۔ اونہوں نے اپنی معلومات سے اپنے ملکوں اور تمام دنیا کے ملکوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔ باوجود اون ذخیروں کے جو اونہوں نے سمیٹ سمیٹ کر اپنے ملکوں میں جمع کئے ہیں اب بھی لگاتار قدیم چیزوں کی تلاش میں ملک ملک پھرتے اور اون کا سُراغ لگاتے ہیں۔ اُنکے ذخیرے دن بدن بڑھتے جاتے ہیں۔ اون کی معلومات کا دائرہ یوماً فیوماً وسیع ہوتا جاتا ہے۔ وہ اِس غرض کیلئے بیشمار روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اون کی پیاس نہیں بجھتی۔ اونکی سرگرمی روزافزوں ہے۔ وہ جہاں کہیں قدیم چیزیں پاتے ہیں پروانوں کی طرح اون پر گرتے ہیں۔ بیروت کا ایک عیسائی عالم لکھتا ہے کہ "اہل یورپ لوگوں کو جو آثار قدیمہ کی تلاش میں شرقی ملکوں میں اور خاص کر مصر اور شام میں گشت لگاتے پھرتے ہیں ہمارے آبا و اجداد نے دیکھا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں دیکھیں گی۔ اُنہوں نے اسقدر قدیم چیزیں شرقی ممالک کی جمع کرلی ہیں کہ وہ بہ نسبت اون ملکوں کے جہاں وہ چیزیں نکالی گئی ہیں زیادہ امیر اور دولتمند ہوگئے ہیں۔ اونہوں نے اِس کام کیلئے جو مجلسیں قائم کی ہیں اون کا سرمایہ کثیر ہے اور جو عجائبات خانے ان چیزوں کیلئے قائم کئے ہیں اون کا ذخیرہ بیحد ہے۔ چونکہ شرق کے باشندے اُن چیزوں کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں اور اپنے ملکوں کی قدیم چیزوں کو برباد کر رہے ہیں اسلئے صاف دیکھنے میں آتا ہے کہ یورپ کے سیاح اِن ملکوں میں آتے ہیں اور اونکی اعلیٰ انفس

اور نادر چیزیں جو زمانۂ قدیم کی یادگار ہیں مفت یا کم قیمت لیجاتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان ملکوں نے اپنی نادر اور کمیاب اور اعلےٰ اور بیش قیمت چیزیں ہاتھ سے کھو دی ہیں۔ اگر یورپ کے لوگ مصر کے میناروں یا بعلبک کے قلعہ یا اور ایسی ہی عالیشان اور قدیم عمارتوں کو اوٹھا کر اپنے ملک میں لیجا سکتے تو اسمیں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ان ملکوں میں ایک چیز بھی قدیم یادگاروں میں سے باقی نہ رہتی۔ ابھی خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک میں سلطنت علیہ عثمانیہ کو اور مصر میں خدیوی گورنمنٹ کو ان قدیمی چیزوں کے محفوظ رکھنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے جو یورپ والوں کے ہاتھ سے بچکر کچھ ان ملکوں میں موجود ہیں قسطنطنیہ اور قاہرہ میں ان چیزوں کے رکھنے کیلئے عجائب خانے قائم ہو گئے ہیں۔ شاید اس توجہ کا یہ اثر ہو کہ ان ملکوں سے قدیم اور نادر یادگاریں باہر نہ جانے پائیں اور انہیں ملکوں میں محفوظ رہیں"۔

امریکا کے ملک مکسیکو کی فتوحات پر ایک مورخ لکھتا ہے کہ جو مکسیکو کے فاتح ڈون جان اور اوسکی فوج نے اس ملک کے بتوں اور قدیم مورتوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قدیم نوشتوں اور تحریروں کو جو مندروں کی دیواروں پر تہیں بگاڑ دیا یا مٹا دیا۔ تاریخی کتابوں کو جو اس ملک میں دستیاب ہوئیں پھاڑ ڈالا یا جلا دیا۔ اونہوں نے اپنے اس وحشیانہ فعل سے ان لوگوں کو جو مکسیکو کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اون عظیم الشان ذریعوں سے محروم کر دیا جو اس ملک میں اون کو دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس ملک کے تاریخی نوشتے بہت سے تو اون خونریز اور وحشی حملہ آوروں نے غارت کر دیے مگر اب تھوڑے کتب نوشتے جو یہاں کے اصلی باشندوں کے پاس رکھے ہیں ان کو یہ لوگ اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے ہیں اور کسی کو نہیں دکھاتے اور ہر ایک شخص کی نظر سے اونکو چھپاتے ہیں مکسیکو کے کتب خانہ میں اسقدر مفید کتابیں بہت ہی تھوڑی ہیں اور جو ہیں وہ ناتمام اور ناقص ہیں جنکے بہت سے اوراق معدوم ہیں۔ اس ملک کی قدیم چیزیں اور یادگاریں بھی جو اس کتب خانہ میں لا کر جمع کی گئی ہیں وہ بھی بہت تھوڑی ہیں۔ اون کو دیکھکر علما افسوس کرتے ہیں اور غصہ میں کہتے ہیں کہ افسوس صد افسوس ان جاہلوں وحشیوں نے اپنے وحشیانہ اور سفاکانہ فعل سے بجائے اسکے کہ خود کچھ نفع اوٹھائیں دنیا کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔

آثار قدیمہ کے جمع کرنے اور اون کے مطالعہ کرنیکے لئے جو شاہی انجمن انگلستان میں قائم ہے اوس نے اپنے مقاصد ایک اعلان میں بیان کئے ہیں اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی تمام انجمنیں کیا کام کرتی ہیں اور اون کے قائم ہونیکا کیا مطلب ہے۔ اس اعلان کا ترجمہ یہ ہے "اس انجمن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ قدیم نوشتوں کو جمع کرے اور ان نوشتوں کی شرح کرے۔ وہ قدیم عمارتوں زمین کھود کر نکالی ہوئی چیزوں۔ کتبوں۔ تصویروں اور موسیقی کی یادگاروں پر بحث کرتی ہے۔ اگلے نسلوں کا حال اس ذریعہ سے جو پچھلے نسلوں کو معلوم ہوتا ہے اوس پر پچھلی نسلیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ اضافہ کر سکتی ہیں۔ اس انجمن کا کام یہ ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کے جن قدیم نوشتوں کا مطلب ابتک معلوم نہیں ہوا اونکا مطلب معلوم کرے اور دنیا کے پانچوں براعظموں میں ایسے لوگوں کو بھیجے جو قدیم چیزوں کو تلاش کریں اور اون کو خریدیں اور جب قدیم چیزوں کا ذخیرہ جمع ہو جائے تو اس انجمن کا فرض ہے کہ اوس ذخیرہ کی تفصیل قلمبند کرے۔ یہ انجمن اپنے کتب خانہ اور آثار قدیمہ سے ہماری حکومت کو اس ملک کے باشندوں کو اور ان لوگوں کو جو آثار قدیمہ کے مطالعہ کے لیے یہاں آتے ہیں بہت فائدے پہونچا سکتی ہے کیونکہ اس انجمن کا کتب خانہ اور عجائب خانہ فی الحقیقت ایک مدرسہ ہے جس میں لوگ قدیم قوموں کے انتظامات اور قوانین کی تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس انجمن کے ذریعہ سے ہماری تجارت کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے اور صنعت و حرفت کو ترقی ہو سکتی ہے"۔

یورپ کے ہر ملک میں ایسی انجمنیں موجود ہیں اور اونکے جمع کیے ہوئے ذخیرے اون کے عجائب خانوں میں فراہم ہیں۔ مصر کے آثار قدیمہ کا اسقدر علم حاصل ہو گیا ہے کہ اوس کی یادگاروں کے مجموعہ کا نام اجپٹالوجی رکھا گیا ہے اسی طرح ملک شام کے آثار قدیمہ کا نام اسریالوجی ہے۔ یورپ کے سیاح اور علمائے آثار ایسے ملکوں میں بھی چلے جاتے ہیں جہاں جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ اگر تم

چین میں یا عرب میں جاؤ تو اون کو چینیوں یا عربوں کے لباس میں دیکھوگے اور اون کو قدیم سکے خریدتے ہوئے پاؤگے یا کسی قدیم عمارت کا فوٹو اوتارتے ہوئے دیکھوگے، یا کسی نوشتے اور کتبے کی نقل کرنے میں مشغول پاؤگے۔ غرضکہ اِن لوگوں کی مساعی جمیلہ سے دنیائے قدیم کی تہذیب و شائستگی کی ایسی صحیح تاریخ تیار ہوگئی ہے جو اور کسی طرح تیار ہونی محال تھی۔

بلاد اسلامیہ میں بھی ایسی اہم یادگاریں موجود ہیں جنکے معلوم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں عاد اور ثمود دو قوموں کا بیان ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں نہایت دولتمند، طاقتور اور شائستہ تھیں۔ اون کی تاریخ بغیر اس ذریعہ کے کس طرح معلوم نہیں ہوسکتی کہ جن ملکوں میں اون کا آباد ہونا معلوم ہوچکا ہے اون ملکوں میں آثار قدیمہ کی تلاش کیجائے ہمکو کامل یقین ہے کہ عرب میں اون کے کھنڈرات کی تلاش کرنے سے اون کا مفصل حال معلوم ہوجائیگا اسی طرح طسم اور جدیس وغیرہ قومیں جنکی نسل عرب سے معدوم ہوگئی اور جنکا ذکر تاریخوں میں بہت ہی مختصر ہے اونکا حال بھی اونکے آثار قدیمہ سے معلوم ہوسکتا ہے مصر میں قبطیوں کا۔ شام میں بنی اسرائیل کا حال اون کی یادگاروں سے معلوم ہوسکتا ہے۔ ان قوموں کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آیا ہے جب سے اسلام کا آفتاب عرب میں طلوع ہوا اوس وقت سے آجتک مختلف ممالک میں اسلام کی حکومت رہی ہے مسلمانوں کے مختلف خاندانوں کی یادگاریں انھیں ملکوں میں تھیں جنمیں سے بہت سی یادگاریں ضائع ہوچکی ہیں مگر بہت سی یادگاریں ابھی باقی ہیں۔ اگر ہندوستان یا مصر یا ٹرکی میں کوئی انجمن اُن اسلامی یادگاروں کا سراغ لگائے اور اون کو محفوظ رکھے اور اون سے مسلمانوں کی تاریخ کو پورا کرے تو وہ گویا اسلام کی اگلی اور پچھلی نسلوں کو اپنا ممنون احسان بنائیگی۔ تاریخیں جو لکھی گئی ہیں اون میں سوائے سلاطین کے جلوس و وفات اور اون کی عہدِ حکومت کے جنگ و جدل کے اور کچھ بیان نہیں ہوا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ مسلمانوں کے عظیم الشان اور حیرت انگیز تمدن کی تصویر کھینچیں اور اُسکے اجزا کی تشریح کریں اور بتائیں کہ مسلمانوں نے ہر ملک میں جاکر کیا کیا صنعت و حرفت اور عمارت کو اون کے ہاتھ سے کیا ترقی حاصل ہوئی۔ اون ملکوں کی ہر چیز میں مسلمانوں نے کیا تغیر پیدا کیا جس سے اون کی ذہانت اور جودت اور طباعی کا سراغ مل سکے، تو ہم بالکل عاجز ہیں۔ تاریخیں اِن اُمور کا جواب دینے سے خاموش ہیں اِن کا مفصل جواب وہی قدیم کتبے اور سکے اور یادگار چیزیں دے سکتی ہیں، جو مسلمانوں نے ہر ملک میں چھوڑی ہیں اور جن میں سے بہت سی تلف ہوگئیں اور جو باقی ہیں اُن میں سے بہت کم چیزیں ہیں جنکا حال اہل یورپ کو معلوم ہوا ہے۔ باقی سب چیزیں یا زمین میں مدفون ہیں یا کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کی کسی عہد کی تاریخ لکھنی چاہتے ہیں اور اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ اونکے اوس عہد کی شائستگی کا حال کما حقہ بیان کرینگے، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ تاریخوں میں جن وقعات یا حالات کے لکھنے کا پہلے زمانہ میں رواج نہیں تھا اُنکی طرف اگر کوئی ضمنی اشارہ ان کتابوں میں ملجاتا ہے تو وہ اوسکو بڑا کر کچھ کا کچھ کردیتی ہیں اور حقیقی اور اصلی تاریخ پر پردہ ڈالدیتی ہیں۔ یہ پردہ جبھی اُٹھ سکتا ہے جبکہ ایسی انجمنیں قائم ہوجائیں جو مسلمانوں کی آثار قدیمہ کو تلاش کرکے اونکو محفوظ رکھیں اور اون سے صحیح نتائج نکالکر اصلی تاریخ مسلمانوں کی ترقیوں کی تحریر کریں۔ بغیر اسکے کوئی صحیح کلیہ مسلمانوں کے نظام حکومت اور نظام معاشرت کی نسبت قائم کرنا خطرناک غلطی ہے خداوند عالم مسلمانوں کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ اسلامی آثار قدیمہ کے جمع کرنے اور ترتیب دینے اور اُنکے محفوظ رکھنے اور اونکے مطالعہ سے تاریخی نتائج نکالنے کیلئے ہر ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت رہ چکی ہے یا اب ہے انجمنیں قائم کریں۔ واللہ موفق للصواب۔

(عزیز الرحمن عزیز)

جدید تصانیف

(زیر طبع)

کتابچہ سیریز کے نمبر (۲) و (۳) راقم کی تصنیف سے مطبع مفید عام
ین زیر طبع ہین - یہ دونون کتابین امدادی فنڈ کے متعلق
ائی گئی ہین - نمبر ۲ - (تربیت الدجاج) یعنی مرغیون کے
لنے کے فن مین جو سوا سے ذاتی اور دوسرے واقف
ون کے تجربون کے انگریزی - ترکی اور اردو کتابون کو پڑھ کر
ستانیون کے مذاق کے موافق بنائی اور لکھی گئی ہے
لی ابتدا مین مرغی پالنے کے شغلی اور مالی فواید کو بیان کیا گیا ہے
ین اس فن کے متعلق تمام قدیم و جدید تحقیقاتون
ضروری اور عملی کارآمد امور و نکات بیان کیے گئے ہین
کتاب غالباً کسی دوسری زبان مین موجود نہو گی - ہر ایک
شائق امیر اور ایک اوس شخص کے پاس جو مرغیون
واسطے پالنا چاہیے - اور ہوٹلون اور کلبون کے خانسامانون
کتاب کی ایک ایک کاپی ضرور موجود ہونی چاہیے -
ے ہوئے ہندوستانی اور اردو پڑھے ہوئے صاحب
سطے بہتر ہے کہ بجائے انگریزی کی کتاب کے اس کتاب
کتاب تربیت الدجاج مین یہ فصلین ہین -
ضروری گذارش مقصد - اقسام مرغیون کے ٹوٹے
یدا اونمین مرغیان - نسلون کی حفاظت - دوغلے بچے
مرغیون کا انتخاب - انڈے مین نر ہے یا مادہ چکنا
- انڈون کا انتخاب - مان کا انتخاب - کتنے انڈے
ے چاہیین - بیٹھنے والی مرغی - نگہداشت انڈون کی - انڈون
- انڈا کیسا ہے - بچے نکلنا - بچون کی پرورش - دوبارہ
نا - کالک روکنا - انڈون کا روانہ کرنا - دور سے آئے
ئے انڈے سے محفوظ نسب - حفظ صحت - معالجہ متفرقات
تیتر بٹیر مرغ - بط - یادداشت - آلات - مفید تحقیقاتین بعض
اصطلاحین - نمبر ۳ (لمعات الاسلام) یہ ایک مجموعہ احادیث
شریفہ کا ہے جو راقم نے انتخاب و جمع کیا ہے - اس مجموعہ
مین ڈیڑھ سو کے قریب ایسی احادیث داخل کی گئی ہین -
جو روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہین -

مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے افعال و کردار
کو سنت نبوی کے مطابق کر سکے اور اس ذریعہ سے وہ تفرقہ
کم ہو جائے جو مسلمانون مین بوجہ عدم واقفیت ایک سیدھی
راہ کے بڑہتی جاتی ہے - ہر ایک حدیث کے نیچے بامحاورہ
اردو ترجمہ اوسکا لکھ دیا گیا ہے اور جہان تشریح کی ضرورت
محسوس ہوئی ہے وہان پر شرح کر دی گئی ہے ایک مختصر
دیباچہ بھی لکھا گیا ہے - اون والدین و مربیون سے جو اپنی
اولاد کو تعلیم دلانے مین مصروف ہین خاصکر سفارش کیجاتی
ہے کہ ایک ایک کاپی اسکی خریدین اور اپنے بچون اور
طالب علمون کو بالضرور پڑہائین یا مطالعہ کرنے کی ہدایت کرین
اسکے سوا ہر ایک دیندار - ہر ایک دنیادار - ہر ایک تاجر - ہر ایک
ڈپلومیٹ - ہر ایک اخبار نویس - ہر ایک مضمون نگار - اور
اون تعلیم یافتون مین سے ہر ایک کو جو اسلام کی مارل اور
سوشل ہدایات سے بوجہ اپنی بدقسمتی کے ناواقف ہین،
ایک ایک جلد اسکی اپنے مطالعہ مین رکھنا نہ صرف لازم بلکہ الزام
ہے - پاس شدہ اہل اسلام طلبا کو انعام مین دیے جانے
کے واسطے یہ مجموعہ نہایت ہی موزون ہے - یہ کتاب بھی
زیر طبع ہے - غالباً دو مہینے کے اندر یہ دونون کتابین چھپکر تیار
ہو جاینگی - قیمت اونکی آیندہ پرچہ مین ظاہر کیجائے گی -

راقم محمد اسمٰعیل (اڈیٹر معارف)